داستانِ تاریخِ اردو
مؤلفہ
حامد حسن قادری

۷۸۶
۹۲

تاریخ آغاز تالیف

داستانِ تاریخِ اُردو

۱۹۳۸ء

یعنی

ابتدا سے بیسویں صدی کے شروع تک اُردو زبان وادب کے
نشوونما کی تاریخ، مصنّفینِ نثرِ اُردو کے حالات اور تصنیفات
کے نمونے

مع اضافے

مؤلفہ

حامد حسن قادری

نام کتاب: داستانِ تاریخِ اُردو

مصنف: حامد حسن قادری

بہ اہتمام: افضال الرحمٰن

اشاعت سوم: 2007

تعداد: 500

مطبع: اے۔ بی۔ سی۔ آفسیٹ پرنٹرز، 4717 حوض قاضی، دہلی۔۶

قیمت: لائبریری ایڈیشن (ہارڈ باؤنڈ) 500 روپیہ

طلباء کے لیے (پیپر بیک) 350 روپیہ

ملنے کا پتہ

افضال الرحمٰن 272 جامعہ نگر، ٹیچر ٹریننگ کالج روڈ۔ نئی دہلی 25

فون نمبر: 011-26827174

ای میل: altafr@rediffmail.com

ا۔ تقسیم کار: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 3108 وکیل اسٹریٹ۔ کوچہ پنڈت۔ دلّی 110006

فون نمبر: 23214465 /23216162 فیکس: 011-2321154

e-mail: ephdelhi@yahoo.com

۲۔ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

فون: 011-26987295 / 32468286 گرام: "ACADEMY"

e-mail: maktaba@ndf. vsnl.net.in

e-mail: maktabajamia@rediffmail.com

۳۔ نئی کتاب: D-24، ابوالفضل انکلیو، متصل بھاسکر کمپاؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

فون: 65416661 موبائل: 9313883054

e-mail:naikitab-publishers@yahoo.com

۷۸۶
۹۲

بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْم
۱۳۷۶ھ
(سورہ الحاقہ۔پارہ ۲۹)

دوسرا دیباچہ

"بِنِعْمَتِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ"
۱۳۷۶ھ

"داستانِ تاریخِ اُردو" پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ چھپتے ہی میں نے بہت سے ادیبوں، نقادوں، پروفیسروں، ایڈیٹروں کو کتاب بھجوائی۔ سب سے پہلے ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے دہلی سے ریڈیو پر اس کے متعلق تقریر نشر کی، پھر دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد دکن سے دوسرے نقادوں نے بھی ریڈیو پر تبصرہ کیا۔ بعض نے مجھے خطوط میں رائیں لکھیں، بعض نے رسائل میں ریویو شائع کرائے۔ چند مہینوں میں کتاب کی اتنی شہرت اور اتنی قدر ہوئی کہ مجھے اس کا تصور بھی نہ تھا۔

بات صرف اتنی تھی کہ کسی نے اُردو زبان و ادب کی تاریخ اس تفصیل، اس

تجزیہ، اس موازنہ، اس محاکمہ کے ساتھ نہ لکھی تھی، اسی کی ضرورت تھی اور اسی کو لوگوں نے سراہا اور نہ یہ کتاب تمام پہلوؤں سے مکمل نہ تھی، بلکہ خود میری نظر میں اس کے اندر خامیاں اور کوتاہیاں موجود تھیں۔ اور بعد کو تبصروں سے اندازہ ہوا کہ غلطیاں بھی واقع ہو گئی تھیں جن کا مجھے لکھتے وقت علم نہ تھا۔

مجھے بڑا اطمینان اس بات سے ہوا کہ تبصرہ نگاروں نے میری رعایت و مروّت سے کام نہ لیا تھا۔ اور میں انھی حضرات کا زیادہ شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے ''ہنر'' کے ساتھ میرے ''عیب'' بھی گنائے۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (الہ آباد یونیورسٹی) نے میرے لیے زحمت گوارا فرمائی اور تبصرے میں کتاب کی کتاب لکھ کر روانہ فرمائی۔ جس میں اغلاطِ کتابت سے لے کر زبان و محاورہ، موضوع و مضمون، بحث و تنقید، مواد و معلومات، سب ہی پر نظر ڈالی، مشورے دئے، تلافیِ مافات کی راہ بتائی، معلومات فراہم کیں۔ اسی طرح دوسروں نے بھی میرے بعض اغلاط و نقائص بتائے۔ میں سب کا ممنون ہوں۔ سب کی ہدایات پر میں نے نظرِ ثانی میں عمل کیا ہے۔

لیکن ''پسند اپنی اپنی'' کا عجیب معاملہ ہے۔ بعض متضاد رائیں بڑی دلچسپ تھیں۔ بعض حضرات میرے سخت تبصروں پر ناراض ہو گئے۔ بعض نے میری نرم تنقیدوں کو ناپسند کیا۔ ایک نے غیر مشہور مصنفوں کو شامل کرنے پر اعتراض کیا۔ دوسرے نے اسی کو کتاب کی بڑی خوبی بتایا۔ کسی نے نمونوں کے طویل ہونے کی شکایت کی، کسی نے اسی بات کی تعریف کی اور لکھا کہ۔

''مصنفین کی کتابوں سے کافی اقتباسات دئے گئے ہیں۔ اور ان کا انتخاب اس سلیقے سے کیا گیا ہے کہ مصنف کے طرزِ تحریر کی کُل خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔ اور اکثر ایک ٹکڑے سے پوری کتاب کا مضمون ذہن میں آجاتا ہے۔''

بعض نے طویل حاشیوں اور ان کے مختلف علمی و ادبی معلومات کو غیر ضروری قرار دیا۔ بعض نے ان کی بنا پر کتاب کو زیادہ مفید اور قابلِ قدر بتایا۔

ایک نقاد نے فرمایا کہ---"انداز بیان بھی سادہ اور بے مزہ ہے۔"------

دوسرے نے ریویو کیا کہ----"ساری کتاب کی عبارت شگفتہ اور دلکش ہے۔"---

میں نے ان تمام تبصروں کو اپنے پاس محفوظ رکھا اور اب سولہ سال کے بعد دوسرے ایڈیشن کو مرتب کرتے وقت ان سے کام لیا۔ چنانچہ میں نے اپنی بعض رائیں بدل دیں، بعض غیر مشہور مصنفوں کو حذف کر دیا، بعض اقتباسات کو گھٹا دیا، بعض غیر ضروری حواشی کو حذف کر دیا۔

میں چاہتا تھا کہ دوسرے ایڈیشن میں صرف نظر ثانی اور ترمیم و درستی ہی نہ ہو بلکہ کتاب کو دوبارہ لکھ دوں لیکن یہ بڑا کام تھا۔ سوچتا اور ارادہ ہی کرتا رہا، حتیٰ کہ پاکستان چلا آیا۔ اور کراچی میں آ کر بس گیا۔ یہاں آ کر اس کتاب کی اس قدر مانگ دیکھی کہ میں حیران رہ گیا۔ میرے آنے کی خبر سن کر طلبہ اور اساتذہ نے طلب کیا، "مطالبہ" کا ہنگامہ شروع کر دیا۔ میرے پاس جو کتاب تھی اس پر حملے رہے۔ اساتذہ نے کتاب کی مانگ اور مقبولیت کے قصّے سنائے کہ پچیس روپیہ تک ایک کتاب فروخت ہوئی ہے۔ اور آخری نسخہ تو ایک دکاندار نے ۳۸ روپیہ کو دیا اور لینے والے نے لے لیا۔ اس وقت بھی جن داموں کو مل جائے لوگ خریدنے کو تیار ہیں۔

بہر حال، اُدھر آگرہ کے پبلشر کا اصرار، اِدھر یہ مانگ۔ میرے ارادے کتاب کو از سرِ نو لکھنے کے متعلق سب رہ گئے اور عافیت اسی میں نظر آئی کہ کتاب جیسی کچھ ہے دوبارہ چھپوادی جائے۔ چنانچہ نظر ثانی میں درستی و ترمیم اور حذف و اضافہ کرتا گیا اور پچاس پچاس سو سو صفحے چھپنے کے لیے بھیجتا گیا۔ آخر کتاب دوبارہ چھپ گئی۔ الحمدللہ!

کتاب کا نام----"داستانِ تاریخِ اُردو"(=۱۹۳۸ء) میں نے تاریخ گوئی

کے شوق میں رکھ دیا تھا۔ بعضوں نے اس پر اعتراض کیا اور سوال اُٹھایا کہ یہ "داستان" زیادہ ہے یا "تاریخ" زیادہ۔ لیکن اب اشاعتِ ثانی میں نام بدل دیا جائے تو کتاب پہچانی نہ جائے گی۔ نام بہت مشہور ہو چکا ہے، اس لئے اس "چیستاں" کو باقی ہی رہنے دیا۔

تاریخ گوئی کے شوق کا مظاہرہ میں نے کتاب کے اندر بھی جابجا اور "جا و بے جا" کیا ہے۔ اور اس پر بھی نقادوں نے رائے زنی کی تھی۔ ایک صاحب کا مشورہ تھا کہ ---- "اگر یہ ایک چھوٹی سی کتاب میں الگ الگ جا ہوتیں تو بہتر تھا۔" دوسرے کی رائے تھی کہ ---- "تاہم اس سے کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔" میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے۔ اس لیے معذرت کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اور اس دوسرے ایڈیشن کی تاریخ پیش کرتا ہوں۔

سالِ طبع جدید و نشرِ کتاب
"شیشے میں اب دو آتشہ ہے شراب"

۱۹۵۷ء

یکم رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ — حامد حسن قادری

۲؍اپریل ۱۹۵۷ء — کراچی۔ ناظم آباد۔ بڑا میدان

بِسمِ اللّٰہِ العَلِیّ العَظِیم
۱۳۶۰ھ

"بذکرِ خدائے بیاں آفریں"
۱۹۴۱ء

پہلا دیباچہ

اُردو کی خدمت "تذکرہ" نویسی کی صورت میں دو سو برس سے ہو رہی ہے۔ سب سے قدیم تین تذکرے ہیں جو ایک ہی سال (۱۱۶۵ھ) میں مرتّب ہوئے یعنی، "گلشن گفتار" (خواجہ خان حمید اورنگ آبادی)۔ "نکات الشعراء" (میر تقی) اور "تذکرہ ریختہ گویاں" (فتح علی گردیزی)۔ پھر اُسی بارھویں صدی کے آخر تک تین تذکرے: "مخزن نکات" (قایم چاند پوری) ۱۱۶۸ھ میں، "چمنستان شعرا" (لچھمی نراین شفیق) ۱۱۷۵ھ میں اور "گلزارِ ابراہیم" (نواب علی ابراہیم خاں خلیل) ۱۱۹۸ھ میں لکھے گئے۔ اس کے بعد تیرھویں صدی ہجری میں دہلی، دکن، گجرات وغیرہ مقامات پر آزاد کے "آبِ حیات" سے پہلے ایک درجن کے قریب تذکرے تالیف کئے گئے۔ (یورپین مصنفوں کے لکھے ہوئے تذکرے ان پر مزید اضافہ ہیں)۔ لیکن یہ سب (مع آبِ حیات) شاعری اور شاعروں کے تذکرے

تھے۔ کسی نے مصنفین نثر کی طرف توجہ نہ کی۔

انیسویں صدی میں غدر (۱۸۵۷ء) سے پہلے اُردو نثر اتنی اور ایسی نہ لکھی گئی تھی کہ مفصل و مسلسل تاریخ و تذکرے کے قابل سمجھی جاتی، اور ایسے تذکرے سے عام دلچسپی کی بھی امید مشکل تھی۔ لیکن آخر صدی تک تصانیفِ نثر اور انشا پردازی نے اتنے مدارجِ ارتقا طے کر لئے تھے کہ کسی تاریخ کا مرتب نہ ہونا اہلِ قلم کے ''تغافلِ علمی'' کا ثبوت تھا۔

اس طرف غالبًا سب سے پہلے مولوی محمد یحیٰی تنہاؔ (بی اے ایل ایل بی وکیل غازی آباد) کو توجہ ہوئی اور انھوں نے ۱۹۱۴ء میں ''سیر المصنفین'' کی پہلی جلد اور ۱۹۲۴ء میں دوسری جلد شائع کی، دونوں میں مصنفوں کے حالات اور طرزِ تحریر کے ساتھ تصانیف کے نمونے بھی درج کئے، لیکن پہلی جلد میں اردوئے قدیم کو روا روی میں لکھا اور تشنہ چھوڑ دیا، اور دوسری جلد کے لئے صرف چوٹی کے سات آٹھ مشہور مصنفوں کو چن لیا اور سرشارؔ و شررؔ پر کتاب کو ختم کر دیا۔ بہر حال تقدم کی فضیلت میں وہ ''تنہا'' ہیں۔ تنہاؔ سے پہلے کسی نے اُردو نثر کا تذکرہ نہیں لکھا تھا۔

اس کے بعد اُردو نثر و نظم دونوں کی یکجا تاریخیں متعدد لکھی گئیں، جن میں سب سے بڑی اور اچھی مسٹر رام بابو سکسینہ کی انگریزی تالیف، اور اس سے بڑا اور اچھا اس کا اُردو ترجمہ ''تاریخ ادبِ اردو'' (مترجمہ مرزا محمد عسکری بی اے لکھنوی) ہے۔ اسی عرصے میں ڈاکٹر گراہم بیلی (پروفیسر اُردو لندن یونیورسٹی) نے انگریزی میں مختصر تاریخ ادب اُردو مرتب کی (اس کا تذکرہ ''داستان تاریخ اُردو'' میں آچکا ہے) پروفیسر اعجاز حسین (الٰہ آباد یونیورسٹی) کی تالیف مختصر تاریخوں میں بہتر ہے۔

لیکن یہ سب صرف زبان و ادب کی تاریخیں اور مصنفوں کے حالات ہیں۔

تصانیف وتحریرات کے نمونے کسی میں نہیں۔ گویا ''زبانی باتیں'' ہیں۔ اس کمی کو ایک فاضل بزرگ مولانا احسن مارہروی مرحوم (متوفی ۱۹۴۰ء) نے ایک اور صورت سے پورا کیا۔ یعنی ''نمونۂ منثورات'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب شایع کی، جس میں نثر اُردو کے صنف وار نمونۂ تحریر ہیں، مثلاً تصنیف وتالیف، تقریظ، عدالتی تحریر، اخبار، خطوط وغیرہ۔ چونکہ یہ نمونے صدی وار مرتب کیے ہیں، اس لیے گویا ''تاریخِ نثرِ اردو'' بھی ہے اور اپنی نوعیت کی منفرد تالیف ہے۔ ان دو کے درمیان میں مولوی سیّد محمد ایم۔اے۔ حیدرآبادی نے ''فورٹ ولیم کالج'' کے مصنفوں کے حالات اور نمونے ''اربابِ نثرِ اردو'' کے نام سے مرتب کیے۔ اور حق یہ ہے کہ تاریخِ اُردو کے اس دور کا حق ادا کردیا۔ ان کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر کتاب ایسی نہیں ہے جس میں تاریخ کے ساتھ نمونے بھی ہوں۔

کسی مصنف کے طرزِ تحریر، اور اس کے تجزیہ وخصوصیات کا بیان تشنہ رہتا ہے جب تک ہر قسم کی تحریر کے نمونے اور مثالیں پیشِ نظر نہ ہوں، اور ان کا تبصرہ وانتقاد ومطالعہ کی رہنمائی کرنے کے لیے ساتھ نہ ہو۔ میں اس ضرورت کو ایک مدّت سے محسوس کر رہا تھا۔ جس وقت میں نے مرزا عسکری صاحب کا ترجمہ دیکھا جو حسنِ ظاہر میں بھی مطبع نولکشور کی مشاطگی کا دلفریب نمونہ تھا، بے اختیار جی چاہا کہ مرزا صاحب نے جہاں اتنی محنت کی کہ ۹۰۰ صفحوں کا ترجمہ تیار کر دیا اتنی زحمت اور گوارا فرماتے کہ ہر مصنف وشاعر کے جملہ تصنیفات وکلام کے نمونے بھی اضافہ کر دیتے۔ کتاب دو ہزار تین ہزار صفحے کی ہو جاتی، اور اچھا ہوتا، مرزا صاحب اس کے اہل تھے اور مطبع نولکشور کے لیے پانچ ہزار صفحے شایع کر دینا بھی کوئی بات نہ تھی۔

بہر حال میں نے ''داستانِ تاریخِ اُردو'' میں اس کمی کو پورا کرنا چاہا

ہے، تاریخ وارتقائے اُردو کے ساتھ ہر دور کے تمام مشاہیر ادب اور بعض غیر مشہور لیکن ممتاز مصنفوں کے حالات اور ان کی تحریروں کے نمونے درج کیے ہیں اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

بے لاگ اور بے باک تنقید کرنا نہ صرف تصنیف پر، بلکہ ذات مصنف پر بھی (مصنف کی حیثیت سے) اب تک ''پل صراط'' پر گزرنے سے کم نہیں ہے۔ لیکن میں نے اس کی جسارت کی ہے۔ میں نے تصنیفوں اور مصنفوں پر اعتراضات کیے ہیں، دوسروں کے اعتراضات نقل کر کے حسب موقع ان کی تائید یا تردید کی ہے میری تنقیدیں شاید تلخ و بے باک نظر آئیں، لیکن بے لاگ اور بے لوث بھی ثابت ہوں گی۔ میں نے صحیح تعریف اور جائز حمایت بھی ایسی کی ہے کہ کسی دوسرے مؤرخ و تذکرہ نویس نے نہیں کی۔ میرے نزدیک یہ سب ایک تاریخ و تذکرے کے ضروری اجزاء تھے بغیر اس روشنی کے، کسی تصنیف و مصنف کے مطالعے کا صحیح راستہ نظر نہیں آتا۔

مجھے اس تالیف کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں ہے، بلکہ اس کے بعض حصّوں کے نامکمل رہ جانے کا اعتراف ہے۔ جس وقت ۱۹۳۸ء میں اس کی تالیف وطباعت ساتھ ساتھ شروع ہوئی، یہ ارادہ نہ تھا کہ اس قدر طویل و مفصل لکھی جائے۔ یہ ارادہ بعد کو مواقع تفصیل پیش آنے پر قایم ہوا۔ اس لیے ابتدائی حصّہ مختصر رہ گیا۔ پہلے سے پوری تاریخ نثر کے لیے ۱۵۰۰ صفحے تجویز ہوئے ہوتے تو ابتدائی حالات اور پہلے دو دور بھی زیادہ تفصیل سے لکھے جاسکتے تھے۔ اور حصّوں میں بھی، باوجود تحقیق و تفصیل کے، ترقی واضافہ کی گنجایش باقی ہے۔

میں نے اس کتاب میں بے شمار تصانیف اور دوسری مطبوعات سے مدد لی ہے، اور متن یا حواشی میں اس کا حوالہ دے دیا ہے۔ اگر کہیں حوالہ رہ گیا ہے تو وہ

میری عجلت یا غفلت کا نتیجہ ہے۔ قصد و ارادہ شامل نہیں ہے۔ اُردو کی ابتدائی تاریخ کے متعلق فاضل مصنّفین حیدر آباد نے بہترین معلومات فراہم کر دی ہیں۔ ہر مؤلف کے لیے ان کی تصنیف سے استفادہ ناگزیر ہے، میں نے بھی ''اردوئے قدیم'' (مؤلفہ حکیم شمس اللہ قادری) ''دکن میں اردو'' (مؤلفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی)، ''اُردو شہپارے'' (مؤلفہ ڈاکٹر محی الدین زور)، ''اربابِ نثرِ اردو'' (مؤلفہ مولوی سیّد محمد ایم اے) سے اپنی تالیف میں جا بجا مدد لی ہے۔ ان کے علاوہ جن مفصل و مختصر تاریخوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سب میرے پیشِ نظر تھیں۔ ''سیر المصنّفین'' سب سے زیادہ کام کی تالیف ہے، میں نے اس سے کام لیا ہے، اور ہر جگہ حوالے دیے ہیں۔ مولوی عبد الحق صاحب کی بعض تالیفات مثلاً ''چند ہم عصر'' اور مجلّہ ''اردو'' سے بھی میں نے بہت فائدہ حاصل کیا ہے۔ اور بہت سے رسالے خصوصاً ''مخزن'' اور ''زمانہ'' کے قدیم و جدید فائل بہت کام آئے۔ اہل دکن کی سی ''عَلَیْمیات'' لکھوں تو بہت طول امل ہو جائے۔

احباب میں اتفاق سے مجھے ایک ہی صاحب کا ممنون ہونے کا موقع ملا۔ یعنی مفتی انتظام اللہ صاحب صدیقی گوپا موی ثم اکبر آبادی کا۔ آگرہ میں مفتی صاحب اپنے علمی و تصنیفی ذوق و شوق میں انفرادی مرتبہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کتب خانے سے مجھے مطبوعہ و قلمی کتابیں اور مصنفوں کے حالات اور نمونے مرحمت فرمائے۔ اور سب کے ساتھ مفتی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں۔

اس ''داستانِ تاریخِ اُردو'' کی تعریف (مدح نہیں صورت حال) اگر ایک لفظ میں بیان کی جائے تو اس کو ''عجیب'' کہہ سکتے ہیں۔ اصل میں تاریخ و تذکرہ کی کتاب عجیب نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن یہ تالیف اپنی ''ہیئت کذائی'' میں کچھ ایسی ہی بن گئی ہے۔ بہر حال میں اس نوعیت کے لیے کوئی معذرت پیش کرنے کی ضرورت

نہیں سمجھتا۔ اپنی اس کوشش کو میں کوئی ''کارنامہ'' نہیں سمجھتا اس لیے یہ نہیں کہہ سکتا کہ ''کارے کردم'' ہاں کام کرنے کی ایک نئی راہ نکال دی ہے۔

دیگراں آیند ''وکارے'' ہم کنند

حامد حسن قادری
پروفیسر سینٹ جانس کالج
آگرہ

علی پور سیداں (ضلع سیالکوٹ)
یکم رمضان المبارک ۱۳۶۰ھ
۲۳ ستمبر ۱۹۴۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

فہرست مضامین داستان تاریخ اردو

آغاز اُردو سے پہلے

اُردو زبان

آغاز اُردو

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا دورِ قدیم

اُردو نثر کا دورِ اوّل

دکن میں اُردو

نثر کا دوسرا دور

شمالی ہند میں (۱۷۳۲ء یا ۱۷۹۹ء)

یورپین مصنفینِ اُردو

نثر اُردو کا تیسرا دور

میرزا علی لطف

میر بہادر علی حسینی

مظہر علی خاں ولاؔ

مرزا کاظم علی جوانؔ

مولوی امانت اللہ شیداؔ

نثر کا چوتھا دور

۱۸۳۱ء(۱۲۴۶ھ) تا ۱۸۷۰ء(۱۲۸۶ھ)

نثر کا پانچواں دور (۱۸۷۱ء-۱۹۰۰ء)

نثر کا چھٹا دور (غدر کے بعد)

میر ناصر علی خاں دہلوی (۱۸۴۷ء-۱۹۳۳ء)

خواجہ سیّد ناصر نذیر فراق دہلوی (۱۸۶۵ء-۱۹۳۳ء)

اس دور کی نثر پر تبصرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"بذکرِ خدائے زباں آفریں"
۱۹۳۸ء

داستانِ تاریخِ اُردو

۱۹۳۸ء

آغازِ اُردو سے پہلے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے صدہا سال قبل، گوتم بدھ بانیِ بدھ مذہب اور مہابیر بانیِ جین مذہب سے سیکڑوں برس پہلے، آریہ قوم کے ورودِ ہندوستان کے وقت ہندوستان کے قدیم اور اصلی باشندے مختلف صوبوں میں مختلف زبانیں بولتے تھے۔ آریا لوگوں نے اپنی زبان سنسکرت کو رواج دیا۔ سنسکرت میں وسعت و تکمیل کے جوہر تھے۔ ہندوستان میں اس زبان کو اس قدر ترقی ہوئی کہ لسانی وادبی و علمی حیثیت سے دنیا کی بہترین زبانوں میں

اس کا شمار ہے۔ لیکن گردشِ زمانہ سے صدہا سال حکومت کرنے کے بعد سنسکرت کو زوال شروع ہوا، اور مختلف صوبہ وار زبانیں جن کو پراکرت کہتے ہیں، سنسکرت کی جگہ لینے لگیں۔

ان پراکرت زبانوں میں ایک سورسینی پراکرت تھی جو برج یعنی متھرا کے علاقے سے شروع ہو کر پنجاب، سندھ، بہار، مالوہ تک شائع و عام تھی۔ اسی کی ایک شاخ کو برج بھاشا کہتے ہیں یعنی متھرا کی زبان۔ یہ سب سے زیادہ وسیع تھی اور حضرت عیسیٰ کے زمانے سے قبل علمی زبان بن چکی تھی، یعنی اس زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

حضرت عیسیٰ سے نصف صدی قبل اجّین کا مشہور راجہ وکرماجیت گزرا ہے۔ جس کے دربار کا جوہرِ بے بہا کالیداس شاعر تھا۔ اسی راجہ کے دربار کے ایک پنڈت ورارو چی نے برج بھاشا کے قواعد صرف و نحو مرتب کیے تھے۔ یہ کتاب اب تک موجود ہے۔ اور پراکرت پرکاش کے نام سے ۱۸۶۸ء میں لندن میں شائع ہوئی ہے۔ اس دو ہزار سال قبل کی کتاب میں برج بھاشا کے ایسے بہت سے الفاظ موجود ہیں جو ہماری موجودہ اُردو زبان میں شامل ہیں۔

سکندر اعظم نے حضرت عیسیٰ سے ۳۲۵ سال قبل ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت بھی برج بھاشا اور دیگر پراکرتیں ہندوستان میں رائج تھیں۔ راجہ اشوک حضرت عیسیٰ سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے تھا۔ اس کی زبان بھی یہی برج بھاشا تھی، اور اس کے مشہور کتبوں پر یہی زبان پتھر کی لکیر بنی ہوئی ہے۔

عرب و ہندوستان کے درمیان سلسلۂ تجارت: اسلام ۵۶۹ء میں شروع ہوا ہے۔ زمانۂ اسلام سے بہت پہلے عرب و ہندوستان کے درمیان سلسلۂ تجارت قائم تھا۔ عرب سواحلِ ہند پر تجارت کی غرض سے آتے تھے، اپنا مال فروخت کر کے ہندوستان کا مال خرید کر لے جاتے تھے۔ لیکن یہ لین دین صرف مال و متاع تک محدود نہ تھا۔ بلکہ الفاظ کا اَدل بَدل بھی ہوتا تھا، یعنی اشیاء خرید و فروخت کے عربی نام ہندوستان میں رہ کر ہندی تاجروں کی زبان میں مل جاتے تھے اور ہندوستانی نام عرب میں پہنچ کر عربی زبان میں شامل ہوتے تھے۔

مسلمانوں کے ابتدائی حملے ہندوستان پر: ۱۶ ہجری (مطابق ۶۳۷ء) میں جس سال حضرت عمر فاروق ؓ نے بیت المقدس کو فتح کیا، اسی سال مسلمانوں نے ہندوستان کے ساحلِ سندھ پر حملہ کیا۔ لیکن ملک کو فتح نہ کر سکے۔ اس کے بعد دو مرتبہ پھر حملہ آور ہوئے اور پھر ناکام رہے۔ آخر خلافتِ بنواُمیّہ کے آغاز میں ۶۶۴ء (۴۴ھ) میں کابل کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کیا اور کابل سے ملتان تک قبضہ میں کرلیا۔ اب حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سواحل و سرحد کا بہت سا حصہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ سندھ پر بھی چند بار حملے کیے اور ناکام رہے۔ پھر ۷۰۵ء (۸۶ھ) میں محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ پر حملہ کامیاب ہوا۔ اس کے بعد ۷۱۴ء (۹۶ھ) تک مسلسل فتوحات کر کے ملتان تک قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے مسلمانوں کی سلطنت سندھ پر صدیوں قائم رہی۔ اسلامی سلطنت بنی اُمیّہ سے بنی عباس میں منتقل ہوگئی تو سندھ کی اسلامی حکومت بھی خلافتِ عباسیہ کے زیرِ اثر آ گئی اور خلیفہ واثق باللہ (زمانۂ خلافت ۸۴۱ء ﴿۲۲۷ھ﴾ تا ۸۴۷ء ﴿۲۳۳ھ﴾) کے زمانے تک دربارِ خلافت سے سندھ کے حاکم و والی (گورنر) مقرر ہو کر آتے رہے۔ لیکن اس کے بعد خلافتِ بغداد کے ضعف کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی حکومت ہند و سندھ بھی کمزور ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ مسلمان اپنے مفتوحہ ممالک سے باہر نہ پھیل سکے۔ اگرچہ سندھ میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب و معاشرت اور رسوم و زبان سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ ابنِ حوقل اور مسعودی جو دسویں صدی عیسوی (مطابق چوتھی صدی ہجری) میں ہندوستان آئے، اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی وضع اور معاشرت اس قدر یکساں ہے کہ تمیز کرنا مشکل ہے۔ دونوں قوموں میں نہایت اتفاق و ارتباط قائم ہے۔ عربی و سندھی دونوں زبانیں رائج ہیں اور ملتان میں ملتانی کے ساتھ فارسی زبان بولی جاتی ہے۔

تاہم اس زمانے تک دیسی اور بدیسی یعنی برج بھاشا اور عربی و فارسی زبانوں کی ایسی آمیزش نہ ہوئی تھی جو ایک مخلوط زبان کا سنگِ بنیاد ہو سکتی۔

سبکتگین کا پنجاب پر حملہ ۹۸۶ء (۳۷۶ھ): سبکتگین غزنی کا بادشاہ تھا۔ اس نے

پنجاب کے راجہ جے پال پر فوج کشی کی۔ راجہ صلح کرنے پر مجبور ہوا، لیکن صلح توڑ دی۔ اس لیے سبکتگین نے دوبارہ حملہ کیا اور پنجاب سے پشاور تک اس کے قبضے میں آ گیا۔ مسلمان ان ممالک مفتوحہ میں رہنے لگے۔

محمود غزنوی کے حملے ۱۰۰۱ء (۳۹۲ھ) تا ۱۰۲۷ء (۴۱۸ھ) سبکتگین کے بعد اس کے جانشین سلطان محمود غزنوی نے ۲۷ سال میں ۱۷ حملے کر کے پشاور، ملتان، کالنجر، قنوج، متھرا، گجرات پر قبضہ کر لیا۔

غزنوی خاندان کی حکومت (پنجاب میں اُردو کا آغاز) ۱۰۰۱ء (۳۹۲ھ) ۱۱۸۷ء (۵۸۳ھ)

محمود کے بعد سب ممالکِ مفتوحہ ہاتھ سے نکل گئے، لیکن پنجاب پر قبضہ رہا اور دو سو برس کے قریب خاندانِ غزنوی نے پنجاب میں حکومت کی۔ لاہور دار الحکومت رہا۔ مختلف اقوام و ممالک کے مسلمان (عرب، ترک، مغل، ایرانی، افغانی) پنجاب میں مقیم رہے اور اہلِ ہند کے ساتھ تمدن و معاشرت، لین دین، شادی بیاہ ہر قسم کے تعلقات پیدا کیے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے برج بھاشا کے الفاظ اپنی زبانوں میں ملانے شروع کیے، اور اہلِ ہند نے عربی، فارسی، ترکی زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں شامل کیے۔ اس طرح اُردو زبان بننی شروع ہوئی۔ دو سو برس کی مدت اس زبان کی عمومیت و اشاعت کے لیے کافی تھی۔ اس عرصے میں یہ نئی زبان بول چال سے بڑھ کر شاعری میں بھی داخل ہو گئی۔

اُردو زبان

لفظ "اُردو" کی تحقیق یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اس زبان کے لیے اُردو کا لفظ کب سے اختیار کیا گیا۔ یہ قیاس درست نظر آتا ہے کہ مغلوں کے زمانے سے ہندوستان میں اُردو کا لفظ لشکر و لشکر گاہ کے معنوں میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ بابر، اکبر، جہانگیر کے فرمانوں اور سکّوں میں اُردو کا لفظ لشکر کے معنی میں درج ہے۔ بابر اپنے لشکر کو اردوئے نصرت شعار کہتا ہے۔ جہانگیر نے سفر کشمیر کے راستے میں جو سکّہ

بنوایا ہے اس پر یہ شعر کندہ ہے:

باد رواں تا کہ بود مہر و ماہ　　سکہ اردوئے جہانگیر شاہ

شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں شاہی لشکر و لشکر گاہ کو اُردوئے معلّیٰ کہتے تھے اور بازار لشکر کو بازارِ اُردو یا اُردو بازار۔

اُردو زبان کا نام ''زبانِ ہندی'' لیکن اس زمانے تک زبان لشکر کے لیے اُردو کا لفظ مستعمل نہ ہوا تھا۔ سب سے قدیم تحریر حضرت امیر خسرو دہلوی (۱۲۵۵ء ﴿۶۵۳ھ﴾ تا ۱۳۲۵ء ﴿۷۲۵ھ﴾) کی ملتی ہے۔ وہ اپنے دیباچۂ دیوان میں اپنے اُردو کلام کو کلامِ ہندوی فرماتے ہیں۔ دوسری قدیم کتاب سیر الاولیاء ہے جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک خاص مرید حضرت سیّد مبارک معروف بہ میر خورد کی تالیف ہے۔ اس میں حضرت بابا فرید شکر گنج کے ایک قول کے متعلق لکھا ہے: فرمود بزبانِ ہندی۔ اور بھی بعض قدیم تحریروں میں اُردو زبان کو زبانِ ہندی کہا گیا ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ امیر خسرو کی تصانیف سے اکبر و جہانگیر کے زمانے کی تصانیف تک یعنی تیرھویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک جہاں جہاں ہندوستانی زبان کا ذکر آیا ہے، اس کی شان یہ ہے کہ پنجاب کے کسی بزرگ کے قول کو زبانِ پنجابی و زبانِ ملتانی کہا گیا ہے۔ اہلِ گجرات کی زبان کو زبانِ گجراتی، اہلِ دکن کی زبان کو دکنی، نیز بلا امتیاز ان زبانوں کو زبانِ ہندی بھی کہہ دیا گیا ہے، لیکن اہلِ دہلی و نواحِ دہلی کی زبان کو زبانِ ہندی ہی کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برج بھاشا نے جس کی اصلی ٹکسال متھرا و نواحِ متھرا تھی، قدیم زمانے ہی سے مختلف صوبوں میں مختلف شکلیں پیدا کرلی تھیں جو امتیاز کے لیے مقامی ناموں سے معروف تھیں۔ اُردو زبان اگرچہ ان سب بولیوں سے مل کر بنی ہے، پھر بھی اس کا اصلی سانچا متھرا و دہلی کی زبان ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دوسرے صوبوں کی مخصوص زبانیں اب بھی الگ الگ رائج ہیں، لیکن موجودہ صوبجات متحدہ کی زبان وہی ہندی زبان ہے جس نے اب اُردو کی شکل اختیار کرلی ہے۔

اُردو زبان کا نام ''زبانِ ریختہ'' بہر حال شہنشاہ جہانگیر کے زمانے تک زبان کے لیے

اُردو کے لفظ کا رواج ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن زبانِ ہندی کے ساتھ ساتھ زبانِ ریختہ کا استعمال پایا جاتا ہے۔ خصوصاً نظم اُردو کو نظم ریختہ کہتے تھے۔ ''ریختہ'' کے معنی گری پڑی چیز کے ہیں۔ اور فارسی شعراء اس نظم کو بھی ریختہ کہتے تھے جو مختلف زبانوں سے مرکّب ہو۔ قدیم شعرائے اُردو کے کلام میں فارسی و ہندی ملی جلی ہوتی تھیں اس لیے اس کو ریختہ کہنے لگے۔ نیز اس لیے کہ اُردو زبان فارسی، عربی، ترکی، ہندی وغیرہ سب زبانوں سے مل کر بنی ہے۔

شیخ مخدوم سعدی کاکوروی (متوفی ۱۵۹۲ء ﴿۱۰۰۲ھ﴾) اکبر بادشاہ کے زمانے میں تھے۔ ان کی ایک مخلوط غزل ملتی ہے۔ انھوں نے مقطع میں غزل کی زبان کو ریختہ فرمایا ہے:-

سعدی کہ گفتہ ریختہ، در ریختہ دُر ریختہ　　　شیر و شکر آمیختہ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے

اس کے بعد عام نظم اُردو کو ریختہ کہنے لگے۔ اور یہ نام انیسویں صدی عیسوی تک مستعمل رہا۔ مثلاً

(۱)　قائمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
　　ایک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی　　(قائمؔ چاندپوری)

(۲)　خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا　　(میر تقی میرؔ دہلوی)

میرؔ کے شعر سے ضمناً یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ریختہ گوئی کا عام رواج دہلی سے پہلے دکن میں ہوا تھا۔

(۳) مرزا قتیلؔ چار شربت میں فرماتے ہیں:-

''مرزا محمد رفیع سوداؔ در ریختہ پایہ ملّا ظہوری دارد (۱)''

(۴) مرزا غالبؔ دہلوی تک ریختہ کا لفظ مستعمل ہے:-

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ　　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

زبان کے لیے لفظ اُردو کا استعمال　　　غالباً شاہجہاں بادشاہ کے زمانے میں یعنی

---

(۱)　منقول:- آبِ حیات

سترھویں صدی سے اُردو کا لفظ زبان کے لیے استعمال ہوا۔ لیکن شاہجہاں و اورنگ زیب کے زمانے تک اس کا استعمال بہت محدود تھا۔ خود شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اپنے ایک رقعہ میں زبانِ ہندی ہی لکھتے ہیں۔ شاہجہاں نے کوئی تحریر اپنے زمانے کی اُردو زبان کی اپنے قلم سے لکھی ہے۔ اس کے متعلق عالمگیر شاہجہاں کو لکھتے ہیں:۔

''آں فرمانِ عالی کہ در زبانِ ہندی از دستخط خاص رقم فرمودہ شاہد ایں معانی است۔''

عالمگیر کے بعد اٹھارہویں صدی میں جتنے تذکرے شعرائے اُردو کے لکھے گئے، ان میں اُردو کو ہندی یا ریختہ کہا گیا ہے۔ تاہم اس زمانے میں اس نام کا استعمال ثبوت سے خالی نہیں ہے۔ ۱۷۹۱ء ﴿۱۲۰۶ھ﴾ میں مولانا محمد باقر آگاہ دیلوری دکنی نے چند اخلاقی و مذہبی نظمیں دکنی اُردو میں لکھی ہیں۔ ان کی وجہ تصنیف نثر میں بیان کی ہے، اس میں لکھتے ہیں:۔

''ان سب رسالوں میں شاعری نیں کیا ہوں بلکہ صاف وسادہ کہا ہوں اور اُردو کے بھاکے میں نیں کہا ہوں۔ کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں۔ اے بھائی یہ رسالے دکنی زبان میں ہیں۔''

اس سے بھی ثابت ہوا کہ اس زمانے میں غیر صوبوں کے لوگ اُردو دہلی کی زبان کو کہتے تھے۔ اس کی تصدیق اور شہادتوں سے بھی ہوتی ہے۔ جب ولؔی دکھنی دہلی آئے اور شاہ سعد اللہ گلشن سے ملے اور اپنی دکھنی زبان کی غزلیں سنائیں تو بقول قدرت اللہ صاحب تذکرۃ الشعرا کے شاہ صاحب نے ولؔی کو یہ مشورہ دیا:۔

''شما زبان دکنی را گذاشتہ موافق اردوئے معلّٰی شاہ جہاں آباد موزوں بکنید کہ تا موجب شہرت و رواج قبول خاطر صاحب طبعان عالی مزاج گردد۔''

شاہجہاں نے دہلی کا لال قلعہ بنایا، دہلی کا نام شاہجہاں آباد رکھا۔ قلعہ کو قلعۂ معلّٰی اور شاہی لشکر گاہ کو اردوئے معلّٰی کہتے تھے۔ جب اُردو زبان قلعۂ معلّٰی میں داخل ہوئی تو اردوئے معلّٰی کا خطاب پایا۔

آغازِ اُردو

پنجاب میں مسلمانوں کے مستقل قیام، مختلف ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں اور ان کی زبانوں کے اجتماع، اہلِ ہند سے تعلقات نے ایک مخلوط زبان کی ضرورت اور صورت پیدا کر دی۔ اہلِ ہند برج بھاشا بولتے تھے، مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔ ضرورت پیدا ہوتے ہی ایک نے دوسرے کی زبان سیکھنی شروع کر دی ہو گی لیکن گیارہویں صدی عیسوی کی یہ بول چال کتب تاریخ میں محفوظ نہیں ہے۔ البتہ اس زمانے کی نظم سے تصدیق ہوتی ہے۔

فارسی شاعری میں ہندی الفاظ بزمانۂ مسعود غزنوی ۱۰۳۰ء ﴿۴۲۱ھ﴾ ۱۰۴۰ء ﴿۴۳۲ھ﴾: سلطان محمود غزنوی کے فرزند و جانشین سلطان مسعود غزنوی کے زمانے میں ایران کا مشہور شاعر منوچہری ہندوستان آیا، اس نے اپنے فارسی کلام میں ہندی زبان کے بعض الفاظ بجنسہٖ نظم کیے ہیں۔ مثلاً:-

الا تا مومناں دارند روزہ الا تا ہندواں گیرند لنگھن

اس سے زیادہ دلچسپ مثال یہ ہے کہ ایران کے ممتاز صوفی شاعر حکیم سنائیؔ (جن کا انتقال بارھویں صدی کے وسط میں ہوا ہے) کبھی ہندوستان نہیں آئے لیکن بعض ہندی الفاظ کو اپنی نظم میں لکھا ہے۔ مثلاً:-

نہ دراں معدہ جز حسد زندہ نہ دراں دیدہ قطرۂ پانی

فارسی شاعروں کا ہندی کلام بزمانۂ ابراہیم غزنوی ۱۰۵۹ء ﴿۴۵۱ھ﴾ تا ۱۰۹۸ء ﴿۴۹۲ھ﴾: مسعود سعد سلمان اور ابو عبداللہ النکتی ہندوستان میں پیدا ہوئے، فارسی کے شاعر تھے، لیکن ہندی زبان میں بھی شعر کہے اور اپنے ہندی دیوان مرتب کیے۔ یہ کلام اب موجود نہیں ہے لیکن محمد عوفیؔ اور امیر خسرو دونوں اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

ہندی شاعری میں عربی الفاظ بزمانہ پرتھی راج

ولادت ۱۱۵۹ء ﴿۵۵۴ھ﴾ تا ۱۱۹۲ء ﴿۵۸۸ھ﴾ پرتھی راج راجہ اجمیر و دہلی کے وزیر و درباری شاعر چاند بردائی نے ایک طویل ہندی نظم پرتھی راج راسو کے نام سے لکھی ہے، جس میں پرتھی راج اور اس کے زمانے کے تمام حالات، تاریخ و معاشرت، رسم و رواج، رزم بزم وغیرہ کے متعلق لکھے ہیں۔ اس نظم میں بہت سے عربی و فارسی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سلام، بادشاہ، پروردگار، دنیا، مست، کھلک (خلق)، پگام (پیغام)، پھرمان (فرمان) ایک شعر یہ ہے:-

بارہ بانس بنیس میں چار انگل پھرمان اتنے گھر بادشاہ ہے متے چوکے چوہان

محمد غوری کے حملے اور اُردو کی وسعت

۱۱۷۵ء ﴿۵۷۰ھ﴾ تا ۱۱۹۲ء ﴿۵۸۸ھ﴾:

(۱) ۱۱۷۵ء ﴿۵۷۰ھ﴾ میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ملتان اور اوچ فتح کیا۔ (۲) ۱۱۷۸ء ﴿۵۷۳ھ﴾ میں گجرات پر حملہ کیا اور شکست کھائی۔ (۳) ۱۱۸۷ء ﴿۵۸۳ھ﴾ میں خسرو ملک غزنوی حکمران پنجاب پر حملہ کر کے پنجاب پر قبضہ کرلیا۔ (۴) ۱۱۹۱ء ﴿۵۸۷ھ﴾ میں پرتھی راج اور محمد غوری میں بمقام نرائن (علاقہ کرنال) جنگ ہوئی۔ مسلمانوں نے شکست پائی۔ (۵) ۱۱۹۲ء ﴿۵۸۸ھ﴾ میں دوبارہ محمد غوری نے راجپوتوں پر حملہ کیا اور پرتھی راج کو شکست دی۔ اس لڑائی میں پرتھی راج اور اس کا درباری شاعر چاند بردائی دونوں مارے گئے۔ اس جنگ سے اجمیر، دہلی، کول (علیگڈھ) ہانسی، سرستی، سب مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ محمد غوری نے پرتھی راج کے بیٹے گوبند راج کو تخت و تاج دے کر اجمیر کا راجہ بنادیا اور دہلی میں اپنے سپہ سالار قطب الدین ایبک کو اپنا قائم مقام کر کے غزنی کو واپس چلا گیا۔

مسلمانوں کے ساتھ ان کی مادری زبان بھی ہر جگہ پہنچتی رہی اور نئی مخلوط زبان (اُردو) کو ترقی ہوتی رہی۔ مسلمان اب تک اپنی بول چال، خط و کتابت وغیرہ کے لیے

فارسی زبان ہی سے کام لیتے تھے۔ لیکن بوقتِ ضرورت اہلِ ہند کے ساتھ نئی مخلوط زبان (اُردو) میں معاملہ کرتے تھے۔

دہلی میں اُردو کا رواج ۱۱۹۲ء ﴿۵۸۸ھ﴾: اب تک پنجاب و گجرات وغیرہ پر مسلمانوں کا تسلّط ہوا تھا اور اِنھی علاقوں میں اُردو کی اشاعت ہوتی رہی۔ دہلی پر سب سے پہلے ۱۱۹۲ء ﴿۵۸۸ھ﴾ میں قبضہ ہوا۔ قطب الدین ایبک ۱۲۰۶ء ﴿۶۰۳ھ﴾ میں دہلی کا پہلا بادشاہ بنا۔ اسی زمانے سے اہلِ دہلی فارسی زبان سے مانوس ہوئے۔ محمد غوری کے جس لشکر نے قطب الدین کی سپہ سالاری میں دہلی پر قبضہ کیا اس میں کثیر تعداد ان مسلمانوں کی تھی جو سالہا سال سے پنجاب میں رہتے تھے۔ اور پنجاب کی مقامی زبان (جو برج بھاشا ہی کی ایک صورت تھی) بولتے یا بول سکتے تھے۔ دہلی کی مقامی زبان بھی برج بھاشا ہی کی ایک شکل تھی اور پنجاب کی زبان سے اسی قدر مختلف تھی جتنی بُعدِ مسافت امتدادِ زمانہ اور لب ولہجہ کے اختلاف سے ہر زبان ہو جاتی ہے۔ اب دہلی کی فضا میں دہلوی لب ولہجہ کو غلبہ ہوا اور دہلی کی بھاشا، پنجاب کی بھاشا، عربی، فارسی سب زبانیں ملنی شروع ہوئیں۔ اور دہلوی اُردو کی ابتدا ہوئی۔

اُردو پر اولیاء اللہ کا فیضان اُردو زبان کی ترویج واشاعت میں اولیاء اللہ کے فیض وکرامت کو بھی بڑا دخل ہے۔ مسلمانوں کے ابتدائے قیام ہند سے ہی صوفیائے کرام ہندوستان تشریف لائے اور اپنے نورِ باطن سے اہلِ ہند کے دل وجان کو روشن کرنا شروع کیا۔ ان بزرگوں کی نظر میں ملک وقوم، مذہب وملّت کی کوئی قید نہ تھی۔ ان کا فیضان مسلم و ہندو سب پر یکساں تھا، کتنے ہندو مسلمان ہوئے اور اولیاء اللہ سے فیض حاصل کیا۔ اسی فیضیابی کی خاطر اگر چہ اہلِ ہند نے فارسی کی مشق بہم پہنچائی، لیکن فیض رسانی کے لیے اولیاء اللہ کی زبان فیض ترجمان پر بھی اکثر ہندی الفاظ جاری ہوئے۔

(۱) حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ (متوفّی ۱۰۶۳ء ﴿۴۵۶ھ﴾) حکومت غزنویہ کے زمانے میں لاہور تشریف لائے، مزارِ پاک بھی وہیں ہے۔

(۲) حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (۱۱۴۲ء ﴿۵۳۷ھ﴾ تا ۱۲۳۵ء ﴿۶۳۳ھ﴾) راجہ پرتھی راج کے زمانے میں اجمیر تشریف لائے۔ داتا صاحب اور خواجہ صاحب کا کوئی

قول ہندی زبان کا نہیں ملتا۔ تاہم خواجہ اجمیری ؒ کے تکلم زبانِ ہندی کے متعلق شہادت ملتی ہے۔ یعنی ملک محمد جائسی کی نظم اکھر وتی کا شارح تمہید شرح میں لکھتا ہے:۔☆

''گراں نکند کہ ہیچ اولیاء اللہ بزبانِ ہندی تکلم نکردہ زیرا کہ اوّل از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملت والدین قدس اللہ سرہٗ بدیں زبان سخن فرمودہ۔''

(۳) حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (۱۱۸۶ء ﴿۵۸۲ھ﴾ تا ۱۲۳۶ء ﴿۶۳۴ھ﴾) قطب الدین ایبک کے زمانے میں دہلی تشریف لائے، خواجہ اجمیری کے خلیفہ اور بابا شکر گنج کے پیر و مرشد تھے۔

(۴) حضرت بابا فرید شکر گنجؒ (۱۱۸۶ء ﴿۵۸۲ھ﴾ تا ۱۲۶۵ء ﴿۶۶۴ھ﴾) ☆☆ نے غلام خاندان کی حکومت کے زمانے میں پاک پٹن (پنجاب) میں سکونت اختیار فرمائی، خواجہ بختیار کاکیؒ سے فیض باطن پایا، پنجاب، بلکہ تمام ہندوستان کو اپنے نورِ باطن سے منور فرمایا۔ بابا صاحب کے زمانے میں مسلمانوں کے فتح پنجاب و حکومت ہند کو دو سو برس کے قریب گزر چکے تھے۔ اُردو زبان کی تشکیل ہو چکی تھی اور رواج بہت بڑھ گیا تھا۔ پھر خود بابا صاحب کثیر الاولاد تھے۔ ان کے صدہا خلفاء اور ہزارہا مرید پنجاب اور تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اہلِ ہند کی تعلیم و تلقین کے لیے بابا صاحب ہندی زبان سے بھی کام لیتے تھے۔ چونکہ نہایت مقبول اور کثیر الفیضان بزرگ تھے اس لیے سب اولیاء اللہ سے زیادہ ان کے اقوال و اشعار مشہور ہیں مثلاً:۔

☆ ''اُردو زبان کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام'' مؤلفہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے۔ سکریٹری انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد، دکن۔

☆☆ حضرت بابا فرید شکر گنجؒ کی تواریخ ولادت و وفات میں مؤرخوں کا بڑا اختلاف ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے سالِ ولادت ۵۶۹ھ لکھا ہے اور شاہجہاں بادشاہ کے زمانے کے ایک مصنف صاحب سیر الاقطاب نے تاریخ ولادت لفظ ''مخدوم'' سے نکالی ہے جس سے ۶۹۰ھ نکلتا ہے۔ اگر ولادت و وفات کے یہ دونوں سال صحیح مانے جائیں تو بابا صاحب کی عمر ۱۲۱ سال کی ہوتی ہے۔ لیکن کسی تذکرے سے یہ عمر ثابت نہیں ہوتی۔ ہمارے سنہ خزینۃ الاصفیاء سے ماخوذ ہیں۔

(ا) سیر الاولیاء مؤلفہ مولانا سیّد مبارک معروف بہ میر خورد میں درج ہے:-

شیخ شیوخ العالم قدس سرۂ العزیز (یعنی بابا فرید شکر گنج) فرمود بزبانِ ہندی ''پوتوں کا چاند بھی بالا ہے۔'' یعنی ماہ شب چہاردہم دراول شب خورد می باشد کہ بتدریج بکمال می رسد۔(۱)

(ب) ایک مرتبہ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ جسم میں عقل کا مقام کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا ''بیچ سر کے۔''

(ج) ایک پرانی بیاض میں باباصاحب کی یہ نظم دستیاب ہوئی:-

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک — پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش بہلت سے گر بڑے ہوتے — بوکڑواں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں — گائے بیلاں بھی واصلاں ہوجائیں
عشق کا رموز نیارا ہے — جز مدو پیر کے نہ چارہ (۲) ہے

(د) بابا فرید شکر گنج کی ایک غزل ریختہ بھی ملی ہے:-

وقت سحر وقت مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
با تن تنہا چہ روی در زمیں — نیک عمل کن کہ وہی سات ہے

پند شکر گنج بدل جاں شنو
ضائع مکن عمر کہ ہیہات (۳) ہے

ان کے علاوہ بہت سے پنجابی زبان کے اشعار پنجاب میں زبان زدخلائق ہیں۔ بعض اشعار واقوال میں ذکر کے طریقے تعلیم فرمائے ہیں باباصاحب کے بعض اعمال محفوظ ہیں۔خاکسار راقم بھی بابا شکر گنج کی اولاد میں ہے۔راقم کے خاندان میں باباصاحب کا ایک خاص عمل رائج ہے جو اُس زمانے کی اُردو زبان میں ہے۔

(۵) حضرت شاہ بوعلی قلندر پانی پتیؒ (متوفی ۱۳۲۴ء ﴿۷۲۴ھ﴾)

---

(۱)(۲)(۳) یہ سب اقوال مولوی عبدالحق صاحب کی تالیف مذکورہ بالا سے ماخوذ ہیں۔

سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں تھے۔ایک مرتبہ حضرت امیر خسرو حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں گئے اور کچھ گانا سنایا۔شاہ صاحب خوش ہوئے اور اپنا کلام امیر صاحب کو سنایا۔امیر اس کو سن کر آبدیدہ ہوئے۔حضرت نے فرمایا تُرکا کچھ سمجھ دار ہے۔ امیر خسرو نے کہا اسی لیے تو روتا ہوں کہ کچھ نہیں سمجھتا۔

حضرت شاہ بوعلی قلندر کی زبان مبارک سے مبارز خاں کے ارادۂ سفر کے موقعہ پر یہ دوہا نکلا تھا:-

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کہ بھور کدھی نہ ہوئے

اسی مضمون کو آپ نے فارسی میں اس طرح ادا کیا ہے

من شنیدم یار من فردا رود راہِ شتاب　　　یا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب(۱)

(۶) حضرت نظام الدین اولیاء(۱۲۳۶ء﴿۶۳۴ھ﴾تا ۱۳۲۵ء﴿۷۲۵ھ﴾)خلیفۂ حضرت بابا فرید شکر گنج و پیر و مرشد حضرت امیر خسرو سے کوئی قول ہندی زبان کا منقول نہیں ہے لیکن ایک مرتبہ آپ نے فرمایا تھا:-

''کلام حق را در روزِ میثاق بآہنگ پوربی شنیدم''(۲)

(۷) حضرت امیر خسرو(۱۲۵۵ء﴿۶۵۳ھ﴾تا ۱۳۲۵ء﴿۷۲۵ھ﴾) پٹیالی (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین محبوب الٰہی سے تربیت باطن حاصل کی۔سلطان غیاث الدین بلبن (خاندان غلامان) سے سلطان محمد تغلق تک گیارہ شاہان دہلی کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت کی،اس زمانے میں پنجاب و بنگال کا سفر کیا،جنگوں میں شریک ہوئے۔امیر خسرو ان باکمال و منتخب ہستیوں

---

(۱) یہ اقوال بھی مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب سے ماخوذ ہیں

(۲) از مضمون مولوی افتخار عالم صاحب مارہروی مطبوعہ رسالہ اُردو بابت اپریل ۱۹۲۱ء

میں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ صد ہا سال کے بعد کبھی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ سپاہی بھی تھے اور عالم بھی، دنیادار بھی تھے اور ولیِ کامل بھی، شاعر بھی تھے اور ماہر موسیقی بھی، عاشق بھی تھے اور زندہ دل بھی، ہندوستان کے فن موسیقی میں جدتیں پیدا کیں، فارسی زبان کے تین دیوان مرتب کیے، اور آٹھ مثنویاں لکھیں۔ ہندی زبان میں بہت کچھ کہا جس کا ذکر اپنے دیوان کے دیباچے میں کیا ہے لیکن وہ ہندی کلام اب محفوظ نہیں ہے۔ بعض گیت، دوہے، پہیلیاں انملیاں، کہہ مکرنیاں ان کے نام سے مشہور ہیں لیکن کسی تاریخی سند سے ثابت نہیں ہوتا کہ انہی کی تصنیف ہیں۔ زبان ریختہ کی بعض غزلیں اور قطعے البتہ انہی کے ہیں۔ یہ تو یقینی ہے کہ امیر صاحب ہندی زبان بے تکلف بول سکتے تھے، لیکن یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندی زبان سے خاص محبت تھی اس لیے کہ ہندی الفاظ اپنی فارسی نظموں میں کثرت سے لکھتے ہیں۔ مثلاً:-

(ا) اے دہلی والے بتان سادہ
پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

(ب) یک گل بیل و دہ دیگر دروں
گل ز گل و گل ز گل آید بروں

(ج) صفتِ بیڑہ تنبول کہ نزد ہمہ خلق
بہ ازاں نیست نباتے بہمہ ہندوستاں

(د) ہندو بچہ بیں کہ عجب دھرے چھے
بر وقت سخن گفتن مکھ پھور جھرے چھے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم
گفتا کہ اے رام ترک کائیں کرے چھے

(ہ) تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے از دست و زباں چرب او واویلے
خالے بلبش دیدم و گفتم کہ تل است گفتا کہ برو نیست دریں تل تیلے

(و) گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی

از ہر دو لبت شہد و شکر می ریزد ہر گاہ بگوئی کہ دہی(۱) لیہو دہی

(ز) زر گر پسرے چو ماہ پارا کچھ گھڑلے سنوارلے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

(ح) خوار شدم زار شدم لُٹ (۲) گیا در غم ہجر تو کمر توتہ(۳) ہے
یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من بے گنہ ہم ساتھ عجب روتہ(۴) ہے
روئے تو رونق شکن آفتاب سرو بہ پیش قد تو بوتہ(۵) ہے
گاہ زخسرو تو نہ گفتی کہ بیٹھ(۶) وہ چہ کند بھاگ مرا پھوتہ(۷) ہے

(ط) شباں ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکا یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سُناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

(ی) جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اُتر ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر
میرا جو من تم لیا تم نے اُٹھا غم کوں دیا غم نے مجھے ایسا کیا جیسے پتنگا آگ پر

(ک) پہیلی

(۱۱) بالا تھا جب سب کو بھایا بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں بوجھو نہیں تو چھوڑو گاؤں

یہ پہیلی اس طرح بنائی ہے کہ اسی میں اس کی بوجھ موجود ہے لیکن بظاہر نظر نہیں آتی۔ امیر خسرو نے اس طرح کی بہت سی پہیلیاں کہی ہیں اور ان کو بڑی ذہانت کے ساتھ موزوں کیا ہے۔ اس کے بوجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ چراغ جلانے کو دیا بالنا کہتے ہیں، اور چراغ بجھنے کے لیے دیا بڑا ہونا بولتے ہیں۔ اب پہلے شعر کے یہ معنی ہوئے کہ جب دیا بالا تھا (یعنی چراغ جلایا تھا) تو سب کو بھایا۔ جب دیا بڑا ہوا (یعنی چراغ بجھ
لو

---

(۱) دہی لو دہی (۲) لُٹ گیا (۳) ٹوٹا (۴) روٹھا (۵) بوٹا (۶) بیٹھ (۷) پھوٹا

گیا) تو کچھ کام نہ آیا۔ تیسرے مصرع کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں:۔ "خسرو کہہ کہ اس کا نام دیا ہے۔" اس طرح بوجھ بھی بتادی۔

اگرچہ ان پہیلیوں کا امیر خسرو کی تصنیف سے ہونا کسی معتبر ذریعہ سے تحقیق نہیں ہوا، لیکن امیر خسرو نے اپنی تصنیف اعجازِ خسروی میں زبان ومحاورہ، ادب وبلاغت کے جو لطائف ونوادر پیدا کیے ہیں ان پر قیاس کر کے ان پہیلیوں، کہہ مکرنیوں، انمیلوں، دوہوں، گیتوں، نقلوں کو ظن غالب کے ساتھ امیر خسرو سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

(ل) یہی حال امیر خسرو کی مشہور تصنیف خالق باری کا ہے کہ اس کے لیے بھی کوئی معتبر شہادت تاریخی نہیں ہے۔ لیکن اس کا ان کی تصنیف ہونا تعجب بھی نہیں۔ "خالق باری"، منظوم نعت کی کتاب ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

خالق باری سرجن ہار　　　واحد ایک بدا کرتار

(م) حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر (متوفی ۱۲۶۵ء ﴿۶۶۴ھ﴾) حضرت بابا فرید شکر گنج کے بھانجے اور داماد تھے۔ پیران کلیر شریف میں مزار مبارک ہے۔ "سیر الاقطاب" (مصنفہ ۱۶۴۶ء ﴿۱۰۵۶ھ﴾ بعہد شاہجہاں) سے منقول ہے کہ حضرت مخدوم صابر صاحب کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ فارسی میں احمد اور ہندی میں صابر تخلص فرماتے تھے۔ مصنف سیر الاقطاب نے "زبانِ ہندی" کا صرف یہ شعر درج کیا ہے:۔

اس طرح اس میں ڈوب اے صابر　　　کہ بجز ہو کے غیر ہو نہ رہے

اس سات سو برس پہلے کی زبان وہی ہے جو آج صحیح وفصیح اُردو کی ہے۔ اس لیے اس شعر کا انتساب مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔

(ن) حضرت شیخ سراج الدین عثمان معروف بہ اخی سراج (متوفی ۱۳۵۷ء ﴿۷۵۸ھ﴾) حضرت سلطان الاولیاء کے مرید تھے۔ ان کے وصال کے بعد بنگالہ سے دہلی آئے اور خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے خلافت حاصل کی۔ خواجہ صاحب نے حکم دیا "بنگالہ جاؤ"، شیخ صاحب نے عذر کیا کہ وہاں شیخ علاء الدین قل پہلے سے موجود ہیں۔ میری کیا ضرورت ہے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "تم اوپر وے تل۔"

(س) حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (متوفی ۱۳۸۰ء ﴿۷۸۲ھ﴾) ملک بہار کا ایک قصبہ منیر آپ کا وطن مبارک ہے۔ پوربی اور ہندی شاعر تھے۔ ان کے کچھ منتر دفع زہر و امراض کے لیے مشہور ہیں۔ خاکسار راقم کے خاندان میں بھی ایک منتر رائج ہے جس کی بڑی لمبی عبارت ہے۔ اس کے آخر میں یہ دُہرا ہے:-

کالا ہنسا نر ملے بسے سمندر تیر پنکھ پسارے بس ہرے نرل کرے سریر(۱)

ہمیں تحقیق نہ تھی کہ یہ منتر اور شعر کس کا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب مذکورہ سے معلوم ہوا کہ یہ شعر حضرت یحییٰ منیری کا ہے۔ مولوی صاحب نے حضرت کا ایک یہ دُہرا بھی نقل کیا ہے:-

شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے گرد چھوئیں دربار کی سو درد دور ہو جائے

اُردو میں سب سے پہلی تصنیفِ نثر ۱۳۰۸ء ﴿۷۰۸ھ﴾

خواجہ سیّد اشرف جہانگیر سمنانی نے (جن کا مزار کچھوچھا شریف علاقہ اودھ میں ہے) اُردو میں ایک رسالہ اخلاق و تصوّف پر ۱۳۰۸ء ﴿۷۰۸ھ﴾ میں تصنیف کیا۔ میر نذر علی درد کاکوروی رسالہ نگار لکھنؤ بابت دسمبر ۱۹۲۵ء میں لکھتے ہیں کہ.......... سیّد اشرف جہانگیر نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہہ الدین کے ارشادات کو اُردو زبان میں (جس کو اس زمانے میں "ہندی زبان" کہا کرتے تھے) خود جمع کیا ہے۔ میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحہ کی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۱۸ کی ایک عبارت کا ٹکڑا یہ ہے:-

"اے طالب آسمان و زمین سب خدا میں ہے، ہوا سب میں خدا ہے۔ جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ کچھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات۔"

نثر اُردو میں اس سے پہلے کوئی کتاب ثابت نہیں ہے۔ سیّد اشرف صاحب

---

(۱) میں نے یہ شعر اپنے خاندان کی روایت کے مطابق لکھا ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق کے منقول شعر سے ایک آدھ لفظ میں اختلاف ہے۔

۱۲۸۹ء ﴿۶۸۸ھ﴾ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰ سال کی عمر کو (بحساب قمری) پہنچ کر ۱۴۰۵ء ﴿۸۰۸ھ﴾ میں وفات پائی۔ خالق باری کا سال تصنیف معلوم نہیں۔ لیکن چونکہ امیر خسرو سیّد اشرف سے عمر میں ۳۵ سال بڑے ہیں اس لیے خالق باری کو مقدم رکھا گیا ہے۔ ممکن ہے سیّد اشرف صاحب کی کتاب پہلے لکھی گئی ہو اور اُردو زبان میں تصنیف اوّلین یہی ہو بہر حال اوّلیت انہی دونوں میں دائر ہے۔ بعض محققین کی نظر میں ''خالق باری'' کا انتخاب حضرت امیر خسرو سے مشتبہ ہے۔ اس نظریہ کی بنا پر اگر خالق باری کسی بعد کے مصنف کا کارنامہ ہے تو پھر سیّد اشرف جہانگیر کا رسالہ تصوف ہی اُردو کی پہلی کتاب ہے۔

اب تک ارباب تحقیق متفق الرائے تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی (بارہویں صدی ہجری) سے پہلے تصنیف وتالیف نثر کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ فخر دکن کو حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہند سے چار سو برس پہلے اُردو کی تصانیف کا آغاز ہوا۔ اب سیّد اشرف جہانگیر کے رسالہ تصوف کی دریافت سے وہ نظریہ باطل ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ دکن میں اُردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو اور سیّد اشرف جہانگیر نے نظم ونثر دونوں کی بنیاد ڈال دی تھی۔

فتح دکن (دکن میں اُردو کا آغاز) ۱۳۱۲ء ﴿۷۱۲ھ﴾

علاء الدین خلجی بادشاہ دہلی کے غلام سردار ملک کافور نے ۱۳۰۶ء ﴿۷۰۶ھ﴾ میں دکن پر حملے شروع کیے اور ۶ سال میں ۱۳۱۲ء ﴿۷۱۲ھ﴾ تک تمام مہاراشٹر (ملک دکن) دہلی میں شامل کر لیا اور مسلمانوں کی حکومت راس کماری تک وسیع ہو گئی۔

یہ اسلامی لشکر جو دہلی سے دکن گیا اُردو زبان ساتھ لے کر گیا۔ ان لوگوں کے دکن میں رہنے کی وجہ سے دکن میں اُردو کا آغاز ہوا۔ اسی نے اہلِ دکن کو اُردو سکھائی۔ اس زمانے سے پہلے وہاں اُردو کا رواج شروع نہ ہوا تھا اور واقعات سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس وقت تک پنجاب، دہلی اور تمام شمالی ہند میں اُردو کا آغاز ہو چکا تھا اور تصنیف وشاعری بھی شروع ہو چکی تھی۔

گجرات میں اُردو کا آغاز ۱۲۹۷ء ﴿۶۹۶ھ﴾

اس سال میں علاء الدین خلجی نے گجرات کو فتح کیا۔ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد حکومت میں گجرات سلطنت دہلی کا صوبہ رہا۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۱۳۴۴ء ﴿۷۴۴ھ﴾ میں گجرات میں بغاوت ہوئی اور بادشاہ سے فرو نہ ہو سکی۔ گجرات میں خود مختاری کی کوشش جاری رہی۔ آخر فیروز تغلق کے بعد ۱۳۹۱ء ﴿۷۹۳ھ﴾ میں ظفر خاں حاکم گجرات بنا کر بھیجا گیا۔ وہ کچھ عرصہ کے بعد خود مختار بن بیٹھا اور اس کی اولاد نے تقریباً دو سو برس یعنی ۱۵۷۳ء ﴿۹۸۰ھ﴾ تک حکومت کی۔

مسلم فاتحوں کے ساتھ ہمیشہ ہر ملک میں مسلمان علماء و زہاد اور اولیاء اللہ بھی پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح ہر مقام پر ہر زمانے میں اسلامی تمدن و معاشرت اور اسلامی حکومت و شریعت کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم ظاہر و باطن بھی رائج و شائع ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ گجرات میں بھی ابتدائے فتح گجرات سے ہی اربابِ علم و اہلِ دل کا اجتماع شروع ہو گیا تھا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ شیخ گنج العلم تحصیل علم کے لیے گجرات گئے تھے۔ گجرات میں مسلمانوں کے سبب سے اُردو کی ابتدا ہوئی اور آہستہ آہستہ ترقی ہوتی رہی۔

(۱) ۱۴۰۰ء ﴿۸۰۳ھ﴾ میں حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشت کے پوتے سیّد برہان الدین عبداللہ بن محمود آغازِ شباب میں پٹن (گجرات) میں تشریف لائے۔ پھر جب سلطان احمد بادشاہ گجرات (۱۴۱۱ء ﴿۸۱۴ھ﴾ تا ۱۴۴۲ء ﴿۸۴۵ھ﴾) نے احمد آباد آباد کیا تو سیّد صاحب پٹن سے احمد آباد آ کر سکونت پذیر ہو گئے۔ گجرات میں آپ کا لقب قطب عالم اور آپ کے فرزند اکبر سیّد سراج الدین محمد بن عبداللہ کا لقب شاہ عالم مشہور ہے۔ حضرت قطب عالم کے متعلق مذکور ہے کہ ایک روز آپ پچھلی رات کو اُٹھ کر باہر نکلے تو کسی چیز سے ٹھوکر لگی آپ نے فرمایا: لوہ ہے یا لکڑ یا پتھر یا کیا ہے۔ قطب عالم کا وصال ۱۴۵۳ء ﴿۸۵۷ھ﴾ میں ہوا۔

(۲) جب شاہ بارک اللہ چشتی احمد آبادی نے بشارت نبوی کی تعمیل میں قطب عالم

کے فرزند اکبر کو ''شاہ عالم'' کا لقب دیا اور قطب عالم نے بشارت خواب اور لقب کا واقعہ سنا تو فرمایا کہ ''چشتیوں نے پکائی اور بخاریوں نے کھائی۔'' شاہ عالم نے ۱۴۷۵ء ﴿۸۸۰ھ﴾ میں وصال فرمایا۔

(۳) شیخ وجیہہ الدین گجراتی (عالم درویش کامل) کے چند مقولے بحر الحقائق میں درج ہیں۔ مثلاً (الف) ''اس سیس ہور کیا خوب ہے۔ اس دنیا میں کہ دل خدا سوں مشغول ہووے۔'' (ب) ''عارف سے کہویں جو خدا سے بھریا ہووے۔''

اُردو کی اہمیت و مقبولیت ۱۳۳۳ء ﴿۷۳۳ھ﴾

(۱) ابن بطوطہ طنجہ (افریقہ) کا رہنے والا تھا۔ اس کی مادری زبان عربی تھی۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۱۳۳۳ء میں ہندوستان آیا اور عربی زبان میں اپنا سفر نامہ لکھا۔ اس نے پردہ، پروانہ، بارگہ، سراچہ، ناخدا وغیرہ فارسی الفاظ کے ساتھ بہت سے اُردو کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ مثلاً ٹٹو، منڈی، ڈولہ، کہار، کنگھر۔ ان الفاظ کے ہندی حروف کو عربی حرف سے بدل لیا ہے۔ بعض جگہ الفاظ میں تغیر بھی کر لیا ہے۔ مثلاً:- کشری (کھچڑی)، جوتری (چودھری) جوکہ (جوگی)، قطارہ (کٹارہ)۔

۱۴۱۹ء ﴿۸۲۲ھ﴾

(۱) مُلّا نذر محمد دہلوی معروف بہ ''قاضی خاں'' نے ۱۴۱۹ء میں فارسی زبان کی کتاب لغت ادات الفضلا لکھی۔

۱۴۴۸ء ﴿۸۵۲ھ﴾

(۲) قوام الدین ابراہیم فاروقی نے بنگال میں سلطان رکن الدین باربک حاکم بنگالہ کے زمانے میں ایک لغت فارسی ۱۴۴۸ء میں مرتب کیا اور شرف نامہ اس کا نام رکھا۔

۱۵۱۸ء ﴿۹۲۴ھ﴾

(۳) شیخ لاد دہلوی (متوفی ۱۵۱۹ء ﴿۹۲۵ھ﴾) نے سلطان ابراہیم لودی کے

زمانے میں موید الفضلاء کے نام سے فارسی لغت مدون کیا۔

ان تینوں لغات میں اور خصوصاً موید الفضلاء میں صدہا فارسی الفاظ کے معنی اُردو میں بیان کیے ہیں۔ اس طرح موید الفضلاء میں تقریباً آٹھ سو اُردو کے الفاظ آگئے ہیں۔ اُردو زبان کی اہمیت وضرورت کی یہ کچھ کم دلیل نہیں ہے۔

۱۴۴۰ء ﴿۸۴۳ھ﴾ تا ۱۵۱۸ء ﴿۹۲۴ھ﴾

(۴) کبیر داس بنارس کے مسلمان جولاہے تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ کسی برہمن کے لاوارث بچے تھے۔ ایک مسلمان جولاہے اور اس کی بیوی نے بیٹا بنا کر عالم شیر خوارگی سے پرورش کی۔ بڑے ہوکر گرو رامانند کے چیلے ہوگئے اور پھر اپنا الگ مذہب کبیر پنتھ نکالا۔ ان کے پند آمیز دوہے کثرت سے مشہور ہیں جن میں عربی وفارسی الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً

کبیر شریر سرائے ہے کیوں سوئے سکھ چین
کوچ نقارہ سانس کا باجت ہے دن رین
کانکر پاتھر جوڑ کے مسجد لیے چنائے
تا چڑھ مُلّا بانگ دے، کیا بہرا ہوا خدائے
دین گوایو دنی سے، دنی نہ آیو ہاتھ — پیر کہاڑی مار لو گا پھل اپنے ہاتھ
دنیا — غافل

کبیر داس سے چند غزلیں بھی منسوب ہیں لیکن ان کی تاریخی سند مشتبہ ہے۔ اگر یہ غزلیں کبیر داس کی ہیں تو پھر دکن کی اولیت شعر وغزل کے سب نظریے باطل ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ومقطع یہ ہے:-

ہمن ہے عشق مستانہ، ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یا جگ میں، ہمن دنیا سے یاری کیا
کبیرا عشق کا ماتا، دوئی کو دور کر دل سے
جو چلنا راہ نازک ہے، ہمن کو بوجھ بھاری کیا

۱۴۶۹ء ﴿۸۷۴ھ﴾ تا ۱۵۳۸ء ﴿۹۴۵ھ﴾

(۵) گرونانک سکھ مذہب کے بانی کبیر کے ہم عصر تھے۔ کبیر کی تعلیم اور مذہب اور شاعری سے متاثر ہوئے۔ ان کے دوہوں یا ہندی اشعار میں بھی عربی فارسی کی آمیزش اُردو کی رفتار ترقی و مقبولیت کو ثابت کر رہی ہے۔ مثلاً

سانس مانس سب جیو تمھارا　　تو ہے اکھرا پیارا
نانک شاعر یو کہت ہے　　تجے پروردگارا

۱۵۲۶ء ﴿۹۳۲ھ﴾

(۶) تاریخ داؤدی میں منقول ہے کہ جب جنگ پانی پت (۱۵۲۶ء) میں بابر نے سلطان ابراہیم لودی پر فتح پائی اور اس کا سر کاٹ کر بابر کے سامنے لایا گیا تو حاضرین میں سے کسی نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھے:-

نو سے اوپر تھا بتیسا　　پانی پت میں بھارت دیسا
اُٹھیں رجب سکروارا　　بابر جیتا براہیم ہارا
(یعنی ۸/ رجب ۹۳۲ھ روز جمعہ)

۱۴۸۳ء ﴿۸۸۸ھ﴾ تا ۱۵۳۰ء ﴿۹۳۷ھ﴾

(۷) سلطنت مغلیہ کے پہلے بادشاہ بابر نے ۱۵۱۹ء ﴿۹۲۵ھ﴾ میں پہلا کامیاب حملہ سندھ پر کیا اور تیسرا حملہ ۱۵۲۶ء ﴿۹۳۲ھ﴾ میں کر کے تخت دہلی پر قبضہ کر لیا۔ بابر صاحبِ سیف و قلم تھا، ترکی اور فارسی زبان کا شاعر تھا۔ دونوں زبانوں کا دیوان یک جا طبع ہو گیا ہے۔ ترکی زبان میں اپنے سوانح حیات ایک ضخیم کتاب تزکِ بابری میں مرتب کیے ہیں۔ قیام ہندوستان کے دوران میں اُردو زبان سے بھی مناسبت پیدا کی۔ اپنی تصنیف میں کثرت سے اُردو الفاظ لایا ہے۔ مثلاً ہاتھی، پان، پنکھا، جامن، کمرک، کیوڑا، کروندا، چرونجی، گلہری، مور، دوپہر وغیرہ اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک ترکی شعر میں بھی اُردو الفاظ اور اُردو فعل استعمال کیا ہے۔ لکھتا ہے:-

مجکانہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی   فقرا بلیغہ بس بولغو سید در پانی وروتی

۱۵۳۵ء ﴿۹۴۲ھ﴾

(۸) اُردو کے رواج اور عام بول چال کا ایک عجیب ودلچسپ ثبوت یہ واقعہ ہے کہ ۱۵۳۵ء میں ہمایوں بادشاہ نے بادشاہ مالوہ و گجرات بہادر شاہ پر حملہ کیا۔ اس کا سپہ سالار رومی خاں مغلوں سے خفیہ طور پر مل گیا۔ رومی خاں کی غداری و بیوفائی سے بہادر شاہ کو شکست ہوگئی۔ ہمایوں کو اسباب غارت میں بہادر شاہ کا ایک طوطا بھی ہاتھ آیا۔ طوطا انسان کی طرح باتیں کرتا تھا۔ فتح کے بعد ہمایوں کے دربار میں طوطے کا پنجرہ رکھا ہوا تھا۔ رومی خاں دربار میں حاضر ہوا تو طوطا اس کو دیکھتے ہی چلا اٹھا:-

''پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام، پھٹ پاپی نمک حرام''

۱۵۳۲ء ﴿۹۳۸ھ﴾ تا ۱۶۲۴ء ﴿۱۰۳۲ھ﴾

(۹) تلسی داس مصنف راماین اکبر و جہانگیر کے زمانے میں تھا۔ راماین ہندی کی نظم ہے۔ خالص ہندوؤں کے قصص و حکایات، تہذیب و معاشرت، رزم و بزم اس کا موضوع ہے لیکن عربی و فارسی الفاظ اس قدر عام و مقبول تھے کہ تلسی داس راماین میں بھی کہیں کہیں بیساختہ لکھ گیا ہے۔ تلسی داس نے اخلاقی دوہے بھی کہے ہیں ان میں تو کثرت سے عربی و فارسی الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً:-

جو بینا میں نا کہے، بیٹھی شکر کھائے   جو بکری میں میں کہے، سہج ہی ماری جائے
تلسی سیدھی چال سے پیادہ ہوئے وزیر   فرزیں شاہ نہ ہو سکے، گت ٹیڑھی تاثیر

(۱۰) سورداس بھی اسی زمانے کا شاعر ہے۔ اس کے کلام میں بھی عربی فارسی کی کثرت ہے۔ مثلاً:-

کھیت بہت کاہے تم تانے، سین سی آواج (آواز)

دیونہ جات پار اتر آوے، چاہت چڑھیں جہاج (جہاز)

اسی میں ایک قافیہ گریب نواج (غریب نواز) ہے۔

۱۵۵۶ء ﴿ ۹۶۳ھ ﴾ تا ۱۶۰۵ء ﴿ ۱۰۱۴ھ ﴾

(۱۱) ایک مرتبہ اکبر بادشاہ کے سامنے کسی اشتعال طبع پر ادہم خاں نے خان اتکہ کو قتل کر دیا تو اکبر نے بیساختہ ادہم خاں سے کہا:-

"اے ملچھ گاوَدی تو کیوں اتکہ مارا از جان بیجان کردی۔" (۱)

(۱۲) جب اکبر نے جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی اور اکبر و جہانگیر دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے چلے تو راجہ نے کہا:-

ہماری بیٹی تمھارے محلوں کی چیری ہم باندگلام رے

اکبر نے برجستہ جواب دیا:-

تمھاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی تم صاحب سردار رے (۲)

۱۵۶۷ء ﴿ ۹۷۵ھ ﴾ تا ۱۵۹۲ء ﴿ ۱۰۰۱ھ ﴾

(۱۳) شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کی تصنیف زاد المتقین (مصنفہ ۱۵۹۴ء) میں مذکور ہے کہ ان کے استاد و مرشد شیخ عبدالوہاب متقی متوطن مالوہ دکن سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں سکونت گزیں ہو گئے تھے۔ وہاں ۱۵۶۷ء ﴿ ۹۷۵ھ ﴾ سے وقت وفات ۱۵۹۲ء ﴿ ۱۰۰۱ھ ﴾ تک ۳۶ سال طلبہ کو درس دیتے رہے۔ جس کی صورت یہ تھی کہ عرب طالب علموں کو عربی زبان میں سمجھاتے تھے۔ اہلِ عجم کو فارسی میں اور ہندوستانیوں کو اُردو میں۔

یہ سب واقعات اُردو زبان کے رواج عام کثرت اشاعت، مقبولیت و اہمیت کے ثبوت ہیں معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق (متوفی ۱۳۵۱ء) کے زمانے سے اُردو مستقل زبان بن کر بول چال، لین دین کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اگرچہ شاہی زبان، دفتری زبان، کتابی زبان،

---

(۱) یہ فقرہ شمس العلماء مولانا محمد عبدالغنی ایم۔اے، ایم۔لٹ، پروفیسر ناگپور یونیورسٹی نے "تاریخ ہمایونی" قلمی سے اپنی تصنیف تاریخ ادب فارسی در عہد سلاطینِ مغلیہ جلد سوم میں درج کیا ہے۔

(۲) یہ واقعہ بھی پروفیسر محمد عبدالغنی صاحب کی اسی کتاب سے اخذ کیا گیا ہے۔

مدّت تک فارسی رہی لیکن کاروباری زبان اور رعایا کی زبان عام طور پر اُردو ہی تھی۔

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا دورِ قدیم

اب تک جو نمونے درج کیے گئے وہ بول چال کی اُردو کے تھے یا ہندی شاعری میں فارسی و عربی الفاظ کی آمیزش کے۔ کبیر داس، گرونانک، تلسی داس، سور داس کے دوہوں میں عربی وفارسی زبانوں کے شامل ہونے سے اُردو زبان کی شان بے شک پیدا ہو گئی اور اس کو یقیناً اُردو شاعری کا سنگِ بنیاد کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اُردو شاعری جس چیز سے عبارت ہے اس میں فارسی بحریں بھی شامل ہیں۔ اس اعتبار سے بھی اُردو شاعری کا آغاز قدیم زمانہ میں ہو چکا تھا۔ جس کا ثبوت امیر خسرؔو اور کبیر داس کی غزلیں اور امیر خسرؔو کی خالق باری ہے۔ اگر چہ ان کی سند تاریخی مشتبہ اور مختلف فیہ ہے تاہم ان کا وجود خارج از قیاس نہیں ہے۔ خاص کر جب کہ کبیر داس ہی کے زمانے میں ایسے شاعر اور بھی موجود تھے۔ جنھوں نے اُردو فارسی کی مخلوط غزلیں کہی ہیں اور اس کے بعد سے شاعری اور غزل گوئی کا سلسلہ جاری رہا ہے۔

۱۵۵۶ء ﴿ ۹۶۳ھ ﴾ (۱) نوری اعظم پوری اکبر بادشاہ کے زمانے میں تھا۔ فیضی کا دوست تھا اس کا یہ شعر میر حسن نے اپنے تذکرہ شعرا میں درج کیا ہے:-

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

۱۵۹۳ء ﴿ ۱۰۰۲ھ ﴾ (۲) حضرت کمال الدین مخدوم شیخ سعدی کاکوری بھی اکبر کے زمانے کے بزرگ ہیں۔ اکبر کی زندگی میں ۱۵۹۳ء ﴿ ۱۰۰۲ھ ﴾ ان کی وفات ہوئی ہے۔ ان کی ایک غزل مشہور ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:-

ہم تمن کو دل دیا، تم دل لیا اور دکھ دیا ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پیت ہے

۱۶۲۵ء ﴿ ۱۰۳۴ھ ﴾ (۳) محمد افضل ساکن جھنجھانہ ضلع میرٹھ تلسی داس کا ہم عصر ہے۔ اکبر و جہانگیر کا زمانہ دیکھا ہے۔ کسی ہندو عورت پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اپنی داستانِ محبت عجیب والہانہ انداز سے نہایت درد انگیز اُردو مثنوی میں بیان کی ہے۔ مثنوی کافی

طویل ہے۔ ایک نظم بارہ ماسہ بھی لکھی ہے۔ ۱۶۲۵ء میں انتقال کیا۔

۱۶۶۲ء ﴿۱۰۷۳ھ﴾ (۴) پنڈت چندر بھان برہمن متخلص بھی اسی زمانے کے شاعر ہیں۔ اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے دہلی میں عمر گزاری۔ شاہجہاں بادشاہ کے دربار میں منشی تھے۔ پھر شہزادہ داراشکوہ کے میر منشی رہے۔ ۱۶۶۲ء میں انتقال ہوا۔ ان کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے:۔

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے، نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے، نہ پیالہ ہے

پنڈت چندر بھان برہمن کے انتقال کے بعد ولی احمد آبادی (۱) پیدا ہوئے ہیں۔ اور تقریباً ۱۷۰۰ء ﴿۱۱۱۲ھ﴾ میں دہلی آئے ہیں۔ لیکن اس وقت ان کے کلام کی شہرت دہلی میں نہیں ہوئی بلکہ ۱۷۲۱ء ﴿۱۱۳۳ھ﴾ میں ولی کا دیوان دکن سے دہلی میں آیا ہے۔

۱۶۹۰ء ﴿۱۱۰۱ھ﴾ (۵) معزالدین موسوی خاں فطرت مشہد (ایران) کے رہنے والے تھے۔ ۱۶۷۱ء ﴿۱۰۸۲ھ﴾ میں ہندوستان آئے اور دربار عالمگیر میں

---

(۱) ولی کو اکثر اہل تذکرہ نے دکنی یا اورنگ آبادی لکھا ہے۔ لیکن اب احمد میاں اختر جوناگڈھی نے طویل بحث کے بعد بدلائل ثابت کر دیا ہے کہ ولی احمد آباد (گجرات) کے رہنے والے تھے، اورنگ آباد (دکن) میں رہے لیکن وہ ان کا وطن نہ تھا گجرات سے لے کر مدراس تک کے حصہ کو قدیم زمانے میں دکن کے لفظ سے تعبیر کر دیا کرتے تھے۔ اس لیے بھی بعض اہل تذکرہ نے ولی کو دکنی لکھ دیا ہے۔ گجرات اور دکن کی زبانوں میں اشتراک بھی ہے، لیکن ولی کے کلام میں ایسے الفاظ و محاورات موجود ہیں جو خاص گجرات میں رائج ہیں۔ دکن میں کوئی ان کو جانتا بھی نہیں۔ ولی کے خاندانی حالات اور ان کے زمانے کے بعض لوگوں کے اقوال سے بھی ولی کا گجراتی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اختر جوناگڈھی صاحب نے اس طرح کی بہت سی دلیلیں قائم کی ہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے بھی یہاں ولی کو احمد آبادی لکھ دیا ہے۔ یہ مشہور ہے کہ ولی کے دہلی آنے سے پہلے اور ان کے دیوان غزلیات اُردو کی دہلی میں شہرت ہونے سے پہلے دہلی اور شمالی ہند میں اُردو غزل گوئی شروع نہ ہوئی تھی۔ ہم نے اسی مضمون میں مختلف غزل گو شاعروں کے نمونوں سے اس کی تردید کی ہے۔

اعزاز پایا۔ فارسی کے شاعر تھے۔ اُردو میں شعر گوئی کا چرچا دیکھ کر کبھی کبھی اُردو میں بھی کہتے تھے۔ ایک شعر ان سے یادگار رہ گیا ہے۔ جس میں اُردو اور فارسی مخلوط ہیں:۔

از زلف سیاہ تو بدل دوم پری ہے(۱)   در گلشن آئینہ گتا جوم پری ہے(۲)

اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں اُردو شاعری کو رواج ہو چلا تھا۔ حالانکہ ولی احمد آبادی کا دیوان ابھی دہلی میں نہیں آیا تھا۔

۱۷۲۱ء ﴿۱۱۳۳ھ﴾ (۶) مرزا عبدالقادر بیدلؔ عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں پرورش پائی۔ شہزادہ محمد اعظم بن شہنشاہ عالمگیر کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ کسی نے شاہزادہ کے سامنے میرزا کی تعریف کی۔ شہزادہ نے کہا ہماری شان میں قصیدہ کہہ کر لائیں تو استعداد دیکھ کر اضافہ منصب و تقرب سے سرفراز کریں گے۔ میرزا نے یہ سنا تو نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ دوستوں نے ہر چند اصرار کیا کہ قصیدہ مدحیہ لکھیں۔ لیکن انھوں نے انکار کیا۔ گوشۂ عزلت اختیار کر لیا اور باقی عمر فقر و توکل میں گذار دی۔ ۱۷۲۱ء ﴿۱۱۳۳ھ﴾ میں انتقال کیا۔ فارسی کے بڑے اعلیٰ شاعر تھے۔ اُردو کے دو شعر قائمؔ و میرؔ وغیرہ کے تذکروں میں ملتے ہیں

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدلؔ کہاں ہے ہم ہیں

دیکھو ان اشعار کی زبان کس قدر صاف و صحیح ہے۔ یاد رہے کہ بیدلؔ کے زمانے میں ولیؔ کی شاعری کا چرچا دہلی میں شروع نہ ہوا تھا۔

۱۶۵۹ء ﴿۱۰۶۹ھ﴾ تا ۱۷۱۳ء ﴿۱۱۲۵ھ﴾ (۷) جعفر زٹلؔ شاہجہاں کے زمانے میں ۱۶۵۹ء ﴿۱۰۶۹ھ﴾ پیدا ہوا اور عالمگیر کی وفات کے بعد ۱۷۱۳ء ﴿۱۱۲۵ھ﴾ میں انتقال

---

(۱) یعنی دھوم پڑی ہے۔   (۲) یعنی گھٹا جھوم پڑی ہے۔

کیا۔ مشہور مسخرا گزرا ہے۔ بہرحال شاعر تھا اور اس حیثیت میں اپنے ہم عصروں سے کم نہ تھا۔ اس کی ہزلیات میں کہیں کہیں مہذب ظرافت بھی موجود ہے۔ ایک مطبوعہ مجموعۂ کلام اس کی طرف منسوب ہے۔ وہ سب اس کا نہ ہو پھر بھی اس نے بہت کچھ کہا ہے۔ جعفر عمر میں ولی احمد آبادی سے بڑا ہے۔ ولی جب دہلی آئے جعفر کی عمر ۴۰ سال سے زیادہ تھی۔ اس نے ولی کے دہلی آنے سے پہلے شاعری شروع کر دی تھی۔

میر جعفر زٹلی عالمگیر بادشاہ کے شہزادوں (محمد سلطان، محمد اعظم اور محمد معظم) کے درباروں سے توسل رکھتا تھا۔ اعظم و معظم کی لڑائیوں سے پریشان ہو کر عالمگیر کے زمانے کو یاد کرتا ہے اور ان بھائیوں کی خانہ جنگی کا مضحکہ اڑاتا ہے:-

کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ — مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
اگت کے آنجھواں دل رووتا ہے — نہ میٹھی نیند کوئی سووتا ہے
دوادو ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے — بچہ درگور سر کھٹیا کھڑی ہے
ازاں سو اعظم و زیں سو معظم — زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم
بیا جعفر زباں کو مختصر کر — ز دورِ مختلف دل میں حذر کر

شہر آشوب

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے

نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے

خوشامد سب کریں زر کی چہ بیگانہ چہ زن گھر کی
بھلا دی بات سب ہر کی عجب یہ دور آیا ہے

جعفر زٹلی کے ہم عصر سید عبدالجلیل اٹلی ہیں۔ نارنول سے دکن کو زٹلی کے نام خط لکھتے ہیں:۔

پناہ بروائی وچوڑائی میر جعفر بڑے بھائی ہر روز از یاد حق سکھی باشد......

زٹلی تیری جعفر جہانگیر شد   زٹلی گفتش اندر توئی (۱) میر شد

سید اٹلی کی ایک غزل یہ ہے:۔

غزل اٹلی

رخسار پر بہار سجن رونق چمن   یا گل گلاب کا کہوں یا لالہ یاسمن
یا حقۂ جواہر و یا دُرج دُر کہوں   یا غنچۂ گلاب کہوں یا کہوں دہن
گیسوئے تابدار ہیں یا ناگ ہے بھونگ   یا زلف مشک ناب ہے یا نافۂ ختن
با قد خوش خرام چلے جب لٹک اٹک   شمشاد اور صنوبر خم کھاویں در چمن

بر توسنِ کرشمہ سوار است نازنیں
سیّد اٹلی زبادۂ دیدار او مگن!

(۱) میر عبدالجلیل بلگرامی علامۂ جلیل و شاعر بے عدیل گزرے ہیں۔ ۱۶۶۱ء ﴿۱۰۷۴ھ﴾ میں پیدا ہوئے۔ ۱۷۲۵ء ﴿۱۱۳۸ھ﴾ میں وفات پائی۔ علامہ مرحوم نے ۱۷۲۲ء ﴿۱۱۳۴ھ﴾ میں نواب نظام الملک آصف جاہ وزیر فرخ سیر بادشاہ دہلی کی شان میں ایک قصیدہ فارسی لکھا ہے۔ اس میں عربی، فارسی، اُردو تینوں زبانوں میں تاریخیں کہہ کر شامل کی ہیں۔ اُردو کی تاریخ کا شعر یہ ہے:۔ ۱۷۲۲ء ﴿۱۱۳۴ھ﴾

اسیس دے کے کہی ہندوی موں یوں سنبت
"رہے جگت موں اچل باس یہ وزیر سدا"
۱ ۱ ۳ ۴ھ

---

(۱) تعجب ہے کہ سید اٹلی بجائے "تو میر شدی" کے "توئی میر شد" لکھتے ہیں

۱۷۲۶ء ﴿۱۱۳۹ھ﴾ (۹) میرزا عبدالغنی قبول کشمیری دہلی میں سکونت گزیں تھے۔ ۱۷۲۶ء ﴿۱۱۳۹ھ﴾ میں وفات پائی۔ فارسی کے شاعر تھے۔ اُردو کا ایک شعر ان سے یادگار ہے:۔

دل یوں خیال زلف میں پھرتا ہے نعرہ زن
تاریک شب میں جیسے کوئی پاسباں پھرے

۱۷۴۶ء ﴿۱۱۵۹ھ﴾ (۱۰) میرزا محمد رضا قزلباش خاں ہمدانی امید تخلص شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ سیّد حسین علی "بادشاہ گر" دورِ سیادت میں برہان پور کرناٹک وغیرہ میں ملازم رہے۔ شاہ عالم بادشاہ کے دربار سے قزلباش خاں خطاب پایا آخر دہلی میں اقامت اختیار کی اور وہیں ۱۷۴۶ء ﴿۱۱۵۹ھ﴾ میں رحلت کی۔ ہندوستان آنے کے شروع زمانے میں جو شعر اُردو کا کہا اس میں فارسیت بھی غالب ہے اور دکنیت بھی، کہتے ہیں:۔

بامن کی بیٹی آج مری آنکھ موں پڑی غصہ کیا و گالی دیا و دگر لڑی

پھر دہلی میں رہ کر یہ شعر کہے:۔

درو دیوار سے اب صحبت ہے یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں

اُردو نثر کا دورِ اوّل

دکن میں اُردو: یہ بات قابل غور ہے کہ پنجاب، دہلی اور تمام شمالی ہند میں اُردو زبان کی ابتدا یعنی گیارھویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی کے آغاز تک کسی مستقل و مکمل تصنیف نثر یا نظم، مطبوعہ یا غیر مطبوعہ موجود یا مفقود کا پتہ نہیں ملتا بجز امیر خسرو کی خالق باری اور سیّد اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالۂ نثر اور افضل جھنجھانوی کی مثنوی کے۔ یہ کتابیں تبرکات ادبی سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کی ایجاد کا سہرا پنجاب کے سر ہے اور شاعری و تصنیف کا طرّہ شمالی ہند کے سر پر۔ لیکن یہ کارنامے امتیاز و

اعزاز سے بڑھ کر کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ برخلاف دکن کے کہ اُردو زبان کے رواج میں دکن پنجاب سے تین سو برس پیچھے ہے اور دہلی سے تقریباً سوا دو سو برس۔ اس پر بھی دکن نے اُردو کی اتنی قدر کی کہ چودھویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی تک نظم و نثر کی صدہا کتابیں تیار کر دیں جن میں شعر و سخن اور علم و فن کی مختلف اصناف شامل ہیں۔

اس کا سبب: ترقی زبان و ادب کے معاملے میں دہلی کی تاخیر اور دکن کی تقدیم کا سبب یہ ہے کہ اس تمام مدت میں شاہی زبان اور دفتری و عدالتی زبان فارسی رہی۔ مخلوط زبان (اُردو) بننے اور بڑھنے لگی تھی لیکن اس کو شاہی سرپرستی حاصل نہ ہوئی۔ اس لیے اس عرصے میں جتنی شاعری اور تصنیف و تالیف ہوئی فارسی زبان میں ہوئی۔ مسلمان اہلِ قلم نے اُردو نوازی کی طرف توجہ نہ کی، ہندو اہلِ ذوق اَلنَّاسُ عَلیٰ دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ (۱) کے اصول پر فارسی علم و ادب حاصل کرتے رہے۔

برخلاف دکن کے کہ فتح دکن ۱۳۱۲ء ﴿۷۱۲ھ﴾ کے چند سال بعد حسن بہمنی (۲) نے (جو محمد تغلق بادشاہ کا امیر دربار اور دکن میں بادشاہ کی طرف سے متعین تھا) حکومت سے بغاوت کر کے دکن میں شاہی اختیارات غصب کر لیے اور ۱۳۴۷ء ﴿۷۴۸ھ﴾ میں سلطنت بہمنیہ قائم کر لی۔ یہ دکن میں پہلی خود مختار سلطنت تھی جو تقریباً دو سو برس (۱۵۲۶ء ﴿۹۳۲ھ﴾) تک قائم رہی۔ اس طویل مدت کے اکثر حصے میں ملک دکن پُر امن رہا۔ حسن بہمنی نے بادشاہ بنتے ہی اہلِ ملک و ہندوانِ دکن کو فوج و دربار میں اعلیٰ عہدے دیے۔ ایک برہمن کو وزیرِ مال بنایا۔ اس کے بعد بھی تمام شاہانِ بہمنی نے ہندوؤں کے ساتھ ہر طرح کے تعلقات تمدنی و معیشتی قائم رکھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حسن بہمنی

---

(۱) رعایا بادشاہوں کا طریقہ اختیار کر لیتی ہے۔

(۲) تاریخ فرشتہ کی غلط بیانی سے عوام میں حسن بہمنی کے متعلق یہ قصہ مشہور ہو گیا ہے کہ وہ گانگو نام برہمن کا ملازم تھا۔ ایک دن کھیت میں کوئی دفینہ نکلا۔ حسن نے اپنے آقا برہمن کو اطلاع کی وہ اس دیانت داری سے خوش ہوا اور سلطان محمد تغلق سے اس کی سفارش کر کے اس کو دربار میں نوکر کرا دیا۔ حسن نے دکن میں سلطنت قائم کی تو شکر و احسان کے طور پر برہمن کا نام شامل کر کے سلطنت بہمنیہ نام رکھا۔ فرشتہ کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ حسن ایران کے بہمن شاہ کی نسل سے تھا اس لیے اپنے آپ کو بہمنی کہتا تھا۔

نے سلطنت کی دفتری و کاروباری زبان کے لیے بجائے فارسی کے ہندی کو پسند کیا۔ اس حسن انتخاب اور سیاسی تدبّر نے انتظام سلطنت کی آسانیوں کے ساتھ اُردو زبان میں شعر و ادب کی بنیاد بھی ڈال دی۔

سلطنت بہمنی

۱۳۴۷ء ﴿۷۴۸ھ﴾ تا ۱۵۲۶ء ﴿۹۳۲ھ﴾

دکن کا سب سے پہلا اُردو مصنف شیخ گنج العلم (وفات ۱۳۹۳ء ﴿۷۹۵﴾

شیخ عین الدین گنج العلم حکومت علاء الدین خلجی کے زمانے میں بمقام دہلی ۱۳۰۶ء ﴿۷۰۶ھ﴾ پیدا ہوئے آغاز شباب میں تحصیل علم کے لیے گجرات کا سفر کیا۔ اس عرصے میں حکومت دہلی خلجی خاندان سے تغلق خاندان میں منتقل ہوگئی۔ ۱۳۲۵ء ﴿۷۲۵ھ﴾ میں محمد تغلق تخت دہلی پر بیٹھا اور ۱۳۲۶ء ﴿۷۲۶﴾ میں اس نے مرکز حکومت دکن کو منتقل کر کے دیوگیر (دولت آباد) کو پایۂ تخت بنایا اور ۱۳۵۱ء ﴿۷۵۲ھ﴾ تک دکن میں اس کی حکومت رہی۔ اسی زمانے میں شیخ گنج العلم دہلی سے گجرات ہوتے ہوئے دولت آباد آئے۔ وہاں سے بیجاپور آ کر قیام کیا اور بیجاپور ہی میں ۱۲۹۳ء ﴿۷۹۵ھ﴾ میں وفات پائی۔ شیخ صاحب کثیر التعداد فارسی کتابوں کے مصنف ہیں۔ دکنی اُردو میں بھی چند مختصر رسالے مسائل شریعہ کے متعلق تصنیف فرمائے۔ دکن میں اُردو زبان کی سب سے پہلی کتابیں یہی ہیں لیکن یہ رسائل اب ناپید ہیں۔

اُردو کی سب سے قدیم کتاب جو شائع ہوئی

معراج العاشقین مصنفۂ حضرت خواجہ بندہ نواز سیّد محمد گیسو درازؒ سب سے قدیم کتاب ہے جو حال میں شائع ہوئی ہے۔ (باستثنائے ''خالق باری'') خواجہ گیسو دراز ۱۳۲۰ء ﴿۷۲۰ھ﴾ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے، خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے فیض باطن اور اجازت و خلافت پائی۔ فیروز شاہ بہمنی کے عہد حکومت ۱۴۱۲ء ﴿۸۱۵ھ﴾ میں دہلی سے حسن

آباد (گلبرگہ) آئے۔ احمد شاہ اوّل بہمنی کے زمانے میں ۱۴۲۲ء ﴿۸۲۵ھ﴾ میں وصال فرمایا۔ عربی و فارسی کے بڑے اعلیٰ پائے کے مصنف تھے۔ اپنے مریدوں اور عام طلبہ علم کو درس بھی دیا کرتے تھے اور عوام کی آسانی کے لیے کبھی کبھی دکنی اُردو میں بھی سمجھاتے تھے۔ آپ کے چند مقولے اور اشعار کتابوں اور بیاضوں میں پائے گئے ہیں مثلاً:۔

(۱) ''بھوکوں موے سوں کچھا پڑیتا ہے، خدا کوں اپڑنے کی استعداد ہور ہے۔''

(۲) او معشوق بے مثال نور نبیؐ نہ پایا — اور نور نبی رسولؐ کا میرے جیو میں بھایا

اپسیں اپیں دیکھاونے کیسی آرسی لایا

(۳) گھوڑے کوں بھیتر کوڑ ہے اس کوں نہ حکمت ہور ہے — ہر دم ذکر سوں توڑ ہے غافل نہ ہو، شیاتوں

کرو سکا دل گیان کا انعام دے خوش دھیان کا — چارا کھلا ایمان کا رکھ باند اپنے وارتوں

خوگیر شریعت لعل بند زیں ہے طریقت زیر بند — حق ہے حقیقت پیش بند تنگھ معرفت اختیارتوں

تب قید گھوڑا آئے گا تجھ لامکاں لے جائے گا — تب عشق جھگڑا پائے گا خد مارلے ترواتوں

شہباز حسینی کھوئے کر ہر دو جہاں دل دھوئے کر — اللہ آپے یک ہوئے کر تب پاوے گا دیدارتوں

ان کے علاوہ خواجہ صاحب کے بعض رسائل دکنی اُردو کے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن میں سے معراج العاشقین کو انجمن ترقی اُردو نے شائع کر دیا ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔

''اے عزیز، اللہ بندہ پنا یہاں پہچان کو جانا، نیں تو شرع جاتا ہے۔ اوّل اپنی پہچانت بعد از خدا کو پہچانت کرنا۔''

''انسان کے بوجنے کوں پانچ تن، ہر ایک تن کو پانچ دروازے ہیں، ہور پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن واجب الوجود، مقام اس کا شیطانی، نفس اس کا اماّرہ، یعنی واجب الوجود کی آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے کان سو غیر نہ سننا سو۔ حسد تک سوں بدبوئی نہ لینا سو۔ بغض کی زبان سوں بدگوئی نکرنا سو۔ کینا کی شہوت کوں غیر جاگا خرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہونا نبض پہچان دوا دینا۔''(۱)

---

(۱) یہ عبارت اور اشعار مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

معراج نامہ(۱) اور رسالہ سہ بارہ بھی خواجہ بندہ نواز کی تصنیف سے دریافت ہوئے ہیں۔ان کے نمونے یہ ہیں:۔

''تحقیق خدا کے میاتے ستر ہزار پردے او جیالے کے ہور اندھارے کے۔اگر اس میں تے پردہ اٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔'' (معراج نامہ)

سوال: ایمان کے جھاڑان کیا اور ایمان کی ڈالیاں کیا اور ایمان کے پات کیا اور ایمان کا وطن کیا اور ایمان کا بیج کیا اور ایمان کا پوست کیا ایمان کا سر کیا اور ایمان کا جیو کیا۔

جواب: ایمان کا جیو قرآن ،ایمان کی جڑ توبہ،ایمان کی ڈالیاں سو بندگی ،ایمان کی پات پرہیزگاری، ایمان کا تخم سو علم ،ایمان کا پوست سو شرم ،ایمان کا وطن سو مومن کا دل ہے۔(رسالہ سہ بارہ)

سلطنت عادل شاہی

۱۴۹۰ء﴿۸۹۵ھ﴾تا ۱۶۸۶ء﴿۱۰۹۷ھ﴾

بہمنی سلطنت کے چودہویں حکمران محمود شاہ کی غفلت و کمزوری سے سلطنت کا زوال شروع ہوا تو بیجا پور (جو سلطنت بہمنیہ کا ایک صوبہ تھا) کے گورنر یوسف عادل شاہ نے ۱۴۹۰ء﴿۸۹۵ھ﴾ میں خود مختاری کا اعلان کر دیا اور بیجا پور میں عادل شاہی حکومت قائم کر دی۔دو سو سال تک قائم رہی۔آخر ۱۶۸۶ء﴿۱۰۹۷ھ﴾ میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے بیجا پور کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

اکثر شاہان بیجا پور خود عالم و شاعر اور قدر دان تھے۔سلاطینِ بہمنی نے اُردو کو دفتری زبان بنا دیا تھا۔عہد عادل شاہی کے پہلے اور دوسرے بادشاہ نے پھر اُردو کی جگہ فارسی کو رواج دیا اور تقریباً پچاس سال تک دفتر پر فارسی کی حکومت رہی لیکن ابراہیم عادل شاہ اوّل (۱۵۳۴ء﴿۹۴۱ھ﴾تا ۱۵۵۸ء﴿۹۶۵﴾) نے مصالح ملکی کے لیے اُردو ہی کو موزوں

---

(۱) ماخوذ از اُردو شہ پارے مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد

سمجھا اور بجائے فارسی کے دوبارہ اُردو کو رائج کر دیا۔ اس کے بعد پھر سلطنت کے ساتھ زبان کی قسمت پلٹی۔ یعنی ابراہیم کے جانشین علی عادل شاہ نے پھر فارسی کو ترجیح دی لیکن پھر اس کے جانشین ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اُردو کو فارسی کی مسند پر بٹھا دیا۔ اس عرصہ میں اُردو زبان دکن میں عام ہو گئی تھی۔ لیکن اہل تصانیف میں شعرا کی تعداد زیادہ تھی۔ تاہم مصنفین نثر بھی موجود تھے۔ مثلاً

شمس العشاق شاہ میراں جی: حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے دکن آ کر حضرت خواجہ گیسو دراز کے خلیفہ کے خلیفہ سے بیعت کی۔ بیجا پور میں ۱۴۹۶ء ﴿۹۰۲﴾ میں وفات پائی۔ دکن نے شاہ صاحب سے بڑا فیض پایا ہے۔ دکن کے بڑے علماء و صوفیاء میں ان کا شمار ہے۔ ان کی تمام تصانیف اُردو نثر یا نظم میں ہیں۔ تصانیف نثر میں سے شرح مرغوب القلوب، جلترنگ اور گل باس قلمی موجود ہیں۔ پہلے رسالے کا نمونہ یہ ہے:۔

"خدا کہیا، تحقیق مال اور پنگڑے (۱) تمھارے دشمن ہیں، چھوڑ دیو دشمناں کوں۔ اے کیا غفلت ہے جو تجھے اندھلا (۲) کیا موت کی یاد تھے (۳) تجھے بسرا (۴) کر۔"

سب رس نام کا ایک رسالہ شاہ میراں جی نے ملاّ وجہی کی سب رس سے پہلے لکھا ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

"اوّل تجھے جو کوئی سکھلاتا ہے اسے پوچھ، توں نجھیں سکلانا سو تجھ پر کھلا ہے۔ اس کا کام اس پر نہیں کھلیا، سو تجھ پر کیا کھلے گا۔ توں کیا سمجھ کر بھولیا ہے۔ بھوسکیکا تو ادھر اودھر کہاں چار حکایتاں۔ اس حکایتاں سو کیا حاصل۔"

شاہ برہان الدین جانم: شاہ میراں جی کے فرزند ہیں۔ اولیاء کبار میں ہیں۔ ۱۵۸۲ء ﴿۹۹۰ھ﴾ کے بعد وفات پائی ہے۔ نثر میں ایک رسالہ کلمۃ الحقائق ان کی تصنیف سے ہے۔ اس میں تصوف کے مسائل سوال و جواب کے طور پر بیان کیے ہیں۔

---

(۱) پنگڑے = اولاد (۲) اندھلا = اندھا (۳) تھے = سے (۴) بسرا کر = بھلا کر

نمونہ یہ ہے:-

"یہ تن الادھا(۱) دستا۔ ولیکن جیتا بکار، ٹوٹے نہیں بلکہ ستتر بکار روپ دستا ہے۔ یک تل قرار نہیں، جیوں مرکٹ روپ۔"

شاہ امین الدین اعلیٰ: شاہ برہان الدین جانم کے فرزند و جانشین ہیں۔ تاریخ وفات "ختم ولی" سے ۱۰۸۶ھ نکلتی ہے (مطابق ۱۶۷۵ء) نثر میں کئی رسالے لکھے ہیں۔ ایک رسالہ گنج مخفی کا نمونہ یہ ہے:-

"اللہ تعالیٰ گنج مخفی کو عیاں کرنا چاہا تو اس میں سوں ایک نظر نکلی، سو اس سے امین دیکھ ہوا، امین شاہد کہتے ہیں، یو دونوں ذات کے دو طور ہیں، ذات نے اپس کو دیکھا، اسے نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا تو اُسے شاہد کہتے ہیں۔ یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں۔"

ان کی عبارت ان کے پدر بزرگوار اور جد امجد کی تصانیف کے مقابلے میں صاف و آسان ہے۔

سلطنت قطب شاہی

۱۵۱۰ء ۹۱۶ھ تا ۱۶۸۷ء ۱۰۹۸

گولکنڈہ جو قطب شاہی بادشاہوں کا پایۂ تخت تھا بہمنی سلطنت ہی کا صوبہ تھا۔ مرکزی حکومت کے ضعف و زوال کا نتیجہ تھا کہ سلطنت قلی قطب شاہ نے اعلانِ خود مختاری کر کے گولکنڈہ کو دار السلطنت بنایا اور قطب شاہی سلطنت کی بنیاد ڈال دی۔ ڈیڑھ سو برس سے زیادہ قائم رہنے کے بعد اس کی تباہی بھی شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

---

(۱) الادھا= علٰحدہ۔ دستا= نظر آتا۔ بکار= متحرک۔ ستتر= بدلنے والا۔ روپ= بھیس، حالت۔ مرکٹ= بندر۔ اس عبارت کا مطلب یہ ہے: "یہ جسم علٰحدہ نظر آتا ہے لیکن زندہ متحرک ہے۔ ٹوٹتا نہیں بلکہ بدلتا رہتا ہے، متحرک حالت میں نظر آتا ہے۔ ذرا سی دیر کو قرار نہیں۔ گویا بندر ہے۔"

شاہانِ گولکنڈہ بھی اُردو کے بڑے قدر دان تھے۔ تین بادشاہ اُردو کے شاعر اور صاحب دیوان تھے (ان کا ذکر حصۂ نظم میں آئے گا)۔ اس دور میں نثر کی کتابیں بھی لکھی گئیں۔ اور گزشتہ دونوں عہدوں سے بہتر لکھی گئیں۔

شاہ میراں جی خدانما: سیّد میراں حسینی نام ہے۔ حیدرآباد وطن تھا۔ بیجاپور جا کر شاہ امین الدین اعلیٰ سے بیعت کی۔ بادشاہ گولکنڈہ عبد اللہ شاہ (۱۶۲۵ء ﴿۱۰۳۵ھ﴾ تا ۱۶۷۲ء ﴿۱۰۸۳ھ﴾) کے زمانے میں تھے۔ گراہم بیلی نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے ملازم بھی رہے ہیں۔ انھوں نے ''تمہیدات عین القضات'' مصنفہ عین القضات ہمدانی کا ترجمہ اُردو میں کیا ہے جس کا نام شرح تمہید ہمدانی ہے۔ اس ترجمہ کا ایک نسخہ ۱۶۰۳ء ﴿۱۰۱۲ھ﴾ میں لکھا گیا ہے۔ مولوی عبد الحق صاحب کے پاس جو نسخہ ہے اس پر سنہ کتابت ۱۰۶۷ھ درج ہے۔ گراہم بیلی نے سیّد صاحب کا سال وفات ۱۶۵۹ء ﴿مطابق ۱۰۷۰ھ﴾ لکھا ہے اور مولوی عبد الحق صاحب نے ۱۰۷۴ء ﴿مطابق ۱۶۶۳ھ﴾ بہر حال یہ کتاب دکن کی قدیم تصانیف اُردو میں ضخیم ہونے کے سبب سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

''اے عزیزاں، اے بات نہیں سنیاں، بادشاہ گھوڑا مستعد کئے باج (۱) نہیں سوار ہوتے، ہور گھوڑے میں کچ (۲) کھوڑا (۳) پچھے (۴) تو بھی قبول نہیں کرتے یعنی پیر کے عشق میں بحثا ہوے باج خدا کے عشق میں نا آسک (۵) سی ہور (۶) دیکھ ناسک سی۔ اگر عشق خالق نداری بارے عشق مخلوقے مہیا کن۔ اس کا معناء خدا کی پچھان کا بل نہیں تو اوّل اپنی پچھانت کر۔''

مولانا عبد اللہ: عبد اللہ قطب شاہ کے زمانے میں تھے۔ ۱۶۲۲ء ﴿۱۰۳۲ھ﴾ میں احکام الصلوٰۃ کے نام سے ایک رسالہ دکنی اُردو میں لکھا ہے جس میں فقہ حنفی کے مطابق احکام شریعت بیان کیے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:-

---

(۱) بغیر (۲) کچھ (۳) عیب (۴) ہو (۵) نہیں آسکتا ہے۔

(۶) اور

''روح قبض ہوا اسی وقت اس کیاں انکھیاں موچنا ہور پاؤں دراز کرنا ہور ہاتھ دراز کرنا دونوں پہلو کی طرف ولیکن سینے پر نا رکھنا۔ ہور اس کی ٹھنڈی ہور سرکوں ملا کر بندنا۔ یو سب سنت ہے۔ ہور مرنے تے وقت اول اس کے سرکوں قطب کی طرف سلانا ہور موے بعد از غسل دینا اسی طریق سوں۔''

مُلّا وجہی: عہد قطب شاہی کا نہایت ممتاز شاعر و مصنف تھا۔ اس نے چار بادشاہوں ابراہیم قلی قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد ۱۶۳۵ء ﴿۱۰۴۵ھ﴾ میں ایک کتاب سب رس نثر میں لکھی۔ یہ کتاب چند سال ہوئے عبدالحق صاحب نے اپنے مقدمہ اور فرہنگ لغات قدیم کے ساتھ شائع کردی ہے۔ اصل کتاب ٹائپ کے تین سو صفحوں پر چھپی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب دکن کی قدیم اُردو کتابوں میں سب سے بڑی ہے۔ سب رس کا دوسرا نام ''قصۂ حسن و دل'' ہے۔ فرضی قصے کی صورت میں عشق و عقل اور حسن و دل کے معرکے بیان کیے ہیں۔ افرادِ قصہ کے نام مہر، وفا، ناز، غمزہ، ناموس، زہد، توبہ وغیرہ رکھے ہیں اور اس پیرایہ میں ان جذبات وواردات کے حقائق بیان کیے ہیں۔

اگرچہ وجہی نے اس کتاب میں کہیں اس امر کا اظہار نہیں کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اصل قصہ اس کے دماغ کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ سب سے پہلے محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشا پوری (متوفی ۱۴۴۸ء ﴿۸۵۲ھ﴾) نے فارسی نظم میں لکھا تھا۔ اس کا نام دستورِ عشاق ہے۔ فتاحی نے اسی قصے کو مختصر طور پر فارسی نثر میں بھی لکھا تھا اور اس کا نام حسن و دل (۱) رکھا تھا۔

---

(۱) فتاحی کا یہ قصۂ نثر بہت مشہور و مقبول ہوا۔ چار تر کی مصنفوں نے اس کو اپنی زبان میں لکھا۔ لامعی اور آہی نے نثر میں، اور روائی وصدقی نے نظم میں۔ دو انگریزوں اور ایک جرمن ڈاکٹر نے اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا اور اصل کے ساتھ چھاپا۔ ہندوستان میں صلاح الدین صرفی نے اور داؤد ایلچی نے ۱۶۴۴ء ﴿۱۰۵۴ھ﴾ میں اس کو فارسی مثنوی میں لکھا۔ پھر شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں ملا جامی بیجنود (متوفی ۱۶۷۵ء ﴿۱۰۸۶ھ﴾) نے نظم کیا اور خواجہ محمد بیدل نے ۱۶۸۳ء ﴿۱۰۹۵ھ﴾ میں پُر تکلف فارسی نثر میں لکھا۔ یہ فتاحی کی تصنیف کی قدر شناسی تھی۔ وجہی کے سب رس کو بھی دکن کے دو شاعروں ذوقی اور مجرمی نے اُردو نظم میں لکھا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وجہی کو مثنوی دستورِ عشاق دستیاب نہیں ہوئی بلکہ قصۂ نثر ''حسن و دل'' مل گیا۔ اس میں ادنیٰ سا تصرف کر کے وجہی نے اُردو میں لکھ دیا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ حسن و دل کی فارسی نثر مقفّٰی و مسجع ہے۔ وجہی نے بھی سب رس میں ایسی ہی اردو نثر لکھی ہے۔ نمونہ یہ ہے:۔

(آغاز کتاب) ''تمام مصحف کا معنی الحمد للہ میں ہے مستقیم، ہور تمام الحمد للہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم، ہور تمام بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کے ایک نقطے میں رکھا ہے کریم، سچ دیکھ خاطر لیا اعمال، حدیث بھی یوں آئی ہے کہ اَلعِلمُ نقطۃٌ وَ کثّرَ ھا الجُہّال، یعنی علم ایک نقطہ میں ہے جاہلاں اسے بڑھائے جہالت کو اس حد لگن لیائے۔''

(آغاز داستان) ''نقل ایک شہر تھا۔ اس شہر کا ناؤں سیستان۔ اس سیستان کے بادشاہ کے ناؤں عقل، دین و دنیا کا تمام اس تے چلتا۔ اس کے حکم باج ذرا کیں نیں ہلتا۔ اس کے فرمائے پر جنو چلے، ہر دو جہاں میں ہوئے بھلے۔ دنیا میں خوب کہوائے، چار لوگوں میں عزت پائے۔''

(ختم داستان) ''الحمد للہ دونوں کوں ہوا وصال، اپنا دل خوش تو سب عالم خوش حال دل کو ملیا جیو کا جانی، یو وصال مبارک یو خوشی ارزانی۔ اپنی جھادل پڑی، تو میسر ہوئی یو وصال کی گھڑی۔ مرداں نے مشقت سوں امید کے دروازے کھولے ہیں، مَن طَلَبَ شَیئاً وَجَدَ فَوجَدَ کو بولے ہیں۔ یعنی جو کوئی جس کام جد دھریا، ان نے وہ کام کریا۔''

میراں یعقوب: ایک ضخیم کتاب ''شمائل الاتقیاء'' مصنفہ شیخ برہان الدین اورنگ آبادی کو میراں یعقوب نے ۱۶۶۷ء ﴿۱۰۷۸ھ﴾ کے بعد اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں تصوف کے مسائل ہیں۔ مضامین کتاب کو چار قسموں میں بیان کیا ہے۔ ان اقسام کی شروع میں تفصیل کر دی ہے۔ اس طرح:۔

پہلا قسم۔ طریقت کے لوگوں کے افعال ہور سالکاں کے مقاماں ہور مریداں ہور طالباں کے طلباں ہور اس کے عجائبات ہور باریکیاں کی شرح میں بیان کیا گیا ہے۔

سبب ترجمہ۔ اپنی حیات کے وقت مجے (۱) اشارات کیے تھی جوں شمائل الاتقیاء کتاب کوں ہندی زبان میں لیاوے تا یہ کسی کو سمجھا جاوے۔ اس وقت مجے بیا نہیں تا کہ یک ہزار ستر پر آٹھویں سال کوں رحلت

---

(۱) مجے = مجھے

کیے پر ان کے بھانجے عارف حق رسیدے عارفوں کے نور دیدے مصطفٰے کے کلیجے ہو۔ مرتضٰی کے نیں شاہ میراں ابن سیّد حسین سلمہٗ اللہ تعالٰی کی خلافت کے زمانے میں کتاب لکھنے کا شروع کیا۔ جی کچھ مشکل میں آتا تھا سوں پیر کی مدد سوں آسان لکھا جاتا تھا۔

ذکر معجزہ و کرامت۔ ہور (۱) ولیاں کوں کرامت ہے کر اہنو (۲) پورا علم دھرتے ہیں وے مغلوب ہور بیخود ہیں۔ جکچہ (۳) اینو تھے (۴) ظاہر ہوتا ہے سوا سے کرامت کہتے ہیں۔ اما معونت او ہے (۵) جو بعضے دیوانے جو پورا علم و معرفت نہیں دھرتے ہیں انو (۶) تھے کچھ خرق عادت یعنی کدھن (۷) نہیں ہوتا ہے سو چیز ظاہر ہوتا ہے۔ ہور مند راج استدراج اسے کہتے ہیں جو بعضے بے ایمان لوگوں کچھ سحر ہور منتر ہور اس وزاں (۸) کے چیزاں ظاہر کرتے ہیں۔ (۹)

دکن بعہدِ مغلیہ

۱۶۸۷ء ۱۰۹۸ھ تا ۱۷۳۰ء ۱۱۴۲ھ

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۶۸۶ء میں بیجاپور پر اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ پر قبضہ کر کے پھر دکن میں مغلیہ سلطنت قائم کر دی۔ اس زمانے میں بھی دکن میں اُردو کی ترقی اور تصانیف نظم و نثر کا سلسلہ جاری رہا لیکن ہر عہد میں نثر کی تصانیف نظم کے مقابلے میں بہت کم ہوئی ہیں۔ اس عہد کا بھی یہی حال ہے تاہم بعض کتابوں کے نام اور بعض کے نمونے ملتے ہیں۔

۱۔ سیّد شاہ محمد قادری اورنگ زیب کے زمانے میں تھے۔ رائچور کے خاندان ''نور دریا'' کے بزرگ تھے اور شیخ امین الدین اعلٰی کے خلیفہ۔ چند رسائل تصوف اردو نثر میں لکھے ہیں۔

---

(۱) ہور = اور (۲) اینو = یہ لوگ (۳) جکچہ = جو کچھ (۴) تھے = سے (۵) او ہے = وہ ہے
(۶) انو = اُن (۷) کدھن = کبھی (۸) وزاں = وضع (۹) ماخوذ از دکن میں اُردو

۲۔ شاہ ولی اللہ قادری خلف شاہ حبیب اللہ قادری نے ۱۷۰۴ء ﴿۱۱۱۵ھ﴾ میں ''معرفت السلوک'' (مصنفہ شیخ محمود) کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کا ۱۷۴۴ء ﴿۱۱۵۷ھ﴾ میں انتقال ہوا۔ اس کتاب کا موضوع تصوف ہے۔ نمونہ یہ ہے:۔

''بولتا ہے کمترین مرید ہور واپس ترین شاگرد جاروب کش درگاہ عالی ہور بارگاہ اعالی عاجز فقیر الحقیر محمد ولی اللہ حکم کیے مجکوں حضرت شہباز ولایت معدن ہدایت آفتاب عالمتاب بزرگ اولیا کے بڑے اتقیا کے ہور صدر نشین محمد مصطفےٰ کے، صاحب شریعت ہور طریقت کے، دربارِ حقیقت اور معرفت کے وارث محمدؐ رسول اللہ حضرت شاہ حبیب اللہ باقی رکھے اللہ انوں کو۔''

''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ کے بیان میں بیان کروں۔ ہور اس کی شرطاں کی شرح کوں عیاں کروں۔ کیا واسطا کہ سرِ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ کے تکتیں کے تحقیق کرنا بہوت مشکل ہے۔ کیا واسطا کہ یو کلام صاحب دل کا ہے نہ ہر ایک بے دل کا ہے۔ ہور عارفاں نے اس بات میں بہوت کتاباں کئی ہیں۔''

۳۔ سیّد شاہ میر بھی اسی زمانے کے بزرگ ہیں۔ قصبہ راچوتی وطن تھا۔ اُردو نثر میں رسالہ ''اسرار توحید'' لکھا ہے۔ ایک اور رسالہ ''حقائق'' بھی شاہ میر کی تصنیف ہے۔ جس کا ایک نسخہ ۱۷۸۳ء ﴿۱۱۹۷ھ﴾ کا لکھا ہوا نصیر الدین صاحب ہاشمی نے دیکھا ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

''قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ جو خدائے تعالیٰ نے فرمایا یعنی میں معبود نیں (۱) بلکہ تمھارے سا عبد ہوں خدا کی نسبت۔ ہور (۲) خدا نیں بلکی بندہ ہوں خدا کا رسول ہوں۔ تمہیں (۳) مج سوں ہے۔ ہور میں خدا سوں ہوں۔ یعنی تمیں میرے نور ہیں، ہور میں خدا کا نور ہوں۔ اپس (۴) سوں مجکوں جدا مت جانو۔ ہور مجھے اپس میں دیکھو۔ ہور سمجھو کہ خدائے تعالیٰ سنت (۵) رکھیا ہے تمنا (۶) پر اس بات کا کہ لقد من اللہ۔''

---

(۱) نیں = نہیں (۲) ہور = اور (۳) تمہیں مج سوں ہے = تم مجھ سے ہو (۴) اپس = آپ۔ خود
(۵) رکھیا = رکھا، رکھی (۶) تمنا = تم

۴۔ مترجم طوطی نامہ قادری: اس شخص کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ طوطی نامہ ان کتابوں میں ہے جو الف لیلہ اور کلیلہ دمنہ کی طرح نہایت مقبول ہوئیں اور بہت سی زبانوں میں ان کے ترجمے اور خلاصے لکھے گئے۔ کلیلہ دمنہ کی طرح طوطی نامہ بھی دراصل سنسکرت میں لکھا گیا تھا جس میں طوطے کی زبانی ستر کہانیاں کہی گئی ہیں۔ مولانا ضیاء الدین بخشی بدایونی (متوفی ۱۳۵۰ء ﴿۷۵۱ھ﴾) نے اُن ستر کہانیوں میں سے باون کہانیوں کا انتخاب کر کے ۱۳۳۰ء ﴿۷۳۰ھ﴾ میں فارسی میں لکھا اور طوطی نامہ (۱) نام رکھا۔ لیکن زبان مشکل تھی۔ عام طور پر اس سے لطف اندوز ہونا دشوار تھا۔ اس لیے ملا سیّد محمد قادری نے گیارھویں صدی ہجری میں اُن ۵۲ کہانیوں میں سے ۳۵ کہانیوں کو عمدہ با محاورہ فارسی میں لکھا اور ''طوطی نامہ'' ہی نام رکھا۔ ہمارے زیر نظر ملا محمد قادری کے اسی طوطی نامہ کا اُردو ترجمہ ہے جو ۱۷۲۹ء ﴿۱۱۴۲ھ﴾ میں لکھا گیا ہے اور جس کا مترجم اب تک پردۂ خفا میں ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

''دیکھیے (۲) میں طرح طرح صفت وثنا پیدا کرنے والے زمین وآسمان کی کیفیت وحقیقت یو ہے کہ داستان قصہ ہا وحکایات حضرت بخشی رحمۃ اللہ علیہ کوں بیچ طوطے نامے کے، ساتھ عبارت سخت ودقیق کے لکھے ہیں۔ اس کے تئیں منفصل وبیان دار واسطے معلوم ہونے تمام لوگوں کوں محمد قادری نیک کرے اللہ تعالیٰ مرتبہ انو کا بیچ عبارت سلیس اور آسان کے کہ ملی ہوئی اوپر عبارت خطاں کے ہوئے روزمرہ

---

(۱) بخشی کے طوطی نامہ کو یہ قبول عام حاصل ہوا کہ فارسی میں ابوالفضل (عہد شہنشاہ اکبر) نے خلاصہ لکھا پھر سیّد محمد قادری نے خلاصہ کیا۔ ترکی میں عبداللہ صابری نے ترجمہ کیا۔ دکنی اُردو میں غواصی نے ۱۶۳۹ء ﴿۱۰۴۹ھ﴾ میں اس کو نظم میں لکھا پھر ابن نشاطی نے ۱۶۶۵ء ﴿۱۰۷۶ھ﴾ میں نظم کیا۔ انگریزی میں جیرانس نے ترجمہ کیا مطبوعہ ۱۷۹۲ء ملا محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ایک ترجمہ اُردو میں ۱۷۲۹ء میں ہوا۔ دوسرا ترجمہ اردو حیدر بخش حیدری نے ۱۸۰۱ء میں کیا اور اس کا نام ''طوطا کہانی'' رکھا۔ انگریزی میں گلیڈون نے ترجمہ کیا جو فارسی کے ساتھ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں چھپا۔ جرمنی زبان میں ۱۸۲۲ء میں ترجمہ ہوا۔ ہندی میں حیدر بخش کے اُردو ترجمے کا ترجمہ ۱۸۸۶ء میں ہوا۔

(۲) یہ عبارت نہایت عجیب ودلچسپ ہے جس نے لوگوں کو دھوکہ دے رکھا ہے کہ محمد قادری کو اس کا مترجم قرار دیں یا کسی اور کو۔ مولانا احسن مارہروی بالکل درست استدلال کرتے ہیں کہ ''اوّل تو (باقی برصفحہ ۷۹ پر)

جواب وسول کہ دولت منداں کے تئیں لائق ہوئے لکھے ہیں۔‘‘

۵۔ مترجم طوطی نامۂ ابوالفضل: مترجم کا نام اور ترجمہ کا سنہ معلوم نہیں۔ نخشبی کے طوطی نامہ کا خلاصہ ابوالفضل نے بھی اکبر بادشاہ کے حکم سے کیا تھا۔ اس کا خوش خط قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے اور اس کے بین السطور میں اُردو ترجمہ لکھا ہوا ہے لیکن ترجمہ پوری کتاب کا نہیں ہے۔ اگر مترجم ترجمہ کو ختم کر دیتا تو آخر میں اپنا نام اور سنہ ضرور لکھتا۔

اب ہم ان معلومات سے محروم ہیں۔ لیکن طرزِ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی تقریباً اسی زمانہ کا ترجمہ ہے جس کا محمد قادری کے طوطی نامہ کا ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری اور مولوی نصیر الدین ہاشمی دونوں نے اس کا قلمی نسخہ لندن میں دیکھا ہے۔ ہاشمی صاحب نے اپنی تالیف (یورپ میں دکھنی مخطوطات) میں ابتدائی چند فقرے ابوالفضل اور مترجم اُردو کے درج کیے ہیں:-

---

(بقیہ صفحہ ۷۸ کا) پرانے طریقہ بیان میں اپنے نام کے ساتھ مترجم و مؤلف انکسار آمیز الفاظ ضرور لکھتے تھے دوم یہ کہ اپنے لیے تعظیمی ضمائر جمع کا استعمال نہ ہوتا تھا۔ یہ دونوں پابندیاں اس ترجمے میں نہیں ہیں۔‘‘ اور اس بنا پر فیصلہ کرتے ہیں کہ ’’یہ ترجمہ محمد قادری کا نہیں ہے۔‘‘ تاہم مولانا اس عبارت کے اس طرح واقع ہونے کے متعلق کوئی قیاس قائم نہیں کرتے اور اس کا مصنف محمد قادری ہی کو مان لیتے ہیں۔ اس عبارت کے مفہوم سے یہ خیال ہوتا ہے کہ طوطی نامہ کے مترجم نے (وہ جو کوئی ہو) یہ عبارت بطور دیباچہ کے اپنی طرف سے لکھی ہے۔ اسی لیے مصنف کا نام تعظیم سے لیا ہے:- محمد قادری نیک کرے اللہ تعالیٰ مرتبہ انو کا۔‘‘ لیکن جب عبارت کے الفاظ پر غور کیا جاتا ہے تو وہ فارسی کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں:

پچھے میں طرح طرح صفت وثنا پیدا کرنے والے زمین وآسمان کی کیفیت وحقیقت یو ہے

بعد از گونا گوں صفت وثنائے خالق زمین وآسمان کیفیت وحقیقت آن است

اور وہ قیاس باطل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر لکھنے والا اپنی طرف سے لکھتا تو ایسی عبارت نہ لکھتا۔ اٹھارہویں صدی میں زبان بہت کچھ صاف اور باقاعدہ ہوگئی تھی۔ ترجمہ کی یہ حالت البتہ اس کے بعد تک رہی ہے۔ اس لیے یہ عبارت ضرور ترجمہ ہے۔ اب ان مشکلات کا حل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مترجم ترجمہ کرتے کرتے جب نام پر پہنچا تو اس کا جی نہ چاہا کہ محمد قادری نے جس طرح اپنا نام لکھا تھا اس کا بجنسہ ترجمہ کر دیتا اس لیے تعظیمی طریقہ سے نام لکھا نہ یہ کتاب ایسی تھی نہ یہ مقام ایسا کہ اپنی طرف سے کوئی تصرف جائز نہ ہو۔

فارسی	اُردو
بعد سپاس خداوند زماں و زمیں وستایش داور جان وتن آفریں کہ طوطیاں باغ قابلیت را شیریں گفتار کرامت فرمودہ و بلبلان چمن کاملیت را عاشق گلشن قدرت خویش گردانیدہ۔	پچھے سیں تعریف صاحب زمانہ کے اور زمین کے یعنی خدائے کی تعریف کے بعد از اور پچھے سیں تعریف صاحب جان اورتن پیدا کرنے ہارے کے وہ صاحب کہ طوطیاں باغ قابلیت کتیں یعنی منشاں کتیں مٹھاس باتوں کی بخشیا یعنی میٹھے باتاں منشیاں کو خدا نے سکایا۔اور بلبلان چمن کامل پنے کتیں یعنی شاعراں کتیں عاشق باغ قدرت اپنے کا کیا یعنی اپنی قدرت دکھا کر عاشق کیا۔

اس سے آگے یہ مضمون آتا ہے:-

چلنے ہارے برے راہ بندگی کو یعنی بندگی رکھنے ہارے کو، وہ کون، ابوالفضل بیٹا شیخ مبارک کا اس کے تیں پاک حکم جاری ہونے کے پایا یعنی بادشاہ حکم فرمایا کہ یہ کتاب کتیں یعنی طوطی نامہ کو سات عبارت تازی کے سات روشن تھوری عبارت کے نقش ترتیب کا دیوے یعنی مختصر عبارت سیں بناوے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری نے اپنی تالیف (اُردو شہ پارے) میں اس طوطی نامہ کی طویل عبارتیں نقل کی ہیں۔ایک کا مختصر نمونہ یہ ہے:-

''بڑائی اور سنار اور درزی اور پرہیز گار مسافری کو نکلے۔اور ایک رات بیچ جنگل دہشت بھرے ہوئے کے کہ پتا باگاں کا ڈر سیں اس جنگل کے پانی ہوتا تھا۔یکا یک اپنا اس جاگا میں پڑیا یعنی ہوا۔وہ چار و یار مصلحت کرے کہ ہم ہر ایک موافق باری کے یک ایک پھر نگہبانی کرے۔اول بڑائی جاگتا تھا۔لکڑی یک بیچ نہایت بہتری صورت کے چھلیا یعنی اچھی صورت بنایا۔اور پھر دو گڑی سنار اس صورت کے تیں زیور سیں سنوار یا۔تیسری پہری میں درزی اس کے تیں سات لباس کے زینت دار کیا چوتھی پہری میں زاہد موں عاجزی کا طرف قبلہ کے لایا۔دعا کیا اور جان بیچ بدن اس کے پھوکے گیا۔''(۱)

---

(۱) فرہنگ پچھے = پیچھے سیں = سے کرنے ہارے = کرنے والے کتیں = کو

بڑائی = بڑھئی باگاں = باگ (شیر) کی جمع جاگا = جگہ پڑیا = پڑا چھلیا = چھیلا

موں = مُنھ پھوکے گیا = پھونکے گیا

دکن میں عہدِ مغلیہ کے بعد کا دور

ا۔محمد باقر آگاہ۔ ویلور (صوبہ مدراس) کے رہنے والے تھے۱۸۰۵ء ﴿۱۲۲۰ھ﴾ میں انتقال کیا۔انھوں نے ۱۷۷۱ء﴿۱۱۸۵ھ﴾ میں اور اس کے بعد متعدد کتابیں عقائد و فقہ کے متعلق اُردو میں لکھیں۔ یہ زمانہ دکن میں مغلیہ سلطنت کے بعد کا ہے۔اس زمانے میں شمالی ہند (دہلی، آگرہ وغیرہ) میں اُردو شاعری اور تصانیف نظم کا سلسلہ جاری ہے لیکن اُردو نثر کی کوئی مستقل تصنیف نہیں پائی جاتی۔ فضلؔی کی دہ مجالس (جس کا ذکر آگے آتا ہے) کا شمالی ہند کی ملکیت ہونا مشتبہ ہے۔اور مرزا سودا دہلوی کا دیباچہ دیوان متفرقات میں شامل ہے۔مولانا شاہ رفیع الدین صاحب اور مولان شاہ عبدالقادر صاحب کے تراجم قرآن بعد کی چیزیں ہیں۔

باقر آگاہ کی مندرجہ ذیل عبارت ان کے منظوم رسائل کے دیباچہ کا اقتباس(۱) ہے:-

''بعض علماء متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ان سے فائدہ پاویں۔لیکن اکثر عورتاں اور تمام اُمیان فارسی سے بھی آشنا نہیں ہیں۔اس لئے یہ عاصی مطلب قسم اول کا بہت اختصار کے ساتھ لے کر دکھنی رسالوں میں بولا ہے۔اور ہر رسالہ کے وزن علیحدہ ہونے سے خواہش و آرزو پڑھنے والوں کی زیادہ ہووے۔ چھ رسالہ اول کے مع رسالہ عقائد سنہ ایک ہزار ایک سو او راستی اور پانچ میں اور ایک ہزار یک سو اتی اور چھ میں (۱۱۸۵ھ و ۱۱۸۶ھ) بنے ہیں......اور ان سب رسالوں میں شاعری نیں کیا ہوں بلکہ صاف اور سادہ کہا ہوں اور اُردو کے بھاکے میں نیں کہا۔کیا واسطے کہ رہنے والے یہاں کے اس بھاکے سے واقف نہیں ہیں۔اے بھائی یہ رسالے دکھنی زبان میں ہیں۔''

اس کے بعد دہلی وغیرہ میں تصانیف نثر کا عام رواج شروع ہو جاتا ہے اور تھوڑے

---

(۱) ماخوذ از (دکن میں اُردو)

عرصہ میں اس کثرت سے اور اس قدر اعلیٰ تصانیف پیدا ہو جاتی ہیں کہ اس کے ساتھ کی دکن کی تصانیف کا پلّہ جھک جاتا ہے۔ تاہم دکن میں بھی اُردو نثر کی تصانیف جاری رہتی ہیں اور ایسی ہیں کہ تاریخ نثر میں نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

۲۔ ارکاٹ کی اسلامی سلطنت کے زمانے میں شرف الملک مولانا محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ نے جو دربار ارکاٹ کے مدار المہام اور اپنے زمانے کے بڑے عالم تھے۔ کیدانی فقہ حنفی کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ ان کا انتقال ۱۸۲۳ء ﴿۱۲۳۸ھ﴾ میں ہوا۔ ان کی تحریر کا نمونہ یہ ہے:۔(۱)

> "بوج کے تحقیق بندہ آزمائی جاتی ہے درمیان اس کے کہ بندگی کرے خدا کی اور ثواب پاوے اور درمیان اس کے کہ گناہ کرے خدا کی اور عذاب کیا جاوے اور آزمائش تعلق رکھتی ہے سات شرعی چیزوں کے کہ کرے اوسے اور سات خلاف شرع چیزوں کے کہ چھوڑ دیوے اسے، اس واسطے ضرور ہوا بیان کرنا شرعی چیزوں کا اور خلاف شرعی چیزوں کا۔"

اس عبارت کو دیکھ کر اس پر غور کرنا چاہیے کہ شرف الملکؒ باقر آگاہ کے ہم عصر ہیں لیکن ان کی نثر آگاہ کی نثر سے زیادہ بے محاورہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ باقر آگاہ کی اپنی اصلی عبارت ہے۔ اس لیے اس زمانے کے محاورہ و روزمرہ کے مطابق ہے۔ لیکن شرف الملک کی عبارت کا ترجمہ ہے۔ لفظی ترجمہ کا رواج اس کے بعد تک ہندو دکن دونوں میں رہا ہے۔

۳۔ قاضی بدر الدولہ (۲) خلف شرف الملک، ۱۷۹۳ء ﴿۱۲۰۸ھ﴾ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۳ء ﴿۱۲۸۰ھ﴾ میں انتقال کیا۔ دربار ارکاٹ میں قاضی تھے۔ کئی درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں ۱۳ کتابیں اُردو کی ہیں۔ فقۂ شافعی، سیرت نبی کریمؐ، سیرت صدیق اکبر، سیرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، ترجمہ و حواشی حدیث، تفسیر قرآن مجید وغیرہ بڑی

---

(۱) و(۲) ماخوذ از (دکن میں اُردو)

ضخیم اور قابل قدر کتابیں لکھی ہیں:-

فوائد بدریہ (سیرت النبیؐ) کے دیباچہ کا اقتباس ہے:-

"دیکھا کہ بازار علم کا بہت کاسد ہو گیا ہے اور علم کے جاننے والے دنیا سے گذر گئے۔ اب کوئی کتاب زبان عربی یا فارسی میں تصنیف کئے تو کچھ فائدہ اس پر مترتب نہیں۔ جن کو ان زبانوں کی معرفت حاصل ہے ان کے لئے بہت سے کتب موجود ہیں اور کسی کو خواہش مند بھی نہیں پایا۔ تب زبان ہندی میں یہ کتاب لکھنا شروع کیا تا عوام مومنوں کو اس سے فائدہ حاصل ہووے اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے احوال سے واقف ہو کہ ان کی پیروی خوبی کے ساتھ کریں۔"

فیض الکریم (تفسیر قرآن مجید) کا نمونہ یہ ہے:-

"واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا۔ اور مضبوط پکڑ و اللہ کی رسی سب مل کر۔ اللہ کی رسّی سے مراد اللہ کا دین ہے۔ یعنی دینِ اسلام اختیار کرو۔ اس کو رسّی سے تعبیر کیا کیونکہ باریک تنگ راہ میں گزرنا چاہے اور پیر پھسلنے کا اندیشہ ہووے تو رسّی جس کے دونوں طرف راہ کے دو جانب سے باندھے ہوں پکڑے تو اس کو خوف نہیں رہتا۔ حق کی راہ بھی بہت باریک تنگ ہے اکثر لوگوں کے پیر اس پر لغزش پاتے ہیں جس نے دینِ اسلام مضبوط پکڑا تو بڑے خوف سے نجات پایا۔"

دہلی کے علماء کرام شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ و تفسیر قرآن بدرالدولہ کی فیض الکریم سے پہلے کے ہیں (ان کے نمونے آگے آتے ہیں)۔ اس لیے کچھ تعجب نہیں کہ ان کی عبارتیں فیض الکریم کی عبارت سے زیادہ خلاف محاورہ و قدامت آمیز ہیں۔

اس زمانے میں اور اس کے بعد دکن کا اُردو لٹریچر دہلی و شمالی ہند کے مقابلے میں زیادہ ممتاز نہیں ہے۔

نثر کا دوسرا دَور

شمالی ہند میں: ۱۷۳۲ء ﴿۱۱۴۵ھ﴾ تا ۱۷۹۹ء ﴿۱۲۱۵ھ﴾

شمالی ہند یعنی دہلی اور موجودہ صوبجات متحدہ آگرہ اور اودھ میں تصانیف نثر کا اصلی اور مستقل دور محمد شاہ بادشاہ دہلی (زمانۂ حکومت ۱۷۱۹ء ﴿۱۱۳۱ھ﴾ تا ۱۷۴۸ء ﴿۱۱۶۱ھ﴾ کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے سے قبل جو رفتار تھی اس کا خاکہ پہلے دکھایا جا چکا ہے۔ اس دوسرے دور کی رفتار یہ تھی:

فضل علی فضلی: فضلی تخلص کے ایک شخص کی اُردو تصنیف دہ مجلس یا کربل کتھا (کربلا کی کہانی) کا نام اور پتہ ملتا ہے۔ جو مُلّا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب (روضۃ الشہداء) کا ترجمہ ہے لیکن فضلی کا نہ صحیح نام دریافت ہوتا ہے نہ پوری کتاب ملتی ہے۔ تذکرہ نویسوں نے اس کے نام و حالات میں بڑا اختلاف کیا ہے۔ مولانا احسن مارہروی نے اپنی بے نظیر تالیف (نمونۂ منثورات) میں (جو اپنی قسم کی اُردو میں پہلی کتاب ہے) فضلی کے متعلق تحقیقات کا خلاصہ اور نتیجہ بیان کر دیا ہے۔ (۱)

فضل علی فضل محمد شاہی عہد میں تھا۔ اس نے یہ کتاب ۱۷۳۱ء ﴿۱۱۴۵ھ﴾ میں لکھی اور پھر ۱۷۴۷ء ﴿۱۱۶۰ھ﴾ میں اس کی اصلاح اور نظرثانی کی۔ اس کتاب کا صرف دیباچہ تذکرہ شعرائے ہند (مؤلفہ و مترجمہ مسٹر فیلن اور مولوی کریم الدین) میں منقول ہے۔ اور کافی طویل اور نہایت دلچسپ ہے۔ مختلف مقامات سے اس کا اقتباس بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

---

(۱) ہم کو مولانا سے یہ اختلاف ہے کہ جب مسٹر فیلن یا مولوی کریم الدین اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "اس کتاب کو تمام میں نے دیکھا وہ میرے پاس موجود تھیں" اور انھوں نے فضل علی نام لکھا ہے تو مولانا نے فضل اللہ نام کو کیوں ترجیح دی۔ دوسرے یہ کہ جب اس فضلی کا شیعہ ہونا ظاہر ہے تو مولانا نے اس کو حنفی نقشبندی کیوں تسلیم کر لیا۔ تذکرہ محبوب الزمن جن بزرگ شاہ فضل اللہ فضلی اورنگ آبادی حنفی نقشبندی کا ذکر ہے وہ یقیناً یہ فضلی نہیں، کوئی اور ہیں۔

''لیکن معنی اس کے عورتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے اور فقرات پُر سوز و گداز اس کتاب مذکورہ کے بسبب لغات فارسی ان کو نہ رُلاتے تھے۔ اکثر اوقات بعد کتاب خوانی سب یہ مذکور کرتیں کہ صد حیف و صد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے ہیں۔ ایسا کوئی صاحب شعور ہووے کہ کسی طرح من وعن ہمیں سمجھادے اور ہم سی بے سمجھوں کو سمجھا کر رُلادے۔ مجھ احقر الفقر کی خاطر میں گزرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا بہ رنگینی عبارات اور حسن استعارات ہندی قریب الفہم عامہ مومنین و مومنات کیجئے تو بموجب اس کلام بانظام کے مَنْ بَکیٰ عَلَی الْحُسَیْنِ اَوْ تبا کاوَجَبَتْ لَہُ الْجَنَّۃ بڑا ثواب لیجئے..........''

''لہٰذا پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع۔ اور اب تک ترجمہ فارسی بزبان ہندی نثر نہیں ہوا مسمّع۔ پس اس اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا اور بیان تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا۔ لیکن راہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایت الٰہی گلشن انتظار پُر اہتزار میں آ، یہ بات آئینۂ خاطر میں منھ دکھلائی کہ یہ فکر عظیم بغیر امداد ارواح مقدس حسنین علیہم السلام حسب خواہش مجھوں کے سرانجام نہ پاوے..........''

یہ رسالہ مسعود او پر بارہ مجلس اور ایک خاتمہ کے ہے۔ اس کی تصنیف کی تاریخ یوں لکھی ہے:۔

یہ جو نسخہ ہوا ہے اب تصنیف بہر کسب ثواب و فیض بشر
چاہا تاریخ اس کی بولے سروش شیعوں کی نجات کا ''مظہر''

۱۱۴۵

اور اب نظر ثانی کر، کمیت و کیفیت مضامین ہندی اصطلاحات و استعارات رنگین اصلاح دیا۔ اس تاریخ نے صفحۂ دل پر جلوہ دیا:۔

''ہر کس از من کند بہ نیکی یاد'' بجہاں نامش ہم بہ نیکی باد

اس دیباچہ کی تمام عبارت میں صرف دو فقرے قابلِ غور ہیں۔ ایک فقرہ اوپر منقول و خط کشیدہ ہے۔ دوسرا فقرہ جو نقل نہیں کیا گیا یہ ہے:۔ تب آپ زبان اعجاز بیان سے فرمائے یہ دونوں محاورے خاص دکن کے ہیں اور اس زمانے سے دو سو برس بعد آج بھی دکن میں اسی طرح بولتے ہیں۔ دہلی و شمالی ہند میں یہ اندازِ بیان نہ جب تھا، نہ اب ہے۔ یہ محاورے خصوصاً دوسرا محاورہ (آپ فرمائے) اس طرح کا ہے کہ جس کی بول چال میں

شامل ہو اس سے چھوٹ نہیں سکتا جیسا کہ حیدرآباد وغیرہ مقامات دکن کے تعلیم یافتہ اصحاب بھی آج تک بولتے ہیں اور جس شخص کا یہ روزمرہ نہ ہو اس کی زبان وقلم سے کبھی نہ نکلے گا۔ اس سے قریب زمانے کہ مصنفین دہلی حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی نثر میں یہ اندازِ بیان نہیں پایا جاتا اور دکن کی تصانیف میں اس کے بہت بعد تک موجود ہے۔ دکن میں مولوی قادر علی (۱) نے ایک کتاب (مصباح الصلوٰۃ) کے نام سے ۱۸۱۷ء ﴿۱۲۳۲ھ﴾ میں ترجمہ کی ہے اس میں لکھتے ہیں:-

"صاحب مفتاح الصلوٰۃ معتبر کتابوں سے لکھا ہے جو شخص کہ فرائض اور واجبات نماز کی نہیں جانتا ہے نماز اس کی روا نہیں۔ شیخ ابوحفص کبیر فرمائے کافر ہوے۔ نعوذ باللہ منہا۔

اس بنا پر فضلی کا دکنی الاصل ہونا لازم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضرور ہے کہ فضلی دکن میں نہیں رہے۔ شمالی ہند میں رہ کر انھوں نے علم حاصل کیا، انشا پردازی سیکھی اور تصنیف و تالیف کی۔ ان کے دیباچہ کی تمام نثر میں اور کہیں دکنی الفاظ، روزمرہ اور اسلوب بیان نہیں پایا جاتا جب کہ دکن میں انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک الفاظ و زبان کی قدامت موجود ہے۔ چنانچہ محمد عثمان مبینؔ (۲) کی کتاب (لازم الاسلام) مرتبہ ۱۸۴۵ء ﴿۱۲۶۱ھ﴾ کا ایک فقرہ ہے:-

"پس جان تو پیدا کرنے ہارا سب عالم کا شاید کوئی دوسرا ہے۔"

اور اسی زمانے کے مصنف مولانا غوثیؒ (۳) اپنی تفسیرِ غوثی میں لکھتے ہیں:-

"اور بعضے کافراں بولتے ہیں کہ حشر برحق ہے کہ ہمارے بُتاں حشر کے روز ہم کو چھوڑائیں گے۔"

اس کے علاوہ فضلی کے دکن میں نہ رہنے کے متعلق مولانا احسن مارہروی کا یہ استدلال بھی بالکل درست ہے کہ فضلی نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے۔ (لہٰذا بن ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع، اور اب تک ترجمہ فارسی بزبان ہندی نثر نہیں ہوا مستمع) حالانکہ دکن میں فضلی کے زمانے میں اور اس سے پہلے بے شمار ترجمے ہوئے ہیں۔ فضلی دکن میں ہوتے تو ان ترجموں کا ان کو ضرور

---

(۱) و (۲) و (۳) دکن میں اُردو

علم ہوتا اور ایسا نہ لکھتے۔

فضلی کی ''کربل کتھا'' کا ایک قلمی نسخہ مفتیان گوپا مئو کے قدیم کتب خانے میں تھا۔ کتاب نقل در نقل تھی اور نا تمام تھی۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس نے کب کہاں سے نقل کی۔ اگرچہ کسی بے نام ونشان نقل پر اعتماد کرنا تصنیف وتحقیق کی ذمہ داری کے خلاف ہے لیکن اس قدر محقق ہے کہ یہ کتاب واعظ کاشفی ہی کی ''روضۃ الشہداء'' کا اُردو ترجمہ ہے اور اس کا کوئی دوسرا قدیم اُردو ترجمہ بجز ''کربل کتھا'' کے معلوم ومشہور نہیں۔ اس لیے ہم اس امر میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے کہ اس نسخہ کو فضلی کی کربل کتھا مان لیں اور اس کا اقتباس داستان تاریخ اُردو میں شامل کر دیں۔ اس کتاب کا کوئی ٹکڑا بجز دیباچہ کتاب کے کسی تاریخ وتذکرہ میں نہیں ملتا تو کم از کم یہی فائدہ ہوگا کہ اگر آئندہ کبھی فضلی کی کتاب دستیاب ہو جائے تو اس انتخاب سے مقابلہ کر کے فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

اس اقتباس کی عبارت، زبان، اسلوب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس کو فضلی کا ترجمہ سمجھنے سے مانع ہو۔ نمونہ یہ ہے:-

''جو کہ حضرت امام حسن نے از بسکہ بیوفائی کوفیوں کی دیکھی بہت ناراض وناخوش ہوئے۔ لاچار حاکم شام سے صلح کی، اور کئی آدمی ساتھ لے کر مدینہ میں جا رہے۔ پھر بعد مدت کئی برس کے حاکم شام نے از راہِ دشمنی کے مصلحت کی کہ حضرت امام حسن کو قتل کیا چاہئے تو یہ مطلب حاصل ہو۔ چنانچہ کچھ آدمی بصرہ میں حضرت امام حسن کے رہتے تھے۔ از بسکہ آدمیوں کو شب خون مارا، اور جو باقی رہے سب بھاگ کر حضرت امام حسن کے پاس آئے۔ تب حضرت امام حسن عبداللہ بن فضل کو ساتھ لے کر حاکم شام پاس پھر آئے۔ جو کہ باتیں کہنا تھیں شام کے حاکم سے کہہ سن کر پھر مدینہ کو آئے...... راہ میں ایک شہر تھا موصل اس شہر کے حاکم کا نام تھا کہ اس سے اور حاکم شام سے برادری تھی کہ حضرت امام حسن اس کے گھر اترے۔ پہلے اترنے سے حضرت کے۔ حاکم شام نے موصل کو بہت سا روپیہ اور مال فریب سے بھیجا تھا اور شیشا زہر ہلاہل کا اس قاتل کے پاس بھیج دیا تھا کہ وقت فرصت کے حضرت امام حسن کو یہ زہر کھلا دینا کہ اس بدبخت نے لالچ میں روپیہ کے ظاہر میں حضرت کی بہت سی خدمت کی اور باطن میں تین دفعہ اس زہر کو کھانے میں حضرت کے دیا۔ تینوں بار حضرت اس بیماری زہر سے بچ گئے۔ تب اس لعین نے شام

کے حاکم کو خط لکھا کہ ہم نے تین بار زہر دیا۔ لیکن حضرت امام حسن کو کچھ اثر نہ کیا۔ تب اس نے پھر زہر ہلاہل بھیجا اور لکھا اب کے حضرت امام حسن کو کھلاؤ۔ قاصد حاکم شام کا شیشا اور خط لے کر چلا اور کسی شخص نے جنگل میں اس قاصد کو مار ڈالا کہ ایک نوکروں سے حضرت امام حسن کے اسی جاگہ آ پہنچا۔ یہ حال دیکھ کر خط اور شیشا زہر ہلاہل کا جناب امام حسن کے پاس لے آیا۔ آپ نے خط کو پڑھ کر نیچے جانماز کے رکھ لیا اور کسی سے کچھ نہیں کہا۔ سعد موصلی کہ چچا مختار دوست حیدر کرار کے تھے، آہستہ ہاتھ بڑھا کر جانماز کے تلے سے خط لے کر پڑھا اور کانپے اور قدم جناب امام حسن کا چوما۔ اور عرض کیا اے فرزند رسولؐ وائے نور چشم مظلوم بتولؓ ہم کو حکم دو اس بے ایمان کے کہ جس کے گھر میں آپ اترے ہیں اس سے احوال کہیں۔ حضرت امام نے فرمایا کہ ہمارا کام نہیں ہے کہ کسی کو بے حرمت کریں، اور نہیں چاہتے ہیں کہ ہماری طرف سے اس کو شرمندگی حاصل ہووے۔ حکم خدا کا جو کہ جاری ہوا ہے وہ ہوگا۔ سعد موصلی نے تعبیر حکم حضرت امام کے اس کو بلا کر کہا کہ اے ملعون تیرے حق میں حضرت پیغمبرؐ نے کیا ظلم کیا ہے۔ جواب دیا کہ کچھ ظلم نہ پہونچا ہے۔ پھر پوچھا کہ حضرت امیر المومنین نے تجھ پر کچھ ظلم کیا ہے؟ کہا کہ خدا کی قسم ہے مدت تک حضرت علی کے نوکر رہے تھے، ہم پر ہمیشہ شفقت اور کرم کرتے تھے۔ تب سعد موصلی نے کہا کہ پس کس واسطے فرزندوں کے ساتھ مرتضٰی علی کے دشمنی کرتے ہو۔ خط اور شیشا آگے اس کے رکھ دیا اور کہا کہ لعنت خدا کی تجھ پر ہو اس نے انکار کیا کہ ہم کو اس خط و زہر سے کچھ خبر نہیں ہے۔ سعد موصلی نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ خوب سا اس کو مارو۔ چنانچہ اسی وقت مر گیا۔"

یہ عبارت "کربل کتھا" کی مجلسِ چہارم سے لی گئی ہے۔

مرزا رفیع سودا دہلوی: مرزا سودا دہلوی ۱۷۱۳ء ﴿۱۱۲۵ھ﴾ میں پیدا ہوئے اور ۱۷۸۱ء ﴿۱۱۹۵ھ﴾ میں وفات پائی۔ انھوں نے اپنے دیوان مرثیہ کا دیباچہ اُردو میں لکھا ہے۔ پیچدار مقفع عبارت ہے۔ نمونہ یہ ہے:-

انسان کہ جس فن سے آپ کو کماینبغی ماہر نہ کرے، چاہئے کہ اس میں اپنی حد سے سخن باہر نہ کرے۔ گفتگوے جاہل پہلوے عالم، مورد انفعال۔ بلکہ خموشی ہے اس کی برابر حد فضل و کمال۔

بات اگر آوے تو چپ رہ کہ گماں کے نزدیک
سو طرح کا ہے سخن پردۂ خاموشی میں

اگر نا آگاہ جس فن کا آگاہ سے اس فن کے، بولی بولے، گویا ہر دولب اس کے دروازۂ رسوائی کے پاٹ ہیں کہ عمداً

اپنے منھ پر کھولے۔ بیت

طرفہ میوہ ہے یہ سخن اے دوست　　　　مغز شیریں و تلخ جس کا پوست

مخفی نہ رہے کہ عرصہ چالیس برس کا بسر ہوا ہے کہ گوہرِ سخن عاصی زیب گوش اہل ہنر ہوا ہے۔ اس مدت میں مشکل گوئی دقیقہ سنجی کا نام رہا ہے، اور سدا مرغ معنی عرش آشیاں گرفتار دام رہا ہے۔

قافیہ پیمائی اس زمانہ کا عام انداز تھا۔ سوؔدا کی خصوصیت نہیں، سو برس بعد تک مقفیٰ نثریں لکھی گئی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے سلیس و بامحاورہ مصنفین (میر امّن وغیرہ) نے بھی قافیہ آرائی کی ہے، اور لکھنؤ کے اہل تصنیف (مرزا سرور وغیرہ) نے بھی۔ یہاں تک کہ مرزا غالبؔ دہلوی نے اپنے رقعات کی سہل ممتنع نثر میں بھی جا بجا قافیہ آرائی کی ہے اور منشی امیر مینائیؔ نے اپنی تصنیف انتخاب یادگار (مصنفہ ۱۸۷۳ء، ۱۲۹۰ھ) بھی اسی طرز میں لکھی ہے۔ اس کے برخلاف دکن کی تصانیف میں اُس زمانہ میں اور اس سے پہلے اور بعد مقفیٰ نثریں شاذ و نادر ہیں۔ طرز نگارش کے اس اختلاف کا سبب اصل میں کتابوں کے مضامین و مقاصد کی نوعیت ہے۔ دکن میں سب رس اور طوطی نامہ وغیرہ چند داستانوں کے علاوہ سب کتابیں فقہ، سیرت، تفسیر، اخلاق، تصوف پر لکھی گئی ہیں۔ علوم و فنون کے بیان میں قافیہ پیمائی اور خیال آرائی کا کیا موقع تھا۔ وجہیؔ کی ضخیم داستان سب رس تمام و کمال مقفیٰ ہے۔ فقہ و تصوف کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے اسی طرح شمالی ہند میں بھی تفریح طبع کی کتابیں مقفیٰ لکھی گئی ہیں۔ علوم و فنون کی کتابیں سادہ ہیں۔

مولانا شاہ رفیع الدینؒ (ترجمہ قرآن): سوؔدا کے دیباچہ تک شمالی ہند کی کوئی مستقل و مکمل تصنیفِ نثر معلوم و متعارف نہیں ہے۔ اس حساب سے سب سے پہلی نثر کی کتاب مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اُردو ترجمۂ قرآن ہے۔ شاہ صاحب حضرت ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ ان سے بڑے شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور ان سے چھوٹے دو بھائی تھے: -شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ شاہ ولی اللہ صاحب ان خاص الخاص علماء میں تھے جو صدیوں بعد کہیں پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیف

حجۃ اللہ البالغہ میں احکام و اعمال شریعت کے جو اسرار و معارف بیان کیے ہیں وہ دنیائے اسلام میں ان سے پہلے کسی نے نہیں بیان کیے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا مرتبہ امام رازیؒ اور امام غزالیؒ سے بڑھا ہوا ہے۔ شاہ صاحب کے سب صاحبزادے خصوصاً پہلے تین صاحبزادے بھی ایسے ہی عالم فاضل اور ولی کامل تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے علاوہ اور تصانیف کے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ ۱۷۳۷ء ﴿۱۱۵۰ھ﴾ میں کیا تھا۔ ان کے دوسرے صاحبزادے شاہ رفیع الدین صاحب نے اُردو کا ترجمہ ۱۷۷۶ء ﴿۱۲۰۰ھ﴾ کے قریب مرتب کیا، ترجمہ اس قدر لفظی اور بے محاورہ اور دشوار فہم ہے کہ ہمارے زمانے میں کیا اس زمانے میں بھی بول چال کی زبان ایسی نہ تھی۔ لیکن اصل یہ ہے کہ عربی زبان کی وسعت و بلاغت اور قرآن مجید کی معجز نما عبارت ترجمہ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اور شاہ صاحب جیسے بزرگ کو آیت آیت اور لفظ لفظ پر یہ خیال تھا کہ ہماری طرف سے کوئی ایسی کمی و بیشی نہ ہو جائے جس سے مطلب کچھ سے کچھ ہو جائے۔ اس لیے ان کے نزدیک بہترین صورت یہ تھی کہ ہر لفظ اور ہر حرف کا ترجمہ عربی کی ترتیب کے مطابق اسی موقع پر لکھ دیا جائے۔ خواہ اُردو عبارت محاورہ کے خلاف ہو جائے۔ ہم دو مقام سے مختصر نمونے درج کرتے ہیں:-

"اے رب ہمارے مت پکڑ ہم کو اگر بھول گئے ہم یا خطا کی ہم نے۔ اے رب ہمارے اور مت رکھ اوپر ہمارے بوجھ جیسا رکھا تو نے اس کو اوپر ان لوگوں کے کہ پہلے ہم سے تھے۔ اے رب ہمارے اور مت اُٹھوا ہم سے وہ چیز کہ نہیں طاقت واسطے ہمارے ساتھ اس کے۔ اور معاف کر ہم سے اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم کو۔ تو ہے دوستدار ہمارا پس مدد دے ہم کو اوپر قوم کافروں کے۔" (سورۂ بقرہ کی آخری آیت دعا)

"اے جماعت جنوں کی اور آدمیوں کی کیا نہ آئے تھے تمھارے پاس پیغمبر تم میں سے، بیان کرتے تھے اوپر تمھارے نشانیاں میری اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات اس دن تمھارے کی سے۔ کہا انھوں نے گواہی دی ہم نے اوپر جانوں اپنی کے اور فریب دیا ان کو زندگانی دنیا نے۔ اور گواہی دی انھوں نے اوپر جانوں اپنی کے یہ کہ وہ تھے کافر۔" (پارہ ۸ ولو اننا سورہ انعام رکوع ۱۶)

شاہ عبدالقادر صاحب ترجمہ قرآن : اسی زمانے میں دو تین سال بعد ۱۷۹۰ء

﴿۱۲۰۵ھ﴾ میں شاہ عبدالقادر صاحب نے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بھی سلیس و بامحاورہ نہیں ہے۔ تاہم شاہ صاحب نے لفظ لفظ اور حرف حرف کا ترجمہ کرنے کے مقابلے میں ادائے مفہوم اور وضاحت مطلب کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس لیے ان کا ترجمہ پہلے ترجمے کی نسبت مختصر اور صاف ہو گیا ہے۔ اسی لیے نہایت مقبول ہوا اور کثرت سے چھاپا اور پڑھا گیا۔ ہم ان کے ترجمہ میں سے بھی سورۂ انعام کی انہی آیتوں کا ترجمہ درج کرتے ہیں:-

''اے جماعت جنوں اور انسانوں کی کیا تم کو نہیں پہونچے تھے تمھارے رسول تمھارے اندر کے، سناتے تم کو میرے حکم، اور ڈراتے اس دن کے سامنے آنے سے۔ بولے ہم نے مانے اپنے گناہ۔ اور ان کو بہکایا دنیا کی زندگانی نے اور قائل ہوئے اپنے گناہ پر کہ وہ تھے منکر۔''

یہ ترجمہ پہلے ترجمہ سے بقدر ایک سطر کے مختصر ہے اور زیادہ صاف و سلیس ہے۔ لیکن دونوں ترجموں کے الفاظ خط کشیدہ میں پہلا ترجمہ دوسرے سے زیادہ صاف ہے۔ حالانکہ عربی الفاظ کا لفظی ترجمہ ہے۔ نہیں پہونچے تھے کی ضرورت نہ تھی۔ نہ آئے تھے بالکل صاف تھا۔ منکم کا ترجمہ (تمھارے اندر کے) اس قدر واضح نہیں ہے جتنا (تم میں سے) لیکن اس سے آگے پہلے ترجمہ میں (ملاقات اس دن تمھارے کی سے) بالکل لفظی ترجمہ ہے اور بول چال کے خلاف۔ اس کے مقابلہ میں شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ (اس دن سامنے آنے سے) ایسا صحیح، با محاورہ اور خوب صورت ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب بھی اس سے بہتر اسلوب پیدا نہ کر سکے۔ صرف (دن) کی جگہ (روز) اور (سامنے) کی جگہ (پیش) رکھ دیا، یعنی (اس روز کے پیش آنے سے)۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے اپنے ترجمہ پر تفسیری حاشیے بھی لکھے اور اس کا نام موضح القرآن رکھا۔ یہ ان کی اپنی عبارت ہے۔ اگرچہ الفاظ کی بے ترتیبی اس میں بھی ہے جیسا کہ مولوی نذیر احمد صاحب نے دیباچہ کی عبارت سے ثابت کیا ہے۔ مثلاً ان فقروں میں:-

''الٰہی شکر تیرے احسان کا ادا کروں کس زبان سے کہ ہماری زبان کو گویا کی اپنے نام کر اور دل کو روشنی دی اپنے کلام کر۔''

لیکن اکثر جگہ اس سے زیادہ صاف بھی ہے۔ مثلاً پارہ ۲۴ سورہ حم سجدہ کے دوسرے

رکوع کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

''دو دن میں زمین بنائی اور دو دن میں پہاڑ اور درخت اور سبزہ جو خلق کی خوراک ہے۔ پھر آسمان سارا ایک تھا دھواں سا۔ اس کو بانٹ کر سات کیے، اور ہر ایک کا کارخانہ جدا ٹھہرایا۔ پھر آسمان زمین کو بلایا۔ خوشی سے آؤ یا زور سے، یعنی ارادہ کیا کہ ان دونوں کے ملاپ سے دنیا بساوے۔ اپنی طبیعت سے ملیں تو، اور زور سے ملیں تو، وہ دونوں آ ملے طبیعت سے۔ آسمان کی شعاع سے گرمی پڑے تو بادیں اٹھیں، ان سے گرد اور بھاپ اوپر چڑھے، پانی ہو کر برسے، چار عنصر زمین پر جمع ہوں مخلوقات پیدا ہوں، اور پہلے زمین میں رکھیں تھیں خوراکیں، یعنی اس میں قابلیت تھی ان چیزوں کے نکلنے کی، اور ہر آسمان کا حکم جدا، یہ رب کو معلوم ہے کہ وہاں کون خلق بستے ہیں، ان کا کیا اسلوب ہے۔ اتنی زمین میں ہزاراں ہزار کارخانے ہیں، اس قدر آسمان کب خالی پڑے ہوں گے۔''

شاہ عبدالقادر صاحب کا انتقال ۱۸۱۵ء ﴿۱۲۳۰ھ﴾ میں ہوا۔ شاہ رفیع الدین صاحب کا ۱۸۱۸ء ﴿۱۲۳۳ھ﴾ اور شاہ عبدالعزیز صاحب کا ۱۸۲۴ء ﴿۱۲۳۹ھ﴾ میں یعنی ترتیب ولادت کے برعکس۔

میر عطا حسین تحسین (نوطرزِ مرصع) : ان مقدس ترجموں کے بعد اس زمانہ کی مستقل تصنیف ''نوطرزِ مرصّع'' ہے، جس میں میر محمد عطا حسین خاں تحسین ساکن اٹاوہ نے قصہ چہار درویش کو رنگین و دقیق اُردو میں لکھا ہے۔ مشہور ہے کہ چہار درویش کا قصہ حضرت امیر خسرو نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں سنانے کے لیے لکھا تھا، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ امیر صاحب کی فہرست تصانیف میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ میر تحسین، محمد باقر خاں شوقؔ کے بیٹے تھے۔ جنرل اسمتھ سالار فوج انگریزی کے میر منشی ہو کر ان کے ساتھ کلکتہ گئے، جب جنرل صاحب ولایت چلے گئے تو تحسینؔ صاحب پٹنہ آ گئے اور پھر وہاں سے فیض آباد آ کر نواب شجاع الدولہ کے دربار سے متعلق ہو گئے۔ نوطرزِ مرصّع کی تصنیف جنرل اسمتھ کی ملازمت کے زمانے میں شروع کر دی تھی۔ لیکن شجاع الدولہ کے دربار میں آ کر ۱۷۹۸ء ﴿۱۲۱۳ھ﴾ میں ختم کی۔ تحسین خوش نویس بھی تھے اور مرصّع رقم کے لقب سے مشہور تھے۔ اس لیے کتاب کے نام میں مرصّع کا لفظ

طرزِ عبارت کے علاوہ مصنف کے نام کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ تحسین نے فارسی میں بھی انشائے تحسین، تواریخ فارسی اور ضوابطِ انگریزی لکھی ہیں۔ نوطرزِ مرصّع میں عربی و فارسی الفاظ وتراکیب اور تشبیہات واستعارات کی اتنی کثرت ہے کہ بعض فقرے دشوار فہم ہونے کے علاوہ مذاق سلیم کے لیے نہایت ثقیل ومکروہ ہیں۔ مثلاً یہ عبارت:۔

''بعد ایک لحہ کے وہ ماہ شب چہاردہم رونق افزا، حدیقۂ فردوس نما کے ہو کر اوپر مسند زربفت نقروی کے جلوہ آرا ہوئی۔ واہ جی واہ، جس وقت وہ قمر طلعت داخل باغچۂ نمونۂ جنت کی ہوئی عطر گلاب رخسارہ زلیخائے شب مہتاب کا تقویت بخش دماغ تماشائیوں کا ہو کے زینت آرا بزم کامرانی کا ہوا، یوسف عکس بیاض نگینہ ہائے الماس انجم کا اوپر خاتم مینا رنگ سبزہ زمین خلد آئین کے زیب افزا دیدۂ نورانی کا ہوا۔''

آخری دو فقرے فارسی کی مشہور تصنیف شبنم شاداب کو یاد دلاتے ہیں۔ لیکن نوطرز مرصّع تمام کی تمام ایسے ہی فقروں سے بھری ہوئی نہیں ہے۔ اس سے کچھ سہل اور بہتر طرز بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً:۔

''بہ سبب ماندگی وکسل اعضا کمین داران خواب کے اوپر قافلہ بیداری کے تاخت لائے، اور متاع گراں بہائے ہوشیاری کے لوٹ لے گئے۔ بعد ایک لحہ کے آواز گریہ وزاری کی بیچ گوش میرے کے مستمع ہوئی، آنکھ کھول کر کیا دیکھتا ہوں کہ تن تنہا پلنگ پر لیٹا ہوں اور صاحب خانہ سے مکان خالی ہے، آگے دالان کے ایک پردہ پڑا ہے۔''

بعض مقامات اس سے بھی صاف وسلیس ہیں، مثلاً:۔

''اور معتمدان ہمراہ کے تئیں بیچ خدمت گذاری اس نازنین کے تعین کر کے آپ واسطے تحقیقات مکان جراح کے حویلی سے باہر آیا، چنانچہ زبانی ایک شخص کے معلوم ہوا کہ عیسیٰ نامی جراح بکمال کسب طبابت وجراحی کے اگر مُردے کے تئیں چاہے تو عنایات وفضل الٰہی سے زندہ کرے، فلانے محلّہ میں رہتا ہے۔ فقیر اس گلبانگ بشارت افروز سے بسان گل کے شگفتہ وخنداں ہو کر پوچھتے پوچھتے اوپر دروازے جراح کے کہ مثال دل بیدار دلوں کے کشادہ تھا جا پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ متبرک ذات خضر صفات بیچ دہلیز گھر کے رونق افروز ہے۔''

بہر حال ہر جگہ دو چار فقروں کے بعد عربی وفارسی ترکیبیں اور صنعتیں ضرور آجاتی ہیں۔

یورپین مصنّفین اُردو

اہل یورپ کے اُردو سیکھنے اور اس زبان میں تصنیف و تالیف کرنے کے حالات سے پہلے ان کے ہندوستان میں آنے اور حکومت کرنے کے اسباب و واقعات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

قدیم اہل یورپ اور ہندوستان : یورپ اور ہندوستان کے درمیان تجارتی تعلقات بہت قدیم زمانے سے قائم تھے۔ ۳۲۷ سال قبل مسیح سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا، لیکن یہاں اپنی حکومت قائم نہ کرسکا۔ صرف کبھی کبھی تجارت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ تجارتی آمد و رفت بحر احمر کے راستے سے ہوتی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں عرب سے اسلام کا آغاز ہوا، اور مسلمانوں نے پہلی ہی صدی میں مصر کو فتح کرلیا۔ اس وقت سے بحر احمر کا راستہ یورپ والوں کے لیے بند ہوگیا، اور پندرھویں صدی عیسوی کے آخر تک اہل یورپ ہندوستان میں نہ آسکے، بلکہ اس عرصہ میں مسلمانوں کے ہندوستان پر حملے ہوتے رہے اور سلطنتیں قائم ہوتی رہیں۔

اہلِ یورپ کی آمد (پرتگالی) : ۱۴۹۸ء ﴿۹۰۳ھ﴾ میں اسپین کے ایک شخص کولمبس نے امریکہ کا ملک دریافت کیا، اور اسی سال جب دہلی میں سکندر لودی کی حکومت تھی، پرتگال کا ایک سیاح واسکوڈی گاما ایک نئے اور لمبے راستے سے ہندوستان کے مغربی ساحل پر کالی کٹ پہنچا۔ یہ شخص تمام امریکہ کا چکر لگاتا ہوا راس امید (کیپ گڈ ہوپ) کی طرف سے ہوکر موجودہ شہر میسور سے تقریباً ایک سو میل دور ساحل پر لنگر انداز ہوا۔

پرتگالیوں نے ہندوستان میں تجارتی حقوق حاصل کرلیے سمندر کے ساحلوں پر قلعے بنائے، اور چند سال میں ۱۵۱۵ء تک مشرقی ساحل کے تمام بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ۱۵۶۵ء سے ان کی تجارت میں زوال شروع ہوا۔ یورپ میں ہالینڈ اور انگلستان ان لوگوں کے دشمن ہوگئے اور اہل پرتگال کی تجارت کو نقصان پہنچانے اور اپنی تجارت قائم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ۱۵۸۰ء میں اسپین نے پرتگال کو زیر کر کے اپنا ماتحت بنالیا۔

اس کے بعد تھوڑے عرصہ میں بجز دو تین مقامات کے سب مقبوضات ہند اہل پرتگال کے ہاتھ سے نکل گیے۔

انگریز ہندوستان میں: اسپین کا زور توڑنے کے لیے انگریزوں نے یورپ میں اسپین والوں سے جنگ چھیڑ دی۔ ۱۵۸۸ء میں جنگ عظیم برپا ہوئی جس میں اہل اسپین کو شکست اٹھانی پڑی۔ لڑائی سے نمٹ کر انگلستان کے تاجروں نے ۱۶۰۰ء میں ملکہ ایلزبیتھ سے ہندوستان میں تجارت کرنے کا فرمان حاصل کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کر دی۔

اہل ہالینڈ ہندوستان میں: لیکن یورپ میں انگلستان کا سب سے بڑا مدّ مقابل ہالینڈ تھا اس نے بھی ۱۶۰۱ء میں تجارتی کمپنی بنالی اور ڈچ قوم (ہالینڈ کے لوگ) نے بھی انگریزوں کے پہلو بہ پہلو تجارت کرنی شروع کر دی۔ اس زمانہ میں ہالینڈ والے یورپ کے سب ممالک کے مقابلہ میں فن جہاز رانی و جہاز سازی میں بڑے ماہر تھے، اس لیے انگریزوں کے لیے ان کا مغلوب کرنا آسان نہ تھا۔ ان لوگوں نے چند سال میں اکثر جزیروں سے اہل پرتگال کو نکال کر مصالحہ کی تجارت پر قبضہ کر لیا، لیکن ہالینڈ والوں کی زیادہ توجہ جزائر کے قبضہ کی جانب اور مصالحہ کی تجارت کی طرف رہی اور مشرقی حصوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کرتے رہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی: ان کے برخلاف انگریزوں نے ہندوستان کی طرف توجہ کی، اور اندرون ملک میں تجارت اور اقتدار پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ۱۶۰۸ء میں کپتان ہاکنس بندرگاہ سورت میں آیا اور شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہو کر سورت میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کی۔ پھر ۱۶۱۵ء میں سر ٹامس رو بادشاہ انگلستان کے سفیر کی حیثیت سے دربار جہانگیری میں حاضر ہوا اور تجارتی کوٹھی بنانے کی اجازت لے لی۔ سورت کے علاوہ ایک کوٹھی مچھلی پٹن (موسولی پٹم) میں مشرقی ساحل پر ۱۶۳۳ء میں قائم کی۔ پھر ۱۶۴۰ء میں مدراس آباد کر کے وہاں قلعہ سینٹ جارج تعمیر کیا۔ انگلستان کے بادشاہ چارلس اول کے پھانسی پانے کے بعد اس کے جانشین چارلس دوم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو نئے فرمان شاہی کے ذریعہ سے اجازت دے دی کہ کمپنی اپنا سکہ جاری کر کے

حفاظت کے لیے قلعہ بنائے اور غیر عیسائی مذہب والوں سے حسب ضرورت جنگ و صلح جو چاہے کرے۔ ۱۶۶۱ء میں چارلس دوم کی شادی پرتگال کی شہزادی سے ہوئی اور اس کے جہیز میں بمبئی (جو اس وقت گاؤں یا قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا) انگلستان کو ملا۔ بادشاہ نے ۱۶۶۸ء میں بمبئی کمپنی کو دے دیا۔ اس عرصہ میں نئے فرمان شاہی کے ذریعہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے مشرقی ساحل پر بالاسور کی کوٹھی اور ہگلی کی نوآبادی قائم کرلی۔ پٹنہ، قاسم بازار اور وزیگاپٹم میں بھی تجارتی کوٹھیاں بنالیں۔

انگریزوں کے حکم رانی کے منصوبے : شہنشاہ اورنگ زیب کے آخری زمانے میں مغلیہ سلطنت کمزور ہوگئی اور مرہٹوں کا زور بڑھ گیا۔ اسی زمانے میں ۱۶۸۶ء میں جوشیا چائلڈ سورت کی کوٹھی کا پریسیڈنٹ مقرر ہوکر آیا۔ اس نے ہندوستان کی سیاسی بے چینی، صوبجاتی شورش اور مرکزی سلطنت کی کمزوری کا اندازہ کرکے طے کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ کمپنی مغلوں اور مرہٹوں پر قابو پائے اور اپنی حکومت قائم کرے۔ چنانچہ جاب چارنک نے بنگال میں ہگلی کے قریب بغیر شاہی اجازت کے کوٹھی تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ بنگال کے صوبہ دار شائستہ خاں نے مزاحمت کی۔ انگریز لڑنے پر آمادہ ہوگئے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کو اس گستاخی کا علم ہوا، انھوں نے کمپنی پر حملہ کرنے کا فرمان جاری کردیا۔ چنانچہ شائستہ خان نے انگریزوں سے وزیگاپٹم، مچھلی پٹن، قاسم بازار اور پٹنہ کی کوٹھیاں چھین لیں اور جوشیا چائلڈ کو بنگال سے نکال دیا۔ وہ مدراس چلا گیا۔ ادھر مغربی ساحل پر بھی جنگ شروع ہوگئی اور مغلیہ فوج نے بمبئی کا محاصرہ کرلیا۔ انگریزوں نے مغربی ساحل پر جس قدر مغلیہ جہاز تھے سب پر قبضہ کرلیا اور اس زمانے میں جو مسلمان حج کے لیے مکہ شریف جارہے تھے ان کو گرفتار کرنا شروع کردیا۔ یہ بڑا نازک معاملہ تھا۔ شہنشاہ حج اور حاجیوں کی خاطر سے مجبور ہوگئے اور صلح کرنے کی اجازت دے دی۔ ۱۶۹۰ء میں کمپنی نے بادشاہ سے معافی مانگ لی اور تجارت کے لیے نیا فرمان حاصل کرلیا۔ اب جاب چارنک بھی مدراس سے ہگلی واپس آگیا اور وہاں ایک چھوٹی سی بستی بسالی جو بعد کو کلکتہ بن گئی۔

اہل یورپ کی تجارتی جنگ ہندوستان میں : یورپ میں فرانس اور ہالینڈ کے

درمیان جنگ چھڑ گئی، اس کا اثر ان کی ہندوستانی تجارتی کمپنیوں پر بھی پڑا۔ اور ہندوستان میں ان میں لڑائی شروع ہو گئی۔ ۱۶۹۳ء میں اہل ہالینڈ نے فرانس والوں سے پانڈی چری کو چھین لیا، لیکن یورپ میں صلح ہو جانے کے بعد پھر فرانسیسیوں کو دے دیا گیا۔ اس کے بعد پرتگال، ہالینڈ، انگلینڈ اور فرانس میں باہمی مقابلہ شروع ہو گیا۔ ہر ملک کی یہی کوشش تھی کہ ہندوستان کی تجارت کا تنہا مالک بن جائے۔ یہ مقابلہ سالہا سال جاری رہا۔ اور آخر انگریزوں کو کامیابی ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اہل پرتگال اگرچہ حکومت کرنے کی قابلیت رکھتے تھے لیکن انھوں نے یہ اصولی غلطی کی کہ حکومت کی بنیاد مذہبی تعصب پر رکھنی چاہی۔ ہندوستان کی سب سے دکھتی رگ مذہب ہے۔ اس کی ٹھیس بھی ان کو برداشت نہیں ہوتی۔ چنانچہ اہل ہند پرتگالیوں کے دشمن ہو گئے اور وہ ساحل کے مقبوضات کے علاوہ نہ اندرون ملک میں تجارت کو وسعت دے سکے نہ حکومت میں حصہ لے سکے۔

ڈچ لوگ (اہلِ ہالینڈ) نہایت دلیر اور باہمت تھے لیکن ان کے پاس جنگی بیڑا انگریزوں کے مقابلے کا نہ تھا۔ اس سبب سے بھی وہ ہمت ہارنے پر مجبور ہو گئے۔ اب ہالینڈ والوں کا ہندوستان کے کسی حصہ پر کوئی قبضہ نہیں ہے۔

فرنچ (اہلِ فرانس) کی ناکامی کا بڑا سبب یہ تھا کہ ان کو اپنی گورنمنٹ سے کچھ مدد نہ ملی۔ بلکہ حکومت کمپنی کی مخالفت کرتی رہی۔ آخر فرانس والے بھی بیٹھ رہے۔ اور میدان تجارت انگریزوں کے ہاتھ رہا۔

فرانس اور انگلستان کی جنگ حکومت ہند کے لیے : اہل فرانس نے جب اندازہ کر لیا کہ انگریزوں کے مقابلے میں ان کی تجارت کامیاب نہیں ہو سکتی تو انھوں نے تجارت کا خیال چھوڑ کر حکمرانی کی طرف توجہ کی۔ ۱۷۳۵ء میں ڈیوما فرانسیسی نوآبادیوں کا گورنر ہو کر آیا۔ اس نے دیکھا کہ ہندوستان میں کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں ہے، اور جو برائے نام ہے وہ کافی طاقتور نہیں ہے۔ صوبے صوبے اور قوم قوم آپس میں برسرِ پرخاش ہیں، اور انگریزوں کی بڑی توجہ تجارت کی طرف ہے، ڈیوما نے تہیہ کر لیا کہ فرانسیسی حکومت قائم کر دی جائے۔ ڈیوما کے بعد ۱۷۴۱ء میں ڈوپلے فرنچ گورنر ہوا۔ یہ شخص بڑا مدبر، باخبر،

حوصلہ منداور شجاع تھا۔ اس نے ہندوستان کے راجاؤں اورنوابوں کے باہمی تنازعہ اور ملکی شورش میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

اتنے میں ۱۷۴۶ء میں فرانس اور انگلستان کے درمیان یورپ میں جنگ شروع ہوگئی۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی یہ دونوں لڑنے لگے، اور وہاں کی صلح کے ساتھ یہاں بھی صلح ہوگئی۔ اس سے دس سال بعد ۱۷۵۶ء میں پھر یورپ میں یہ دونوں ملک باہم جنگ آزما ہوئے۔ پھر ہندوستان میں جنگ کے ساتھ جنگ اور صلح کے ساتھ صلح ہوئی۔ اب انگریز وفرانسیسی ہندوستان کی حکومت حاصل کرنے کے لیے لڑ رہے تھے۔ ہندو اور مسلمان ریاستوں اور صوبہ داروں میں باہمی مخالفت اور جنگ و جدل جاری تھی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ان کی حمایت شروع کر دی۔ کسی کے طرف دار انگریز ہوگئے، کسی کے فرانسیسی۔ اور اس طرح حکومت حاصل کرنے کے لیے اپنے اپنے داؤ لگانے لگے۔ آخر ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت نے اہلِ فرانس کو ہمیشہ کے لیے مایوس اور انگریزوں کو کامیاب بنا دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت : شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مغلیہ سلطنت بالکل لڑکھڑانے لگی۔ بارہ برس کے عرصہ میں تین بادشاہ تخت نشین اور معزول ہوئے۔ محمد شاہ (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) کے عہد میں نادر شاہ (۱۷۳۹ء) اور احمد شاہ ابدالی (۱۷۴۷ء) کے حملے ہوئے۔ مرہٹے زور پکڑ گئے، اور پنجاب پر قابض ہو گئے۔ اودھ، بنگال، دکن کے صوبے آزاد ہو گئے۔ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس حالت سے فائدہ اٹھایا۔ کمپنی کی خوش قسمتی سے اس کا ایک معمولی کلرک کلائیو (جو ۱۷۴۴ء میں ملازم ہو کر آیا تھا) غیر معمولی دل و دماغ کا آدمی نکلا۔ ۲۳ سال کے عرصہ میں وہ خود لارڈ اور گورنر اور سپہ سالار بن گیا اور کمپنی کو دہلی اور شمالی ہند کا حکمران بنا دیا۔ اگر چہ شاہانِ مغلیہ کی اولاد کٹ پتلی کی طرح تخت پر بیٹھتی رہی لیکن حکومت در اصل انگریزوں کی تھی۔ چنانچہ ڈھنڈورے کا نعرہ ہی یہ ہو گیا تھا:- ''ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔''

کمپنی کا بڑھتا ہوا اقتدار دیکھ کر انگلینڈ کی حکومت نے کمپنی کی براہ راست نگرانی

شروع کردی۔ اور ۱۷۷۳ء میں اس کے متعلق قانون بنا دیا، جس کو ریگولیٹنگ ایکٹ کہتے ہیں۔ بنگال پایہ تخت مقرر ہوا اور وہاں کا گورنر گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ پہلا گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز تھا۔ اس کی مدد کے لیے ایک کونسل بنائی گئی۔ کلکتہ میں عدالتِ عالیہ (ہائی کورٹ) قائم ہوئی۔ اور تمام انگریزی مقبوضات کا حاکم اعلیٰ گورنر جنرل ہو گیا۔ اور اس کے ماتحت تین پریسیڈنسیاں قائم ہو گئیں:-

(۱) بنگال پریسیڈنسی۔ بنگال پر انگریزوں کا اثر شروع ہی سے تھا۔ جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد تقریباً تمام بنگال انگریزوں کے زیرِ اثر آ گیا تھا۔ کلکتہ کے مشہور قلعے فورٹ ولیم کی بنیاد اس سے پہلے پڑ گئی تھی، لیکن موجودہ قلعہ ۱۷۵۷ء میں تعمیر ہونا شروع ہوا، اور ۱۷۷۳ء میں مکمل ہو گیا۔

(۲) مدراس پریسیڈنسی۔ مدراس کی آبادی بنگال سے بھی پہلے ۱۶۴۰ء میں شروع ہو گئی تھی۔ اور وہاں قلعہ کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد نواب کرناٹک اور نظام حیدر آباد کی ریاستوں کے کچھ اضلاع اس میں شامل کیے گئے۔ پھر ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی سلطنت شامل ہو جانے سے یہ پریسیڈنسی بہت وسیع ہو گئی۔

(۳) بمبئی پریسیڈنسی۔ ۱۶۶۸ء میں بمبئی کمپنی کی ملکیت میں شامل ہو گیا تھا۔ گورنر جنرل ہیسٹنگز نے (۱۷۷۵ء تا ۱۷۸۴ء) اور گورنر جنرل ویلزلی نے (۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء)، اور پھر ہیسٹنگز نے (دوبارہ ۱۸۱۳ء تا ۱۸۲۳ء) مرہٹوں سے چار مرتبہ جنگ کر کے اور شکست دے کر ان کا بہت سا ملک بمبئی کے احاطے میں شامل کر لیا۔ پھر ۱۸۴۳ء میں سندھ اسی خطے میں شامل ہو گیا، اور بمبئی پریسیڈنسی میں موجودہ وسعت پیدا ہو گئی۔

انگریزوں کی شہنشاہی: ہندوستان میں یورپ کی متعدد قومیں تجارت کرنے آئیں اور ان میں سے بعض بعض نے حکومت ہند کی باگ بھی ہاتھ میں لینی چاہی، لیکن کسی کو انگریزوں کے مقابلے میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ انگریزوں کی حکومت انگلستان اور تمام قوم انگریزی کمپنی کی طرفدار، مددگار، مشیر کار اور نگراں تھی۔ یہ بات پرتگال اور ہالینڈ والوں کو کیا فرانس والوں کو بھی نصیب نہ تھی۔ سلطنت برطانیہ حسب موقع

روپیہ کی امداد بھی دیتی رہی، اور قابل سے قابل حکمرانوں کو بھی بھیجتی رہی اور نئے فرمان بھی جاری کرتی رہی۔ اس طرح ہندوستان اگرچہ بظاہر کمپنی کے زیرِ اثر تھا، لیکن حقیقت میں اس کی مالک ومختار خود برٹش گورنمنٹ تھی۔ اسی لیے ۱۸۵۷ء کے غدرِ عظیم کے بعد انگلستان کو حکومت ہند کی باگ کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لینے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے الٰہ آباد کے دربار میں ہندوستان پر برطانیہ کی شہنشاہی کا اعلان کردیا۔ یہ کمپنی کا آخری گورنر جنرل وائسرائے (نائب شاہی) بنادیا۔ اوراب دونوں عہدے ایک ذات میں جمع ہوگئے۔

گورنمنٹ کی طرف سے اشاعت تعلیم: ۱۸۱۳ء﴿۱۲۲۸ھ﴾سب سے پہلی مرتبہ گورنمنٹ نے ایک لاکھ روپیہ ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے منظور کیا۔ ۱۸۱۶ء میں ڈیوڈ ہیر نے راجہ رام موہن رائے کی مدد سے کلکتہ ہندو کالج قائم کیا۔ اسی زمانے میں چند پادریوں نے سیرامپور میں ایک کالج کھولا۔

۱۸۱۸ء میں انہی پادریوں نے سماچار درپن کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔

۱۸۳۰ء میں الیگزینڈر رڈف نے کلکتہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج کھولا۔ ان کالجوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان تھی۔ انگریزی علم وادب اور سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن اب تک سرکاری طور پر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانا طے نہ ہوا تھا۔

۱۸۳۵ء میں انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی۔

۱۸۳۶ء میں سرچارلس مٹکاف (سابق گورنر صوبہ آگرہ) نے گورنر جنرل ہونے کے بعد پریس کو آزادی دے دی۔ یعنی اہل ہند بغیر لائسنس کے اخبارات جاری کرنے لگے۔ اورنامہ نگاروں کو آزاد واقعہ نگاری ورائے زنی کا اختیار مل گیا۔

۱۸۵۴ء﴿۱۲۷۰ھ﴾ میں سرچارلس وُڈ نے ولایت سے ہندوستان اپنی تعلیمی رپورٹ بھیجی۔ جس میں حکومت ہند کو مشورہ دیا تھا کہ تمام رعایا کے لیے تعلیم کو عام کردینا چاہیے۔ چنانچہ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے محکمۂ تعلیم قائم کردیا اور دیہاتی مدرسے جاری کردیے۔

۱۸۶۱ء میں اعلیٰ تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں

یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔

۱۸۷۷ء میں سر سیّد احمد خاں نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا۔ اور وائسرائے لارڈ لٹن نے خود اس کی رسم افتتاح ادا کی۔

۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی۔

۱۸۸۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی کا افتتاح ہوا۔

۱۹۰۴ء (۱۳۲۲ھ) میں لارڈ کرزن نے یونیورسٹیز ایکٹ کے نام سے اعلیٰ تعلیم کی اصلاح کے لیے ایک قانون پاس کیا۔ اس کے ذریعہ سے نظام تعلیم میں حکومت کا عنصر بڑھایا گیا۔ اسی بنا پر اہلِ ہند نے اس قانون کی مخالفت کی۔

اس کے بعد بنارس، علی گڑھ، لکھنؤ، دہلی، آگرہ، ڈھاکہ، پٹنہ، ناگپور، رنگون وغیرہ مقامات پر الگ الگ یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں۔ ابتدائی اور درمیانی تعلیم کے لیے محکمے قائم ہوئے مکاتب و مدارس جاری ہوئے۔ ذات پات کا فرق مٹ کر تعلیم سب کے لیے عام ہو گئی۔

اہلِ یورپ اور اُردو : اس تاریخ کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں یورپ کی جو جو قومیں آئیں ان کے رسوخ و اثر کا اندازہ ذہن نشین کرایا جائے۔ اور اُردو سے ان کا تعلق بیان کیا جائے۔ خصوصاً انگریزوں اور انگریزی کا اثر اُردو پر دکھایا جائے۔

(۱) پُرتگال والے سب سے پہلے آئے، تجارت سے ترقی کر کے حکومت میں حصہ لیا، ساحلوں پر قبضہ جمایا، تجارتی کوٹھیاں بنائیں، جائدادیں خریدیں، اپنا مذہب پھیلایا، ہندوستانیوں کو عیسائی بنایا۔ ان سب مشاغل اور مصروفیتوں کے لیے اہلِ ہند سے میل جول کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اہلِ پرتگال نے سواحل ہند کی زبانیں سیکھیں اور اپنی زبان سکھلائی۔

(۲) اہل پرتگال بہت سی چیزیں اپنے ساتھ لائے جو ہندوستان میں نہ تھیں۔ ان کے نام ہندوستان میں باقی رہ گئے۔ مثلاً الماری، بالٹی، پیپا، پستول، صابون، کارتوس، میز، تولیا وغیرہ۔

(۳) پُرتگالیوں کا اثر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جنوبی ہند کی زبانوں پر

پڑا۔ مرہٹی، بنگالی، اُڑیا وغیرہ زبانوں میں صدہا پُرتگالی لفظ مل گئے، اور پھر اندرونِ ملک میں پہنچ کر اُردو میں شامل ہوئے۔

(۴) اہل پُرتگال کے بعد جب ہالینڈ، فرانس اور انگلستان والے آئے تو انھوں نے دیکھا کہ تمام بندرگاہوں اور ساحلی مقامات پر پُرتگالی نما ہندوستانی یا ہندوستانی نما پُرتگالی زبان پھیلی ہوئی ہے، اور اہل ہند سے میل جول کے لیے یہ زبان سیکھنا آسان اور مفید ہے، اس لیے ان لوگوں نے اسی زبان کو حاصل کیا۔

(۵) کپتان ہملٹن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ہندوستان کے ساحلوں پر اہلِ پرتگال کی زبان کا اس قدر اثر موجود ہے کہ اہلِ یورپ باہمی گفتگو اور اہلِ ہند سے میل جول کے لیے یہی زبان حاصل کرتے ہیں۔ لاکیر اپنی کتاب (اشاعت ۱۷۱۱ء) میں ذکر کرتا ہے کہ اہلِ پرتگال کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی زبان نے سواحلِ ہند پر ایک مشترک زبان پیدا کر دی ہے جو تمام اہلِ یورپ کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔

(۶) ہالینڈ اور فرانس والے بھی ہندوستان میں آئے، تجارت وحکومت کی کوشش کرتے رہے۔ اہلِ ہالینڈ کو ہند میں رہنا اور اپنے مقبوضات قائم رکھنا نصیب نہ ہوا، ہندوستان سے جلد واپس جانا پڑا، اہلِ فرانس برسوں رہے۔ بعض مقامات پر قبضہ کیا اور اب تک قابض ہیں۔ لیکن ان دونوں قوموں کی زبانوں کا کوئی اثر ہندوستان میں نہ ہوا اور ان کی کوئی نمایاں یادگار باقی نہیں ہے۔ یورپ سے جو نئی چیزیں اور ان کے نام آئے اور رائج ہوئے وہ اکثر پرتگیز کے لائے ہوئے تھے۔ ہالینڈ اور فرانس سے کچھ اور نئی چیزیں نہیں آئیں جن کی یادگار باقی رہتی۔ صرف بعض الفاظ ہندوستان میں موجود ہیں۔

(۷) پُرتگال، ہالینڈ اور فرانس کا جو کچھ اثر اُردو پر ہوا وہ صرف الفاظ کی شکل میں ہوا۔ اُردو انشا پردازی پر کوئی اثر نہ پڑا۔ بلکہ خود ان لوگوں نے ہندوستانی زبانیں سیکھیں، اُردو حاصل کی، اُردو میں کتابیں لکھیں، اُردو میں شاعری کی۔

(۸) خصوصاً اہل فرانس میں سے بعض بعض پرائیویٹ طور پر ہندوستان میں اقامت پذیر ہو گئے۔ مختلف شہروں میں جاگیریں لیں، مکانات بنائے، ہندوستانی لباس و

معاشرت اختیار کی، چنانچہ آگرہ میں ایک فرانسیسی مسٹر مارٹن کی یادگار مکانات اب تک موجود ہیں۔ اور مارٹن محل کے نام سے مشہور ہیں۔ فرانسیسی اُردو شاعروں کی یادگاریں بھی تذکروں میں باقی ہیں۔

(۹) انگریز پرتگالیوں سے سو برس بعد تجارت کرنے آئے۔ لیکن ایسا سودا کیا کہ ہندوستان ہی کو مول لے لیا۔ انگریزوں کو ہندوستان میں قدم رکھے تین سو برس سے زیادہ ہو گئے۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو دو سو برس کے قریب ہوئے (از عہد لارڈ کلائیو) اور انگریزوں کی شہنشاہی کو ایک صدی کے قریب گزر گئی۔ انگریزوں نے اُردو زبان کی رفتارِ ترقی اور قبولیت عام کو دیکھ کر اس کی طرف توجہ کی۔ ان سے پہلے ہالینڈ اور پرتگال والے اُردو کی قواعد صرف و نحو پر کتابیں لکھ چکے تھے۔ انگریزوں نے بھی اٹھارہویں صدی میں اُردو گرامر اور لغت کی متعدد کتابیں لکھیں۔ انیسویں صدی میں مشن کے پادریوں نے مذہبی کتابیں اُردو زبان میں شایع کیں، اُردو اخبار اور رسالے جاری کیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے انگریز ملازموں کے لیے اُردو زبان کا سیکھنا اور پھر اس میں امتحان پاس کرنا لازم کر دیا۔ ۱۸۳۲ء ﴿۱۱۴۸ھ﴾ میں اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ قانون کی کتابیں انگریزوں نے لکھیں، انگریزی حکام عدالت کی کارروائیاں اُردو میں لکھنے لگے۔ کمپنی کے ملازموں کے لیے ہر قسم کا لٹریچر مہیا کیا گیا۔ مختلف زبانوں سے ترجمے کرائے گئے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ انگریز حکام نے درباروں میں اُردو زبان میں تقریریں کیں۔ چنانچہ گارسن دتاسی (۱) کا بیان ہے کہ:-

---

(۱) گارسن دتاسی فرانسیسی عالم و مستشرق تھا۔ اس کو اُردو زبان سے اس قدر عشق تھا کہ فرانس میں بیٹھا بیٹھا اُردو زبان کی رفتار و ترقی کا مطالعہ کرتا تھا۔ اپنے دوستوں اور انگریز حکام کی معرفت اُردو کے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کرتا تھا۔ اور ہر سال کے آخر میں اپنی یونیورسٹی میں اُردو کی اُس سال کی ترقی پر لکچر دیتا تھا، جس میں اُردو کی ادبیات، شاعری، مصنفین شعرا، اخبارات وغیرہ سب کا ذکر ہوتا تھا۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک ۱۹ لکچر دیے۔ جن کا ترجمہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے ۸۰۰ صفحوں کی مجلد کتاب میں شائع کر دیا ہے۔ اسی سے یہ اقتباسات ماخوذ ہیں۔ ان لکچروں کے علاوہ گارسن دتاسی نے اُردو زبان کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ اُردو کی کتابوں کے ترجمے کیے ہیں، اور بعض اُردو کتابوں کو اپنی ادارت میں شائع کیا ہے۔

''۷؍جنوری ۱۸۶۵ء کو پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر نے لاہور میں اپنی روانگی سے قبل ایک دربار منعقد کیا۔ لفٹیننٹ گورنر نے اس موقع پر انگریزی میں نہیں بلکہ ہندوستانی (اُردو) زبان میں حاضرین جلسہ کو مخاطب کیا۔''

''فروری کے مہینے میں لکھنؤ میں چیف کمشنر کے زیرِ صدارت ایک جلسہ ہوا جس میں اس نے اودھ کے تعلقہ داروں کے روبرو ہندوستانی میں طول طویل تقریر کی۔''

انگریزوں نے اُردو زبان میں شاعری کی اور بعض صاحب دیوان ہوئے۔ مثلاً الگزنڈر ہیڈلے اور جارج پیش شور۔ پہلے کا تخلص آزادؔ تھا اور دوسرے کا شورؔ۔ اُردو کے بعض مشہور مصنفوں کو ان کی تصانیف کے سلسلے میں ڈاکٹر کی ڈگری (ایل ایل ڈی) دی۔ مثلاً سر سیّد احمد خاں اور مولوی نذیر احمد دہلوی کو۔ ملکہ وکٹوریہ نے اُردو زبان سیکھی اور منشی عبد الکریم کو آگرہ سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن بُلایا۔ اُردو لکھنے پڑھنے لگیں۔ ملکہ کے اُردو میں دستخط بھی شائع ہوئے۔

(۱۰) انگریزی زبان کا اُردو پر بیحد اثر پڑا۔ صدہا انگریزی لفظ انگریزی میں شامل ہو گئے، جن میں سے بعض کے تلفظ ہندوستانی لب ولہجہ کے مطابق کر لیے گئے۔ مثلاً لالٹین، بوتل، رپٹ، سنتری، جرنیل، لاٹ صاحب۔ انگریزی محاورے، انگریزی اسلوبِ بیان، اُردو میں ڈھال لیے گئے۔ انگریزی کہاوتوں مثلوں کا اُردو میں ترجمہ کر لیا گیا۔ انگریزی رموزِ اوقاف (کاما، علامتِ سوال وغیرہ) کو اُردو تحریروں میں استعمال کرنے لگے۔ اور ان میں سے علامتِ سوال کا رُخ اردو تحریر کی مناسبت سے داہنی طرف کو پھیر دیا، یعنی انگریزی علامت (?) کو اُردو میں (؟) لکھنے لگے۔ اُردو تحریروں میں پیراگراف قائم ہونے لگے۔ اُردو زبان میں بچوں کے قاعدے اور ریڈریں انگریزی کے اصول پر لکھی گئیں۔ مغربی علوم و فنون کے اُردو میں ترجمے ہوئے۔ نئی نئی اصطلاحیں بنائی گئیں۔ اخبارات و رسائل جاری ہوئے۔ مقالات علمی و ادبی مختصر افسانے، ناول، ڈراما، تنقید، سیرت، تذکرہ، تاریخ وغیرہ ہر قسم کی انشا پردازی انگریزی کے اصول پر اُردو میں شروع ہو گئی۔ اُردو شاعری پر بھی انگریزی کا بہت بڑا اثر ہوا۔ جدید شاعری کی ایک مستقل صنف

اُردو میں پیدا ہوگئی جو قدیم اُردو شاعری میں خال خال پائی جاتی تھی۔ انگریزی کی تقلید میں مختلف موضوعات، جذبات، مناظرِ قدرت، معارف وحقایق، اخلاق، سیاست وغیرہ کے متعلق نظمیں لکھی جانے لگیں، نظم کی ظاہری صورتوں میں اضافہ ہوگیا، یعنی قدیم مثلث، مخمس وغیرہ کے علاوہ قافیوں اور مصرعوں کی ترتیب انگریزی کی اتباع میں اور اور شکلوں سے بھی ہونے لگی۔ غزل کی روش بدل گئی، بلند خیالی، مشکل پسندی، باریک بینی، متانت وشائستگی پہلے سے بڑھ گئی لیکن انگریزی تعلیم، اور مغربی تہذیب ومعاشرت کے اثر سے قصیدہ مفقود ہو گیا، مرثیہ متروک ہوگیا، مثنوی ختم ہوگئی۔

ان سب چیزوں کا تفصیلی ذکر تاریخ میں موقع ومحل پر کیا جائے گا۔ اس وقت اُردو زبان پر انگریزی اور انگریزوں کے اثر کا خاکہ کھینچنا تھا۔

پہلا یورپین مصنف جان جوشوا کیٹلر (ڈچ) : اہلِ یورپ میں پہلا شخص جس کی اُردو زبان کے متعلق کوئی کتاب اور کوئی تحریر ملتی ہے غالباً ہالینڈ کا رہنے والا (ڈچ) جان جوشوا کیٹلر ہے۔ یہ شخص ۱۷۱۱ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر مقرر ہوا اور تین سال سورت میں رہا۔ شاہ عالم بادشاہ (۱۷۰۸ء ﴿۱۱۲۰ھ﴾ تا ۱۷۱۲ء ﴿۱۱۴۴ھ﴾ اور جہاندار شاہ ۱۷۱۲ء کے دربار میں بھی ڈچ سفیر کے طور پر حاضر ہوا۔ لاہور، دہلی، آگرہ کی سیر کی۔ اس زمانے میں آگرہ میں ڈچ تاجروں کا ایک کارخانہ سورت کے ماتحت تھا۔ اس شخص نے صرف ونحو ہندوستانی کے نام سے اُردو زبان کی گرامر غالباً ۱۷۱۵ء میں لکھی جس کو ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب لیٹن (لاطینی) زبان میں ہے۔ ہندوستانی الفاظ اور عبارتیں رومن حروف میں ہیں۔ اس کتاب میں حضرت عیسٰی کی مشہور دعا کا اُردو ترجمہ بھی درج ہے۔ اس کو بطور نمونہ لکھا جاتا ہے:۔

> ''ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے، پاک ہوئے تیرے نام، آوے ہم کوں ملک تیرا، ہوے راج تیرا جوں آسمان تو جمین (زمین) میں روٹی ہمارے نہ تھی، ہم کو آس دے اور معاف کر تقصیر اپنی ہم کوں، جوں معاف کرتے اپرے (اپنے) قرض داروں کو، نہ ڈال ہم کو اس وسوسے میں، بلکہ ہم کوں گھس کر اس برائی سے، تیری پہنچی سواری عالمگیری حمایت میں، آمین۔''

اس کے بعد مختلف اہل یورپ نے اُردو زبان کی کتب لغات لکھیں، قواعد صرف و نحو پر کتابیں تالیف کیں، بائبل کے اُردو میں ترجمے کیے۔ ان میں سے چند کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے:-

(۱) پادری بنجمن شُلو نے لیٹن زبان میں اُردو زبان کی قواعد لکھی جو ۱۷۴۴ء میں طبع ہوئی اس میں اُردو کے الفاظ فارسی خط میں لکھے ہیں۔

(۲) اسی شخص نے ۱۷۴۸ء میں بائبل کا اُردو میں ترجمہ کیا۔

(۳) مل نے ۱۷۴۴ء میں ہندوستانی حروف تہجی پر ایک مختصر کتاب تصنیف کی۔

(۴) جی اے فرنز نے ۱۷۴۸ء میں ایک کتاب لکھی جس میں اُردو کے حروفِ تہجی کا دیگر ممالک کے حروف سے مقابلہ کیا۔

(۵) ملک اٹلی کے ایک پادری کیسانو بیلی گاٹی نے ۱۷۶۱ء میں حروف تہجی پر ایک رسالہ الفابیٹم برہمانکم کے نام سے لکھا۔

(۶) ہیڈ لے نے ۱۷۷۲ء میں اُردو کی گرامر (صرف ونحو) لکھی۔

(۷) پُرتگالی زبان میں ایک اُردو کی قواعد ۱۷۷۸ء میں گریمیٹکا اندوستانا کے نام سے شائع ہوئی۔

(۸) ڈف نے قیام ہندوستان کے زمانے میں ایک ہندوستانی گرامر لکھی اور لندن میں شائع کی۔ یہ شخص ۱۷۸۵ء میں ہندوستان آیا۔ کلکتہ میں اس نے سنسکرت، بنگالی اور ہندوستانی (اُردو) زبانیں سیکھیں۔ مولوی عبدالحق صاحب بی اے کی رائے ہے کہ اس نے اُردو قواعد میں بہت غلطیاں کی ہیں۔

(۹) ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے ۱۷۹۳ء میں انگریزی ہندوستانی ڈکشنری مرتب کی۔

(۱۰) ہندوستانی گرامر ۱۷۹۶ء۔

(۱۱) اورنٹل لنگوئسٹ (مشرقی زباندان) مطبوعہ ۱۷۹۸ء۔

یہ اٹھارہویں صدی کی چند کتابیں ہیں۔ انیسویں صدی میں بے شمار اہل یورپ

(جرمن، فرنچ، انگریزوں) نے علمی و ادبی و قانونی کتابیں اُردو زبان میں اور اُردو زبان کے متعلق دوسری زبانوں میں لکھیں۔ بعض کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر گلکرائسٹ : اہلِ یورپ میں اُردو زبان پر سب سے بڑا احسان ڈاکٹر گلکرائسٹ کا ہے۔ انھوں نے ۱۷۸۷ء سے اُردو کی خدمت شروع کی اور بیس برس تک اُردو زبان میں اور اُردو کے متعلق انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۸۰۰ء (۱۲۱۴ھ) میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ اس کے پرنسپل ڈاکٹر گلکرائسٹ مقرر ہوئے۔ یہاں ایک محکمہ اُردو کے ترجمہ و تالیف کا انھوں نے قائم کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کے لیے ڈاکٹر صاحب نے اُردو کی کتابیں، لغات، قواعد، تاریخ وغیرہ کے متعلق خود بھی لکھیں اور ہندوستان کے لائق اہل قلم مسلمانوں اور ہندوؤں کو جمع کر کے ان سے کتابیں اُردو میں ترجمہ و تالیف کرائیں۔ ان کی سرپرستی اور کوشش سے اس زمانے میں ایسا اُردو لٹریچر پیدا ہو گیا جو آج تک اُردو میں اپنی نوعیت کا بے نظیر اور یادگار ہے۔ میر امّن دہلوی، میر شیر علی افسوس دہلوی، میر بہادر علی حسینی، سیّد حیدر بخش حیدری، مرزا کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، للو لال جی، بنی نرائن، مظہر علی خاں ولا، مرزا علی لطف وغیرہ اہل فن اور اربابِ ادب نے ڈاکٹر گلکرائسٹ ہی کی سرپرستی میں کام کیا اور باغ و بہار، باغِ اُردو، آرائشِ محفل، طوطا کہانی، سنگھاسن بتیسی، گلشنِ ہند وغیرہ اُردو کی کتابیں جو ان لوگوں نے لکھیں ڈاکٹر گلکرائسٹ ہی کی اُردو نوازی کا نتیجہ ہیں۔ (ان مصنفین و تصانیف کا تذکرہ آگے اپنے موقع پر آئے گا)۔

خود ڈاکٹر گلکرائسٹ کی تصانیف کی فہرست بھی کافی طویل اور نہایت وقیع و قابلِ قدر ہے۔ مثلاً:-

(۱) و (۲) و (۳) کا ذکر اوپر اٹھارہویں صدی کی کتابوں میں حوالہ نمبر (۹، ۱۰، ۱۱) صفحہ ۱۰۶ پر آچکا ہے۔

(۴) مشرقی زباندان کا خلاصہ مع اضافۂ جدید مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۰ء۔

(۵) فارسی فعل کا نظریۂ جدید مع مترادفات ہندوستانی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۱ء۔

(۶) قصص مشرقی (انگریزی سے اُردو میں ترجمہ) مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء۔

(۷) رہنمائے زبانِ اُردو مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۴ء۔

(۸) ہندی عربی کا آئینہ (عربی الفاظ کے نقشے جو اُردو زبان سے خاص تعلق رکھتے ہیں)۔ مطبوعہ ۱۸۰۴ء۔

(۹) قواعد اُردو۔ مطبوعہ ۱۸۰۹ء۔

(۱۰) اُردو رسالہ گلکرائسٹ مطبوعہ ۱۸۲۰ء۔ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی قواعد اُردو کا خلاصہ ہے۔

(۱۱) انگریزی ہندوستانی بول چال۔ مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء۔

ڈاکٹر گلکرائسٹ ۱۸۰۴ء میں ہندوستان سے پنشن لے کر ولایت چلے گئے اور ایڈنبرا میں قیام کیا۔ پھر ۱۸۱۶ء میں لندن آگئے اور انڈین سول سروس کے امیدواروں کو پرائیویٹ طور پر مشرقی زبانوں کی تعلیم دیتے رہے۔ ۱۸۱۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۲۵ء میں یہ درس گاہ بند کر دی گئی، لیکن ڈاکٹر صاحب اپنے طور پر لوگوں کو اُردو پڑھاتے رہے۔ ۱۸۴۱ء میں بمقام پیرس ڈاکٹر صاحب نے ۸۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

گلکرائسٹ کی قواعدِ اُردو (مطبوعہ ۱۸۰۹ء) کا نمونہ (۱) یہ ہے:-

"یاد رکھنا چاہیئے کہ مصدر دلالت کرتا ہے صادر ہونے پر فعل کے فاعل سے، یا قائم ہونے پر فعل کے فاعل میں۔ اور اس صدور اور قیام کے بعد ایک کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کیفیت پر جو اسم دلالت کرے وہ حاصل بالمصدر ہے۔ پس اگر مصادر کی علامت کے حذف کرنے سے جس قدر باقی رہے وہ حاصل بالمصدر ہے۔"

گلکرائسٹ کے علاوہ انیسویں صدی کے یورپین مصنفین اُردو اور بھی بہت ہیں۔ مثلاً:-

(۱) کپتان جوزف ٹیلر نے اُردو انگریزی لغت لکھی، جس میں ڈاکٹر ولیم ہنٹر بھی

---

(۱) ماخوذ از نمونۂ منثورات مؤلفہ مولانا احسن مارہروی

شریک کار رہے۔ پہلی بار ۱۸۰۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی، پھر ۱۸۲۰ء میں ولیم کارمیکائل اسمتھ نے اس پر نظر ثانی کر کے مختصر ایڈیشن شائع کیا۔

(۲) گلیڈون نے فارسی ہندوستانی ڈکشنری مرتب کی (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۹ء)۔

(۳) کپتان ٹامس روبک نے ڈاکٹر گلکرائسٹ کو "ہندوستانی لغت" تیار کرنے میں مدد دی۔ اور خود لغت جہاز رانی لکھی، جس میں جہاز رانی کے متعلق اصطلاحات اُردو انگریزی میں جمع کیں، اور ایسے الفاظ اور فقرے بھی جمع کر دیے جو میدانِ جنگ میں اور فوجی بارکوں میں ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں کام آئیں۔ اسی میں اُردو قواعد کے متعلق بھی ایک ضمیمہ شامل کر دیا۔ یہ کتاب کلکتہ میں ۱۸۱۱ء میں چھپی۔

(۴) کپتان روبک نے ایک اور کتاب "ترجمانِ ہندوستانی" کے نام سے لکھی، جس میں زبان اُردو کے قواعد درج ہیں۔ یہ پہلی بار لندن میں ۱۸۲۴ء میں چھپی۔ پھر ۱۸۴۱ء میں لندن پیرس دونوں جگہ شائع ہوئی۔

(۵) جان شیکسپیر نے اُردو لغت لکھی (مطبوعہ ۱۸۱۳ء) اور "منتخباتِ ہندی" دو جلدوں میں مرتب کی۔ لندن میں ۱۸۱۸ء میں چھپی۔ اس کی پہلی جلد میں میر شیر علی افسوس کی تاریخ ہند (آرائش محفل) کے دس باب کا انگریزی ترجمہ شامل ہے اور دوسری جلد میں اُردو نثر و نظم کا انتخاب ۲۰۰ صفحہ کا اور ہندی نثر کا انتخاب ۴۸ صفحہ کا ہے۔ ہندی انتخاب میں کہانیاں ہیں جو اکثر سنگھاسن بتیسی سے لی گئی ہیں اور اُردو انتخاب میں مختلف شہروں کا مفصل حال ہے۔ مثلاً دہلی، آگرہ، الٰہ آباد، اجودھیا، ڈھاکہ، کشمیر، کابل وغیرہ۔ نظم میں میر حسن، سودا، میر کی مثنویوں کا انتخاب ہے، انگریزوں کی تعلیم کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

(۶) ولیم ٹیٹ نے ایک کتاب مقدمہ زبان ہندوستانی لکھی۔ جس کے تین حصے ہیں...... قواعد...... لغت...... زباندانی۔ (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۲۷ء)

(۷) ایس ڈبلیو برٹین نے قواعد زبان ہندوستانی لکھی۔ (مطبوعہ لندن ۱۸۳۰ء)

(۸) اسٹیم فورڈ ارناٹ نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے جدید خود آموز قواعد زبان ہندوستانی جو برٹش انڈیا کی نہایت کارآمد اور عام زبان ہے۔ (مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء) یہ کتاب رومن اور فارسی خط میں لکھی ہے، اور اس کے ساتھ بطور ضمیمہ لغت اور اسباب زباندانی بھی شامل کیے گئے ہیں۔

(۹) اسی مصنف (ارناٹ) کی دوسری کتاب قواعد فارسی، عربی، اور دیوناگری حروف میں ہے۔ اس پر ڈنکن فاربس نے حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ (مطبوعہ لندن ۱۹۴۴ء)

(۱۰) جیمس آر بالن ٹائن نے ہندوستانی گرامر لکھی۔ (مطبوعہ لندن ۱۸۴۴ء)

(۱۱) ڈنکن فاربس نے ہندوستانی لغت لکھی (مطبوعہ لندن ۱۸۴۷ء)

(۱۲) ایف۔ فیلن نے مولوی کریم الدین دہلوی کی شرکت میں شاعروں کا تذکرہ شعرائے ہند کے نام سے مرتب کیا۔ (مطبوعہ ۱۸۴۸ء)

(۱۳) ایک فرانسیسی برٹرینڈ نے اُردو لغت لکھی۔ (مطبوعہ پیرس ۱۸۵۸ء)

(۱۴) ریورنڈ جی اسمال نے ہندوستانی گرامر لکھی۔ (مطبوعہ لندن ۱۸۴۷ء)

(۱۵) ایک جرمنی کے عالم جی دت لو پراخنو نے ہندوستانی گرامر لکھی۔ (مطبوعہ برلن ۱۸۵۲ء)

(۱۶) ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو۔ فیلن نے چار کتب لغات لکھیں۔ ۱۔ ہندوستانی انگلش ڈکشنری ۔۲۔ انگلش ہندوستانی ڈکشنری۔ ۳۔ ہندوستانی انگلش قانونی ڈکشنری۔ ۴۔ انگلش ہندوستانی قانونی ڈکشنری۔ دوسرے نمبر کی کتاب سب سے آخری ہے۔ ۱۸۷۹ء میں اس کو مرتب کرنا شروع کیا۔ ۱۸۸۰ء میں انتقال ہوگیا۔ باقی کام ڈاکٹر صاحب کے مددگاروں (یعنی لالہ فقیر چند، لالہ چرنجی لال، لالہ ٹھاکر داس، لالہ جگن ناتھ، اور مسٹر واٹلنک) نے پورا کیا۔ اور ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔

(۱۷) ان سب سے بڑا اُردو زبان کا عاشق اور مصنف اور مؤلف فرانسیسی عالم پروفیسر گارسن دتاسی ہے۔ (جس کا ذکر ہم اس سے پہلے کسی فُٹ نوٹ میں کر چکے ہیں) اس نے اپنے وطن پیرس میں بیٹھ کر اُردو کے متعلق لکچر بھی دیے اور بہت سی کتابیں اور مضامین لکھ کر اور مرتب کر کے شائع کیے۔ اس شخص نے فارسی، عربی، سنسکرت، اُردو، ہندی کی خدمت کی ہے اور مذہب، فلسفہ، تصوف، تاریخ، سیرت، قصص، شاعری، تذکرہ شعرا وغیرہ علوم وفنون کے متعلق تصنیفات وتالیفات کی ہیں۔ ہم اس کی صرف اُن کتابوں کے نام گناتے ہیں جو اُردو کے متعلق ہیں:-

(۱) پند آموز حکایات کا ترجمہ (مطبوعہ ۱۸۲۱ء)

(۲) انتخاب کلام میر تقی میرؔ مع ترجمہ زبان فرنچ (مطبوعہ ۱۸۲۶ء)

(۳) قصہ کامروپ مصنفہ تحسین الدین کا فرنچ ترجمہ (مطبوعہ ۱۸۳۴ء)

(۴) انتخاب کلام ولیؔ اورنگ آبادی (مطبوعہ ۱۸۳۶ء)

(۵) کتبہ جات عربی فارسی اُردو (مطبوعہ ۱۸۲۸ء)

(۶) ذکر تذکرہ جات مشتمل بر حالات شعراو مصنفین ہندی اُردو (مطبوعہ ۱۸۳۸ء)

(۷) مسلمانان مشرق کا علم عروض عربی و فارسی و اُردو (مطبوعہ ۱۸۳۴ء)

(۸) ہندوؤں کے کھانے جن کا ذکر اُردو کتابوں میں ملتا ہے۔ (مطبوعہ ۱۸۳۴ء)

(۹) انتخاب قصہ گل بکاؤلی مع ترجمہ زبان فرانسیسی (مطبوعہ ۱۸۳۵ء)

(۱۰) اُردو زبان کا ابتدائی رسالہ (مطبوعہ ۱۸۳۳ء)

(۱۱) سعدیؔ [1] دکھنی ہندوستان کا ایک مشہور شاعر (مطبوعہ ۱۸۴۳ء)

(۱۲) تذکرہ شعرائے اُردو (دو جلدوں میں) (مطبوعہ ۱۸۴۷ء)

(۱۳) انتخاب اُردو ہندی (مطبوعہ ۱۸۵۴ء)

(۱۴) تذکرہ مصنفین و تصانیف اُردو (مطبوعہ ۱۸۶۸ء)

(۱۵) خطبات متعلق زبان اُردو ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک۔ (مطبوعہ ۱۸۷۴ء)

(۱۶) خطبات متعلق زبان اُردو ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۷ء تک۔

(۱۷) تذکرہ شعرائے اُردو (تین جلدوں میں) پہلے تذکرہ مذکورہ (۱۲) کا ترمیم شدہ ایڈیشن مع اضافہ مقدمہ مشتمل بر تاریخ زبان و اصناف شاعری۔ اس میں تین ہزار اُردو ہندی شعراو مصنفین کا تذکرہ ہے۔ (مطبوعہ ۱۸۷۰ء)

اس قسم کے یورپین مصنفین اُردو انیسویں صدی میں نہایت کثرت سے ہیں۔ بعض کا تذکرہ اور نمونہ تحریر درج کیا جاتا ہے:-

---

[1] اس سعدیؔ کو دکھنی ماننے میں گارسن دتاسی نے غلطی کی ہے۔ یہ شاعر مخدوم کمال الدین سعدیؔ ہیں اور کاکوری کے رہنے والے ہیں۔ ہم اس کتاب کے ابتدائی حصے میں ان کا ذکر اور نمونہ کلام درج کر چکے ہیں۔ (قادری)

مسٹر ایف فیلن طبقات شعرائے ہند : مسٹر فیلن (۱) اور مولوی کریم الدین دہلوی نے باہمی شرکت و معاونت سے شعرائے ہند کا تذکرہ طبقات شعرائے ہند کے نام سے مرتب کیا۔ کتاب کے بعض حصے ایک کے لکھے ہوئے ہیں بعض دوسرے کے۔ ۱۸۴۵ء ﴿۱۲۶۲ھ﴾ میں یہ تالیف ختم ہوئی اور ۱۸۴۸ء ﴿۱۲۶۴ھ﴾ میں مطبع العلوم دہلی میں طبع ہوئی۔ اس کے بعد اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ ان مؤلفوں نے اس تذکرے میں گارسن دتاسی کے تذکرے سے بھی مدد لی۔ بلکہ اس کا ترجمہ کر دیا۔ اور دیگر تذکروں سے بھی اس میں اخذ و اقتباس کیا۔ اس لیے یہ فیلن کا تذکرہ ایک نئی تالیف ہے اور زیادہ مفصل و معتبر ہے۔ اس میں فیلن کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

> ''گرچہ میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ بہت تذکرے جمع کر کے اس تذکرے کو فراہم کروں، لیکن مجھ سے پہلے چونکہ ڈی تاسی نے فرنچ زبان میں درمیان ملک فرانس کے ایک تذکرہ ان تذکروں مفصلہ ذیل سے بہت اچھی طرح تالیف کر دیا تھا اس لیے اور دوسرے تذکروں سے جو اس کو دستیاب نہیں ہوئے اور اس تذکرہ سے مدد لے کر یہ تذکرہ میں نے فراہم کیا۔''

ولیم میکفرسن ''دستور العمل عدالت'': ۱۸۵۱ء ﴿۱۲۶۸ھ﴾ میں ولیم میکفرسن نے ایک قانونی کتاب دستور العمل عدالت دیوانی حکومت فورٹ ولیم کے نام سے مرتب کی۔ اس کی تالیف میں دو اور شخص بھی شریک ہیں، یعنی ماسٹر ایکوٹی اور جارج اسمولٹ فیکن مجسٹریٹ کلکتہ۔ مسٹر فیکن نے ''مجموعہ قوانین تعزیرات ہند'' بھی اُردو میں مرتب کیا ہے۔ دستور العمل کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

> ''جس ضلع میں جو زبان مروج ہے۔ اس زبان کے خط و عبارت میں نوشت و خواند و سوال و جواب وہاں کی عدالتوں میں اور ان کے سررشتوں میں کہ جہاں امورات عدالت قلم بند ہوتے ہیں، عمل میں آتے ہیں۔ یعنی دیار مغربی کے اور صوبہ بہار کے محکموں میں بزبانِ اُردو اور اضلاع دیار بنگالے کی عدالتوں میں بنگلہ زبان میں اور ضلع کٹک اور اس کے متعلق پرگنوں کی کچہریوں میں اُڑیا زبان میں نوشت خواند و سوال و جواب کرنا معمول ہے۔''

---

(۱) فیلن و میکفرسن کے نمونے مولانا احسن مارہروی کی کتاب ''نمونہ منثورات'' سے ماخوذ ہیں۔

جان ولیم پیل ''رسالہ آلات طبعی'': مسٹر پیل (۱) آگرہ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ علم طبعیات (فزکس) کے ماہر اور فن کیمیا (کیمسٹری) کے عالم تھے۔ مولوی کریم الدین مدرس اول اردو کی مدد سے آلات طبعی کا نقشہ تیار کیا، اور ان کے استعمال کے متعلق ۱۸۵۰ء ﴿۱۲۶۵ھ﴾ میں ایک رسالہ اُردو میں تحریر کیا، جو مطبع مصور، آگرہ میں ۱۸۵۴ء ﴿۱۲۷۰ھ﴾ میں طبع ہوا۔ دیباچہ کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔

''یہ کتاب واسطے مددان طلباء کے جو علم طبعی کے لکچروں یعنی درسوں میں حاضر ہوا کرتے ہیں بموجب حکم جناب معلی القاب جیمس طامسن صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربیہ کے طیار کی گئی تھی، اور چونکہ اس حکم نے ان کی وفات تاسّفی کے چند روز پیشتر نفاذ پایا تھا اور یہ طلباء کی ترقی کے بڑے مشتاق رہتے تھے.....''

ان کے علاوہ آگرے ہی میں ایک اور انگریز جان پارکس لیڈلی تھا۔ سرکاری مترجم کا عہدہ اس کے سپرد تھا۔ اس نے اپنا ایک مطبع قائم کیا تھا۔ علمی دلچسپی اور اُردو زبان کا شوق رکھتا تھا۔ ایک ۹۰ صفحہ کا رسالہ علم المعیشت (اکنامکس) پر انگریزی سے ترجمہ کر کے اُردو میں لکھا اور اپنے مطبع میں ۱۸۵۳ء ﴿۱۲۶۹ھ﴾ میں طبع کیا۔

عیسائی مشنری: اہل یورپ نے ہندوستان میں تجارت وحکومت کی کوشش کے ساتھ ساتھ عیسائی مذہب کی تبلیغ کا کام بھی بڑے زور شور سے کیا۔ اور ہندوستان کی تمام زبانوں میں انجیل کے ترجمے کیے۔ اس طرح بالواسطہ اُردو زبان کی وسعت اور اُردو لٹریچر کی کثرت میں سعی کی۔ اٹھارہویں صدی ہی میں چند ترجمے ہو گئے تھے۔ انیسویں صدی میں اُردو کے ٹائپ اور لیتھو کے چھاپے خانے جاری ہونے سے بائبل کی اشاعت بڑی کثرت سے ہونے لگی۔ سر سیّد احمد خاں مرحوم نے اپنی تفسیر انجیل میں اور گارساں دتاسی نے اپنے خطبوں میں انجیل کے ترجموں کا مفصل ذکر کیا ہے۔ ہم انیسویں صدی کے ایک ترجمے کا مختصر اقتباس بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔ اس کا ٹائٹل پیج یہ ہے: ''کتاب مقدس یعنی پرانا اور نیا عہد نامہ، پہلی جلد جس میں سب کتابیں پیدائش سے لے کے زبور کی کتاب تک مندرج ہیں، نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی کی طرف سے مرزا پور کے آرفن اسکول پریس میں

---

(۱) ماخوذ از ''یوپی میں اُردو'' مصنفہ منشی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی

ڈاکٹر میتھر صاحب کے اہتمام سے ۱۸۶۷ء میں چھاپی گئی۔'' نمونہ یہ ہے:-

''پھر اس نے دوسرا خواب دیکھا اور اسے اپنے بھائیوں سے بیان کیا اور کہا کہ دیکھو میں نے ایک خواب دیکھا کہ سورج اور چاند اور گیارہ ستاروں نے مجھے سجدہ کیا۔ اور اس نے یہ اپنے باپ اور بھائیوں سے بیان کیا (تب اس کے باپ نے اسے ڈانٹا اور اس سے کہا): کہ یہ کیا خواب ہے، جو تو نے دیکھا ہے؟ کیا میں اور تیری ماں اور تیرے بھائی سچ مچ تیرے آگے زمین پر جھک کے تجھے سجدہ کریں گے؟ اور اس سے بھائیوں کو رشک آیا، لیکن اس کے باپ نے اس بات کو یاد رکھا۔''

اُنیسویں صدی میں یہ سلسلہ جاری رہا کہ انگریز حکام اور اہل قلم اُردو زبان میں تصنیف و تالیف کرتے رہے۔ چونکہ عدالتی زبان اُردو ہو گئی تھی اس لیے شمالی ہند کی کچہریوں کی کارروائیاں اُردو میں ہوتی تھیں۔ خود انگریز حُکّام تجویزیں اور فیصلے اُردو میں لکھتے اور لکھواتے تھے۔ لیکن جب انگریزی تعلیم عام ہو گئی اور حکومت کو انگریزی داں ملازم ملنے لگے تو اُردو کی ضرورت نہ رہی اور سرکاری زبان انگریزی ہی ہو گئی۔ اس وقت انگریزوں نے بھی اُردو کی تصانیف سے توجہ ہٹالی۔ انگریز اب بھی اُردو سیکھتے ہیں۔ لیکن بولنے کے لیے زیادہ پڑھنے کے لیے کم۔ اور لکھنے کے لیے بہت کم۔ بیسویں صدی میں انگریزوں کی اُردو تحریروں کا سلسلہ بالکل ختم ہو گیا لیکن اُردو زبان سے دلچسپی اور اس کے متعلق تالیفات اب بھی ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۳۲ء میں گراہم بیلی نے ایک مختصر تذکرہ ''ہسٹری آف اُردو لٹریچر'' کے نام سے انگریزی میں لکھا ہے اور لندن سے شائع کیا ہے۔ سو صفحے کی کتاب ہے۔ ابتدائے اُردو زبان اور دکن کی تصانیف اُردو سے لے کر عصر حاضر تک کے مشہور اور خاص خاص شاعروں اور مصنفوں کا مختصر حال اور ذکر تصانیف درج کیا ہے۔ نمونہ نثر و نظم کچھ نہیں ہے۔ بعض جگہ غلطیاں بھی کی ہیں۔ لیکن کتاب کی ترتیب واضح اور دلچسپ ہے۔ اُردو کی رفتار و ترقی کا مجمل اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ مصنف نے اپنی تصنیف کے زمانہ (۱۹۳۲ء) کے زندہ و موجود مصنفین نثر میں کسی کا ذکر نہیں کیا۔ راشد الخیری اور پریم چند تک کو چھوڑ دیا ہے۔ شاعروں میں سے صرف ڈاکٹر اقبال کو لیا ہے۔ حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی کا بھی نام نہیں لیا۔ گراہم بیلی کے مطالعۂ شاعری اور نقد و نظر

کی ایک دلچسپ مثال درج کی جاتی ہے۔

اس نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں مختلف صورتوں سے اُردو شاعروں کے درجے قائم کیے ہیں اور بہتری اور برتری کے اعتبار سے ان کے ناموں کو مرتب کیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

(۱) سب سے بڑے شاعر۔ ان مجموعوں کی ترتیب مرتبے کے لحاظ سے ہے۔ اور مجموعوں کے اندر ناموں کی ترتیب زمانے کے اعتبار سے۔

(الف) میرؔ۔ غالبؔ۔ انیسؔ۔

(ب) ولیؔ۔ سودا۔ نظیرا کبر آبادی۔ اقبالؔ۔

(ج) دردؔ۔ میر حسنؔ۔ داغؔ۔ حالیؔ۔ اکبرؔ۔

(۲) بہترین غزل گوشعراء۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) میرؔ۔ ولیؔ۔ دردؔ۔ غالبؔ۔ مصحفیؔ۔ آتشؔ۔ داغؔ۔ امیر مینائی۔

(۳) بہترین قصیدہ نویس شعراء؛ (مرتبہ کے لحاظ سے) سوداؔ۔ ذوقؔ۔ نصرتیؔ دکنی۔

(۴) بہترین مرثیہ گوشعراء۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) انیسؔ۔ دبیرؔ۔ مونسؔ۔ خلیقؔ۔ ضمیرؔ اور دکن کے شعرائے مرثیہ ہاشمؔ علی مرزا۔

(۵) بہترین مثنوی گوشعراء۔ (مرتبہ کے لحاظ سے) میر حسنؔ۔ اثرؔ۔ میرؔ۔ نسیمؔ۔ مومنؔ۔ اور دکن کے شعراء غواصیؔ۔ نصرتیؔ۔ طبعیؔ۔ وجہیؔ۔

(۶) عام شاعری کے اعلیٰ شعراء۔ (بہ ترتیب زمانہ) قلی قطب شاہ بادشاہ گولکنڈہ۔ نظیرا کبر آبادی۔ حالیؔ۔ اکبرؔ۔ کیفیؔ حیدر آبادی۔ اقبالؔ۔

(۷) گزشتہ ۵۰ برس کے بہترین شعراء (علاوہ مذکورہ بالا شعراء کے) آزادؔ۔ جلالؔ۔ تسلیمؔ۔ اسمٰعیلؔ۔ شادؔ۔

(۸) گزشتہ ۱۰۰ برس میں بہترین نظم مسدس حالی ہے۔ بشرطیکہ انیسؔ کے مرثیوں کو ایک نظم نہ مانا جائے۔

ہم کو ان ترتیبوں سے بعض جگہ اختلاف ہے، لیکن یہ رائے گراہم بیلی کے وسیع مطالعے اور غائر نگاہ کا ثبوت ہے۔ چونکہ اہلِ یورپ کی اُردو زبان میں انشاپردازی کا سلسلہ

ختم ہے۔ اس لیے ہم نے یورپین مصنفین نثر کا ذکر یہیں ختم کر دیا ہے۔ کہ نثر کے متعلق ان کی کارگزاریاں ایک جگہ نظر آ جائیں۔

نثر کا تیسرا دَور

(ا) مصنفین فورٹ ولیم کالج

۱۸۰۰ء تا ۱۸۲۰ء

۴ رمئی ۱۸۰۰ء (مطابق ۷ رذی الحجہ ۱۲۱۴ھ) کو لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا۔ اس سے پہلے کمپنی کے انگریز ملازموں کے لیے اُردو کی تعلیم کا کوئی باقاعدہ بندوبست نہ تھا۔ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل اول نے دیسی کالج کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا تھا جس میں انگریز ملازم اور ہندوستانی طلباء فارسی پڑھتے تھے۔ لیکن یہاں اُردو یا کوئی ملکی زبان نہ پڑھائی جاتی تھی۔ فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کمپنی کی طرف سے ہر انگریز ملازم کو تیس روپیہ فی کس دیے جاتے تھے۔ وہ لوگ اُردو اپنے طور پر پڑھ لیتے تھے، یا انگریز حُکام اپنے ماتحتوں کے لیے اُردو کی تعلیم کا انتظام کر دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مغلیہ سلطنت کی زبان فارسی تھی۔ فارسی ہی میں تمام عدالتی اور ملکی کاروبار انجام پاتے تھے۔ سلطنت کے اثر سے شمالی ہند میں کثرت سے اور عام طور پر اور کم و بیش تمام ہندوستان میں فارسی تعلیم کا رواج تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی پہلا اور بڑا تعلق سلطنت مغلیہ ہی سے پیدا کرنا تھا۔ اس لیے انگریز بھی فارسی کی تحصیل پر زیادہ توجہ دیتے تھے، لیکن مغلیہ سلطنت اور فارسی زبان کا تنزل اور اُردو زبان کی ترقی اس سرعت کے ساتھ جاری تھی کہ لارڈ ویلزلی نے انگریزوں کے لیے اُردو کی ضرورت کو محسوس کر لیا۔ اور اس کی باضابطہ تعلیم کا انتظام کر دیا۔ اس ضرورت کے ساتھ ہی گورنر جنرل کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ جو انگریز کمپنی میں ملازم ہو کر آتے ہیں وہ ولایت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نہیں آتے اور کاروائی اور حکمرانی کے لیے علوم و فنون کی مہارت ضروری ہے۔

اس لیے اس نے یہ چاہا تھا کہ یہ فورٹ ولیم کالج علوم وفنون کی اعلیٰ درس گاہ ہو، جس میں علمی زبانیں عربی وفارسی و سنسکرت بھی پڑھائی جائیں اور ملکی زبانیں اُردو، بنگالی اور مرہٹی وغیرہ بھی، اور یورپین زبانیں انگریزی، لاطینی، یونانی بھی۔ اور علوم وفنون کی تعلیم بھی دی جائے، جن میں تاریخ عالم، تاریخ ہند، جغرافیہ، اصول قانون، شرح اسلام، دھرم شاستر وغیرہ شامل ہوں لیکن کمپنی نے ایسے عظیم الشان کالج کے مصارف کثیر برداشت کرنے سے قطعاً انکار کردیا۔ اس لیے کالج کو صرف زبان دانی کا کالج بنانا پڑا۔

ڈاکٹر گلکرائسٹ اس کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے، وہ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، اُردو کے بڑے حامی اور ماہر تھے، اور کئی سال پہلے سے اُردو کی خدمت کر رہے تھے، کمپنی کے ملازموں کو بھی اپنے طور پر اُردو پڑھایا کرتے تھے۔ اب کالج میں باقاعدہ اُردو کی تعلیم شروع کردی۔ اور اپنی مدد کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھی مدرس مقرر کیا۔ اس تعلیم کے ساتھ ہی انھوں نے اُردو کی تالیف وتصنیف کا محکمہ بھی قائم کردیا۔ اور ہندوستانی اہل زبان اور ماہران فن سے اُردو زبان میں ترجمہ وتصنیف کا کام بھی لینا شروع کیا۔ اوران کتابوں کے چھاپنے کے لیے اُردو ٹائپ کا مطبع بھی قائم کردیا۔ یہی ہندوستان میں سب سے پہلا چھاپہ خانہ تھا۔ (۱)

---

(۱) فورٹ ولیم کے چھاپے خانے کے بعد انگریز پادریوں نے سیرامپور میں مطبع قائم کیا۔ پادری مارٹن نے انجیل کے عہد جدید کا ترجمہ ۱۸۱۴ء میں یونانی زبان سے اُردو زبان میں کیا۔ سیرامپور کے مشنریوں نے پوری بائبل کا ترجمہ پانچ جلدوں میں ۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۹ء تک شائع کیا۔ لکھنؤ میں نواب غازی الدین حیدر (سال جلوس ۱۸۱۴ء، ﴿۱۲۲۹ھ﴾ کے زمانے میں ٹائپ کا مطبع قائم ہوا۔ اس میں سب سے پہلی کتاب ہفت قلزم (فارسی لغت) طبع ہوئی۔ لیتھو کا سنگی مطبع سب سے پہلے ۱۸۳۰ء میں ایک انگریز مسٹر آرچر نے کانپور میں جاری کیا۔ ۱۸۳۵ء میں دہلی میں سنگی مطبع قائم ہوا۔ اور ۱۸۳۶ء میں دہلی سے مولوی محمد باقر (مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے والد) نے دہلی اُردو اخبار جاری کیا۔ یہ اُردو زبان کا دوسرا اخبار تھا۔ پہلا اُردو اخبار مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا۔ نواب نصیر الدین حیدر (سال جلوس ۱۸۲۷ء، ﴿۱۲۴۳ھ﴾) نے مسٹر آرچر کو کانپور سے (باقی صفحہ ۱۱۸ پر)

اس وقت تمام ملک میں اُردو کی ایک کتاب نثر بھی ایسی نہ تھی جس کو فورٹ ولیم کالج کے نصاب تعلیم میں شامل کیا جاتا۔ مطبوعہ کتاب کا تو اس سے پہلے امکان ہی نہ تھا۔ قلمی کتابوں میں فضلی کی وہ مجلس یا کربل کتھا اور شاہ صاحبان دہلوی کے تراجم قرآن مجید مذہبی کتابیں تھیں۔ انگریزوں کے کام کی نہ تھیں۔ تحسین کی نوطرز مرصع مشکل اور ادق تھی۔ اور جو کتابیں متفرق لوگوں نے لکھیں وہ قلمی ہونے کے سبب سے اور غیر مشہور اشخاص کی

(بقیہ صفحہ ۱۱۷ کا) بُلا کر لکھنؤ میں سنگی مطبع قائم کیا جس میں سب سے پہلی کتاب شرح الفیہ چھپی۔ ۱۸۳۷ء میں دہلی میں ٹائپ کا مطبع بھی قائم ہوگیا۔ اس سال کے بعد تمام ہندوستان میں لیتھو کے چھاپے خانے کھلنے لگے، اور اخبارات نکلنے لگے۔ آگرہ، میرٹھ، بنارس، بریلی، پنجاب، بمبئی، مدراس وغیرہ میں بڑی کثرت سے مطابع و اخبارات جاری ہوگئے۔ ۱۸۴۹ء میں صرف ممالک مغربی شمالی (یعنی موجودہ یوپی، دہلی اور پنجاب) میں ۲۳ مطبع تھے جن میں سے بارہ مطبع صرف لکھنؤ میں تھے۔ اور ان مقامات پر ۲۳ اخبار اُردو کے نکلتے تھے۔ اُس سال تمام ہندوستان کے اُردو اخباروں اور رسالوں کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔ اور صرف ممالک مغربی شمالی میں ۱۴۱ کتابیں طبع ہوئی تھیں۔ غدر کے اگلے سال ۱۸۵۸ء میں مطبع نولکشور قائم ہوا، اور اسی سال مطبع سے اودھ اخبار جاری ہوا۔ یہ اخبار آیندہ چل کر روزانہ ہوگیا اور ملک کے ممتاز اخباروں میں شمار ہونے لگا۔ اور مطبع نولکشور کو اس قدر ترقی ہوئی کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ممالک مشرقی میں اس سے بڑا مطبع نہ تھا۔ لیکن صحت کتابت اور حسن طباعت کے اعتبار سے منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی کانپور نے نام پیدا کیا جو انیسویں صدی کے آخر میں قائم ہوا تھا اور بیس سال سے زیادہ ملک کی خدمت کر کے اپنے مالک کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اس کی مطبوعات حسن و خوبی کے لحاظ سے ایشیا بھر میں بے نظیر تھیں۔ قدیم مطابع میں مطبع نولکشور کے علاوہ صوفی قادر علی خاں کے مطبع مفید عام آگرہ کو بھی فن طباعت میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ بیسویں صدی میں متعدد اعلیٰ مطابع جاری ہوئے۔ کامیاب رہے اور قائم ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں بلاک کی چھپائی اس قدر عام اور ارزاں ہوگئی ہے کہ تمام سنگی مطابع کی خوشنمائی اس کے سامنے ہیچ ہے۔ عمومیت اس قدر کہ جنتریاں اور دواخانوں کی فہرستیں پوری بلاک سے چھاپی جاتی ہیں اور ارزانی اتنی کہ بلاک کا چھپا ہوا پورا قرآن مجید ایک روپیہ میں اور حمائل شریف آٹھ آنے میں دستیاب ہوسکتی ہے۔ یہ مطابع کی مختصر تاریخ ہے۔ اس کی تفصیلات موقع بموقع کتاب کے اندر آئیں گی۔

تصانیف ہونے کی وجہ سے گمنام تھیں اور اب ان کا پتہ چلا ہے تو مشکل سے کوئی کتاب مذہبی تعلیم سے علیٰحدہ عام لٹریچر (تاریخ، سیرت، فسانہ وغیرہ) کے متعلق تھی۔ اس لیے ڈاکٹر گلکرائسٹ کا اُردو زبان پر کتنا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اُردو کا سب سے پہلا لٹریچر گویا ایجاد کر دیا۔ ہندوستان کے ذی علم واہل زبان لوگوں کو جمع کیا اور کتابیں لکھوائیں۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ صرف چار سال اس کالج میں رہے، لیکن ان کا شروع کیا ہوا کام جاری رہا، ان کے قائم مقام انگریز پرنسپل اور منتظم اس محکمۂ تالیف وتصنیف کی نگرانی وسرپرستی کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بعد کپتان ٹامس روبک کالج کے پرنسپل ہوئے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی ان کی تالیفات میں مدد دی اور خود بھی لغت جہاز رانی وغیرہ کتابیں لکھیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر بھی فورٹ ولیم کالج کے اُردو پروفیسر تھے۔ ان کی تصنیفات اُردو کا ذکر بھی پہلے کیا جاچکا ہے۔ اب کالج کے ہندوستانی مصنفوں کا تذکرہ لکھا جاتا ہے۔

میر امّن دہلوی: میر امّن کا نام میر امان تھا اور امّن تخلص، لیکن میر امّن کے نام سے مشہور ہیں۔ میر امّن فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں پہلے نہیں ہیں۔ ان سے پہلے میر بہادر علی حسینی وہاں میر منشی تھے۔ میر امّن کے دوست تھے، انھی کے ذریعہ سے میر امّن ملازم ہوئے۔ میر امّن نے کتابیں بھی اوروں سے کم لکھیں، یعنی صرف دو، باغ و بہار اور گنج خوبی۔ ان میں سے بھی صرف باغ و بہار ہی مشہور ہے۔ دوسری کا نام بھی کم لوگ جانتے ہیں۔ لیکن اکیلی باغ و بہار نے ان کے نام کو غیر فانی بنا دیا ہے۔ دلّی کی زبان، اردوئے معلّی کے روز مرّہ اور محاورے، بیان کی دلکشی، فقروں کی شگفتگی، مکالموں کی دلفریبی، حسب موقع اختصار وتطویل، مناظر کی تصویر، یہ سب خوبیاں اس زمانے کے کسی مصنف میں ایسے کمال کے ساتھ یک جا نہیں ہیں۔ میر امّن کے ذاتی حالات کسی تذکرے میں اتنے بھی نہیں ملتے جتنے انھوں نے خود "باغ و بہار" کے دیباچہ میں لکھ دیے ہیں۔ ہم انھی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں کہ یہ ان کے نمونۂ تحریر کا بھی کام دیں گے۔

"میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجا

لاتے رہے، اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدر دانی جتنی چاہئے فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز فرما کر مالا مال اور نہال کر دیا، اور "خانہ زاد موروثی و منصبدار قدیمی" زبان مبارک سے فرمایا۔ چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اسی گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے۔ عیاں راچہ بیاں، تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا۔ احمد شاہ درّانی نے گھر بار تاراج کیا، ایسی ایسی تباہی کھا کر ایسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلاوطن ہوا، اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا، غارت ہوا۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے، کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا، کچھ بنی، کچھ بگڑی، آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے، روزگار نے موافقت نہ کی، عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا، اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانہ کے زور سے آپہونچا۔ چندے بیکاری میں گذری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا۔ لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا، تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلہ سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوانمرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہئے کہ کچھ دن بھلے آویں، نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دعا اس قدر دان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔"

باغ و بہار کے قصے کا ماخذ اور طرز تحریر بھی خود میر امن کی زبانی یہ ہے:-

"قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلویؒ نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زر بخشؒ جو ان کے پیر تھے (اور درگاہ ان کی قلعہ میں تین کوس لال دروازے کے باہر متیا دروازے سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے) ان کی طبیعت ماندی ہوئی۔ تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انھوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصہ کو سنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا۔ اب خداوند نعمت، صاحب مروت، نجیبوں کے قدردان، جان گل کرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ

قصّے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام، آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

باغ و بہار ۱۸۰۱ء ﴿۱۲۱۵ھ﴾ میں لکھنا شروع کیا اور ۱۸۰۲ء ﴿۱۲۱۷ھ﴾ میں ختم کیا۔ ۱۸۰۳ء میں پہلی بار طبع ہوا۔ باغ و بہار تاریخی نام ہے (۱۲۱۷ھ نکلتا ہے) میر امّن نے فارسی کے قصّے کو اپنی کتاب کی اصل بتایا ہے۔ لیکن ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے اپنے مقدمۂ باغ و بہار میں ثابت کیا ہے کہ میر امّن نے باغ و بہار کو چہار درویش سے ترجمہ نہیں کیا، بلکہ تحسین کی نوطرزِ مرصع کو دیکھ کر لکھا ہے، لیکن تحسین کی ثقیل عبارت کو سلیس کر دیا ہے۔ غیر ضروری باتوں کو چھوڑ دیا ہے، ضروری باتوں کا اضافہ کیا ہے۔ حسب ضرورت مختصر بیان کو مفصل اور مفصل کو مختصر کر دیا ہے اور بحثیت مجموعی کتاب کو اپنا بنالیا ہے۔ میر امّن نے قواعد زبان کی پابندی سے زیادہ روزمرّہ اور محاورہ اور بول چال کا خیال رکھا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ اُردو کے مقابلے میں میر امّن کی زبان میں تذکیر و تانیث کا اختلاف، قدیم محاورے، ہندی کے الفاظ پائے جاتے ہیں جو اب متروک ہیں۔

اسی قصّے کو اسی سال (۱۲۱۷ھ) میں ایک اور شخص محمد عوض زرّیں نے لکھا ہے۔ اس نے "قصہ چہار درویش" کو پہلے فارسی میں لکھ کر راجہ رام دین برادر راجہ سیتل پرشاد کو دکھایا، اور راجہ کی فرمائش پر پھر اس کو اُردو میں لکھا۔ عجیب بات ہے کہ زرّیں نے تحسین کی کتاب کے دیکھنے کا ذکر نہیں، لیکن نام وہی تحسین والا رکھا ہے، یعنی نوطرزِ مرصع اور عجیب تر یہ کہ زرّیں کو میر امّن کی کتاب کی خبر نہیں، لیکن اس نے تاریخ تصنیف وہی میر امّن والی نکالی ہے، یعنی باغ و بہار۔ دیباچہ میں لکھتا ہے:-

بنا کر یہ گلدستۂ روزگار ‏ ‏ ‏ ‏ لکھی اس کی تاریخ باغ و بہار

محمد عوض زرّیں نے وہی چار درویشوں کے قصّے لکھے ہیں، لیکن بہت مختصر، قافیہ پیمائی کی ہے۔ لیکن عبارت بالکل سادہ ہے۔ کوئی لطف اور کوئی خصوصیت ان دونوں کتابوں کے

مقابلے میں نہیں ہے۔ البتہ کتاب کے اندر جا بجا، بلکہ اکثر صفحوں پر کئی کئی جگہ دو دو چار چار شعر لکھے ہیں جو مثنوی کی طرز میں ایک ہی بحر کے ہیں اور بیان داستان کا جزو ہیں۔ یہ نظم نثر سے زیادہ دلچسپ ہے۔

میر امّن کی باغ و بہار اس قدر مقبول ہوئی کہ انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، لاطینی زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ اُردو میں متعدد شاعروں نے نظم کیا۔ میر امّن کی زبان و بیان کو ہر ہندوستانی اور یورپین نے سراہا ہے۔ فرانسیسی مستشرق گارسن دتاسی نے اپنے خطبات میں بار بار باغ و بہار کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کی خوبیاں گنائی ہیں۔ ایک جگہ کہتا ہے:۔ ’’اس کتاب (۱) کے پڑھتے وقت آپ بہت مفید اور کار آمد بات یہ پائیں گے کہ ان قصوں میں ہر صفحہ پر آپ کو قومی خصوصیات کے متعلق ایسی باتیں ملیں گی جو ہمیں اصلی ہندوستان اور خاص کر اسلامی ہندوستان کو سمجھنے میں بہت کار آمد ہوں گی۔‘‘ دوسرے خطبے میں باغ و بہار کی ایک اور خصوصیت کا ذکر کرتا ہے اور اس کو اعتراض کے طور پر بیان کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ گارسن دتاسی عیسائی ہے، اس کو اسلام کی اشاعت و تبلیغ پسند نہیں اور اس بات کو قصے میں عجیب سمجھتا ہے۔ لیکن میر امّن مسلمان ہیں، قصے کے کسی مسلمان شخص کو مسلمان دکھانا، یا بقول دتاسی اسلام کی تبلیغ کرنا ان کے لیے بالکل درست بلکہ فطری بات ہے۔ ہم گارسن دتاسی کی تنقید درج کرتے ہیں، اور اس نے باغ و بہار کے جن فقروں کا حوالہ دیا ہے، ان کو میر امّن کے الفاظ میں باریک قلم سے نقل کرتے ہیں۔ یہ مختصر ٹکڑا باغ و بہار کے مکالمات کی بھی چھوٹی سی دلچسپ مثال ہے۔

گارسن دتاسی کہتا ہے:۔ ’’باغ و بہار کی نسبت میں اپنے ۱۸۵۳ء کے خطبے میں ذکر کر چکا ہوں۔ اس جگہ پھر ایک امر کی جانب اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، وہ یہ ہے کہ اسلامی قصوں میں آپ ہمیشہ دیکھیں گے کہ تبلیغ اسلام کی جانب کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور اشارہ کیا جاتا ہے۔ اور غنائی شاعری، تصوف، عشق مجازی اور

---

(۱) خطبات گارسن دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اُردو

ہمہ اوست کے مسائل سے آگے نہیں بڑھتی۔قصوں میں اسلامی عقائد اثباتی نوعیت کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں، اور اسلام کی جانب غیر مسلموں کو نہایت موثر انداز میں رجوع کیا جاتا ہے، مثلاً باغ و بہار میں جہاں بخارا کے تاجر کا ذکر ہے کہ اسے کیوں کر دختر وزیر کی وساطت سے مصائب سے نجات ملتی ہے، تو وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تاجر دوگانہ شکرانے کا روبقبلہ ہو کر پڑھنے لگا۔وزیر کی لڑکی یہ حرکات و سکنات دیکھ کر متعجب ہوتی ہے اور اس تاجر سے دریافت کرتی ہے کہ وہ یہ کیا کر رہا ہے؟ تاجر جواب دیتا ہے۔

''جس خالق نے ساری خلقت کو پیدا کیا اور تجھ سی محبوبہ سے میری خدمت کروائی اور تیرے دل کو مجھ پر مہربان کیا اور زنداں سے خلاص کروایا، اس کی ذات لاشریک ہے، اس کی میں نے عبادت کی اور بندگی بجالایا، اور ادائے شکر کیا، یہ بات سن کر کہنے لگی، تم مسلمان ہو؟ میں نے کہا، شکر الحمدللہ۔بولی میرا دل تمھاری باتوں سے خوش ہوا، میرے تئیں بھی سکھاؤ اور کلمہ پڑھاؤ، میں نے دل میں کہا کہ الحمدللہ کہ یہ ہمارے دین کی شریک ہوئی۔غرض میں نے لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا، اور اس سے پڑھوایا۔''

(باغ و بہار)(۱)

باغ و بہار اس زمانے کے تمدن و معاشرت کا آئینہ ہے۔اسلامی عقائد اور ضعیف العتقادیاں، رسم ورواج، طعام ولباس، مشاغل و معمولات، آداب و اخلاق غرض ہر قسم کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔میر امّن شاعر بھی تھے، لیکن پیشہ ور نہیں۔صرف تفریحی و اتفاقی۔امّن اور لطف دونوں تخلص تھے۔

میر امّن کی دوسری کتاب گنج خوبی ہے۔یہ ملاّ حسین واعظ کاشفی (مصنف انوار سہیلی) کی اخلاق محسنی کا ترجمہ ہے۔اس کے متعلق میر امّن خود لکھتے ہیں:۔

''لیکن فقط فارسی کے ہو بہو معنی کہنے میں کچھ لطف و مزا نہ دیکھا، اس لیے اس کا مطلب لے کر اپنے محاورے میں سارا احوال بیان کیا۔'' (گنج خوبی)

یہ کتاب بھی ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے باغ و بہار کے بعد ۱۸۰۲ء ﴿۱۲۱۷ھ﴾ میں

---

(۱) یہ عبارت بھی مع باغ و بہار کے اقتباس کے خطبات گارسن دتاسی سے ماخوذ ہے۔

لکھی تھی۔ لیکن اس کو شہرت اور مقبولیت نصیب نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کو چھپوایا بھی نہیں۔ مدتوں بعد ۱۸۷۵ء (۱۲۹۲ھ) میں مطبع محبوب بمبئی میں چھپی۔ اس کا ایک بوسیدہ نسخہ مولوی سیّد محمد صاحب بی اے (عثمانیہ) کو کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد دکن) میں ملا ہے۔ جس سے انھوں نے ایک حکایت بطور نمونہ اپنی تالیف (ارباب نثر اُردو) میں نقل کی ہے۔ کتاب کے نادر نایاب ہونے کے سبب سے ہم بھی اس حکایت کو درج کرتے ہیں۔ کمیاب چیز کا جس قدر حصہ جتنا مشتہر ہو جائے غنیمت ہے:۔

کہتے ہیں کہ ایک بزرگ نے اپنی زندگی کی امانت اجل کے فرشتے کو سونپی اور اسباب اپنی ہستی کا اس سرائے فانی سے منزل باقی میں پہونچایا، کسو شخص نے انھیں خواب میں دیکھا، اور پوچھا کہ مرنے کے بعد تم پر کیا کیا واردات گزری، اور اب کیا حال ہے، جواب دیا کہ ایک مدت تئیں عذاب کے عقاب کے پنجے میں سختی کے شاہین کے چنگل میں گرفتار تھا، ایک بارگی کریم کے کرم سے چھٹکارا ہوا، اور سارے گناہ معاف ہو گئے۔ سائل نے پھر سوال کیا کہ اس کا کیا سبب ہے اور باعث ہے، کچھ تمھیں معلوم ہو تو بیان کرو کہ کس کے وسیلہ سے نجات پائی۔ بولے کہ ایک میدان میں مسافر خانہ بنایا تھا۔ شاید کوئی غریب راہ چلتا جیٹھ کے دنوں میں دوپہر کی دھوپ میں تونسا ہوا اس کے سائے میں آنکر بیٹھا، اس نے کوئی دم آرام پایا، جب ٹھنڈی ہوا اور راہ کی ماندگی سے ہرا ہوا، خوش ہو کر نہایت عاجزی سے بدل دعا کی کہ اے بارالٰہا، اس مکان کی بنا کرنے والے کے گناہ بخش، اور اس کی روح کو فردوس کی چھاؤں میں جگہ دے۔ وہیں اس کی دعا کا تیر قبولیت کے نشانے پر درست بیٹھا، میری آمرزش ہوئی اور جہنم کے گڑھے سے نکال کر بہشت کے غرفے میں رہنے کا حکم ہوا۔ بیت:۔

ہر چند کہ سب کاموں میں مَیں غور کروں ہوں — نیکی ہی بھلی سب میں ہے اور باقی ہے سب پوچ"

سیّد حیدر بخش حیدری: فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں حیدری نے سب سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، لیکن نہ سب کی سب شائع ہوئیں، نہ سب کے قلمی نسخے ملتے ہیں۔ حیدری کے آبا و اجداد نجف اشرف سے ہندوستان آئے، دہلی میں سکونت اختیار کی۔ ان کے والد کا نام سیّد ابوالحسن ہے۔ معاش سے پریشان ہو کر ان کے والد لالہ سکھدیو رائے کے ساتھ دہلی سے بنارس چلے گئے اور وہیں رہنے لگے۔ بنارس میں نواب علی ابراہیم خاں

خلیل (مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم) عدالت کے جج تھے۔ حیدری کی تعلیم و تربیت نواب صاحب کی صحبت میں ہوئی۔ جب فورٹ ولیم کالج کا افتتاح ہوا اور وہاں ہندوستانی منشیوں کی ضرورت ہوئی تو حیدری نے اُردو میں قصہ مہر و ماہ لکھا اور اس کو لے کر کلکتہ پہنچے۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ کے سامنے اپنی تصنیف پیش کی۔ انھوں نے بہت پسند کی اور حیدری کو ملازم رکھ لیا۔ حیدری ۱۸۱۴ء ﴿۱۲۲۹ھ﴾ سے پہلے اس ملازمت سے سبک دوش ہوکر بنارس واپس آگئے۔ اور ۱۸۲۳ء ﴿۱۲۳۸ھ﴾ میں انتقال کیا۔ حیدری کی تصنیفات کی فہرست یہ ہے:-

(۱) قصہ مہر و ماہ۔ حیدری کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اوائل ۱۲۱۴ھ (وسط ۱۷۹۹ء) میں لکھی۔ اس کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔

(۲) قصہ لیلیٰ و مجنوں۔ امیر خسرو کی فارسی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا اُردو ترجمہ ہے۔ ۱۸۰۰ء ﴿۱۲۱۴ھ﴾ میں تمام ہوا۔ یہ بھی مفقود ہے۔

(۳) ہفت پیکر۔ حیدری کی تصنیف منظوم ہے۔ نظامی گنجوی کی اسی نام کی مثنوی کے جواب میں مثنوی ہے۔ ۱۸۰۵ء ﴿۱۲۲۰ھ﴾ میں لکھی گئی۔ مرزا کاظم علی جواں نے اس کی تاریخ تصنیف کہی تھی: "جان تازہ ہفت پیکر یہ ہوئی" (۱۲۲۰ھ) یہ بھی اب ناپید ہے۔

(۴) تاریخ نادری۔ فارسی تصنیف تاریخ جہاں کشائے نادری (۱) مصنفہ مرزا محمد مہدی استر آبادی کا اُردو ترجمہ ہے۔ مہدی نادر شاہ کا مصاحب تھا۔ اپنے آقا کے حالات (تا وفات نادر شاہ ۱۷۴۷ء ﴿۱۱۶۰ھ﴾) لکھے ہیں۔ یہ کتاب تاریخ نادری کے نام سے مشہور ہے۔ یہی نام حیدری نے اپنے ترجمے کا رکھا۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۹ء ﴿۱۲۲۴ھ﴾ میں ختم ہوا۔ یہ بھی نایاب ہے۔

---

(۱) "تاریخ جہاں کشا" کے نام سے فارسی کی ایک اور تاریخ بھی مشہور ہے۔ ان دونوں کو خلط ملط نہ کرلیا جائے۔ وہ فارسی تاریخ اس فارسی تاریخ سے پانسو برس پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ ابن عطا ملک جوینی نے چنگیز و ہلاکو کے حالات ۱۲۶۰ء ﴿۶۵۸ھ﴾ لکھے ہیں۔ جوینی بھی ہلاکو خاں کا ملازم و مصاحب تھا، جیسے مہدی نادر شاہ کا۔

(۵) گلزار دانش۔ شیخ عنایت اللہ کی فارسی تصنیف بہار دانش کا اُردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ کا سنہ دریافت نہ ہوا۔ فارسی کی تصنیف ۱۶۵۱ء ﴿۱۰۶۱ھ﴾ میں ہوئی ہے۔ جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کا قصہ ہے۔ عنایت اللہ نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ قصہ فرضی نہیں بلکہ سچا واقعہ ہے۔ بہر حال حیدری کی گلزار دانش بھی اب گم ہے۔

(۶) گلدستۂ حیدری۔ میں حیدری کی متفرق تالیفات جمع ہیں۔ یعنی (۱) مجموعہ مراثی (۲) حکایات ولطائف (۳) دیباچۂ مہر وماہ (۴) دیباچۂ لیلیٰ مجنوں (۵) غزلیات و قصائد وغیرہ۔ یہ کتاب بھی طبع نہیں ہوئی اور کمیاب ہے۔

(۷) گلشن ہند۔ شعرائے اُردو کا تذکرہ ہے جو حیدری نے ۱۸۰۰ء ﴿۱۲۱۴ھ﴾ میں ختم کیا۔ عجب اتفاق ہے کہ فورٹ ولیم کالج ہی کے ایک اور متوسل میرزا علی لطف نے اسی زمانے میں شعرائے اُردو کا تذکرہ لکھا ہے اور اس کا نام بھی گلشن ہند رکھا ہے۔ لطف کا تذکرہ ۱۸۰۱ء ﴿۱۲۱۵ھ﴾ میں تمام ہوا ہے۔ دونوں نے اختتام تالیف کی جو تاریخیں نکالی ہیں ان سے یہی سنہ نکلتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدری نے اپنی تالیف لطف سے ایک سال پہلے پوری کی۔ حیدری نے یہ قطعہ تاریخ کہا ہے:-

مرتب کر چکا جب تذکرہ میں ۔۔۔ زروئے حق^ یہ بولے شیخ اور رند
کہی تاریخ اس کی حیدری خوب ۔۔۔ "اسے کہتا ہے ہر ایک گلشنِ ہند"

۱۲۰۶
۸
۱۲۱۴ھ

اور میرزا علی لطف کا قطعہ یہ ہے:-

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا ۔۔۔ کہتا ہے یوں خزاں سے کہ تو کیا پلشت (۱) ہے
حیراں پھرے ہیں بے سرو پا بہمن اور دے ۔۔۔ تاریخ اس کی جب سے کہ "رشکِ بہشت" (۲) ہے

۱۲۲۷
۱۲
۱۲۱۵ھ

---

(۱) پلشت = ذلیل وزبوں

(۲) مؤلف "ارباب نثر اُردو" کو (جن کی تالیف سے یہ حالات اور اقتباسات ماخوذ ہیں) (باقی صفحہ ۱۲۷ پر)

حیدریؔ کا یہ تذکرہ کمیاب ہے۔ انگلستان میں اس کی دو کاپیاں ہیں۔ ان میں سے برٹش میوزیم کے نامکمل نسخہ سے تھوڑا سا اقتباس ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ (پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) نے مولوی سیّد محمد صاحب کو بھیجا تھا، جو انھوں نے ''ارباب نثر اُردو'' میں درج کیا ہے۔ اس میں سے صرف مؤلف (حیدری) کا حال ہم نقل کرتے ہیں:۔

''احوالِ مؤلف۔ اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام مع اشعار و تخلص کے جمع کئے اور کئی جز بخوبی تمام لکھے۔ افسوس ہے کہ دو جز حرف شین سے لے کر حرف ی تک خدا جانے کیا ہوئے۔ اس واسطے نوبت تحریر حرف ی تک نہ پہونچی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اگر زمانہ اسی صورت سے قدرے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سرے احوال ان شعراؤں کا خاطر خواہ لکھتا ہے، اور یہ جلد دو چار جز کی جو کلام و ابیات سے تیار ہوئی سود سگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہٗ کی وہ دستگیر درماندگاں اور حامی بے کساں ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں خوش و خرم رکھے اور مشکل کشائی اس کی مشکل کشا کیا کرے بہ حق محمد و آلہٖ الامجاد''

حیدری نے اپنے تذکرہ میں میر شیر علی افسوسؔ کا حال دو سطروں میں لکھا ہے، اور میرزا سوداؔ دہلوی کا ایک سطر میں۔ اس حساب سے بے شک شین سے لے کر ی تک دو جز ہوئے ہوں گے۔ اور الف سے سین تک بھی دو جز سے زیادہ کیا ہوں گے۔ گویا پورا تذکرہ چار پانچ جز کا ہوا۔ حالانکہ لطفؔ کا تذکرہ باوجود پبلشر کی قطع و برید کے دو سو صفحوں پر طبع ہوا ہے۔ البتہ حیدری کی عبارت سادہ و سلیس ہے، اور لطف کی مقفّیٰ اور پیچدار (جیسا کہ آگے نمونہ سے معلوم ہوگا)۔

(صفحہ ۱۲۶ سے آگے) ''رشکِ بہشت'' سے تاریخ نکالنے میں غلط فہمی ہوئی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''جب'' کے اعداد کا تخرجہ کیا جائے تو ۱۲۱۵ھ نکلتا ہے۔ ''رشکِ بہشت'' کے اعداد ۱۲۲۷ ہیں۔ ''جب'' کے ۵ عدد گھٹائے جائیں گے تو ۱۲۲۲ بچیں گے۔ اس کے علاوہ قطعہ کے چوتھے مصرع میں (جب سے) کا اشارہ جمع کرنے کی طرف ہو سکتا ہے۔ تفریق کی طرف نہیں۔ انھوں نے قطعہ کے تیسرے مصرع پر غور نہیں کیا۔ بہمن اور دے کے بے سروپا ہونے سے یہ مقصد ہے کہ بہمن کا سر (ب) اور (دے) کا پاؤں (ے) لے کر ان کے ۱۲ اعداد تفریق کیے جائیں گے۔ قادریؔ

(۸) طوطا کہانی۔ حیدری کی شہرت ان کی دس تالیفات میں سے دو کتابوں کے سبب سے ہے، جن میں سے ایک "طوطا کہانی" ہے۔ اس کے متعلق خود حیدری کا بیان ہے:-

"بہ موجب فرمائش صاحب موصوف (یعنی گل کرائسٹ) کے محمد قادری کے طوطی نامہ کا جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین بخشی ہے۔ زبان ہندی میں موافق محاورے، اُردو معلی کے عبارت سلیس وخوب، الفاظ رنگین ومرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطی کہانی رکھا"

ہم نے طوطی نامہ اور اس کے تراجم کا ذکر اسی تاریخ اُردو کے صفحہ ۴۱ و ۴۲؟ پر متن وحاشیہ میں کر دیا ہے۔ حیدری کی طوطا کہانی ۱۸۰۱ء ﴿۱۲۱۵ھ﴾ میں لکھی گئی اور ۱۸۰۴ء میں شائع ہو کر کالج کے نصاب میں شامل کی گئی۔ یہ کتاب نہایت مقبول ہوئی اور بار بار مختلف مطابع میں چھپی۔ ۱۸۵۲ء میں ڈنکن فاربس نے لندن سے اس کا نہایت خوبصورت ایڈیشن شائع کیا۔ جی اسمال نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مختصر نمونہ یہ ہے:-

"جب سورج چھپا اور چاند نکلا خجستہ باسینہ پر سوز چشم گریاں آہیں بھرتی ہوئی طوطے کے پاس گئی اور کہنے لگی اے سبز پوش طوطے میں عشق کے غم سے موئی جاتی ہوں اور تو ہر ایک شب میری نصیحت اور گفتگو میں کھو دیتا ہے۔ فرد:-

نصیحت کی باتیں نہ مجھ کو سنا   میں عاشق ہوں، مجھ کو نصیحت سے کیا

طوطا کہنے لگا اے خجستہ یہ کیا کہتی ہے۔ دوستوں کی بات ماننا چاہیے، کیونکہ جو کہنا دوستوں کا نہیں مانتا خراب ہوتا اور پشیمانی کھینچتا ہے۔"

(۹) آرایشِ محفل۔ حیدری کی دوسری مشہور کتاب ہے۔ داستان حاتم طائی کی سات سیروں کا فسانہ ہے۔ اس لیے عبد الغفور نساخ نے اپنے تذکرہ "سخن شعراء" میں حیدری کی اس کتاب کا نام ہفت سیر حاتم لکھا ہے۔ حیدری نے ۱۸۰۲ء ﴿۱۲۱۶ھ﴾ میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش کے مطابق فارسی کی داستان کو اُردو میں لکھا۔ محض ترجمہ نہیں کیا بلکہ کمی وبیشی کر کے نئی اور زیادہ دلچسپ بنا دی۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:-

"......زبان ریختہ میں اپنی طبع کے موافق اس کتاب سے جو ہاتھ لگی تھی ترجمہ نثر میں کیا، اور اس کا نام آرایش محفل رکھا، مگر اس میں اپنی طبیعت سے جہاں جہاں موقع اور مناسب پایا وہاں زیادتیاں کیں

تا کہ قصہ طولانی ہو جائے اور سننے والوں کو خوش آئے۔"

اسی نام سے ایک کتاب میر شیر علی افسوسؔ نے لکھی ہے۔ وہ بالکل الگ چیز ہے، اور حیدری کی کتاب کے کئی سال بعد ۱۸۰۵ء ﴿۱۲۲۰ھ﴾ میں لکھی گئی ہے۔ اس زمانے کے لوگوں کی یہ عجیب عادت ہے کہ کسی مشہور کتاب کے نام پر اپنی کتاب کا نام رکھ دیتے ہیں، خواہ کتنا ہی ناموزوں، بے محل اور بے ضرورت ہو۔ محمد عوض زریںؔ نے تحسین کی کتاب نوطرز مرصع کا نام لے لیا، لطف وحیدری دونوں نے اپنے اپنے تذکروں کا نام گلشن ہند ہی رکھا، خواہ کسی نے کسی سے لیا ہو۔ افسوسؔ نے بھی حیدریؔ والا نام آرائش محفل ہی پسند کیا۔ حالانکہ افسوسؔ کی کتاب "مملکت ہندوستان کی تاریخ" ہے۔ "آرائش محفل" کا نام تاریخ سے زیادہ قصہ کہانی کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ زریںؔ کی عبارت میں سجع و ترصیع نہیں ہے، پھر اس کو "نوطرز مرصع" کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ (۱) گلشن ہند کا لفظ تذکرہ شعراء کا مترادف یا مُشعر نہیں ہے کہ خواہ مخواہ یہی نام ذہن میں آئے یا موزوں معلوم ہو۔

حیدریؔ کی آرائش محفل نہایت دلچسپ، خوبصورت، سلیس روز مرّہ میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے بہت مقبول ہوئی اور کثرت سے شائع ہوئی۔ نمونہ یہ ہے:-

"چند روز بعد جب وہ لڑکی شعور دار ہوئی تو اپنے ذہن کی رسائی اور نیک بختی کے باعث سے دائی سے کہا کہ اے مادر مہربان، دنیا مانند حباب ہے، اس کا مٹنا کچھ بڑی بات نہیں، اس قدر دولت تنہا لے کر میں کیا کروں گی مصلحت یہی ہے کہ اس کو خدا کی راہ میں لٹادوں اور آپ کو آلایش دنیاوی سے پاک رکھوں اور شادی نہ کروں، بلکہ یاد خدا میں مصروف رہوں، اس واسطے تم سے پوچھتی ہوں کہ اس سے کس طرح چھٹکارہ پاؤں، جو مناسب جانو کہو۔ دائی نے کہا اے جان پدر تو ان سات سوالوں کا اشتہار لکھ کر دروازے پر چپکادے اور یہ کہہ کر کہ جو کوئی میرے یہ ساتوں سوال پورے کرے گا میں اس کو قبول کروں

---

(۱) اگر مولانا عبدالحق دہلوی کے قیاس کے مطابق محمد عوض زریںؔ نے خود اپنی کتاب کا یہ نام نہ رکھا، بلکہ مطبع نولکشور والوں نے کتاب چھاپتے وقت نوطرز مرصع نام تجویز کر دیا ہو تو اہلِ مطبع بھی اسی زمانے کے لوگ ہیں۔ اور ہمارے اعتراض کی زد میں ہیں۔ قادریؔ

گی اور وہ سوال یہ ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ وہ کیا ہے جو ایک بار دیکھا دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال، تیسرا سوال یہ ہے کہ کسی سے بدی نہ کر اگر کرے گا تو وہی پائے گا۔ چوتھا سوال یہ ہے کہ سچ کہنے والے کو ہمیشہ راحت ہے۔ پانچواں سوال یہ ہے کہ کوہ ندا کی خبر لاوے۔ چھٹا سوال یہ ہے کہ وہ موتی جو مُرغابی کے انڈے کی برابر بالفعل موجود ہے، اس کی جوڑی پیدا کرے۔ ساتواں سوال یہ ہے کہ حمام باد گرد کی خبر لاوے۔ حسن بانو نے دائی کی اس بات کو پسند کیا اور خوش ہو کر دل میں کہا کہ وہ ایسا کون ہے جو ان ساتوں کو بہم پہونچائے گا۔"

(۱۰) گُلِ مغفرت۔ زمانۂ تصنیف کے اعتبار سے حیدری کی کتابوں میں آخری کتاب ہے۔ اور فورٹ ولیم کالج کے لیے نہیں لکھی گئی۔ مُلّا حسین واعظ کاشفی (مصنف انوار سہیلی و اخلاق محسنی و تفسیر حسینی) کی تصنیف روضۃ الشہداء نہایت مشہور اور اپنے موضوع کی بے نظیر کتاب ہے اس میں مشہدائے اسلام اور خصوصاً شہدائے کربلا کے حالات ہیں۔ جن کو دس ابواب میں لکھا ہے اس کو وہ مجلس بھی کہتے ہیں۔ اس کتاب سے اُردو میں مختلف ترجمے اور تالیفیں ہوئی ہیں۔ اور وہ بھی اکثر دہ مجلس کے نام سے مشہور ہوئی ہیں۔ فضلی کی کربل کتھا بھی کاشفی کی کتاب سے ماخوذ ہے، اور وہ بھی دہ مجلس کہلائی جاتی ہے۔ حیدری کی گُلِ مغفرت میں بھی روضۃ الشہدا سے شہدائے کربلا کے حالات لیے گئے ہیں۔ جیسا کہ خود حیدری کہتے ہیں:-

"صاحبان درد و غم و مبتلایان رنج والم پر ظاہر و ہویدا ہووے کہ اس حیدر بخش حیدری کی کتاب گلشن شہیداں سے جس کو پہلے روضۃ الشہدا سے زبان ریختہ میں ترجمہ کر چکا تھا، اب شہر محرم الحرام کی بیسویں تاریخ سن بارہ سو ستائیس ہجری میں جناب فیض مآب گل گلزار معانی شمع بزم نکتہ دانی، بحر سیادت و امانت، سرو جوئبار گلشن شرافت و نجابت، مولوی سید حسین علی صاحب جونپوری زاد الطافہٗ کے ارشاد کرنے سے جن کی خدمت فیصد رجت میں اس ہیچ مداں کو ایک رسوخ دلی و نیاز باطنی ہے، اس نسخہ دہ مجلس کو انتخاب کیا اور نام اس کا گلِ مغفرت رکھا اس لئے ہر ایک خاص و عام کی نظر اشرف سے گزرے، مقبول خاطر ہووے بحق محمدؐ و آلہ الامجاد۔"

گل مغفرت ۱۸۱۲ء ﴿۱۲۲۷ھ﴾ میں لکھی گئی اور اسی سال کلکتہ سے شائع ہوئی۔ ۱۸۴۵ء

میں کسی فرانسیسی نے فرنچ زبان میں ترجمہ کرکے شائع کیا تھا۔ گل مغفرت اب کہیں نہیں ملتی مؤلف ارباب نثر اُردو کو ایک نسخہ مطبوعہ ۱۸۷۰ء ﴿۱۲۸۷ھ﴾ ملا ہے اور انھوں نے اس کا اقتباس درج کیا ہے۔ ہم بھی اس کو اس خیال سے نقل کرتے ہیں کہ اس کتاب کا اتنا نمونہ بھی اور کہیں دستیاب نہ ہوا۔

''کتاب ایوان الرضا میں یوں لکھا ہے کہ اے اہل بیت رسالت کے ہوا خواہ ہو، وائے آل عبا کے ماتم دارو، ماہ محرم میں گریہ وزاری کرو، خوشی وخرمی کو دل میں راہ نہ دو، حق تعالیٰ اس رونے اور غم کرنے کا اجر عظیم دے گا۔ بہشت بریں سا مکان عطا فرمائے گا۔ کہتے ہیں کہ عمرو بن لیث خراسان کے بادشاہ کا ہمیشہ سے یہ معمول و دستور تھا کہ جب کوئی امیر سو سوار مکمل و مسلح اپنے ساتھ لاکر موجودات دیتا، ایک گرز طلائی سے سرفراز ہوتا۔ ایک دن اس کے لشکر کی نظر ثانی ہوئی۔ ایک سو چوبیس سردار صاحب گرز شمار کیے گئے۔ عمرو بن لیث اس فوج کو دیکھ کر یہاں تلک رویا کہ غش کھا گیا۔ جب ہوش میں آیا ایک وزیر نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا، اے بادشاہ تجھے کیا ہو گیا، ایسا کیا حادثہ تجھ پر پڑا؟ اس نے کہا اے وزیر نیک تدبیر، یہ فوج دریا موج کو دیکھ کر میں نے جناب امام حسین علیہ السلام کو یاد کیا، اور جی میں یہ گزرا کہ اگر اس لشکر فتح پیکر سے جناب سیّد الشہداءؑ کے ساتھ کربلائے معلیٰ میں ہوتا تو ان کافروں بدنہادوں کو مارتا، آپ کے ساتھ فتح ونصرت سے پھرتا۔ حاصل کلام، وہ نیک انجام بعد تھوڑے دنوں کے مر گیا۔ شب کے وقت کسی شخص نے اسے خواب میں دیکھا کہ ایک مرصع تاج سر پر دھرے خلعت شاہانہ پہنے، کارچوبی پٹکا کمر میں باندھے ہوئے، حور وغلماں اپنے ساتھ لئے ہوئے ایک اسپ خوش خرام پر سوار ہے اور بہشت بریں کی سیر کرتا پھرتا ہے۔ پوچھا۔ اس نے کہا کہ اے شخص، پہلے میں غضب الٰہی میں گرفتار ہوا تھا، بعد اس کے حضرت امام حسین علیہ السلام کا غم والم یاد کرنے اور آپ کے حال زار پر رونے کے صدقے سے بخشا گیا۔ یقین ہے کہ جو کوئی آپ کے ماتم میں شریک ہوگا، اور آپ کے رنج والم کو یاد کرکے روئے گا، یہ گریہ وزاری حشر کے دن اس کے کام آوے گی، موجب نجات ہوگا۔''

حیدری کا طرزِ تحریر بھی سادہ ہے۔ مقفیٰ عبارت نہیں، لیکن عربی وفارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں، محاورہ کا زیادہ خیال نہیں رکھتے۔ میر امّن چھوٹے جملے، ہندی کے الفاظ، روزمرہ اور محاورہ اس طرح برتتے ہیں کہ ان کی عبارت نہایت دلکش ہو جاتی

ہے۔ میر شیر علی افسوسؔ حیدریؔ سے بھی زیادہ عربی و فارسی الفاظ لکھتے ہیں۔ (جیسا کہ افسوس کے نمونوں سے معلوم ہوگا)۔

میر شیر علی افسوس : ان کے والد کا نام سیّد علی مظفر خاں ہے۔ آبا و اجداد ہندوستان آئے اور قصبہ نارنول (صوبہ آگرہ) میں سکونت اختیار کی۔ افسوسؔ کے دادا محمد شاہ بادشاہ کے زمانے (۱۷۱۹ء ﴿۱۱۳۱ھ﴾ تا ۱۷۴۸ء ﴿۱۱۶۱ھ﴾) میں دہلی آئے یہیں افسوسؔ پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد نواب عمدۃ الملک کے ملازم تھے۔ ۱۷۴۶ء ﴿۱۱۵۹ھ﴾ میں عمدۃ الملک کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ افسوسؔ کے چچا سیّد غلام علی خاں الٰہ آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ محمد شاہ کے بعد سلطنت کا نظام ابتر ہوگیا، اور غلام علی خاں نے بھی وفات پائی۔ تو افسوسؔ کے والد پٹنہ چلے گئے اور میر قاسم نواب بنگالہ کے داروغہ توپ خانہ ہوگئے۔ میر قاسم کے بعد اس کے بیٹے میر جعفر کے ہاں ۱۷۶۰ء تک ملازم رہے۔ وہاں سے لکھنؤ آئے اور نواب شجاع الدولہ بادشاہ اودھ کے ہاں تین سو روپیہ پر ملازم ہوگئے۔ افسوسؔ بنگال میں باپ کے ساتھ تھے اور لڑکپن کا زمانہ تھا۔ گیارہ برس کا سن تھا، اسی وقت سے شعر گوئی شروع کردی تھی۔ لکھنؤ آئے تو یہاں میرؔ و سوداؔ، جرأتؔ و انشاؔ کی سخن سنجیوں کی دھوم تھی۔ افسوسؔ نے بھی شاعری کی مشق کی اور اساتذہ سے داد سخن لی۔ میر حیدر علی حیراںؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ شہزادہ مرزا جواں بخت جہاندار شاہ (ولی عہد سلطنت مغلیہ) اس زمانہ میں لکھنؤ میں تھے۔ انھوں نے افسوس کا کلام پسند کیا اور اپنا مصاحب و شاعر بنالیا۔ شہزادہ کے لکھنؤ سے واپس دہلی جانے کے بعد بھی افسوسؔ لکھنؤ میں رہے۔ سرفراز الدولہ ان کی سرپرستی کرتے رہے۔ جب فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کی ضرورت ہوئی تو سرفراز الدولہ نے لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ سے افسوس کی سفارش کرکے کلکتہ بھجوادیا۔ وہاں ۱۸۰۱ء ﴿۱۲۱۵ھ﴾ میں پہنچے۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ نے دوسو روپیہ ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ ۱۸۰۹ء میں افسوسؔ نے انتقال کیا۔

باغِ اُردو۔ افسوسؔ نے فورٹ ولیم پہنچ کر پہلی کتاب ''باغِ اُردو'' مرتب کی۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

''لیکن تعلق میرا جو مدرسہ ہندی (یعنی فورٹ ولیم کالج) سے ہوا، بر بنا اس کے بسا اوقات خدمت میں صاحب عالی طبیعت والا فطرت، مدرس ہندی، مسٹر گل کرائسٹ صاحب دام ثروتہٗ کے، کہ جامع قوانین اس زبان کے ہیں، حاضر ہونے لگا۔ ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا بزبان اُردو میں ترجمہ کر، میں نے دھیان کیا کہ عبارت اس کی صاف و بباطن پیچدار ہے، علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے۔ اور ابتدا میں قوت تالیف اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی۔ مصرع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

.........بارے فضل ایزدی اور لطف سرمدی سے تمام کتاب اُردو زبان میں لکھی اور وہ مقبول خاص و عام ہوئی، نام اس کا باغ اُردو رکھا، چنانچہ اس کی شروع کی تاریخ بھی اسی میں نکلتی ہے۔ قطعہ

میں تاریخ اس کی جو چاہا مع نام کہوں دل کھول با آئین نیکو
کہ اس میں ہاتف غیبی یہ بولا کہ ہے آغاز اُردو! باغ اُردو

۱۲۱۴
۱
۱۲۱۵

کتاب کے خاتمے پر لکھتے ہیں:-

سن ہجری بارہ سے سولہ (۱۲۱۶ھ) اور عیسوی اٹھارہ سے دو (۱۸۰۲ء) میں ترجمہ کہ مسمّٰی بہ باغ اُردو ہے تمام ہوا۔

قطعہ

عون توفیق رب سبحاں سے ترجمہ یہ کیا تمام میں جب
ختم کی اس کے، پیر عقل سے کی میں نے تاریخ عیسوی جو طلب
ابتدائے بہار سے یہ کہا ''باغ اُردو ہوئی گلستاں اب''(۱)

۱۷۹۹
۲
۱۸۰۱

---

(۱) اس مصرع تاریخ میں ۱۷۹۹ء نکلتے ہیں اور لفظ بہار کی ابتدا ب کے دو عدد بڑھانے سے ۱۸۰۱ء (باقی ص ۱۳۴ پر)

افسوسؔ نے باغِ اُردو کے دیباچہ میں جو حمد و نعت لکھی ہے اس کی عبارت رنگین و مقفّٰی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"تازگی گلستانِ سخن کی، حمد باغبانِ حقیقی کی ہے کہ اس نے بوستانِ عالم کو طرح طرح درختوں سے آرائش دی، اور رنگ برنگ کے پھولوں سے زینت بخشی۔ اور اس کے ابرِ رحمت کی بارش سے ہر ایک گل تر و تازہ، نسیم فیض سے اس کے ہر ایک درخت ہرا بھرا، ہر گل کی زبان وا ہے اس کے ذکر میں، جو غنچہ سر بجیب ہے اسی کے فکر میں، قمری اسی کے طوق بندگی میں اسیر، تدرواسی کے بند عشق سے پا بہ زنجیر.........."

(بقیہ صفحہ ۱۳۳ کا) ہوتے ہیں حالانکہ قطعہ سے اوپر افسوسؔ نے سن ہجری و عیسوی دونوں لفظوں میں لکھے ہیں۔ اور ختم کتاب کا سال ۱۸۰۲ء بتایا ہے۔ اس لیے تطابق مشکل ہو گیا۔ اسی طرح کی الجھن افسوسؔ کے کلکتہ جانے کے زمانے کے متعلق پیدا ہوتی ہے۔ سیر المصنفین میں افسوسؔ کے پہلے دیباچہ کی جو عبارت نقل کی گئی ہے اس میں یہ فقرہ ہے: "ستائیسویں تاریخ روز جمعہ کو وہی سترھویں ماہ اکتوبر کی تھی سن ہجری بارہ سے پندرہ تھے اور ۱۸۰۱ء کہ صاحب جلیل القدر کرنل اسکاٹ بہادر نے مجھے بلوا بھیجا اور کلام میرا سنا، پھر الطاف نوازش سے فرمایا کہ تو سرکار کمپنی بہادر دام دولتہم کے ملازموں میں اسی تاریخ سے سرفراز ہوا، بدل جمعی تمام کلکتہ کو روانہ ہو کہ صاحب عالی شان دام ظلہم زبان اُردو کا محاورہ اور صحت دریافت کیا چاہتے ہیں، بنا بر اس کے تجھے طلب کیا ہے۔" حالانکہ سیر المصنفین کے مؤلف نے اس سے اوپر افسوسؔ کے حالات میں لکھا ہے کہ "آپ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے۔" ارباب نثر اُردو میں غالباً افسوسؔ کے اس بیان کی بنا پر لکھا ہے کہ "اس موقع پر حسن رضا خاں نے اکتوبر ۱۸۰۱ء میں کرنل اسکاٹ سے افسوسؔ کا تعارف کرایا۔" اب دشواری یہ ہے کہ اکتوبر ۱۸۰۱ء، ۱۲۱۶ھ میں واقع ہوتا ہے ۱۲۱۵ھ میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ ۱۲۱۶ ہجری آغاز محرم سے آخر ذی الحجہ تک ۱۴ رمئی ۱۸۰۱ء تا ۳ رمئی ۱۸۰۲ء کے مطابق ہے۔ اس لیے افسوسؔ کے کلکتہ پہنچنے کا عیسوی سنہ (۱۸۰۱) غلط معلوم ہوتا ہے۔ ہجری سن (۱۲۱۵) صحیح ہے۔ اس ہجری سال میں اکتوبر ۱۸۰۰ء واقع ہو گا۔ لہٰذا ۱۸۰۰ء (۱۲۱۵ھ) افسوسؔ کلکتہ گئے اسی سال باغ اُردو لکھنی شروع کی۔ اور اگلے سال ۱۸۰۱ء (۱۲۱۶ھ) میں تمام کی۔ اس طرح آغاز کتاب کی تاریخ ۱۲۱۵ھ اور اختتام کتاب کی تاریخ ۱۸۰۱ء درست ہو جائے گی۔ قادری

لیکن اس کے بعد اسی دیباچہ میں جو اپنا حال اور باغ اُردو کے ترجمہ کا ذکر لکھا ہے، جس کا اقتباس اوپر درج کیا گیا، اس کی عبارت سادہ ہے۔ تاہم حیدر بخش حیدرؔی کے مقابلے میں زیادہ اور میر امّنؔ کے مقابلے میں بہت زیادہ عربی و فارسی کے الفاظ، اضافتیں، بندشیں، افسوسؔ کے قلم سے نکلتی ہیں۔ لفظوں کی تقدیم و تاخیر اوروں سے زیادہ نہیں ہے۔

گلستانِ سعدی کا ترجمہ افسوسؔ نے اکثر لفظی کیا ہے اور لفظی ترجمے کی کوشش میں کہیں کہیں اپنی بول چال اور روز مرّہ سے بھی ہٹ گئے ہیں۔ بعض مقامات پر گلستان ہی کے الفاظ بجنسہٖ اپنے ترجمے میں اختیار کر لیے ہیں، حالانکہ ان کا بدل سہل تر الفاظ سے ممکن تھا۔ مثلاً ایک ترجمہ یہ ہے:۔

ایک بزرگ سے طینت صاحبان صفا کی پوچھی، کہا، ان سے ادنیٰ فعل ان کا مقدم رکھنا ہے یاروں کے دل کی مراد کو اپنے مقصدوں پر، اور حکیموں نے کہا ہے۔ وہ بھائی کہ اپنے ہی بند و بست میں رہے، نہ وہ بھائی ہے اپنا۔"

لیکن یہ دانش مندی کی ہے کہ سعدؔی کے وہ مقولے اور مصرع جو ضرب المثل بن گئے ہیں، بجنسہٖ لے لیے ہیں۔ مثلاً:۔

ہر کسے را کہ پارسا بینی	پارسا داں و مرد نیک انگار
در ندانی کہ در نہانش چیست	محتسب را درونِ خانہ چہ کار

(ترجمہ)

جس کو ظاہر میں متقی دیکھے	اس کے تقوے کا تو نہ کر انکار
کھوج مت کر کسی کے باطن کی	محتسب را درونِ خانہ چہ کار

باغِ اُردو میں ایک حکایت کا ترجمہ یہ ہے:۔

حکایت۔ کہتے ہیں کہ نوشیروان عادل کے واسطے شکارگاہ میں ایک شکار کے کباب بھونتے تھے، نمک موجود نہ تھا۔ لوگوں نے زمیندار کے پاس آدمی بھیجا کہ نمک لے آوے۔ نوشیرواں بولا کہ نمک قیمت دے کر لیجو تاکہ رسم نہ بگڑ جاے اور گاؤں خراب نہ ہو۔ لوگ بولے اے بادشاہ اتنی سی بات سے کیا خلل

پیدا ہوگا۔ نوشیرواں نے کہا اولاً ظلم کی بنیاد تھوڑی ہی سی تھی، جو آیا اس پر بڑھاتا گیا حتیٰ کہ اس درجہ کو پہونچ گئی۔ بیت:-

یہیں رہتا ہے ظالم بد شعار سدا اس پہ لعنت رہے پائدار

قطعہ

جو کھاوے شہ رعیت کے باغ سے اک سیب غلام اس کے درختوں کو ڈالیں جڑ سے اکھاڑ

جو آدھے انڈے پہ سلطاں ستم روا رکھے سپاہی سیخ پہ بھونیں ہزار مرغ پچھاڑ

افسوسؔ کی دوسری کتاب آرائش محفل ہے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ یہ کتاب حیدریؔ کی کتاب کی ہم نام ہے، لیکن ہم مضمون نہیں۔ یہ آرائش محفل ہندوستان کی تاریخ ہے، اور اُردو لٹریچر میں پہلی چیز ہے۔ فورٹ ولیم میں بھی اکثر کتابیں قصہ، اخلاق، تذکرہ، صرف و نحو، لغت وغیرہ موضوعات پر لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ تاریخ کی جو کتابیں لکھی گئیں وہ اب مفقود ہیں۔ مثلاً حیدری کی تاریخ نادری اور حسینی کی تاریخِ آسام۔ اس کے بعد ایک کتاب ولاؔ کی تاریخ شیر شاہی البتہ قلمی موجود ہے۔ ۱۶۹۵ء ﴿۱۱۰۷ھ﴾ میں منشی سبحان رائے ساکن پٹیالہ نے فارسی میں عہد ہنود و عہد اسلام کی مکمل تاریخ لکھی تھی۔ جس میں اس زمانے کی تمام موجودہ تواریخ سے مدد لی تھی اور اُن سب کا خلاصہ کر دیا تھا۔ اسی لیے اس کا نام خلاصۃ التواریخ رکھا تھا۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ کے فورٹ ولیم سے جانے کے بعد افسوسؔ نے ۱۸۰۴ء ﴿۱۲۱۹ھ﴾ میں مسٹر جے۔ ایچ۔ مارنگٹن کی فرمائش سے اس فارسی تاریخ کا ترجمہ شروع کیا اور ۱۸۰۵ء ﴿۱۲۲۰ھ﴾ میں عہد ہنود کی تاریخ تمام کر کے آرائش محفل نام رکھا۔ جو ۱۸۰۸ء ﴿۱۲۲۳ھ﴾ میں شائع ہوئی، اور انگریزوں کے امتحان اُردو کے نصاب تعلیم میں شامل کی گئی۔ اس کے بعد کلکتہ، لکھنؤ، لاہور کے مطابع سے چند بار شائع ہوئی۔ میجر ہنری کورٹ نے پوری کتاب کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ جان شیکسپیر نے اس کے دس باب کا انگریزی ترجمہ کر کے اپنی کتاب منتخبات ہندی میں شامل کیا۔

آرائش محفل کی عبارت مقفّٰی ہے، لیکن قافیہ پیمائی سے روانی اور بے تکلفی میں فرق نہیں آیا۔ نمونہ یہ ہے:-

"جب سے یہ مرکز خاکی آرام گاہ حیوانات ہوا، سیکڑوں لاکھوں شہر قصبے بسے اور بستے جاتے ہیں۔ کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ، لیکن ہندوستان کی سرزمین کا عالم سب سے نرالا ہے، کوئی ولایت اس کی وسعت کو نہیں پہونچتی، اور کسی مملکت کی آبادی اس کو نہیں لگتی۔ یہاں کی ہر ایک بستی میں گھما گھم، جا بجا ایک نئی طرح کا عالم، ہر شہر و قصبے میں ستھری پاکیزہ، پختہ متعدد سرائیں، مسافر کے واسطے ہر قسم کے اوڑھنے بچھونے اور اقسام کی غذائیں، اکثر بیسیوں مسجدیں، خانقاہیں، مدرسے، باغات، غریبوں، بے کسوں مسافروں کے لئے متعدد مکانات، قلعے بڑے بڑے مضبوط وسعت میں ایسے کہ سیکڑوں گاؤں ان میں بسیں، اور رفعت میں اس قدر کہ بادل ان کے نیچے برسیں، ندی نالے تالاب کنوئیں لطیف و پاکیزہ ہزار ہا، پانی ان میں میٹھا ٹھنڈا ستھرا ابھرا ہوا، بڑے بڑے دریاؤں میں کشتیاں نواڑے، بجرے وغیرہ بے شمار، شاہ راہ کے ندی نالوں پر بیشتر مقاموں پر پل بندھے ہوئے تیار، اکثر راستوں میں کوسوں تک سایہ دار درختوں کی دو طرفہ قطار، ایک ایک کوس کی مسافت پر ایک ایک مینار نمودار، ہر ایک چوکی پر تمام چیزیں مہیا۔ سودے والوں کی دکانیں جا بجا، مسافر خوش و خرم کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے دن بھر چلے جاتے ہیں اور شام کو منزل پر بھی سب طرح آرام پاتے ہیں۔

سفر یہ نہیں باغ کی سیر ہے جہاں دیکھئے خیر ہی خیر ہے"

افسوؔس نے ان دو کتابوں کے علاوہ کوئی نثر کی کتاب تالیف نہیں کی۔ اپنا دیوان البتہ مرتب کیا۔ فورٹ ولیم کے لیے مرزا سوؔدا دہلوی کے دیوان کا افسوؔس نے انتخاب کیا۔ جس میں سوؔدا کے قصائد و غزلیات، مثنوی و مرثیہ کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ افسوؔس نے میر بہادر علی حسینی کی کتاب نثر بے نظیر کی نظر ثانی کی، اور نہال چند لاہوری کی مذہب عشق کی تصحیح کی۔

میرزا علی لطف: یہ بھی فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں ہیں، لیکن صرف ایک کتاب "تذکرہ گلشن ہند" لکھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہاں مستقل ملازم نہ تھے، تھوڑے دنوں رہے۔ میرزا علی نام تھا لطف تخلص ان کے والد کاظم بیگ خاں استر آبادی ۱۷۴۱ء ﴿۱۱۵۴ھ﴾ میں نادر شاہ کے ساتھ دہلی آئے، ابوالمنصور خاں صفدر جنگ (نواب آصف الدولہ وزیر اودھ کے دادا) کے ذریعے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے دربار سے تعلق ہوا۔ ہجری

تخلص کرتے تھے، فارسی کے شاعر تھے۔ میرزا علی لطفؔ فارسی میں باپ کے شاگرد تھے۔ دہلی میں پرورش ہوئی، یہیں تعلیم پائی اور فارسی واُردو دونوں میں شاعری شروع کی۔ مختلف تذکروں میں لطفؔ کو میر تقی اور مرزا سوداؔ کا شاگرد بتایا ہے لیکن لطفؔ اس تذکرہ میں اپنے حال میں لکھتے ہیں کہ ''مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے۔''

دہلی کی تباہی کے بعد میرزا لطفؔ باہر نکلے، اور حیدرآباد جانے کا ارادہ کیا، اوّل لکھنؤ پہنچے۔ وہاں استادوں کا مجمع تھا، شہزادہ مرزا جواں بخت لکھنؤ میں مقیم تھے اور شعرا کے قدردان تھے۔ انھوں نے لطفؔ کا کلام بھی سنا اور پسند کیا۔ لیکن لطفؔ کو اساتذہ سخن کے مقابلے میں اپنے نباہ کی صورت لکھنؤ میں نظر نہ آئی۔ پٹنہ پہنچے، وہاں سے کلکتہ کی سیر کر کے دکن کا قصد تھا کہ ڈاکٹر گل کرائسٹ سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے لطفؔ سے یہ تذکرہ لکھنے کی فرمائش کی۔ لطفؔ نے دیباچہ میں اسی تذکرہ کا ماخذ اور تالیف کا حال اور زمانہ تالیف بیان کیا ہے۔ ہم درمیان میں سے کچھ حذف کر کے لطفؔ ہی کے بیان کو مسلسل کیے دیتے ہیں۔ یہی نمونۂ کتاب کا کام دے گا۔ لکھتے ہیں:-

''علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے، اور نام اس کا گلزار ابراہیم رکھا ہے۔ ۱۱۹۸ھ گیارہ سو اٹھانوے ہجری اور ایک ہزار سات سو چوراسی عیسوی (۱۷۸۴ء) میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب سرحلقۂ بزم نکتہ دانی، رونق افزائے محفل معانی، سخن کی جان اور سخندانوں کے قدردان، صاحب والا مناقب، مسٹر گل کرائسٹ صاحب کی نظر مبارک سے گزرا، از بسکہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا، ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبان ریختہ میں کیا جائے تو خوب ہو، اور ہر ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے تو نہایت طبع کے مرغوب ہو، مبتدی اس سے بڑا مزہ پائیں گے، اور نو مشق کیفیت بہت اٹھائیں گے۔

چنانچہ اس خیرخواہ خفی و جلی، میرزا علی کو کہ لطفؔ تخلص کرتا ہے، نہایت محبت اور اخلاص سے فرمایا کہ تو اگر تن دہی اس مقدمہ میں کرے، تو ہم اس تذکرہ کو اپنی طرز پر لکھیں، اگرچہ یہ پابند الفت کا اس ایام میں ارادہ حیدرآباد کی سیر کا رکھتا تھا، لیکن اس خلق مجسم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس

وقت اس خوبی سے ادا فرمایا کہ مجھ سے سوائے اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا، کہ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں، اور ایک سرِ مو آپ کے فرمانے سے نہیں باہر ہوں......

الحمد للہ آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک مطابق عیسوی کے ہیں ......موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے، کہ نام اور اسم گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس ہیچمداں نے یہ تذکرہ لکھا، اور نام اس کا بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح کے گلشن ہند رکھا۔"

یہ طرز تحریر دیباچہ سے مخصوص نہیں ہے۔ تمام تذکرہ کی عبارت اسی نمونہ کی ہے، یہی قافیہ پیمائی یہی خیال آرائی جا بجا عربی فارسی کے الفاظ اور ترکیبیں ہیں۔ مقفّیٰ عبارت کے شوق میں تعقید کی بھی پروا نہیں۔ مثلاً میر تقی میرؔ کے حال میں لکھتے ہیں:۔

"ناقدر دانی سے اغنیا کی، اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے، اور ہوائے شہرستان معنی طراز اس مرتبہ فاسد کہ میرؔ سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں پوچھتا اس کی آج ہے۔"

حیرانؔ کا حال اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

"حیرانؔ تخلص، میر حیدر علی نام، ساکن شاہ جہاں آباد کے، شاگرد رائے سرپ سنگھ دیوانہ تخلص استاد کے۔"

دوسرے فقرے پر مولانا شبلی نے نوٹ لکھا ہے، تعقید کی شکایت کرتے ہیں:۔ "اس فقرے میں قافیہ کی پابندی سے سخت تعقید پیدا ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سرپ سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے، اور جو استادِ فن ہیں، حیرانؔ ان کے شاگرد ہیں۔"

لطفؔ اس تذکرہ کی ترتیب کے بعد حیدر آباد چلے گئے وہاں اعظم الامرا ارسطو جاہ مدار المہام تھے، انھوں نے قدر دانی کی اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔ لطفؔ کے دو بھائی اور بھی ان کے ساتھ تھے اور شہر میں سوز خوانی کیا کرتے تھے۔ لطفؔ نے ۱۸۲۲ء ﴿۱۲۳۸ھ﴾ میں وہیں انتقال کیا۔

تذکرہ گلشن ہند نایاب و ناپید تھا۔ اتفاق سے ۱۹۰۲ء ﴿۱۳۲۰ھ﴾ میں حیدر آباد کی موسیٰ ندی میں عظیم الشان سیلاب آیا، صدہا گھر ویران ہو گئے اور اسباب بہہ گیا۔ اسی میں

یہ تذکرہ کسی کے ہاتھ آ گیا۔ مولانا شبلی حیدر آباد میں تھے، ان کو دکھایا، انھوں نے بہت پسند کیا، اور خود اس پر تشریحی حواشی لکھے۔ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے مفصل عالمانہ مقدمہ لکھا۔ ۱۹۰۶ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اب دوبارہ انجمن نے اپنی طرف سے گلشن ہند اور اس کے ماخذ واصل گلزار ابراہیم دونوں کو یک جا شائع کر دیا ہے۔

میر بہادر علی حسینی : ان کے والد کا نام سیّد عبداللہ کاظم ہے۔ دہلی میں قیام تھا، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اُردو ترجمہ قرآن مجید حسینی کے والد کے اہتمام سے پہلی مرتبہ دہلی میں چھپا تھا۔ میر امّن حسینی کے خاص دوست تھے۔ حسینی پہلے فورٹ ولیم کالج میں پہنچ گئے تھے، اور وہاں میر منشی تھے۔ انھی کی سفارش سے میر امّن کا تقرر ہوا تھا۔ حسینی نے چار کتابیں مرتب کیں:-

(۱) نثر بے نظیر۔ اس کا سبب تالیف اور طرز تحریر خود حسینی بیان کرتے ہیں:-

''قصہ بے نظیر و بدر منیر کہ نظم میں تصنیف کیا ہوا شاعر بے ہمتا، ادا بند یکتا، رونق بزم سخن، میر حسن مرحوم متخلص بہ حسن، سعید ازلی خلف الرشید میر غلام حسین ضاحک دہلوی کا تھا، فی الواقع ہر ایک مصرع اس کا فصاحت و بلاغت میں بے نظیر ہے اور ہر اک شعر حسن و خوبی میں مثل بدر منیر۔ جو سخن دان منصف مزاج عاشق پیشہ ہیں وہی اس کی طرز بخوبی پہچانتے ہیں۔ مقابل اس کے نظم کس سے ہو سکے، بلکہ کوئی رمزوں کو تو پا سکے؟ قاصر ہے زبان اس کی توصیف میں، ہر کہ وہ مشغول ہے اس کی تعریف میں، اب اس کو عہد میں شاہ عالم بادشاہ کے اور ریاست امیر سراپا تدبیر...... مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء کے، حکم سے صاحب خداوند نعمت...... جان گل کرائسٹ صاحب بہادر دام حشمتہٗ کے، عاصی میر بہادر علی حسینی نے شروع قصے سے موافق محاورہ خاص کے نثر میں لکھا ہے۔ پہلے اس سے یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بہ طرز سہل واسطے صاحبان نو آموز کے تحریر کر چکا تھا۔ اب جی میں یوں آئی کہ اس داستان شیریں کو (کہ فی الحقیقت قصہ شیریں سے شیریں تر ہے) اس رویہ سے نثر کروں کہ ہر ایک زباں داں و شاعر اس کو سن کر عش عش کرے، اور اس ہیچمداں کی ایک یادگاری دنیا میں رہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس تالیف کا یہ دیباچہ ہے اس سے پہلے کالج کے نو آموز

انگریزوں (''صاحبانِ نو آموز'') کے واسطے'' اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بہ طرزِ سہل'' تحریر کر چکے تھے۔ پھر دوبارہ یہ تالیف کی جو اس وقت زیرِ نظر ہے۔

حسینی کی یہ نثر اصل مثنوی کے سامنے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی، لیکن حسینی نے اس کو دلچسپ بنانے کی یہ تدبیر کی ہے کہ اپنی نثر کے درمیان موقع بموقع مثنوی کے اشعار لکھ دیے ہیں۔ مثنوی میر حسن فورٹ ولیم کالج کے نصاب تعلیم میں شامل تھی، ڈاکٹر گل کرائسٹ نے نثر بے نظیر کو بھی مثنوی کے ساتھ چھپوا دیا۔ دوسری طباعت کے وقت میر شیر علی افسوس نے اس پر نظر ثانی کی۔ متعدد بار مختلف مطابع سے شائع ہوئی۔ انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ۱۸۷۱ء میں ایم، ایچ، کورٹ نے شائع کیا۔ اب اس کے نسخے نہیں ملتے۔ مؤلف ارباب نثر اُردو کو بڑی سعی و تلاش کے بعد ایک نسخہ حاصل ہوا ہے۔ ''یہ کالج پریس کا مطبوعہ ۱۸۷۰ء ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۵۲ صفحات پر مشتمل اور ٹائپ میں چھپا ہوا ہے۔'' اس میں سے ''داستان سواری کی تیاری'' کا نمونہ درج کیا جاتا ہے:-

''جب گیارہ برس خیریت سے گزرے، بارھواں برس آیا، الحمد للہ جس دن کی آرزو تھی سو کریم نے ساتھ خوشی کے دکھایا۔ شادی محل میں چاروں طرف مچ گئی مبارک بادی کی صدا پھر بلند ہوئی۔ نظم

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی　　کھلی گٹھڑی غم کے جنجال کی

چار گھڑی دن رہے غرض بیگی کو بادشاہ نے ارشاد کیا کہ صبح سواری مبارک جلوس سے تیار ہو کر میں شہزادے کو لے کر سوار ہوں گا، تا رعیت اور سپاہ اس کا دیدار دیکھ کر شاد ہو، اور بستی ان کے دل کی بھی آباد ہو، تم نقیبوں کو تقید کرو گھر گھر یہ حکم پہونچا دیں، اور ہر ایک چھوٹے بڑے کو جتا دیں کہ زرق برق سے نکلے اور تمام اسباب سواری کا بھی نیا اور جگمگا ہو، خبردار ایک سوار میلا اور ایک گھوڑے کا زین پرانا نظر نہ آوے۔ احیاناً کسی کو اگر کوئی چیز میسر نہ آوے تو سرکار سے بے تکلف لیوے کہ مابدولت کی مرضی اور خوشی اسی میں ہے۔ نظم:-

کریں شہر کو مل کے آئینہ بند　　سواری کا ہو نور جس سے دو چند

اتنے میں شام پڑی اور آفتاب والشمس پڑھ کے سجدۂ شکر میں گیا، مہتاب سورہ نور پڑھتا ہوا نکلا، حضرت محل میں تشریف لے گئے، تمام رات ناچ و راگ رہا، مارے خوشی کے محل میں کوئی نہ سویا۔ نظم

عجب شب تھی وہ جوں سحر رو سفید　　عجب روز تھا مثل روز امید

القصہ رات ہوئی، چاند نے بالین استراحت پر اپنا سر رکھا، اور سورج بڑی چمک سے اپنی آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ نظم:-

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو　　کہ بابا نہا دھو کے تیار ہو

(۲) اخلاق ہندی　میر بہادر علی حسینی کی دوسری کتاب ہے، اور پہلی سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ اخلاقی کہانیاں پہلے سنسکرت میں لکھی گئی تھیں۔ سنسکرت سے اس کے دو ترجمے فارسی میں ہوئے، نگار دانش اور مفرح القلوب۔ مفرح القلوب کا سبب تالیف حسینی نے اخلاق ہندی کے دیباچہ میں یہ لکھا ہے:-

"یہ کتاب سرکار دولت مدار میں ملک الملوک شاہ نصیر الدین کے جس کی تخت گاہ صوبہ بہار تھی، پہونچی، جب انھوں نے جو سنا، اس میں قصے از بسکہ دلچسپ ہیں، اور نصیحت میں نہایت مرغوب اور باتیں خوب، اور حکایتیں اکثر مفید، تب اپنے ملازموں سے ایک کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس کو ترجمہ سلیس فارسی میں کرو تو میں اپنے مطالعہ میں رکھوں اور اس کے مضمون سے مستفید ہوں، تب ان میں سے ایک شخص (مفتی تاج الدین) حکم بجالایا اور نام اس کا مفرح القلوب رکھا۔"

اس مفرح القلوب کا حسینی نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۲ء (۱۲۱۷ھ) میں ترجمہ کیا اور اخلاق ہندی نام رکھا۔ ۱۸۰۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد بھی کئی ایڈیشن نکلے۔ اس کی عبارت سادہ اور سلیس ہے، لیکن کوئی خاص دلکشی نہیں۔ نمونہ یہ ہے:-

"سانپ ہر روز دو تین مینڈک کھانے لگا۔ تھوڑے دنوں میں سب کو نگل گیا، اکیلا بادشاہ رہا۔ سانپ نے پوچھا اے بادشاہ آج میں کیا کھاؤں، مجھے بھوک لگی ہے۔ مینڈک نے کہا اے سانپ کسی جھیل کے کنارے چل کر اپنا پیٹ بھر لے۔ تب اس نے کہا تمھارے لشکر نے میرے پیٹ میں چھاؤنی کی ہے، بادشاہ کا لشکر سے جدا رہنا خوب نہیں، اپنی فوج کے ساتھ آپ بھی اسی چھاؤنی میں شامل ہوں تو بہتر ہے۔ تب وہ اپنی موت سمجھ کر چپ ہو رہا۔ سانپ نے اپنے شہسوار کو زمین پر پٹک کر دم کے کوڑے مارے اور کھا گیا، جیسا کہ کسو شاعر نے کہا ہے: فرد

گردن بندگی نت خم ہے در فرماں پر گوے سر اپنا فدا کیوں نہ کرے چوگاں پر

(۳) تاریخ آسام : شہاب الدین طالش ابن ولی محمد نے فارسی میں تاریخ آسام لکھی تھی۔ جس میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے سپہ سالار میر جملہ کی مہم آسام (۱۶۶۶ء﴿۱۰۷۷ھ﴾) کا حال لکھا تھا۔ میر بہادر علی حسینی نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ منشی کریم الدین نے اپنے تذکرہ طبقات الشعرا میں ذکر کیا ہے کہ یہ ترجمہ ۱۸۰۵ء ﴿۱۲۲۰ھ﴾ میں ختم ہوا اور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ۱۸۴۵ء﴿۱۲۶۱ھ﴾ میں شائع ہوا تھا۔ لیکن حسینی کا ترجمہ ناپید ہے۔

(۴) رسالہ گل کرسٹ: حسینی کی یہ چوتھی تالیف ہے، جو اصل میں حسینی کے دماغ کی پیداوار نہیں بلکہ ڈاکٹر گل کرائسٹ کی مفصل کتاب صرف ونحو ہندوستانی کا خلاصہ ہے۔ اصل کتاب ضخیم تھی، فورٹ ولیم کالج کے انگریز طالب علموں کو امتحان کے لیے اس کو تیار کرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ اس لیے حسینی نے اس کو مختصر کر دیا۔ یہ رسالہ ۱۸۱۶ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۷۲ء میں چھپا، لیکن زیادہ اشاعت نہیں ہوئی۔ اور اب کمیاب ہے۔

مظہر علی خاں وِلاؔ : دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام مرزا لطف علی تھا۔ لیکن مظہر علی خاں کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے والد سلیمان علی خاں وداد فارسی کے شاعر تھے، اور دادا محمد حسین علی قلی خاں کے خطاب سے مشہور تھے۔ مظہر علی خاں وِلاؔ فارسی، سنسکرت اور ہندی کے اچھے عالم تھے، شاعری میں ممنونؔ، مصحفیؔ اور طپشؔ سے مشورہ کیا ہے لیکن وِلاؔ کا دیوان مفقود ہے۔ بعض تذکروں میں دو ایک شعر ملتے ہیں۔ وِلاؔ نے ۱۸۰۲ء سے ۱۸۰۵ء تک فورٹ ولیم کالج میں چند کتابیں لکھیں۔ ان کے ہم عمر و ہم پیشہ منشی بینی نراین جہاں نے اپنے تذکرہ شعرا دیوان جہاں میں جو ۱۸۱۴ء﴿۱۲۲۹ھ﴾ میں مرتب ہوا ہے، ان کو بقید حیات اور کلکتہ میں مقیم بتایا ہے۔ اس سے زیادہ حالات دستیاب نہیں ہوتے۔

ولاؔ کی تالیفات یہ ہیں:- (۱) مادھونل اور کام کندلا۔ (۲) ترجمہ کریما۔ (۳) ہفت گلشن۔ (۴) اتالیق ہندی۔ (۵) بیتال پچیسی۔ (۶) تاریخ شیر شاہی۔ ان میں سے شیخ سعدی کے کریما کا ترجمہ نظم میں ہے۔ اس لیے اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے۔ اس داستان تاریخ اُردو کے حصہ نظم میں اس کا ذکر آئے گا۔ اور اتالیق ہندی فارسی کی کتاب ہے۔ اس کا تذکرہ بھی ترک کیا جاتا ہے۔

(۱) مادھونل اور کام کندلا۔ قدیم ہندی زبان کے قصہ (مصنفہ موتی رام کبیشر) کا اُردو ترجمہ ہے۔ ولاؔ نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمایش سے ۱۸۰۲ء میں مرتب کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے انتخاب بیاض ہندی میں اس کا ایک حصہ چھاپا تھا۔ پوری کتاب نہیں چھپی۔ صرف برٹش میوزیم میں اس کا ایک قلمی نسخہ دریافت ہوا ہے۔ ارباب نثر اُردو سے معلوم ہوا کہ ولاؔ نے اس کتاب کے آخر میں دو قطعہ تاریخ لکھے ہیں۔ ایک سے ہجری سال ۱215ھ نکلتا ہے، دوسرے سے ۱۸۰۲ء نکلتا ہے(۱)۔ اسی تذکرہ سے ولا کی کتاب کا نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔

---

(۱) یہ دونوں سال ہجری وعیسوی باہم مطابق نہیں ہیں اس لیے ہجری سال آغاز تالیف کا ہوگا، اور عیسوی اختتام کا۔ اسی طرح اس سے اوپر تذکرہ "دیوان جہاں" کے جو سال ترتیب درج کیے گئے ہیں وہ ارباب نثر اُردو میں ۱۸۱۴ء مطابق ۱۲۲۷ھ بتائے گئے تھے۔ ان میں سے بھی کسی سال کا کوئی حصہ دوسرے سال میں واقع نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم نے سال عیسوی کو درست مان کر سال ہجری بجائے ۱۲۲۷ھ کے ۱۲۲۹ھ کر دیا ہے۔ اسی طرح کے عدم مطابقت کا ذکر میر شیر علی افسوسؔ کے حاشیہ میں کیا گیا ہے۔ یہ عدم تطابق کا مسئلہ نہایت عجیب ہے۔ قدیم مصنفین اپنے زمانے کے ہجری وعیسوی سن لکھنے میں غلطی نہیں کر سکتے۔ یقیناً ناقلان کتب کی بے پروائی سے یا بعد کے مؤلفین کے تذکرہ یا تاریخ کی بے احتیاطی سے یا مطابع کی غلطیوں سے ہم تک پہنچتے پہنچتے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت مطابقت ہجری وعیسوی کی دو فہرستیں ہیں (ان دونوں سے سنین مذکورہ کی مطابقت نہیں ہوتی) ایک موجودہ زمانے کی مطبوعہ ایران سے ہے۔ دوسری سرسید احمد خاں نے اپنی تالیف "تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام" حصہ اول مطبوعہ ۱۸۶۲ء (۱۲۷۸ھ) کے آخر میں درج کی ہے۔ سرسید نے اپنی (باقی صفحہ ۱۴۵ پر)

"بلند بلند مکانوں کے بالا خانوں کا عالم دیکھ کر آسمان و زمین کا عالم تہ و بالا، نئے نئے طور کے مکان منقش عالی شانوں پر سنہری کلسیوں کے چمکنے سے عجیب اجالا، صاحب علم و ہنر، نیک افعال و نیک کردار اور لوگ اچھے اچھے آرام چین سے اس بستی میں بستے تھے۔ وہ پہہ پاوتی نگری مشہور تھی، اور راجہ گوبند چند دانش و بخشش میں یکتا، نیک افعال، خجستہ خصال، مہر سے معمور، علم و حیا سے مشہور، صورت و سیرت میں خوب، خلق طالب وہ مطلوب، دوست اس کے لطف سے شاد، دشمن اس کے قہر سے برباد، جا بجا اس کی دھاک، غرض وہاں راج راجہ اندر کی طرح کرتا تھا۔"

(۲) **ہفت گلشن:** ناصر علی خاں واسطی بلگرامی نے کوئی اخلاقی کتاب فارسی میں تصنیف کی تھی، اس کا مظہر علی ولاؔ نے یہ اُردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ بھی ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۲ء (۱۲۱۶ھ) میں مرتب ہوئی۔ اس میں اخلاقی مضامین کی جا بجا حکایتوں سے

(بقیہ صفحہ ۱۴۴ کا) فہرست میں ۱۵۸۲ء کے بعد سے مطابقت کی دو جدولیں قائم کی ہیں: (۱) بموجب نئے حساب کے، اور (۲) بموجب قدیم حساب کے۔ ایرانی فہرست اس قدیم حساب کے مطابق ہے۔ قدیم و جدید حساب میں گیارہ دن کا فرق ہے۔ مثلاً یکم محرم ۹۹۰ھ مطابق ۲۶ر جنوری ۱۵۸۲ء تھی تو یکم محرم ۹۹۱ھ مطابق ۱۵ر جنوری ۱۵۸۳ء ہونی چاہئے، لیکن اس کو ۲۵ر جنوری ۱۵۸۳ء کے کر دیا گیا ہے، یعنی گیارہ دن چھوڑ دیے گئے۔ اس انقلاب تقویم کی تاریخ یہ ہے:-

تاریخ ترمیم تقویم۔ ۱۵۸۲ء میں پوپ گریگری نے مشہور ہیئت داں گلیولیس کے مشورہ سے حکم دیا کہ ۴ر اکتوبر ۱۵۸۲ء کو ۱۵ر اکتوبر مانا جائے۔ اور صدی کے وہ سال سالِ کبیسہ مانے جائیں جو ۴۰۰ پر پورے تقسیم ہو جائیں۔ یہ ترمیم تمام کیتھولک ممالک میں اختیار کر لی گئی۔ لیکن کلیسائے یونان اور اکثر پروٹسٹنٹ اقوام نے پوپ کے تعمیل حکم سے انکار کیا۔ پھر تقریباً دو صدی بعد ۱۷۵۱ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے اس ترمیم کو تسلیم کر لیا اور حکم جاری کر دیا کہ ۳ر ستمبر ۱۷۵۲ء کو ۱۴ر ستمبر مانا جائے۔ یعنی گیارہ دن چھوڑ دیے جائیں، اور آئندہ میں یہی حساب جاری رہے۔ یہ حساب قدیم کہلاتا ہے۔ ہر چوتھے سال کو، جو چار پر پورا تقسیم ہو جائے، سال کبیسہ ماننا اور اس کے ایک مہینہ (فروری) میں ایک دن کا اضافہ کرنا، سنہ ۴۵ قبل مسیح میں جولیس سیزر نے جاری کیا تھا۔ ان سالہائے کبیسہ میں سے ایسے سال کو خارج رکھنا جو ۴۰۰ پر تقسیم نہ ہوں (مثلاً ۱۷۰۰-۱۸۰۰-۱۹۰۰.....) گریگری کی ترمیم تھی۔

دلچسپ و مؤثر بنایا ہے۔اس کا بھی قلمی نسخہ برٹش میوزیم ہی میں پایا جاتا ہے۔اور ہم اس کا نمونہ بھی ارباب نثر اُردو ہی سے درج کرتے ہیں:-

''حکایت چوتھی مرغی اور مور کی ہے کہ ایک مرغی دانے کی تلاش میں جنگل کو گئی اور ہر طرف دانہ چگنے لگی کہ ناگاہ ایک سوراخ کے پاس انڈے کتنے ایک مارسیاہ کے پائے، تب خوش ہو کر نہایت شفقت و مہربانی سے ایک درخت کے نیچے ان انڈوں کو اکٹھا کر کے اپنے پروں کے نیچے لے بیٹھی اور سینے لگی......''

(۳) بیتال پچیسی: یہ اصل میں سنسکرت زبان کی کتاب تھی، اس میں بیتال نامی ایک شخص کی کہی ہوئی ۲۵ کہانیاں ہیں۔محمد شاہ کے زمانے میں اس کا ترجمہ ''برج بھاشا'' میں ہوا۔اس ترجمے سے ولا نے ۱۸۰۳ء ﴿۱۲۱۷ھ﴾ میں اُردو ترجمہ مرتب کیا۔ اس کی تیاری میں فورٹ ولیم کالج کے ایک اور منشی للولال جی نے ولا کو مدد دی۔ بیتال پچیسی کلکتہ میں اور ہندوستان کے مختلف مطابع میں متعدد بار چھپی اور مقبول ہوئی۔اس میں جا بجا برج بھاشا کے الفاظ بجنسہٖ استعمال کیے ہیں۔نمونہ یہ ہے:-

''اسی عرصہ میں کسور راجہ کی بیٹی سہیلیوں کا جھنڈ ساتھ لئے ہوئے اسی تالاب کے دوسرے کنارے پر اشنان کرنے آئی۔سو اشنان دھیان پوجا کر سہیلیوں کو ساتھ لے درختوں کی چھانوں میں ٹہلنے لگی۔اُدھر دیوان کا بیٹا بیٹھا،اور راجہ کا بیٹا پھرتا تھا کہ اچانک اس کی اور راجہ کی بیٹی کی چار نظریں ہوئیں۔دیکھتے ہی اس کے روپ کو راجہ کا بیٹا فریفتہ ہوا،اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ اے چنڈال کام دیو مجھ کو کیوں ستاتا ہے۔اور اس راج پتری نے اس کنور کو دیکھ کر سر میں جو کنول کا پھول پوجا کر کے رکھا تھا،وہی پھول ہاتھ میں لے،کان سے لگا،دانت سے کتر،پاؤں تلے دیا،پھر اٹھا چھاتی سے لگا لیا،اور سہیلیوں کو ساتھ لے،سوار ہو اپنے مکان کو گئی اور یہ راج پتر نہایت نراس ہو برہ میں ڈوبا ہوا دیوان کے پاس آیا اور ساتھ شرم کے اس کے آگے حقیقت کہنے لگا۔''

(۴) تاریخ شیر شاہی: اکبر بادشاہ کے حکم سے عباس خاں شروانی نے شیر شاہ سوری بادشاہ دہلی کے عہد کی تاریخ فارسی میں لکھی تھی۔اس کو ولا نے کپتان جیمس مونٹ کے حکم سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔۱۸۰۵ء ﴿۱۲۲۰ھ﴾ میں ترجمہ ختم ہوا لیکن کہیں شائع نہیں ہوا۔گارساں دتاسی نے ۱۸۶۵ء میں اس کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا تھا۔ولا کا ترجمہ

قلمی صورت میں انڈیا آفس لندن میں ہے۔ ارباب نثر اُردو سے اس کا نمونہ نقل کیا جاتا ہے:-

''اس نے کہا اپنے بھائی میرداؤد کو شیر خاں کے پاس بھیجے تا وہ اس سے یہ قرارداد کرے کہ ہم قلعہ دیتے ہیں لیکن اس شرط سے کہ تو عہد کرے کہ جس بیٹے بدبخت نے اپنے باپ کو مارا ہے اس کی ناک اور کان کاٹے تا اوروں کو کان ہوں۔ جب میرداد شیر خاں کے پاس گیا اس سے بہ قسمیہ عہد و پیمان کیا کہ لاد ملکہ اور تم تینوں بھائیوں کے ساتھ کسی نوع کی مخالفت نہ کروں گا، اور مہمانداری کی رسم بخوبی بجالایا، کوئی فرو گذاشت نہ کی اور اس کے آنے سے نہایت خوش ہوا۔ محبت و اخلاص حد سے زیادہ کیا، اور کہا کہ اگر لاد ملکہ میرے تیں قلعہ دیوے اور مجھ سے نکاح کرے تو میں اس کا نہایت ممنون احسان ہوں گا۔ مرغ دل کا شکار کرنا احسان سے خوب ہے اور اچھے کاموں سے ہے۔''

(۵) جہانگیر نامہ: وِلاؔ کی اس تالیف کا حال بجز اس کے کچھ معلوم نہیں کہ گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ تزک جہانگیری کے ایک حصے کا ترجمہ مظہر علی خاں وِلاؔ نے کیا تھا۔ اس کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔

مرزا کاظم علی جواںؔ: دہلی کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ ۱۸۰۱ء میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے شکنتلا ڈرامہ کا ترجمہ کیا۔ یہ ڈراما کالی داس نے سنسکرت میں لکھا تھا، اس کو نواز کبیشر نے برج بھاشا میں ترجمہ کیا تھا۔ اس ہندی کے ترجمے سے جواںؔ نے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے دیباچہ میں یہ حال لکھا ہے:-

''دوسرے ہی دن انھوں نے (ڈاکٹر گل کرائسٹ) نہایت مہربانی والطاف سے ارشاد فرمایا کہ سکونتولا کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کر، اور للولال جی کو حکم دیا کہ بلاناغہ لکھایا کرے، اگرچہ کبھی سوا نظم کے نثر کی مشق نہ تھی لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا کہ جس نے سُنا پسند کیا اور اچھا کہا۔ بہت سا پڑھنے لکھنے میں آیا اور کچھ چھپ کر اتفاقات سے رہ گیا۔ ان دنوں میں کہ ۱۸۰۴ء ہیں اور احقر قرآن شریف کے ہندی ترجمے کا محاورہ درست کرتا ہے، صاحب ممدوح نے فرمایا ہم چاہتے ہیں کہ اس کتاب کو چھپوا

دیں، نظرثانی لازم ہے اور اس کب کو فرمایا کہ تم بھی اس کتاب سے مقابلہ کرو کہ اگر کہیں مطلب کی کمی بیشی ہوئی ہو نہ رہے، چنانچہ ہم ان کا فرمانا بجالائے۔ پھر موافق حکم صاحب کے بندے نے تھوڑا سا دیباچہ اور بھی لکھا۔"

اس کے بعد یہ کتاب لندن، بمبئی اور لکھنؤ سے بھی شائع ہوئی۔ نواز کبیشر نے یہ قصہ کبت اور دُھروں میں لکھا تھا۔ کاظم علی نے نثر میں لکھا اور موقع موقع پر ہندی اشعار کی جگہ اپنے اُردو کے شعر لکھ دیے۔ اگرچہ شاعری کے اعتبار سے ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے، تاہم ایک لطف پیدا ہو گیا ہے۔ ہندی کے الفاظ بھی جا بجا استعمال کیے ہیں، اور وہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ عبارت مقفّیٰ لکھی ہے لیکن صاف و سلیس ہے۔ اس لیے لطف کی تحریر کی طرح بےلطف نہیں ہے۔ ارباب نثر اُردو سے اس کا مختصر نمونہ درج کیا جاتا ہے:-

غرض اس تپشوی کا یہی حال تھا، آٹھویں پہر تپ جپ کا خیال تھا، چونسٹھ برس تک وہ بیاباں نورد تھا، سر سے پاؤں تلک گرد گرد تھا، بناس پتی کھاتا رہتا۔ بھوک پیاس کی ایذائیں سہتا اور روبہ آفتاب ہو کر

گرمیوں میں وہ جگر تفتہ جلا کر گرد آگ　　بیٹھا تھا ڈھیر جیسے راکھ کا آوے نظر
اور جاڑوں میں گلے تک پانی میں ہو کر کھڑا　　جپ کیا کرتا تھا شوق دل سے ہر شام وسحر

ایسی باتیں سن کر راجہ اندر کو بہت سوچ پڑا، ڈر دل میں ہوا، اس کے اس جوگ کو توڑنے کے لیے منوکا پری کو بلا کر بہت سی آؤ بھگت کی، اور یہ احوال ظاہر کیا۔ وہ راجہ کے حسن سلوک سے بہت خوش ہوئی اور مطلب کے سنتے ہی یوں بولی کہ میں وہ پری ہوں کہ اگر میرا سایہ برہما، بشنو مہادیو پر پڑے دیوانے ہو جاویں۔

جو وے ہوویں وحشی تو کرلوں میں رام　　مری یاد میں بھولیں سب اپنے کام
یے ایسی ہیں جادو بھری انکھڑیاں　　رہے دیکھ کر ان کو سُدھ بُدھ کہاں
یہ احوال جب ایسے لوگوں کا ہو　　رکھوں پاک دامن میں کب اور کو

وسوامتر کو ایک پل میں اپنے پر دیوانہ کرلوں، تمام عمر کو تشقہ کی جاگہ یہ کلنک کا ٹیکہ ماتھے پر دھروں......

وہ ایک ایسا ستارہ تھی کہ تمام عالم کو جس نے روشن کر دیا تن پر سولہ سنگار بارہ ابھرن جو اس نے سر سے پاؤں تلک کیے دن کو سورج اس کا جادو دیکھ کر رشک کی آگ سے جلا، اور رات کو چاند غیرت سے

داغ ہو کر ستاروں کے انگاروں پر لوٹنا۔"

کاظم علی جواںؔ کی یہ شکنتلا اُردو میں پہلا ناٹک یا ڈرامہ ہے۔ یہ صنف ادب بھی لٹریچر کا ضروری جزو ہے۔ اور اس کے آغاز کا بھی اسی کالج کے سر سہرا ہے۔

شکنتلا ناٹک کے علاوہ جواںؔ نے ایک طویل نظم بارہ ماسہ یا "دستور ہند" لکھی جس میں ہندو مسلمانوں کے تہواروں کی تفصیل بیان کی۔ اور تاریخ فرشتہ کے ایک حصے کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا، لیکن یہ دونوں کتابیں اب ناپید ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ جواںؔ نے للولال جی کو سنگھاسن بتیسی لکھنے میں مدد دی، قرآن مجید کے اُردو ترجمے کو درست کیا اور شعرا کے انتخاب میں اعانت کی۔ مولوی حفیظ الدین کی کتاب خرد افروز کی ۱۸۱۵ء میں نظر ثانی کی۔

مولوی امانت اللہ شیدا: ان کا وطن، حالات، سنین ولادت و وفات وغیرہ بالکل نامعلوم ہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے۔ تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی و فارسی کے اچھے عالم تھے۔ کالج میں کام کرنے سے پہلے بطور خود انھوں نے فقہ اسلام کے متعلق ایک ضخیم کتاب عربی زبان میں ہدایت الاسلام کے نام سے لکھی تھی۔ پھر اس کے فائدے کو عام اور وسیع کرنے کے خیال سے اسی کتاب کا اُردو میں ترجمہ کیا اور وہی نام رکھا۔ پہلی جلد ترجمہ کر کے ڈاکٹر گل کرائسٹ کے سامنے پیش کی۔ ڈاکٹر پر ان کے فضل و کمال کا بڑا اثر ہوا۔ اور ان کو عربی و فارسی کی مشکل کتابوں کے ترجمے کے لیے ملازم رکھ لیا۔ ان کی تالیفات یہ ہیں:۔ (۱) اُردو ترجمہ ہدایت الاسلام دو جلدوں میں۔ (۲) اُردو ترجمہ اخلاق جلالی۔ (۳) اُردو ترجمہ قرآن مجید۔ (۴) صرف اُردو منظوم۔

(۱) ہدایت الاسلام کی پہلی جلد ۱۸۰۴ء میں فورٹ ولیم کالج سے شائع ہوئی اور ڈاکٹر گل کرائسٹ نے اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ نمونہ یہ ہے:۔

"فصل کعبے کے درمیان نماز پڑھنے میں۔ فرض کی یا نفل کی نماز کعبہ کے اندر صحیح ہے اگرچہ مقتدی کا منہ امام کے منہ کی طرف ہو، اور جو مقتدی کی پیٹھ اس کے منہ کی طرف ہو تو نماز اس کی صحیح نہیں ہوئی ہے۔ اور کعبہ کے اوپر مکروہ ہے۔ اور کعبہ کے چاروں طرف اقتدا کرنا گو بعضے مقتدی امام کی نسبت سے اس کی طرف نزدیک ہوں صحیح ہے، پر امام جس جانب ہے اگر مقتدی اسی طرف کو امام کی نسبت سے کعبہ کی

طرف نزدیک ہو تو اس کی نماز درست نہیں کیوں کہ اس تقدیر میں وہ امام کے آگے ہو جاوے گا، اور مقتدی کو اس کے آگے کھڑا ہونا درست نہیں ہے۔"

(۲) ترجمہ قرآن مجید: ہدایت الاسلام کی دوسری جلد کا ترجمہ ختم کرنے کے بعد ڈاکٹر گل کرائسٹ کے حکم کے مطابق میر بہادر علی حسینی کے ساتھ مل کر قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا۔ لیکن اسی دوران میں ڈاکٹر صاحب بسبب علالت پنشن لے کر ۱۸۰۴ء میں ولایت چلے گئے۔ ان کے بعد کپتان جیمس مونٹ مقرر ہوئے۔ انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ موقوف کرا دیا۔ اور جتنا ترجمہ مرتب ہوا تھا اس کو بھی شائع کرنا گوارا نہ کیا۔ لیکن بعد کو کسی نے مولوی امانت اللہ کا مترجم حصہ شائع کر دیا۔ اس کا نمونہ یہ ہے:۔

"اور نہیں کوئی چلنے پھرنے والا زمین میں مگر خدا ہی پر ہے اس کی روزی، اور جانتا ہے وہ اس کے ٹھیراؤ کو اور اس کے سونپے جانے کی جگہ کو، سب کچھ روشن کتاب میں ہے، اور وہی تو وہ خدا ہے، جس نے بنا ڈالا آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں اور اس کا عرش پانی پر تھا، تا کہ آزمائے ہمیں کہ کون ہے تم میں سے بہتر، چال چلن کی راہ سے۔ اور اگر کہتا ہے تو ضرور تم اٹھائے جاؤ گے مرنے کے بعد تو کہنے لگتے ہیں وہ لوگ کہ جو کافر ہو گئے کہ نہیں ہے یہ مگر صریح جادو۔" (بارہویں پارہ کا شروع)

(۳) جامع الاخلاق یعنی اُردو ترجمہ اخلاق جلالی کپتان جیمس مونٹ کی فرمائش سے مرتب کیا۔ خاتمہ کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"جولائی کی بیسویں دوشنبہ کے دن ۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۲۰ھ کے بہت محنت و جانفشانی اور فضل یزدانی کی مدد اور صاحبان عالی شان کے اقبال کی برکت سے اس ہیچمدان نے کتاب لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق عرف اخلاق جلالی کے ترجمے سے فراغت کی۔ ولیکن داناؤں کے نزدیک پوشیدہ نہ رہے کہ اس کے لآلی مطالب کو جو فارسی عبارت کے صدف میں پنہاں تھے غواص طبیعت نے دریائے فکر میں کس طرح سے غوطے مار کر نکالا اور ان آبدار موتیوں کو رشتۂ تحریر میں پرو کر ریختہ زبان کے اُردو بازار میں لا حاضر کیا۔"

مولوی امانت اللہ کا نام اسی ترجمہ کے سبب سے مشہور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اخلاق جلالی جیسی علمی، مشکل اور ضخیم کتاب کا ترجمہ کر لینا ہی ایک کارنامہ تھا، لیکن حقیقت میں

مولوی امانت اللہ کا ترجمہ کوئی بڑا کارنامہ ثابت نہ ہوسکا۔ انھوں نے لفظی ترجمہ کا اہتمام کیا ہے اور بہت سے عربی و فارسی الفاظ بے ضرورت بجنسہٖ رہنے دیے ہیں۔ عبارت میں سلاست نہیں رہی اکثر تعقید اور پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً:-

''لیکن بہ مقتضائے اس کے کہ معانی اس کے اسرار حکمت پر مشتمل اور احکام مصلحت کو شامل تھے، یہ تشبیہ اس خیال سے کہ شاہد متناسب الاعضا اور عروس خود زیبا کو کیا پرنیاں اور کیا دیبا، ہر لباس میں ہے وہ خوش نما، اس کی زلف مطالب کی عقدہ کشائی ناخن فکر کو تیز کر کے عقل حکمت شناس کی مشاطگی سے آراستہ کیا۔''

لیکن اس سے صاف اور سلیس عبارت بھی موجود ہے۔ لکھتے ہیں:-

''عدالت پہلے شخص اور اس کے خصائل سے علاقہ رکھتی ہے جیسے اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، پھر اس کے شریکوں کے ساتھ اہل خانہ یا شہر کے رہنے والوں میں سے ہوں، اس واسطے پیغمبر خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ ہر ایک تم میں سے اپنے اعضائے جسمانی اور قوائے نفسانی کا نگہبان ہے، وہ قیامت میں پوچھا جائے گا ان کے احوال سے، اور جب فرمایا کہ عادل لوگ منبر کے اوپر حق سبحانہ تعالیٰ کے نور کی مثال ہیں، صحابیوں نے پوچھا، وے کون آدمی ہیں، فرمایا وے جو پہلے اپنے حق میں اور اپنی اولاد کے حق میں عدالت کریں، پھر ان کے حق میں جو ان کے ملک میں اور ان کے تابع فرمان رہیں۔''

جامع الاخلاق کالج کی طرف سے شائع نہ کی گئی مدت تک مسودہ کی صورت میں رہی۔ پھر کہیں طبع ہونے کی نوبت آئی۔ لوہے کے نستعلیق ٹائپ میں چھپی ہے۔ شائع کرنے والا لکھتا ہے کہ ''اب ۱۲۶۴ھ میں موافق ۱۸۴۸ء کے...... خادم الطلباء احقر غلام حیدر ساکن ہوگلی نے اس ترجمے کو کلکتہ کے بیچ مطبع احمدی میں چھاپا تا کہ طالب علموں کو اس سے فائدہ پہنچے اور عاصی کو ثواب ملے۔'' اس فقرے کے بعد غلام حیدر نے ایک قطعہ بہت خوبصورت لکھا ہے:-

قطعہ

ہر ایک حکایت ہے حدیث لب شیریں	ہر ایک ورق اس کا نقاب رُخ لیلیٰ
گو خوان پہ تحسیں کے سخن کی ہو مدارات	مہمان ہو یہ اور ہوں سب اس کے طفیلی

(۴) صَرف اُردو منظوم   مولوی امانت اللہ نے صرف اُردو کے قواعد مثنوی کی صورت نظم کیے ہیں۔ اس کا نمونہ اس تاریخ کے حصہ نظم میں دکھایا جائے گا۔

شیخ حفیظ الدین: ان کے اسلاف خاندان عرب سے دکن آئے اور پھر دکن سے بنگال چلے گئے۔ جب کلکتہ میں وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل نے ایک مدرسہ (جس کو نیٹو کالج کہتے تھے) قائم کیا، تو اس میں شیخ حفیظ الدین احمد کے والد شیخ بلال الدین مدرس مقرر ہوئے۔ شیخ حفیظ الدین نے اسی مدرسے میں تعلیم پائی۔ پھر فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو ڈاکٹر گل کرائسٹ نے ان کو مدرس مقرر کر لیا۔ اور ڈاکٹر صاحب ہی کی فرمائش سے تصنیف و ترجمہ کا کام بھی کیا۔ کالج کی ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ریزیڈنٹ دہلی کے میر منشی ہو گئے۔ ان کے علمی کارنامے یہ ہیں:-

خرد افروز   شیخ ابوالفضل علامی کی کتاب عیار دانش کا اُردو ترجمہ کیا۔ یہ وہی کلیلہ دمنہ کی داستان ہے جس کا شمار دنیا کے مشہور فسانوں میں ہے۔ اصل میں سنسکرت زبان میں تصنیف ہوا تھا۔ ہندوستان سے ایران پہنچا۔ قدیم فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا، فارسی سے عربی میں لکھا گیا۔ اسی کا بہترین پیرایہ انوار سہیلی ہے۔ جس سے ملّا حسین واعظ کاشفی کا نام روشن ہے۔ اسی کو ابوالفضل نے عیار دانش کے نام سے مرتب کیا، لیکن علامی کی تالیف کاشفی کا چربہ نہیں ہے۔ دونوں میں اختلاف ہے۔ اُردو میں یہ قصہ پہلی مرتبہ حفیظ الدین نے عیار دانش سے لکھا ہے۔ ان کے بعد اوروں نے بھی اُردو میں لکھا۔ انیسویں صدی کے آخر تک کم سے کم سات مختلف لوگوں کے اُردو قصوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے جان بہاری لال راضی کا فسانہ ارژنگ راضی منظوم ہے۔ جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا ہے اور سب سے مشہور فقیر محمد خاں گویا کا بستانِ حکمت ہے جو ۱۸۳۵ء (۱۲۵۱ھ) میں مرتب ہوا۔ (اس کا ذکر و نمونہ آگے درج کیا جائے گا)۔

حفیظ الدین احمد نے اپنے والد کی مدد سے عیار دانش کا ترجمہ کر کے ڈاکٹر گل کرائسٹ کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے اس کے طرزِ بیان کو بہت پسند کیا۔ عبارت

صاف وسادہ ہے۔ اگرچہ میر امّن کی سی شگفتگی نہیں ہے، لیکن با قاعدہ و با محاورہ نثر ہے، تکلفات سے خالی ہے اور فورٹ ولیم کالج کے اکثر مصنفین سے بہتر ہے۔ اس لیے مترجم اور کالج دونوں کی طرف سے اُردو زبان کی قابل قدر خدمت ہے۔ اسی لیے بہت مقبول ہوئی۔

خرد افروز کالج کی طرف سے ۱۸۰۵ء میں شائع کی گئی۔ اس کے بعد ۱۸۱۵ء میں حفیظ الدین کی ترک ملازمت کے بعد کپتان ٹامس روبک نے میر کاظم علی جوانؔ وغیرہ سے نظر ثانی کرانے کے بعد شائع کی۔ پھر ۱۸۵۷ء میں انگلستان سے اس کا نہایت عمدہ ایڈیشن نکلا۔ انگریزی میں بھی خرد افروز کا پورا ترجمہ شائع ہوا۔ مختصر نمونہ یہ ہے:-

"چاروں دوست ایک دل خوشی سے منزل طے کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر فارغ بال و آسودہ حال رہتے تھے۔ دور دراز منزل کو طے کر کے شہر نسطور میں پونچے اور شہر کے ایک کنارے اچھی جگہ اُترے۔ کسی کے پاس کچھ خرچ کو نہ رہا تھا۔ ان یاروں میں سے ایک نے کہا، اب وقت ہے کہ ہر کوئی اپنا اپنا ہنر دکھلاوے اور زور بازو سے کچھ بہم پہونچاوے، تو چین سے چند روز اس شہر میں رہیں۔ بادشاہ زادے نے کہا سب کام خدا کی تقدیر پر موقوف ہیں، آدمی کی کوشش سے سرانجام نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ دانا ہیں اس کی تلاش میں نہیں دوڑتے۔ خوبصورت نوجوان نے کہا، حسن دولت کے حاصل کرنے میں بڑا ایک وسیلہ ہے، جہاں اس کی نمود ہو دولت تابع ہوگی۔ سوداگر بچہ نے بھی حال اپنا ظاہر کر کے کہا کہ حسن کی پونجی معاملہ کے بازار میں ایک متاع بے بہا ہے اور تھوڑے عرصہ میں اس سے کچھ منفعت نہیں ہوتی ہے۔ وا ے صواب و تدبیر درست اور کاروانی و معاملہ فہمی کا فائدہ سب چیزوں سے زیادہ ہے، جو بے سامان اس کو اختیار کرے جلد اپنے مطلب کو پہونچے۔ دہقاں بچہ نے کہا کہ معاملہ فہمی و کاروانی سب وقت کام نہیں آتی۔ اکثر میں نے دانا کو حیراں اور ناداں کو کامیاب دیکھا ہے۔ بہت سے کسب اور کوششیں ہیں جو آدمی کو کامیاب اور مقصد در بناتی ہیں۔ اور ہنر و حرفہ عقلمند کے سامان و دولت کا وسیلہ ہوتا ہے۔"

خلیل علی خاں اشکؔ: ان کے ذاتی حالات دریافت نہیں ہوئے۔ ۱۸۰۱ء ﴿۱۲۱۵ھ﴾ میں ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے داستانِ امیر حمزہ اُردو میں لکھی۔ اس

کے متعلق اشکؔ کا بیان یہ ہے:۔

''مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصۂ دلچسپ کی سلطان محمود شاہ کے وقت سے ہے، اور اس زمانے میں جہاں تک راویانِ شیریں کلام تھے انھوں نے آپس میں مل کر واسطے سنانے اور یاد دلانے منصوبے لڑائیوں اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے امیر حمزہ صاحب کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں۔ ہر رات کو ایک داستان حضور میں سناتے تھے۔ انعام و اکرام پاتے تھے۔ اب شاہ عالی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق سنہ بارہ سو پندرہ ہجری اور سنہ اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علی خاں نے جو متخلص بہ اشکؔ ہے۔ حسب خواہش مسٹر گل کرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب بنا بر آموزان زبان ہندی اس قصے کو اُردوئے معلّیٰ میں لکھا تا کہ صاحبان مبتدیان کے پڑھنے کو آسان ہووے۔''

خلیل علی خاں کے بعد داستانِ امیر حمزہ کو منشی نول کشور نے حافظ سیّد عبداللہ بلگرامی سے مرتب کرا کے شائع کیا۔ پھر مطبع نول کشور کے مشہور مصنف و مصحح سیّد تصدق حسین نے اس کو اپنے طرز پر لکھا۔ اس زمانے میں فسانۂ عجائب کی بڑی دھوم تھی اور اس کی رنگین عبارت آرائی نہایت مقبول تھی۔ سیّد تصدق حسین نے قصہ امیر حمزہ کو شاعرانہ صنعت گری کا عجائب خانہ بنا دیا، اور اپنے نزدیک فسانۂ عجائب کا جواب لکھ دیا۔ اس کے مقابلے میں خلیل علی خاں کا طرز بیان سادہ و سلیس ہے۔ انھوں نے بھی کہیں کہیں رنگین و مقفّیٰ فقرے لکھے ہیں اور خیال آرائی کی ہے، لیکن اس قدر نہیں کہ ناظرین پر بار گزرے۔ صنائع و استعارات و تشبیہات بھی معتدل ہیں۔ فارسی ترکیبیں بھی معقول حد تک ہیں۔ خلیل علی خاں نے اگرچہ فارسی زبان کے قصہ سے اپنی داستان مرتب کی ہے، لیکن اس میں ہندوستانی رسم و رواج اور مناظر کو داخل کر کے ہندوستانی مذاق کے مطابق بنا دیا ہے۔

بعد کے لوگوں نے اسی ایک قصہ کو طول دے کر بڑی ضخیم کتابیں طلسم ہوش ربا و طلسم ہفت پیکر وغیرہ تیار کر دیں۔ سیّد تصدق حسین اپنی تالیف میں ایک قصہ کو اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

''نخل بندان بوستان اخبار، چمن پیرایان گلستان اظہار، تختۂ کاغذ صاف میں اس طرح اشجار الفاظ موقع بموقع نصب فرماتے ہیں، صحن شفاف قرطاس کو گل و ریاحین مضامین رنگا رنگ سے یوں رشک تختۂ

ارژنگ بناتے ہیں کہ جب باغ بیداد تیار ہوا، نمونۂ بہشت شداد نمودار ہوا، القش خوشی سے پھول گیا، فکر دارین بھول گیا۔"

خلیل علی خاں اسی داستان کو اس طرح لکھتے ہیں:۔

"یہاں سے دوکلمہ داستان ملک القش کے ملاحظہ فرمایئے، جب کہ وہ باغ تیار ہوا ایک دن بادشاہ کے حضور میں عرض کی غلام نے ایک باغ حضور کی بدولت بنایا ہے اور بندہ امیدوار ہے کہ ظل سبحانی وہاں رونق افروز ہو کر ایک چمچہ آش نوش جان فرمائیں کہ باعث عزت از دیار خانہ زاد ہے۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

اس کے علاوہ خلیل علی خاں نے کپتان ولیم ٹیلر کی فرمائش سے ابوالفضل کے اکبر نامہ کا ۱۸۰۹ء میں ترجمہ کیا اور واقعات اکبر نام رکھا۔ لیکن شائع نہیں ہوا۔

اکرام علی: ان کے حالات بھی معلوم نہیں فورٹ ولیم کالج میں رہ کر صرف ایک کتاب اخوان الصفا ہندی لکھی ہے۔ اخوان الصفا کے نام سے بصرہ میں ایک انجمن تھی اس کے اراکین نے متعدد رسالے مختلف علمی مباحث کے متعلق لکھے ہیں۔ یہ "رسائل اخوان الصفا" عربی زبان کی مشہور و مقبول تصنیف ہے۔ ان میں سے پہلے رسالے میں مخلوقات کی فضیلت کے دعوے پر انسان وحیوانات میں مباحثہ ہے، جنوں کا بادشاہ ان کا حکم و منصف ہے، آخر میں انسان کا فضل و شرف اس بنا پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ جملہ مخلوقات میں صرف انسان خلافت الٰہی کا اہل اور بار امانت کا حامل ہے۔ اس رسالہ کو مولوی اکرام علی نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"جب میں بموجب حسن ایماء جناب صاحب نامدار...... خداوند نعمت مستر ابراہم لاکٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے اور موافق طلب اخی واستاذی جناب بھائی صاحب مولوی تراب علی صاحب دام ظلہم کے شہر کلکتہ میں آیا، اور رہنمونی طالع سے بعد حصول شرف ملازمت مورد عنایت و مرحمت ہوا، از بسکہ صاحب موصوف کو کمال پرورش منظور تھی، سرکار کمپنی بہادر میں نوکر رکھوا کر اپنے پاس متعین کر لیا۔ بعد چندروز کے باستصواب جناب عالی شان...... مدرس ہندی کپتان جان ولیم ٹیلر صاحب بہادر دام دولتہٗ

نے فرمایا کہ رسالہ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبان اُردو میں ترجمہ کر،
لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہو دیں بلکہ اصطلاحات علمی اور خطبے بھی اس کے کہ تکلف
سے خالی نہیں ہیں، قلم انداز کر، صرف خلاصہ مضمون مناظرہ کا ہونا چاہئے۔راقم نے بموجب فرمانے
کے فقط حاصل مطلب کو محاورۂ اردو میں لکھا، خطبوں کو نکال ڈالا، اور اکثر اصطلاحات علمی کہ مناظرہ سے
ان کو علاقہ نہ تھا ترک کیں، مگر بعضے خطبے اور اصطلاحات ہندی وغیرہ کہ اصل مطلب سے متعلق تھے، باقی
رکھے۔"

یہ رسالہ ۱۸۱۰ء ﴿۱۲۲۵ھ﴾ میں اکرام علی نے لکھا، ۱۸۱۱ء میں پہلی مرتبہ شائع
ہوا۔اس کے بعد بمبئی وغیرہ میں چھپا۔انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔نمونہ یہ ہے:۔

"بادشاہ نے کہا یہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم ۔یعنی انسان کو ہم
نے نہایت سڈول بنایا ہے۔اس کا کیا جواب دیتے ہو۔اس نے عرض کیا جہاں پناہ کلام ربانی میں
ظاہری معنوں کے سوا بہت سی تاویلیں ہیں کہ بغیر اہل علوم کے کوئی نہیں جانتا۔تفسیر اس کی عالموں سے
پوچھا چاہیے۔چنانچہ ایک حکیم دانش مند نے بموجب حکم بادشاہ کے مطلب اس آیت کا یوں ظاہر کیا،
جس دن اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا، سُبھ گھڑی، نیک ساعت تھی، ستارے اپنے اپنے برج شرف میں
جلوہ گر اور ہیولیٰ عناصر کے واسطے قبول کرنے صورتوں کے آمادہ و مستعد تر تھے۔اس لیے صورتیں اچھی،
قد سیدھے ہاتھ پاؤں درست بنے، اور احسن تقویم کے ایک معنی اور بھی اس آیت سے ظاہر ہوتے
ہیں: فَعَدَلَکَ فِیْ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَاشَاءَ رَکَّبَکَ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو حدِ اعتدال پر پیدا کیا
ہے، نہ بہت لنبا بنایا، نہ بہت چھوٹا۔بادشاہ نے کہا اس قدر اعتدال اور مناسبت اعضاء کی واسطے فضیلت
کے کفایت کرتی ہے۔حیوانوں نے عرض کیا کہ ہمارا بھی یہی حال ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہم کو بھی ساتھ
اعتدال کے جو مناسب تھا ہر ایک عضو بخشا۔اس فضیلت میں ہم اور وے برابر ہیں۔انسان نے جواب
دیا کہ تمھارے لئے مناسبت اعضا کی کہاں ہے، صورتیں اَنپٹ مکروہ، قد بے موقع، ہاتھ پاؤں بھدے
ہے، کیونکہ تم میں سے ایک اونٹ ہے۔ڈیل بڑا، گردن لمبی، دُم چھوٹی اور ہاتھی ہے جس کا ڈیل ڈول
بہت بڑا اور بھاری، دو دانت منہ سے باہر نکلے ہوئے، کان چوڑے، آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔"

ایک اور فصل کا اقتباس یہ ہے:۔

''بادشاہ نے کہا جنوں کی قوم میں نیک و بد اور مسلمان و کافر ہوتے ہیں۔ جس طرح انسانوں میں، جو کہ نیک ہیں اور اپنے رئیس کی اطاعت و فرماں برداری اس قدر کرتے ہیں کہ آدمیوں سے بھی نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے کہ اطاعت و فرماں برداری جنات کی مثل ستاروں کے ہے۔ آفتاب ان میں بمنزلۂ بادشاہ ہے اور سب ستارے بجائے فوج و رعیت کے ہیں۔ چنانچہ مریخ سپہ سالار، مشتری قاضی، زحل خزانچی، عطارد وزیر، زہرہ حرم، ماہتاب ولی عہد ہے اور ستارے گویا فوج و رعیت ہیں۔ اس واسطے کہ سب آفتاب کے تابع ہیں، اسی کی حرکت سے حرکت کرتے ہیں۔ وہ جو ٹھہر رہتا ہے، سب متوقف ہو جاتے ہیں، اپنے معمول و حد سے تجاوز نہیں کرتے۔ یعسوب نے پوچھا کہ ستاروں نے بخوبی اطاعت و انتظام کی کہاں سے حاصل کی۔ بادشاہ نے کہا یہ فیض ان کو فرشتوں سے حاصل ہے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی فوج ہیں، اور اس کی اطاعت کرتے ہیں۔''

تمام کتاب میں اس طرح کے مکالمات اور مباحثات نہایت دلچسپ ہیں۔ مختلف مسائل و موضوعات کے متعلق معلومات کا خزانہ جمع کر دیا ہے۔ مولوی اکرام علی نے نہایت خوبی سے ترجمہ کیا ہے۔ متروک الفاظ، قدیم محاورے، قواعد زبان سے اختلاف بہت کم ہے۔ تمثیل نگاری کا (جس کو انگریزی میں ایلیگری کہتے ہیں) نہایت نادر نمونہ ہے۔ انوار سہیلی پر فسانہ کا رنگ غالب ہے، اخوان الصفا میں علمی شان بھی ہے اور دلچسپی بھی ہر جگہ قائم رہتی ہے۔

نہال چند لاہوری: دہلی کے رہنے والے تھے، وہاں سے پنجاب چلے گئے، لاہور کو وطن بنا لیا اور لاہوری مشہور ہوئے۔ ایک انگریز کپتان ولورٹ کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے، اور ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے ۱۸۰۳ء ﴿۱۲۱۷ھ﴾ میں گل بکاؤلی کا قصہ فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ فارسی میں عزت اللہ بنگالی نے لکھا تھا، نہال چند نے مذہب عشق تاریخی نام رکھا۔ کتاب کے آخر میں ہجری و عیسوی تاریخیں نکالی ہیں لکھتے ہیں:۔

غرض جس طرح سے کیا ان کو شاد ہماری بھی دے یا الٰہی مراد

یہ قصہ ہوا جب بخوبی تمام — تو پھر فکر تاریخ تھی صبح و شام
یکا یک سنی میں نے آواز غیب — کہ ہے "مذہب عشق" تاریخ و نام
۱۲۲۷ھ

ہوئی پھر یہ خواہش کہ کلک و زبان — کریں عیسوی سال کو بھی عیاں
تو پھر ہاتف غیب نے دی ندا — کہ اس "مذہب عشق" میں کوئی آ
۱۲۲۷ھ
کرے "مشرب جام" گر اختیار — تو رازِ نہاں اس پہ ہو آشکار
۵۸۶

یعنی مذہب عشق میں مشرب جام کو ملایا جائے تو ۱۸۰۳ء حاصل ہو جائیں گے۔

لالہ نہال چند نے نہایت سلیس، صحیح، با محاورہ، با قاعدہ زبان لکھی ہے۔ متروک الفاظ اور محاورے خال خال ہیں۔ پہلی مرتبہ مذہب عشق ۱۸۰۴ء میں شائع ہوا۔ دوبارہ اشاعت کے وقت میر شیر علی افسوس نے نظر ثانی کی۔ اس کے بعد بھی ہندوستان کے مختلف مطابع میں بار بار شائع ہوا۔ اسی قصہ کو پنڈت دیا شنکر نسیم نے نظم کر کے گلزار نسیم نام رکھا۔ ۱۸۳۸ء ﴿۱۲۵۴ھ﴾ میں یہ مثنوی لکھی گئی۔ اس نظم کی خوبی و لطف نے نہال چند کے قصہ کی شہرت و مقبولیت کو کم کر دیا۔ مذہب عشق کا نمونہ یہ ہے:-

"اُس نے کہا کہ آج تم یہ گٹھے میرے آقا کے باورچی خانے میں لے چلو، دولت خانہ اس کا نزدیک ہے، اس نے اس ویرانہ میں ایک شہر آباد کیا ہے، واجبی قیمت ملے گی، بلکہ ایسا انعام پاؤ گے کہ پھر کہیں اور لکڑیاں بیچنے نہ جاؤ گے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری تمام عمر اسی کام میں اور اسی بیابان سے لکڑیاں لے جاتے گزری ہے، لیکن آبادی کا یہاں نشان دیکھا نہ سنا۔ ساعد نے کہا تم ذرا آگے بڑھ کر دیکھو، اگر میرے کہنے کا کچھ اثر ظاہر ہو تو بہتر نہیں تو تمھارے پھر آنے کا کوئی مانع نہ ہوگا۔ لکڑہارے انعام کے لالچ سے ساعد کے آگے ہو لئے۔ پھر تھوڑی دور جا کر سب یک بارگی پکار اُٹھے نعوذ باللہ من الشیطان الرجیم! اے میاں، تم ہمیں آگ میں جھونکنے کو لئے جاتے ہو، چولھے میں جائے انعام اور بھاڑ میں پڑے اکرام، بس ہمیں معاف کرو، ہم نے بھر پایا۔ ساعد نے کہا یہ شعلۂ آتش نہیں، حویلی کے جواہرات چمک رہے ہیں۔ تم ہرگز اندیشہ نہ کرو اور

میرے ساتھ چلے آؤ۔ وہ اس کے کہنے سے کچھ اور بھی آگے بڑھے، آگے ساری زمین سونے کی نظر آئی سب نے اس کی بات سچی پائی، قدم اٹھائے بیدھڑک چلے۔"

بینی نراین جہاںؔ : لاہور کے رہنے والے تھے، ان کے والد مہاراجہ لکشمی نراین بڑے رئیس تھے۔ ان کے بھائی رائے کھم نراین عالم و شاعر تھے، رندؔ تخلص کرتے تھے، بینی نراین گردش روزگار سے تباہ ہو کر کلکتہ پہنچے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر گل کرائسٹ فورٹ ولیم کالج سے رخصت ہو کر ولایت چلے گئے تھے۔ بینی نراین ایک عرصہ تک کلکتہ میں بیکار اور پریشان رہے، پھر حیدر بخش حیدری کے وسیلے سے کالج میں ملازم ہوئے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں:- (۱) چار گلشن۔ (۲) دیوان جہاںؔ۔ (۳) ترجمہ تنبیہ الغافلین۔ یہ کبھی شائع نہیں ہوئیں۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں ان کے مسودے محفوظ ہیں۔ ارباب نثر اُردو سے ان کے نمونے درج کیے جاتے ہیں:-

(۱) چار گلشن عشقیہ قصہ ہے۔ بینی نراین نے ۱۸۱۱ء ﴿۱۲۲۵ھ﴾ میں یہ قصہ امام بخش صہبائی کو زبانی سنایا تھا۔ انھوں نے پسند کیا اور لکھنے کی رائے دی۔ ان کے مشورے کے مطابق بینی نراین نے لکھا تھا۔ کلکتہ میں کپتان روبک اور کپتان ٹیلر کے سامنے پیش کیا دونوں نے پسند کیا، اور معقول صلہ دیا۔ نمونہ یہ ہے:-

"زمانہ گزشتہ کے نقل بیان کرنے والوں اور ایام سلف کے قصہ کہنے ہاروں نے ان نادر قصوں اور عجیب حکایتوں کے گوہر آبدار کو رشتۂ بیان میں اس طرح منسلک کیا ہے کہ بیچ بلاد خجستہ بنیاد وسعت آباد ہندوستان جنت نشان کے شہروں سے کسی شہر میں ایک بادشاہ جم جاہ، نہایت عالی شان والا دودمان تھا۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے شان و شوکت اور جاہ و حشمت اس کو اس قدر عطا فرمائی تھی کہ اس زمانے میں کوئی دوسرا بادشاہ اس کی برابری نہ کر سکتا تھا اور اس کے داب و رعب کے آگے پاؤں رستم کا بھی نہ ٹھہر سکتا تھا۔ بیت

فلک مرتبت تھا وہ کیوان شاہ   دو مشعل فروز اس کے تھے مہر و ماہ

(۲) دیوانِ جہاں یہ شعرائے اُردو کا تذکرہ ہے جو بینی نراین جہاں نے کپتان

روبک کی فرمائش سے ۱۸۱۴ء (۱۲۲۹ھ) میں مرتب کیا۔ اس میں ۱۲۵ شاعروں کا مختصر حال ہے۔ جن میں سے بہت سے ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کا اور کہیں ذکر نہیں ملتا۔ بنی نراین نے اپنا کلام تقریباً سب کا سب درج کر دیا ہے، گویا یہی تذکرہ "دیوان جہاںؔ" بھی ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں ہر سال ۲۵ر جولائی کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا، جس میں کالج اور بیرون کالج کے شعراء شریک ہوتے تھے۔ دیوان جہاں میں ایک مشاعرے کی غزلیں بھی آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہیں۔ تذکرہ کا نمونہ یہ ہے:-

"محبتؔ تخلص، نام نواب محبت خاں، نواب حافظ رحمت خاں کے بیٹے، بریلی کے رہنے والے۔ اس نحیف پر نہایت مہربانی فرماتے تھے۔ اور ہفتہ میں ایک بار چارشنبہ کے دن اس خاکسار کے غریب خانہ پر تشریف لاتے تھے۔"

(۲) تنبیہ الغافلین اس نام سے ایک کتاب مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (مترجم قرآن مجید) نے مولوی سیّد احمد بریلوی کی فرمائش سے فارسی میں لکھی تھی۔ بنی نراین جہاں نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جہاں کے مسلمان ہو جانے اور مولوی سیّد احمد کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی اطلاع کا ذمہ دار فرانسیسی مستشرق پروفیسر گارسن دتاسی ہے۔ اس نے اپنے تذکرہ شعرا میں بھی جہاں کا حال لکھا ہے، اور اپنے پانچویں خطبے (۱۸۵۴ء) میں جہاں کی تصانیف کے سلسلے میں لکھتا ہے:-

"تیسری ایک کتاب تنبیہ الغافلین کا ترجمہ ہے۔ یہ ایک مذہبی کتاب ہے۔ جو فارسی زبان میں مشہور مسلمان مصلح اور فرقہ وہابی کے بانی سیّد احمد کی فرمائش سے تالیف ہوئی تھی۔ اس کتاب کے اور ترجمے بھی ہندوستانی زبان میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں فرقۂ وہابی سے تعلق رکھتا تھا، یا کم سے کم مسلمان ہو گیا تھا، کیونکہ وہ اس کتاب کے دیباچہ میں اس طرح لکھتا ہے جیسے سچ مچ کا مسلمان۔"

خطبات گارسن دتاسی ص ۹۰ و ۹۱ مطبوعہ انجمن ترقی اُردو

تنبیہ الغافلین کے جو ترجمے مطبوعہ ملتے ہیں وہ بنی نراین کے نہیں ہیں، دوسرے مصنفوں کے ہیں۔ ان میں ۲۵ باب ہیں۔ اور بنی نراین کے ترجمے میں (جو مسودے کی صورت میں انڈیا آفس میں موجود ہے) ۲۰ باب کا ترجمہ ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے:-

''بنی اسرائیل سے ایک جگہ تین بھائی تھے۔ ان میں ایک بڑا دانا تھا، اس نے اپنے بھائیوں سے کہا اے بھائیو ماں باپ کی خدمت ہم کو سپرد کرو تو ہم بجالاویں، بعد مرنے کے جب میراث ان کی ملے گی، تم دونوں ہی باٹ لیجیو۔ یہ بات سن کر وہ بہت خوش ہوئے، اور ایسا ہی کیا۔ الغرض وہ اکیلا ان کی خدمت کرنے لگا۔ جب ماں باپ ان کے مر گئے یہ دونوں بھائی ورثہ ان کا پا کر خوش گذران کرنے لگے، اور بڑے بھائی کو اس مال سے کچھ نہ دیا۔ اس نے چھوٹے بھائیوں سے کہا اے بھائیو، جیسا ماں باپ کے وقت میں کھانے پینے کو پاتا تھا ایسا ہی اب مجھ کو دو، میں اور کچھ نہیں مانگتا ہوں۔ اس کی رنڈی یہ بات سن کر قضیہ کرنے لگی۔ ایک رات اس بیچارے نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کہتا ہے کہ فلانی جگہ سو دینار سونے کے گڑے ہیں تو نکال لے۔ اُس نے اعتبار نہ کیا۔ آخر میں یہی بات تین رات پیہم خواب میں دیکھا کیا۔ بعد اس کے جو اس جگہ کو کھودا تو وہ دینار پائے۔''

للّو لال جی: گجرات کے برہمن تھے، لیکن اوائل عمر میں شمالی ہند میں آ بسے تھے۔ یہ بھی فورٹ ولیم کالج میں شروع زمانے ہی میں ملازم ہو گئے تھے۔ اس کالج میں اُردو کے ساتھ ہندی کی تصنیف و ترجمہ کا کام بھی جاری کیا گیا تھا۔ ہندی میں سب سے زیادہ کارنامہ للّو لال کا ہے، اور ان کے بعد ان کے رفیقِ کار سدل مسرا کا۔ مسرا جی نے صرف ایک قصہ ہندی زبان میں لکھا ہے۔ للّو لال جی نے سب سے پہلے پریم ساگر لکھی جو ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھگوت گیتا کے دسویں باب کا ترجمہ ہے۔ اس سے پہلے ایک اور شخص پنڈت چتر بھوج مسرا نے اس کو برج بھاشا میں لکھا تھا۔ لیکن اس زمانے کی دیگر تصانیف کی طرح اس میں کثرت سے سنسکرت الفاظ، تراکیب، محاورات تھے۔ گویا برج بھاشا سے زیادہ سنسکرت کی کتاب تھی، اس لیے عام فہم نہ تھی۔ للّو لال نے سنسکرت زبان کا عنصر کم کر کے آسان زبان میں ترتیب دی۔ اس کی عبارت مقفّٰی ہے اور جا بجا اشعار بھی حسب موقع ہیں۔ یہ پریم ساگر موجودہ ہندی لٹریچر (۱) کا سنگِ بنیاد ہے۔ اس

---

(۱) ہندی زبان کی تاریخ: اُردو اور ہندی دونوں زبانیں ایک ہی پراکرت یعنی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ ۱۶۲ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۱ گذشتہ) برج بھاشا کی دو صورتیں ہیں، اور اپنی تقویم و ترقی میں ایک دوسری سے متاثر ہیں، نیز اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ سے ہندی زبان کی موجودہ ادبیات کا آغاز ہوا ہے۔ اس لیے ادبیات ہندی کی مختصر تاریخ ناظرین تاریخ اُردو کے لیے دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوگی۔ ہندوستان کی تمام زبانیں انڈو آرین زبان کی شاخیں ہیں اس زبان کی علمی صورت سنسکرت ہے۔ سنسکرت نہایت مکمل، وسیع، باقاعدہ زبان ہے لیکن صرف علمی اور کتابی زبان ہے۔ پہلے بھی سنسکرت کبھی عام بول چال میں داخل نہیں ہوئی۔ عام بول چال کی زبان کو سنسکرت کے مقابلے میں پراکرت کہتے ہیں۔ اس کی صورتیں صوبے صوبے میں مختلف ہیں۔ کہیں زیادہ فرق ہے کہیں کم۔ ہندوستان کے نصف شمالی کی پراکرتوں کی تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے:-

(۱) راجستھانی، اس میں میواتی، مارواڑی، جیپوری اور مالوی زبانیں شامل ہیں۔ ان میں سے مارواڑی علمی زبان ہے۔ اس حصہ ملک میں برج بھاشا بھی شاعری کے لیے مستعمل ہے۔ (۲) پچھمی بھاشا۔ اس میں پنجابی، برج بھاشا، قنوجی، بندیلی زبانیں شامل ہیں۔ (۳) پوربی بھاشا اس میں بگھیلی، چھتیس گڑھی، بیسواڑی (اجودھیا کی زبان) شامل ہیں۔ ان میں سے اودھ یعنی اجودھیا کی زبان علمی شان رکھتی ہے۔ (۴) بہاری جو بنگالی کی ایک صورت ہے۔

ان بولیوں میں برج بھاشا کو سب سے زیادہ وسعت حاصل ہوئی۔ باوجودیکہ پنجاب، بہار، اودھ، راجپوتانہ وغیرہ میں الگ الگ بولیاں موجود تھیں، لیکن شاعری کی زبان کے لیے برج بھاشا سب سے زیادہ موزوں سمجھی گئی تھی۔ اسی برج بھاشا سے آگے چل کر دو صورتیں دو رسم الخط میں اُردو اور ہندی کے نام سے رائج ہوئیں۔ یہ فرق اور یہ نام مسلمانوں کے تسخیر دہلی کے بعد پیدا ہوا۔ اس سے پہلے برج بھاشا کی علمی و ادبی شان صرف شاعری میں محدود تھی۔ اُردو زبان کی ساخت اور رواج سے دو سو برس تک برج بھاشا میں کوئی نثر کی کتاب موجود نہ تھی۔ نظم کا لکھنا اس قدر آسان اور پسندیدہ تھا کہ فن عروض، قواعد صرف و نحو، علم نجوم شرح و تفسیر، فسانہ و ڈراما، جس موضوع پر کتابیں لکھی گئیں سب نظم میں لکھی گئیں۔ پھر بھی بعض نثر کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ نثر ہندی کی ایک تصنیف گورکھ ناتھ سے منسوب ہے جو چودھویں صدی عیسوی میں تھا۔ اس کتاب کی اس مصنف سے نسبت مشتبہ ہے، لیکن اگر درست ہو تو یہ سب سے پہلی تصنیف نثر ہے۔ اس سے قبل کسی کتاب کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ اس کے بعد سولہویں صدی میں وٹھل ناتھ کی کتاب منڈن اور گوکل ناتھ کی تصنیف چوراسی وارتا ہیں۔ پھر سترھویں صدی میں داموور داس نے مارکھنڈ پران کا ترجمہ نثر میں کیا۔ اس کے بعد بھی تھوڑا بہت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نثر کا لٹریچر پایا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں چتر بھوج مسرا نے بھگوت گیتا کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا، جس کو للّو لال نے پریم ساگر کے نام سے سہل تر زبان میں لکھا۔ چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک تمام تصانیف نثر کا یہ طرز ہے کہ سنسکرت کا غلبہ ہے لیکن جملوں کی ساخت برج بھاشا کے قواعد کے مطابق ہے، افعال وضمائر برج بھاشا کے ہیں، اس لیے یہ زبان سنسکرت سے آسان ہے، تاہم عام فہم نہیں ہے۔ للّو لال پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی تصانیف میں روزمرّہ کی بول چال اور اسلوب بیان اختیار کیا اور سنسکرت کے نامانوس و مشکل الفاظ کی جگہ برج بھاشا کے سہل تر الفاظ استعمال کیے۔ للّو لال کی عبارت چند الفاظ بدلنے سے اُردو کی متعارف عبارت بن جاتی ہے۔ مثلاً للّو لال کی پریم ساگر سے چند سطریں ناگری رسم الخط سے اُردو میں لکھی جاتی ہیں:۔

> ''یہ سنتے ہی کنس ڈر کر کانپ اُٹھا اور کرودھ کر (غصہ ہو کر) دیوکی کو جھونٹے پکڑ کر رتھ سے نیچے کھینچ لایا، کھڑگ (تلوار) ہاتھ میں لیے، دانت پیس پیس، لگا کہنے جس پیڑ کو جڑ ہی سے اکھاڑیے تس میں پھول پھل کاہے کو لگے گا، اب اسی کو ماروں تو نرد ہے (بے فکر) راج کروں، یہ دیکھ سُن باس دیو من میں کہنے لگے، اس مورکھ (بے وقوف) نے دیا سنتاپ (رنج) جانتا نہیں ہے پُن اور پاپ، جو میں اب کرودھ (غصہ) کرتا ہوں تو کاج بگڑے گا، تس سے اس سمے (وقت) چھما (درگذر) کرنی یوگ (بھلی) ہے۔''

فورٹ ولیم کالج میں ہندی کا آسان لٹریچر پیدا کرنے کی کوششیں جاری تھیں کہ ان سے علیحدہ بلکہ ان سے پہلے ایک اُردو کے شاعر سیّد انشاء اللہ خاں دہلوی (متوفی ۱۸۱۷ء) کو لکھنؤ میں ''ایک انوکھی بات'' سوجھی اور انھوں نے ایک طویل کہانی ایسی روزمرّہ کی بول چال میں لکھ دی جس میں عربی فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا۔ یہ کہانی ناگری حروف میں چھپ کر ہندی کتابوں میں شامل ہے اور فارسی خط میں چھپی ہوئی اُردو کے کتب خانے میں داخل ہے۔ اس کا مفصل تذکرہ آئندہ صفحات میں عنقریب آتا ہے۔ یہاں اس کی چند سطریں ہندی تحریر کی مثال کے طور پر درج کی جاتی ہیں:۔

> ''ہم اچھی گھڑی سُبھ مہورت سوچ کے تمھارے سسرال میں کسی باہمن کو بھیجتے ہیں جو بات چیت چاہی ٹھیک کر لاوے۔ باہمن جو سُبھ گھڑی دیکھ کر ہڑبڑی سے گیا تھا، اس پر کڑی پڑی۔ سُنتے ہی رانی کیتکی کے باپ نے کہا ان کے ہمارے ناتا نہیں ہونے کا، ان کے باپ دادا ہمارے باپ داداوں کے آگے سدا ہاتھ جوڑ کے باتیں کرتے تھے اور جو تنک تیوری چڑھی دیکھتے تھے تو بہت ڈرتے تھے کیا ہوا جو اب وے بڑھ گئے اور اونچے پر چڑھ گئے۔ جس کے ماتھے ہم بائیں پاؤں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے انگوٹھے سے ٹیکا لگادیں وہ مہاراجوں کا راجہ ہو جائے، کس کا منہ جو یہ بات ہمارے منھ پر لاوے۔''

فورٹ ولیم کالج میں ہندی تصانیف کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ کالج کے بعد اور کالج کے باہر بھی جاری رہا۔ تمام علوم وفنون کی کتابیں ہندی میں ترجمہ وتالیف ہونے لگیں۔ اخبارات ورسائل جاری ہوئے، اور ہندی تحریر کے مختلف اسلوب پیدا ہو گئے۔

۱۸۳۷ء میں لیتھو کا ہندی مطبع دہلی میں قائم ہوا۔ ہندی کا سب سے پہلا اخبار گوبند رگھوناتھ کی اڈیٹری میں بنارس اخبار کے نام سے ۱۸۴۵ء میں جاری ہوا۔ لیتھو میں چھپتا تھا (یہی اخبار اسی نام سے اُردو میں بھی شائع ہوتا تھا لیکن اُردو کا پہلا اخبار نہ تھا۔ اس سے پہلے اُردو کے اور اخبار نکل رہے تھے۔) دوسرا ہندی کا اخبار بنارس ہی سے سدھاکر کے نام سے تارا موہن مترا کی اڈیٹری میں ۱۸۴۹ء میں جاری ہوا۔ یہ پرچہ پہلے اُردو میں نکلا تھا، پھر اُردو کی جگہ ہندی میں چھپنے لگا۔ ہندی کا سب سے پہلا ڈراما گوپال چند نے نہوسا کے نام سے ۱۸۰۰ء میں مرتب کیا۔ مقالہ نگاری سب سے پہلے بال کرشن بھٹہ نے ۱۸۴۵ء میں شروع کی۔ ہندی لکھنے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو اُردو نہیں جانتے تھے، صرف ہندی میں لکھتے تھے، ان لوگوں نے اپنی تحریر میں سنسکرت کا عنصر بڑھا دیا اور عربی وفارسی کے مانوس ومروج الفاظ سے پرہیز کیا۔ ایسے مصنفوں میں پنڈت شیام سندر داس بہت ممتاز ہیں۔ ان کی نسبتاً سادہ تحریر کا نمونہ یہ ہے:-

''آج کل کی سبھیتا (زمانہ) میں دن پر دن اپ بے (فضول خرچی) کرنے کا دوش بڑھتا جاتا ہے، کیوں بڑے بڑے رئیس اور دھن وان (دولت مند) ہی اب بیائی (فضول خرچ) نہیں ہوتے بلکہ مدھم اور اتم سڑ پرین (متوسط وادنیٰ درجہ) کے لوگ بھی خرچ کرنے میں بڑی ادارتا (شان) دکھلاتے ہیں۔ اس کا کارن (نتیجہ) یہی ہے کہ لوگ اپنی باست بک دشا (اصلی حالت) کو چھپاتے اور لوگوں کو اپنی جھوٹی سمپتا دکھانے کے لیے اوپری ٹرک بھڑک ادھک رکھتے ہیں۔''

لیکن ان میں سے جو لوگ اُردو ہندی دونوں میں لکھتے ہیں وہ زیادہ عام فہم لکھتے اور عربی وفارسی کے آسان الفاظ بھی بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ ان میں منشی پریم چند کا خاص درجہ ہے۔ انھوں نے بعض افسانے اُردو ہندی دونوں زبانوں میں لکھے ہیں۔ ان کا فرق ذیل کے نمونوں سے واضح ہوگا۔ فسانہ (بڑے گھر کی بیٹی) ہندی میں اس طرح شروع کرتے ہیں:-

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) ''بینی مادھوسنگھ گوری پور گاؤں میں زمیندار اور نمبردار تھے۔ ان کے پتا ماکسی کے بڑے دھن دھاتھ سمپن تھے۔ گاؤں کا پکا تالاب اور مندر جن کی اب مرمت بھی مشکل تھی انھیں کی کیت استھم تھے۔ کہتے ہیں اس دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا، اب اس کی جگہ ایک بوڑھی بھینس تھی۔ جس کے شریر میں است پنجر کے سوا اور کچھ شیش نہ رہا تھا، پر دودھ شاید بہت دیتی تھی، کیونکہ ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لیے اس کے سر پر سوار ہی رہتا تھا۔''

اسی قصہ کو اُردو میں اس طرح لکھتے ہیں:۔

''بینی مادھوسنگھ موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبردار تھے ان کے بزرگ کسی زمانے میں بڑے صاحب ثروت تھے۔ پختہ تالاب اور مندر انھیں کی یادگار تھی، کہتے ہیں اس دروازے پر پہلے ہاتھی جھومتا تھا۔ اس ہاتھی کا موجودہ نعم البدل ایک بوڑھی بھینس تھی جس کے بدن پر گوشت تو نہ تھا مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی کیونکہ ہروقت ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لیے اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔''

علمی مضامین اور تصانیف کی زبان اور اسلوب بیان تو دشوار ہونا ہی چاہیے، لیکن عام لٹریچر، اخبار، رسائل، فسانہ، تاریخ وغیرہ میں بھی یہ اختلاف تھا کہ کسی کی زبان آسان کسی کی مشکل ہوتی تھی، یعنی کوئی شخص سنسکرت اور برج بھاشا کے نامانوس الفاظ زیادہ استعمال کرتا تھا، کوئی فارسی عربی کے عام فہم الفاظ لکھتا تھا، لیکن ۱۹۳۵ء سے ہندی زبان کے مقرر، نامہ نگار، مصنف کھڑی بولی اور عام فہم بھاشا کو دقیق و دشوار اور سنسکرت سے مشابہ بنانے لگے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک یہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے کہ عربی فارسی کے الفاظ تو استعمال کیے جاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ سنسکرت اور بھاشا کے مشکل اور غیر متعارف الفاظ بھی برتے جاتے ہیں۔ مثلاً

''منجوں کے سبھاؤ سے ماتائیں ادھک پر چت ہوتی ہیں، بچے ماؤں سے ادھک پریم کرتے ہیں، پریم پورک کہی ہوئی باتوں کا دل پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔''

نیز مشہور و مروّج الفاظ مدرسہ، استاد، استانی، کتاب، امتحان وغیرہ کو صرف ادبی تصانیف سے نہیں بلکہ عام بول چال سے بھی خارج کر کے ان کی جگہ سنسکرت اور بھاشا کی دشوار اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً اسمبلی کا ایک ریزولیشن ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:۔

''یہ اسمبلی سرکار سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ڈسٹرکٹ بورڈوں تھا میونسپل بورڈوں کو اَدیش کرے کہ وہ لوئر پرائمری تھا پرائمری میں اب سے بجائے پرش ادھیا پکوں کے استری (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ادھیاپکائیں نیوکت کریں، پرنتو یدی دنمان سے میں ضرورت کے مطابق استی ادھیاپکائن نہ ملیں تو عارضی طور سے پُرش ادھیا پک رکھ لیے جائیں، لیکن جیسے ہی یوگیہ ادھیا پک ملیں فوراً عارضی ادھیا پکوں کو ہٹا کر استری ادھیاپکائیں مقرر کی جائیں۔"

ڈاکٹر تارا چند سابق سکریٹری ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ہندی کے مشہور ادیب ہیں۔ سہ ماہی رسالہ 'ہندوستانی' (ہندی ایڈیشن) بابت جولائی ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے نام سمبندھی غلط فہمیاں (نام کے متعلق غلط فہمیاں)۔ اس کے چند فقرے یہ ہیں:-

"پرشن کے پکش بپکش میں بچار کرنے اور دونوں ورودھی دلوں کے پرتھک پرتھک درشٹی کون سمجھنے کے
مسئلہ دونوں رُخ غور مخالف گروہوں الگ الگ زاویۂ نگاہ

پہلے مجھے یہ آوشیک معلوم ہوتا ہے کہ جن ناموں کا ہم پریوگ کریں ان کی ٹھیک ٹھیک پریبھاشا دے دیں
ضروری استعمال تعریف

کیونکہ اس سمبندھ میں بہت کچھ غلط فہمی اس کارن ہوتی ہے کہ ان ناموں کے ارتھ کے بارے میں لوگوں
تعلق سبب مفہوم

کو بھرم ہے۔ اس وشے میں بہت سے ناموں کا پریوگ ہوا ہے جن میں سے کچھ یہ ہیں:- بھاشا، ہندوی،
دھوکا بارے استعمال

ہندوستانی، زبان ہندوستان، دہلوی، کھڑی بولی، مدھیادیس کی بولی، ریختہ، زبان، اردوئے معلیٰ، اُردو،
صوبجات متحدہ

ان سب ناموں میں ہندی، ہندوستانی اور اُردو کا پریوگ ادھک ہوتا ہے، اور واستب میں وادوواد بھی اب
استعمال بہت حقیقت مباحثہ

ان تینوں ناموں کے پریوگ کے ہی سمبندھ میں ہے۔"
استعمال تعلق

یہ ہندی کے مختلف اسالیب بیان کی مثالیں تحریر و تقریر کی پیش کی گئی ہیں۔ بہر حال ہندی لٹریچر نے ان سوا سو برس میں نہایت کثرت و وسعت پیدا کر لی ہے۔ تمام علوم و ادبیات میں اعلیٰ پایہ کی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(مسلسل از صفحہ ۱۶۱) سے پہلے اس سے زیادہ صاف کھڑی بولی اور عام فہم شمالی ہند کی بھاشامیں کوئی نثر ہندی کی کتاب موجودنہیں ہے۔

پریم ساگر کے علاوہ للّو لال نے 'راج نیتی' ہندی میں لکھی۔اس میں کہانیوں کے ذریعہ سے اخلاق و حکومت کے آداب بتائے ہیں۔ایک مجموعہ ہندوستانی لطیفوں کا 'لطائف ہندی' کے نام سے لکھا۔ایک منظوم فسانہ 'مہادیو بلاس' مرتب کیا۔'سبھا بلاس' کے نام سے ہندی کی دلچسپ نظموں کا انتخاب تیار کیا۔

یہ سب ہندی کی کتابیں ہیں۔لیکن ایک کتاب 'سنگاسن بتیسی' للّو لال نے اُردو میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تصانیف ہوئی ہیں اور ہورہی ہیں۔اخبارات و رسائل، مطابع و ادارت ہندی زبان و ادب کی وسعت واشاعت میں بہتر سے بہتر کوشش کررہے ہیں۔

ہندی شاعری کی تاریخ نثر کی تاریخ سے زیادہ دلچسپ ہے، اور زیادہ قدیم بھی، اس لیے کہ برج بھاشا اصل میں شاعری ہی کی زبان ہے، اور اس زبان کا آغاز ہی شاعری کے ساتھ ہے۔نثر ہندی کی تصنیف چودھویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں ملتی، لیکن نظم ہندی کا وجود بارھویں صدی سے بھی پہلے پایا جاتا ہے۔نثر ہندی میں کوئی عجیب خصوصیت نثر اُردو کے مقابلے میں نہیں ہے، لیکن نظم ہندی دنیا بھر کی شاعری سے نرالی ادا رکھتی ہے۔اور ایسی انفرادی حیثیت کی مالک ہے جس میں کوئی ملک اور کوئی زبان اور کوئی شاعری شریک نہیں۔ہندی شاعری کے مختلف موضوعات واجزاء وعناصر پر اُردو میں بھی بعض کتابیں لکھی گئی ہیں۔غالباً سب سے پہلے جناب نیازؔ فتح پوری نے 'جذبات بھاشا' کے نام سے نہایت دلچسپ کتاب لکھی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے اپنے رسالہ 'نگار' لکھنؤ کی ایک اشاعت (جنوری ۱۹۳۶ء) ہندی شاعری کے لیے مخصوص کردی تھی۔اس میں نیازؔ صاحب نے ایک انگریز مصنف مسٹر ایف ای کی 'تاریخ ادب ہندی' کا ترجمہ شائع کردیا ہے۔لیکن اصل کتاب اور ترجمہ دونوں میں نمونے نہیں ہیں، نمونے اسی رسالے کے دوسرے مضامین میں موجود ہیں۔ڈاکٹر اعظم کریوی وغیرہ نے بھی ہندی شاعری پر کتابیں لکھی ہیں۔

اس حاشیہ میں زبان ہندی کی تقسیمیں اور بعض معلومات اسی انگریز مصنف کی تاریخ سے ماخوذ ہیں۔

نمونے اس کتاب میں نثر کے بھی نہیں ہیں۔

بھی لکھی ہے۔ اس میں ہندی کے الفاظ بھی بکثرت ہیں عربی فارسی کے الفاظ بھی ہیں اور طرز ادا، اور اسلوب بیان بھی اُردو کے مطابق ہے۔ یہ کتاب اُردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں شائع ہوئی، بار بار چھپی اور مقبول ہوئی۔ نمونہ یہ ہے:-

"برہمن کہنے لگا جب ثلا لگن آوے جو اس میں مندر اٹھاوے، جب تک وہ لگن رہے تب تک کام اس میں جاری رکھے، اور جب ثلا لگن ہو چکے تب اس کا کام موتوف کر دے، اس طرح ثلا لگن میں ہی وہ سارا مکان تیاری پر لاوے۔ اس کا اٹوٹ بھنڈارہ ہو۔ اور کچھی اس کے یہاں سے کبھی نہ جاوے۔ یہ بات سن کر راجہ من میں خوش ہوا، دیوان کو بُلایا اور مندر اٹھانے کی اجازت دی کہ تم اچھی جگہ ڈھونڈھ کر محل بناؤ۔ اتنے میں ثلا لگن بھی آن پہونچی۔ اس مندر کی نیو دی۔ دیس بدیس میں یہ آوا ہوئی کہ راجہ ثلا لگن میں محل بنواتا ہے۔ جتنے کاریگر اس میں کام کرتے تھے، وے اُٹھ کر ثلا لگن میں بناتے تھے۔ کہیں کام اس میں سونے کا اور کہیں روپے کا اور کہیں لوہے کا اور کہیں کاٹھ کا نئی نئی طرح سے بنتا تھا۔"

ان تصنیفات کے علاوہ للّو لال نے مظہر علی ولا کو 'بے تال پچیسی' ترجمہ کرنے میں مدد دی۔

فورٹ ولیم کالج میں مذکورہ بالا منشیوں اور مصنفوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ملازم و متوسل تھے، لیکن ان کے ادبی کارنامے نہ زیادہ ہیں، نہ اعلیٰ، نہ مشہور، اس لیے یہ اہلِ قلم شہرت نہ پا سکے۔ مثلاً حمید الدین بہاری نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمائش سے کھانے اور مٹھائیاں تیار کرنے کی ترکیبیں لکھیں اور اس کتاب کا نام 'اخوان الوان' رکھا۔ مرزا محمد فطرت نے 'انجیل' کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا۔ محی الدین فیض نے 'پند نامہ عطار' کا منظوم ترجمہ کیا۔ ان میں سے ایک مصنف البتہ امتیاز کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں:-

مرزا جان طپش: ان کا نام مرزا محمد اسمٰعیل ہے۔ مرزا جان کے نام سے مشہور ہیں۔ دہلی میں ۱۷۶۸ء (۱۱۸۲ھ) میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ لڑکپن سے شاعری کا شوق ہوا۔ خواجہ میر درد دہلوی کے شاگرد تھے۔ ۱۷۸۴ء (۱۱۹۸ھ) میں دہلی سے لکھنؤ آئے۔ وہاں سے بنگال چلے گئے اور ڈھاکہ میں نواب شمس الدولہ سیّد احمد علی خاں کے دربار میں توسّل اختیار کیا۔ نواب صاحب کے حکم سے اُردو محاورات کی لغت لکھی اور اس کا نام نواب صاحب کے خطاب کی مناسبت سے "شمس

البیان فی مصطلحات ہندوستان' رکھا۔ یہ لغت ۱۷۹۳ء (۱۲۰۷ھ) میں مرتب ہوا ہے اور فورٹ ولیم کالج سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اس لیے فورٹ ولیم کالج سے باہر کے تصانیف میں اس کا ذکر موزوں تھا۔ لیکن چونکہ مرزا جان طپش بعد کو کالج میں چلے گئے تھے، اور وہاں اگرچہ خود کوئی تصنیف نہیں کی، تاہم دوسروں کو مدد دی، اس لیے کالج ہی کے سلسلے میں اس لغت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ایک مرتبہ مُرشد آباد سے ۱۸۴۹ء (۱۲۶۵ھ) میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں اُردو محاوروں کے معنی فارسی زبان میں لکھے ہیں، لیکن ان کی مثالیں شعرائے اُردو کے کلام سے درج کی ہیں۔ اس زمانے کی تصانیف کی اکثر یہی روش ہے کہ اُردو زبان کے متعلق کتابیں بھی فارسی زبان میں لکھتے تھے۔ جیسے انشاء اللہ خاں کی 'دریائے لطافت' کہ اس کا موضوع اُردو زبان کے قواعد و متعلقات شعر و ادب ہیں لیکن فارسی عبارت میں تصنیف کی گئی ہے۔ (اس کا ذکر آئندہ آتا ہے)۔ شمس البیان کا نمونہ یہ ہے:-

'انگاروں پر لوٹنا': کنایہ از بے قراری کہ در عالم رشک لاحق گردد۔ ولی دکنی گوید ؎

شعلہ خو جب سے نظر نہیں آتا　　تب سے انگاروں پہ لوٹے ہے ولی

'رفو چکر میں آنا': حیراں ماندن بہ مشاہدہ۔ امر عجیب وعوام (۱) بازاری استعمال کنند، سراج الدین سراج دکنی گوید ؎

رفو گر کو کہاں طاقت کہ زخم عشق کو ٹانکے　　اگر دیکھے مرا سینہ رفو چکر میں آجاوے

---

(۱) اس محاورہ (رفو چکر میں آنا) کو عام بازاری کا محاورہ اس لیے کہا گیا ہے کہ 'رفو چکر ہونا' اور 'چکر میں آنا' دو الگ الگ محاورے ہیں۔ مثلاً:-

جس طرف دیکھتی تھی بھر کے نظر　　ہوش ہوجاتے تھے رفو چکر

قیامت تک یہی گردش رہے گی رات دن ان کو　　مہ و خورشید حسن یار سے آئے ہیں چکر میں

جاہل آدمیوں نے دوسرے محاورے میں 'رفو' کا لفظ بھی ملا لیا، اور حیران ہونے کے لیے رفو چکر میں آنا بولنے لگے۔ لیکن پرانے زمانے کے لوگ بولتے ہوں گے۔ اب سننے میں نہیں آتا۔

فورٹ ولیم کالج میں رہ کر طپش نے ایک مثنوی میر حسن کی تقلید میں لکھی اور 'بہار دانش' نام رکھا، اپنا دیوان بھی مرتب کیا اور کالج نے اس کو خرید کر شائع کیا۔

فورٹ ولیم کالج کی خدمات پر مختصر تبصرہ

(۱) فورٹ ولیم کالج کے قائم ہونے سے پہلے اور جاری رہنے کے زمانے میں کالج و کلکتہ سے باہر بھی اُردو تصانیف نثر کا سلسلہ جاری تھا، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا اور آیندہ لکھا جائے گا، لیکن کوئی باقاعدہ اور متحدہ کوشش نہ تھی، بلکہ متفرق طور پر لوگ کچھ کچھ لکھ رہے تھے۔ کالج کے منتظموں نے سلیس نثر نگاری کا مقصد متعین کر کے کام شروع کیا۔ یہ گویا پہلا علمی و ادبی ادارہ یا ندوہ تھا۔

(۲) اُردو ٹائپ کا پہلا مطبع اسی کالج کی طرف سے قائم کیا گیا، اور بعض کتابیں خاص حسن و خوبی کے ساتھ شائع کی گئیں۔

(۳) کالج کی یہ خدمات کم و بیش بیس برس جاری رہیں۔ اس عرصہ میں اٹھارہ مصنفوں نے پچاس کتابیں اُردو میں تصنیف، تالیف اور ترجمہ کیں۔ اس زمانے میں (۱۸۰۱ء سے ۱۸۲۰ء تک) فورٹ ولیم کالج سے باہر تمام ہندوستان میں اتنی کتابیں نثر اُردو کی مشکل سے لکھی گئی ہوں گی۔ اور جتنی لکھی گئیں ان میں سے اکثر کو آج تک چھپنا نصیب نہیں ہوا۔

(۴) بیرون کالج کی کوئی تصنیف زبان و محاورہ کی سلاست اور اسلوب بیان کی دلکشی میں میر امّن، حیدری، اکرام علی وغیرہ کی کتابوں سے بہتر اور 'داستان امیر حمزہ' و 'اخوان الصفا' سے زیادہ ضخیم نہیں ہے۔

(۵) کالج کی تالیفات میں مختلف ضروری، مفید اور دلچسپ موضوع کتابیں شامل ہیں، یعنی فسانہ، تذکرہ، صرف و نحو، تاریخ، اخلاق، فقہ اسلام، ترجمہ قرآن مجید، ترجمہ انجیل مقدّس۔

(۶) سب سے بڑی خدمت اس کالج کی یہ ہے کہ سلیس نثر نگاری کی شاہراہ قائم

کردی۔ اگر یہ محکمہ جاری نہ ہوتا تو بھی اربابِ علم وادب اس رستے پر آتے لیکن دیر لگتی۔ ان کتابوں کا نمونہ موجود ہونے پر بھی لوگوں نے اس کی طرف کم توجہ کی اور بہت آہستہ آہستہ اس راہ پر آئے۔

---

(۲) مصنّفین بیرون کالج

۱۸۰۱ء (۱۲۱۵ھ) تا ۱۸۳۰ء (۱۲۴۵ھ)

اسی زمانے میں جب کہ فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف کا محکمہ جاری تھا، ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی اصحابِ علم وادب انفرادی طور پر نثر اُردو کی کتابیں لکھنے میں مصروف تھے۔ دکن کے اسی عہد کے بعض مصنّفین نثر (شرف الدولہ، بدر الدولہ وغیرہ) کا ذکر "دکن میں عہد مغلیہ کے بعد کے دور" میں آچکا ہے، دہلی، لکھنؤ، آگرہ وغیرہ مقامات میں بھی اربابِ قلم رفتار اُردو کی ترقی میں سعیِ پیہم کر رہے تھے۔ لیکن کالج سے باہر کے مصنفوں کو مطبع واشاعت کی آسانیاں میسّر نہ تھیں۔ کالج میں دار الترجمہ کے ساتھ مطبع قائم ہو گیا، اور ۱۸۰۳ء سے کتابیں چھپنی شروع ہو گئیں، لیکن فورٹ ولیم کالج سے باہر ۱۸۳۷ء میں دہلی میں مطبع کھلا۔ اس کے بعد کتابوں کو طباعت واشاعت نصیب ہوئی۔ اس سبب سے دہلی، لکھنؤ وغیرہ میں قیام کالج سے پہلے، اور زمانہ کالج، بلکہ اس سے کچھ عرصہ بعد تک جو کتابیں لکھی گئیں وہ مشہور و عام نہ ہو سکیں۔ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ ترقی اُردو انیسویں صدی کے شروع میں بھی تنہا فورٹ ولیم کالج ہی کی احسان مند نہیں ہے، بلکہ بیرونِ کالج بھی اُردو کی رفتار کو تیز کرنے کی کوششیں جاری تھیں، چند نام اٹھارویں اور انیسویں صدی کے گنائے جاتے ہیں:-(۱)

---

(۱) یہ فہرست مفتی انتظام اللہ صاحب صدیقی اکبرآبادی کی تصنیف 'یوپی میں اُردو' سے ماخوذ ہے، اور ان میں سے چند مصنفوں کے حالات اور نمونے بھی جو آگے آتے ہیں۔

(۱) ہری ہر پرشاد سنبھلی مصنف بدائع الفنون (۱۷۳۳ء-۱۱۴۶ھ)

(۲) بندرابن متھراوی (متوفّی ۱۷۵۷ء-۱۱۷۰ھ) مصنف تذکرۂ معاصرین

(۳) محمد حسین کلیم دہلوی (۱۷۵۴ء-۱۱۶۷ھ میں زندہ تھے) مترجم فصوص الحکم

(۴) نادر علی شاہ قادری۔ مصنف رسالہ تصوّف (۱۷۷۶ء-۱۱۹۰ھ)

(۵) مولوی قدر عالم بن مولوی بدر عالم مصنف فقہ محفوظ خانی (۱۷۸۵ء-۱۱۹۹ھ)

(۶) حکیم محمد شریف خاں دہلوی (متوفّی ۱۸۰۷ء-۱۲۲۲ھ) مترجم قرآن مجید

(۷) محمد جعفر مصنف روح الایمان واسلام (۱۷۸۹ء-۱۲۰۳ھ)

(۸) مولوی کریم الدین دہلوی مترجم تاریخ ابی الفداء (۱۸۰۰ء-۱۲۱۵ھ)

(۹) مولوی حافظ احمد مصنف سراج ایمان (۱۸۰۰ء-۱۲۱۵ھ)

(۱۰) مولوی محمد صفا مصنف زادِ آخرت (۱۸۰۲ء-۱۲۱۷ھ)

(۱۱) مولوی حافظ محمد علی مصنف راہ نجات (۱۸۰۳ء-۱۲۱۸ھ)

(۱۲) مولوی محمد حیات مصنف سراج الحیات (۱۸۰۶ء-۱۲۲۱ھ)

(۱۳) مولوی عبد القادر مصنف گلشن دیں (۱۸۱۲ء-۱۲۲۷ھ)

(۱۴) مولوی محمد خالق اکبرآبادی مصنف مخزن القواعد (۱۸۱۳ء-۱۲۲۸ھ)

(۱۵) مولوی ولی محمد مصنف میخانۂ وحدت (۱۸۲۰ء-۱۲۳۶ھ)

(۱۶) مولوی قادر بخش پانی پتی مصنف مختصر التجوید (۱۸۲۶ء-۱۲۴۲ھ)

یہ سب فورٹ ولیم کالج سے پہلے اور ساتھ کے مصنّفین ہیں۔ان کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں اور ان سے زیادہ مشہور ہیں۔ان میں سے بعض متقدمین کے حالات اور نمونۂ تصانیف درج کیے جاتے ہیں۔

محمد حسین کلیم دہلوی : شاعر و مصنف دونوں تھے۔میر حسن دہلوی (مصنف مثنوی سحر البیان) نے اپنے تذکرۂ شعراء میں کلیم کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے فصوص الحکم کا اُردو میں ترجمہ کیا۔میر حسن کے الفاظ یہ ہیں:-"در ہندی نثر کتابے ایجاد کردہ" اس "ایجاد کردہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کو اس سے پہلے کسی اُردو کتاب کا علم نہ تھا، اور

اس کا کچھ تعجب نہیں۔ دکن کی اُردو تصانیف کا شمالی ہند و دہلی میں پہنچنا اور مشہور ہونا قرینِ قیاس نہیں ہے۔ میر حسن اور محمد حسین کلیم ہم عصر تھے۔ میر حسن کا انتقال ۱۷۸۶ء ﴿۱۲۰۰ھ﴾ میں ہوا ہے اور کلیم ۱۷۵۴ء ﴿۱۱۶۷ھ﴾ میں زندہ تھے۔ جس سال احمد شاہ بن محمد شاہ بادشاہ دہلی کی آنکھیں نکلوائی گئیں۔ اس عہد کی صرف ایک کتاب فضلی کی 'کربل کتھا' ہے جو ۱۷۳۱ء ﴿۱۱۴۵ھ﴾ میں لکھی گئی اور ۱۷۴۷ء ﴿۱۱۶۰ھ﴾ میں مصنف نے اس پر نظرِ ثانی کی (جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے)۔ اس زمانہ میں کلیم و میر حسن دونوں زندہ تھے۔ اگر فضلی کی کتاب شمالی ہند یا دہلی کی ہو تو میر حسن کو اگرچہ اس کا علم ہونا لازم نہ تھا، لیکن ممکن و متوقع ضرور تھا۔ اس لیے کہ یہ 'کربل کتھا' یا 'دہ مجلس' مجالسِ عزا میں پڑھنے کے لیے لکھی گئی تھی، اور میر حسن شیعہ تھے۔ یہ قیاسات میر حسن کے فقرے کے لفظ ''ایجاد'' پر قائم کیے گئے ہیں۔ لیکن اگر میر حسن کی مراد (ایجاد کرد) سے (بوجود آورد) ہو، یعنی ''تصنیف کی''، تو بات صاف ہے، میر حسن نے کلیم کا صرف ایک فقرہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا ہونے کے متعلق نقل کیا ہے۔ یہی فقرہ تبرک کی طرح تمام مصنفین 'آبِ حیات' 'سیر المصنفین' 'دیو پی میں اُردو' وغیرہ میں دست بدست نقل ہوتا رہا ہے۔ ہم بھی اسی کا لہو لگا کر شہیدوں میں ملے جاتے ہیں۔ کلیم کا فقرہ یہ ہے:-

''کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر، آج کے دن بیٹھے ہیں اندھے ہو بصیر(۱)، ایسی دولت سے زنہار زنہار، فاعتبروا یا اولی الابصار۔''

کلیم کے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساری نثر میں ایسی ہی قافیہ پیمائی ہوگی جیسی اس زمانے کی 'کربل کتھا' اور 'نوطرزِ مرصع' میں ہے۔

---

(۱) یہ محاورہ کی بوالعجبی ہے کہ بصیر کے معنی دیکھنے والے کے ہیں لیکن پاس خاطر اور دلجوئی کے لیے اندھے کو بھی بصیر کہہ دیتے ہیں۔ گویا چشم ظاہر بند ہے تو کیا، دیدۂ باطن کھلا ہوا ہے۔ اسی غرض سے اندھے کو حافظ کہتے ہیں چاہے اس کو الحمد اور قل ھو اللہ بھی یاد نہ ہو۔ اسی طرح سقے کا بہشتی، حجام کو خلیفہ، خاکروب کو مہتر کہتے ہیں۔

حکیم شریف خاں دہلوی : حکیم محمد شریف خاں، مُلّا علی داؤد برادر مُلّا علی قاری کی اولاد سے تھے۔ اس لیے سلسلۂ نسب حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ حکیم صاحب کے اجداد میں سے ایک بزرگ بابر بادشاہ کے ہمراہ ہندوستان آئے، اور حیدر آباد میں قیام کیا۔ حکیم شریف خاں کے دادا حکیم محمد واصل خاں آگرہ آ کر سکونت پذیر ہوئے۔ پھر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ حکیم واصل خاں شاہ علم اللہ کے خلیفہ بھی تھے۔ ان کے بیٹے حکیم محمد اکمل خاں محمد شاہ بادشاہ دہلی (عہد سلطنت ۱۷۱۹ء ﴿۱۱۳۱ھ﴾ تا ۱۷۴۸ء ﴿۱۲۶۱ھ﴾) کے طبیب خاص ہوئے اور ''حاذق الملک'' خطاب پایا۔ ان کے بیٹے حکیم شریف خاں تھے جو ۱۷۲۴ء ﴿۱۱۳۷ھ﴾ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے تحصیل علوم کی، بڑے مشہور اور مستند عالم تھے، فنِ طب میں ''ثانی بو علی سینا'' کہے جاتے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ (۱۷۵۹ء ﴿۱۱۷۳ھ﴾ تا ۱۸۰۶ء ﴿۱۲۲۱ھ﴾) کے عہد میں شاہی طبیب تھے۔ ''اشرف الحکماء'' خطاب تھا۔ تصنیف و تالیف کا بھی شوق رکھتے تھے۔ ۱۷۷۹ء ﴿۱۱۹۳ھ﴾ میں حدیث شریف کی کتاب مشکوٰۃ کا فارسی ترجمہ 'کاشف المشکوٰۃ' کے نام سے کیا۔ 'حاشیہ نفیسی'، 'حاشیۂ شرح اسباب'، 'آثار نبوت'، 'شرح حمد اللہ' وغیرہ متعدد فارسی و عربی کی تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ ۱۸۰۷ء ﴿۱۲۲۲ھ﴾ میں انتقال کیا۔ رفتار اُردو کے سلسلے میں حکیم شریف خاں کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا اُردو ترجمہ ہے، جو حضرت شاہ عبد القادر دہلوی کے ترجمۂ اُردو سے تقریباً بیس سال پہلے کا ہے۔ لیکن آج تک قلمی اور گمنام ہے۔ حکیم محمد احمد خاں دہلوی مرحوم (متوفی ۱۹۳۷ء) کے پاس یہ پورا ترجمہ مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا۔ اس ترجمہ سے سورۂ فاتحہ کی صرف پہلی آیت کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:۔

> ''جو تعریف کہ اوّل سے آخر تک موجود ہے، لائق ہے واسطے اللہ کے کہ پالنے والا ہے تمام عالموں کا، بخشنے والا وجود کا آخرت میں۔''

یہ صرف اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن کا ترجمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب نے باوجود ترتیب لفظی کے تشریحی ترجمہ کیا ہے۔ لفظ اَلْحَمْدُ کا ترجمہ اور

مترجم ''سب تعریف'' یا ''تمام تعریفیں'' کرتے ہیں لیکن حکیم صاحب نے لکھا ہے:۔ جو تعریف کہ اوّل سے آخر تلک موجود ہے۔'' اسی طرح رَبِّ الْعَالَمِیْن کے ترجمے میں ''پالنے والا'' کے آگے ''بخشنے والا وجود کا آخرت میں'' بھی بڑھا دیا ہے۔ تاکہ رَبِّ کا مفہوم واضح ہو جائے یعنی اس عالم میں روح کی تکمیل تربیت کے بعد آخرت میں باقی مراتب روحانی کا طے کرانا بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں شامل ہے۔

اب زمانۂ فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اور بعد کے بعض مشہور مصنفوں کا ذکر لکھا جاتا ہے۔

سیّد انشاء اللہ خاں دہلوی : ان لوگوں میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا کارنامہ کثیر و ضخیم نہیں، لیکن نوعیت میں طرفہ و عجیب ہے۔ ان کے والد کا نام حکیم ماشاء اللہ خاں ہے۔ آبا و اجداد ایران سے کشمیر آئے، وہاں سے دہلی میں آ بسے۔ حکیم ماشاء اللہ خاں شاہی طبیب تھے، دہلی کی تباہی کے بعد مرشد آباد چلے گئے، وہیں انشاء اللہ خاں پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر تعلیم سے فارغ ہو کر دہلی آئے۔ شاہ عالم بادشاہ کے دربار کا وسیلہ پکڑا، لیکن کچھ عرصہ بعد لکھنؤ چلے گئے اور نواب سعادت علی خاں کے مصاحب ہو گئے۔ انشاء عالم، شاعر، زباندان، نکتہ سنج، لطیفہ گو، مسخرے، نقال بھی کچھ تھے۔ نواب کی ناک کا بال ہو گئے۔ لیکن کچھ زمانے کے بعد بگڑ گئی تو نواب نے آٹے کے بال کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ لکھنؤ میں ۱۸۱۷ء ﴿۱۲۳۲ھ﴾ میں انتقال کیا۔ (ان کے حالات 'آبِ حیات' میں پڑھنے کے قابل ہیں) ان کے کلیات میں غزلیات، قصائد، مثنویات، قطعات، رباعیات، ریختی، چیستاں، پہیلیاں سبھی کچھ ہے۔ ان کا ذکر موقع و محل پر آئے گا۔ نثر کی تصانیف کا انشاء کے گرد و پیش کوئی رواج نہ تھا۔ لیکن انھوں نے زبان اُردو اور نثر اُردو کی دو عجیب خدمتیں کی ہیں۔

(۱) رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی: یہ انشاء کی ذہانت کی عجیب و نادر کارستانی ہے۔ ایک داستان لکھی ہے جس میں عربی فارسی وغیرہ کسی ہندوستان سے باہر کی زبان کا کوئی لفظ نہیں آیا۔ کوئی چھوٹی سی حکایت نہیں، پچاس صفحوں کی مکمل داستان

ہے۔ قصہ بھی دلچسپ اور اندازِ بیان بھی دلکش۔ جا بجا رباعیاں ہیں، ان کو "چونکا" لکھا ہے، اشعار کو "دوہے" اور "کبت" لکھا ہے۔ بعض اشعار ہندی اسلوب میں لکھے ہیں، مثنوی کے طرز پر چھوٹی بحر میں جو شعر لکھے ہیں ان میں عجیب روانی اور لطافت ہے۔ انشاء بڑے زندہ دل اور شوخ مزاج تھے۔ اس کہانی کی ایجاد ہی ان کی شوخی طبیعت کی دلیل ہے، سارے قصہ میں یہی شوخی جلوہ گر ہے، شروع میں سبب تالیف بیان کرتے ہیں:۔

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی سے پُٹ نہ ملے، تب جا کے میرا جی پھول کی کلی کے روپ میں کھلے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ نہ ہو۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی پڑھے لکھے پُرانے دُھرانے بوڑھے گھاگ یہ کھڑاگ لائے، سر ہلا کر، منہ بنا کر، ناک بھوں چڑھا کر آنکھیں پھرا کر لگے کہنے، یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن بھی نہ ٹھوس جائے۔ جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں جوں کا توں وہی ڈول رہے، اور چھانہ کسی کی نہ پڑے، یہ نہیں ہونے کا۔ میں نے ان کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹھوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا، میں کچھ ایسا بڑ بولا نہیں، جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کے انگلیاں نچاؤں اور بے سُری بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی باتیں سجاؤں، جو مجھ سے نہ ہو سکتا تو بھلا یہ بات منہ سے کیوں نکالتا، جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔

اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ لوگ اسے پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے۔ دھنا ہاتھ منہ پھیر کر آپ کو جتاتا ہوں، جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا بجلی سے بھی بہت چنچل، اچھلاہٹ میں ہرنوں کے روپ میں ہے، اپنی چوکڑی بھول جائے۔

گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں	کرتب جو ہیں سو سب دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے جو چاہا تو ابھی	کہتا جو کچھ ہوں، کر دکھاتا ہوں میں

آگے کہانی کا ایک ٹکڑا یہ ہے:۔

ایک رات رانی کیتکی نے اپنی ماں کام لتا سے بُھلاوے میں ڈال کے یہ پوچھا، گرو جی گسائیں مہندر گر

نے جو بھبوت باپ کو دیا تھا وہ کہاں رکھا ہے اور اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی ماں نے کہا میں تیری واری تو کیوں پوچھتی ہے۔ رانی کیتکی کہنے لگی، آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے چاہتی ہوں، جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلوں اور چور بنوں تو کوئی مجھ کو نہ پکڑ سکے۔ رانی کام لتا نے کہا، وہ کھیلنے کے لئے نہیں ہے، ایسے لٹکے کسی بُرے دن کے سنبھال لینے کو ڈال رکھتے ہیں، کیا جانے کوئی گھڑی کیسی ہے، کیسی نہیں، رانی کیتکی اپنی ماں کی اس بات سے اپنا منہ تھتھا کے اٹھ گئی اور دن بھر بن کھائے پئے پڑی رہی۔ مہاراج نے جو بلایا تو کہا، مجھے رچ (۱) نہیں ہے تب رانی کام لتا بول اٹھیں، اجی کچھ تم نے سنا بھی بیٹی تمھاری آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے وہ بھبوت گرو جی کا دیا ہوا مانگتی تھی۔ میں نے نہ دیا اور کہا بیٹی یہ لڑکپن کی باتیں اچھی نہیں، کسی بُرے دن کے لئے گرو جی دے گئے ہیں، اسی پر مجھ سے روٹھی ہے۔ بتیرا بہلاتی پھسلاتی ہوں، مانتی نہیں۔ مہاراج نے کہا، بھبوت تو کیا، مجھے تو اپنا جی بھی اس سے پیارا نہیں، اس کی ایک گھڑی بھر کے بہل جانے پر ایک جی تو کیا لاکھ جی بھی ہوں تو دے ڈالیے، رانی کیتکی کو ڈبیا میں سے تھوڑا سا بھبوت دیا، کئی دن تلک آنکھ مچولی اپنے ماں باپ کے سامنے سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی، سب کو ہنساتی رہتی، جو سو سو تھال موتیوں کے نچھاور ہوا کیے، کیا کہوں، ایک چُہل تھی جو کہیے تو کروڑوں پوتھیوں میں جیوں کی تیوں نہ آسکے۔"

(۲) دریائے لطافت: یہ تصنیف اُردو زبان وقواعد ادب کے متعلق سیّد انشاء کا نہایت قابلِ قدر کارنامہ اور غیر فانی یادگار ہے۔ کتاب فارسی زبان میں لکھی ہے، لیکن مضمون وموضوع اُردو زبان ہے۔ اس کے دو حصّے ہیں۔ پہلا حصّہ اُردو کی قواعد ومحاورہ کے متعلق ہے اور انشاء کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا حصّہ منطق ومعانی وعروض پر ہے، اور محمد حسین قتیل کی تصنیف ہے۔ 'دریائے لطافت' ۱۸۰۷ء ﴿۱۲۲۲ھ﴾ میں مرتب ہوئی اور پہلی مرتبہ ۱۸۵۲ء ﴿۱۲۶۸ھ﴾ میں مطبع آفتاب عالم تاب مرشد آباد میں چھپی۔ اس کے بعد مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اُردو کی طرف سے مع اپنے عالمانہ مقدمہ کے ۱۹۱۶ء میں شائع کی۔ اس جدید اشاعت میں کچھ اختصار وترمیم بھی کی گئی ہے۔ انشاء نے جا بجا فحش کلمات

---

(۱) بھوک

بے تکلف استعمال کیے تھے ان کو خارج کر دیا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق اس کتاب کی خوبیاں بیان کرتے ہیں:۔ ''کتاب کی جان پہلا ہی حصّہ ہے۔ اگرچہ اس سے قبل بعض اہل یورپ نے متعدد کتابیں اُردو قواعد پر لکھی تھیں لیکن یہ پہلی کتاب ہے۔ جو ایک ہندی اہلِ زبان نے اُردو صرف ونحو پر لکھی ہے، اور حق یہ ہے کہ عجیب جامع اور بے مثل کتاب ہے۔ اُردو زبان کے قواعد، محاورات، اور روز مرّہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے بعد بھی کوئی کتاب اس پائے کی نہیں لکھی گئی۔ جو لوگ اُردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، یا اس کی صرف و نحو یا لغت پر کوئی محققانہ تالیف کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔''

سیّد انشاء نے الگ الگ باب باندھ کر حروف تہجی کی بحث، دہلی کے مختلف محلوں کی زبان کا فرق، بعض شعراء وفصحاء کا ذکر، دہلی ولکھنؤ کی فصاحت وفوقیت کا موازنہ، دہلی کی اصطلاحیں عورتوں کی خاص گفتگو اور اصطلاحات، صرف ونحو کے مجتہدانہ اصول بیان کیے ہیں۔ اور ہر جگہ عجیب ظرافت سے کام لیا ہے۔

'دریائے لطافت' کے تیسرے باب کے متعلق عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:۔'' اسی باب میں نواب عماد الملک، بھاڑا مل، مرزا صدر الدین صفاہانی اور مُلاّ عبد الفرقان کی دلچسپ تقریریں ہیں، خاص کر بی نورن اور میر غفر غینی کی تقریریں نہایت پر لطف ہیں۔ بی نورن اور میر غفر غینی کی تقریریں ایسی پاک صاف شستہ ہیں کہ آج کل کی بول چال بھی اس سے زیادہ فصیح نہیں ہو سکتی۔ اس سے سیّد انشاء کی زباندانی اور فصاحت کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ باوجود اس قدر زمانہ گزرنے کے، اور زبان کے منجھنے اور ترقی پانے کے جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں، اس میں کہیں حرف گیری کا موقع نہیں، بلکہ ویسی فصیح اور پاک صاف اُردو اب بھی ہر شخص نہیں لکھ سکتا۔ اور اس میں شعرائے عصر کے کلام پر جو تنقید کی ہے وہ ظریفانہ ہے، یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑا۔''

ہم اسی کا نمونہ ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

کلام بی نورن کسبی باشندۂ کوچہ بلاقی بیگم بامیر غفر غینی ویائی:

اجی آو میر صاحب تم تو عید کے چاند ہو گئے، دلی میں آتے تھے، دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے تھے۔ لکھنؤ میں تمھیں کیا ہوگا کہ تمھارا کہیں اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجو، کہیں آٹھوں (۱) میں بھی نہ چلو، تمھیں علیؑ کی قسم، آٹھوں میں مقرر چلیو۔

جواب از میر غفر غینی ویائی:۔(۲)

اجی بی نورن، یہ کیا بات فرماتی ہو، تم تو اپنے جیوڑے کی چین ہور پر کیا کہیں جب سے دلی چھوڑی ہے جی کچھ افسردہ ہو گیا ہے اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا کہ مجھ سے سُنیے، ریختے میں استاد میاں وَلی ہوئے، ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی، پھر میاں آبرو اور میاں ناجی اور میاں حاتم، پھر سب سے بہتر مرزا رفیع السوداؔ، اور میر تقی صاحب، پھر حضرت خواجہ میر دردؔ صاحب برّد اللہ مرقدہٗ جو میرے بھی استاد تھے، وہ لوگ تو سب مر گئے اور ان کی قدر دانی کرنے والے بھی جان بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ہیں ویسے ہی شاعر ہیں، اور دتی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے، تخم تاثیر صحبت کا اثر، سبحان اللہ! یہ کون میاں جرأت بڑے شاعر۔ پوچھو تو تمھارا خانماں کس دن شعر کہتا تھا؟ اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہے؟ اور دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں رکھتے، اگر پوچھئے کہ ضَرَبَ زَیْدٌ عُمْرًوا کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرتؔ کو دیکھو، اپنا عرق بادیان اور شربت اناریں چھوڑ کے شاعری میں آ کے قدم رکھا ہے، اور میر انشاء اللہ خاں بچارے میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے، آگے پریزاد تھے، ہم بھی گھورنے کو جاتے تھے، اب چند روز سے شاعر بن گئے ہیں، مرزا مظہر جان جاناں صاحب کے روز مرّہ کو نام رکھتے ہیں، اور سب سے زیادہ ایک اور سُنئے کہ سعادت یار، طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ آپ کو جانتا ہے، رنگینؔ تخلص ہے، ایک قصہ کہا ہے، اس مثنوی کا نام 'دلپذیر' رکھا ہے، رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے، میر حسن پر زہر کھایا ہے،

---

(۱) آٹھوں کا میلہ لکھنؤ کا مشہور تہوار ہے۔

(۲) میر غفر کو غینی ویائی اس لیے کہا ہے کہ میر صاحب 'لام' اور 'رے' کو اکثر 'غین' اور 'کسرتی' بولتے ہیں۔ انشاء نے ان کی ساری تقریر 'غین' اور 'ی' کے ساتھ لکھی ہے، جس کو مولانا عبدالحق نے دریائے لطافت کے حاشیہ میں درست کر کے لکھ دیا ہے۔ یہ بھی انشاء کی لاجواب ظرافت تھی۔

ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی، گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس شعر کو کیونکر کہیئے۔ سارے لکھنؤ والی کے رنڈی سے لے کر مرد تک پڑھتے ہیں۔

چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی   کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

سواس بچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے، کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلم، لیکن بچارا برچھی بھالے کا ہلانے والا، تیغ کا چلانے والا، تو ایسا قابل کہاں سے ہوا، اور کراہی پن (یا کلاہی پن) جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آ گیا ہے تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے، اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں، اور ان کے ساتھ اپنا منھ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے کہ

یہاں سے ہے کئے پیسے ڈولی کہارو (۱)

اور نچوڑی انگیا، اور نگوڑی انگیا، اور مروڑی انگیا، اور مرد ہو کے یوں کہے ع

کہیں ایسا نہ ہو کمبخت میں ماری جاؤں

اور ایک کتاب بنائی ہے اس میں رنڈیوں (۲) کی بولی لکھی ہے۔ اوپر والیاں، چیلیں، اوپر والا، چاند، اجلی دھوبن، اندر والا، دل، اور سہ گانا، دوگانا، یگانہ، زناخی، الاچی (بمعنی دوست)

مرزا قتیل: فرید آباد (دہلی) کے رہنے والے، قوم کے کھتری تھے۔ دیوالی سنگھ

---

(۱) ریختی شاعری کی ایک قسم نکالی گئی ہے جس میں عورت کی زبان سے بے حیائی کے عشقیہ جذبات و معاملات بیان کرتے ہیں، ریختی سعادت یار خاں رنگین کی ایجاد نہیں ہے جیسا انشا نے بیان کیا، بلکہ رنگین سے پہلے ہاشمی دکنی نے سب سے پہلے ریختی کہی ہے، رنگین کی اس غزل کا مطلع و مقطع یہ ہے:۔

جو ہونی تھی وہ بات ہولی کہارو   چلو لے چلو میری ڈولی کہارو
ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کرلو   یہاں سے ہے کتے پیسے ڈولی کہارو

(۲) رنڈی لکھنؤ میں عورت کے لئے بولا جاتا تھا۔ طوائف کے معنوں میں بعد کو استعمال ہوا ہے۔ اس زمانے میں طوائف کو کسبی کہتے تھے اور آج بھی کہتے ہیں۔

نام تھا۔ مسلمان ہو گئے۔ محمد حسن نام رکھا گیا۔ مرزا قتیلؔ کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۸۲۴ء ﴿۱۲۴۰ھ﴾ میں انتقال کیا۔ فارسی کے شاعر و ادیب تھے۔ مولوی غلام شہید آپ کے شاگرد ہیں۔ دربارِ اودھ کے متوسّل تھے۔ 'نہر الفصاحت'، 'چار شربت'، 'دیوان' وغیرہ فارسی کی تصنیفات ان سے یادگار ہیں۔ سیّد انشاؔ سے بڑا یارانہ تھا۔ قتیلؔ کا اُردو زبان کے متعلق یہی کارنامہ ہے کہ 'دریائے لطافت' انشا کی شرکت میں مرتب کی۔ اس کا دوسرا حصہ، جیسا کہ پہلے لکھا گیا، منطق، عروض، قافیہ، معانی، بیان کے متعلق قتیلؔ نے لکھا ہے۔ قتیلؔ نے بھی انشا کی طرح ظرافت سے کام لیا ہے، لیکن ان سے بڑھے نہیں۔ مثلاً فنِ عروض میں اوزانِ بحر کے مشہور الفاظ کی جگہ نئے الفاظ تراشے ہیں، جیسے:

مفعول مفاعیلن مفعول فاعیلن کی جگہ بی جان پری خانم بی جان پری خانم

فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن کی جگہ چت لگن پری خانم چت لگن پری خانم

منطق میں بھی ایک جدّت پیدا کی ہے۔ اپنے نزدیک تو اس میں ظرافت و شوخی کا پہلو نکالا ہے، لیکن وہ ایک علمی تجویز بھی ہے جو وضع اصطلاحات اور ترجمۂ علوم و فنون کے ماہرین کے لیے قابلِ غور ہے۔ یعنی منطق کی اصطلاحوں کے لیے اُردو کے الفاظ تلاش کیے ہیں مثلاً:-

تصوّر	دھیان	تصدیق	جوں کا توں
موضوع	بول	دَور	ہیر پھیر
محمول	بھرپور	مطابقت	ٹھیک ٹھیک
نسبت	ملاپ	التزامی	اوپری لگاوَ
قضیہ	بات	مثلّث	تکڑا
تسلسل	اُلجھا سوت	مربّع	چوکڑا

مرزا قتیلؔ نے علم بیان و بدیع کا حصہ بھی خوب لکھا ہے۔ یہ علوم اُردو میں غالباً سب سے پہلے اسی کتاب میں مرزا قتیلؔ کے قلم سے مرتب ہوئے ہیں۔ امام بخش صہبائیؔ کا 'ترجمۂ حدائق البلاغت' اس سے بعد کا ہے۔ قتیلؔ نے تمام صنائع لفظی و معنوی کی مثالیں

اپنی طبع زاد نظم یا نثر میں لکھی ہیں۔ مشہور و معروف صنعتوں کے علاوہ اور نئی نئی کاریگریاں نکالی ہیں۔ تعریف و تشریح فارسی زبان میں ہے اور مثالیں اُردو میں لکھی ہیں۔ تحریر کا انداز یہ ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:-

سوائے ضلع مناسبت درمیان دو چیز مخالف یک دیگر بہ یک لفظ بیاں کنندہ آں را 'نسبت' نام نہند، مثلاً اگر کسے پرسد کہ گوٹے اور آتش بازی میں کیا نسبت ہے؟ باید گفت کہ ''چرخی'' یا پرسد کہ بندوق اور مہاجن اور فرنگی میں کیا نسبت؟ باید گفت کہ ''کوٹھی'' یا ایں کے شمشیر و پلٹن باہم چہ نسبت دارند؟ باید گفت ''باڑھ'' یا میانہ چو پڑو دو پٹہ چہ نسبت است؟ باید گفت کہ ''گوٹ''۔

ضلع کی مثال میں دریا کے مناسب چیزیں بیان کرنے کے لیے دو صفحہ میں اُردو کی عبارتیں لکھی ہیں۔ جن میں پانی کے اقسام، دریاؤں کے نام، دریائی جانور، کشتی اور تیراکی کے الفاظ ضلع یا ایہام کے طور پر استعمال کیے ہیں۔ شروع کے فقرے یہ ہیں:-

''آپ کا 'بجرہ' آج کچھ کھل گیا ہے، واللہ تمھاری بات 'پانی' بہت مشکل ہے، ہمیں کل 'سوتا' چھوڑ گیے، ہر چند ضعف 'نالی' کی تو بھی رتھ میں جگہ 'ندی'، ایک 'باؤلی' رنڈی کے کہنے سے ہماری 'چاہ' دل سے اُٹھا دی۔''

ایک عبارت مرتب کی ہے جس میں حرف 'نون' کہیں نہیں آنے دیا۔ لکھتے ہیں:-

''جس کا جی چاہے پاس آئے، گھر ہے اس کا، اور جو کوئی آتا آتا یکبارگی رہ جائے تو ہم کو کیا غرض۔ اگر یہ چاہے کہ ہم سا بے لیاقت بھی کبھی کبھی آیا کرے تو یہ بات بہت مشکل ہے، اس واسطے کہ عاصی پُر از معاصی ایسا عہد کر بیٹھا ہے کہ اس گوشے ہی کے بیچ اسی طرح جما رہے کہ اگر ہزار بار دورۂ کامل فلک ہشتم کا کہ جس کو خلق خدا کی کرسی کہتی ہے سر پر گذر جائے تو بھی اس جگہ سے اُٹھ کر جو بہت جائے تو اس دوسرے حجرے تک جاوے سو بھی دیکھا چاہیے، یہ بھی اس وقت کا ایک زٹل قافیہ ہے۔''

ایک عبارت موصل دو حرفی کی صنعت میں لکھی ہے، یعنی دو دو حرف ملے ہوئے ہیں، نہ کوئی حرف الگ ہے، نہ دو سے زیادہ ملے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

''چوٹی کو کا جی کی لڑکی کی گویا کالی ناگن ہے، پر جب جی چاہے تب کاٹے ہے، جو جو خوبی حق نے کوکا صاحب کی لڑکی کو دی ہے، شاید نوشابہ کو دی ہو تو دی ہو۔''

اس عبارت کے ضمن میں اس زمانے کی سوسائٹی کے اخلاق بھی قابلِ ذکر وتوجہ ہیں۔ انشا، قتیل اور رنگین تینوں گہرے اور بے تکلف دوست ہیں، تینوں کو کسبی عورتوں سے بڑی دلچسپی ہے۔ انشا کی زبانی بی نورن کا ذکر بیان کیا جا چکا ہے۔ انشا نے رنگین کی بھی اس دلچسپی کا ذکر کیا ہے، قتیل نے ان دونوں سے کم اپنی دلچسپی و وابستگی کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے حصہ تالیف میں جتنی مثالیں دی ہیں، اکثر میں رنڈیوں اور کسبیوں کا ذکر ہے۔ صنعت توشیح میں انہی عورتوں کے نام نکالے ہیں۔ معمے انہی کے نام کے بنائے ہیں۔ اشعار اور عبارتوں میں انہی کا ذکر ہے، اور اوزانِ بحر میں انہی کے نام رکھے ہیں۔ شاید اس زمانے کے لکھنؤ کی رنڈیوں اور کنچنیوں کے نام لکھ دئے ہیں۔ اس عہد کے لکھنؤ پر عیش وعشرت کے بادل چھائے ہوئے تھے، تاہم یہ بات قابلِ داد ہے کہ وہ بزرگ بے باکی یا بے تکلفی یا صاف دلی کے ساتھ کہہ دیتے ہیں ممکن ہے، بلکہ یقین ہے کہ اس زمانے میں یہ ذکر اذکار سب کرتے تھے، حال وکردار سب کے ایسے نہ تھے، لیکن ہمارے زمانے میں حال وہی ہے قال وہ نہیں۔

'دریائے لطافت' کے علاوہ مرزا قتیل کی اُردو نثر کی تحریر مرزا کے مجموعہ 'مکتوبات' میں بھی پائی جاتی ہے۔ مرزا کے شاگرد خواجہ امداد الدین نے ان کے خطوط جمع کر کے ۱۸۱۷ء ﴿۱۲۳۲ھ﴾ میں 'معدن الفوائد' کے نام سے شائع کیے تھے۔ اس میں مرزا قتیل نے حمد ونعت عربی، ترکی، فارسی، اُردو میں لکھی ہے۔ اُردو کا نمونہ یہ ہے:-

"بہت بندگی اور بہت غلامی کے لائق وہ جناب ہے کہ اس کو خدائے برتر نے اپنا پیغمبرؐ کیا اور تمام فاضلوں اور عالموں اور آدمیوں کو اس کی اُمت کیا، سبحان اللہ اس بزرگ درگاہ کا دیکھنے والا ہوں کہ میری ہدایت کی راہ کا دکھلانے والا ہے، اور سعادت کی منزل کا خضر ہے۔"

اس عبارت کے اسلوب پر فارسی کا اثر ہے، 'دریائے لطافت' کے اقتباسات سلیس وفصیح روز مرّہ میں ہیں۔ بہر حال مرزا قتیل بھی ترقی اُردو کے کار پردازوں میں شامل ہیں۔

مولوی اسمٰعیل دہلوی: شاہ عبدالغنی صاحب کے بیٹے اور حضرت شاہ ولی اللہ

صاحب دہلوی کے پوتے تھے۔۱۷۹۶ء﴿۱۲۱۰ھ﴾ میں پیدا ہوئے۔والد کا انتقال ان کے بچپن میں ہو گیا تھا ان کے چچا شاہ عبدالعزیز صاحب نے تربیت کی، آغازِ جوانی میں علوم معقول ومنقول کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ جوان ہو کر مولوی سیّد احمد بریلوی کے مرید ہو گئے جو ہندوستان میں فرقہ وہابیہ کے بانی ہوئے ہیں۔مولوی سیّد احمد ۱۷۸۳ء ﴿۱۱۹۷ھ﴾ میں پیدا ہوئے تھے۔شاہ عبدالعزیز اورشاہ عبدالقادر سے تعلیم پائی تھی۔لیکن بعد کو وہابیت کی طرف مائل ہو گئے تھے۔نہایت خوش بیان مقرر تھے۔اس لیے لوگ کثرت سے ان کے معتقد و مرید ہو جاتے تھے۔ ہندوستان میں اپنے عقائد کی اشاعت کرنے کے بعد ۱۸۲۲ء﴿۱۲۳۷ھ﴾ میں حج کو گئے، مکّہ معظمہ سے قسطنطنیہ گئے، چھ سال تک ترکی و ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کر کے اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے رہے پھر دہلی واپس آکر پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اشاعت عقائد شروع کر دی۔اور آخر انتہائے جوش میں سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔۱۸۲۸ء﴿۱۲۴۳ھ﴾ میں مولوی اسمٰعیل کو ساتھ لے کر عظیم الشان لشکر کی قیادت کرتے ہوئے سکھوں سے جنگ کرنے کے لیے پشاور کو روانہ ہو گئے۔ان کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہو گئی تھی۔بڑے بڑے مشاہیر ملک اور اہلِ دولت ان کے معاون و مددگار تھے۔۱۸۲۹ء میں انھوں نے پشاور پر قبضہ کر لیا، لیکن ان کے عقائد و اصول کی سخت گیری سے تنگ آکر سرحدی افغانوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔اور یہ پشاور چھوڑ کر دریائے اٹک کے پار پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔آخر ۱۸۳۱ء﴿۱۲۴۶ھ﴾ میں قلعہ بالاکوٹ کے قریب سکھوں سے جنگ کرتے ہوئے مولوی سیّد احمد و مولوی اسمٰعیل دونوں نے اثنائے سفر پنجاب میں سفر آخرت اختیار کیا اور شہید مشہور ہوئے۔

جب اس شکست کی خبر دہلی پہنچی تو مشہور شاعر شاہ نصیرؔ نے ظرافت و تمسخر کے انداز میں ایک طویل قصیدہ کہا، اس کے دو شعر یہ ہیں:-

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سیپارہ ۔۔۔ نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نص قرآنی
ہرن کی طرح میدانِ وغا میں چوکڑی بھولے ۔۔۔ اگرچہ تھے دُمِ شملہ سے وہ شیر نیستانی

یہ قصیدہ دہلی میں مشہور ہوا تو اُن کے مرید پیر کی یہ توقیر سن کر برافروختہ ہوگئے، اور کثیر تعداد میں شاہ نصیرؔ کے مکان پر چڑھ آئے۔ قریب تھا کہ شاہ صاحب دشمنوں کی زد میں آجائیں، لیکن کوتوال شہر میرزا خانی کو اطلاع مل گئی، وہ موقع پر پہنچ گئے اور شاہ نصیرؔ کی جان بچالی۔ شاہ صاحب نے قصیدہ میں شکریہ کا اضافہ کیا اور یہ شعر بھی کہا:-

نہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی نصیر الدین بیچارہ تو رستہ طوس (۱) کا لیتا

مولوی سیّد احمد بریلوی نے اُردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ فارسی میں 'تنبیہ الغافلین' لکھی ہے جس کا اُردو میں ترجمہ مولوی عبداللہ نے ۱۸۳۰ء میں ہگلی (کلکتہ) سے شائع کیا تھا، مولوی اسمٰعیل دہلوی نے کئی کتابیں اپنے عقائد کے متعلق اُردو میں لکھیں، جن میں سے 'تقویت الایمان' بہت مشہور ہے۔ اُس زمانے میں مولوی سیّد احمد کے اور مریدوں نے بھی بہت سی کتابیں تبلیغ و اشاعت کی غرض سے لکھیں، مثلاً 'ترغیب جہاد'، 'ہدایۃ المومنین'، 'نصیحۃ المومنین' وغیرہ۔ یہ کتابیں بھی اُردو کی ترقی کے سلسلے میں شامل ہیں۔ مولوی اسمٰعیل کی 'تقویۃ الایمان' بہت صاف و سلیس زبان میں ہے۔ صرف کہیں کہیں ترتیب الفاظ اور اندازِ بیان میں قدامت ہے، نمونہ یہ ہے:-

"ہر خاص و عام کو چاہیے کہ اللہ و رسول ہی کے کلام کو تحقیق کریں اور اسی کو سمجھیں اور اسی پر چلیں، اور اسی کے موافق اپنے ایمان کو ٹھیک کریں۔ سو سننا چاہیے کہ ایمان دو جز ہیں۔ خدا کو خدا جاننا اور رسول کو رسول سمجھنا اور خدا کو خدا سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا شریک کسی کو نہ سمجھے، اور رسول کا رسول سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی راہ نہ پکڑے۔ اس پہلی بات کو توحید کہتے ہیں اور اس کے خلاف کو شرک، اور دوسری بات کو اتباع سنت کہتے ہیں اور اس کے خلاف کو بدعت۔ سو ہر کسی کو چاہیے کہ توحید اور اتباع سنت کو خوب پکڑے اور شرک و بدعت سے بہت بچے، کہ یہ دونوں چیزیں اصل ایمان میں خلل ڈالتی ہیں اور باقی گناہ ان سے پیچھے ہیں کہ وہ اعمال میں خلل ڈالتے ہیں۔"

---

(۱) طوس کے لفظ سے شاہ نصیرؔ نے اپنے ہمنام خواجہ نصیر الدین طوسی کی طرف اشارہ کیا ہے، ورنہ رستہ تو ملک عدم کا لیتے۔

تقویۃ الایمان کثرت سے شائع ہوئی۔ اس کے پہلے حصے کا انگریزی ترجمہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) کے رسالے میں شائع ہوا تھا۔

سیّد اعظم علی اکبر آبادی آگرہ کے رہنے والے، مولوی ببر علی کے بیٹے تھے۔ ان کے نانا آگرہ کے مشہور بے نظیر عالم و صاحبدل بزرگ مولوی ولی محمد (شارح مثنوی مولانا روم تھے) ان کے سایہ میں مولوی اعظم علی نے پرورش پائی تھی۔ تحصیل علوم کے بعد مین پوری مین محصّل لگان رہے۔ پھر آگرہ کالج میں فارسی کے مدرس ہو گئے۔ علمی مذاق رکھتے تھے، صاحب تصانیف ہیں۔ ۱۸۰۵ء ﴿۱۲۲۰ھ﴾ میں 'سکندر نامہ' کا ترجمہ کیا۔ ۱۸۲۴ء ﴿۱۲۴۰ھ﴾ میں 'فسانہ سرور افزا' اُردو میں لکھا۔ ۱۸۴۵ء ﴿۱۲۶۱ھ﴾ میں ایک فارسی مثنوی 'اکسیر اعظم' لکھی۔ یہ آخری تصنیف ہے۔ مرزا غالبؔ سے مولوی اعظم علی کے مراسم خط و کتابت تھے۔ غالبؔ کے پنج آہنگ میں مولوی صاحب کے نام بھی ایک فارسی کا رقعہ ہے۔ 'فسانہ سرور افزا' کا نمونہ یہ ہے، حمد باری تعالیٰ لکھتے ہیں:-

> ''احسان ایسے بادشاہ عادل اور شہنشاہ باذل کا کہ جس نے واسطے عبادت و معرفت اپنی ذات کے انسان ضعیف بنیان کے تئیں تہ خانہ ظلمات عدم سے نکال کر خلعت جواہر نگار حیات ابدی کا عنایت فرمایا مقدور کس بشر کا ہے کہ زبان بیان سے ادا کر سکے، اور شکر ایسے ہادی برحق و کریم مطلق کا کہ ایسے مشتے خاک سراسر ناپاک کے تئیں تمامی مخلوقات و موجودات سے ممتاز و سرفراز کر کے نور عقل و شمع ایمان سے منور کیا۔ طاقت کس کی ہے جو ایک حرف اس دفتر بے پایاں سے بیان کرے۔ ایسا خداوند حقیقی ہے کہ ہر ذی حیات کو بے رعایت سلسلہ طاعت و عبادت کے بشام و صباح وظیفہ خوار نعمتوں سے بے قیاس کا رکھتا ہے، اور عجب رزاق مطلق ہے کہ مور سے مار تلک کسی جاندار کو اپنے مائدہ فضل و نوال سے محروم و مایوس نہیں کرتا ہے۔''

یہ عبارت ترجمہ نہیں ہے، مصنف کی طبع زاد تحریر ہے، لیکن اسلوب ترجمہ کا سا معلوم ہوتا ہے، اس زمانے میں فارسی پڑھنے لکھنے کے سبب سے درسیات و ادبیات فارسی کا طرز بیان ذہن نشین ہوتا تھا، وہی انداز اپنی آزادانہ نگارش میں بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کو بدلنا اور سلاست و روانی پیدا کرنا اپنی اپنی افتاد طبیعت اور اقتضائے حال کے مطابق ہو سکتا

ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کا مقصد ہی سادہ و آسان اُردو لکھنا تھا۔ اس لیے اکثر کتابیں ایسی ہی لکھی گئیں، پھر بھی سب کا طرز ایک سا نہیں ہے۔ میر امّن اور حیدری نے ترجموں کو بھی اپنا کر لیا ہے، افسوس پورے کامیاب نہ ہو سکے، امانت اللہ بالکل ناکام رہے۔ لطف نے سلاست و سادگی کے جھگڑے میں ہی پڑنا پسند نہ کیا۔ اپنی وہی قدامت کی آن قائم رکھی۔ جب کالج کے متعین مقصد اور متحدہ کوشش کا یہ حال ہے تو کالج سے باہر تو کوئی پابندی تھی ہی نہیں۔ انشا اور قتیل ذہین، طباع، جدّت پسند تھے، بہتر سے بہتر اُردو لکھ گئے، اور لوگ اپنی اپنی روش پر چلتے رہے۔

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ : لکھنؤ کے سب سے پہلے مصنف نثر ہیں۔ مرزا اصغر علی بیگ کے بیٹے ہیں۔ غالباً ۱۷۸۷ء ﴿۱۲۰۲ھ﴾ میں پیدا ہوئے۔ (مرزا غالبؔ سے دس برس پہلے) فن خوش نویسی کے بڑے ماہر واستاد تھے۔ موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ عربی و فارسی کی تعلیم بھی کافی پائی تھی۔ شاعری میں آغا نوازش حسین کے شاگرد تھے۔ نہایت ظریف، زندہ دل، خوش رو، خوش خو آدمی تھے۔ نواب (۱) غازی الدین حیدر

---

(۱) مختصر تاریخ وزارت و شاہی اودھ شاہانِ اودھ کا مورث اعلیٰ خراسان کا تاجر محمد امین تھا جو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد سے تھا۔ اس کا باپ محمد نصیر، بہادر شاہ (بن اورنگ زیب عالمگیر) بادشاہ دہلی (۱۷۰۷ء ﴿۱۰۱۹ھ﴾ تا ۱۷۱۲ء ﴿۱۰۲۴ھ﴾) کے عہد سلطنت میں ہندوستان آیا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد محمد امین ہندوستان میں آیا اور نواب سربلند خاں صوبہ دار گجرات کے دربار میں ملازم ہوا۔ پھر صوبہ دار سے ناراض ہو کر دہلی آ گیا، اور فرخ سیر، بادشاہ دہلی (۱۷۱۳ء ﴿۱۱۲۵ھ﴾ تا ۱۷۱۹ء ﴿۱۱۳۱ھ﴾) اور محمد شاہ (۱۷۱۹ء ﴿۱۱۳۱ھ﴾ تا ۱۷۴۸ء ﴿۱۱۶۱ھ﴾) کے عہد میں ہندون و بیانہ کا فوجدار رہا، ایک موقع پر سادات بارہہ کے مقابلے میں محمد شاہ کی مدد کی۔ بادشاہ نے سعادت خاں بہادر کا خطاب دیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اس کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کر دیا اور برہان الملک کا خطاب عنایت کیا۔ جب ۱۷۳۹ء ﴿۱۱۵۱ھ﴾ میں نادر شاہ کابل و پشاور و پنجاب فتح کرتا ہوا حملۂ دہلی کے ارادے سے پانی پت تک آ گیا تو برہان الملک (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) سعادت خاں نے اودھ سے آ کر محمد شاہ کی مدد کی اور پانی پت پر بادشاہ کے ساتھ نادر شاہ سے جنگ کی۔ اتفاق سے برہان الملک اور نظام الملک آصف جاہ دونوں نادر شاہ کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے۔ نادر شاہ نے محمد شاہ کو بھی بارادۂ صلح اپنے خیمے میں بلا لیا اور جنگ ختم کر کے ان سب کو ساتھ لے کر نادر شاہ دہلی آ گیا، نظام الملک برہان الملک کا دشمن تھا اور اس کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ جس صبح کو نادر شاہ نے دہلی میں قتل عام کیا اس سے پہلی رات کو نظام الملک برہان الملک کے پاس آیا اور کہا کہ نادر شاہ کہتا ہے کہ اگر پچاس کرور روپیہ مجھے دے دو تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ ورنہ تمھاری جان کی خیر نہیں۔ اتنا روپیہ کہاں ہے۔ لیکن یہ دن آج میرے لیے ہے کل تمھارے لیے۔ اس بے آبروئی سے موت بہتر، اس لیے ہم تم دونوں زہر کے پیالے پی کر اپنا کام آپ تمام کر لیں برہان الملک سادہ دل آدمی تھا کہنے میں آ گیا۔ اور زہر پی کر جان دے دی، نظام الملک آرام سے اپنے گھر آ کر سو رہا۔ برہان الملک کے بعد محمد شاہ نے اس کے بھانجے صفدر جنگ کو اودھ کا صوبہ دار بنا دیا۔

(۲) منصور علی خاں صفدر جنگ: (۱۷۳۹ء/۱۱۵۱ھ تا ۱۷۵۴ء/۱۱۶۷ھ) اس عہد میں روہیلہ افغانوں نے اودھ پر حملہ کیا اور صفدر جنگ نے ان کو شکست دی۔ مقبرہ صفدر جنگ دہلی کی مشہور عمارت ہے جس کا روضہ تاج آگرہ کا نقشہ لیا گیا ہے۔ صفدر جنگ کا باپ جعفر خاں جس سے سعادت خاں کی بہن منسوب تھی سادات میں سے نہ تھا بلکہ آرمینیا کی مشہور ترکمان قوم قرا قوینلو سے تھا۔ صفدر خاں کی ماں سیدانی تھی۔

(۳) شجاع الدولہ: (۱۷۵۴ء/۱۱۶۷ھ تا ۱۷۷۵ء/۱۱۸۸ھ) صفدر جنگ کا بیٹا تھا۔ تاریخ ہندوستان کا بڑا نامور اور ہنگامہ پرور آدمی ہے۔ انگریزوں سے جنگ کی، شکست کھائی اور صلح کر لی۔ روہیلوں سے لڑا اور کامیابی پائی۔ اسی کے زمانے میں روہیلہ پٹھانوں کی ریاست رام پور کی بنیاد پڑی۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ پانی پت پر تیسری مشہور جنگ ہوئی (۱۷۶۱ء/۱۱۷۵ھ)۔

(۴) آصف الدولہ: (۱۷۷۵ء/۱۱۸۸ھ تا ۱۷۹۷ء/۱۲۱۲ھ) بن شجاع الدولہ، بڑے شان و شوکت کا نواب تھا۔ اس کا زمانہ نسبتاً پُر امن رہا۔ شجاع الدولہ تک نوابانِ اودھ کا مرکزِ حکومت فیض آباد رہا۔ آصف الدولہ نے لکھنؤ کو دار الحکومت بنایا۔ مقبرہ آصف الدولہ ہندوستان کی بے نظیر عمارتوں میں شامل ہے۔ سلطنت مغلیہ کی بربادی کے سبب سے دہلی کے شعرا و اہلِ کمال شجاع الدولہ و آصف الدولہ کے زمانے میں اودھ آئے۔ مرزا سودؔا، میر تقی میرؔ، میر حسنؔ، میر سوزؔ، انھی زمانوں میں لکھنؤ آئے۔ اور ان کے آنے سے لکھنؤ میں شعر و سخن کی رونق ہوئی۔ آصف الدولہ خود بھی شاعر تھا، اچھا کہتا تھا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) (۵) وزیر علی خاں: (۱۷۹۷ء ﴿۱۲۱۲ھ﴾ میں صرف چار مہینے حکومت کی)، آصف الدولہ کا فرزند اکبر تھا۔ لیکن اس کی بدکرداری کے سبب سے خود اس کی دادی، بہو بیگم والدۂ آصف الدولہ اور چند امرو و اعیان سلطنت مخالف ہو گئے، اور انگریزوں کی مدد سے معزول کرا دیا۔ رعایا وزیر علی خاں کی طرفدار تھی لیکن ان کی کچھ نہ چلی، فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں مقید رہا اور وہیں ۱۸۱۶ء ﴿۱۲۳۲ھ﴾ میں انتقال کیا۔

(۶) سعادت علی خاں: (۱۷۹۸ء ﴿۱۲۱۲ھ﴾ تا ۱۸۱۴ء ﴿۱۲۲۹ھ﴾) آصف الدولہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ بھائیوں میں نباہ نہ ہو سکتا تھا اس لیے سعادت علی خاں لکھنؤ سے باہر بریلی، آگرہ، ڈیگ (بھرتپور) وغیرہ میں اقامت گزیں رہا۔ لیکن انگریزوں سے برابر خط و کتابت کرتا رہا کہ آصف الدولہ کے بعد اسی کو حکومت دی جائے۔ جب وزیر علی خاں کو انگریزوں نے معزول کیا تو سعادت علی خاں سے یہ شرط کی کہ اگر تم نصف ملک ہمیں دے دو اور نصف پر اپنی حکومت رکھو تو تم کو حکمراں بنائے دیتے ہیں۔ سعادت علی خاں نے منظور کر لیا، اور معاہدہ پر دستخط کر دیے۔ اس طرح کوڑہ، کٹرہ، فرخ آباد، الٰہ آباد، بریلی وغیرہ بہت سا ملک ہاتھ سے نکل گیا اور ایک کرور ۳۵ لاکھ ۲۳ ہزار ۴ سو ۸۵ روپیہ کا نقصان ہو گیا۔ دوسری عجیب و غریب نادانی سعادت علی خاں نے یہ کی کہ ہندوستان پر اپنا سکہ جمانے کے لیے تمام ممالک محروسۂ انگریزی کا اس شرط کے ساتھ ٹھیکہ لینا چاہا کہ کرور ہا روپیہ زرِ پیشگی دینے کا وعدہ کیا۔ اس کام کے لیے ایک انگریز مسٹر اڈرلی کو لندن بھیج کر بادشاہ اور پارلیمنٹ کے سامنے ٹھیکہ کی درخواست پیش کر دی۔ اسی زمانے میں لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل ہو کر آ رہا تھا۔ اس معاملے کی سعی و سفارش کے لیے لارڈ کو ایک کرور روپیہ بھیج دیا۔ لارڈ ہندوستان آنے لگا تو اس نے سعادت علی خاں کو خط لکھا کہ میں آتے ہی تمھارا کام کر دوں گا۔ نواب اس خوشی میں ایسا پھولا کہ اپنے دربار میں اس کا ذکر کر دیا۔ یہ غلطی پر غلطی ہوئی۔ لکھنؤ کا ریزیڈنٹ کرنل بیلی پہلے ہی سے نواب کا دشمن تھا۔ اس نے بھی سُن لیا۔ اتفاق سے انھی دنوں میں نواب عارضۂ جگر و استسقا میں مبتلا ہوا۔ غسل صحت کے بعد سواری پر باہر گیا۔ رات کو آ کر یخنی مانگی، نواب کے سالے رمضان علی خاں نے زہر ملا کر یخنی پیش کر دی۔ پیتے ہی زہر سرایت کر گیا اور خاتمہ کر دیا۔ نواب سعادت علی خاں بڑا زندہ دل، شاعرانہ مزاج تھا۔ علم و فن اور شعر و ادب کا بڑا قدر دان تھا۔ سید انشاء اللہ خاں، مصحفی، مرزا قتیل، رائے گلاب رائے گلشن اسی دربار کے شعراء تھے۔

(۷) غازی الدین حیدر: (وزارت ۱۸۱۴ء ﴿۱۲۲۹ھ﴾ تا ۱۸۱۹ء ﴿۱۲۳۴ھ﴾۔ شاہی ۱۸۱۹ء ﴿۱۲۳۴ھ﴾ تا ۱۸۲۷ء ﴿۱۲۴۳ھ﴾) سعادت علی خاں کا فرزند اکبر تھا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) چند سال وزارت ونوابی کے بعد لارڈ ہیسٹنگز نے غازی الدین حیدر کو مستقل بادشاہ بنادیا اور سلطنت دہلی سے تعلق منقطع کردیا۔ یہ نواب بھی علم دوست تھا۔ اس کے زمانے میں لکھنؤ میں ٹائپ اور لیتھو کے مطبع قائم ہوئے۔ کتابیں تصنیف و طبع ہوئیں۔ رجب علی سرور، فقیر محمد خاں گویا، شیخ ناسخ، خواجہ آتش، خواجہ وزیر اسی زمانے میں تھے۔

(۸) نصیر الدین حیدر: (۱۸۲۷ء ﴿۱۲۴۳ھ﴾ تا ۱۸۳۷ء ﴿۱۲۵۳ھ﴾) اس کے زمانے میں شاہی خاندان میں بہت فتنہ و فساد رونما ہوا۔ اس بادشاہ کی محبوب ملکہ نواب قدسیہ بیگم تھی۔ کسی بات پر بادشاہ اس سے بدظن اور بددل ہوگیا۔ اس نے زہر کھالیا بادشاہ کو سخت صدمہ ہوا اور اس نے ماتمی سیاہ لباس پہننے کا تمام رعایا اور اہلِ خاندان کو حکم دیا۔ بادشاہ کی والدہ بادشاہ بیگم بہو سے ناراض تھی۔ اس نے ماتم کرنے سے انکار کیا۔ بادشاہ ماں سے ناراض ہوگیا۔ اور اس کو الماس باغ میں رہنے کا حکم دیا۔ بادشاہ کا فرزند اکبر مرزا فریدوں بخت عرف منا جان اپنی ماں کے مرنے کے بعد سے دادی کے پاس رہتا تھا وہ بھی بادشاہ بیگم کے ساتھ چلا گیا۔ بادشاہ نے لڑکے کو اپنے پاس رکھنا چاہا، بیگم نے نہ بھیجا۔ بادشاہ بیٹے سے بھی ناراض ہوگیا، اور اعلان کردیا کہ فریدوں بخت بادشاہ زادہ ہی نہیں ہے، اس طرح ماں بیٹے (بادشاہ بیگم اور نصیر الدین حیدر) کی رنجش و عناد کا بہت طول ہوگیا۔ آخر میں بادشاہ نے ماں کو راضی کرنا چاہا تو وزیر المما لک نے آتش فتنہ کو اور بھڑکا دیا اور کسی طرح صلح نہ ہونے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کو زہر دے دیا گیا۔ نصیر الدین حیدر نے بھی اہلِ کمال کی بہت قدر کی۔ جدید مطابع جاری ہوئے۔ بعض نادر کتابیں عربی و فارسی کی شائع ہوئیں۔

(۹) محمد علی شاہ: (۱۸۳۷ء ﴿۱۲۵۳ھ﴾ تا ۱۸۴۲ء ﴿۱۲۵۸ھ﴾) نصیر الدین حیدر کی وفات ناگاہ کی خبر پاتے ہی لکھنؤ کے انگریز ریزیڈنٹ جنرل لو نے نصیر الدین حیدر کے چچا نصیر الدولہ خلف نواب سعادت خاں کو تخت نشین کرنے کی تیاری شروع کردی۔ ابھی نصیر الدولہ ملبوس شاہی پہننے میں مشغول تھا کہ بادشاہ بیگم اپنے پوتے نصیر الدین حیدر کے لڑکے مرزا فریدوں بخت کو لے کر آگئی۔ اور اس کو تخت نشیں کرنا چاہا۔ دولت خانہ شاہی کا دروازہ ریزیڈنٹ کے حکم سے بند تھا۔ بادشاہ بیگم نے ہاتھیوں کے ذریعہ سے دروازہ توڑ ڈالا اور فریدوں بخت کو تخت پر بٹھا دیا اور نذریں لینا اور احکام شاہی جاری کرنا شروع کردیا۔ ریزیڈنٹ نے آکر بیگم کو سمجھایا کہ مداخلت کرنا بیگم کے لیے اچھا نہ ہوگا۔ لیکن اس نے نہ مانا۔ ریزیڈنٹ نے انگریزی فوج بلالی اور توپوں کے فیر کا حکم دے دیا۔ بادشاہ بیگم کے حامی کچھ کام آئے کچھ فرار ہوگئے۔ بادشاہ بیگم اور فریدوں بخت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) گرفتار ہو گئے اور نصیر الدولہ محمد علی شاہ کا لقب اختیار کر کے بادشاہ بن گیا۔ نیک دل اور مخیر تھا، لیکن اس کے عہد میں بعض کمینوں کو بہت عروج ہوا، لکھنؤ کی دوسری بے نظیر عمارت امام باڑہ حسین آباد اسی بادشاہ کی یادگار ہے۔ بادشاہ نے اس امام باڑہ کے مصارف کے لیے بارہ لاکھ روپیہ انگریزی خزانے میں جمع کر دیے تھے کہ ان کے سود سے مصارف کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ یہ نظام آج تک بدستور جاری ہے۔

(۱۰) امجد علی شاہ: (۱۸۴۲ء ﴿۱۲۵۸ھ﴾ تا ۱۸۴۷ء ﴿۱۲۶۳ھ﴾) یہ بڑا مذہبی بادشاہ تھا۔ امور مملکت و عدالت کا اختیار کلی مجتہد العصر کو سپرد کر دیا تھا۔ مجالس عزا اور مرثیہ خوانی کا انتظام پہلے سے زیادہ اس کے عہد میں ہوا۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے کمال کو اسی زمانے میں عروج ہوا۔

(۱۱) واجد علی شاہ: (۱۸۴۷ء ﴿۱۲۶۳ھ﴾ تا ۱۸۵۶ء ﴿۱۲۷۲ھ﴾) یہ بادشاہ عیش و عشرت کی طرف اس قدر راغب تھا کہ بعض کور نمک و پست فطرت لوگوں کو دخل اندازی کا موقع مل گیا اور نظام سلطنت بگڑنے لگا۔ انگریزی حکومت کی طرف سے چند بار متنبہ کیا گیا، کچھ توجہ نہ ہوئی، آخر غدر سے ایک سال پہلے ۱۸۵۶ء میں بادشاہ کو معزول کر کے اودھ کا حکومت انگریزی سے الحاق کر لیا۔ شاہی اودھ ختم ہو گئی۔ بادشاہ کو کلکتہ کے فورٹ ولیم میں نظر بند کر دیا۔

اسی سال بادشاہ نے الحاق اودھ اور واپسی سلطنت کی داد فریاد کے لیے ایک وفد انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کے پاس بھیجا۔ اس وفد میں جناب عالیہ ملکہ کشور اور مرزا ولی عہد اور مرزا اسکندر حشمت (مخاطب بہ جرنیل صاحب) اور مولوی مسیح الدین خاں کاکوروی خاص لوگ تھے اور بہت سے ان کے مصاحب و خادم تھے۔ یہ لوگ انگلستان پہنچے، ملکہ سے ملاقات کی، لیکن ساتھ کے کمینہ طبع لوگوں نے ارکان وفد میں اختلاف رائے پیدا کر دیا۔ ادھر ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں غدر ہو گیا۔ اور ولایت کے انگریزوں نے الحاق اودھ کو بھی غدر کا ایک سبب قرار دے لیا، غرض یہ وفد ناکام رہا۔ واپسی میں فرانس میں ملکہ کشور اور مرزا اسکندر حشمت کا انتقال ہو گیا۔ مرزا ولی عہد بادشاہ کے پاس کلکتہ آ گئے۔ بادشاہ فورٹ ولیم سے مٹیا برج میں منتقل کر دیے گئے۔ یہاں نسبتاً بہت عیش و راحت اور یک گونہ آزادی نصیب ہو گئی۔ قلعہ میں بالکل ہی قید تھی۔ ۱۸۸۷ء ﴿۱۳۰۴ھ﴾ میں مٹیا برج میں انتقال کیا۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ کو عیش و نشاط کے علاوہ علوم و فنون، صنعت و تجارت میں بھی بہت ترقی ہوئی۔ قیصر باغ اسی کی یادگار ہے۔ واجد علی شاہ خود شاعر تھا، اخترؔ تخلص تھا۔ چھ دیوان غزلیات، تین جلد مراثی چند مثنویاں اور بہت سے مجموعے نظم و نثر کے تصنیف کیے جن کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔ دیگر مشاہیر شعر و ادب کے نام یہ ہیں:۔ مرزا رجب علی سرورؔ، اصغر علی خاں نسیمؔ دہلوی، نواب محمد خاں رندؔ، مظفر علی خاں اسیرؔ، آفتاب الدولہ قلقؔ، نظیر حسن اوجؔ، عابد علی کوثرؔ، علی اوسط رشکؔ، منیرؔ شکوہ آبادی، امیرؔ مینائی، امانتؔ، برقؔ، سحرؔ وغیرہ۔

(تسلسل از صفحہ ۱۸۷) شاہِ اودھ (عہدِ وزارت و سلطنت ۱۸۱۴ء ﴿۱۲۲۹ھ﴾ تا ۱۸۲۷ء ﴿۱۲۴۳ھ﴾) کے حکم سے جلاوطن ہو کر لکھنؤ سے کانپور چلے گئے، کانپور میں حکیم سیّد اسد علی کے مشورہ سے اپنی مشہور تصنیف 'فسانۂ عجائب' لکھنی شروع کی۔ جب ۱۸۴۷ء ﴿۱۲۶۳ھ﴾ میں واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو انھوں نے سرور کو درباری شاعر مقرر کیا اور پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ کر دی۔ ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ ختم ہو گئی اور بادشاہ معزول ہو گئے، پھر ۱۸۵۷ء ﴿۱۲۷۳ھ﴾ میں غدر کی تباہی آئی۔ سرور اس عرصہ میں سخت پریشان رہے۔ ۱۸۵۹ء میں مہاراجہ بنارس نے اپنے پاس بلا لیا پھر مہاراجہ الور اور مہاراجہ پٹیالہ نے بھی مہمان بلایا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے طلائی کڑے نذر کیے۔ سرور نے ایک خط میں اپنے سفر دہلی و میرٹھ و راجپوتانہ کے مصائب کا حال لکھا ہے۔ ۱۸۶۳ء میں سرور اپنی آنکھوں کے علاج کے لیے کلکتہ گئے اور واجد علی شاہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے جو مٹیا برج میں نظر بند تھے۔ وہاں سے واپس آ کر بنارس چلے گئے اور وہیں ۱۸۶۷ء ﴿۱۲۸۴ھ﴾ میں انتقال کیا۔ سرور کی تصنیفات یہ ہیں:-

(۱) فسانۂ عجائب۔ ۱۸۲۴ء ﴿۱۲۴۰ھ﴾ میں لکھی۔ (۲) 'سرور سلطانی' ترجمہ شمشیر خانی، ۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ کے حکم سے مرتب کی۔ کسی نے شاہ نامۂ فردوسی کا خلاصہ نثر فارسی میں شمشیر خانی کے نام سے لکھا تھا، سرور نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ (۳) 'شررِ عشق' ۱۸۵۶ء میں نواب سکندر جہاں بیگم ریاست بھوپال کے حکم سے لکھا، یہ بھوپال کے جنگل کے پرندوں کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ (۴) 'شگوفۂ محبت' بھی اسی سال ۱۸۵۶ء میں لکھا۔ یہ قصہ پہلے مہر چند کھتری نے لکھا تھا۔ اسی کو سرور نے اپنے رنگ میں لکھا۔ (۵) 'گلزارِ سرور' ترجمہ حدائق العشاق فارسی۔ یہ مذہبی کتاب ہے جس میں روح و عشق کا مناظرہ دکھایا ہے۔ سرور نے اپنے مخصوص طرز رنگین و مقفٰی میں لکھا ہے۔ مرزا غالب نے اسی طرز میں اس پر تقریظ لکھی ہے۔ (۶) 'شبستانِ سرور' اس میں الف لیلہ کے چند قصوں کا ترجمہ ہے۔ (۷) 'انشائے سرور' مرزا سرور کے خطوط کا مجموعہ جوان کے بعد مرتب و شائع ہوا۔ ان میں سے بعض کے نمونے درج کیے جاتے ہیں:

(۱) 'سرور سلطانی ترجمہ شمشیر خانی' کی عبارت مقفّٰی ہے۔ شاہنامہ نثر اُردو میں لکھا ہے۔ یہ کتاب مشہور و مقبول نہ ہوئی، حالانکہ سرؔور کا مخصوص اسلوب تحریر اس میں بھی موجود ہے۔ سہراب و رستم کی آخری جنگ سے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:-

''دوسرے دن جس وقت تہمتن مشرق (آفتاب) آغشتہ بخوں، سمند نیلگوں (آسمان) پر سوار ہوا، سہراب رستم سے دوچار ہوا۔ آخر کار تہمتن نے نعرہ کیا، کوہ دماموں کا جگر پارہ کیا، اور سہراب کا کمر بند پکڑ کے سر سے بلند کر کے زمین پر دے پٹکا، اور فوراً کمر سے خنجر آبدار نکال اس کے سینے کو چاک کر دیا۔ سہراب نے آہ سرد دل زخمی و پُر درد سے کھینچی اور کہا افسوس مشتاق دیدار پدر، محروم و ناکام پسر، دار ناپائدار سے چلا، تہمتن شیر افگن نہ ملا۔ مگر اب تو مچھلی بن کر زیر قدم گاہ وز میں پناہ لے جائے گا یا اختر ہو کر فلک ہفتمیں پر اپنے تئیں چھپائے گا، میرا باپ کہیں منھ نہ موڑے گا، کسی طرح تجھ کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ رستم نے پوچھا اس کا نام کیا ہے۔ سہراب نے کہا رستم جہاں پہلوان ہے اور میری ماں دختر شاہ سمنگان ہے۔ یہ سنتے ہی دنیا رستم کی نظر میں تیرہ و تار بن گئی۔''

(۲) 'گلزار سرور' اس کے آغاز میں سرور نے کچھ اپنا حال اور تالیف کتاب کا سبب بیان کیا ہے اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ قافیہ پیمائی اور رنگین نگاری سرؔور کی ہر جگہ خصوصیت ہے۔ لکھتے ہیں:-

''یہاں سے نقاش ثانی معترف نادانی، گردش دیدہ بلا رسیدہ، یار و دیار سے دور، رجب علی بیگ سرؔور، اپنی گذشتہ داستان حیرت بیان لکھتا ہے۔ بارہ سو چوہتر ہجری (۱۲۷۴ھ) شہر شعبان میں فلک نے وہ سامان کیا، گلزار لکھنؤ پر عین بہار میں خزاں آ گئی، اس شعبدہ باز کہن نے نئی نیرنگی دکھائی ...... بے فکری اس جا کی دور دور مشہور تھی۔ بقول مشہور لنگوٹی میں پھاگ کھیلتی تھی، فاقہ کشی میں ڈنڈ پیلتی تھی، اپنے زعم میں قیصر و فغفور تھی، ایسی چشک دنک ہوئی کہ حد سے گذر گئی۔ ہر کمالے را زوالے، فلک کو اُجاڑنا، اس کا نام و نشان بنا کے بگاڑنا منظور تھا، وگرنہ بادشاہ کے دل میں نہ یہاں کی رعایا کی طبیعت میں فتور تھا۔ حضرت واجد علی شاہ سلطان عالم نے نو برس محمد شاہی کی، اس پر سرکار سے سرتابی نہ کی، بلکہ خیر خواہی کی، قیصر باغ کو غیرت گلزار ارم بنایا تھا، کیا لکھوں دن رات جو لطف اٹھایا تھا۔ خدا جانے کس کم بخت کی نظر اس شہر کو کھا گئی، امیر فقیر سب پر تباہی آ گئی ...... ہند میں فوج سرکار قدیم نمک خوار، پیادہ اور سوار

بشامت اعمال سے پھر گئے، غربا سے امرا تک بلا میں گھر گئے۔ جا بجا شور و شر مچایا۔ قتل و غارت سے فساد ہوا، لچوں کا کیا بگڑا، ہندوستان اس بکھیڑے میں برباد ہوا۔ پہلے دہلی اُجڑی پھاٹک ٹوٹا، پھر لکھنؤ لوٹا۔ یہاں تک کہ بے چراغ ہوا، بے بہمن ودے پامال خزاں خانہ باغ ہوا۔"

(۳) 'فسانۂ عجائب' یہ سرور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اسی سے ان کا نام زندہ ہے۔ اُردو انشا پردازوں میں ان کا ایک انفرادی درجہ قائم ہے۔ فسانۂ عجائب کی چند خصوصیات یادگار و قابلِ ذکر و توجہ ہیں:-

(۱) فسانۂ عجائب کی رنگین و مقفّٰی عبارت اس زمانۂ قدیم کی طرز نگارش سے جدا گانہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے اس رنگ کی کم سے کم دو کتابیں ممتاز ہیں۔ فضلی کی 'دہ مجلس' یا 'کربل کتھا'، اور تحسین کی 'نوطرزِ مرصع' ان کے گزشتہ نمونوں سے ظاہر ہے کہ قافیہ پیمائی، عبارت آرائی، عربی فارسی کے الفاظ و تراکیب، زورِ قلم اور علمی شان میں کسی سے کم نہیں۔ یہی حال فسانۂ عجائب کا ہے۔ پھر بھی سرور نے اس روش کو اعتدال کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ مسلسل بیان میں کچھ دیر کے لیے قافیے بھی ترک کر دیتے ہیں اور ثقیل الفاظ سے روانی و صفائی میں کمی نہیں آنے دیتے۔ اس لئے فضلی اور تحسین کی سی تعقید اور گنجلک کم پیدا ہوتی ہے، اور تحسین کی سی ثقالت اور معمائیت شاذ و نادر پیدا ہوتی ہے۔

(۲) فسانۂ عجائب کے اسلوب تحریر کو اب کیسا ہی سمجھا جائے اور کسی نظر سے دیکھا جائے، لیکن یہ قدیم زمانے کا محبوب و مقبول انداز تھا اور علم و انشا کا کمال گنا جاتا تھا۔ اس لیے اس کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے، اس لفظی آرائش اور علم و قابلیت کی نمائش سے موزوں اور ناموزوں دونوں کام لیے جا سکتے ہیں۔ مرزا سرور کی تحریر میں بھی مناسب و نامناسب دونوں انداز موجود ہیں۔ مثلاً سرور کہیں عربی و فارسی تراکیب تشبیہ و استعارہ سے محاکات و منظر کشی کرتے ہیں، لیکن ناکام رہتے ہیں۔ یعنی وہ منظر آنکھوں کے سامنے نہیں آتا، دیکھیے رات گزرنا اور دن نکلنا بیان کرتے ہیں:

"جس وقت زاغ شب نے بیضہ ہائے انجم آشیانۂ مغرب میں چھپائے، اور صیادان سحر خیز دام بردوش آئے، اور سیمرغ زریں جناح مطلاّ بال غیرت لال قفس مشرق سے جلوہ افروز ہوا، یعنی

شب گذری روز ہوا۔"

یا ایک جگہ "سردی کی شدت" دکھانے کے لیے یہ فقرے لکھتے ہیں:-

"آتش رخسار گل شبنم نے بجھائی تھی، باغ میں بھی جاڑے کی دہائی تھی۔ اوس برگ و بار کی صنعت پروردگار کی دکھاتی تھی، مرصع کاری یک لخت نظر آتی تھی، دانہ ہائے اشک شبنم بڑے یار یزے تھے، ہر شجر کے پتے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے آویزے تھے۔"

اس سے سردی کا سماں پیش نہیں ہوتا، لیکن اسی سردی کو جب اسی مقفّی انداز میں لیکن واقعات کے ساتھ اور قریب واقعہ تشبیہوں کی مدد سے بیان کرتے ہیں تو پوری منظر کشی ہو جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"چلّے کے جاڑے کڑاکے کی سردی تھی، گویا زمین سے آسمان تک برف بھر دی تھی، سردی سے سب کا جی جلتا تھا، دم تقریر ہر شخص کے منھ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا، زمانے کے کاروبار میں خلل تھا، ہر ایک دست در بغل تھا۔ ہر سنگ کے سینے میں آگ تھی، گواہ شرعی شرر تھا، لیکن سردی کو یہی لاگ تھی اور جاڑے کا ایسا اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں، فولاد سے زیادہ کڑی تھیں۔"

(۳) سرور حسب موقع زبان اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ عربی و فارسی کے استعمال کی مثالیں اوپر مذکور ہوئیں۔ ضرورت پر آیات قرآن مجید بھی تضمین کر دیتے ہیں۔ مثلاً:-

"لیکن بایں حکومت و ثروت کاشانۂ امید کا چراغ گل اولاد بالکل نہ تھی، خواہش فرزند در دل، نہونے کی خواہش متصل، حسرت پسر میں رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ ہر ساعت بر زبان۔ رَبِّ ھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا وظیفہ دہاں۔ لڑکے کی تمنا میں بادشاہ مثل گدا دست دراز، ایسا لاپرواہ بے نیاز کی قدرت سے بانیاز۔"

لیکن اس سے آگے جب اس بادشاہ کے ہاں فرزند پیدا ہوتا ہے، اور بادشاہ شہزادے کا جنم پتر کھلوانے کے لیے نجومی پنڈت کو بلاتا ہے تو سرور پنڈتوں کی مخصوص زبان و اصطلاحات لکھتے ہیں:-

"نجومی پنڈت جعفرداں حاضر ہوئے، بہت سوچ بچار کر پنڈتوں نے عرض کی، مہاراج کا بول بالا، جاہ و

حشم و مرتبہ دوبالا رہے، ہماری پوتھی کہتی ہے بھگوان کی دیا سے شہزادے کا چندرمان بلی ہے، چھٹا سورج ہے جو گرہ ہے وہ بھلی ہے، دیگ یگ کا مالک رہے، دھرم مورت یہ بالک رہے، جلد راج پر براجے، پرتھمی میں دھوم مچے ایسی شادی رچے، مگر پندرھویں برس مشتری بارھویں آئے گی، سنچر پاؤں پڑے گا، ایک پنکھیرو سوے کے برن میں ہاتھ آئے گا، تریا کی کھٹ پٹ سے وہ بچن سنائے گا کہ راج پاٹ چھڑا دیس بدیس لے جائے گا، ڈگر میں شاہزادہ بھٹکے کوئی پاس نہ پھٹکے، ساتھی چھٹیں، اپنے ڈیل سے ڈانواڈول رہے، پھر ایک منکھ ٹھاکر کا سیوک کرپا کرے راہ لگائے کوئی کلکن سو بھی ہو کشت لگائے۔''

(۴) اسی طرح مختلف فنون کی اصطلاحیں، شریف ورذیل کا طرزِ کلام، اہلِ بازار و اہلِ حرفہ کی گفتگو وغیرہ مختلف اجزائے فسانہ مناسب زبان و بیان میں ادا کیا ہے۔ اس اعتبار سے 'فسانۂ عجائب' اس مخصوص اسلوب تحریر کی پہلی بہترین و مکمل تصنیف ہے۔

(۵) اصل فسانہ میں کوئی خاص جدّت نہیں ہے۔ خلاف قیاس واقعات اور عجائبات جیسے اس سے پہلے 'داستان امیر حمزہ' وغیرہ میں ہیں، 'فسانۂ عجائب' میں بھی ہیں۔

(۶) 'فسانۂ عجائب' کو اس اعتبار سے مطالعہ کرنا ضروری بھی ہے اور دلچسپ بھی کہ یہ داستانی لٹریچر کا جزو ہے۔ اس سے پہلے کم اور اس کے بعد بڑی کثرت سے نہایت طویل و ضخیم داستانیں لکھی گئیں۔ ان داستانوں میں اس کا کیا درجہ ہے؟ پھر 'فسانۂ عجائب' کی تصنیف (۱۸۲۴ء) کے تقریباً چالیس برس بعد اُردو میں جدید ناول نگاری کا دور شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد نے ۱۸۶۲ء میں زنانہ ناول 'مرأۃ العروس' لکھا، اور پھر پے در پے متعدد ناول تصنیف کیے، اور پھر پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ۱۸۷۸ء میں 'فسانۂ آزاد' لکھا۔ ان ناولوں سے 'فسانۂ عجائب' کا کیا مقابلہ ہے؟

(الف) داستانوں میں 'فسانۂ عجائب' کو کوئی نمایاں مرتبہ حاصل نہیں ہے۔ اس کے بعد 'الف لیلہٰ' اور 'بوستانِ خیال' اور 'داستانِ امیر حمزہ' اور اس کے سلسلے کی ایک الماری بھر داستانیں لکھی گئیں۔ جن میں سے ایک ایک 'فسانۂ عجائب' سے کئی کئی گنی بڑی ہے اور واقعات و نیرنگ و فسوں اور تجربات و مشاہدات کی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔

(ب) ناولوں کی خصوصیات کے لحاظ سے بھی 'فسانۂ عجائب' کو کوئی درجہ نہیں دیا

جا سکتا۔ یعنی افراد قصہ کا کیریکٹر، مربوط و مقرر پلاٹ، اشخاص کا مکالمہ، جذبات نگاری جدید ناول کے اصول سے مطابق نہیں ہیں۔ کہیں یہ اجزا درست ہیں کہیں ناقص، مثلاً ملکہ مہر نگار کا کردار مہر و وفا، صدق و صفا، ہمت و استقلال، دانائی و کاردانی صحیح طور پر پیش کیا ہے۔ 'فسانۂ عجائب' کا مقابلہ نذیر احمد، سجاد حسین، عبدالحلیم وغیرہ کے ناولوں سے تو ہو ہی نہیں سکتا۔ سرشار کے 'فسانۂ آزاد' سے اس اعتبار سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے کہ سرور نے اپنی کتاب کے دیباچے میں اور سرشار نے اپنے تمام فسانے میں لکھنؤ کی معاشرت اور سوسائٹی اور تہذیب و تمدن کا حال دکھایا ہے، لیکن سرور کی نقاشی ایسی ہے جیسے نمائش گاہ میں باتصویر پردہ جس پر بازاروں، مجلسوں، مجمعوں کی تصویریں صحیح کھنچی ہوں۔ لیکن بالکل خاموش اور بے حس۔ اور سرشار کی مصوری ایسی ہے جیسے متکلم سنیما کے پردے پر چلتی پھرتی بولتی چالتی تصویریں۔ سرور مختصر طور پر سرسری بیان لکھتے ہیں۔ سرشار چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل لکھتے ہیں۔ سرور قصہ اور اس کے عجائبات سے دلچسپی رکھتے ہیں، سرشار قصے کو چھوڑ دیتے ہیں بلکہ بھول جاتے ہیں اور افراد قصہ اور ان کے خصائص، طبع و عجائب فطرت کو بیان کرتے ہیں۔ سرور میں ظرافت و شوخی کہیں نہیں، اور سرشار میں ہر جگہ اور ہر وقت ہے۔

(۷) آخر میں سرور کے متعلق یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے 'فسانۂ عجائب' کے دیباچے میں میر امن دہلوی اور ان کے 'باغ و بہار' پر چوٹیں کی ہیں، لکھتے ہیں:-

> ''اگرچہ اس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے، یا اس افسانہ کو بنظر نثاری کسی کو سنائے، اگر شاہجہاں آباد کہ مسکن اہلِ زبان، کبھی بیت السلطنت ہندوستان تھا۔ وہاں چندے بود و باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کرتا، فصاحت کا دم بھرتا، جیسا کہ میر امن صاحب نے چہار درویش میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے دین وحصہ میں یہ زبان آئی ہے۔ دہلی کے روڑے ہیں کہ محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں، پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر کہ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے، مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے، بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے، کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے، مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔''

حالانکہ میر امن نے کسی کا نام لے کر چوٹ نہیں کی تھی نہ اس زمانہ (۱۸۰۲ء) تک

لکھنو کا کوئی شاعر و مصنف مشہور ہوا تھا۔ بلکہ اس زمانے میں بھی جو شاعر ممتاز و مقبول تھے (میر، جراءت، مصحفی، انشا، خلیق وغیرہ) وہ دہلی کے ہی تھے۔ میر امن نے دہلی کے ٹکسال اور مرکز زبان ہونے کے سبب سے یہ لکھ دیا تھا۔

''جو شخص دہلی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار اُمرا کے دیکھے اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر و تماشہ اور کوچہ گردی اس شہر کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔''

بہر حال رجب علی بیگ سرور کا یہ لعن طعن ہنگامہ آرائی کا سبب بن گیا۔ جس سے اردو لٹریچر میں بھی اضافہ ہوا۔ یعنی سرور کے جواب میں خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی نے ایک قصہ 'سروش سخن' لکھا اور اس میں سرور کا جواب دیا اور الٹے اور اعتراض کئے۔ یہ کتاب ۱۸۶۰ء میں لکھی گئی۔ اس کے جواب میں اور سرور کی حمایت میں جعفر علی شیون لکھنوی نے ۱۸۷۲ء میں ایک فسانہ 'طلسم حیرت' لکھا، اس میں اہلِ دہلی کے طعنوں کا جواب دیا۔

'فسانہ عجائب' کے آغاز و اختتام تصنیف کے صحیح سنہ دریافت نہیں ہوئے۔ مرزا محمد عسکری صاحب نے 'تاریخ ادب اردو' میں لکھا ہے کہ '۱۲۴۰ھ میں سرور کانپور گئے۔' اور یہ سنہ سرور کی تحریر سے ثابت کیا ہے۔ اس سے آگے لکھتے ہیں:۔ 'کانپور ہی میں یہ کتاب لکھی گئی۔۔۔ یہ کتاب غازی الدین حیدر کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی۔' اس کے بعد لکھتے ہیں، 'بعد اختتام بعہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ آئی، اس کا سنہ تصنیف ۱۲۴۰ھ ہے جیسا کہ آخیر کے قطعات تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔' یہ بیانات نہایت غیر مطابق اور غیر ذمہ دارانہ ہیں۔ اگر ان سنوں کو صحیح مان لیا جائے تو سرور جس سال کانپور گئے اسی سال کے اندر یہ کتاب لکھ لی، اور آخر میں اسی سال کے قطعات تاریخ شامل کر دئے، یہ بالکل قرین قیاس ہے، لیکن ۱۲۴۰ھ (مطابق ۱۸۲۴ء) غازی الدین حیدر کے زمانے کا سال ہے۔ نصیر الدین حیدر کا عہد حکومت اس سال سے تین سال بعد ۱۲۴۳ھ (مطابق ۱۸۲۷ء) میں شروع ہوتا ہے، پھر اس کے لکھنے کے کیا معنی کہ

"نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی۔"

فسانہ عجائب کا طویل نمونہ دینے کی ضرورت نہیں، نہایت مشہور، عام ورائج کتاب ہے۔ اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں اس کے اقتباسات شامل ہیں۔ ایک مختصر ٹکڑا درج کیا جاتا ہے جس میں عربی وفارسی کی لفاظی کم ہے، روز مرہ اور محاورہ زیادہ:۔

"یہاں تو یہ حیص بیص تھی کہ جانعالم تشریف فرما ہوا۔ عجب صحبت دیکھی کہ شہزادی بچشم پر آب و بادل کباب غیظ میں آ تھر تھرا، طوطے سے بحث رہی ہے۔ شہزادہ نے فرمایا، خیر باشد، طوطا بولا آج نرا شر ہے، خیر بخیر، مگر چندے حیات اس وحشی کی اور آب ودانہ، قفس چینا کھانا باقی تھا، اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے، تشریف نہ لاتے تو میرا طائر روح گربۂ غضب شہزادی سے مجروح ہو کر پرواز کر جاتا، ہرگز جیتا نہ پاتے، مگر پنجرا خالی دیکھ مزاج عالی پریشان ہوتا، بحسرت افسوس یہ فرماتے ؎

طوطا ہمارا مر گیا کیا بولتا ہوا

ماہ طلعت ان باتوں سے زیادہ مکدر رہوئی، شہزادہ سے کہا، اگر میری بات کا طوطا صاف جواب نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلووں سے اس کی آنکھیں ملوں گی جب دانہ پانی کھاؤں پیوں گی۔ جانعالم نے کہا کچھ حال تو کہو، طوطے نے گذارش کی، حضور یہ مقدمہ غلام سے سنئے، آج شہزادی صاحب اپنی دانست میں، بہت نکھر ؎

دیکھ آئینہ کو کہتی تھی کہ اللہ رے میں!

پھر مجھ سے فرمایا تو نے ایسی صورت کبھی دیکھی ہے؟ مجھ اجل رسیدہ کے منہ سے نکلا خدا نہ کرے! اس جرم قبیح پر شہزادی کے نزدیک کشتنی، سوختنی، گردن زدنی ہوں، بقول میر تقی میر ؎

بے جرم تہِ تیغ ہی رکھا تھا گلے کو
کچھ بات بُری منھ سے نہ نکلی تھی بھلے کو

جانعالم نے کہا، تم بھی کتنی عقل سے خالی حُمق سے بھری ہو، تم تو پری ہو، جانور کی بات پر اتنا آزردہ ہو، گو گویا ہے پھر طائر ہے۔ میاں مٹھو کو ان باتوں کی تاب نہ آئی، آنکھ بدل روکھی صورت بنائی، اور تیس سے بولا خداوند نعمت، جھوٹ جھوٹ ہے، سچ سچ ہے، میں نے تو جھوٹ اور سچ دونوں سے بچ کر ایک کلمہ کہا تھا، اگر راستی پر ہوتا گردن کج کئے سیدھا گور میں سوتا۔ یہ سن کے وہ اور مکدر رہوئی، مثل مشہور ہے،

راج ہٹ، تریا ہٹ، بالک ہٹ۔ جانعالم نے مجبور ہو کر کہا جو ہو سو ہو، مٹھو پیارے سچ کہہ دو۔"

محمد بخش مہجور: شرفائے دہلی سے تھے، رسمی علوم میں اچھی دستگاہ تھی۔ شاعرانہ ذوق رکھتے تھے۔ جرأت (متوفی ۱۸۲۹ء ﴿۱۲۴۵ھ﴾) کے شاگرد رشید تھے۔ میر و سودا کا زمانہ دیکھا تھا۔ نثر اُردو میں وہی طرزِ مقفّی ان کو بھی پسند تھا۔ "گلشن بہار" ان سے یادگار ہے، اُسی زمانہ کے گمنام مصنف ہیں، اس لیے ان کی کتاب میں سے حمد باری تعالیٰ کی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں، کہ ان کا نام زندہ رہے:-

"حمد و سپاس و ثنائے بے قیاس، اس کریم کارساز، بے نیاز بے انباز بندہ نواز، بے چون و بے چگوں کو، کہ جس نے ساتھ ابر کرم اور بہار قدرت کے گل ہائے گوناگوں انسان ضعیف البیان سے گلشن تکوین کو سرسبز و شاداب کر کے اپنے تئیں برنگ نکہت ہر غنچہ و گل میں جلوہ گر کیا ہے، فی الواقع بقول میاں جرأت کے۔

اسے دیکھو تو ہے ہر رنگ میں وہ
عیاں گل میں، نہاں ہے سنگ میں وہ
وہ ہے ہر رنگ میں اور پھر جدا ہے

خدا ہے وہ، خدا ہے وہ، خدا ہے

نثر اُردو کا چوتھا دَور

۱۸۳۱ء ﴿۱۲۴۶ھ﴾ تا ۱۸۷۰ء ﴿۱۲۸۶ھ﴾

اس سے پہلے اُن مصنفوں کا تذکرہ کیا گیا جو مصنفین فورٹ ولیم کالج کے ساتھ لیکن کالج سے باہر ہندوستان میں اُردو نثر کی تصنیف و تالیف کر رہے تھے۔ یہ چوتھا دور ان کے بعد کے مصنفوں کا ہے جن کا زمانۂ تصنیف غدر (۱۸۵۷ء) سے پہلے یا کچھ بعد ہے۔ یہ تیسرے اور چوتھے دور کی علیحدگی کسی خاص ادبی ولسانی تغیر کے اصول پر نہیں ہے۔ اس اعتبار سے انیسویں صدی کا نصف اول بلکہ دو ثلث تقریباً یکساں ہیں۔ زبان و انشا کی بے قاعدگی و باقاعدگی دونوں ساتھ ساتھ جاری رہی ہیں۔ ۱۸۰۱ء سے ۱۸۷۰ء تک، میر امّن سے معاصرینِ غالبؔ تک بے اصول و با اصول دونوں طرح کے لکھنے والے رہے۔ ہم نے فورٹ ولیم کالج کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر اس کو الگ دور میں رکھا ہے، اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسی زمانے میں اور لوگ بھی اسی شاہ راہ پر گامزن تھے، بیرونِ کالج والوں کو اسی دور میں لکھ دیا ہے، یہ چوتھا دور اسی کے سلسلے میں بعد کے لوگوں کا ہے۔

سدا سکھ لال : ۱۸۳۲ء میں اُردو عدالتی اور سرکاری زبان مقرر کی گئی، لیکن اس سے پہلے اہل ہند کی آسانی کے لیے دیوانی و فوجداری و مالگذاری کے قوانین کا اُردو میں ترجمہ شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۳ء ﴿۱۲۱۷ھ﴾ میں گورنمنٹ مغربی شمالی (جس میں موجودہ صوبجات متحدہ بھی شامل تھے) کی طرف سے ''ہدایت نامہ مال گذاری'' اُردو میں مرتب ہوا۔ یہ قانون کی سب سے پہلی کتابوں میں ہے جو اُردو میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد بھی سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۳۴ء ﴿۱۲۴۹ھ﴾ میں منشی سدا سکھ لال نے 'مجموعۂ قوانین (ایکٹ ہائے سپریم گورنمنٹ) مرتب کیا، جس میں ۱۷۹۳ء سے ۱۸۳۴ء تک جملہ ایکٹ ہائے مروّجہ ممالک مغربی و شمالی تھے۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۶۴ء میں مطبع نور الابصار آگرہ میں چھپی تھی۔ بعد کی تین جلدیں بھی اسی مطبع میں ۱۸۶۶ء میں چھپیں۔ اس کے دیباچہ کی چند

سطریں یہ ہیں:-

"فائدے اس تالیف کے ایسے نہیں ہیں کہ احتیاج ان کے بیان کی ہو، فی الواقع یہ جلدیں آئینہ نمائے انتظام جملہ سررشتہ ہائے سلطنت عظیم الشان سرکار دولت مدار انگلشیہ کی ہیں، ان کے دیکھنے سے بآسانی معلوم ہوسکتا ہے کہ ہر باب میں کتنے قوانین مجاریہ وقت ہیں اور کتنے منسوخ ہوگئے۔ واضح ہو کہ مصنف نے ترجمہ اُردو میں کہ وہ مسلمہ گورنمنٹ اور مندرجہ گزٹ سرکاری تھا، کچھ تصرف نہیں کیا ہے۔"

اس کے علاوہ سدا سکھ لال نے "فنِ زراعت" کے متعلق ایک کتاب انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی اس کا نام 'گنگا کی نہر' رکھا۔ یہ ۲۴ صفحہ کا مختصر رسالہ ہے۔ ۱۸۵۴ء میں آگرہ میں طبع ہوا۔

تراجم علوم وفنون۔ اس موقع پر یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فورٹ ولیم کالج کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کی حکومت میں یعنی غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اُردو میں ہر قسم کے علوم وفنون کی کتابیں ترجمہ وتالیف ہوگئی تھیں، اور ان میں سے اکثر طبع ہوگئی تھیں۔ تاریخ و جغرافیہ، مذہب، سائنس، نجوم وہیئت، معاشیات (اکنامکس) منطق، طبیعات (فزکس) فن زراعت، تعلیمات، درسیات وغیرہ موضوعات ومضامین کی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے چند کتابیں بعض پرائیویٹ کتب خانوں میں دستیاب ہوتی ہیں۔ کلکتہ وغیرہ کی بڑی یا سرکاری لائبریریوں میں اور ریاستوں یا امیروں کے کتب خانوں میں موجود ہوں گی، لیکن لندن کے انڈیا آفس کی لائبریری میں سب کی سب موجود ہیں۔ جن میں مطبوعات بھی ہیں اور قلمی بھی۔ ان کی تصنیف وتالیف میں ہندو اہلِ قلم برابر کے شریک ہیں۔ چند مطبوعہ کتابوں کے نام درج کیے جاتے ہیں:-

(۱) کھیت کرم۔ ۳ حصہ، مصنفہ کالی رائے، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۶ء (فن زراعت)

(۲) اصول علم انتظام مدن۔ مترجمہ دھرم نرائن، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۶ء (معاشیات)

(۳) اصول علم طبعی۔ مترجمہ اجودھیا پرشاد وسیوا پرشاد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء (طبیعات)

(۴) عجائب روزگار۔ مصنفہ ماسٹر رام چندر، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۷ء (طبیعات)

(۵) مرأۃ العلوم۔ مصنفہ ہری ورمن لال، مطبوعہ بنارس ۱۸۴۹ء (طبیعات)

(۶) اصول قواعد مائیات۔ مترجمہ اجودھیا پرشاد، مطبوعہ دہلی ۱۸۵۰ء (طبیعات)

(۷) قانون انطباع (چھاپہ کا فن)۔ مصنفہ سیتل پرشاد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء (سائنس)

(۸) اصول علم ہیئت۔ مصنفہ ماسٹر رام چندر، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء (نجوم و ہیئت)

(۹) مختصر دقائق النجوم۔ مؤلفہ گھٹالے، مطبوعہ مدراس ۱۸۴۸ء (نجوم و ہیئت)

(۱۰) خلاصہ نظام آسمانی۔ مرتبہ پنڈت دامی دھیرا، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۳ء (نجوم و ہیئت)

(۱۱) جغرافیۂ ہند۔ مترجمہ پنڈت سواروپ نرائن و سیواروپ نرائن، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء (جغرافیہ)

(۱۲) فتح گڑھ نامہ (جغرافیہ ضلع فتح گڑھ)۔ مرتبہ کالی رائے، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۹ء (جغرافیہ)

(۱۳) پند نامہ کاشتکاری۔ مصنفہ موتی لال، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۲ء (زراعت)

(۱۴) ریشم کا کیڑا۔ مرتبہ موتی لال، مطبوعہ لاہور ۱۸۵۳ء (صنعت و حرفت)

(۱۵) بُخار کی کل (اسٹیم انجن)۔ مؤلفہ ایشوری لال، مطبوعہ بنارس ۱۸۵۵ء (سائنس)

(۱۶) ہوا کا بیان۔ مرتبہ بدری لال، مطبوعہ بنارس، ۱۸۵۴ء (علم طبیعات)

(۱۷) معدنیات۔ مؤلفہ جواہر لال، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۵ء (طبیعات)

(۱۸) خلاصۃ الصنائع۔ مترجمہ بھولا ناتھ، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۴ء (سائنس)

(۱۹) تحصیل فی جر الثقیل۔ مصنفہ سیّد احمد خاں (سرسیّد)، مطبوعہ آگرہ ۱۸۴۴ء (طبیعات)

(۲۰) ترجمہ معاشیات مل۔ مترجمہ وزیر علی، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء (معاشیات)

(۲۱) ترجمہ شمسیہ، مترجمہ سیّد محمد، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء (منطق)

(۲۲) مقاصد العلوم۔ مترجمہ سیّد محمد میر، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۱ء (طبیعات)

(۲۳) علم حکمت (میکانکس)۔ مؤلفہ چارلس فنک، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۳ء (سائنس)

(۲۴) بحر الحکمۃ (اسٹیم انجن)۔ مرتبہ ریورنڈ پارکن، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۴۷ء (سائنس)

(۲۵) توصیف زراعت۔ مرتبہ کلب حسین، مطبوعہ آگرہ ۱۸۴۸ء (زراعت)

(۲۶) علم جغرافیہ۔ مرتبہ میر غلام علی، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۱ء (جغرافیہ)

(۲۷) رسالہ مقناطیس۔ مترجمہ سیّد کمال الدین، مطبوعہ دہلی ۱۸۵۰ء (طبیعات)

(۲۸) بجلی کی ڈاک۔ مؤلفہ جے۔ ڈبلیو۔ بیل، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۴ء (طبیعات)

(۲۹) اصول جرثقیل۔ مرتبہ محمد احسن، مطبوعہ بنارس ۱۸۵۴ء (طبیعات)

(۳۰) چائے لگانے کی کتاب۔ مطبوعہ لاہور ۱۸۵۴ء (زراعت)

فقیر محمد خاں گویا: لکھنؤ کے رئیس تھے، شاہانِ اودھ کے زمانے میں فوج کے رسالدار رہے۔ ''نواب حسام الدولہ'' خطاب تھا۔ گویاؔ تخلص ہے۔ ناسخؔ اور وزیرؔ دونوں سے مشورۂ سخن کیا ہے۔ صاحب دیوان ہیں۔ مطبع نولکشور میں دیوان طبع ہو گیا ہے۔ ۱۸۵۰ء ﴿۱۲۶۶ھ﴾ میں انتقال کیا۔ گویاؔ کی صرف ایک تصنیف ہے۔ ۱۸۳۵ء ﴿۱۲۵۱ھ﴾ میں 'انوار سہیلی' کا ترجمہ 'بستان حکمت' کے نام سے کیا۔ 'انوار سہیلی' کے اُردو ترجمے گویاؔ سے پہلے اور بعد کو اور لوگوں نے بھی کیے، جن میں سے بعض کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے منشی حفیظ الدین نے 'خرد افروز' کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۲۴ء میں محمد ابراہیم بیجاپوری نے ترجمہ کیا۔ لیکن ان سب سے فقیر محمد خاں گویاؔ کا ترجمہ بہتر ہے۔ سرور کی طرح قافیہ پیمائی نہیں ہے، لیکن الفاظ و فقرات کی ترتیب میں قدامت کا اثر ہے جس سے خواہ مخواہ ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ تاہم یہ تنہا گویاؔ کا قصور نہیں ہے۔ الفاظ کی صحیح و باقاعدہ ترتیب اُس زمانے میں کیا بہت بعد تک پیدا نہ ہوئی تھی۔ ہر مصنف کی تحریر میں بلا استثنا یہی بات ہے۔ سر سیّد احمد خاں کی تحریر میں تو یہ بے قاعدگی بہت کثرت سے ہے، خود غالبؔ کی سہل ممتنع زبان بھی اس سے خالی نہیں۔ اگرچہ کم ہے۔ نذیر احمد و حالیؔ کے دور سے یہ عیب بالکل جاتا رہا۔ فقیر محمد خاں گویاؔ نے اپنے ترجمے میں اصل کتاب اور 'انوار سہیلی' کے عربی و فارسی الفاظ و تراکیب جا بجا قائم رکھی ہیں۔ اس لیے زبان بالکل آسان نہیں رہی، پھر بھی نہایت خوشنما، دلچسپ اور پُرمعنی ہے۔ گویاؔ نے دیباچے میں جو اپنی عبارت لکھی ہے، اس کا بھی یہی رنگ ہے۔ سبب تالیف بیان کرتے ہیں:۔

''اب سنا چاہئے کہ ایک روز بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شاگرد ارشد شیخ ناسخ صاحب کے ہیں، اور چند ارباب اور بھی باہم بیٹھے ہوئے تھے اور وقت شغل انوار سہیلی کے مطالعے کا

تھا۔ اور اس کے مصنف کی فکر رسا پر سب نے زبان ثنا کھولی تھی کہ سبحان اللہ مصنف اس کا عجیب حکیم بے مثل تھا، اور عجب کتاب تصنیف کی ہے کہ گنجینہ ہے اسرار الٰہی کا اور خزینہ ہے فیض غیر متناہی کا، بلکہ قرینہ اس پر دال ہے کہ جو کچھ اس نے بیان کیا ہے مظنہ ہے کہ بامداد الہام غیبی ہو، و الّا رائے انسان ضعیف البیان کب کنہ کو اس قدر جزئیات عالم کے پہونچ سکتی ہے.....''

غرض ان خواجہ تاشوں کی فرمائش سے گویا نے یہ کتاب مرتب کی۔ ترجمہ کے متعلق کہتے ہیں۔ ''برائے نام ترجمہ کیا جاتا ہے، ورنہ یہ کتاب حقیقت میں جدا ہے، لیکن حق یوں ہے کہ یہ احسان نقاش اوّل کا ہے، ورنہ مجھ سے بے مایہ کو کہاں طاقت اس کے بیان کی تھی۔''
'بستانِ حکمت' کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

''بادشاہ نے حکم دیا کہ دمنہ کو دار القضا میں سپرد کرو تا قاضی اس کا حال دریافت کرے کہ احکام سیاست میں جب تک شرائط شرعی تمام نہوں گے کچھ حکم نہ کیا جائے گا۔ دمنہ نے کہا کہ کون حاکم راست کار بادشاہ سے زیادہ ہے، اور کون قاضی، عادل شہریار سے بالاتر ہے۔ الحمد للہ کہ ضمیر منیر بادشاہ آئینہ ہے باصفا بلکہ جام ہے جہاں نما، کہ صورت ہر ملازم و رعایا کی اس میں ہویدا ہے۔

رباعی سوداؔ

ایوانِ عدالت میں تمہارے اے شاہ	ہے ظلم کو کیا دخل ، عیاذاً باللہ
شیشے کا اگر طاق سے ٹوٹے ہے پاؤں	پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

اور بہ یقین اتنا جانتا ہوں کہ کشف شبہات اور رفع حجاب میں کوئی چیز برابر فراست بادشاہ جم جاہ کے نہیں ہے۔ اگر خود شہریار بنفسِ نفیس رائے جہاں آرا کو قاضی میرے حال کا فرمائے تو کذب اور صدق میرا مانند صبح صادق کے روشن ہو جائے، جیسا کہ حافظ نے فرمایا۔ بیت

عرض حاجت در حریم حضرتت محتاج نیست	راز کس مخفی نماند بر فروغ رائے تو

شیر نے کہا کہ اے دمنہ اندیشہ نہ کر کہ اس مہم میں جستجوئے تمام کی جائے گی، اور تحقیق اس کام کی اس طرح پر کہ زیادتی اس سے متصور نہ ہو، عمل میں آئے گی۔

نظم

جدا کریں گے ہم اس طرح حق و باطل کو	کہ جیسے دودھ سے مکھی نکال لیتے ہیں

نکال لیتے ہیں، جس طرح عطر پھولوں سے ہر ایک بات کا ہم جی نکال لیتے ہیں

نیم چند کھتری: اُس زمانے میں ہندو اہلِ ذوق وارباب علم اُردو شعر و سخن اور علم وادب کی تحصیل، ترویج اور تکمیل میں نہایت مستعدی سے کوشش کر رہے تھے، جیسا کہ پہلی فہرستوں اور نمونوں سے دریافت ہوا۔ منشی نیم چند کھتری بھی ایسے ہی ادیبوں میں ہیں۔ فارسی سے 'قصہ گل باصنوبر' ۱۸۳۷ء ﴿۱۲۵۲ھ﴾ میں ترجمہ کیا اور شائع ومقبول ہوا۔ اس کا نمونہ مولانا احسن مارہروی کی تالیف 'نمونہ منثورات' سے نقل کیا جاتا ہے۔ قصّے کے ٹائٹل پیج کی عبارت یہ ہے:۔

''زبان فارسی سے زبان اُردو میں ترجمہ کیا ہوا نیم چند کھتری کا نام سے بابو گورچرن کے نواب مستطاب لارڈ جارج آکلنڈ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے عہد میں، وداتا رام برہمن کی تصحیح سے چھاپا گیا۔''

تحریر کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

''بعد ازاں فقیر حقیر رضائے الٰہی پر خرسند نیم چند، یوں لکھتا ہے کہ اس عالمِ ناپائدار میں کسی چیز کو قرار نہیں اور نیستی پر سب کا مدار ہے، اس کی ذات لازوال کے واسطے بقا، اور باقی سب کو فنا ہے مگر ایک گلستانِ سخن کہ خزانِ جہاں اس کے گلوں پر نہیں آتی، چوروں کی چوری اور رہزنوں کی سرزوری سے یہ دولت کہیں نہیں جاتی، چمن اس کا ہمیشہ تازہ وخرم رہتا ہے، اور اس کی نہروں میں زلال زندگی بہتا ہے، اس کے مکان کی نیو کو حادثے کے بھونچال کا کچھ خطرہ نہیں ہوتا۔''

مولوی قطب الدین دہلوی: ان کے والد کا نام محمد محی الدین احراری ہے۔ دہلی کے بہت بڑے عالم ومحدث تھے۔ امارت وثروت بھی رکھتے تھے۔ مولانا حاجی محمد اسحاق دہلوی (مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے) کے شاگرد رشید تھے۔ ۱۸۷۲ء ﴿۱۲۸۹ھ﴾ میں انتقال کیا۔ ان کی تصانیف سے دو کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

(۱) 'ظفر جلیل' اردو ترجمہ ''حصن حصین'' (مصنفہ قاضی القضاۃ شمس الدین محمد دمشقی متوفی ۱۴۳۱ء ﴿۸۳۳ھ﴾ مولوی قطب الدین نے تاریخی نام رکھا ہے اس سے

سالِ تالیف ۱۲۵۳ھ ﴿۱۸۳۷ء﴾ نکلتا ہے۔اس کا نمونہ یہ ہے:-

''حمد بے شمار ہے اس پاک پروردگار کے لیے کہ ہم کو توفیق دی اپنے ذکر کی اور راہ بتائی اپنی فکر کی، یا الٰہی درود و سلام بیحد نازل کر خاتم النبیین شفیع المذنبین رسولؐ امین پر، اور ان کے اصحاب ابرار اور آل اطہار پر اور سب پر۔''

(۲) 'مظاہر حق' اُردو ترجمہ و شرح 'مشکوٰۃ المصابیح' اس ترجمہ کا نام بھی تاریخی ہے، اس سے ۱۲۵۴ھ ﴿۱۸۳۸ء﴾ نکلتے ہیں۔ یہ مولانا قطب الدین کا نہایت عظیم الشان کارنامہ ہے۔یعنی چار جلدوں میں بہت بڑی تقطیع کے دو ہزار صفحوں سے زیادہ پر طبع ہوا ہے۔اُردو زبان میں یہ سب سے پہلی جامع و مکمل حدیث شریف ہے۔اس کا حال خود قطب الدین صاحب نے دیباچے میں لکھا ہے:-

''بعد اس کے مسکین، محمد قطب الدین شاہجہاں آبادی عرض کرتا ہے کہ کتاب مشکوٰۃ شریف علم حدیث میں عجب نافع کتاب ہے کہ ہر مضمون کی حدیثیں اس میں مندرج ہیں، اس کا ترجمہ عدیم النظیر میرے استاد بزرگوار مولانا مخدومنا، مکرمنا حضرت حاجی محمد اسحاق، نواسہ حضرت شیخ عبدالعزیز رحمہا اللہ تعالیٰ کے نے بیچ زبان ہندی کے بین السطور میں لکھا تھا، لیکن کاتبوں سے اس کی صحت میں فرق آنے لگا، مرضی جناب موصوف کی ایسی پائی کہ اگر یہ بطور شرح کے لکھا جاوے بہتر ہے، اس لئے اس ہیچمداں نے ترجمہ اس کا عبارت عربی سے علیحدہ کر کے لکھا، اور فائدے مختصر مناسب مقام کے، شروع مشکوٰۃ وغیرہ سے، مثل مرقاۃ شرح ملا علی قاری اور ترجمہ حضرت شیخ عبدالحق اور حاشیہ سید جمال الدین رحمہم اللہ کے، اور سوائے ان کے سے، زیادہ کر کے خدمت عالی میں عرض کی۔اور جناب ممدوح نے بھی کچھ فائدے لکھے تھے، تبرکاً اس میں درج کیے، اور نام اس کا 'مظاہر حق' رکھا گیا کہ اس میں تاریخ اس کی نکلتی ہے۔''

مولانا قطب الدین کے استاد بزرگوار کا ترجمہ اس سے بھی پہلے کا ہے، لیکن اب نایاب ہے، مولانا نے 'مظاہر حق' کے فائدوں میں ہر جگہ ان شروح و تراجم و حواشی کا حوالہ دے دیا ہے، جن سے استفادہ کیا ہے۔'مظاہر حق' میں احادیث کا ترجمہ تو ہر مقام پر ایک ہی اسلوب قدیم کا ہے، لیکن فائدے کہیں بالکل پرانی روش بے قاعدہ کے ساتھ ہیں، کہیں ترتیب الفاظ زیادہ صاف و باقاعدہ ہے۔ترجمہ و فائدہ کا نمونہ عربی کی حدیث کو چھوڑ کر

درج کیا جاتا ہے:-

''اور روایت ہے واثلہ بن اسقع سے کہا، فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے، جس شخص نے کہ طلب کیا علم، اور حاصل ہوا اس کو، ہوگا واسطے اس کے دوہرا ثواب، اور اگر نہ حاصل ہوا اس کو علم تو ہوگا واسطے اس کے ایک حصہ ثواب سے، روایت کی یہ دارمی نے۔ف دوہرا ثواب، ایک ثواب طلب کا اور مشقت کا کہ تحصیل علم میں کھینچی ہے، دوسرا ثواب حاصل ہونے علم کا، اور پڑھانے کا اوروں کو، یا ثواب عمل کا کہ علم پر کیا ہے، اور دوسرے کو ایک ثواب مشقت ہی کا ہوگا۔ ہر تقدیر طلب علم میں رہنا چاہیے۔ اگر حاصل ہوا نور علی نور، والّا طلب علم میں مرنا بھی سعادت ہے۔ بیت

گرچہ نتواں بدوست رہ بُردن ۔۔۔ شرط یاریست در طلب مُردن

مفتی صدر الدین آزردہ: والد کا نام مولوی لطف اللہ کشمیری، مفتی صاحب دہلی میں ۱۷۹۸ء ﴿۱۲۰۴ھ﴾ میں پیدا ہوئے۔ مولانا شاہ عبد العزیز، مولانا شاہ عبد القادر، مولانا محمد اسحاق، مولانا فضل امام خیر آبادی، مولانا فضل حق خیر آبادی جیسے مشاہیر علما سے علوم عقلیہ اور نقلیہ کی تحصیل کی۔ غدر سے پہلے انگریزی حکومت کی طرف سے دہلی میں صدر الصدور اور مفتی تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں ان پر جہاد کے فتوے کا الزام لگایا گیا، گرفتاری اور جائداد کی ضبطی عمل میں آئی۔ لیکن چند روز بعد رہا کر دئے گئے، اور جائداد کا بھی ایک حصہ واپس دے دیا گیا۔ تعلیم و تدریس کا اس قدر شوق تھا کہ ''صدر الصدور'' ہونے کی حالت میں بھی طالب علموں کو پڑھایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب کے شاگردوں میں نواب یوسف علی خاں، والیِ ریاست رام پور، سر سیّد احمد خاں، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی بھی شامل ہیں۔ عربی و فارسی کی چند تالیفات اور فتاویٰ ان کی یادگار ہیں۔ شاعری کا بھی ذوق تھا، عربی فارسی، اُردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آزردہ تخلص تھا۔ اُردو میں شاہ نصیر، میر ممنون اور میاں مجرم اکبر آبادی سے مشورہ کیا ہے۔ اُردو کے شاعروں کا ایک تذکرہ فارسی میں مرتب کیا تھا، لیکن اب نایاب ہے۔ ۱۸۶۸ء ﴿۱۲۸۵ھ﴾ میں انتقال کیا۔ مرزا غالب، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، امام بخش صہبائی سے مفتی صاحب کے خاص

تعلقات تھے۔ اوران صاحبوں سے اُردو میں خط وکتابت رکھتے تھے۔ اُردو کی یہی تحریریں مفتی صاحب کی یادگار ہیں۔ ایک خط کی چند سطریں نمونہ وتبرک کے طور پر درج کی جاتی ہیں، جو "یو۔ پی میں اُردو" سے ماخوذ ہیں:-

نامۂ آزردہ بنام نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

"شکر ہے اس پروردگارِ عالم کا جس نے مجھ کوایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اس میں غرقاب تھا، نکالا۔ کیسے علائق میں جکڑ بند تھا کہ نکلنا اس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا۔ مقدمات اصلی کا فیصل کرنا منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا، رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات دورہ میں فتویٰ دینا، کمیٹیوں میں حاضر ہونا، طلباء مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا، احکام اخیر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزارہا کاغذوں پر دستخط کرنا، پھر گھر میں آکر طالب علموں کو پڑھانا، اور اپنے اطراف و جوانب کے سوالات شرعی کا جواب لکھنا، وہابیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حَکَم ہونا، مجالس شادی و غمی اور اعراض میں جانا، شعروشاعری کی صحبت کو گرم رکھنا، باغات کی سیر کو اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا......"

مفتی سعد اللہ رامپوری: خلف رشید مولوی محمد نظام الدین مرادآبادی۔ اصلی وطن مرادآباد ہے۔ وہیں ۱۸۰۴ء ﴿۱۲۱۹ھ﴾ میں پیدا ہوئے۔ علمائے عصر سے تحصیل علوم کی جن میں مفتی صدرالدین آزردہ بھی ہیں۔ دہلی میں تعلیم حاصل کر کے لکھنؤ گئے، وہاں تکمیل کر کے مدرسہ شاہی میں مدرس رہے۔ الحاق اودھ (۱۸۵۶ء ﴿۱۲۷۲ھ﴾) تک وہیں رہے۔ اس کے بعد رامپور چلے گئے۔ نواب رامپور یوسف علی خاں ناظم اور منشی امیر احمد مینائی بھی ان کے شاگرد ہیں۔ ۱۸۷۶ء ﴿۱۲۹۲ھ﴾ میں انتقال کیا۔ امیر مینائی اپنی تصنیف 'انتخاب یادگار' میں مفتی سعد اللہ کے حالات میں لکھتے ہیں:- "جامعیت فضل و کمال میں مشہور آفاق، علم معقول ومنقول میں طاق، طبیعت ہمہ گیر، فکر وقاد، ہندوستان میں ہزاروں کے استاد، مولوی صاحب کی بہت سی تصنیفات ہیں، مطوّل و مختصر اٹھائیس تالیفات ہیں، ان کتابوں میں بعض ناتمام ہیں، کچھ چھپ بھی گئی ہیں۔ مولوی صاحب

برسوں دہلی اور لکھنؤ میں رہے۔ ایک مدت سے اس دار الریاست (رامپور) میں مکان بنوا لیا ہے، اہل وعیال سب یہیں ہیں اب یہی مسکن ہے۔ مراد آباد سے کچھ علاقہ نہیں رہا یہی وطن ہے۔ سرکار فیض آثار (نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور) کی قدردانی سے باعزاز و اکرام منصب حکومت مرافعہ عدالتین پر مامور ہیں۔ نظم ونثر عربی میں بھی دور دور مشہور ہیں کبھی کبھی شعر فارسی کی طرف بھی توجہ فرماتے ہیں۔" مفتی سعد اللہ آشفتہ تخلص کرتے تھے۔

مفتی سعد اللہ صاحب نے بعض عربی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ 'فقہ اکبر' کا اُردو ترجمہ ۱۸۴۰ء (۱۲۵۵ھ) میں کیا، اس کا نمونہ یہ ہے:-

"یہ کتاب ہے اصل توحید اور اعتقاد صحیح کے بیان میں، واجب ہے ہر مسلمان پر کہ کہے صدق دل سے، یقین لایا میں اللہ پر اور اس کے سب فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر، اور جلا اٹھانے پر پیچھے مرنے کے، اور خیر وشر کی تقدیر پر کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہے، اور حساب ہونا اور تلنا اعمال کا قیامت میں، اور بہشت اور دوزخ سب حق ہے، اور اللہ تعالیٰ ایک ہے، عدد سے نہیں، پر اس راہ سے کہ اس کا کوئی ساجھی نہیں۔"

عباس بن ناصر علی المؤرخ: اٹھارویں صدی میں زمانۂ زیر تحریر (انیسویں صدی کے درمیان) تک مذہبی کتابیں، فقہ اسلام، عقائد اسلام وغیرہ ضروریات اسلامی کے متعلق کثرت سے لکھی گئیں، جیسا کہ مختصر فہرست مندرجہ صفحات ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴ سے معلوم ہوگا۔ مولوی عباس نے بھی عام مسلمانوں کے فائدے کے لیے ایک رسالہ 'صبح کا ستارہ' لکھا۔ اس کے متعلق خود مصنف آغاز کتاب میں لکھتے ہیں:-

"بعد ازاں عباس بن ناصر علی المؤرخ بن فضل اللہ العلامہ الجاجموی غفر اللہ لہم کہتا ہے کہ سن بارہ سو انچاس ہجری میں جب میرے بھائی قاسم علی نے کہ نہایت سخی وشجاع ومجاہد تھا اور میری والدہ نے انتقال کیا، میں نے کتاب 'دقائق الاخبار' کو کہ حجۃ الاسلام ابوحامد محمد بن محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ نے موت کے احوال میں تصنیف کی تھی، مغلق عربی سے سلیس اُردو میں ترجمہ کیا، تا فائدہ اس کا عام ہوجائے، اور ثواب

اس کا میں نے ان دونوں کی روح کو بخشا.......... اور اصل کتاب میں میں نے کچھ کمی وبیشی نہیں کی مگر بعض جگہوں میں بضرورت یا بالقصد اختصار۔ اور نام اس ترجمے کا 'صبح کا ستارہ' ہے۔''

مترجم جاجموٴ (آگرہ) کے رہنے والے تھے۔ یہ رسالہ ۱۸۲۲ء ﴿۱۲۴۹ھ﴾ میں مرتب ہوا، اور ۱۰ رشوال ۱۲۶۸ھ ﴿۱۸۵۲ء﴾ کو مطبع مصطفائی شہر کانپور محلہ پٹکا پور میں چھاپا گیا۔ اس میں موت اور بعد موت کا حال لکھا ہے۔ ہر بیان کو آیات واحادیث واقوال علماء واولیاء سے مدلل کیا ہے۔ ترجمہ دقائق الاخبار کے بعد مترجم نے اپنی طرف سے چند اختلافی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک مسئلہ بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

مسئلہ: حق تعالیٰ سے اس طرح دعا مانگنا کہ الٰہی بحرمت نبی یا ولی کے میری حاجت روا کر، روا ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے قواعد الایمان میں لکھا ہے کہ ''اگر بحرمت مصطفےٰ گوید، شاید، چہ در دعائے استفتاح الشہر الحرام والمشعر الحرام و قبر نبیک علیہ السلام ماثور و مروی ست۔'' اور حصن حصین میں صحیح بخاری وغیرہ سے منقول ہے کہ دعا میں توسّل بانبیاء و صلحا جائز ومستحب ہے۔ اور فتاویٰ سراجیہ میں ہے کہ ''دعا میں بحق فلاں کہنا ابوالفضل کرمانیؒ نے مکروہ لکھا ہے، اس واسطے کہ حق تعالیٰ پر کسی مخلوق کا حق نہیں۔ ولیکن روایت وآثار سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔'' انتہیٰ راقم عفا اللہ عنہ کہتا ہے کہ اگلے زمانے میں معتزلہ کا بہت غلبہ تھا۔ اس واسطے کرمانیؒ وغیرہ نے بحق کہنا مکروہ لکھا ہے۔ تا بخوبی ثابت ہو کہ اللہ تعالیٰ پر کچھ واجب نہیں اور کسی کا حق نہیں، وہ مالک ومختار ہے جو چاہے کرے۔ پس منع کرنا اس لفظ کا احتیاطاً تھا، والا اس کے جواز میں شبہ نہیں۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَ کَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اور شیخ عبدالحق دہلویؒ نے جذب القلوب الی دیار المحبوب میں لکھا ہے کہ جب حضرت علیؓ کی ماں نے وفات پائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَللّٰھم اغفر لھا بحق و بحق جمیع الانبیاء من قبل۔

امام بخش صہبائی: دہلی کے رہنے والے، فارسی کے بڑے عالم ومحقق تھے، فارسی کی بعض نہایت ادق کتب درسیہ 'سہ نثر ظہوری' وغیرہ کی شرحیں بڑی تحقیق کے ساتھ

فارسی میں لکھی ہیں۔ غدر سے پہلے دہلی کالج (۱) میں پروفیسر تھے۔ جہاں مولوی محمد حسین آزاد اور ماسٹر پیارے لال آشوب وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔ انھوں نے 'آثار الصنادید'

---

(۱) دہلی میں انگریزوں نے ہندوستانیوں کو مغربی علوم سکھانے کے لیے ایک اسکول کھولا تھا۔ پھر اس کو ترقی دے کر کالج کر دیا گیا۔ 'دہلی کالج' اور 'قدیم دہلی کالج' کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۸۲۷ء سے اس میں انگریزی زبان کی تعلیم بھی جاری کر دی گئی۔ یہ عجیب بات تھی کہ ہندوستانیوں کو انگریزوں کی زبان سے تو وحشت و نفرت تھی لیکن انگریزوں کے علوم و فنون سیکھنے کا بیحد شوق تھا۔ پھر بھی چار سال میں یعنی ۱۸۳۱ء میں انگریزی زبان پڑھنے والوں کی تعداد کالج میں تین سو سے کم نہ تھی۔ یہ کالج دہلی میں کشمیری دروازے کے قریب تھا۔ ریاضی، سائنس وغیرہ علوم کی تعلیم لکچروں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اس لیے کہ انگریزی کتابیں آسانی سے میسّر نہ آسکتی تھیں، اور علوم و فنون کے ترجمے اُردو میں ہوئے نہ تھے۔ طالب علموں سے کوئی فیس نہ لی جاتی تھی۔ بلکہ وظیفے دے دے کر شوق دلایا جاتا تھا۔ علوم کیمیا و طبیعات کے اسباق و تجربات آلات کے ذریعہ سے سکھائے جاتے تھے۔ سائنس کے تجربے اور مشاہدے ہندوستانیوں کے لیے عجیب حیرت و مسرّت کا باعث ہوتے تھے۔ اس کالج کا پرنسپل انگریز ہوتا تھا پروفیسر انگریز اور ہندوستانی دونوں قسم کے تھے مثلاً ماسٹر رام چندر، ماسٹر رام کشن، مولوی کریم الدین پانی پتی، مولوی امام بخش صہبائی۔ صہبائی کے زمانے میں ایک فرانسیسی ایم فیلیکس بوترو پرنسپل تھا۔ (اس کا نام صہبائی نے اپنے ترجمہ 'حدائق البلاغت' میں بوترس لکھا ہے۔ لیکن فرنچ زبان کے قاعدے سے 'س' کا تلفظ نہ ہوگا 'واو' پڑھا جائے گا)۔ اس فرنچ پرنسپل کی نگرانی میں ایک ادبی و علمی انجمن ۱۸۴۲ء میں ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے نام سے دہلی کالج میں قائم کی گئی۔ اس کے اصلی کار پرداز مولانا صہبائی اور ماسٹر رام چندر تھے۔ اس انجمن نے عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی زبانوں سے ترجمے کر کے ملک و زبان کی بڑی خدمت کی۔ پروفیسر رام چندر کی خدمات کا ذکر آئندہ آئے گا۔ پروفیسر رام کشن نے سر ولیم میکناٹن کی قانونی تالیف ''اصول ہندو شاستر'' کا انگریزی سے ترجمہ کیا، اصول حکومت، فن زراعت، فن طب، صرف و نحو زبان انگریزی وغیرہ کتابیں ترجمہ و تالیف کیں۔ مولوی کریم الدین پانی پتی بھی دہلی کالج میں پروفیسر تھے، انھوں نے عورتوں کے لیے چند دلچسپ و مفید کتابیں تصنیف کیں، فن عروض پر ایک کتاب لکھی، تاریخ ابو الفدا کا ترجمہ، شعرائے عرب کا تذکرہ، شعرائے اُردو کا تذکرہ (جو مسٹر فیلن کی شرکت میں مرتب کیا) قانون وراثت اسلامی پر ایک رسالہ، گلستان ہند (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کی تیاری میں سرسیّد کو بڑی مدد دی تھی۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا اس میں عمارتوں کے حالات صہبائی نے لکھے تھے۔ اسی لیے عبارت میں پرانا پن زیادہ تھا اور سرسیّد کے اسلوب تحریر کے خلاف تھا۔ شاہی قلعۂ معلّٰی سے بھی صہبائی کی رسم وراہ تھی۔ شاہی خاندان کے بعض افراد ان کے شاگرد تھے۔ شعروسخن میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء ﴿۱۲۷۳ھ﴾ کے سلسلے میں جن لوگوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ان میں صہبائی کا حصہ بھی کسی سے کم نہ رہا۔ یعنی قتل کیے گئے اور ان کا مکان کھود کر زمین کے برابر کردیا گیا۔ مفتی صدرالدین آزردہ نے کس درد سے کہا ہے:-

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

صہبائی نے دہلی کالج کی ملازمت کے زمانے میں ۱۸۴۲ء ﴿۱۲۵۸ھ﴾ میں منشی شمس الدین فقیر کی تصنیف 'حدائق البلاغت' (مصنفۂ ۱۷۵۵ء ﴿۱۱۶۸ھ﴾) کا اُردو ترجمہ مرتب کیا۔ لیکن صرف کہنے کو ترجمہ ہے، ورنہ اصل میں فنِ بلاغت کو اُردو میں منتقل کیا

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) (مجموعۂ لطائف) وغیرہ متعدد کتابیں مولوی کریم الدین کی یادگار ہیں۔ دہلی کالج کے بعض طالب علم بڑے مشہور و نام آور ہوئے، مثلاً ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال آشوب، مولوی ذکاء اللہ، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، مولوی شہامت علی وزیر اعظم ریاست اندور، ڈاکٹر مکند لال جو طب مغرب کے بڑے عالم و ماہر تھے۔ دہلی کالج کے یورپین پرنسپل بھی اُردو کے بڑے ماہر و سرپرست گزرے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر اسپرنگر، موسیو بوترو، مسٹر ٹیلر، اسپرنگر کی خدمات سے استفادہ آج تک ناگزیر ہے۔ آخر دہلی کالج ہنگامۂ غدر کی نذر ہوگیا۔ ۱۲ر مئی ۱۸۵۷ء کو کالج کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، اس کے کتب خانے کو نذر آتش کر دیا گیا، اور کالج کے پرنسپل مسٹر فرانسس ٹیلر کو قتل کر دیا گیا، مگر خوش قسمتی سے اس کالج کی آمدنی ایک وقف سے تھی، وہ وقف قائم رہا۔ چنانچہ شورش غدر فرو ہونے کے بعد دوسرا کالج چاندنی چوک میں دہلی انسٹی ٹیوٹ کے نام سے قائم کیا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کو مقبولیت حاصل ہوگئی اور چار سو پانسو طالب علم تعلیم پانے لگے۔ اس کالج کے ساتھ لائبریری بھی قائم ہوگئی اور ایک عجائب خانہ بھی کھولا گیا۔ اس کالج کے مقابلے میں پہلا کالج 'قدیم دہلی کالج' کہلاتا ہے۔

ہے۔ یہ اُردو میں اس فن کی پہلی مکمل و مستند کتاب ہے۔ صہبائی اپنے ترجمے کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

''نسخہ حدائق البلاغت، علم بیان اور بدیع اور عروض میں شمس الدین فقیر رحمۃ اللہ علیہ کے قلم بلاغت رقم کا ثمرہ ہے، اور اس کتاب کا اس فن کے استیعاب میں شہرہ ہے، صاحب والا مناقب، بلند مراتب حاکم دادور، داور دہش گستر، بورس صاحب بہادر دام اقبالہ نے کہ شہر سعادت بہر شاہجہاں آباد کے مدارس کے پرنسپل ہیں فقیر سراپا تقصیر، خاکپائے علما، گدائے سرکوچہ فضلا، سرگشتۂ وادیِ ناتوانائی، امام بخش صہبائی کو کہ طلبۂ فارسی کی تعلیم کے لیے مدرسِ اول کے عہدے پر مشرف ہے، ارشاد کیا گیا کہ اگر یہ نسخہ فارسی زبان سے اُردو میں ترجمہ کیا جاوے اور اس میں عربی اور فارسی مثالوں کی جگہ اشعار اُردو، زباندانانِ اردو کے مندرج ہوں تو ان لوگوں کے واسطے کہ اُردو اشعار سے ذوق رکھتے ہیں، اور اس قدر استعداد نہیں رکھتے کہ عربی اور فارسی کتابوں سے ان مطالب عالیہ کو سمجھ لیں، بہت مفید ہوگا۔ اس واسطے اس خاکسار نے بموجب اس کے کہ المامور معذور باوجود کمی استعداد کے، تقدیم امر میں سعی کر کے اس رسالے کو ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء مرتب کیا۔ لیکن مستعدان انصاف پسند پر مطالعہ کے وقت ظاہر ہوگا کہ اس کم استعداد نے علمی مسائل کے لکھنے اور امثلۂ اُردو کے فراہم کرنے میں کس قدر سعی کی ہے۔ اور جو کہ یہ مقصود تھا کہ علم بیان اور بدیع اور عروض سے طالبین کو فائدہ تام حاصل ہو اس واسطے بہت مسائل اصل کتاب سے زیادہ کر دیے تا کہ از بسکہ لفظ بلفظ کے ترجمے میں مطلب کی توضیح خوب نہیں ہوتی، اس لیے ترجمے میں اس امر کا مقید نہیں ہوا۔''

ترجمہ 'حدائق البلاغت' کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

صنعت تلمیح۔ یہ اس طرح پر ہے کہ کلام مشعر ہو کسی واقعۂ مشہورہ پر، یا کسی ایسی چیز پر اشارہ کیا جائے کہ کتب مستعملہ میں مذکور ہو، جیسے شعر سودا کا۔

دکھلائیے (۱) جا کر تو تجھے مصر کا بازار　　　　پر واں کوئی خواہاں نہیں اس جنس گراں کا

اس شعر میں اشارہ ہے طرف قصہ حضرت یوسفؑ کے کہ وہ مشہور ہے، اور یہ شعر فقیر محمد خاں گویا کا۔

---

(۱) مرزا غالب کو یہ شعر بہت پسند تھا۔ لیکن وہ اس طرح پڑھا کرتے تھے:۔

دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار　　　　لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنس گراں کا

منھ دکھاتا تو کہاں باتیں تھیں اس کی مجھ تک　　　لن ترانی کی بھی آئی نہ صدا میرے بعد

اس شعر میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کی طرف اشارہ ہے، حق یہ ہے کہ جو لوگ کہ چاشنی، انصاف اور مذاق شعر سے بہرہ رکھتے ہیں ان کے نزدیک یہ شعر جواب نہیں رکھتا۔ اور جیسے یہ شعر۔

خزاں میں اس لیے لوٹے ہے خاک پر غنچہ　　　کہ یہ علاج ہے اس کا جسے ہو استقا

اس شعر میں اشارہ ہے طرف مسئلہ طب کے۔"

یہ ترجمہ پہلی مرتبہ 'حدائق البلاغت' کے حاشیہ پر دسمبر ۱۸۸۷ء میں مطبع نولکشور واقع شہر کانپور سے شائع ہوا۔

مولوی مسیح الزماں　　خلف مولوی نور محمد۔ ۱۸۴۸ء میں تعلیم مکاتب کے لیے ایک کتاب 'معلم الحساب' مُلقب بہ مکتب نامہ لکھی، جس میں لڑکوں کے لیے نصائح، حکایات، انشائے رقعات، اور قواعد حساب درج کیے۔ اس میں ایک جنتری بارہ سو برس کی درج ہے۔ کتاب کے صفحہ پر اوپر انگریزی مہینوں کے نام اور نیچے ایک مہینے کی تاریخیں خانوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ بیچ میں جو جگہ خالی ہے اس میں کاغذ کا گول ٹکڑا لگا ہوا ہے جس پر ایک سو بارہ سن عیسوی لکھے ہوئے ہیں۔ اوپر کے کاغذ کو کسی سنہ کے کسی مہینے کے سامنے لانے سے نیچے اسی مہینے کی تاریخیں نکل آتی ہیں۔ اس وضع کی جنتریاں ہمارے زمانے میں بہت عام ہیں لیکن آج سے تقریباً ایک صدی پہلے کی کتاب میں بہت عجیب و دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔

'مکتب نامہ' دوسری بار ۱۸۵۹ء ﴿۱۲۷۵ھ﴾ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ بطور نمونہ ایک قاعدہ حساب درج کیا جاتا ہے:-

"قاعدہ۔ ہر اپریل کے مہینے میں جو سنہ فصلی ہووے جب اس پر ساڑھے چھ سو برس اور بڑھائے جاویں تو 'سمبت' بن جاوے گا۔ جیسے اپریل ۱۸۵۹ء میں سنہ ۱۲۶۶ فصلی ہیں اس پر ساڑھے چھ سو اور بڑھائے، اونیس سو سولہ (۱۹۱۶) ہوئے، یہی سال 'سمبت' ہے۔"

منشی عبدالکریم: لکھنؤ وطن تھا، کلکتہ میں گورنر جنرل کے دفتر فارسی کے میر منشی تھے۔ ان کو قصے کہانی کی کتابوں میں 'الف لیلہ' بہت پسند تھی۔ ملازمت سے پنشن لینے کے بعد 'الف لیلہ' کے انگریزی ترجمے سے ۱۸۴۲ء ﴿۱۲۵۸ھ﴾ میں اُردو ترجمہ مرتب کیا، اور ۱۸۴۷ء ﴿۱۲۶۳ھ﴾ میں چھپوایا۔ پھر ۱۸۷۸ء ﴿۱۲۹۵ھ﴾ میں باتصویر شائع کیا۔ اس کا حال دیباچے میں لکھا ہے۔ اسی کا اقتباس بطور نمونہ 'سیر المصنفین' سے اخذ کیا جاتا ہے۔

''وہ کتاب سوادوسورات کی کہ جس کو شیخ احمد عرب یمنی شروانی نے واسطے پڑھانے صاحبان عالی شان کالج کلکتہ کے بکمال تلاش عرب سے منگوا کر چھپوایا تھا، میسر نہ آئی۔ آخر کار جب راقم بسبب شدّت امراض کے بعد تقرر پنشن بیت السلطنت لکھنؤ میں، کہ مولد اپنا ہے، خانہ نشیں ہوا، وہ نسخہ تمام وکمال انگریزی زبان میں مع تصویرات بہم پہنچا۔ راقم نے اس کو اول سے آخر تک بسبب استعداد سمجھنے انگریزی کے دیکھا، از بسکہ قصے دلچسپ تھے۔ دو برس تک اس کا ترجمہ کرتا رہا، اور ۱۲۵۸ھ میں تمام کیا۔ شہر میں شہرہ ہوا اکثر لوگوں نے منگوا کر نقل اس کی لی۔ کمتر مسودہ راقم کے گھر رہا، دست بدست پھرا کیا۔ چنانچہ پانچ سات جز تلف ہوئے۔ راقم کو اس کے لکھنے میں دوبارہ تکلیف کرنی پڑی، اور طلب کرنے احباب سے نہایت تنگ آیا، جس کو نہ دیتا وہ خفا ہوتا، اور دینے میں اپنی کتاب سے ہاتھ دھوتا۔ آخر کو خیال ہوا کہ یہ کتاب چھپ جائے تاسب کے ہاتھ آئے۔ اور راقم بھی ایک ایک نسخہ اس کا عزیزوں اور دوستوں کو بانٹے۔ فقط اس واسطے راقم نے جس طرح ہوسکا بیچ عہد معدلت مہد بادشاہ وجم جاہ، خاقان زماں، ابوالمظفر مصلح الدین محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی ملک اودھ خلّد اللہ ملکہٗ اور وزارت وزیر اعظم، نواب امین الدولہ عماد الملک، امداد حسین خاں بہادر ذوالفقار جنگ دام اقبالہ کے چھپوایا اور سنہ ہجری اس کتاب کے ۱۲۶۳ اور عیسوی ۱۸۴۷ ہیں۔''

منشی عبدالکریم کی عبارت سادہ ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے، لیکن ترتیب الفاظ کی بے قاعدگی وہی ہے جو ان سے پہلے ہر جگہ ہے۔

ماسٹر رام چندر: دہلی کالج میں پروفیسر تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد ان کے شاگرد ہیں۔ گارساں دتاسی دسمبر ۱۸۵۲ء کے خطبے میں ماسٹر رام چندر

کے بارے میں لکھتا ہے کہ ''ان کے عیسائی مذہب قبول کر لینے پر اس سال کے ماہ جولائی میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی، کہا جاتا ہے کہ دہلی کے یہ پہلے ہندو ہیں جنھوں نے یہ مذہب اختیار کیا۔ اس پنڈت کی عمر اس وقت ۳۵ سال کی ہے، یہ شخص دہلی کالج کا طالب علم تھا، اور اس کالج میں اس نے انگریزی، ہندوستانی اور فارسی زبانوں کو حاصل کیا تھا، لیکن علم ریاضی کی طرف اس کا خاص رجحان تھا، وہ متعدد مفید کتابوں کا مصنف اور مترجم ہے، جن میں سے ایک 'الجبرا' ہے ایک کتاب علم مثلث پر ہے جس میں مخروطات بھی شامل ہیں اور ایک کتاب علم ہندسہ پر ہے۔ ایک کتاب علم الحساب پر لکھی ہے، اور ان کے علاوہ کئی کتابیں ادب پر ہیں۔ یہ پروفیسر دو رسالوں کے ایڈیٹر بھی ہیں، ان میں سے ایک خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جس کا نام 'محبوب ہند' ہے۔ یہ ایک ماہانہ پرچہ ہے جس میں اہم مسائل و معلومات وقت پر، اہلِ ہند کی تعلیمی حالت پر، اور عام ادب یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں۔'' (۱)

اس کے علاوہ ماسٹر رام چندر نے 'عجائب روزگار' تصنیف کی جو دہلی میں ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ ایک کتاب 'اصول علم ہیئت' لکھی جو ۱۸۴۸ء میں چھپی، ایک تالیف 'تذکرۃ الکاملین' کے نام سے مرتب کی جو ۱۸۴۹ء میں دہلی سے نکلی، اس کے بعد تین بار مطبع نولکشور میں چھپی۔ ماسٹر صاحب ملازمت انگریزی کے بعد ریاست پٹیالہ میں ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیم ہو گئے تھے۔ اور 'تذکرۃ الکاملین' ریاست کے نصاب تعلیم میں شامل ہو گئی تھی۔

'تذکرۃ الکاملین' میں یونان، روم قدیم، یورپ، ایران، ہندوستان کے مشاہیر علم و فضل کے مختصر حالات درج کیے ہیں، نمونے کے طور پر کتاب کے سب سے آخری شخص کے حال کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:-

''ذکر مہندس بھاسکر کا۔ یہ شخص بہت بڑا عقلمند اور مہندس ہند میں گزرا ہے اس کے برابر ذہین اور عاقل اور سچے علم کی پیروی کرنے والا کوئی اور شخص قوم میں نہیں ہوا ہے۔ یہ بزرگ بمقام شہر بنارس میں بیچ ۱۱۵۰ء کے پیدا ہوا تھا۔ اس شخص نے ہمارے شاستر کی غلطیوں کو درست کیا۔ لیکن اکثر برہمن اس

---

(۱) منقول از خطبات گارسن دتاسی، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو۔

کے قول پر عمل نہیں کرتے۔ اگر چہ اس کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں۔ لیکن جو بڑے بڑے فاضل اور عاقل ہیں، وہ اس کے کلام کو کلام بُرا ان پر ترجیح دیتے ہیں۔ کسی شاستر میں لکھا ہے کہ زمین مثل دائرے کے ہے، اور کہیں یہ لکھا ہے کہ وہ مثل مثلث کے ہے۔ بھاسکر نے ان لغو باتوں کو رد کیا، اور لکھا کہ زمین کی شکل گروی ہے۔ یہاں سے اس کے ذہن کو دیکھنا چاہیے۔ شاستر میں لکھا ہے کہ زمین سانپ کے پھن اور کچھوے اور آٹھ ہاتھیوں پر سہارا پائے ہوئے ہے۔ بھاسکر نے کہا کہ اگر چہ یہ شاستر میں لکھا ہے، لیکن محض غلط ہے۔ اس نے فرمایا کہ زمین ہوا میں ہمارے معبود حقیقی کے ہاتھ میں معلق ہے۔"

آغا امانت لکھنوی: سیّد آغا حسین نام، امانت تخلص، ۱۸۱۶ء (۱۲۳۱ھ) میں پیدا ہوئے، شاعری مرثیہ گوئی سے شروع کی۔ اس زمانے میں میاں دلگیر لکھنؤ میں مرثیے کے بڑے استاد تھے، ان سے اصلاح لی۔ پھر مرثیہ چھوڑ کر غزل گوئی شروع کی۔ بیس برس کی عمر میں کسی بیماری سے زبان بند ہوگئی اور دس برس تک گونگے رہے۔ زبان کا کام تحریر سے لیتے تھے۔ اسی حالت میں کربلا گئے۔ وہاں زبان کھل گئی لیکن لکنت باقی رہی۔ امانت شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اپنے زمانے میں استاد مانے جاتے تھے۔ رشک، بحر، برق، گویا، جیسے باکمالوں کے ہم عصر تھے۔ لیکن تمام کلام ضلع جگت، ایہام، مرعاۃ النظیر سے معمور ہے۔ امانت کا منظوم ڈراما یا ناٹک 'اندر سبھا' نہایت مشہور و مقبول ہوا۔ اُردو میں اپنی نوع کی پہلی کتاب ہے۔ دیوان غزلیات اور واسوخت بھی امانت کی یادگار ہیں۔ ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا۔

امانت نے اپنی منظوم 'اندر سبھا' کی توضیح و تشریح نثر میں شرح اندر سبھا کے نام سے لکھی تھی، لیکن وہ گمنام تھی۔ اس کو سیّد مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی نے رسالہ اُردو میں شائع کر دیا ہے۔ اس کی عبارت اس زمانے کی روش کے مطابق مقفّی ہے لیکن الجھاؤ اور گنجلک نہیں۔ اکثر صاف و رواں ہے۔ اس میں سے 'سبب تالیف اندر سبھا' کا اقتباس بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے:-

"ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی یگانۂ ازلی، رفیق شفیق مونس و غمخوار، قدیمی جان نثار، شاگرد

اول، موزوں طبیعت، تخلص عبادت، عاشق کلام امانت، انھوں نے از راہ محبت کہا کہ بیکار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے، ایسا کوئی جلسہ (یعنی ناٹک) کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہئے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہووے، اور خلق میں شہرت ہووے، آخرالامر موافق ان کی فرمائش کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا، دمبدم شوق زیادہ ہوا، چونکہ یہ جلسہ کہنا سب کو مرغوب تھا، مگر اپنے نزدیک معیوب تھا، اس لحاظ سے اپنا تخلص بدل کر اس میں استاد تخلص کیا، لیکن لوگوں نے غزلوں کے سبب سے بندے کا کلام دریافت کرلیا۔ غرض کہ چودھویں تاریخ شوال کی ۱۲۶۸ھ میں 'اندر سبھا' اس جلسے کا نام رکھ کر بجائے چار باب، چار پریاں قرار دے کر شروع کیا۔ شہرت گھر گھر ہوئی اہل محلّہ کو خبر ہوئی۔ دو شخص اس جلسے کی تیاری پر آمادہ ہوئے، ہجوم حد سے زیادہ ہوئے، رفتہ رفتہ بعد ہزاراں ہزار شور و فساد اور حجت و تکرار کے ڈیڑھ برس میں جلسہ تیار ہوا مگر اپنے نزدیک بیکار ہوا، کہ کس ریاض سے ایک درخت لگایا، آخر کو اس سے رنج کا پھل پایا، خیر جو ہوا سو ہوا اپنا تو یہ قول ہے نقدیرے گہ ہے کسی سے گلہ نہیں۔"

منشی چرنجی لال: الٰہ آباد کے رہنے والے تھے، فلسفہ اور ریاضی کا بہت شوق تھا۔ ایک کتاب 'مصباح المساحت' ۱۸۵۴ء میں لکھی۔ اس کے بعد مسٹر ہنری کارٹر کی تحریک اور مسٹر چارلس فنک کی اعانت سے علم نفسیات کی ایک کتاب انگریزی سے ترجمہ کی، اور اس کا نام 'تعلیم النفس' رکھا۔ یہ کتاب گورنمنٹ پریس میں ۱۸۵۹ء میں طبع ہوئی۔ اس کا ایک فقرہ یہ ہے:-

"سنین ماضیہ میں اکثر اساتذہ بسبب اس کے کہ ان کو بہ تعمق و تامل سیر کتب کی عادت تھی، نامور اور مشتہر ہو گئے ہیں، اور کبھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی بلا حصول اس عادت کے فضیلت پیدا کرے۔"

مولوی ضیاء الدین: خلف شیخ غلام حسن خاں جاگیردار بسی دارا پور۔ وطن سے دہلی آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ مدرسہ تعلیم المعلمین (نارمل اسکول) میں مدرس مقرر ہوئے۔ علم طبیعیات (فزکس) سے خاص لگاؤ تھا، میجر فلر ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی فرمائش سے "اصول علم طبیعیات" پر ایک کتاب 'مخزن طبیعیات' دو حصوں میں ترتیب دی، جو لاہور میں

۱۸۶۵ء ﴿۱۲۸۱ھ﴾ میں طبع ہوئی۔ حصہ دوم کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

''ارباب بصیرت پر ظاہر ہو کہ جن اجسام میں کشش اتصال اس قدر کم ہے کہ ان کے اجزا بغیر محسوس ہونے مزاحمت کے متحرک ہو سکتے ہیں، ان کو سیال کہتے ہیں۔ اجسام سخت اور اجسام سیال میں بڑا فرق یہی ہے کہ اجسام سخت کے اجزا کو کشش اتصال متصل اور پیوستہ رکھتی ہے۔''

مرزا غالبؔ دہلوی: اب تک جن مصنفوں کے حالات لکھے گئے ہیں ان میں مشکل سے کوئی ایسا ہوگا جس کے مفصل حالات اور مکمل سوانح حیات علیٰحدہ یا تذکروں اور تاریخوں سے ملتے ہوں۔ کتنے ایسے ہیں جن کے سنین ولادت و وفات، مولد و مسکن، معمولی احوالِ زندگی بھی نامعلوم ہیں، اس لیے ہم بھی زیادہ تفصیل نہ دے سکے۔ مرزا غالبؔ پہلے شخص ہیں جن کی ساری زندگی کے پورے حالات ہمارے سامنے ہیں اور اس صفت میں شاید وہ اول و آخر شخص ہیں کہ ان کی تصنیف اور ان کی سیرت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اگر چہ انھوں نے اپنی مسلسل سوانح عمری نہیں لکھی، لیکن ان کی تمام حیات نہ صرف ان کی تحریروں میں جابجا مذکور ہے بلکہ ان کے اسلوب و موضوع نگارش پر اثر انداز بھی ہے۔ غالبؔ کی اس خصوصیت اور ان کے شعر و ادب کی انفرادیت کے سبب سے، ان کی ترتیب سوانح، تجزیۂ سیرت، تبصرہ کلام، شرح دیوان کے متعلق کثرت سے کتابیں لکھی گئیں۔ سب سے پہلے مولانا حالیؔ نے شاگردی کا حق ادا کیا، اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا، مولانا کی 'یادگار غالب' کے بعد مسٹر غلام رسول مہرؔ کی کتاب 'غالبؔ' مسٹر محمد اکرام کا 'غالب نامہ' منشی امتیاز علی عرشی کی تالیف 'مکاتیب غالبؔ' ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا 'مقدمۂ کلیات غالبؔ' ڈاکٹر عبداللطیف کی کتاب 'غالبؔ' مرزا محمد عسکری کی 'ادبی خطوط غالبؔ' اور مختلف مصنفوں کی شروح دیوانِ غالب، غالبؔ کو سمجھنے کے لیے، اور موافق و مخالف دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ منشی مہیش پرشاد ایم۔ اے۔ پروفیسر ہندو یونیورسٹی بنارس خطوط غالبؔ کے متعلق برسوں تک مستقل ریسرچ (چھان بین) کرتے رہے۔ غالبؔ کے متعلق متفرق مضامین کا، جو مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے

ہیں کوئی حساب وشمار نہیں ہوسکتا۔

بعض کج فہم وتنگ نظر لوگوں کو شکایت ہے کہ غالبؔ کے ساتھ ضرورت سے زیادہ اعتنا کیا گیا ہے۔ لیکن اعتراض کرنے والے یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اُردو زندہ زبان ہے، اور یہ اس کی زندگی کا ثبوت بھی ہے اور اس کی قوت کا سامان بھی۔ اہلِ یورپ نے اپنے مصنف وشعراء میں سے ایک ایک کے تذکرے اور تبصرے سے ایک ایک کیا کئی کئی الماریاں بھر دی ہیں۔ یہاں اگر مرزا غالبؔ، میر انیسؔ ڈاکٹر اقبالؔ وغیرہ پر ایک ایک دو دو درجن کتابیں لکھ دی گئیں تو ابھی الماری کا ایک خانہ بھی پُر نہیں ہوا۔

غالبؔ کا نام وخطاب اسد اللہ خاں نام، مرزا نوشہ عرف، نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب شاہی، پہلے اسدؔ تخلص تھا پھر حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے لقب اسد اللہ الغالب کی مناسبت سے غالبؔ تخلص کرلیا۔

نسل ونسب: غالبؔ کے آباواجداد توران کے ایک تُرک تھے، سلسلۂ نسب فریدوں بادشاہ تک پہنچتا ہے۔ غالبؔ کو اپنے نسب پر بڑا فخر تھا، کہتے ہیں:-

غالبؔ از خاک پاک تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم

ایبکیم از جماعت اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم

باپ دادا: غالبؔ کے دادا شاہ عالم بادشاہ دہلی (۱۷۵۹ء ﴿۱۱۷۳ھ﴾ تا ۱۸۰۶ء ﴿۱۲۲۱ھ﴾) کے عہد میں سمرقند سے ہندوستان آئے، بادشاہ کی طرف سے منصب ملا اور پہاسو کا پرگنہ ذات اور رسالہ کی تنخواہ میں عطا ہوا۔ غالبؔ کے والد عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا کی شادی آگرہ کے ایک رئیس خواجہ غلام حسین کی لڑکی سے ہوئی جو میرٹھ میں فوج کے کمیدان (نائب کپتان) تھے۔ عبداللہ بیگ خاں کا قیام اپنی سسرال آگرہ میں رہتا تھا، لیکن مختلف ملازمتیں بھی کیں۔ اول نواب آصف الدولہ وزیر اودھ کے ہاں ملازم ہوئے، پھر حیدر آباد میں نواب نظام علی خاں کی سرکار میں تین سو سوار کے سردار رہے، وہاں سے ترک خدمت کرکے آگرہ آگئے۔ آگرہ سے الور جا کر ریاست کے متوسل

ہو گئے، وہاں ایک لڑائی میں قتل ہوئے۔

چچا: غالبؔ کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں بہادر کی شادی نواب فخر الدولہ والی لوہارو کے خاندان میں ہوئی۔ نصر اللہ بیگ پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبہ دار رہے۔ پھر انگریزی فوج میں چار سو سواروں کے رسالدار ہو گئے، اور جنرل لارڈ لیک کے ساتھ بڑی فوجی خدمات ادا کیں، جس کے صلے میں نواح آگرہ کا پرگنہ ''سونک سونسا'' بقید عین حیات جاگیر میں ملا۔ ۱۸۰۶ء ﴿۱۲۲۱ھ﴾ میں نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا۔ سرکار نے جاگیر واپس لے لی اور ان کے وارثوں کے لیے سات سو روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر دی۔

ولادت و تربیت: غالب ۸؍رجب ۱۲۱۲ھ ﴿۱۷۹۷ء﴾ کو آگرہ میں پیدا ہوئے، ان کا مکان آگرہ میں اس جگہ تھا جہاں اب ''پیپل منڈی'' کی سڑک پر ''کالا محل'' واقع ہے۔ غالب پانچ برس کے تھے جو والد کا انتقال ہو گیا، چچا نصر اللہ بیگ خاں نے پرورش کی، لیکن ابھی آٹھ برس کی عمر تھی کہ چچا نے بھی انتقال کیا۔ اس کے بعد غالب کی تربیت ان کی ننھیال میں ہوئی اور لڑکپن آگرہ میں گذرا۔ ایک بزرگ استاد شیخ معظم سے تعلیم حاصل کی، آگرہ کے مشہور بے نظیر شاعر میاں نظیر اکبر آبادی سے بھی کچھ پڑھا۔

شادی: غالبؔ کی عمر ۱۳ برس کی تھی کہ ۷؍رجب ۱۲۲۵ھ ﴿۱۸۱۰ء﴾ کو ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی لڑکی سے ہوئی، جو نواب احمد بخش خاں والی فیروز پور جھرکہ و جاگیر دار لوہارو کے حقیقی بھائی تھے۔ غالب کے چچا کی شادی بھی اسی خاندان میں ہوئی تھی، اسی وسیلے سے غالب کا رشتہ ہوا(۱)۔ نواب الٰہی بخش خاں دہلی میں رہتے تھے۔ شادی کے بعد غالبؔ کی آمد و رفت دہلی میں شروع ہو گئی۔

---

(۱) نواب احمد بخش خاں نے اپنی زندگی میں اپنے لڑکے نواب شمس الدین احمد خاں کو والی فیروز پور بنا دیا تھا، اور خود گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ یہ نواب شمس الدین احمد خاں، نواب مرزا داغؔ دہلوی کے والد تھے۔ اس حساب سے غالبؔ کا داغؔ سے سسرالی رشتہ تھا۔ نواب شمس الدین احمد خاں ۱۸۳۵ء میں قتل ہوئے، اُن کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں والی فیروز پور و لوہارو ہوئے۔ ان سے غالبؔ کے خاص تعلقات اُنس و محبت تھے۔

تحصیل فارسی اسی عرصے میں ایک شخص ایرانی ملاّ عبدالصمد ۱۸۱۱ء (۱۲۲۶ھ) میں (حسب تحریر "قاطع برہان" مصنفہ غالبؔ) آگرہ آیا اور غالب کے گھر دو برس رہا۔ یہ شخص "زرتشتی" سے مسلمان ہوا تھا۔ غالبؔ نے اس سے فارسی زبان سیکھی۔ اس شخص ایرانی اور اس سے تحصیل فارسی کے متعلق خود غالبؔ کے بیانات میں عجیب و دلچسپ اختلاف یا ظرافت ہے۔ "اردوئے معلّیٰ" کے متعدد خطوط کے علاوہ ایک مکتوب ۷/اکتوبر ۱۸۶۶ء میں نواب کلب علی خاں رئیس رامپور کو لکھتے ہیں:-

> "بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجکو ملے، بارے مراد بر آئی، اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔" (از مکاتیب غالبؔ صفحہ ۸۲)

اس کے برعکس ایک خط میں فرماتے ہیں:-

> "مجھ کو مبدء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں۔ عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے، چونکہ لوگ مجکو بے استادہ کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کے لیے ایک فرضی استاد گھڑ لیا۔"

ان دونوں بیانوں میں مطابقت نہیں ہو سکتی بجز اس کے کہ دوسرا بیان بطور ظرافت ہے، یا یہ بات ثابت کرنے کے لیے ہے کہ غالبؔ زبان و ادب فارسی میں کسی کے شاگرد نہ تھے، اور یہی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ پہلا بیان چند فارسی محاوروں کے سلسلے میں ہے، جن کے معنوں میں غالبؔ او رنواب خلد آشیاں کے درمیان اختلاف تھا۔ نواب صاحب ہندوستانی مصنفین لغات کے معنوں کو درست سمجھتے تھے۔ غالبؔ اسی خط کے آیندہ سطور میں اُن سب فرہنگ نویسوں کو نالائق اور غیر معتبر ٹھہراتے ہیں۔ یہ غالبؔ کی انشا پردازی ہے کہ کسی اہم بات کے لیے شاندار اور فیصلہ کن الفاظ لکھتے ہیں۔ چنانچہ نواب صاحب کا "منہ بند کرنے کے لیے" لکھ دیا کہ "میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے، اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔" گویا "حقائق و دقائق زبان پارسی" لطائف تصوف اور اسرار معرفت تھے کہ ایک مرشد کامل نے دو سال میں سارا

سلوک طے کرا دیا، یا سینے سے لگا کر علم لدنّی آن واحد میں عطا کر دیا، اور اس سے نفس مطمئنہ حاصل ہو گیا۔ بلا شبہ غالبؔ کو "اس امر خاص میں نفس مطمئنہ" حاصل تھا، اور اکثر ان کی رائے درست ہوتی تھی، لیکن یہ بات ان کو کافی مطالعہ کے بعد حاصل ہوئی ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ عبد الصمد ایرانی سے دو سال تک جو فارسی میں گفتگو کی ہوگی، شعر و شاعری کا ذکر و فکر رہا ہوگا، اس سے یک گونہ بصیرت پیدا ہو گئی ہوگی جس نے ذوق سلیم، فکر صحیح، مطالعہ وسیع کے ساتھ مل کر آئندہ رائے صائب کا ملکہ پیدا کر دیا۔

قیام دہلی: غالباً ۱۸۱۳ء یا ۱۸۱۴ء میں غالبؔ آگرہ چھوڑ کر دہلی آ رہے، اس لیے کہ نواب خلد آشیاں کو یکم ستمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "میں باون ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں۔" (از مکاتیب غالبؔ) لیکن دہلی میں آخر عمر تک کوئی ذاتی مکان نہ بنایا۔ مختلف محلوں میں کرایہ کے مکانوں میں رہا کیے۔ سب سے آخر میں حکیم محمود خاں مرحوم کے مکان کے قریب مسجد کے عقب میں رہتے تھے۔ اس مکان کے متعلق کسی کو لکھتے ہیں:۔

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے ‏ ‏ یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

اولاد ہوئی لیکن زندہ نہ رہی۔ بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارفؔ کو بیٹا بنا لیا تھا۔ عارف اور ان کے بچّوں کو اولاد سے بڑھ کر سمجھا۔ غالبؔ کے ایک چھوٹے بھائی بھی تھے مرزا یوسف خاں، ان سے بڑی محبت کرتے تھے ایک مرتبہ مرزا یوسف نے کسی مرض سے صحت پائی تو غالبؔ نے کہا تھا:۔

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی ‏ ‏ میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسف ثانی مجھے

بھائی نے بیس برس دیوانہ رہ کر اکتوبر ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا، زین العابدین خاں اس سے پہلے دو بچے چھوڑ کر جوانی میں (۱۸۵۶ء ﴿۱۲۷۲ھ﴾) داغ دے گئے تھے۔

دیگر حالات: غالبؔ کو چچا کی جاگیر کے عوض سات سو روپیے سالانہ بحساب باسٹھ روپے آٹھ آنہ ماہوار ملتے تھے، لیکن اس قدر آمدنی ان کے لیے کافی نہ تھی اور وہ اس کو اپنے حق سے کم بھی سمجھتے تھے، اس لیے اس میں اضافہ کرانے کی غرض سے ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گئے، گورنمنٹ میں اپیل کی، شہنشاہ انگلستان اور انگریز حکّام کی شان میں زوردار قصیدے

کہے، لیکن دو سال رہ کر کلکتہ سے ناکام آئے، اس سفر میں لکھنؤ، بنارس کی بھی سیر کی۔ نوابانِ اودھ کی مدح میں قصیدے پیش کیے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے دربار سے پانچ سو روپے سالانہ مقرر ہوا، لیکن ۱۸۵۶ء میں الحاق اودھ کے ساتھ بند ہو گیا۔

۱۸۴۲ء ﴿۱۲۵۸ھ﴾ میں دہلی کالج میں "مدرس فارسی" کا جدید عہدہ قائم کیا گیا، اس کے لیے مسٹر ٹامسن نے (جو بعد کو صوبہ کے لفٹنٹ گورنر ہوئے) غالبؔ کا انتخاب کیا، اور ملاقات یا امتحان کے لیے بلایا، غالبؔ پالکی میں گئے، لیکن منتظر رہے کہ صاحب بہادر لینے کے لیے آئیں، وہ غالبؔ کو امیدوار ملازمت سمجھ کر نہ آئے، انھوں نے اپنی کسر شان سمجھی، اور نوکری سے معذرت کر کے لوٹ آئے۔ مولوی امام بخش صہبائی اس عہدے پر لے لیے گئے۔ غالبؔ کو چوسر کھیلنے کا بہت شوق تھا، اور ہمیشہ کچھ برائے نام بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ ۱۸۴۸ء ﴿۱۲۶۴ھ﴾ میں جو کوتوال شہر تھا اس کو غالبؔ سے کچھ عناد تھا، اس نے قمار بازی کے الزام میں غالبؔ کو گرفتار کر لیا اور چھ مہینے کی سزائے قید کرادی۔ کوتوال کا عناد درست سہی لیکن واقعہ یہ ہے کہ غالبؔ کا مکان جوئے کا "اڈہ" بن گیا تھا۔ جواری جمع رہتے تھے۔ بہر حال تین مہینے کے بعد خود مجسٹریٹ ہی کی رپورٹ پر رہا کر دئے گئے۔ قید خانہ میں غالبؔ کے ساتھ ہر طرح کی عزت کا سلوک ہوتا تھا، گویا صرف نظر بندی تھی، لیکن غالبؔ کے غیور حساس قلب پر اس بے عزتی کی ایسی چوٹ لگی کہ وہ خود اپنی نظر سے گر گئے، اور اپنے نزدیک رؤساء و معززین سے ملنے جلنے کے قابل نہ رہے، چنانچہ ۱۸۵۲ء ﴿۱۲۷۰ھ﴾ میں منشی ہرگوپال تفتہؔ کو لکھتے ہیں:-

"سرکار انگریزی میں بہت بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، پورا خلعت پاتا تھا، اب بدنام ہو گیا ہوں، بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے، کسی ریاست میں دخل نہیں کر سکتا، مگر ہاں استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ رسم پیدا کروں۔"

لیکن لوگوں نے غالبؔ کو ایسا نہیں سمجھا، ہر رئیس و بادشاہ کی نظر میں بھی وہی وقعت رہی جو ہمیشہ سے تھی، چنانچہ ۱۸۵۰ء ﴿۱۲۶۶ھ﴾ میں بہادر شاہ ظفرؔ آخری تاجدار مغلیہ نے غالبؔ کو "تاریخ شاہی" لکھنے کی خدمت پر مامور کیا۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا

خطاب وخلعت دیا، پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی اور جب ۱۸۵۴ء ﴿۱۲۷۱ھ﴾ میں بادشاہ کے استاد ذوقؔ کا انتقال ہو گیا تو بادشاہ غالبؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ پھر جب نواب یوسف علی خاں مسند نشین رامپور ہوئے (۱۸۵۵ء ﴿۱۲۷۱ھ﴾ تا ۱۸۶۵ء ﴿۱۲۸۱ھ﴾) تو انھوں نے سو روپیہ ماہوار تنخواہ کر دی۔ جس زمانے میں نواب صاحب اپنے والد کی مسند نشینی سے پہلے، دہلی میں اقامت گزیں تھے، تو ۱۸۴۰ء سے پہلے نواب صاحب نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں غالبؔ سے فارسی پڑھی تھی اور مسند نشین ہونے کے بعد نواب صاحب نے شاعری شروع کی اور غالبؔ کو استادِ سخن بھی بنا لیا، انہی کے مشورے سے ناظمؔ تخلص کیا۔ غدر میں جب بادشاہ دہلی وقلعہ شاہی سے تعلقات کے سبب غالبؔ کی سرکاری پنشن بند ہو گئی تو نواب صاحب ہی کی سعی وسفارش سے تین سال بعد ۱۸۶۰ء میں پھر جاری ہوئی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ غالبؔ نے اس حقیقت حال (۱) کے اظہار سے اغماض کیا ہے۔ یوسف مرزا صاحب کو ان کے استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:-

''والی رامپور کو اس پنسن (۲) کے اجرا میں کچھ دخل نہیں، یہ کام خدا ساز ہے بعلی ابن ابی طالب علیہ السلام۔''

نواب کلب علی خاں رئیس رامپور (۱۸۶۵ء ﴿۱۲۸۱ھ﴾ تا ۱۸۸۷ء ﴿۱۳۰۴ھ﴾) نے بھی غالبؔ کے سو روپیہ ماہوار جاری رکھے۔ ان دونوں رئیسوں کے دربار سے تنخواہ مقررہ کے علاوہ بھی صدہا روپیہ وصول ہوتے رہے۔

وفات : ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ر ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کو ۷۳ برس کی عمر میں انتقال کیا، اور حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کی درگاہ میں اپنے خسر کے پائیں مزار دفن ہوئے۔ ''آہ غالبؔ بمرد'' مادہ تاریخ ہے۔ جس میں دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا

---

(۱) منقول از مکاتیب غالبؔ صفحہ ۵۵

(۲) غالبؔ پنشن کو سین سے پنسن لکھا کرتے تھے۔

اور وہ اس وجہ سے کہ آٹھ برس پہلے غالبؔ اپنی موت کی آرزو اور پیشین گوئی میں ''غالب مُرد'' (۱۲۷۷) سے تاریخ نکال چکے تھے۔ اب اس پر لفظ آہ اور حرفِ ب کا اضافہ عامۃ الورود تھا۔

اخلاق و عادات : غالبؔ، انسان دوست، استاد، مربّی، مخدوم، خادم، شہری ہر حیثیت میں بے نظیر آدمی تھے۔ بہت بڑا حلقۂ احباب رکھتے تھے۔ ہر شخص کے دکھ درد میں شریک تھے، اور واقعی طور پر متاثر ہوتے تھے۔ خدمتِ احباب، ہمدردی، فیاضی کا یہ حال تھا کہ اپنی آمدنی اپنی ذات سے زیادہ دوسروں پر صرف کر دیتے تھے۔ اسی لیے ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ لیکن ہمیشہ قرض کا سخت بار محسوس کرتے تھے، اور جلد ادا کرنا چاہتے تھے۔ دوستوں اور شاگردوں سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رکھتے تھے۔ ہر ایک کے ہر حال سے باخبر رہنا چاہتے تھے۔ شاگردوں کے کلام پر اہتمام کے ساتھ اصلاح دیتے تھے باقاعدہ جواب دینے کا ایسا التزام تھا کہ بیماری، ضعف، معذوری میں بھی لیٹے لیٹے لکھ یا لکھوا دیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ مرنے سے ایک روز پہلے کئی پہر کے بعد بیہوشی سے افاقہ ہوا تو نواب علاء الدین احمد خاں کو جوابِ خط لکھوایا، اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا۔ ''میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو، ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔'' فراغ حوصلہ ایسے تھے کہ کسی سائل کو دروازے سے خالی نہ جانے دیتے تھے۔ ایک بار لفٹننٹ گورنر کے دربار سے سات پارچے کا خلعت اور تین رقوم جواہر لے کر آئے، جانتے تھے کہ چپراسی اور جمعدار انعام مانگنے آئیں گے۔ اس لیے گھر آتے ہی خلعت و جواہر بازار بھیج دیے۔ چپراسی آئے تو ان کو بٹھا لیا، بازار سے ان چیزوں کی قیمت آئی تو انعام دے کر رخصت کیا۔ نہایت متواضع، ملنسار، بے تعصب، زندہ دل آدمی تھے۔ ہندو مسلمانوں سے یکساں تعلق اور برتاؤ تھا۔ ان کے خطوط کے مکتوب الیہم میں منشی ہر گوپال تفتہؔ، ماسٹر پیارے لال آشوبؔ، منشی بہاری لال مشتاقؔ، بابو ہر گوبند سہائے، منشی شیو نراین وغیرہ کتنے ہندو شامل ہیں۔ منشی ہر گوپال کو مرزا تفتہ کہا کرتے تھے۔ ان کے نام ۱۲۳ خطوط ہیں، اتنے کسی دوسرے کو نہیں لکھے۔

علم و فضل اور سخن فہمی: غالبؔ کو مطالعہ کتب سے بیحد شوق تھا، لیکن کتاب

خریدتے نہ تھے۔ کتب فروشوں سے کرایہ پر منگا کر پڑھتے تھے۔ شعروادب، اخلاق و تصوف، طب وحکمت، قافیہ ونجوم سے بہت دلچسپی تھی۔ ان علوم وفنون کو خصوصاً ادبیات و تصوف کو کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ اور ان میں بڑی بصیرت رکھتے تھے۔ درسیات رسمی کی تعلیم مکمل طور پر حاصل نہ کر سکے تھے۔ لیکن ان کے فہم درّاک، ذہن وقّاد اور ذوق نقاد نے اس کمی کو پورا کر دیا تھا۔ شعرائے عجم کے کلام پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ اسی لیے ان کے ذوق سلیم اور ذہن متوازن نے یہ چیلنج دے دیا تھا:۔ ''بیاورید گرایں جابود زباں دانے'' اور اسی سبب سے اپنے معاصرین میں سے کسی کو فارسی و اُردو میں اپنا ہم پایہ نہ گردانتے تھے۔ مومنؔ اور ذوقؔ سے خاص کر چوٹیں چلتی تھیں۔ لیکن چونکہ حقیقی شاعر اور صحیح سخن فہم تھے، اس لیے شعر کو شاعر کی ذات سے الگ کر کے بھی دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ مومنؔ اور ذوقؔ کے ان اشعار کو بے حد پسند کرتے تھے:۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومنؔ)

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے (ذوقؔ)

مومنؔ کا شعر سن کر فرمایا تھا کہ ''کاش مومن میرا سارا دیوان لے لیتا اور یہ شعر مجھے دے دیتا۔'' مومنؔ و غالبؔ میں ایسی چشمک تھی کہ دونوں ایک مشاعرے میں شریک نہیں ہوتے تھے، پھر بھی غالبؔ مومنؔ کے قدردان تھے۔ مومنؔ کے انتقال (۱۸۵۱ء) پر یہ رباعی کہی تھی:۔

شرط است کہ روے دل خراشم ہمہ عمر خونابہ برُخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگِ مومنؔ چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

ظرافت: شوخی وظرافت غالبؔ کا وہ چمکتا ہوا جوہر تھا، جس کی آب وتاب آج تک باقی ہے۔ ان کے خلق وعادت کی یہ خوبی ان کی تمام زندگی پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ بات بات میں شوخی اور فقرے فقرے میں ظرافت تھی۔ ان کی مہر ومحبت، سخاوتواضع کی اب صرف یاد ہی یاد باقی ہے، کوئی اثر ونتیجہ جاری وباقی نہیں، لیکن ان کی شوخی وظرافت آج بھی

ویسا ہی ہنساتی اور خوش کرتی ہے جیسا ان کی زندگی میں ان کے مخاطب ومکتوب الیہ کو خوش کرتی تھی۔ (غالبؔ کے لطیفے ''یادگار غالبؔ'' وغیرہ میں دیکھنے چاہئیں) آج کل مزاحیہ نگاری ایک خاص علم وفن بن گئی ہے، لیکن یہ سب ''عقلی مزاح'' ہے اور غالبؔ کی ''فطری ظرافت'' تھی۔ غالبؔ کو اپنی اس فطرت سے بعض فائدے بھی حاصل ہوئے۔ ایک تو یہ کہ طبعی زندہ دلی کے سبب سے وہ غم والم کو آسانی سے جھیل جاتے تھے، اور مصیبت کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کی بعض نازیبا باتیں ''مذاق'' کے پردے میں چھپ جاتی تھیں۔ تیسرے یہ کہ وہ ہنسی ہنسی میں بعض کام بنا لیتے تھے۔ ایک دن غدر کے بعد تحقیقات کے لیے غالبؔ کرنل براؤن کے سامنے پیش ہوئے، اس نے ان کا حلیہ دیکھ کر پوچھا ''تم مسلمان ہو؟'' یہ بولے ''حضور آدھا۔'' کرنل نے کہا ''کیا مطلب؟'' بولے: ''شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا۔'' ایک اور موقع پر کہا تھا کہ ''میں نے کسی دن نماز نہیں پڑھی اور کسی دن شراب نہیں چھوڑی، پھر مجھے مسلمان کیوں سمجھتے ہیں؟'' یہ باتیں اصل میں غالبؔ نے جان وآبرو بچانے کے ڈر سے کہی تھیں، لیکن شوخی وظرافت کے رنگ میں کہیں، اور واقعہ بھی یہی تھا، اس لیے ان کا نازیبا ہونا مخفی وغیر محسوس رہا۔

شراب وکباب: غالبؔ شراب پیتے تھے لیکن اس عیب کو چھپاتے نہ تھے، علانیہ پیتے تھے اور اس گناہ کا احساس رکھتے تھے۔ آم کا بیحد شوق تھا۔ آموں کی کسی نے صفت پوچھی تو کہا، ''بہت ہوں، اور میٹھے ہوں۔'' کھانے میں شامی کباب خاص طور پر پسند تھے۔ جب اور کچھ نہ کھا سکتے تھے تب بھی کباب ضرور کھاتے تھے۔ ان تینوں چیزوں کا اپنے خطوط میں بار بار ذکر کیا ہے۔

بعض عجیب باتیں: غالبؔ کے حالات میں بعض ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو ان کے اخلاق سے تخالف رکھتی ہیں۔ غالبؔ غیور تھے، خوددار تھے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ دہلی کالج کی ملازمت کا ارادہ اپنے معیارِ عزت کو پیش نظر رکھ کر ترک کر دیا، اور سو روپے ماہوار کی آمدنی سے قطع نظر کر لی۔ لیکن دوسرے موقعوں پر تحصیل زر کے لیے جدوجہد اور الحاح وزاری میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ غدر سے پہلے پنشن میں اضافہ کے لیے

کلکتہ کا سفر کیا اور انگریز حکام کی مدح میں فارسی قصیدے کہے۔ یہ کوشش نامناسب نہ تھی، لیکن قصیدہ خوانی اور اس حد تک عجیب تھی۔

پھر غدر کے بعد جب پنشن بند ہوگئی، تو اس کو جاری کرانے اور دربار و خلعت کو بحال کرانے کی خاطر مدح خوانی و قصیدہ سرائی کی کوئی حد نہ رکھی۔ ملکہ وکٹوریہ، گورنر جنرل، وائسرائے، لفٹنٹ گورنر، کمشنر وغیرہ کوئی انگریز حاکم، جس کو پنشن کے معاملے سے ذرا سا بھی تعلق تھا، ایسا نہ رہا جس کی تعریف میں قصیدہ یا قطعہ نہ کہا ہو۔ دونوں موقعوں کے لیے فارسی کے ۲۵ قصیدے اور قطعے کہے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے خطوط میں پنشن بند ہونے کی حسرت، اجرا کی ضرورت، آرزو، توقع، انتظار، بیقراری کے جذبات جیسے اور جتنے جا بجا ظاہر کیے ہیں، وہ بجائے خود عجیب و دلچسپ ہیں۔ غالبؔ کے قدیم مجموعات خطوط میں بھی یہ مضامین ہیں، لیکن اب ''مکاتیبِ غالبؔ'' میں رئیسانِ رامپور کے نام غالبؔ کے خطوط شائع ہو جانے سے ان واقعات پر اور زیادہ روشنی پڑ رہی ہے۔ طرفہ تر یہ کہ غالب اجرائے پنشن کے لیے نواب یوسف علی خان صاحب بہادر سے سفارش چاہتے ہیں۔ نواب صاحب اپنے استاد کی تعمیل ارشاد کرتے ہیں، اور غالبؔ کو اطمینان دلانے کے لیے لکھتے ہیں کہ: ''ہنگام ملاقات کے اکثر صاحبان ذی شان نے تذکار محامد اوصاف ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور قدر دانی سرکار دولت مدار سے یقین واثق ہے کہ جو مدارج شریف آپ کے قدیم سے ہیں پیشگاہ گورنمنٹ سے بھی اسی مطابق ظہور میں آوے گا۔'' جب پنشن جاری ہونے کا حکم آتا ہے تو غالبؔ جانتے ہیں کہ اس کامیابی میں نواب صاحب کی کوشش و سفارش شامل ہے۔ اور ایک خط میں نواب صاحب سے اس کا اقرار بھی کرتے ہیں: ''جس طرح عالمِ شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے ہیں، عالمِ غیب میں آپ کا اقبال مجکو مدد پہونچا رہا ہے۔'' لیکن پنشن وصول ہونے کے بعد جب لوگ ان سے یہ بات پوچھتے ہیں تو صاف لکھ دیتے ہیں کہ: ''والی رامپور کو اس پنسن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔''

''مکاتیب غالبؔ'' کی اشاعت نے غالبؔ کی سیرت کا ایک نیا باب کھول دیا ہے، یا جو باب پہلے مجمل تھا اب اس کی شرح شائع کر دی ہے۔ غالبؔ کے دوستوں میں

بعض رؤساء و جاگیر دار بھی تھے۔ اور وہ ہمیشہ ہر موقع پر امداد کرتے رہتے تھے، لیکن ان میں سے نواب ضیاء الدین خاں اور نواب علاء الدین خاں بھی ہیں، جن سے خاص الخاص مراسم وتعلقات تھے، ایسے نہ تھے کہ بے تحاشا دیتے، اور غالبؔ کی ضرورتیں اسی کی متقاضی تھیں۔ خوبی تقدیر سے نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں رئیسانِ رامپور یکے بعد دیگرے ایسے قدر دان مل گئے جو اپنے آپ کو ان کا شاگرد سمجھتے تھے اور اس قدر عزت کرتے تھے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتی۔ ان بزرگوں سے طلب زر کے لیے غالبؔ کی الحاح والتجا اور حسن طلب یا قبح سوال کے اسالیب وتراکیب، عجائب فطرت بھی ہیں اور نوادرِ ادبیت بھی۔ ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے 'مکاتیب غالبؔ' کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ یہاں مثالاً بعض فقرے نقل کیے جاتے ہیں۔

نواب یوسف علی خان بہادر کو لکھتے ہیں:۔

(۱) ''سو روپیہ کی ہنڈوی بابت مصارف ماہ نومبر ۱۸۵۹ء پہونچی اور روپیہ وصول میں آیا، اور صرف ہو گیا، اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔ اس مشاہرہ مقرری کے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجکو اور بھیج دیجئے گا تو جلا لیجئے گا، لیکن اس شرط سے کہ اس عطیہ مقرری میں محسوب نہ ہو اور بہت جلد مرحمت ہو۔''

(۲) ''یہ تحریر نہیں مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کروا کے اور آپ سے اجازت لے کے بطریق انبساط عرض کرتا ہوں کہ سوا سو روپے (۱) جو تورہ وخلعت کے نام سے مرحمت ہوئے ہیں، میں کال کا مارا اگر سب روپیہ کھا جاؤں گا اور اس میں لباس نہ بناؤں گا تو میرا خلعت حضور پر باقی رہے گا یا نہیں۔''

نواب کلب علی خاں بہادر کو لکھتے ہیں:۔

(۱) ''پیرو مرشد! حضرت فردوس مکان (یعنی نواب یوسف علی خاں) کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا، اس کی رسید میں خط تحسین وآفریں کا، شرم آتی ہے کہتے ہوئے مگر کہے بغیر نہیں بنتی، دو سو پچاس

---

(۱) نواب صاحب نے اپنے چھوٹے لڑکے صاحبزادہ حیدر علی خاں کی شادی کے موقع پر ایک سو پچیس روپیہ تورہ وخلعت کے بجائے بھیجے تھے۔

روپے کی ہنڈوی اس خط میں ملفوف عطا ہوا کرتی تھی .... یہ رسم بُری نہیں ہے اگر جاری رہے تو بہتر ہے۔"

(۲) "حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں، میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں، اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرض باقی ماندہ ادا ہو جائے، اور آئندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے۔"

(۳) ماہِ صیام میں سلاطین و امراء خیرات کیا کرتے ہیں۔ اگر حسین علی خاں (۱) یتیم کی شادی اسی مہینے میں ہو جائے، اور اس بوڑھے اپاہج فقیر کو روپیہ مل جائے، تو اس مہینے میں تیاری ہو رہی ہے۔"

ان محسنان رامپور کی شان میں قصیدے تو چار پانچ بھی نہیں اور یہ مکتوبات کی مدح خوانیاں کثیر و طویل ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ غالبؔ نواب خلد آشیاں (نواب کلب علی خاں) کے دعوت نامے پر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں رامپور پہنچے۔ نواب صاحب نے ۷ نومبر کو ایک ہزار روپیہ عطا کیے، ۲۸ نومبر کو غالبؔ مرزا تفتہؔ (منشی ہر گوپال) کو رامپور سے خط لکھتے ہیں، لیکن اس عطیہ کا ذکر نہیں کرتے بلکہ مزید بخشش کی آرزو لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقت رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔"

دسمبر میں نواب صاحب نے دو سو روپیہ زادِ راہ کے لیے مرحمت کر دیے۔

غالبؔ میں یہ بات بھی بڑی دلچسپ تھی کہ کسی ہندوستانی کے فارسی دانی کے قائل نہ تھے، خصوصاً اپنے زمانے کے اور اپنے زمانے کے قریب کے شعراء و مصنفین فارسی کو تو بالکل ہیچ و پوچ سمجھتے تھے۔ ان میں بھی ہندو اہلِ قلم سے نہایت بیزار تھے۔ خاص کر جب خود ان کے مقابلے میں کسی ہندی یا ہندو کا نام کوئی شخص لیتا تو جل جاتے تھے، اور بڑی تحقیر سے

---

(۱) زین العابدین خاں عارف کا چھوٹا لڑکا۔ غالبؔ نے اس کے باپ کے انتقال کے بعد اس کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ حسین علی خاں، غالبؔ کی وفات کے بعد ریاست رامپور میں ملازم دربار ہو گئے تھے۔

اس کا ذکر کرتے تھے۔ مرزا قتیل، مولوی غیاث الدین مصنف غیاث اللغات وغیرہ سب کو نالائق سمجھتے تھے۔ ''برہان قاطع'' کی قطع و برید کا تو ایک ہنگامہ برپا رکھا۔ بعض اور فرہنگ نویسوں کے متعلق نواب خلد آشیاں کو لکھتے ہیں:۔

''میاں انجو جامع فرہنگ جہانگیری، شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی، عظمائے عجم میں سے نہیں، ہندان کا مولد، ماخذ ان کا اشعار قدما، ہادی ان کا قیاس، ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو، سبحان اللہ۔ ہندی بھی اور ہندو بھی! نورٌ علیٰ نور!!''

مولوی امام بخش صہبائیؔ غالبؔ کے ہم عصر اور دوست تھے اور فارسی کے بڑے مشہور و مستند فاضل تھے۔ غالبؔ ان کو بھی کچھ نہ سمجھتے تھے۔ ''برہان قاطع'' کی غلطیاں ثابت کرنے کے لیے غالبؔ نے 'قاطع برہان' لکھی۔ غالبؔ کے جواب میں کسی شخص نے 'ساطع برہان' شائع کی۔ اس کے مصنف رحیم بیگ کے متعلق غالبؔ لکھتے ہیں (سیاح و شاکر کے نام کے خطوط کا یہ اقتباس ہے):۔

''وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے، وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملّائے مکتب دار کا خبط ہے، رحیم بیگ اس کا نام ہے، میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے، باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے(۱)............ کتاب پڑھا نہیں سکتا، سُن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا لکھوا دیتا ہے، بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوت عملی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائیؔ سے اس کو تلمذ نہیں ہے، اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اے وائے اس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائیؔ کا تلمذ موجب عزّ و وقار ہو۔''(۲)

اسی کتاب کی بحث کے سلسلے میں ایک اور جگہ غالبؔ نے مولانا صہبائیؔ پر اس سے زیادہ سخت حملہ کیا ہے، مرزا رحیم بیگ مصنف 'ساطع برہان' کو ایک رقعہ (مطبوعہ عود ہندی) میں لکھتے ہیں:۔

---

(۱) اُردوئے معلّٰی (مجموعہ رقعات غالبؔ) بحوالہ مکاتیب غالب۔

(۲) عود ہندی (مجموعہ رقعات غالبؔ)

''یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو ''امام المحققین'' خطاب دیا ہے، کتنے محققین نے آپ کو (یعنی مولوی امام بخش کو) اپنا امام مان لیا ہے۔.......... اگر حضرت (یعنی رحیم بیگ) بفتحۂ قاف ثانی بصیغۂ تثنیہ امام المحققین کہتے، تو ایک ماموم (پیرو امام) آپ اور نراین داس تنبولی دوسرا ہوتا۔''

غالبؔ کا مقصود یہ ہے کہ امام بخش صہبائی سب محققوں کے امام تو ہو نہیں سکتے۔ دو محققوں کے امام ہو سکتے ہیں، ایک رحیم بیگ کے دوسرے نراین داس تنبولی کے۔ صہبائی اس زمانے میں زندہ نہ تھے ورنہ ان فقروں کا مزہ لیتے۔

غالبؔ کا مذہب: بیسویں صدی سے پہلے اہلِ ہند کی ذہنیت ایسی نہ تھی کہ تذکرہ و تاریخ میں کسی مشہور شخص یا شاعر یا مصنف کے مذہب و عقائد کے متعلق بحث روا رکھی جاتی۔ لیکن عصر حاضر میں تقلید فرنگ اور تحقیق و تنقید کے رواج نے اس کی اجازت دے دی ہے۔ اہل یورپ اپنے مشاہیر کے متعلق ذرا ذرا سی بات کی کرید کرتے ہیں۔ ایک سال ولادت یا وفات کو متعین کرنے کے لیے دلیلوں پر دلیلیں لاتے ہیں اور صفحے کے صفحے لکھ ڈالتے ہیں۔ اسی طرح عقائد و رجحانات مذہبی کے ایک ایک پہلو کو روشن کرتے ہیں، اور یہ محض علمی تحقیقات ہوتی ہے، عناد و فساد مقصود نہیں ہوتا۔ غالبؔ کے مذہب پر بھی اس طرح نظر ڈالنی چاہیے۔ ان کے لیے اپنا پسندیدہ مذہب ثابت کرنے کی کوشش تاریخی و علمی نظر میں غیر مستحسن ہے۔ ان کا کوئی مذہب ثابت ہو یا کوئی مذہب بھی ثابت نہ ہو، مورخ و نقاد یا شاعر و ادیب کے نزدیک ان کا پایۂ کمال غیر متزلزل رہنا چاہیے۔ غالبؔ کے متعلق اس زمانے میں اس امر خاص پر بھی بحثیں ہوئی ہیں، مختلف مضامین رسائل میں شائع ہوئے ہیں، اور وہ ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ تاریخ و تذکرہ اور تنقید و تبصرہ کے ذریعہ سے لوگوں نے غالبؔ کے لیے مختلف عقائد ثابت کیے ہیں۔ یعنی تفضیلی، مائل بہ تشیع، شیعہ، شیعہ غالی، نُصیری، صوفی، چشتی و نظامی، اور بیدین و لامذہب۔ اور ان عقائد کے لیے خود غالبؔ یا غالبؔ کے دیکھنے والوں کے بیانات دلیلوں میں لائے گئے ہیں۔ تفصیل کی گنجائش نہیں، مختصر طور پر ہماری رائے و تحقیق یہ ہے:-

غالبؔ کو بیدین و لامذہب ان کے مختلف و متضاد اقوال کی بنا پر کہا گیا ہے، کہ کبھی

نُصَیری ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، کبھی شیعہ ہونے سے بھی انکار ہے۔ کبھی اپنے آپ کو صوفی صافی بتاتے ہیں۔ کبھی خلفائے راشدین سے بھی بیزار ہیں۔ جس کا ایسا مذہب ہو، اس کا کوئی مذہب نہیں۔ لیکن غالبؔ پر یہ الزام لگانا انتہا درجہ کی جسارت اور محض عناد ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ غالبؔ شاعر بھی تھے اور ظریف بھی، دنیا دار بھی تھے اور رندِ مشرب بھی۔ ایسا شخص جیسا موقع دیکھتا اور ضرورت سمجھتا ہے کبھی بطریق انبساط، کبھی بطرزِ شاعری، کبھی بتقاضائے بشریت، جو چاہتا ہے کہہ دیتا ہے، لیکن وہ اس کے صحیح خیالات اور اصلی معتقدات نہیں ہوتے۔ اگر اس طرح کے مواقع واقوال کی گرفت کی جائے تو نماز روزے کے لطیفوں پر ہی غالبؔ کو کافر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ فتوائے کفر فتورِ عقل کا ثبوت ہوگا۔ اسی طرح اگر غالبؔ نے یہ کہا:-

منصور فرقۂ علیؑ اللّٰہیاں منم   آوازہ ''انا اسد اللّٰہ'' برآورم

تو اس کو دعوائے نُصَیریت سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ مضمون ایسا سوجھا، اور اس میں انا اسد اللّٰہ ایسا معنی خیز تھا، کہ اگر اس سے شرکِ جلی بھی لازم آتا تو غالبؔ کہنے سے باز نہ رہتے، اور بیشک کہنا چاہئے تھا۔ ایسے شعر اتفاق سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ نوادرِ شاعری میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ''صوفی'' ہونے کا غالبؔ نے بارہا دعویٰ کیا ہے، اور اپنے آپ کو چشتی نظامی بھی بتایا ہے، یعنی لکھا ہے:-

''شاہ محمد اعظم صاحب خلیفہ تھے مولانا فخر الدین صاحب کے، اور میں مرید ہوں اسی خاندان کا۔''

مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللّٰہ علیہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے بزرگ تھے۔ غالبؔ کے آبا و اجداد سب سُنّی تھے۔ ان کی بیوی سُنّی تھیں، ان کی سسرال والے (جاگیر دارانِ لوہارو) سُنّی تھے۔ اور ان میں سے اکثر اسی خاندان کے مرید و معتقد تھے۔ اس لیے غالبؔ بھی اسی خاندان کے مرید ہوں تو عجب نہیں لیکن غالبؔ کا اپنے آپ کو صوفی صافی کہنا اصطلاحی معنوں میں نہ تھا، بطور محاورہ تھا، ''ولی اللّٰہ'' ہونے کا دعویٰ نہ تھا، بلکہ مقصود یہ تھا کہ:-

''آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل''

غالبؔ نے تصوف کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا، اور اس کے مسائل ذہن نشین تھے، اصطلاحیں برزبان تھیں، باتیں کرنے اور باتیں بنانے کا بہت شوق تھا، سخن آرائی اور سخن پروری کی بڑی مشق تھی۔ اسی کا اثر ان کی باتوں اور ان کی شاعری سے نمایاں ہے۔ فارسی و اُردو کلام میں تصوّف کے مسائل بہت لکھے ہیں، لیکن ان میں تصوف کی زبان ہے، صوفی کا دل نہیں۔ خواجہ میر دردؔ اور غالبؔ کے متصوفانہ کلام کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دردؔ دل سے کہتے ہیں، اور غالبؔ زبان سے، دردؔ اُس عالم میں پہنچے ہوئے ہیں، اور غالبؔ کو وہاں کی ہوا بھی نہیں لگی۔ غالبؔ ''حقیقتِ حقّہ' وحدتِ وجود'' کے بڑے قائل ہیں، اور فرماتے ہیں:۔

''زبان سے لا الٰہ الا اللّٰہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللّٰہ، لا مؤثر فی الوجود الا اللّٰہ سمجھے ہوئے ہوں۔''

یہ کہنا کسی صاحب حال کا سا نہ تھا، بلکہ ایسا تھا کہ:۔

''بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لیے''

غالبؔ کے مذہب کے متعلق مولانا حالیؔ لکھتے ہیں:۔

''مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیّع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیرؑ کو وہ رسول خداؐ کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔''

مولانا آزادؔ دہلوی (صاحب 'آبِ حیات') کی رائے ہے:۔

''مگر اہل راز اور تصنیفات سے یہی ثابت ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا، اور لطف یہ تھا کہ ظہور اس کا جوشِ محبت میں تھا، نہ کہ تبرّا و تکرار میں۔''

لیکن غالبؔ کا ایک فقرہ اس سے زیادہ کا بھی پتہ دیتا ہے، فرماتے ہیں:۔

''مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں، مشرک وہ ہیں جو مُسلمہ کو نبوت میں ختم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہم سر جانتے ہیں۔''

''ابوالائمہ'' سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ ہیں اور جن بزرگوں کو حضرت علی کا ہمسر مانا جاتا ہے ان کو ''نومسلم'' کہا ہے، اور جو لوگ مانتے ہیں ان کو ''مشرک'' ٹھہرایا ہے۔

تصانیف فارسی: غالبؔ نے آخری بادشاہ دہلی بہادر شاہ ظفرؔ کے حکم سے ۱۸۵۰ء ﴿۱۲۶۶ھ﴾ میں خاندان تیمور کی تاریخ لکھنی شروع کی۔اس کتاب کا نام 'پرتوستان' تجویز کیا تھا۔لیکن پہلا حصّہ تمام ہوا تھا کہ غدر ہوگیا۔یہ حصّہ 'مہر نیمروز' کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔اس میں تیمور سے ہمایوں بادشاہ تک کے حالات ہیں۔دوسرے حصّے میں اکبر بادشاہ سے بہادر شاہ ظفر تک کی تاریخ ہوتی، لیکن لکھنے کا موقع نہ ملا۔اس حصّے کا نام غالبؔ نے 'ماہ نیم ماہ' تجویز کیا تھا۔اس ترکیب پر ان کو بڑا ناز تھا۔دوسرے 'رستخیز بیجا' (۱) پر بہت فخر کرتے تھے۔یہ ہنگامۂ غدر کا مادّہ تاریخ ہے، اور بیشک بے مثل ہے (۲) 'دستنبو' اس میں غدر کا حال لکھا ہے۔خود غالبؔ کا بیان ہے:۔ ''گیارھویں مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں بہ عبارت فارسی نام آمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔دستنبو اس کا نام رکھا ہے۔اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے۔ (۳) 'پنج آہنگ' میں فارسی انشا پردازی کے نمونے ہیں۔ (۴) 'کلیات نظم غالب'، بقول غالبؔ ''ایک فارسی دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا ہے۔'' اس میں قصائد، غزلیات، قطعات، رباعیات، سب کچھ ہے۔(۵) 'سبد چین' میں چند فارسی قصائد، و غزلیات و رقعات ہیں۔ (۶) 'قاطع برہان' میں خانِ آرزو کی 'برہانِ قاطع' کے اغلاط ثابت کیے ہیں۔بعد کو اس میں اضافہ کیا اور اس کا نام 'درفشِ کاویانی' رکھا۔

اُردو تصانیف: (۱) 'عود ہندی'، رقعات غالبؔ کا پہلا مجموعہ غالبؔ کی زندگی میں، وفات سے چار مہینے پہلے اکتوبر ۱۸۶۸ء ﴿رجب ۱۲۸۵ھ﴾ میں پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی،

---

(۱) ''رستخیز بیجا'' تخرجہ کے ساتھ تاریخ ہے۔تخرجہ کا عیب جن تاریخی مادّوں میں حسن بن گیا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔'رستخیز' کے اعداد (۱۲۷۷) ہیں ان میں سے (جا) کے چار عدد نکالے جائیں تو ۱۲۷۳ھ پیدا ہوتے ہیں، یہی غدر کا سال ہے۔''بیجا'' کہہ کر تخرجہ (تفریق) کی طرف اشارہ کیا ہے۔''رستخیز بیجا'' (یعنی بے محل قیامت) غدر کے لیے کس قدر موزوں لفظ ہے۔غالبؔ کی دوسری تاریخ ''غدر ہندی'' (۱۲۷۳ھ) بھی خوب ہے، لیکن پہلی اس سے بھی بہتر ہے۔

میرٹھ سے شائع ہوا۔اس میں ۱۶۲ رقعات ہیں اور ان کے علاوہ غالبؔ کی لکھی ہوئی دو کتابوں کی تقریظیں اور تین کتابوں کے دیباچے بھی شامل ہیں۔

(۲) 'اُردوئے معلّٰی' حصہ اول دوسرا مجموعہ خطوط غالبؔ کے انتقال سے ۱۹ روز بعد ۶/ مارچ ۱۸۶۹ء مطابق ۲۱/ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ روز جمعہ کو مطبع اکمل المطابع، دہلی میں چھپ کر تیار ہوا۔ غالبؔ کے شاگرد مرزا قربان علی سالکؔ نے سالِ طبع لکھا:-

''آج اون کا سخن تمام ہوا''

۱۲۸۵ھ

اس میں ۴۶۴ صفحے اور ۲۷۴ خطوط ہیں۔

(۳) 'اُردوئے معلّٰی' حصہ دوم، ۱۸۹۹ء میں مطبع مجتبائی، دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے متعلق مولوی عبدالاحد، مالک مطبع نے لکھا ہے کہ ''اس حصہ میں خاص کر وہ رقعات ہیں جن میں انھوں نے (مرزا غالبؔ نے) لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں، یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے، یا کوئی نکتہ بتایا ہے، اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں۔'' اس میں ۵۶ صفحے اور ۵۳ رقعے ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں جب شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے اُردوئے معلّٰی کے دونوں حصے یکجا شائع کیے تو آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل کر دیا جس میں غیر شائع شدہ ۲۳ خطوط ہیں۔

(۳) 'مکاتیب غالبؔ' آخری مجموعۂ خطوط ہے۔ جس میں نواب یوسف علی خاں بہادر اور نواب کلب علی خاں بہادر فرمانروایانِ رامپور کے نام غالبؔ کے ۱۱۵ مکتوبات ہیں۔ یہ مجموعہ نہایت خوبصورت ٹائپ میں بہترین طباعت کے ساتھ ریاست کی جانب سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا ہے۔ منشی امتیاز علی صاحب عرشی ناظمِ کتب خانۂ سرکاری نے ۱۸۱ صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے، جس میں ان خطوط کی مدد سے غالبؔ کے حالات پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ یہ رقعے ادبی اعتبار سے زیادہ وقیع نہیں ہیں۔ درجنوں رقعے صرف چار چار پانچ پانچ سطروں کے ہیں جن میں تنخواہ ماہانہ کی ہُنڈی (یا بقول غالبؔ ہُنڈوی) کی رسیدیں ہیں۔ پھر بھی کہیں کہیں کوئی ادبی یا علمی بات بھی آ گئی ہے، یا کوئی قطعہ یا تاریخ

شامل ہے، جواب تک شائع نہ ہوا تھا۔ غالبؔ کا مخصوص اسلوب نگارش سب میں ہے، اور ظرافت اکثر میں۔ اس لیے یہ مجموعہ بھی تبرکات غالبؔ میں شامل ہے۔

(۵۔۶۔۷) 'لطائفِ غیبی'۔ 'تیغ تیز'۔ 'نامہ غالبؔ' یہ تینوں رسالے 'قاطع بُرہان' کے مخالفوں کے جواب میں لکھے ہیں۔

(۸) تقریظیں اور دیباچے، مختلف کتابوں کے لیے لکھے تھے۔ 'عودِ ہندی' اور 'اُردوئے معلّٰی' حصّہ دوم میں شامل ہیں۔

غالبؔ کا اسلوبِ تحریر: تقریظوں اور دیباچوں میں غالبؔ نے تحریر کا طرز وہی رکھا ہے جو خود ان کتابوں کا ہے یا جو اس زمانے میں مقبول و رائج تھا، یعنی قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی۔ بقول مولانا حالیؔ کے، "مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہیے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے وہ بغیر ان تکلفات باردہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے، اس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔" اگرچہ ان تحریروں میں کوئی جدّت و ندرت نہیں، تاہم غالبؔ کی یادگاریں ہیں۔ اس لیے وہ تین تحریروں کے چند فقرے نقل کیے جاتے ہیں۔

(۱) مرزا حاتم علی مہرؔ کی مثنوی کی تقریظ:۔

"یہ مثنوی کہ مجموعۂ دانش و آگہی ہے، اگرچہ اس کو سفینہ کہہ سکتے ہیں، لیکن فی الحقیقت ایک نہر ہے کہ بحرِ سخن سے ادھر کو بہی ہے۔ سخن ایک معشوقۂ پری پیکر ہے، تقطیع شعر اس کا لباس اور مضامین اس کا زیور ہے۔ دیدہ وروں نے شاہدِ سخن کو اس لباس اور اس زیور میں روکش ماہ تمام پایا ہے، اسی رو سے اس مثنوی نے شعاع مہر نام پایا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ یہاں مہر سے مراد آفتاب ہے، یہ شعاع اس مہر کی ہے کہ جو ذرہ خاک راہ بوترابؑ ہے۔ سچ تو یوں ہے کہ سخن ور روشن ضمیر مہر چہرہ مرزا حاتم علی مہر کو سخن طرازی میں یدِ بیضا ہے۔"

(۲) 'گلزارِ سرور' مصنفہ مرزا رجب علی بیگ سرور کی تقریظ:۔

"مجھ کو دعویٰ تھا کہ انداز بیان کی خوبی میں 'فسانۂ عجائب' بے نظیر ہے، جس نے میرے دعوے کو اور 'فسانۂ

عجائب' کی یکتائی کو مٹایا وہ یہ تحریر ہے، گیا ہوا کہ ایک طرح اور ایک قماش کے ہیں۔ یہ دونوں دلفریب نقش ایک ہی نقاش کے ہیں۔ مانا کہ ایک دوسرے کا ثانی ہے، یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقاش لاثانی ہے۔ مانی نقاش بے معنی صورتیں بنا کر دعویٰ پیمبری کا کرے، کیا عقل کی کمی ہے۔ یہ بندۂ خدا معنی کی تصویر کھینچ کر دعویٰ خدائی نہ کرے۔ کس حوصلے کا آدمی ہے۔"

(۳) 'حدائق الانظار' تالیف خواجہ بدرالدین خاں کا دیباچہ:-

"دریں ولا، میرا برادر زادہ سعادت تواماں، خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ اماں، کہ وہ ایک جواں شیریں بیاں تیز ہوش ہے، اور ہر فن کی تحصیل میں سخت کش سخت کوش ہے۔ ستار کا جو خیال ہوا، ایسا بجایا کہ میاں تان سین کی انگلیوں پر نچایا، مصوری کی طرف جو طبیعت آئی، وہ تصویر کھینچی کہ اس کو دیکھ کر مانی و بہزاد کو حیرت آئی۔ اس اقبال آثار کا یہ ارادہ ہوا، "معز نامہ" کی فارسی نثر کے اُردو کرنے پر آمادہ ہوا ....بعد اختتام نگارش غالب فلک زدہ سے دیباچہ لکھنے کی آرزو کی۔ میں نے ہر چند عجز آمیز معذرت انگیز گفتگو کی، بیدار گر نے ایک بات نہ سنی، اور ایک عذر نہ مانا۔ بھلا اس اصرار کا کیا علاج اور اس ضد کا کیا ٹھکانہ، بھتیجا اور پیارا بھتیجا، ناچار بجز خامہ فرسائی کچھ بن نہ آئی۔"

(۴) 'سراج المعرفت' کا دیباچہ۔ اس کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "ان میں سے بعض نثر میں مرزا کی روش خاص میں نہایت ممتاز ہیں، خصوصاً وہ دیباچہ جو انھوں نے مفتی میر لال کی کتاب 'سراج المعرفت' پر لکھا ہے۔ اس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کیے ہیں، اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے لکھے۔" اس دیباچہ کا مختصر نمونہ یہ ہے:-

"حق یوں ہے کہ حقیقت از روے مثال ایک نامۂ درہم وپیچیدہ سربستہ ہے، کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے **لا مؤثر فی الموجود الا اللہ** اور خط میں مندرج ہے **لا موجود الا اللہ** اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور اور نام آور کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں: آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی۔ انبیائے پیشین صلوات اللہ علی نبینا وعلیہم اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیاء کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات

اعتباری اٹھادیں اور حقیقت بیرنگی ذات کو صورت آلان کما کان میں دکھادیں۔ اب گنجینۂ معرفت، خواصِ امتِ محمدی کا سینہ ہے، اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے۔ زہے عامۂ مومنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں، اور نفی شرک فی الوجود، جو اصل مقصود ہے ان کی نظر میں نہیں۔ مگر جب لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ کہیں گے، اسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی قدم گاہ پر آ رہیں گے۔ یعنی ہماری اس کلمہ سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا، یہی حقیقت ہے شفاعتِ محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمۃ اللعالمین ہونے کے، اور اسی مقام سے ناشی ہے ندائے روح افزائے من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ ....

جب اولیاء اللہ نے، کہ وہ اطباء روحانی ہیں، دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے، اور بسبب استیلاء وہم کے مشاہدۂ وحدتِ ذات سے محروم رہ جاتے ہیں، ہر چند ان کو سمجھائیں گے، راہ پر نہ آئیں گے، ناچار اشغال واذکار وضع کیے تاکہ قوتِ متخیلہ اس میں الجھی رہے اور رفتہ رفتہ بیخودی طاری ہو جاوے۔ وحدتِ وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو اور ہم اس کو بجبر یا بہ تکلف ثابت کیا چاہتے ہوں۔ ع

دانی ہمہ اوست درندانی ہمہ اوست

وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے، اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے۔ پس جب وہ وہم شغل و ذکر کی طرف مشغول ہو گیا، بے شبہ اپنے کام سے یعنی صورت گری اور پیکر تراشی سے معزول ہو گیا۔ بیخبری اور بے خودی چھا گئی، اور وہ کیفیت جو موحدین کو بجز فہم حاصل ہوتی ہے، اس شاغل کے نفس کو بیخودی میں آگئی۔ ایک دریا میں جان کر کودا، ایک کو کسی نے غافل کر کے ڈھکیل دیا، انجام دونوں کا ایک ہے۔ وہ لوگ جو وحدتِ وجود کو سمجھ لیں، یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں، مگر ہاں کم ہیں اور کہیں کہیں ہیں۔ اور ایسے نفوس جو کسب حالت بیخودی کے واسطے محتاج اشغال واذکار ہیں، بہت ہیں بلکہ بے شمار ہیں۔"

رُقعات اُردو کی خصوصیات اور غالب کی اوّلیت : اُردو نثر میں غالبؔ کی اُولوِیّت اور اوّلیّت ان کے رقعات کے سبب سے ہے۔ اُردو میں خطوط نویسی کا غالبؔ نے جو طریقہ ایجاد کیا، اور اس میں جو جدتیں پیدا کیں، اور ان کو جس التزام، اہتمام اور کمال کے ساتھ برتا، اس میں غالبؔ اوّل بھی ہیں اور آخر بھی۔

۱۸۵۰ء تک غالبؔ فارسی میں خط لکھا کرتے تھے۔ اس سال میں بہادر شاہ ظفر

نے ان کو تاریخ نویسی کی خدمت سپرد کی۔ وہ فارسی تحریریں بڑی محنت اور کاوش سے لکھا کرتے تھے۔ اب اس تاریخ کے ساتھ خطوط فارسی پر بھی محنت کرنا دشوار تھا اس لیے اُردو میں خط و کتابت شروع کردی۔ پھر غدر کے بعد صدمات اعزہ و احباب، مالی تردّدات اور پیری و امراض نے زیادہ مضمحل کر دیا تو ۱۸۶۱ء میں ارادہ کرلیا اور اعلان کر دیا کہ فارسی انشا پردازی ختم کر کے اُردو ہی میں لکھا کریں گے، لیکن باوجود اس عزم کے بضرورت کبھی کبھی فارسی میں بھی خطوط لکھتے رہے۔ آخر ۱۸۶۵ء میں فارسی نگاری بالکل چھوڑ دی اور تا دم مرگ (۱۸۶۹ء) اُردو میں خط و کتابت کرتے رہے۔

جتنے خطوط اب تک دستیاب ہوئے ہیں، اور تین چار مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں ان کی ضخامت تقریباً ۹۰۰ صفحات ہے اور تعدادِ خطوط تقریباً ۸۲۵۔ اگرچہ رقعات کا شمار تصنیف میں نہیں ہوا کرتا، لیکن ایسا ضخیم مجموعہ یقیناً غالبؔ کی مستقل تصنیف کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ خاصکر جب ان میں سے تخمیناً سو خطوط کو چھوڑ کر (غالباً اس سے بھی کم) باقی سب میں کم غالبؔ کا ایجاد کردہ طرزِ تحریر ہے۔ یا ان کی شوخی وظرافت ہے، یا ادبی نکات ہیں، یا علمی مباحثہ ہے، یا اشعار کی تشریح ہے، یا شاگردوں کے کلام کی اصلاحات ہیں۔

''رقعاتِ غالبؔ'' کی خصوصیات مختصر طور پر یہ ہیں:۔

(ا) غالبؔ نے القاب و آداب، مزاج پرسی و خیریت نگاری کا قدیم دستور، جس سے سرِ مو تجاوز کرنا روا نہ رکھا جاتا تھا، بالکل ترک کر دیا۔ یہ بات نہیں کی یہ باتیں لکھتے ہی نہ تھے، مگر ان قاعدوں کے اور ان کی ترتیب کے پابند نہ تھے۔ کبھی القاب و آداب بالکل چھوڑ دیتے، اور اوّل سطر سے مضمون شروع کر دیتے تھے۔ کبھی لکھتے تھے تو نئے، مختصر، موزوں القاب لکھتے تھے۔ مثلاً ''میاں''، ''برخوردار''، ''بندہ پرور''، ''مہاراج''، ''پیرو مرشد''، ''بھائی صاحب''، اس سے زیادہ لکھا تو ''میری جان کے چین، میاں سرفراز حسین'' ''میرے مہربان، میری جان، مرزا تفتہ سخندان۔'' کبھی یہ سب غائب اور خط اس طرح سے شروع:۔

''ہاں صاحب، تم کیا چاہتے ہو؟'' یا ''مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے!''

اسی طرح دعا سلام اور اپنا نام، اور تاریخ تحریر لکھنے میں بھی کوئی پابندی نہ تھی۔ مثلاً:۔

''نورچشم، راحت جان، میر سرفراز حسین، جیتے رہو اور خوش رہو۔''

''ناوک بیداد کا ہدف، پیر خرف، یعنی غالبؔ آداب بجالاتا ہے۔''

''قبلہ کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست، جو غالبؔ کہلاتا ہے، وہ کیا کھاتا پیتا ہے، اور کیونکر جیتا ہے؟''

''۶ر دسمبر ۱۸۶۵ء کی، بدھ کا دن، صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں۔ کاتب کا نام غالبؔ ہے تم جانتے ہو گے۔''

جواب کا طالب، غالبؔ۔ سہ شنبہ از روئے جنتری ۲۶، از روے رویت ۲۵ر رجب ۱۲۸۳ھ۔''

(۲) خط کو مکالمہ بنا دیتے ہیں۔ اس طرح لکھتے ہیں گویا سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ خود بعض لوگوں کو لکھتے ہیں کہ۔ ''پیرومرشد یہ خط لکھنا نہیں، باتیں کرنی ہیں۔''

''بھائی، مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔'' ''اب حضرت سے باتیں کر چکا خط کو سرنامہ کر کے کہار کو دیتا ہوں۔'' اس طرح کے خط کا ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے۔ ان کو یہ لکھنا تھا کہ محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا، میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں، میں نے پوچھا کیا آج جائیں گی؟ اُس نے کہا آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔ اس مطلب کو انھوں نے اس طرح لکھا ہے:۔

''محمد علی بیگ ادھر سے نکلا، بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔''

اس طرح کا ذرا طویل انتخاب آگے درج ہو گا۔

(۳) اس طرزِ مکالمہ میں کبھی یہ جدت پیدا کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے غائب فرض کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ ان کے اندازِ بیان سے واقف نہیں وہ اس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے ہیں:۔

''میر مہدی، جیتے رہو! آفریں! صد آفریں! اُردو لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے، کہ مجھے رشک آنے لگا ہے۔ سنو، دلّی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے، یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا، اللہ برکت دے۔''

اس ''ظالم'' سے مراد یہی میر مہدی ہیں۔

(۴) غالبؔ کے خطوط کی سب سے بڑی خوبی جس نے، بقول مولانا حالیؔ ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، ان کی شوخیٔ تحریر ہے، جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی...... پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا، اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے۔ اس میں ان کی لڑکی کو، جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے، بعد دعا کے لکھتے ہیں:-

''کیوں بھئی اب ہم اگر کول آئے بھی تو تم کو کیوں کر دیکھیں گے؟ کیا تمھارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟''

یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں رئیس لوہارو کو ان کے بچپن کے زمانے میں، ان کے رقعے کا جواب، جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا، اس طرح لکھتے ہیں:-

''اے مردمِ چشمِ جہاں بین غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو، یعنی چشمِ جہاں بین غالب کی پتلی۔ چشمِ جہاں بیں، تمھارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر، اور پتلی تم، میاں تمھارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو تمھارا صرف دلدادہ ہوں۔''

(۵) کبھی اس پیرایۂ ظرافت سے حسنِ طلب کا کام لیتے ہیں جیسے نواب صاحب رامپور کے نام کا خط پہلے درج کیا گیا۔ کبھی کسی فرمایش کو ہنسی ہنسی میں ٹال دیتے ہیں، مثلاً ایک بار نواب علاء الدین احمد خاں نے اپنے لڑکے کی تاریخ ولادت اور تاریخی نام کی فرمایش کی۔ غالبؔ مادّۂ تاریخ نکالنے سے ہمیشہ گھبراتے ہیں۔ اس فرمایش کے جواب میں لکھتے ہیں:-

''شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریق صید افگنی سکھاتا ہے، جب جوان ہو جاتے ہیں، آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے، حسن طبع خداداد رکھتے ہو، ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو، کہ مجھ پیر غمزدہ دل مُردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین احمد خاں، تیری جان کی قسم! میں نے پہلے لڑکے کا جو نام تاریخی نظم کر دیا تھا، اور وہ لڑکا نہ جیا، مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ وہ میرے نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے، جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہونچا، نا صاحب، دہائی خدا کی! میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔''

(۶) ظرافت کے لیے نئے نئے پیرائے پیدا کرتے ہیں۔ ناداری میں کپڑے بیچنے پڑے تو لکھتے ہیں:۔

''اور لوگ روٹی کھاتے ہیں میں کپڑا کھاتا ہوں۔''

رامپور کے ایک جشن سرکاری کے حال میں لکھتے ہیں:۔

''طوائف کا وہ ہجوم، حکّام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیے۔''

(۷) بعض خطوط مقفّٰی بھی لکھے ہیں، لیکن بقول مولانا حالیؔ مقفّٰی عبارت خاص کر ان خطوں میں لکھتے تھے جن سے ہنسی، ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ مفتی میر عباس کو ان کے احترام اور قدامت پسندی کے سبب سے سراسر مقفّٰی خط لکھا ہے۔

(۸) بعض جگہ الفاظ کی ترتیب میں قدامت ہے۔ یہ فارسی کی عادت کا اثر تھا، جو پہلے سے تھا اور بعد تک رہا ہے۔ بعض فارسی محاوروں کو ترجمہ کر دیا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:۔

''کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستورِ قدیم کو برہم مارے۔'' (فارسی برہم زند)

اب بعض خطوط پورے اور بعض کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ نواب خلد آشیاں کلب علی خاں رئیس رامپور کے نام کا مکمل مکتوب یہ ہے:۔

حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض آنکہ منشور عطوفت عزّ ورود لایا، تنخواہ جولائی ۱۸۶۵ء حال کا روپیہ از روے ہنڈوی

ملفوف معرض وصول میں آیا۔ اگر چہ یہاں مینہ اس قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصل فصل ربیع سے ہاتھ دھولیں، مگر چونکہ بفرمان ازلی میرے رزق کی برأت آپ پر ہے، اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے، ابرِ رحمت کے شکریہ میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں۔ بنظر اصلاح نظم و اصلاح حال ملاحظہ ہو۔ زیادہ حد ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالبؔ۔ جمعہ ۱۱ر ماہ اگست ۱۸۶۵ء

قطعہ

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک — رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار، برس

کہاں ہے ساقیِ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر — بیار، لا ئے گلنار گوں، بیار، برس

خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی — درِ حضور پر، اے ابر، بار بار برس

ہر ایک قطرہ کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے — امیر کلب علی خاں جئیں ہزار برس

فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں — کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس

جناب قبلۂ حاجات، اس بلاکش نے — بڑے عذاب میں کاٹے ہیں پانچ چار برس

شفا ہو آپ کو، غالبؔ کو بند غم سے نجات — خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

نواب خلد آشیاں ہی کے نام دوسرا عریضہ ہے۔ رامپور کی نمائش گاہ بے نظیر میں شریک نہ ہو سکنے کی حسرت لکھتے ہیں، کیا خوب پیرایہ پیدا کیا ہے:-

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے، نمایش گاہ سراسر سور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں، اور خونِ جگر کھاتا ہوں، کہ ہائے میں وہاں نہیں! بالا خانے پر رہتا ہوں، اُتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اُتارا اور پالکی میں بٹھا دیا۔ کہار چلے، راہ میں نہ مرا، اور رامپور پہونچ گیا، کہاروں نے جا کر 'بینظیر' میں میری پالکی رکھ دی۔ پالکی قفس اور میں طائرِ اسیر، وہ بھی بے بال و پر، نہ چل سکوں نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں یہ سب بطریق فرضِ محال ہے۔ ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے۔ بارے تین بیت کا قطعہ تاریخ

بھیجتا ہوں، اگر پسند آئے تو خوشنودی مزاج مبارک سے اطلاع پاؤں۔

نمایشگہے درخور شان خویش برآراست نواب عالی جناب
بہ بیں چوں طرب را نہایت نماند بود سال آں "بخشش بے حساب"
خدایا پسندد خداوندگار کہ از طبع غالبؔ رود پیچ و تاب

"بخشش بیحساب" کے بارہ سو پچاسی ہوتے ہیں۔ طرب کی نہایت ہائے مؤحدہ ہے۔ جب وہ نہ رہی تو دوعدد گھٹے۔ اور ۱۲۸۳ رہ گئے۔ فہوالمقصود اگر حضرت کی مرضی ہو، تو دبدۂ سکندری میں یہ تاریخ چھاپی جائے۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

داد کا طالب، غالبؔ ۱۴ رماہ اپریل ۱۸۶۷ء (۱)"

قاضی عبدالجمیل بریلوی کے نام کا خط ہے، اس میں فضلائے ہند پر رائے زنی ہے۔ مقفّٰی عبارت لکھی ہے:-

"صاحب، وہ خط جس میں اشعار سید مظلوم کے تھے مجکو پہنچا، اور میں نے اس خط کا جواب تم کو بھیجا، اور ذکر اشعار قلم انداز کیا۔ فارسی کیا لکھوں، یہاں گرمی تمام ہے۔ اخوان و احباب، یا مقتول یا مفقود الخبر، ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں، آپ غم زدہ اور آپ غم گسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے، پا بر کاب ہوں۔ طرح بالفتح بمعنی نمونہ اور بمعنی قریب، سچ۔ لیکن طرح بفضحیں اور چیز ہے۔ غیاث الدین رامپور میں ایک مُلّائے مکتبی تھا لا عاقل، جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیلؔ کا کلام ہوگا۔ اس کا فنِ لغت میں کیا فرجام ہوگا۔ مصرع "کیستم من کہ تا ابد بزیم" لاحول ولاقوۃ! یہ مصرع میرا نہیں۔ "تا ابد بزیم" یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے۔ میرا قطعہ یہ ہے۔

کیستم من کہ جاوداں باشم ۔ چوں نظیریؔ نماند و طالبؔ مُرد
در بگویند در کدا میں سال مُرد غالبؔ ؟ بگو کہ "غالبؔ مُرد"

یہ مادۂ تاریخ از روئے نجوم نہیں، بلکہ از روئے کشف ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!"

---

(۱) یہ دونوں خط مکاتیب غالبؔ مرتبہ منشی امتیاز علی صاحب عرشی رامپوری سے منقول ہیں۔

مرزا غالب کی دستخطی تحریر

وفات سے آٹھ مہینے پہلے

اقبال نشان والد سعادت نشان منشی عزیز تر از جان میرزا علاء الدین خاں تمکو دعا درویشانہ

غالب دیوانہ پہنچے سال نگارش تمکو یاد ہوگا میں نے دبستان فارسی

ذہنی تمکو اپنا جانشین و خلیفہ قرار دیکر ایک سجل لکھ دیا تھا اب جو

تہتّر کم اسّی برس کے عمر ہوئے اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا

بلکہ مہینوں کی بھی نہیں ہے تو شاید بارہ مہینے جسکو

ایک برس کہتے ہیں اور جیئوں ورنہ دو چار مہینے پانچ سات ہفتے دس

بیس دن کی بات رہ گئی ہے اپنی ثبات حواس میں اپنے دستخط

سے یہ توقیع تمکو لکھہ دیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین

ہو جانیے اور میرے جاننے والے تمکو جیسا مجکو جانتے تھے

ویسا تمکو جانیں اور جسطرح مجکو مانتے تھے تمکو مانیں کل شیء ہالک

و یبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام یکشنبہ سلخ صفر ۱۲۸۵ ہجری

مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں، اور ان کے اشعار پر اصلاح دیتے ہیں:-

"آج غزل کو دیکھا، کل یہ لفافہ روانہ کروں گا۔ شعر

کوئی آتا نہیں آگے ترے ہنستا ہوکر　　آئنہ جب نظر آیا ہے تو اندھا ہوکر

یہ مطلع دلنشیں ہے، مگر اتنا تامل ہے کہ آئینے کو اندھا کہنا چاہیے یا نہیں۔ شعر

مردمِ چشمِ سیہ جب نظر آتا ہے ترا بیٹھ جاتا ہے مرے دل میں سویدا ہوکر

مردم، آنکھ کی پتلی، مذکر نہیں۔ معشوق کی قید کیا ضرور؟ دعویٰ حسن پرستی رہے عموماً۔ یہ خوب ہے۔ شعر

نظر آتی ہے جہاں مردمک چشم سیاہ بیٹھ جاتی ہے مرے دل میں سویدا ہوکر

شعر

حرمت مے کے لئے پیر مغاں کا یہ حکم ریش قاضی کی رہے پنبۂ مینا ہوکر

یہ شعر بے لطف ہوگیا۔ کس واسطے کہ جب قاضی کی ریش کہی، تو وہ ایہام 'ریش قاضی' کہاں رہا؟''

غالب کا یہ نکتہ شاعروں اور ادیبوں کے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محاورۂ فارسی جو کسی خاص معنی کے لیے مستعمل ہو، بجنسہٖ لینا چاہیے۔ اس میں تغیر کرنا، مثلاً اُردو میں ترجمہ کر لینا جائز نہیں۔ شراب چھاننے کے کپڑے کو فارسی میں 'ریش قاضی' کہتے ہیں۔ اُردو میں اس کو 'قاضی کی ریش' نہیں کہتے، اس لیے شاکر کے شعر میں وہ ایہام نہیں رہتا۔ اُردو شعر میں اس کی مثال ناسخ کا یہ شعر ہے:-

نہ پائی ریش قاضی تو لیا عمامۂ مفتی

مزاج ان مے فروشوں کا بھی کیا ہی لاابالی ہے (ناسخ)

میر مہدی مجروح کے نام خط لکھتے ہیں، اور اس میں مکالمہ کا عجیب لطف پیدا کرتے ہیں۔ اس سے بہتر اور شوخ تر مکالمہ خود غالب کے اور رقعات میں بھی نہیں ہے۔ اس رقعہ میں لکھنا یہ ہے کہ میران صاحب آئے، اور ان سے یہ باتیں ہوئیں۔ مگر معمولی و عام طریقہ پر نہیں لکھتے، بلکہ اس طرح شروع کرتے ہیں:-

''اے میرن صاحب! السلام علیکم''، ''حضرت آداب''، ''کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کو خط لکھنے کی؟''، ''حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟'' ''نہیں میرن صاحب، اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں، وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔'' ''حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے کیا خفا ہوں گے۔'' ''بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے باز رکھتے ہو؟'' ''سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے، اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے!'' ''اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟'' ''کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ

پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ شوق سے لکھیے گا۔''' میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو، تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمھاری باتوں میں آ گیا، اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ!''

اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر خط کا مضمون شروع کرتے ہیں۔

ان گوناگوں جدّتوں، نُو بنُو اسلوبوں، رنگا رنگ ظرافتوں نے غالبؔ کے خطوط میں ایسی دلکشی اور انفرادیت پیدا کردی ہے کہ یہ طرز ان سے شروع ہو کر انھیں پر ختم ہو گیا۔ لیکن عام طور پر یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ ان خطوں کو دیکھ کر لوگ سادہ و بے تکلف خط لکھنے لگے۔

عہدِ سقوطِ غدر کی ایک نایاب کتاب

۲۰۰۶ء

نواب احمد بخش خاں کا نام غالبؔ کے حالات کے سلسلے میں بار بار آتا ہے۔ یہ خاندان بڑا شایستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ ان کے والد عارف جان اپنے دو بڑے بھائیوں قاسم جان اور عالم جان کے ساتھ احمد شاہ (۵۴-۱۷۴۵ء) کے عہد میں بخارا سے ۱۷۵۰ء کے قریب ہندوستان آئے۔ ان کے ساتھ ترکوں کا ایک فوجی دستہ بھی تھا۔ کچھ عرصہ اٹک میں رہے۔ پھر دہلی اور دربارِ شاہی میں پہنچے۔

مرزا عارف جان کے چار بیٹے تھے۔ احمد بخش خاں، الٰہی بخش خاں، محمد علی خاں اور نبی بخش خاں۔

ان میں احمد بخش خاں اور الٰہی بخش خاں بہت مشہور ہوئے۔ الٰہی بخش خاں شاعر تھے۔ معروف تخلص تھا اور ان کی بیٹی امراؤ بیگم بہ عمر ۱۱ سال کی شادی مرزا غالب بہ عمر ۱۳ سال سے ہوئی۔

نواب احمد بخش خاں صاحبِ سیف و قلم تھے۔ ان میں انتظام امور سلطنت کی

قابلیت بہت زیادہ تھی۔ انھوں نے کئی معرکوں میں لارڈ لیک کی بڑی مدد کی۔ ۱۸۰۱ء میں انگریزوں نے بھرت پور میں قلعہ ڈیگ پر چڑھائی کی۔ احمد بخش خاں کے مشورے پر مہاراجہ الور نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ مہاراجہ نے پہلے ہی ان کو دہلی میں اور لارڈ لیک کے ہاں اپنا وکیل مقرر کردیا تھا۔ گھمسان کا رن پڑا، مگر میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ چنانچہ انگریزی سرکار نے بھی نواب احمد بخش خاں کی جاں بازی کا صلہ دیا اور دہلی میں دربار میں لارڈ لیک نے فیروز پور جھرکہ۔ سانگرس۔ پونا ہانا اور نگینہ کا علاقہ جاگیر میں عطا کیا۔ اور ان کو فخر الدولہ۔ دلاور الملک۔ نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ کے خطابات دیئے۔

مہاراجہ بختاور سنگھ والیِ الور نے انھیں لوہارو کا پرگنہ بھی دے دیا۔ اس طرح انھیں والی لوہارو اور جھرکا لکھا جاتا ہے۔

لیکن اس وقت تذکرہ مقصود ہے ان کے چھوٹے بھائی نواب نبی بخش خاں کا۔ ان کا نام یا ذکر بہت کم سننے میں آتا ہے۔ یہ بہت شایستہ، تعلیم یافتہ اور سیاسی طور پر باخبر دور اندیش شخص تھے۔

غدر کے فوراً بعد انھوں نے ایک مختصر رسالہ ''عدلِ اہلِ فرنگ'' لکھا اور اس میں عہدِ انگلشیہ کی خوبیاں اور برکات بیان کی ہیں۔ اور پھر مدلل طور پر لکھا ہے کہ انگریزی عہد سے پہلے مسلمانوں اور ہندوؤں کے دور میں کس طرح ناانصافی کا دور دورہ تھا۔ انگریزوں نے کس طرح سماجی برائیوں کا قلع قمع کیا۔ عام آدمی کو کس کس طرح کی آسایش فراہم کی۔

لیکن انھوں نے نہایت دلیری اور بے باکی کے ساتھ انگریزی سرکار کی کوتاہیوں پر بھی ان کی گرفت کی ہے۔ وہ ''عدلِ اہلِ فرنگ'' میں لکھتے ہیں:۔

> ...... ''مگر بعض امور کا انتظام باقی رہ گیا۔ ایک یہ کہ ہنود کے شاستر میں ستی اور سماد کا ہونا بہت اولیٰ تھا۔ اور بڑے بڑے راجاؤں کے ملک میں یہ رسم جاری تھی۔ سرکار نے کسی کی پاسداری نہ کی اور ان رسموں کو بالکل موقوف کرادیا۔ اور باوصفیکہ ہنود کے مذاہب میں بیوہ عورت کے دوبارہ پھیرے ہونے چاہئیں اور ۱۸۵۸ء میں مسٹر فلپ ہنری

انجرٹن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر دہلی نے جب ہری رام پنڈت سے اس بارے میں رائے طلب کی تو انھوں نے از روئے دھرم شاستر اپنی رائے میں لکھا کہ بیوہ کے دوسرے پھیرے کرنے چاہیے ہیں۔ اور مسلمان کے مذہب میں بھی دوسرا نکاح سنت ہے کیوں کہ حضرت جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹیوں کا دوبارہ نکاح کیا ہے۔ لیکن سرکار نے اس کا انتظام نہیں کیا۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ سرکار کو اس طرف توجہ کیوں نہیں ہے کہ اس میں صدہا خون ہوتے ہیں کیوں کہ جب بیوہ عورتوں کو حمل رہ جاتا ہے تو وہ پہلے پیروی اسقاطِ حمل کی کرتی ہے۔ اگر اسقاطِ حمل نہیں ہوتا تو بخیالِ بدنامی زہر کھا کر یا کنوئیں میں ڈوب کر مر جاتیاں ہیں۔ اگر اپنی جان عزیز سمجھ کر اپنے کو ہلاک نہیں کرتیں تو اون کے ماں باپ یا بھائی اپنی رسوائی سے ڈر کر زہر سے مار ڈالتے ہیں۔ اگر ہندو ہیں تو ہیضہ کا مرض بیان کر کر جلدی سے جلا آتے ہیں اور اگر مسلمان ہیں تو فوراً قبر میں دفن کر آتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ جب مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا ہے تو اس میں سمن مدعی اور مدعی علیہ کے گواہوں کے نام جاری ہوتے ہیں اور مدعی کے گواہ مدعی کے موافق از روئے حلف گواہی دیتے اور مدعی علیہ کے گواہ مدعی علیہ کے موافق حلف سے بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک فریق کے گواہ نے جھوٹی گواہی دی۔ اور صاحبِ عدالت کو بھی یہ حال کھل گیا کہ دروغ حلفی ان سے ہوئی مگر کچھ ان کا تدارک نہیں ہوتا۔ اگر سرکار چاہے تو بخوبی انتظام اس کا ہو سکتا ہے......"

انھوں نے یہ کسی خوشامد یا تعریف کے تحت نہیں لکھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملکی سیاست اور اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ سماجی خرابیوں کا اور عوام کی فلاح و بہبود کا انھیں بہت خیال تھا۔

جس وقت دہلی میں غدر کے آثار رونما ہونے شروع ہوئے تو انھوں نے میرٹھ کے کمشنر Mr.Greathad کے پاس اپنا ایک خاص آدمی خفیہ طریقے سے اطلاع کرنے کے لئے بھیجا۔ اس کا نام حاجی بیگ تھا جو مرزا رحیم بیگ کا بیٹا تھا۔ حاجی بیگ کو باغی سردار بخت خاں نے پکڑ کر قتل کر دیا۔ ہمیں Philip/Egerton دہلی اور کانگڑہ کے

ڈپٹی کمشنر کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب نبی بخش خاں نے غدر کے دوران بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں ایک درخواست بھیجی تھی جس میں نہایت زوردار الفاظ میں استدعا کی تھی کہ جو انگریز عورتیں اور بچے شاہی قلعہ میں مقید ہیں اُن کی جان کی پوری پوری حفاظت کی جائے۔
اگرچہ باغیوں نے ان سب کو قتل کر دیا۔

نواب نبی بخش خاں کا اس پُر آشوب زمانے میں بادشاہِ دہلی کو اس طرح کا خط لکھنا ان کی انتہائی دلیری اور شرافت و انسانیت کی دلیل ہے۔ وہ تحریر باغیوں کے ہاتھ لگ سکتی تھی جو انھیں موت کے گھاٹ اتار دیتے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ان کے اندر بہت راسخ تھا۔ غدر کے فوری بعد مسلمانوں پر جس بیدردی کے ساتھ انگریز نے ظلم کیا ہے وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ غدر کے مابعد اثرات ابھی زائل نہیں ہوئے تھے۔ ہندوستانی اور خاص طور پر مسلمان ابھی تک مشکوک سمجھے جاتے تھے کہ عام طور پر یہ خبر مشہور ہوئی کہ انگریز اب روس پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اس خبر کے پیشِ نظر آپ دیکھئے کہ نواب نبی بخش خاں نے اس دور کے ہندوستان کے کمانڈر انچیف لارڈ نیپئر (Napier) کو ایک خط بھیجا اور ان سے کہا کہ اس طرح کی جنگ سے شدید جانی نقصان ہوگا اور بے گناہ افراد مارے جائیں گے، املاک تباہ ہوگی، اس لیے اس طرح کی محاذ آرائی سے گریز کیا جائے۔

یہ خط انھوں نے ۱۸۷۶ء کو لکھا اتفاق سے کمانڈر انچیف لارڈ نیپئر اپنی مدّت ملازمت ختم کر کے ولایت رخصت ہو چکے تھے۔ شملہ سے ان کے پرائیویٹ سکیریٹری لیفٹنٹ کرنل مور نے ۱۵ر جون ۱۸۷۶ء کو نواب نبی بخش خاں کے خط کی رسید دی اور انھیں اطلاع دی کہ لارڈ نیپئر اب واپس نہیں آئیں گے۔ اور روس سے جنگ کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اس واقعہ سے نواب نبی بخش خاں کی سیاسی بصیرت اور عالمی امور سے باخبری کے ساتھ ان کی فطری دلیری اور بے خوفی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

''عدلِ اہلِ فرنگ'' غدر اور مابعد غدر کے دور کی اہم تاریخی دستاویز ہے۔ اس کتاب کا اور اس کے مؤلف نواب نبی بخش کا کسی کتاب میں تفصیلی ذکر نہیں ملتا۔ صرف نواب احمد بخش کے حوالے سے بعض جگہ ان کا نام مل جاتا ہے۔

یہ کتاب بالکل نادر ہے۔ اس لیے تبرک کے طور پر اس کا سرورق عکسی نقل سے شائع کیا جارہا ہے۔ کتابت میں اس عہد کے املا اور طرزِ تحریر کا لحاظ رکھا گیا ہے تاکہ اس زمانے کی تحریر کا نمونہ فراہم ہو جائے۔

کتاب کے متعلق مختلف مقامات پر مختلف تاریخیں ملتی ہیں۔ مثلاً:-

فہرست ''عدلِ اہلِ فرنگ'' کے اوپر لکھا ہے۔ مطبوعہ ۲۳ر دسمبر ۱۸۷۴ء

صفحہ ۱۲ پر درج ہے:-

......''تاریخ یکم جولائی ۱۸۶۳ء کو جب یہ اوراق اختتام کو پہنچے بشرف ملاحظہ جناب مستطاب معلیٰ القاب نواب سر رابرٹ منٹ گمری کے سی بی لیفٹیننٹ گورنر بہادر سابق فیضیاب ہو کر پسند خاطر عاطر ہوئے......''

کتاب کے اخیر میں صفحہ ۶۲ پر تحریر ہے:-

''بتاریخ ۱۵ر جنوری ۱۸۷۵ عیسوی بخطِ خواجہ ممتاز تحریر یافت۔''

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ۱۸۶۳ء میں وہ ''عدلِ اہلِ فرنگ'' ختم کر چکے تھے۔ طباعت کے مراحل میں اور چند سال صرف ہوئے۔

وہ اپنا نام و تعارف اس طرح کراتے ہیں:-

خاکسار نبی بخش المخاطب مشرف الدولہ نبی بخش خاں بہادر دلاور جنگ سفیر حضرت عرش آرام گاہ محمد اکبر بادشاہ نوراللہ مرقدہٗ خلف نواب غلام محمد خاں نبیرہ اعتماد الدولہ اعتصام الملک نواب چاغر خاں بہادر ترک جنگ بن نواب آغر خاں بہادر ترک جنگ صوبہ ٹھٹھہ و بھکر و صوبہ کابل۔

اب آپ اصل کتاب ملاحظہ کیجیے اور آخیر میں انگریزوں کے خطوں کے اقتباسات بھی دلچسپ ہیں۔

اللہ باقی

ہو رعیت کی جس میں بہبودی اس میں سرکار کی ہے خوشنودی

کتاب لاجواب مصنفہ مشرف الدولہ نواب نبی بخش خاں بہادر دلاور جنگ یعنی

عدلِ اہلِ فرنگ

کہ نصف مطبع منشی مراری لال واقع مکان مفتی صدرالدین خان مرحوم

و نصف در ہندو پریس باہتمام پیارے لال واقع کوچہ ماہیداس بسعی خواجہ ممتاز طبع شد

من کل فانی

مرتبہ اوّل مین جب یہ عدلِ اہلِ فرنگ چھپ چکی تو شاہجہان
نامہ مین خاکسار نے دیکھا کہ چھٹی جلوسمین شاہجہان نے بیدلنانکو مثنوی کے
جلدومین سونے مین تلوادیااور ساتوین جلوس میں طالبای کلیم کو قصیدہ کے
انعام مین زر میں وزن کرادیا۔ کمترین نے بدرگاہِ آفریدگار عالم التجا کی کہ یہ
کتاب مقبول ملکہ معظمہ و مطبوع حکام قدر شناس ہو۔ پروردگار کی عنایت سی
نواب گورنر جنرل بہادر نے باجلاس کونسل پسند فرمایا اور شہزادہ ڈیوک آف
ایڈنبرگ صاحب بہادر اور نواب کمانڈر چیف صاحب بہادر و نواب لیفٹیننٹ
گورنر بہادر اضلاع شمالی اور مغربی و چیف کمشنر صاحب و حکام اودہ چیف
کورٹ اور بہت سے صاحبان کمشنران اور دیگر تخمیناً سوافسران کلان جنگی و
ملکی نے بذریعہ چٹھیات پسندیدگی ظاہر کی اور ہندوستان کی سوسائٹیوں مین
بھی پسند ہوئی اور مہتمان انڈین پبلک اوپنین پنجاب مطبوعہ ۱۲ر جون
۱۸۶۸عیسوی اور سائنٹیفک گزٹ علیگڈہ مطبوعہ ۳ر دسمبر ۱۸۶۹عیسوی نے
بہی اس کتاب کی بہت تعریف لکھی اور دہلی گزٹ میں بہی تعریف اس کی
درج ہے۔ بس حکام کی پسندیدگی گویا ملکہ معظمہ کی پسندیدگی ہے
اور سوسائٹیونکی پسندیدگی کل اہلِ ہند کی پسندیدگی یہہ کتاب جب اول چھپی
تہی علاوہ جزوی تقسیم کے سر ولیم میور صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر اضلاع شمالی
و مغربی نے ڈہائی سو کتابیں اور ڈائرکٹر صاحب اودہ نی ایکسو ساٹھ جلدین
طلب کی تہین جو کہ اب حال میں مستر کپتان ڈاڈ صاحب بہادر سپرنٹنڈنٹ
گورنمنٹ پرسٹن وکٹوریہ اضلاع شمالی و مغربی نی اور جلدین طلب کین اس
لئی دوبارہ منقش کرائی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعریف اوس پروردگارِ عالم کو سزاوار ہی جو خداوندِ جلیل الاقتدار دونو جہان کا مالک ومختار ہی اوسینے ایک مٹی خاک سی آدم کا پتلا بنوایا، اوسی نی یہہ رتبہ دیا کہ اشرف المخلوقات فرمایا۔ جسکو چاہتا ہی تخت سلطنت پر بٹہا کر تماشای جام جہان نماد کہاتا ہی جس کو چاہتا ہی پیالہ ہاتہہ میں دیکر دربدر پہراتا ہی۔ انسان ضعیف البنیان کو کیا شعور کہ اوسکی توصیف میں کچہہ تقریر کر سکی اور قلم بریدہ زبانکا کیا مقدور کہ تعریف اوس کی تحریر کر سکی۔ نظم:

اگر ہووی ہر موئی تنگ زبان — ادا ہو نہ حمد خدائی جہان
قلم کو بہلا اتنی طاقت کہان — کہ ہواس سے تعریف اوسکی بیان

اور نعت اوس سرورِ کائنات کو زیبا ہی کہ جس کی شان میں خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہی وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین، صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین

تعریف جناب ملکہ معظمہ

وکٹوریہ خلد اللہ ملکہا وسلطانہا

رعایائی سرکار دولت مدار کو بدرگاہ حضرت باری مقام شکر گذاری کا ہی کہ ان کے عہد مین حضور پرنور معدلت ظہور شاہنشاہ والا بارگاہ فرمانروائی بحر وبر آفتابِ جہان تاب ہفت کشور فلک رفعت کیوان ایوان ملکہ معظمہ دوران خلد اللہ ملکہا وسلطانہا کو تخت معدلت پر جلوہ گر فرمایا ہی ہر چند اگلی زمانی مین بادشاہان عظیم الشان دانا اور عادل وسخی ہو گذری مگر اس شاہنشاہ آسمان جاہ کو سب پر شرف حاصل ہی نوشیروان عادل اگر اس وقت میں ہوتا تو لقب عادل کبہی اوسکی نام پر جاری نہوتا حاتم طائی کا تو کیا مقدور تہا کہ اس بحر سخا کی عہد مین دست ہمت دراز کرتا۔ بیت

شہے گر گنج بخشی را دہد داد — کلاہ کبر قارون را بردباد

جب سی کہ غلغہ نصفت شعاری اس شاہنشاہ فریدوں کلاہ کا ربع مسکون میں پہیلا ہے باب ظلم وستم بالکل بند ہو گیا ہے۔ اس شاہنشاہ کیطرف سے حکام عالیمقام چار طرف کرسی

حکومت پر بیٹھی بنیاد ظلم کی مٹا رہی ہین ظالمونکو سزا جور و جفا کا چکہا رہے ہین، دروازہ عدالت کا کہل رہا ہی ہر داد خواہ اپنی داد مراد کو پہونچ رہا ہے۔ چور بدمعاش وطن چھوڑ چھوڑ کر بہاگے جاتے ہین شرفا لوگ گہرونمین بیٹھی عیش و آرام اوٹہاتے ہین۔ عدالت کی دہوم دہام ہی ہر طرح سے پرورش خاص و عام ہے چار طرف امن و امان ہو رہا ہے ہر ادنیٰ و اعلیٰ دعائین دی رہا ہی ہر چند عہد سرکار مین ہر امر کا انتظام و بندوبست ایسا ہوا کہ کسی وقت میں نہوا تہا مگر بعض امور کا انتظام باقی رہگیا ایک یہہ کہ ہنود کے شاستر میں ستی اور سماد کا ہونا بہت اولی تہا اور بڑی بڑی راجاؤنکی ملک میں یہ رسم جاری تہے سرکار نے کیسکیے پاسداری نکی اور اون رسمونکو بالکل موقوف کرادیا اور باوصفیکہ ہنود کے مذہب میں بیوہ عورت کی دوبارہ پہیرے ہونی چاہئی ہین اور ۱۸۵۸ء مین مسٹر فلپ ہنری انجرٹن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر دہلی نے جب ہریرام پنڈت سی اس بارہمین رائی طلب کی تو انہوں نے از روئی دہرم شاستر اپنی رائی مین لکہا کہ بیوہ کے دوسرے پہیری کرنی چاہئی ہین اور مسلمان کی مذہب میں بہی دوسرا نکاح سنت ہے کیونکہ حضرت جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹیونکا دوبارہ نکاح کیا ہے لیکن سرکار نے اس کا انتظام نہیں کیا مین افسوس کرتا ہون کہ سرکار کو اسطرف توجہ کیون نہین ہے کہ اسمین صدہا خون ہوتے ہیں کیونکہ جب بیوہ عورتونکو حمل رہ جاتا ہی تو وہ پہلی پیروی اسقاط حمل کی کرتی ہین اگر اسقاط حمل نہین ہوتا تو بخیال بدنامی زہر کہا کر یا کنوئین مین ڈوبکر مرجاتیان ہین اگر اپنی جان عزیز سمجھ کر اپنی کو ہلاک نہین کرتین تو اونکی باپ یا بہائی اپنی رسوائی سی ڈر کر زہر سی مار ڈالتے ہین اگر ہندو ہین تو ہیضہ کا مرض بیان کر کر جلدیسی جلا آتی ہین اور اگر مسلمان ہین تو فوراً قبر مین دفن کر آتی ہین دوسری یہہ کہ جب مقدمہ عدالت مین پیش ہوتا ہی تو سمن مدعی اور مدعی علیہ کے گواہونکے نام جاری ہوتے ہین مدعی کے گواہ مدعی کے موافق از روئی حلف گواہی دیتے اور مدعی علیہ کی گواہ مدعی علیہ کی موافق حلف سی بیان کرتی ہین ظاہر ہے کہ ایک فریق کے گواہون نے جہوٹی گواہی دی اور صاحب عدالت کو بہی یہہ حال کہل گیا کہ حلف دروغی انسی ہوئے مگر کچھ اونکا تدارک نہین ہوتا اگر سرکار چاہی تو بخوبی انتظام اس کا ہوسکتا ہی یقین ہے کہ جس وقت حکام کو

خیال آجائیگا انتظام ایسی امورات کا بھی بخوبی ہو جائی گا بعد اس کی گذارش کرتا ہی خاکسار
نبی بخش المخاطب مشرف الدولہ ولد نبی بخش خان بہادر دلاور جنگ سفیر حضرت عرش آرامگاہ
محمد اکبر شاہ بادشاہ نور اللہ مرقدہٗ خلف نواب غلام محمد خان مرحوم نبیرہ اعتماد الدولہ اعتصام
الملک نواب چاغر خان بہادر ثر جنگ بن نواب آغر خان بہادر تر جنگ صوبہ ٹھٹھہ و بھکر و
صوبہ کابل کہ ایام غدر مین اکثر لوگ براہِ کم فہمی اس خیال سی ہمراہ باغیو نکے ہوگئی تھی کہ اگر
صاحبان عالیشان پہر تسلط پائینگے ہندو مسلمانونکو کرشتان کر ڈالینگے مقام غور کا ہے کہ
۱۸۵۷ء مین جو فتح سرکار ہوئی ہزار ہا ہندو مسلمان واسطے بچانے جان کے جائی امن وامان
ڈہونڈتی پہرتے تہی پہاڑون اور جنگلون میں چھپتی پہرتے تہی اگر سرکار کو کرشتان کرنا
منظور ہوتا تو ایک اشتہار اس مضمون کا جاری کردینا کافی تہا کہ جو شخص باغیان ومفسدین
وغیرہ سی مذہب عیسائی قبول کریگا بغاوت سے بری ہو جائی گا یقین ہے کہ اس صورت
میں ہزار ہا آدمی چارطرفسی دوڑی آتی اور بخوشی ورغبت کرشتان ہوجاتے اور یہہ بہی ظاہر
ہے کہ سرکار نی کبہی کسیکو کرشتان بجبر نہیں کیا جو ہندو مسلمان کرشتان ہوا اپنی خوشی و
رضا مندی سے ہوا اور نیز مذہب عیسائی مین کرشتان بجبر کرنا جائز بہی نہین ہی بلکہ جو
اشتہار حسب الحکم جناب ملکہ معظمہ بتاریخ پہلی نوانبر ۱۸۵۸ء کو جاری ہوا اوسکی فقرہ ساتوین
مین درج فرمایا ہے کہ اگرچہ ہمکو مذہب عیسائیکی صدق کی نسبت یقین کلی حاصل ہے اور
تسلی خاطر سی جو اُوسّی ہوا کرتی ہے ہمکو ساتہہ شکر گذاریکی اعتراف ہے تو بہی ہمکو نہ تعصب
ہے نہ آرزو کہ کسی رعیت سی خواہ مخواہ اپنے عقیدی کو قبول کراوین ہمارا حکم شاہانہ اور مرضی
ہے کہ کسی ایک مذہب کو دوسری مذہب پر ترجیح نہ دیجاوی اور کسی شخص کو بوجہ اعتقاد یا رسمیات
مذہبی کے ایذا ند یجاوی اور سب رعیت کو قانون کی روسی بغیر طرفداری محافظت ہوتے رہی
اور ہماریطرفسی تاکید ہوتی ہے کہ کوئی متنفس جو ہماری نوکر میں ملک ہند کے انتظام کی لئے
مقرر ہو کسی رعیت کی اعتقاد اور عبادت مذہبی کی نسبت دست اندازی نکری والا ہمارا غضب
ہوگا اور نیز جو عاقل ودانا ہین وہ سمجھتی ہین کہ خدا رب العالمین ہے اور دنیا اوس کا ایک باغِ
دلنشین ہے کہ جس میں ہر قسم کا گُل کہل رہا ہی رنگروپ ایک کا ایک سے نرالا ہے پس جو

صاحب عملداری سرکار کو برا جانتے ہین وہ بنظر انصاف تعذیرات ہند کو دیکھین کہ سرکار کی ہیبت نی ظالم و مظلوم مین کسقدر اخلاص بڑہایا ہی کہ شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلایا ہے اور جو صاحب یہ خیال کرتے ہین کہ سرکار کے عہد مین بہی حق تلفی ہوتی ہے یہہ اونکی نافہمی ہے کیونکہ سرکار کیوقت میں سراسر انصاف ہی اگر اتفاقا حق رسی سے کوئی محروم رہجاتا ہی یہہ بہی بعضی ہندوستانی صاحبونکا سبب ہوجاتا ہی چنانچہ بعضی اسی حیلہ سی حق تلفی کرادیتی ہین کہ جس سی دشمنی ہوتے ہی اوسکے بارہمین عرضی گمنام لکھ کر بروقت ملاحظہ عرایض پیش کرادیتی ہین اور ہنگام استفسار حاکم عرضی کی تائید کرتے ہین اور اپنے دوستونسی بہی اوسکی صداقت پہونچادیتے ہین تاکہ حاکم دشمن ہوجاوی اور پھر دوستونمیں بیٹہہ کر براہ شکوہ کہتی ہین کہ مستغیث مانند کاٹ کی پتلی ہماری ہاتہہ میں ہے جدھر چاہتے ہین کل موڑ دیتی ہین۔ بلکہ یہ واقع خاکسار پر بہی گذر چکا ہے جو کہ اس زمانے مین اکثر لوگ بباعث نادانی ہندوستانی عملداریکو اچھا جانتی ہین اونکی خیال خام مٹانی اور سمجھانیکو چند اوراق درباب عالی ہمتی سرکار عالیوقار اور ظلم و بی انتظامی عملداری ہندوستانیان اور انصاف و بندوبست صاحبان عالیشان مع بعضے ایجاد جو واسطی آسایش رعایا ظہور مین آئی مختصراً تحریر کئے تاریخ یکم جولائی ۱۸۶۳عیسوی کو جب یہہ اوراق اختتام کو پہونچی بشرف ملاحظہ جناب مستطاب معلّی القاب نواب سر رابرٹ منٹ گمری کی سی بی صاحب لیفٹینٹ گورنر بہادر سابق فیضیاب ہوکر پسند خاطر عاطر ہوئی جناب محتشم الیہ نی براہِ عنایت وقدردانی صحیح کراکر چٹھی سکرتری بدیں خلاصہ ارسال فرمائی کہ اگر یہہ کتاب چھپ جائی تو پچاس جلد سرکار بہی لیگی اور جناب کپتان فلر صاحب بہادر ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ممالک پنجاب وغیرہ نی بعد ملاحظہ پسند فرما کی سو جلد ونکی فرمایش کی اور جناب کرنیل جارج ولیم ہملٹن صاحب بہادر کمشنر قسمت دہلی اور جناب ٹی ایچ تہارنٹن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر سابق دہلی و جناب کپتان میکماین صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ضلع دہلی و جناب مسٹر کولڈسٹریم صاحب بہادر جج محکمہ خفیفہ دہلی و جناب لیفٹنٹ ولیم رِنس مو برلسد ہالراند انسپکٹر مدارس حلقہ انبالہ و جناب ہنری ہٹن صاحب بہادر پروفیسر دہلی و جناب پادری ونٹر صاحب بہادر پرنسپل مشن کالجکے

بہی ملاحظہ مین آئی از روئی چٹھیات وخطوط مرغوب دلپسند صاحبان ممدوح معلوم ہوئی اسلئے کمترین نی طبع کرایا تا مقبول انام اور مطبوع خاص و عام ہو یقین ہے کہ جو دانا و دور بین ہین وہ جسوقت بنظر انصاف ان ورقوں پر غور فرمائینگی تحریر راقم کو واقعی خیال مین لائینگی اور جو نافہم ونکتہ چین ہین براہ کوتہ اندیشی زبان طعن وتشنیع دراز کرینگی امید صاحبان اولی الابصار سے یہہ ہی کہ اگر کسی جا غلطی خاکسار پاوین براہ کرم اصلاح فرمادین کہ سہو خاصہ بشریت ہی نام اس کا عدل اہلِ فرنگ رکھا اور منفصل تین فصل اور ایک خاتمہ پر کیا فصل پہلی مین عالی ہمتی سرکار عالی وقار و پرورش رعایا و فصل دوسری مین بے انتظامی ہندوستانیان و انتظام صاحبانِ عالیشان فصل تیسری میں ظلم ہندوستانی صاحبان و بے انتظامی ریاستہا و انصاف سرکار معدلت شعار۔ خاتمہ بیچ بیان نیرنگی زمانہ کے فصل پہلی بیچ عالی ہمتی سرکار و پرورش رعایا.......... واضح ہو کہ سرکار دولتمدار کی عہد مین علم نے اس قدر ترقی پائی کہ کسی بادشاہ کے وقت مین یہہ ترقی نہ پائی تہی سرکار نی کروڑہا روپی خرچ کر کے تعلیمِ اطفال کی لئی سیکڑون اسکول مقرر کئے چنانچہ جناب معلی القاب نواب گورنر جنرل بہادر دام اجلالہم و جناب والا خطاب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر دام اقبالہم و جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر ممالک پنجاب وغیرہ دام اقبالہم تعلیم وتربیت اطفال مین اسقدر بدل مصروف ہین کہ لوگ اپنی اولاد کی تعلیم میں بہی اسطرح مصروف نہین رہتی اور صاحبان ممدوح کو یہہ بہی منظور ہے کہ کوئی ہندوستانمین بیعلم نرہے اگر غور کیجائی تو اس فیض سرکاری انواع طرحکی فوائد رعایا کی قسمین متصور ہین اول یہہ کہ لڑکے لہو ولعب اور صحبت بدسی محفوظ رہتی ہین دوسری یہہ کہ علم جلدی حاصل کرتی ہین تیسری یہہ کہ بعد تحصیل علم عمدہ عہدونپر مقرر ہوتی ہین چوتہی یہہ کہ بعضی ایسی بہوکی کنگال تہے کہ جب کسیکی گھر تقریب شادی یا غمی کی سن پاتی بن بلائی دوڑی جاتی اپنی عادت سی مجبور تہے سایہ یمین برگی مشہور تہی اور سرکار عالی وقار کی بدولت اونکی اولاد بہی علم تحصیل کر کے عہدہ ہائے عمدہ پر پہونچی ۲۔ سرکار کی عہد مین چھاپے خانے جا بجا اس کثرت سے جاری ہوئے کہ جسکے سبب سے کتاب ہر فن کی صحیح وخوشخط بقیمت ارزان دستیاب ہوتی ہے ۳۔ سرکار نی براہِ رعیت پروری اسپتال وشفا خانی و پاگل خانے

بصرف ہزار ہا روپیہ جاری کی تا رعیت آرام پائی باوجودیکہ اگلی بادشاہو نکے وقت مین بہی جا
بجا شفا خانی بنی اور طبیب واسطی معالجہ کے مقرر ہوئی سیکڑوں بیمار شفا پاتی تہی اور ہر ہر
طرحکی آرام اوٹہاتی تہی لیکن جس قدر سرکار دولتمدار غریب پروری مین بدل مصروف ہی وہ
اس قدر مصروف تہی ۴۔ قحط سالی میں بیچ ۱۸۶۰ عیسوی کی سرکار کی طرف سی لکھ ہا روپئی
صرف ہو کے جا بجا واسطی غربا کی محتاج خانی مقرر ہوگئی مردمان سفید پوش جو براہِ غیرت
کسیکی آگے ہاتہہ نہین پہیلا سکتی تہے فاقہ کشی سے ہلاک ہوئی جاتی تہی اور عورات پردہ
نشین جو اپنی زندگی سے تنگ تہین اونکی واسطی سرکار نی تنخواہین مقرر کردین ۵۔ عملداری
ہندوستانی مین ساہوکارونکو بخوف حاکم بجز گزی گاڑہی کے لوئی کا اوڑہنا بہی نصیب نہوتا تہا
روپیہ اوسکا زیرِ زمین دفن رہتا تہا اب سرکار کی بدولت مہاجن لوگ پوشاک زرتار زرین
نگار پہن پہن کر بگیون اور پالکیونمین سوار ہو ہو کر کس زرق و برق اور شان وشوکت سی نکلتے
ہین ہردم آفریدگار عالم کا شکرانا بجالانا چاہئی کہ سرکار انصافمدار کو اس عہد میں حاکم کیا ہے
۶۔ جس مجرم کو کسی جرم مین سرکار قید کرتی ہے اوسپر بہی نظر پرورش کی رکہتی ہے کہ قید خانیمین
معلم مقرر ہین تا ایک گہنٹہ علم پڑہاتی ہین موافق حیثیت کی پیشہ سکہاتے ہین مطلب
سرکار یہہ ہی کہ جسوقت مجرم چھوٹکر جاوئی اپنے قوت بازوسی اکل حلال پیدا کر لاوی ۷۔
عہد سرکار میں صبح وشام سڑکوں پر چھڑکاؤ کیے جاتی ہین وقت شب جا بجا لعل ٹینین روشن
ہوتی ہین چلنے والونکو آسایش ہے بازار کی رونق و آرایش ہے ۸۔ سابق مین جب کسیکی
شبیہ کہینچنی منظور ہوتی تو مصور اوسکی سامنے ہو بیٹہتا اور بہت عرصہ میں شبیہ کہینچتا اب دانایانِ
فرنگ نے یہہ ترکیب ایجاد کی ہے کہ شیشہ کو تیزاب ملکر اور بکس میں رکہکر شعاع آفتاب کی
آگی دہرتے ہین شبیہ یا نقشہ جو کہینچنا منظور ہوتا ہے آنا فانا مین کہینچ لیتی ہین ۹۔ سابق مین
واسطی بجانی گہڑیال کی دو پنڈت بمشاہرہ آٹھ روپیہ ماہواری نوکر رکہتی تہے اب گہنٹہ ایسا
ایجاد ہوا ہی کہ منٹ منٹ کا حال اوسی حاصل ہوتا ہی اور قیمت بہی بہت قلیل ہے یعنی دس
بارہ روپیہ کو ہاتہہ آتا ہی اور برسون تک کام دیتا ہے ۱۰۔ جہاز دخانی ایسا ایجاد ہوا ہی کہ
بصرف قلیل سیکڑوں آدمی جس مقام پر چاہتی ہین تہوڑے عرصہ مین پہونچ جاتے ہین اور جو

کوئی اسباب تجارت کہین لیجانا چاہتا ہی بحفاظت تمام پہونچ جاتا ہی ۱۱۔ سرکار کی عہد
مین ایسی کل ایجاد ہوئی کہ جسکی سبب سی انواع انواع قسم کا کپڑا نفیس و تحفہ پیدا ہوتا ہے
اور خاص و عام کی استعمال مین آتا ہی ۱۲۔ سرکار کی عہد میں پنچکی ایسی جاری ہوئی ہے جو
مفید رعایا ہی ۱۳۔ سرکار کیوقت مین دیا سلائی کا ایسا ایجاد ہوا کہ اگر طلسم کہئی بجا ہے
اور اسمین وہ آگ داخل کی ہی جو انسان و حیوانکی اصل خلقت مین تہی اور قیمت بہی بہت
قلیل ہی ایکڈبیہ کہ جسمیں دیا سلائیان تخمیناً ڈہائی سو ہوتی ہین آدہ آنہ کو بکتی ہے فصل دوسری
بیچ بیان بی انتظامی ہندوستانیان وانتظام و بندوبست صاحبانِ عالی شان سابق مین رہزنون
اور قزاقون اور گٹہ کٹونکی اس قدر زور و ظلم تہے کہ دو چار مسافر جا نسکتی اگر بباعث ضرورت
کی چل نکلتے تو راہ مین جان سے ہاتہہ دہو بیٹھتی بلکہ یہہ حال تہا کہ اگر کوئی شخص کسی ملک سی
مدت مدید مین زر نقد کما کر ارادہ وطن جانیکا کرتا کئی مہینی پیشتر سی جانیوالونکی تلاشمین رہتا
جب قافلہ اکٹھا ہو جاتا تب اوسکا جانا میسر ہوتا چار طرف رستی ایسی خراب تہی کہ گاڑیبان
کدال پہاوڑی اپنی ہمراہ رکہتی جگہ جگہ پر پہاڑونسی ٹیلی رستی کے کاٹ کر جائی آمد و رفت کی
کرتی جاتی باوجودیکہ قافلہ ہوتا تہا لیکن اوسپر بہی قزاق و رہزن لوٹ مار کرتے اکثر مسافر
ماری جاتی جو قزاقونسی بچکر آگی بڑہتی کچھ شیر بہیڑیونکی خوراک ہو جاتے جنکی کچھ عمر باقی
ہوتی وہ سب مصیبتین جھیلکر جب شہر مین پہونچتی وہان کا حاکم خبر سن کر ڈنڈ لیتا بعد اوسکی
حرام خور چھٹ کر کچھ نکچھ لے مرتی راہنکو چور بدمعاش ناکمیں دم کرتی سرکار نی ہزار ہا روپیہ
صرف کر کی محکمہ جات مقرر کئی اور صاحبان منتظم و دانائی انتظام اون ظالمونکا ایسا کیا کہ نام و
نشان تک نیست و نابود کر دیا اور چار طرف سڑکین صاف صاف لکہہ ہا روپیہ صرف کر کر تیار
کرائین اور پانچ پانچ کوس پر سرائین بنائین تا کہ مسافرونکو بخوبی آسایش ہو جنگل و
بیابان کی زیبایش ہو ۲۔ قوم مینونکی ایسی ظالم تہی کہ جب دو چار مسافر کسی شہر سی کما کر اپنی
اہل و عیال پاس جانیکا ارادہ کرتی وہ قوم خبر سنکر سو سو دو دو سو کوس پر پہونچکر مسافرونکو ہلاک کر
ڈالتی اور جو کچھ اون پاس ہوتا وہ لیلیتے اب سرکار کی دہشت سے مینی گہرسی نکلتی ڈرتی ہین
مسافر بیخوف و خطر چار طرف آمد و رفت رکہتی ہین ۳۔ پہلی جس کسیکو خط ضروری کسی مقام پر

بہیجنا منظور ہوتا تو عرصہ دراز میں پہونچتا مثلاً اگر آدم اجورہ دار آٹھہ دس روپیہ لیکر دہلی سی
لاہورروانہ ہوتا مہینے سوا مہینے مین جواب لاتا اکبرنامہ وغیرہ مین لکھا ہی کہ جب حضرت نصیر
الدین ہمایون بادشاہ کا ۱۳ ربیع الاول ۹۶۳ ہجری مین جہان فانی سی انتقال ہوا وزیرون او
رندیمون نی براہِ دور اندیشی انتقال بادشاہ مخفی رکہا بیمار ہونا مشہور کیا اور خفیہ ہرکارہ اطلاع
دینی کو پاس حضرت جلال الدین اکبر پسر ہمایون بادشاہ کی ضلع لاہور مین بہیجا بسبب نہ
برآمد ہونی بادشاہ کی جو خلایق مین اضطراب پیدا ہوا تو وزرا اور امرا نی ملا شکیبی کو لباس
حضرت مغفور پہنایا اور بالائی محل جسجا نشستگاہ بادشاہ مرحوم کی تہی روبطرف دریا کرکی
بٹہلایا تمام خلق اللہ آداب کورنش بجالائی ادنیٰ و اعلیٰ نی بحصول دیدار تسلی پائی جب حضرت
جلال الدین اکبر کو انتقال بادشاہ سی آگاہی ہوئی اونیس روز بعد ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ ہجری کو
کلانور مین آکر تخت نشین ہوئی صاحبان عالی شان نی بایجاد تار برقی خبر رسانی ایسی سہل
کردی ہی کہ بصرف قلیل شاہجہان آباد سے بمقام کلکتہ ڈیر گہنٹہ مین خبر پہونچ کر جواب
حاصل ہوجاتا ہی اور ریل گاڑی ایسی ایجاد کی ہی کہ دہلی سے بمقام کلکتہ پچاس گہنٹہ مین
جو چاہے پہونچ سکتا ہی اور بسبیل کاٹ میل آدہ آنہ کی ٹکٹ مین خط دہلی سے ہر مقام پر جا
پہونچتا ہے اور سرکار نی براہ رحم دلی واسطی آسایش رعایا کی چارطرف نہرین جاری کرین
اور کروڑہا روپیہ اسمین صرف کئی اور محکمہ جات مقرر ہوئی تاکہ جان رعایا تکلیف قحط سالی سے
محفوظ رہے ۴۔ ہردوار مین جو کُمبھ کا میلہ ہوتا تہا صدہا آدمی بسبب ہجوم خلایق ضایع ہوتی
تہے سرکار نی ہزار ہا روپیہ لگا کر اوس ہر کی پیڑیکو وسیع کردیا لوگونکو ضایع ہونی سی بچالیا
۵۔ عملداری ہندوستانی مین دستور تہا کہ جس وقت کوئی راجہ یا سردار فوت ہوجاتا اوسکی خاص
رانی کو زبردستی بٹہا کر سر مردی کا اوسکی زانو پر رکہتی اور باقی رانیونکو اوسکے چارطرف بٹہا کر
گرد اونکی لکڑیان چنتی اور چارطرف سی آگ لگا کر زندہ عورتونکو جلا کر خاک سیاہ کردیتی
۶۔ رجواڑونمین پہلے رواج سماد کا تہا کہ کئی مہینے پیشتر ہاتہہ پاؤنکی انگلیون مین پوری پوری
مہدی لگاتی بعد اوسکی گڑہا زمین مین کہود کر آپ اوسمین اوتر جاتی اور اوپر سی مٹی ڈلوا کر اپنی
تئین خاک بسر کرتی تہے ۷۔ دریا نربدا کی متصل ایک پہاڑ ہے کہ اوس کو مان دہانا کہتی ہین

اکثر ہنود اوس پہاڑ سی اپنی تئین گرا کر مر جاتی اور اس خیال فاسد مین جہان سے گزر جاتی
کہ ہم دوسرا جنم لین گے اور کسی ملک کی راجہ بنین گے ۸۔ مقام الہ آباد مین بعضے جوگی اول
ہاتھہ اپنی کٹوا کر آگ مین ڈالدیتی اور بعد اوسکی آگ مین کود کر اپنی جسم کو خاک کر دیتی
۹۔ مقام بنارس مین بعضے ہنود اپنے جسم کو آرہ سی چرواتی تہی اس خیال سی کہ ہم دوسری جنم
مین کسی شہر کی راجہ ہونگی ۱۰۔ بعضی ہنود کوئی عضو اپنا کاٹ کر دیوتا کی استہان پر چڑہا دیتے
۱۱۔ بعضی ہنود زبان اپنی کاٹ کر کالکا مین چڑہاتی ۱۲۔ بنگالی مین یہ رسم تہی کہ جب کسی بیمار کی
بیماری کو عرصہ کھچتا تو وارث اوسکی دریا میں غوطی دیتی اور کہتی ہری بول ہری بول اگر اس صدمی
سے بیمار مر جاتا تو اوسکو جلا دیتی اور سخت جانی کی سبب زندہ رہتا تو ایک گانو مین کہ اوسکو
مردونکا گانو کہتی ہین بہجوا دیتی تمام عمر وہ اسی گانو مین رہتا مال و اسبابکی مفارقت کی صدمی
رات دن دل پر سہتا ۱۳۔ اکثر ہنود اور بعض مسلمان افغان وغیرہ نی یہہ رسم مقرر کر رکہی تہے
کہ جب دختر پیدا ہوتی تو اوس کو مار ڈالتی ۱۴۔ بعض نادان لوگ بباعث پہونچنی کسی رنج کی
دریا مین ڈوب کر مر جاتی اور بعض زہر کہا کی فوت ہو جاتے ۱۵۔ منڈ چری دوکانون کی آگے
کھڑی رہ کر سر اپنا اُستری سے چیرتے تہی ۱۶۔ بعض پتہر بہاری اپنی چہاتی پر مارتے تہی
۱۷۔ بردہ فروش ہر ملک و دیار سی لڑکیان اور لڑکی ادنیٰ و اعلیٰ کی پکڑ لاتی اور بطمع نفسانی
بیچڈالتی مول لینے والی چھوٹے چھوٹے بچونسی کار خدمت لیتی بلکہ صدہا طرحکی تکلیفین
دیتے یہانتک کہ اکثر ظالم سیخچے لوہیکی گرم کر کے اونکی بدن پر رکہتی اور ہر ہر طرحکی اذیت
پہونچاتی ۱۸۔ مخنث اکثر لوگونکی لڑکونکو اغوا کر کی مخنث کر ڈالتی اور اونسی فعل بد کرواتے
اور بعضونکو خواجہ سرا کرا کر بطمع زر بادشاہون اور امیرونمین گذرانتے ۱۹۔ سرکار کی عملداری
سے پیشتر بعضی بد وضع لوگ لڑکونسی اغلام کرتی تہے اور اس فعل شنیعہ کی بہت کثرت تہی
۲۰۔ پہلے پچاس پچاس سو سو آدمی جمع ہو کر خانہ جنگیان کرتی تہی اور مفت ضایع ہوتی تہے۔
۲۱۔ اکثر لوگ شہر میں دو طرفہ جمع ہو کر مورچے باندہتی تہے اور قلمین کہ جسکو چچھوندرین بہی
کہتے ہین چھوڑتے تہی ہزارون سیرانی جلکر مر جاتے تہی ۲۲۔ بعضی بباعث عداوت کسی
حیلہ سی دشمن کے گہر آگ لگا دیتے مال و اسباب کو خاک مین ملا دیتی ۲۳۔ پہلی دستور تہا کہ اگر

کسی شخص پر کسیکا کچھ قرض لینا ہوتا تو قرضخواہ مع دس بیس آدمیون کے قرضدار کی مکان پر دہرنا دیکر ہو بیٹھتا سقہ اور خاکروب تک گہر مین جانی نہ دیتا اگر قرضدار پاس کچھ ہوتا تو وہ دیکر اپنا چہٹکارا کرتا اگر پاس نہوتا تو زہر کہا کر مر رہتا وارث اوسکی جو حاکم وقت سے استغاثہ کرتی وہان شنوائے نہوتی ۲۴۔ جس شخص کو آدم بیگار کی ضرورت ہوتی وہ ایک تلوار یا کوئی تمغہ لیکر جس گانو مین چلا جاتا عورت یا مرد جو مطلوب ہوتا پکڑ لاتا ۲۵۔ پہلے دستور تہا کہ مسافر کے رستہ بتانیکو رات کیوقت چوریکی قوم سے ایک شخص گانونسی رہبر ہمراہ لی لیتی جب دوسری گانو پر پہونچتی اوس رہبر کو چھوڑ کر دوسرا رہبر ہمراہ لی لیتی ایک مرتبہ راقم سمت پورب سے طرف دہلی کی آتا تہا جب قریب کانپور کی پہونچا ایک رہبر وہانسی نکلوایا جب چلتی چلتی دوسری گانو پر آیا تو اس عرصہ میں آدہی رات گذری رہبر نے گانو مین آواز دی وہانسی ایک لڑکا نو دس برس کی عمر کا ہاتہہ مین لکڑی لئی ہوئی اور ایک ٹکڑا کپڑیکا سر پر ڈالی ہوئی نکلا مینی پوچھا کہ تیرا کوئی وارث بہی ہے یا نہین اوسنی کہا کوئی نہین ایک باپ تہا وہ بہی مرگیا مین تن تہا رہ گیا اور اوسوقت مجکو لڑکی پر رحم آیا اور اوسکو گانو مین بہجوادیا اور وہ پہلا رہبر جو اگلی گانو سے میری ہمراہ آیا تہا اوس کو ایک آنہ اور دینا کرکی اپنے ہمراہ لی لیا سرکار انصافمدار کی عہد مین تمامی امورات مرقومہ بالا کا انتظام وانسداد قرار واقعی ہوگیا ممکن نہین کہ کوئی کسی پر ظلم کرنے پائی یا کسیکو کسی طرحکی اذیت پہونچائی علاوہ اسکی سرکار انگریزیکی وقتمین سینکڑون طرحکی انتظام ظہور مین آئی چنانچہ ۲۶۔ سابق مین جب کوئی شخص پسر نابالغ چھوڑ کر مرجاتا تو مردمان بدمعاش اوسکو آ چہٹتی زرومال اوسکا خورد برد کرکے ایسا حال کردیتی کہ سر پر ٹوپی اور پیٹ کو روٹی میسر نہ آتی بلکہ دمڑی چنے کہانیکو بہم نہ پہونچتی سرکار نی براہ نصفت پروری و عدالت گستری موافق ایکٹ نمبر ۴۰ ۱۸۵۸ عیسوی کے جو تجویز صاحبان لجس لیف کونسل ہند صادر ہو کر بتاریخ گیارہوین ستمبر ۱۸۵۸ء کو پیشگاہ امیر کبیر جناب مستطاب نواب گورنر جنرل بہادر سے منظور کیا گیا اور حکم منظوری جناب نواب معظم الیہ بخدمت کونسل موصوف بتاریخ اٹھارہوین (۱۸) ماہ مذکور مرسل ہوا باندراج اونتیس دفعات حفاظت جان و مال یتیمونمین ایسا بندوبست کیا کہ کسی بادشاہ کیوقت مین نہوا تہا اگر انسان دفعات مذکورہ کو

معائنہ کری حال پرورش یتیمان معلوم ہووے ۲۷۔ عملداری ہندوستانی مین جب
زمینداروںکو کسی فصلمین خسارہ پڑتا اور روپیہ بہم نہ پہونچ سکتا تو اونکی بچونکو اول مین چہین لیتے
اور یہہ کہہ دیتی کہ اتنے عرصہ مین اگر روپیہ خسارہ کا ادا کر دوگی تو اپنے بچی لیلوگی ورنہ بعد
انقضائی ایام میعاد بچونسی دست بردار ہوگے پس اگر ایام وعدہ پر زمینداروںکو روپیہ دستیاب
ہوجاتا تو روپیہ دیکر بچونکو لی لیتے اور اگر روپیہ بہم نہ پہونچتا تو بباعث ناچاری اپنی اولاد سی
دست بردار ہوتی اب سرکار کی اقبال سے خود زمیندار فصل بفصل زر مالگذاری سرکار مین
داخل کرتی ہین اور ہر ہر طرحکی فواید اوٹہاتی ہین ۲۸۔ پہلی قاعدہ تہا کہ بروقت شادی کرنیکی
گہی اور چانول وغیرہ بقال سے قرض خرید لیتی اور قصاب سی گوشت بوعدہ منگالیتی مطنجن و
بریانی پکوا کر دوستون کو کہلاتے اور کنچنیون کو بلا کر رات بہر نچاتی بعد شادی قرض خواہ
آموجود ہوتے قرضدار بسبب ناداری چہپتی پہرتے انجام کار قرض خواہ نالش کرکی اجرائی
ڈگری مین جائداد نیلام کراتی اور زر ماقبی مین قیدخانی پہونچاتی جناب کرنیل جارج ولیم
ہملٹن صاحب بہادر کمشنر دہلی اور جناب ٹی ایچ تہارنٹن صاحب بہادر کمشنر دہلی نے انتظام
وانسداد اس رسم کا بخوبی کردیا ۲۹۔ ہندوستان مین دستور ہے کہ مثلاً بیٹا کلکتہ مین ہو اور بیٹی
شاہجہان آباد مین تو جب دونو کی والدین کی رضامندی ہوجاتی تو باہم سگائی کردیتی لڑکی
اوسیوقت سے عرصہ دراز پر جاتی اور مان باپ کی جدا ہونیکی خیال سے رنج وغم مین مبتلا
ہوجاتے اور جب شادی کرکی لے جاتی تو مان باپ کی مفارقت مین مثل مردہ بنجاتی آفرید
گار عالم نے اون لڑکیونپر بہی رحم کیا کہ ریل گاڑی کی سبب سے فکر وغم اون کا بالکل جاتا رہا
۳۰۔ ۱۸۵۷ء مین چار مہینے تخمیناً باغیان مفسد شہر دہلی مین رہی صدہا طرحکی ظلم رعایا نے سہی
جس گہر کو یا دوکانکو چاہتی لوٹ لیتی جس کو چاہتی بیعزت کرتے جس کو چاہتی جان سے
کہوتے چنانچہ عید قربانکی مہینی مین قصابونپر اتہام کیا کہ پہاڑی پر آتی جاتے ہین صاحب
لوگونکو گوشت پہونچاتی ہین اس بہانی سی اونکو پکڑ لیا اور جانسی مار ڈالا علاوہ اسکی درمیان شہر
کیسی بیرونقی ہوگئی تہے کہ گہوسیون نے چوک کی سڑک پر گائی بہینس کا باندہنا شروع کیا
تمام سڑک کو نجاست سی خراب کردیا ایسی کیچ وبدبو سڑک پر رہتی تہے کہ راہ چلنی والونکو دیکہی

سے نفرت ہوتی تھی بعد فتح سرکار کی بدولت شہر نے زینت و آرایش پائی ہے ہر کوچہ و بازار مین رونق و صفائی ہے ۳۱۔۱۸۶۳ء مین جو خاکسار واسطی ملاقات نواب معلی القاب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک پنجاب روانہ ہوا اور ہوشیار پور کی راہ سی جناب فلپ ہنری انجرٹن صاحب بہادر کی ملاقات کی لئی بہاگسو گیا تو راہ مین عجب طرحکی صنعت و دانائی دانایان فرنگ دیکھنی مین آئی اکثر مقام پر یہہ نظر آیا کہ بڑی بڑی پہاڑ عالیشان کہڑے ہین کسی مقام پر یہہ دیکہا کہ بلندی دو دو کوس کی چلی گئی ہے کہین دو دو تین تین کوس کا نشیب نظر آتا ہی کسی مقام پر پہاڑ کو نیچی سی کاٹکر تخمیناً ایک میل تک اندر اندر سڑک نکالی ہی جا بجا پڑاو اور سرائین بنائی ہین۔

فصل تیسری بیچ بیان ظلم ہندوستانی صاحبان کی اور بغاوت و بی انتظامی

ریاستہا و انصاف سرکار معدلت شعار جو صاحب یہہ خیال کرتی ہین کہ سرکار انگریزی اپنی قول و قرار پر قائم نرہی راجگان اور رئیسان سی بد عہدی کرکی ملک اونکا اپنی قبضی مین لائی یہہ اونکی کم فہمی ہے کیونکہ سب رئیسونکو مناسب یہہ تہا کہ جب صاحبان عالیشان نی لاہور پر مہم کی تہی اپنے دلمین غور کرتے اور اس تحقیقات مین بدل مصروف ہوتی کہ کونسی وجہ سرکار کی خیالمین آئی جو لاہور پر مہم ٹہیر آئی ہی جب باعث مہم بغاوت و بی انتظامی دریافت ہوتا اپنی اپنی ریاست مین بندوبست کرنا چاہئی تہا تاکہ ریاست برقرار رہتی دست اندازی نہوتے اگر غور کرین تو سرکار نصفت شعار نی جب کثرت ظلم و بی انتظامی ملاحظہ کی براہ انصاف و رحمدلی مداخلت فرمائی اول تہوڑا سا حال ظلم حاکمان و سرداران دہلی تحریر کرکی بغاوت و بی انتظامی لاہور وغیرہ و ظلم سی مقام لکہنؤ تحریر کرون گا--------

حال ظلم رسانی ہندوستانیان

ہر چند خاکسار کو خاندان تیموریہ مین واسطہ قدامت و نمکخوارگی کا حاصل ہے مگر اس مقام پر جو حال واقعی ہے تحریر کرتا ہون۔ نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ نی ایام شہزادگی مین بیچ ۳۷ء جلوسی اکبر کے واسطے قتل کرنے ابوالفضل مقرب بادشاہ کی راجہ نرسنگہ دیو کو اشارہ کیا راجہ

مذکور نے بروقت مراجعت ابوالفضل کودکن کی راہ مین قتل کیا اور سر ابوالفضل کا کاٹکر الہ آباد
مین جہانگیر پاس بہیجدیا اور نور جہان بیگم زوجہ شیر افگن خان جونہایت خوبصورت و قابل تہی
اور جہانگیر اوس پر عاشق تہا قطب الدین خان فرزند شیخ سلیم الدین چشتی کو بنگالہ کیطرف
واسطی قتل شیر افگن خان کے بہیجا شیر افگن خان بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا مگر قطب
الدین خانکو اوسپر رحم نہ آیا اور فساد برپا کیا انجام کار قطب الدین خان قتل ہوا اور شیر افگن
خان شہادت کو پہونچا جب نور جہان بیگم جہانگیر بادشاہ کی ہاتہہ آئی اور شب چہار شنبہ
بتاریخ چہبیسوین جمادی الثانی ۱۰۳۷ ہجری حسب الحکم شاہجہان بادشاہ امیرون نے شہریار
وطہمورث وموستگ پسران دانیال نبیرہ جلال الدین اکبر قتل کیا اور بلاقی وگرشاسپ پسران
خسرو کو بہی ہلاک کرڈالا اور ۱۰۶۶ ہجری مین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ بادصفیکہ بڑی عالم و
فاضل تہے دارا شکوہ اور شاہ شجاع و مراد بخش اپنے بہائیونکو شکست دیکر اور حضرت شاہجہان
باپ اپنے کو قید کرکے آپ بادشاہ ہوئی بعد اوسکی دارا شکوہ بڑے بہائی اپنی کو قتل
کروایا اور سلیمان شکوہ جو دارا شکوہ کا بیٹا تہا اوس کو ۱۱ رجمادی الاول ۱۰۷۱ ہجری مین ہاتی پر
سوار کرکی اول تشہیر کیا بعد اوسکی ہاتہو مین ہتکڑیان ڈلوا کر محبوس خانہ مین بہجوادیا اور اوس کی
بہائی شہر شکوہ اور مرزا مراد کی چہوٹی بیٹے بہتیجی اپنے کو گوالیار مین قید رکہا بعد عرصہ کی دونون
مرگیے اور مرزا مراد بہائی اپنے کو قید کرلیا اور ایک لڑکی سی اوسپر خون کا دعویٰ کراکی اپنے
روبرو قتل کرواڈالا۔ بہادر شاہ خلف اورنگزیب عالمگیر بادشاہ بعد جنگ اعظم شاہ بہائی اپنے
کو ۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۸ ہجری مین مار کر آپ تخت پر بیٹہی ۱۱۲۴ مین محمد معز الدین جہاندار شاہ و
خجستہ اختر و جہان شاہ و رفیع الشان پسران شاہ عالم بہادر شاہ باہم عہد و پیمان کرکے تخت
لاہور پر بیٹہے عرصہ ڈیڈہ مہینے مین خجستہ اختر و رفیع الشان نااتفاقی باہم سے قتل ہوئی
۴۔ آٹہوین محرم ۱۱۲۵ ہجری مین محمد معز الدین جہاندار شاہ کو محمد فرخ سیر بادشاہ نی قتل کیا۔ محمد
فرخ سیر کو ۸ ربیع الثانی ۱۱۳۱ ہجری مین حسین علیخان نے زہر دیکے مارڈالا۔ ۱۰ شعبان
۱۱۶۷ ہجری مین غازی الدینخان نے احمد شاہ بادشاہ کو نابینا کرکے قید مین رکہا۔ عزیز الدین
عالمگیر ثانی خلف معز الدین جہاندار شاہ کو روز پنجشنبہ ۱۸ ربیع الثانی ۱۱۷۳ ہجری مین عماد

الملک کے کہنی سے بالا یار خان و مہدی قلیخان وغیرہ نی کوٹلہ مین ہلاک کر ڈالا۔ ۱۲۰۱ ہجری میین غلام قادر خان افغان نے حضرت عالی گوہر شاہ عالم بادشاہ کو نابینا کر کے بیدار بخت کو تخت پر بٹھایا بعد دو ماہ چند روز کے بیدار بخت بھی معہ برادر اپنے کے ضرب شمشیر سے قتل ہوا۔

حال مقام لاہور

بعد فوت مہاراجہ رنجیت سنگہ والی لاہور مہاراجہ کہڑک سنگہ بڑی بیٹے اونکی مسند حکومت پر بیٹھے بعد چھ مہینی کے بیمار ہو کر مر گئی چند کنور زوجہ مہاراجہ کہڑک سنگہ گدی پر بیٹھے باغوای مہاراجہ شیر سنگہ پسر دوم مہاراجہ رنجیت سنگہ پتھر ونکی ضرب سے قتل ہوئی بعد اوسکی مہاراجہ شیر سنگہ مسند ریاست پر متمکن ہوئی بعد چندی سردار اجیت سنگہ سندہان والہ نی مہاراجہ شیر سنگہ اور دہیان سنگہ کو بتاریخ ۱۵ ر ستمبر ۱۸۴۳ء ہلاک کیا اور اسیطرح سن دہولیا اور اوسکے بیٹی کنور پرتاپ سنگہ کو سردار لہنا سنگہ نے مار ڈالا بعد انتقال دہیان سنگہ ہیرا سنگہ بیٹا اوس کا ۱۵ مہینے زندہ رہا ۲۲ر دسمبر ۱۸۴۴ عیسوی کو لاہور سی بہاگا جاتا تہا ایک رسالہ فوج نے باغوائی جواہر سنگہ برادر رانی چندا ہلاک کیا جواہر سنگہ جانشین عہدہ وزارت ہوا مہاراجہ دلیپ سنگہ کو سندہان والون نے مسند حکومت پر بٹھایا اور رانی چندا والدہ مہاراجہ دلیپ سنگہ کو بظاہر مختار کیا فوج کو جو زر و نقد سی مطلوب ہوتا بزور و جبر لے آتی اور کسیکو خاطر مین نلاتے ایکروز فوج نے جواہر سنگہ کو بھی مار ڈالا اور خلاف عہد نامہ قصد غارتگری سرحد انگریزی کا کیا دریائی ستلج سی عبور کر کے سرحد انگریز میین پہونچی اور مستعد لوٹ مار کی ہوئی صاحبان عالیشان سے چند مرتبہ جنگ عظیم ہوئی اور ہر بار فوج سکہہ نے شکست پائی بعد فتح فوج سرکار لاہور مین پہونچی جو کہ سرکار نصفت شعار کو بگاڑنا ریاست کا منظور نتہا براہ رحم دلی یہ خیال فرمایا کہ اگر صورت انتظام سرکار کیطرف سی نہوگی تو سکہان ظالم مہاراجہ دلیپ سنگہ اور اونکی ماںکو ہلاک کر ڈالینگے واسطی بندوبست کی صاحب اشسٹنٹ رزیڈنٹ بہادر کو مقرر کیا اور مہاراجہ دلیپ سنگہ کو بدستور ریاست پر قایم کر کی حکم احکام اونکا جاری رکہا جب کہ سرداران مولراج نی صاحب اشسٹنٹ رزیڈنٹ بہادر کو ہلاک کر ڈالا اور مولراج نی فوج سرکار کا

مقابلہ کیا اور مہاراج دلیپ سنگہ کیطرفسے شیر سنگہ اور چتر سنگہ واسطی رفع فساد مولراج کی گئے مولراج نی خود اپنے تئین حوالہ سرکار والا تبار کر دیا شیر سنگہ چتر سنگہ ملتان سے مع فوج گجرات مین آئی قریب بارہ چودہ ہزار ولایتی کی اکٹہا کر کی فوج سرکاری لڑی آخر کار شیر سنگہ و چتر سنگہ بہی سرکار انگریزیسی خود آن ملی صاحبان عالیشان کو باعث اس بغاوت کا سازش رانیصاحبہ معلوم ہوا تب رانی چندا کو ۱۸۴۸ء مین چنار کو بہیجدیا اور مہاراجہ دلیپ سنگہ کو ۱۸۴۹ عیسویمین ضلع پورب کو روانہ کیا۔ **حال ریاست گوالیار** اگر مفصلاً لکہا جاوے تو ایک کتاب علیحدہ ترتیب پائی اس لئے مختصراً تحریر کرتا ہون مگر ناظرین کو چاہیی کہ اول سے آخر تک بغور معاینہ کرین تا حال رحم دلی سرکار بخوبے روشن ہو۔ مہاراج دولت راؤ سندہیہ سرکار انگریزیسی برخلاف رہکر بہت سی لڑائیان لڑی مگر نفع یاب نہوئی جو پلاٹن کہ ڈیبوین صاحب نی بہرتی اور مونسیر پیرونصاحب نی مرتب کی تہین تمام برباد ہوگئین پانسو سی زیادہ توپین جو برفنان فرنگ نی مہاراج کی عملداری مین تیار کی تہین وہ بہی چھن گئین بیچ ۱۸۰۵ء کی عہد نامہ مابین سرکار انگریزی و مہاراج متہرا مین لکہا گیا کہ اوسکی باعث قلعہ گوالیار اور کچہہ ملک معاف ہوا ۱۸۲۸ء مین مہاراج لاولد انتقال کر گئے اور اونکی بعد اونکی رانی بیجا بائے صاحبہ منصرم رہین بتاریخ ۱۸ ر جون گیارہ سال کے صغرسن کو گود لیکی بلقب عالیجاہ جنکو جی راؤ سندہیہ مسند نشین ریاست کیا ۷ ر فروری ۱۸۴۳ء کو یہہ مہاراج بہی لاولد فوت ہوگئی اونکی رانی تارا بائی صاحبہ نی کہ تیرہ برسکی تہین آٹہہ برسکی صغیرسن کو گود لیا اور ملقب بمہاراجہ جیاجی راؤ سندہیہ کر کے رونق افروز مسند گوالیار کیا اور ماما صاحب کو جو مہاراج متوفی کے ماموتہی بمنظوری نواب گورنر جنرل بہادر خلعت مختاری مرحمت ہوا بعد اوسکی تارا بائی صاحبہ نے باغوائی صلاح کاران ماما صاحب کو موقوف کر کی دادا خاصگی والہ کو مقرر کیا یہہ عزل و نصب نواب گورنر جنرل بہادر کو ناپسند ہوا ہر چند بتحریک نوشتخواند ماما صاحب کے بحالی اور دادا خاصگی والہ کی معزولی چاہی مگر رانی صاحبہ کو منظور نہوئی صاحب ممدوح نی ۱۰ ر اگست ۱۸۴۳ء کو اپنی رائی قلمبند کی جس کی بعضے فقرونکا یہ مضمون تہا کہ ہمارا منظور کیا ہوا نایب موقوف کیا اور سارے فرنگی نسل کے افسر بہی موقوف کر دیی اور علاقہ ہائی جنگی و ملکی پر

وہ لوگ ہین جو گورنمنٹ انگریزی کے مخالف ہین اسلیئے مناسب معلوم ہوتا ہی کہ کچھہ فوج انگریزی کمر بندر ہی جاوی اور لارڈ ایلین برا صاحب گورنر جنرل بہادر نے لارڈ گف صاحب سپہ سالار فوج انگریزی کو ہدایت کی کہ تم کانپور پر خیمہ قایم کرو اور بارہ پلٹن پیادونکی اور ایک رجمنٹ رسالونکی آب جمن کے کنارہ پر طیار رکہو اس عرصہ مین درمیان گوالیار زیادہ تر بے انتظامی ہوگئی اور باہم گولہ چلنے لگا ۱۱ ردسمبر ۱۸۴۳ء کو نواب گورنر جنرل بہادر نی آگرہ مین تشریف لاکر خریطہ رانیصاحبہ کو ارسال کیا جس کا خلاصہ مضمون یہہ تہا کہ بموجب عہد نامہ بُرہان پور کی گورنمنٹ انگریزی پر واجب ہے کہ مہاراج دولت راؤ کے جانشینونکی جسم اور حقوق کی محافظت کری مہاراجہ صاحب و مہارانے صاحبہ خورد سال ہین بذات خود لیاقت حکمرانی کی نہین رکہتی اور مردمان ناعاقبت اندیش کی حرکات سی روابط دوستی جو دونو سرکارونمین منوط و مربوط تہی ٹوٹ گئی اب گورمنٹ انگریزی اگر مداخلت نکری تو بیشک ریاست گوالیار تباہ ہو جائیگی اس عرصہ مین سپاہ گوالیار مستعد جنگ ہوگئی اور نواب گورنر جنرل بہادر بہی اب چنبل سے پار ہوکر ہنگونہ تک پہونچگئی ۲۵ ردسمبر ۱۸۴۳ء کو صاحب ممدوح نی اشتہار بدینخلاصہ مہارانیصاحبہ کو ارسال کیا کہ فوج انگریزی مہاراج سندھیہ کی عملداری مین بطریق پابندی شرایط عہدنامہ آپکی حمایت اور ریاست قایم رکہنی کو داخل ہوئی ہے اتفاقاً فوج انگریزی مقام چھوندہ مین آنا چاہتی تہی کہ سپاہ گوالیار مہاراجپور پر مقابل ہوئی اور ہنگامہ جنگ و جدل خوب گرم ہوا فوج انگریزی فتح پاکی چھوندہ کیطرف متحرک ہوئے اور وہان پہونچ کر بعد کشت و خون بسیار فتح پائی غرضکہ فوج انگریزی کی تین فتح متصل ظہور مین آئین نو سو آدمی انگریزی اور بہت مخالفین مجروح و مقتول ہوئی مہارانیصاحبہ اور اونکی خیر اندیشون نی جو شرایط حکام انگریزی پیش کرتی تہے قبول کین ۳ ردسمبر کو مہاراجہ صاحب و مہارانیصاحبہ باریاب ملازمت نواب گورنر جنرل بہادر کی ہوئے باوجودیکہ نواب ممدوح کو بباعث ضایع ہونے فوج کی کمال رنج تہا لیکن بخیال صغرسنی موافق رسمیات معمولی کے پیش آئی اور حکم دیا کہ اشتہار دو روز تک مشتہر کیا جائی کہ جسکا خلاصہ مضمون یہہ ہے کہ افواج انگریزی واسطی حفاظت مہاراج اور قایم رکہنی ریاست کی داخل گوالیار ہوئی

اس لئی ہدایت ہوتی ہے کہ تمامی وفادار رعیت سیندھیہ ہر طرحسی فوج مذکور کی مدد کری فوج انگریزی کسیکو ایذا اندیگی اور جو نقصان کہ سپاہ سے بی ارادہ ہوا ہوگا وہ دیا جائیگا ۵ر جنوری ۱۸۴۴ء کو نواب گورنر جنرل بہادر معہ سپاہ داخل گوالیار ہوئی اور ۱۳ر تاریخ کو گورنر جنرل بہادر نے نئی عہدنامہ کو قبول کیا اور اس عہدنامہ مین بارہ شرطین درج ہوئین جب عہدنامہ پختہ ہوگیا تو مہم گوالیار ختم ہوئی اور کاروبار ریاست حسب قرارداد جاری ہوئی۔ جائے غور کے ہی کہ باوصفیکہ مہاراج دولت راؤ سیندھیہ سرکار انگریزی سے منحرف رہی اور بہت سی لڑائیان لڑی اور بناچاری صلح کر کے تادم مرگ منتظر وقت رہے مگر سرکار انگریزی نے اونکی انتقال کے بعد کچہ خیال عداوتکا نکیا اور ریاست گوالیار مہاراج جنکو جی راؤ سیندھیہ پر برقرار رکہی اور بعد اونکی وفات کے جو مہاراج جیاجیو راؤ بہادر رونق بخش مسند گوالیار ہوئی اونکی عہد مین بہی بباعث سرکشی و فتنہ پردازی اہلکاران اکثر امور بر خلاف مرضی سرکار دولتمدار انگریزی ظہور مین آئی اور تخمیناً نو سو آدمی سرکار انگریزی کی مقتول و مجروح ہوئی مگر سرکار نصفت شعار صغر سنونکی ہمیشہ ممد معاون رہی یہہ خاکسار یقین رکہتا ہے کہ اسیطرح سرکار کی رحمدلی اور عدالت پروری سی مرزا جوان بخت اور مرزا شاہ عباس کیواسطی بہی صورت رونق کی ہووی کیونکہ ۱۸۵۷ عیسوی مین یہہ بہی دونون صغیر سن تہے۔

حال مہاراجہ صاحب والی بہرتپور

جب مہاراجہ صاحب والی بہرتپور نی جہان فانی سی انتقال کیا مہاراجہ بلونت سنگہ بہادر پسر مہاراجہ موصوف مسند نشین ریاست ہوئی دُرجن سال نے چاہا کہ مہاراجہ صغیر سن کو کسی بہانہ سی مار ڈالیئے اور دخل اپنا ریاست پر کر لیجئی جب سرکار انگریزی کو اس حال سے اطلاع ہوئی درجن سال پر فوج کشی کی اور بعد جنگ اوسکو گرفتار کیا اور مہاراجہ بلونت سنگہ بہادر کو گدی پر بٹہایا باوصفی کہ لڑائی مین لکہ ہا روپیہ سرکار کا خرچ ہوا اور نقصان سپاہ کا بہی ظہور مین آیا مگر براہ انصاف ریاست صغیر سن پر قایم رکہی اور بعد انتقال راجہ بلونت سنگہ کے مہاراجہ جسونت سنگہ بہادر صغیر سن پسر مہاراجہ موصوف کو گدی پر بٹہایا چنانچہ مہاراجہ صاحب ممدوح مقام

بھرتپور مین اب تک مسند نشین ریاست ہین فقط

حال مہاراو راجہ صاحب والی الور

مہاراو راجہ بختیاور سنگہ والی الور نے بعد وفات دو بیٹی چھوڑی ایک مہاراو بنی سنگہ گودلئی
ہوئی اور دوسری مہاراو راجہ بلونت سنگہ جوبطن رام جنی سی تہے جب باہم فساد وتنازع برپا ہوا
اور استغاثہ تا بسرکار انگریزی پہونچا سرکارنی مہاراو بنی سنگہ کوالور مین مسند حکومت پر بٹہایا
اور مہاراو راجہ بلونت سنگہ کو گدی نشین تجارہ کیا بعد انتقال مہاراو بلونت سنگہ کی تجارہ بہی
مہاراو بنی سنگہ کی متعلق کردیا بعد وفات مہاراو راجہ بنی سنگہ کی راجہ شیودہیان سنگہ پسر
مہاراو راجہ بنی سنگہ کوکہ صغیرسن تہے گدی پر بٹہایا جب سرکارنی بی انتظامی ریاست ملاحظہ
فرمائی واسطی حفاظت راجہ صاحب بہادر کی صاحب اجنٹ بہادر کو جہت بندوبست وانتظام
مقرر کیا۔ حال مہاراجہ صاحب والی جیپور جب مہاراجہ جیسنگہ والی جیپور نے انتقال
کیا مہاراجہ رام سنگہ بیٹی اونکی کوکہ صغیرسن تہے سرکارنی مسند ریاست پر بٹہایا باوجودیکہ بلاک
صاحب بہادر کومفسدون نی ہلاک کیا تو بہی سرکارنی براہ انصاف ریاست مہاراجہ صغیرسن پر
برقرار رکہی۔ حال ریاست والی منڈی جب راجہ بل بیرسین والی منڈی نے راجہ بجی
سین پسر صغیرسن چہوڑکر پہاڑ پر انتقال کیا سرکارنی راجہ صاحب صغیرسن پر ریاست قایم رکہی
جب راجہ بجی سین تیرہ چودہ برس کے عمر کو پہونچی صاحب کمشنر بہادر کو معلوم ہوا کہ راجہ صاحب
کو بیماری آتشک کی ہوگئی ہے گوساون وزیر پر جرمانہ کیا اور سُب شنکر پروہت کو جلاوطن کردیا
اور چار ہزار روپیہ کی ضمانت لیلی کہ ریاست مین نہ آنی پائی۔ حال مہاراجہ صاحب والی
پٹیالہ جب مہاراجہ نراندر سنگہ نے مہاراجہ مہندر سنگہ پسر صغیرسن چہوڑکر جہانسی کوچ کیا
بتاریخ ۲۲ رفروری ۱۸۶۳ء کو سرکار کیٹرفسی جناب کرنیل اودروس صاحب بہادر اجنٹ
نواب گورنر بہادر و جناب جرنیل صاحب بہادر جنرل چہاونے و جناب ڈگ لارنس
صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر شملہ و جناب مکیل صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر لودہیانہ و جناب نسبک
صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر انبالہ تشریف فرما ہوکر مہاراجہ مہندر سنگہ بہادر صغیرسن کو خلعت پہنایا
اور بدستور مسند نشین پٹیالہ فرمایا۔ حال مہارانا صاحب والی اودیپور مہارانا جوان

سنگہ پسر رانا بہیم سنگہ جب دنیا سی انتقال کرگئی مہارانا سردار سنگہ برادر یکجدی اونکی گدی پر بیٹہے اونہونی اپنے انتقال سے پیشتر رانا سروپ سنگہ چھوٹی بہائی اپنے کو گود لیا اور اپنے سامنی گدی نشین کیا رانا سروپ سنگہ نی اپنی زندگی مین رانا شنبو سنگہ صغیرسن پسر ساد ہو سنگہ کو کہ بہتیجی اونکی ہین اور اونکی باپکو اونہونی ہلاک کرایا تہا گود لیا اور اپنی روبرو مسند نشین اودیپور کیا جب سرکار نی باہم تنازع وبی انتظامی ملاحظہ فرمائے جناب صاحب رزیڈنٹ بہادر اجمیر تشریف فرما ہوئی باوجودیکہ رانا صاحب پسر صلبے رانا سروپ سنگہ کی نہ تہی گود لئی ہوئی تہے اور رانا سروپ سنگہ کی ساتہہ خواص بہی ستی ہو چکی تہے براہ رحم دلی رانا صاحب صغیرسن کو خلعت پہنایا اور واسطے انتظام و بندوبست کی صاحب اجنٹ بہادر کو مقرر فرمایا۔

حال روٗسائی پاٹودی محمد اکبر علیخان بہادر مرحوم رئیس پاٹودی بتاریخ یکم رمضان ۱۲۷۸ ہجری مطابق ۳ / مارچ ۱۸۶۲ء کو رحلت کرگئی اونکی بیٹی محمد تقی خان بہادر مرحوم بجائی پدر مسند نشین ہوئی بتاریخ چھٹی ذیحجہ ۱۲۷۸ ہجری مطابق پانچوین جون ۱۸۶۲ء کو جب وہ مر گئے محمد مختار حسین خان بہادر بیٹے اونکی ریاست پر قایم رہے حال روٗسائی جاورہ محتشم الدولہ نواب غوث محمد خان شوکت جنگ رئیس جاورہ تاریخ ۲۹ / اپریل ۱۸۶۵ء مطابق ۳ ذیحجہ ہجری روز شنبہ کو فوت ہوئی سرکار معدلت شعار نی براہ رحم دلی احتشام الدولہ محمد اسمٰعیل خان بہادر فیروز جنگ بیٹی اونکی کو تخمیناً بعمر دس برس کی تہی بجائی پدر بدستور مسند ریاست پر قایم و برقرار رکہا اسیطرح سرکار نی اور ریاستونمین بہی صغر سنونکی پرورشین کین اور ریاستین برقرار رکہین جو لوگ عملداری سرکار پر طعن کرتی ہین وہ بغور دلمین انصاف کرین کہ اگر سرکار کو بگاڑنا ریاستونکا منظور ہوتا تو صغر سنونکی کیون پرورشین کرتے اور صاحبان اجنٹ واسطی انتظام کے کیون مقرر فرماتی جس وقت کوئی رئیس یا راجہ انتقال کر جاتا قبض و تصرف اپنا کرلیتی فقط حال بی انتظامی مقام لکہنو ۱۸۲۰ء مین جو خاکسار طرف لکہنوٗ کی روانہ ہوا جب نانا مئو کی گہاٹ علاقہ بانگر مئو مین پہونچا قریب ایک تالاب کے بیس پچیس لاشین پُر بیونگی اسطور پر کہ سرجدا اور تن جدا دیکہنے مین آئین مجہکو یقین ہوا کہ یہانسی زندہ جانا محال ہے آگی بڑہنا خواب و خیال ہے جو کہ نوکر چاکر میری ہمراہ موجود

تہی رہزنونکا کچہہ بس نہ چل سکا مین آ گی روانہ ہوا جب بانگر مئو مین پہونچا وہاں ایک چکلہ
دار صاحب تہی کہ وہ بہی رہزنوسی کچہہ کم نتہی گہوڑا برنگ سبزہ اونکی پسند آیا بدم وفریب مجہسی
لینا چاہا جوکہ ہنگام روانگی میڈ ہو خان رسالدار نی لکہنؤ سی مجہکو لکہا تہا کہ مہر میری نام کی کندہ
کرا کے لیتے آنا وہ مہر چکلہ دار کو معاینہ کرائی اور کچہہ دباغت میڈ ہو خانکی دکہلائی جب
چکلہ دار کی دام فریب سے رہائی پائی بلکہ چکلہ دار نے آدمی اپنے میری ہمراہ کردئی کہ وہ
بحفاظت تمام لکہنؤ مین پہونچا گئے لکہنؤ مین جا کر یہہ حال دیکہا کہ ہر روز بلا ناغہ خانہ
جنگیان ہوتی ہین صدہا آدمی مفت ضایع ہوتی ہین اور ایکطرفہ ماجرا یہہ دیکہنی مین آیا کہ
گرہیونپر جو سہ بندیکی لوگ نوکر ہوکی جاتے اول بار نکی گرہ سی دیتی جب چہرہ لکہوا کر
گرہیونپر روانہ ہوتے آٹہہ دس روز کی عرصہ مین یہہ سنّنی مین آتا کہ جو لوگ سہ بندی کے گئی
تہے پچاس ساٹہہ آدمی اونمین سے ماری گئے حال مقام لکہنؤ ۱۸۳۴ء مین جو اتفاق
میرے جانیکا دوبارہ لکہنؤ مین ہوا تو وہ عہد نصیر الدین حیدر کا تہا اوسوقت مین سابق سے بہی
حال بدتر وخراب دیکہا تیسری محرم کو جو مین بخدمت جان لو صاحب بہادر رزیڈنٹ کی
ملاقاتکو گیا تو راہ مین یہہ حال دیکہا کہ بازار مین ہٹ تال ہورہی ہے بیرونقی بدرجہ کمال ہو
رہی ہے سب دوکانین بند و مقفل ہین مسجدونپر بہی قفل ہین جب منی حال دریافت کیا تو
لوگون نی کہا کہ جہان پناہ نی آج حکم دیا ہی کہ کوئی سنت جماعت بازار مین نہ آئی گہر سے
باہر نکلنی نہ پائی عند الملاقات جو صاحب موصوف نے حقیقت لکہنؤ مجہسی پوچہی جو حال کہ
منی راہ مین دیکہا تہا وہ بیان کیا صاحب ممدوح نی اوسیوقت مولوی غلام یحیی وکیل جہان پناہ
کو طلب فرمایا اور زبان نصفت بیان سے ارشاد کیا کہ آج بحکم جہان پناہ بازار مین ہٹ
تال ہے رعایا کو تکلیف بدرجہ کمال ہے اگر ایسی احکام پیشگاہ جہان پناہ سی جاری ہونگی تو
جہان پناہ کی قسمین بہتر نہوگی وکیل مذکور نی تمام حال جہان پناہ سی عرض کیا وہانسی بنام
درشن سنگہ درباب انتظام حکم ہوا درشن سنگہ نی شہر مین منادے کرادی کہ کوئی شخص فساد
نکرنے پائی اگر کریگا تو قابل سزا کی ہوگا اوسیوقت دوکانین کہل گئین اور لوگ بدستور
چلنی پہرنے لگے ظلم سی مقام لکہنؤ مردمان ثقات سی جو سنا اور کتاب حدیقہ شہدا مین جو
دیکہا مختصراً تحریر کرتا ہون کہ اودہ مین ایک ٹیلا تہا کہ اوسکو ہنومان بیٹہک کہتی تہے عالمگیر

بادشاہ نی اوسکے قریب مسجد بنوادی بعد عرصہ دراز بیراگیون نی ہنومان گڈہی مین داخل کرلی شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح نے درباب قایم کرنے مسجد کے فیض آباد کا ارادہ کیا شاہ اودہ نی ملازمان سرکاری واسطی تحقیقات کی بہیجی دونون مولوے بامید دادرسی مسجد بابر مین مقیم ہوئی دس بارہ ہزار گنوار وغیرہ نی آ کر مسجد کو گہیر لیا اور سب مسلمانونکو ہلاک کیا جو کہ اہلکاران والی اودہ کو نذرانہ پہونچ چکا تہا کچہہ انصاف نہوا مولوی امیر الدین علی نے مع مسلمانان بارادہ انتقام فیض آباد کا سفر کیا جب مقام امیٹی مین پہونچی امیر حیدر مولوی صاحب کے پاس آئی اور مسجد بنوا دینی کا وعدہ کرکی شاہ اودہ پاس لائی مولوی صاحب نی کہا کہ آپ مقدمہ ہمارا صاحب رزیڈنٹ بہادر کے سپرد کردین تا کہ ہم اپنی داد کو پہونچین شاہ اودہ اس درخواست پر راضے نہوئی مگر ایسا دم دلاسہ دیا کہ مولوی صاحب نی ارادہ فیض آباد کا ملتوی رکہا باوجود گزرنی عرصہ درازگی جو ایفائی وعدہ نہوا مولوی صاحب نی پہر ارادہ کیا شاہ اودہ نی پہر وعدہ کرکے اونکو روکا اسیطرح کئے مرتبہ قصد کیا مگر شاہ اودہ نے جانی ندیا آخر کو مولوی صاحب ناچار ہوکر راہی ہوئی جب دریاباد کی میدانمین پہونچی چند علماء زر پرست نے آنکر ہمراہیان مولویصاحب کو اغوا کیا اکثر لوگ پہر گئے اور فوج شاہی نے لشکر کی رسد بند کردی آب ودانہ کیطرفسی کمال تکلیف دی ۲۶رصفر ۱۲۷۲ ہجری مطابق ۷رنومبر ۱۸۵۷ء کو مولوی صاحب نے کوچ کیا شیخ حسین علی نے مولوی صاحب سی آکر کہا کہ چند روز مقام ردولی مین آپ تشریف رکہیں جہان پناہ مسجد بنوادینگے مولوی صاحب ردولی کو روانہ ہوئی جب ٹکیریکی برابر پہونچی تو وہان توپ خانہ شاہی لگا ہوا تہا گولہ اندازون نے گولہ مارنا شروع کیا ہمراہیان مولوی صاحب ایسی لڑے کہ لشکر شاہی بہاگ گیا لیکن توپونکی پیچہی اور توپین خفیہ لگی ہوئی تہین وہانسی چہرّا لگنا شروع ہوا لشکر مولوی صاحب اگرچہ کم تہا لیکن پانسو مخالف ہلاک کئی آخر کو جانبازی کرتی کرتے خود بہی تمام ہوئے ایک ظالم نی آکر سر مولوی صاحب کا تن سے جدا کرلیا خلعت وانعام حاصل کیا اوراونہین دنونمین بمقام کہیری لہرپور ایک جولاہی نے عشرہ محرم کو چبوترہ بنا کر تعزیہ رکہا تہا جبکہ راجہ قصبہ مذکور وہان پہونچا چبوترہ تڑوادیا تعزیہ جلوادیا جولاہی نے شاہ اودہ سے استغاثہ کیا وہانسے حکم ہوا کہ جبتک سر راجہ کا کاٹکر نلائینگی ہم خاصہ تناول نفرمائینگی فرستادگان نی جاکر راجہ سی کچہہ معاملہ

کرلیا کسی شخص بیگناہ کا سر کاٹکر بھجوا دیا جب غصہ فرو ہوا خاصہ تناول کیا جو کہ واجد علیشاہ نی عہد نامہ اسمضمون کا سرکار کو لکہدیا تہا کہ اگر ریاست لکہنؤ مین کسیطرحکی بے انتظامی ظہور مین آئی تو سرکار اپنا دخل کرلی جب کہ سرکار نی صدہا طرحکی بے انتظامیان ملاحظہ فرمائین لہذا بندوبست سرکاری عمل مین آیا ظاہر ہے کہ والی لکہنؤ نی جو ظلم سی رعیت روا رکہی اوسکا نتیجہ پایا کہ دس پشتکی ریاست اور ایک سو پینتالیس برسکی حکومت کا نام ونشان تک جاتا رہا اور سرکار نی جو نصفت پرور یکی آفریدگار عالم نی ملکونکو قبض وتصرف مین کر دیا فیض رسانی سرکار غدر مین جس نے ادنیٰ خیر خواہی کی اوسکو بعد فتح دہلی خلعت وانعام ملا اور جاگیر و پنشن مقرر ہوئی اور اگر کوئی خیر خواہ محروم رہگیا یہہ ہندوستانی چغل خوردن کا سبب ہوا انصاف اگرچہ سرکار خاندان تیموریہ سے خفا تہی اوسپر بہی جب ۱۱ر ستمبر ۱۸۵۸ء کو خیر اندیش نے بخدمت چارلس ساانڈرس صاحب بہادر کمشنر دہلی خط اسمضمونکا لکہا کہ سلاطین و بیگمات بیگناہ بہوکے مرتی ہین صاحب ممدوح نی ہر ایک بادشاہزادہ اور بادشادیکی لئے روزینہ مقرر کر دیا اور پہانسیان موقوف کین اور عبد الرحمٰن خان والی جہجر واحمد علیخان والی فرخ نگر اور ناہر سنگہ والی بلم گڑہ کو بعلت بغاوت باوجودیکہ پہانسیان لگ گئین اون کے متعلقین کے لئی روزینہ مقرر ہوگیا اور نیز تاریخ ۲۵ر ستمبر ۱۸۵۸ء کو خط خاکسار نے خط درباب بی قصوری رعایا متضمن بچند عذرات بخدمت جناب فلپ ہنری انجرٹن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر دہلی ارسال کیا سرکار سی براہ رحم دلی رعایا پر بہی نظر عنایت مبذول ہوئے خاتمہ سبحان اللہ کیا اوس کی شان ہی کہ آناً فاناً مین کچہہ کا کچہہ کر دکہاتا ہی ادنیٰ سے اعلیٰ اعلیٰ سے ادنیٰ بناتا ہی ہر چند ہر ایک واقف حال ہے کہ یہہ دنیا خواب وخیال ہے مگر اسقدر غفلت چہائی ہے کہ بالکل بے اعتنائی مقام عبرت کا ہی کہ وہ تیمور جسنی روم وشام تک قبض و تصرف پاتہا اور جسکی دبدبہ نی ملکونمین شور مچایا تہا اوسکی نسل مین پانسو دو برس چار مہینے بیس روز سی بادشاہت چلی آتی تہی بد اقبالی نے نام و نشان تک مٹا دیا کم طالعی نے سب کچہہ خاک مین ملا دیا
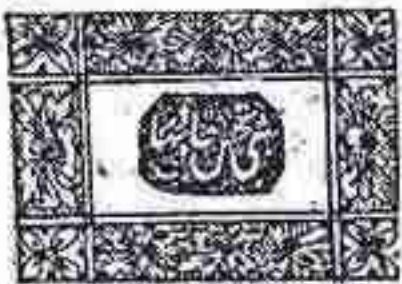
حسب قانون بستم ۱۸۴۷ عیسوی کوئی صاحب اس کو طبع نکرائین فقط واسطی تصدیق اپنی تحریر کے نقول بعضی کواغذات لکھی جاتی ہین۔

نقل شقہ حضور والا موسومہ معظم الدولہ امین الملک اختصاص یار خان طامس ثیافلس مٹکف بہادر فیروز جنگ قایم مقام اجنٹ بہادر موصولہ بست و ہشتم ۲۸ راپریل ۱۸۳۵ عیسوی بزرگان شرافت ونجابت مرتبت فدوی خاص مشرف الدولہ بہادر کہ منصبدار قدایم این در دولت بودند در ینولا بنا بر سوال و جواب مقدمات بادشاہی مقرر نمودہ شد ہر چہ کہ سوال و جواب نماید ارشادات مابدلت تصور نمودہ راست و درست دانند زیرا کہ مابدولت را ساختہ و پرداختہ منشار الیہ بہر طور منظور است و اگر احیاناً کسی دیگر بذریعہ شقہ والا یا چیزے زبانی بیان ساز د اصلاً و مطلقاً قرین صدق و اعتبار نداند لہٰذا اشرف ارقام میرود کہ آنفدوی خاص خان مشار الیہ را بتوقیر و احترام مدارج ملاقات ملحوظ داشتہ جواب مقدمات معرفت خان مسطور معروض داشتہ باشد درینباب موجب خوشنودی و استرضائے حضور دانند زیادہ تفصلات

شناسد دستخط انگریزی نقلمطابق اصل است

العبد

داخل دفتر گردد مرقوم بست و ہشتم ابریل ۱۸۳۵ نور الدین احمد میر منشی الحینتی شاہجہان آباد

ترجمہ سائیفکٹ جناب چارلس سیلی سانڈرس صاحب بہادر کمشنر و اجنٹ دہلی مورخہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء نواب نبی بخش خان بڑی معزز مسلمان صاحب ہین انہون نے بادشاہ دہلی کو عرضی درباب ناجائز ہونے قتل انگریزی قیدیون میمون اور بچون کے گذرانی تھی یہ عرضی بروقت دخلیابی قلعہ بادشاہ کی محلمین سے ہماری ہاتھہ لگی مستحق بہت زیادہ لحاظ کی ہوئی

ہمنی انکو پانسو روپے دیئی اور ہم درخواست کرتی ہین کہ افسران انگریزی ہر طرحسی انکا ادب لحاظ کرین اور یہہ معہ اپنی کنبی کے شہر مین آباد ہون

نقل خط جناب فلپ ہنری انجرٹن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر دہلی بنام خاکسار

نمبر ۳۲ مرزا رحیم بیگ نے عرضی بدرخواست پرورش یا پنشن اپنی بجلدوے اسکی کہ بایام غدر حاجی بیگ پسر سائل کو آپ نی معہ خط بخدمت جناب صاحب کمشنر بہادر میرٹھہ بمقام پہاڑے بہیجا تہا سو بخت خان نے اثناء راہ مین اوسکو مار کر لٹکا دیا گزرانی لہذا نقل عرضی مذکور برائی ملاحظہ آپکی ملفوف رقیمہ ہذا مرسل ہو کر نوکریز کلک تو دوسلک ہوتا ہے کہ کیفیت اسمقدمہ سی مطلع فرمائے۔ مرقوم سیزدہم ۱۳ ر ماہ تمبر ۱۸۵۹ء دستخط انگریزی مطلع شد شوقیرام سررشتہ دار ۲۱ ر جولائی ۱۸۵۹ء کو مختاران مولوی نذیر حسین صاحب نے جو عرضی بتنازعہ مولوی عبدالقادر بحضور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر گزرانی خلاصہ اوس کا یہ ہی عبدالکریم و محمد صدیق شاگردان مولوی نذیر حسین نے روبرو نواب نبی بخش خان کے اپنی اوستاد سے کہا کہ میم صاحبہ زخمی باغمین پڑی ہین مولوی صاحب نے بصلاح نواب نبی بخشخان میم صاحبہ کو اوٹہا منگایا اور تین مہینی آٹہہ روز تک اپنی گہر مین رکہا اور زخمون سے اچہا کر کے پہاڑی پر پہونچوادیا مولوی عبدالقادر کو صرف اتنی بات پر کہ وہ خواجہ صاحب جاتی تہی اور بیٹا مولوی نذیر حسین کا میم صاحبہ کو رتہہ مین پہاڑی پر لئے جاتا تہا مولوی صاحب نے اونکو بہی ساتہہ کر دیا سوا اونکو تین سو روپیہ اور ایک کٹرہ جس کی آمدنی تقریبا بیس روپیہ ماہوار ہوگی مرحمت ہوا مقام غور ہے کہ عبدالقادر سے زیادہ حق دار نبی بخش خان صلاح دہندہ ہین فقط۔

ہر کہ خواند دعا طمع دارم زانکہ من بندہ گنہگارم

ہر کہ نویسد بخط خوش رقم جملہ مرادش تو بدہ از کرم

بتاریخ ۱۵ ر جنوری ۱۸۷۵ عیسوی بخط خواجہ ممتاز تحریر یافت

COPIES OF LETTERS

No.1317

From: T.J. CHICHELE PLOWDEN, Esqr.
Offg. Under Secy to the Govt. of India,

To NAWAB NABI BUKSH KHAN.

Fort William, 29th March 1873.

Sir,--In reply to your letter dated the 9th instant, I am directed to state that the Government of the Punjab to Home Dept. Public. whom your Fatwa has been referred will without doubt do justice to its merits. Meanwhile, I am to observe that it was not intended to ignore the loyalty which your Fatwa displays and for which the Governor General in Council expresses his high consideration.

I have the honor to be,

Sir,

Your most obedient servant,

(Sd) T. J. C. PLOWDEN.

Offg. Under Secy. to the Govt. of India.

The bearer Nawab Nubbee Baksh Khan, a highly respectable Mahomedan gentleman who presented to the king of Delhi a petition praying him not to permit the slaughter of the European prisoners, women, and childern, which petition was

---

Religious virdict advocating the unlawfulness of the jehad against the British Rulers of India

found in the king's apartments accidently upon our taking possession of the Palace, is deserving of the highest consediration.

I have presented him with 500 Rupees, in consideration of the service performed by him, and beg to request that he may be treated with every respect and consideration by British Officers, and be allowed to return to his house in the City with his family.

CHAS. P. SAUNDERS,

December 5th 1857 Offg. Commissioner.

Copy of a letter No. 21, dated 28th December 1857 from C.B.SAUNDERS, Esqr, Offg. Commissioner, Delhi ; to P. H. EGERTON, Esqr. Collector Delhi.

I have the honor hereby to authorize your paying to the bearer Nawab Nabi Baksh Khan a very respectable old man the sum of Cash Rs. 500 as a reward for highly meritorious conduct in having at the risk of incuring His displeasure and losing his own life president a petition to the Ex-king of Delhi urging on him in very strong terms the necessity of

using his influence with the soldiery and others to protect the lives of the Ladies and childern then in confinement in the Palace.

A translation of his petition is appended and you are requested to charge the amount of this reward in the Contiongent Bill of your office under authority of this letter.

True Copy
Seal of the Commissioner's Court Delhi 1857.
(Sd) F. W. POCOCK
Head clerk

Extract from a letter from P. H. EGERTON, Esqr., Deputy Commissioner of Delhi to Nawab Nabi Baksh Khan, dated June 30th 1858

Sir,- Your reward was recommended by the Commissioner at what he thought proper, and I am unable to recommend any further reward for you. The consciouness of having done so good and brave a deed must be an immense happiness to you.

Yours obediently,
(Sd.) PHILIP H. EGERTON,
Deputy Commissioner.

Extract from the Government of India, Home Department, letter No. 519, dated 8th November 1858, Circulated in the Punjab under the Judicial Commissioner Punjab's Circular Order No. 117, dated 22nd November 1858.

16- The most deserving of indulgence are those, who have had a share in saving lives of English Subjects

Abstract translation of a letter from P. H. EGERTON, Esqr. Deputy Commissioner of Delhi, to Nawab Nabi Baksh Khan, No. 132, dated 13th September 1859.

After the usual complements, request further particulars regarding Haji Begg, who was sent by Nawab Nabi Baksh Khan to Mr Greathed Commissioner of Meerut on the ridge with information of the rebellion at Delhi, and was murdered by the mutineer Bakht Khan, as Mirza Rahim Begg, the father of the deceased has applied to the Deputy Commissioner for employment or pension in consideration of his son having been thus murdered.

(Sd) P. H. EGERTON.

Extract from a certificate from P. H. EGERTON,

Esqr., dated Kangra December 12th 1862.

Nawab Nabi Baksh Khan whom I knew very well when Deputy Commissioner of Delhi has taken the trouble to pay me a visit to Kangra, with the view of obtaining from me a written certificate of his services to Government and qualifications for employment.

In 1857 when the records of the Ex-king of Delhi were seized and examined, a very strong feeling in favor of the Nawab was excited by the petition from him to the Ex-king which was then found remostrating against the murder of English women and childern who had been collected in the Palace which was then in contemplation.

Mr. Saunders Officiating Commissioner at Delhi, sent him a reward of Rs 500 at the time and I believe he has never recieved any thing more from our Government. I have always given the old gentlement credit for this act, by which at the risk of his life and apparently in the interest of humanity alone, he protested against a barbarous and savage massacre.

And as in those days a doubt was generally given against any one suspected of rebellion, it is but fair that one should be given favor of a person

supposed to have been loyal.

(Sd) PHILIP H EGERTON,

Deputy Commissioner of Kangra late of Delhi.

The bearer of this Nawab Nabi Baksh Khan is a gentlement of Delhi of great respectablity.

(Sd) G. W. HAMILTON ,

Delhi, 13th July 1864 Commissioner.

Copy of a letter from D, FITZPATRICK, Esqr, Deputy Commissioner of Delhi to J. W. SMYTH, Esqr, Deputy Commissioner of Lahore.

Dated 4th March 1868

My DEAR SMYTH,- The Nawab Nabi Baksh Khan one of our Raises here who is said to have been distinguished as a Khair-Khah in difficult times ask me to write this as an introduction for him.

Copy of a letter from the Honorable C. BOULNOIS, Esqr. Judge, Chief Court Punjab to Nawab Nabi Baksh Khan, dated Lahore 16th May 1868.

My DEAR SIR,- I have to thank you for the copy which you have been kind enough to offer me

of your book called Adal Ahal-i-Farang. The motive, occasion and execution of the work are, I am sure, most creditable; more especially the former.

I note that your loyalty has been recognized by many distinguished officers and I doubt not that it remains as steadfast and sincere as you have shown it to be in days gone by.

Expressing my high consideration of your conduct, as testified to in the documents.

I am, Yours faithfully,
(Sd.) C.BOULNOIS,

Nawab Nabi Baksh Khan of Delhi, holds a letter from my brother which fully explains the service he performed to Europeans in the mutiny, and the motive which actuated him at that time can scarely have been one of self interest-he is certainly deserving of all consideration for his boldness. He has written a book which attributes many virtues to the European rule-and which he has publicly read out at a full meeting of the Anjuman-i-Punjab during his present stay in Lahore-another proof of his boldness in asserting

that the British rule is preferable to the rule of former native dynasties at this time when so much is being written and said on the opposite side.

(Sd.) LESLIE SAUNDERS,

Lahore, June 25th 1868 settlement Officer

Nawab Nabi Baksh Khan a respectable native gentlement of Delhi, intends visiting Benares and other Stations. this note is given to him by way of any introduction to European Officer to whom he may wish to pay his respect.

He receives a chair and is on the Government Darbar List.

(Sd.) W. McNeile,

Commissioner

Delhi, March 1st 1869

The son of the writer presented me with a copy of his book "Adal Ahal-i-Farang." This book contains the essence of loyalty.

The writer with honesty and candour clearly shows how very much happier the natives of India are under the British rule where justice is meted out to all impartially.

The writer brings up facts from Indian History

showing what cruelty and oppression was exercised under the Mohamedan and Hindoo Rule.

Nawab Nabi Baksh Khan well deserves the respect of the English in consideration of his humanity in saving the lives of the European prisoners.

(Sd.) R. A. Napper, Colonel,
Delhi, 11th May 1874, A. C. Magistrate

Simla, 15th June 1876

My Dear Sir- I have to acknowledge receipt of your note of the 6th enclosing a petition to be presented to Lord Napier of Magdalal late Commander-in -Chief in India.

I have now to inform you that His Lordship left India on the 10th of April for England and that he is not likely to return to this country. I will however take an opportunity of making known to the late Commander-in-Chief the purport of your petition which does great credit to your loyality any humanity. As far as we can see at present there does not seem to be and probability of our becoming engaged in war with Russia, which as you say would be attented with fearful loss of life and property.

Hoping this will find you in the enjoyment of good health believe me

Yours Sincerely,
(Sd) H. MOORE, Lt Col.

Private Secy to His Excellency the Commander-in-Chief.
To
Nawab Nabi Baksh Khan,
Grandson of Nawab Aughar Khan Bahadur Turk Jang.

Rais of Delhi.

خواجہ اماں دہلوی: بدرالدین خاں عرف خواجہ اماں، دہلی کے رہنے والے، مرزا غالب کے عزیز تھے، یعنی بقولِ غالب ''میرے ایک رشتے دار کے بھتیجے۔'' انھوں نے داستان 'بوستانِ خیال' کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ 'بوستانِ خیال' کا مصنف میر تقی خیالؔ گجرات کا رہنے والا تھا۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں دہلی آیا۔ اس زمانے میں 'داستانِ امیر حمزہ' بہت مقبول تھی۔ میر تقی خیال نے اس کے جواب میں 'بوستانِ خیال' لکھی۔ چونکہ پہلی داستان میں تاریخ اسلام کے ایک بزرگ حضرت امیر حمزہ کے کارنامے تھے، اس لیے خیالؔ نے بھی ایک تاریخی ہستی تلاش کی، اور شاہزادہ معزالدین ابوتمیم کو ہیرو بنایا جو حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل میں تھے۔ میر تقی خیالؔ نے دس جلدوں میں بہت ضخیم داستان تیار کی ہے۔ خواجہ امان دہلوی نے مہاراجہ شیودان سنگھ والیِ ریاست الور کی فرمائش سے پانچ جلدوں کا ترجمہ کیا۔ باقی کے لیے عمر فانی نے وفا نہ کی۔

ترجمہ خواجہ امان کی پہلی جلد کا نام ''حدائق الانظار'' اور دوسری کا ''ریاض الابصار'' ہے۔ پہلی جلد کے لئے غالب نے دیباچہ لکھا تھا جس کا اقتباس ان کے نمونوں میں درج کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ذکر غالب نے کئی دوستوں کو لکھا ہے اور خریداری کی فرمائش کی ہے۔ خوجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں: ''-میرے ایک رشتہ دار کے بھتیجے نے بوستانِ خیال کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے، میں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے...... آپ کے پسند آئے یا اور اشخاص

خرید کرنا چاہیں تو چھ روپیہ قیمت اور محصول ڈاک ذمہ خریدار ہے۔"

خواجہ امان نے تمہید میں مقفّی عبارت لکھی ہے، اور عربی فارسی سے کام لیا ہے، لیکن اصل داستان بہت سادہ سلیس لکھی ہے۔ 'ریاض الابصار' کی تمہید کے چند فقرے یہ ہیں:-

"امید کہ یہ ناظورۂ تالیف جدید بھی مثل جملہ گزرانید بحصول نقد سرخروئی، پذیرائی، اور خلعت سرسبزی اَحسنت، جیب وداماں مراد کو پُر کرے، اور چاکر موروثی اسی وسیلہ جزیلہ کے سبب گاہ گاہ مذکور بارگاہ فلک کارگاہ وسرمایۂ اعزاز وتفاخر ہووے۔ خدا کا شکر کہ ادائے شکر خداوندِ نعمت کے پردے میں ادائے شکرِ نعمتِ خدا ہو، یعنی شکر نعمت خداوند کیا، شکر خدا ادا ہوا۔"

داستان کا نمونہ یہ ہے۔ اس قدر صاف با محاورہ زبان لکھی ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتی:-

"اب عاقب حرانی کا حال سنو، اول بیان ہوا ہے کہ عاقب حرانی حکومت کے علاوہ فنِ عیاری میں بھی نہایت مستعد وچالاک ہے۔ اس نے ایک شب قصد کیا کہ خبر واخبار کے واسطے حریف کے لشکر میں چلئے اور دیکھئے کہ کردہ حکیم ضار منکوس کس کام میں مشغول ہے۔ آخر عاقب حرانی ایک نقب کی راہ سے جس کا دہن بیرون شہر باغ میں تھا، باہر نکلا اور بہت ہوشیاری سے جم قدر کے لشکر میں پہنچا۔ قضارا اس وقت ایک خدمت گار خاص ضار منکوس کے کسی کام کے واسطے خیمے سے نکلا تھا۔ عاقب نے اس خدمت گار کی گردن میں اس طرح کمند بندکی کہ حلق سے آواز تک نہ نکلی۔ بعد ازاں اس کا پشتارہ باندھ کر ایک خرابے میں رکھ آیا، اور اپنی صورت اس خدمت گار کی شکل سے تبدیل کی، بلکہ اسی کا لباس پہنا اور خدمت گاروں کی صف میں وارد ہو گیا۔"

مولوی غلام امام شہید: والد کا نام مولوی شاہ غلام محمد۔ قصبہ امیٹھی، ضلع لکھنؤ وطن تھا۔ عربی وفارسی کے بڑے عالم تھے۔ فارسی آغا سیّد اسمٰعیل مازندوانی سے حاصل کی تھی، نظم فارسی میں مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ اُردو میں شیخ مصحفی کے۔ ایک عرصہ تک صدر نظامت آگرہ میں سررشتہ دار رہے۔ ۱۸۳۹ء میں سر سیّد احمد خاں بھی نوکر ہو کر آگرہ آگئے۔ مولانا شہید، سر سیّد اور دیگر مشاہیر آگرہ کی صحبتیں گرم رہتی تھیں۔ شہید کی ترک ملازمت کے بعد ہندوستان کے مشاہیر امراء ورؤساء ان کی خدمت کرتے رہے۔ نواب کلب علی خاں والیِ رامپور، سر سالار جنگ وزیر اعظم حیدر آباد، سعید عالم خاں رئیس سورت ان کے بڑے قدر دان تھے، حیدر آباد سے ۴۳۰ روپیہ سالانہ نذرانہ مقرر ہو گیا تھا، جو آخر عمر تک ملتا

رہا۔ یہ سب قدر دانیاں شہید کے عشق و محبت رسولؐ اللہ کی برکتیں تھیں۔ ان کی شیفتگی و فدائیت اس درجہ پر پہنچ گئی تھی کہ کہ بجز نعت شریف لکھنے اور پڑھنے کے کوئی شغل نہ تھا۔ اسی سبب سے 'مدّاحِ نبی' اور 'عاشقِ رسول' کے مبارک القاب سے مشہور تھے۔ اطراف ہندوستان میں اضلاع آگرہ و مراد آباد و رامپور والہ آباد و دکن میں شہید نے صد ہا شاگرد و مرید چھوڑے۔ پیرانہ سالی میں ۱۸۷۶ء (۱۲۹۳ھ) میں انتقال کیا۔ منشی غلام غوث بیخبر نے طویل قطعہ تاریخ کہا ہے، مصرع تاریخ یہ ہے:۔ ''وائے امام شعرا شد شہید'' = ۱۲۹۳ھ۔

فارسی میں قصائد و غزلیات وغیرہ کا ضخیم کلیات شہید کی یادگار ہے۔ اُردو میں 'انشائے بہارِ بے خزاں' ان کے خطوط و مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو ۱۸۶۶ء میں مرتب و شائع ہوا۔ دوسری کتاب محفل میلاد النبیؐ میں پڑھنے کے لیے تصنیف کی جو'مولد شریف شہید' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب اس قدر مشہور ہوئی اور اتنی مرتبہ چھپی کہ اس کی اشاعتوں کا شمار دشوار ہے۔ آج تک رائج و شائع ہے۔ اس کے ایک ایک فقرے، ایک ایک روایت، ایک ایک شعر سے شہید کا عشق و ولولہ، جوش و شوق، سوز و درد مترشح ہے۔ سنا ہے جب شہید خود اس کو محفل میں پڑھتے تھے، عجب سماں بندھ جاتا تھا۔ اکثر اہلِ محفل پر وفورِ رقت سے غش طاری ہو جاتا تھا۔ اس طرز اور اس مقصد کی یہ اُردو میں پہلی کتاب ہے۔ اس کو دیکھ کر لوگوں نے اس سے اخذ و اقتباس کیا، اس کی نقلیں کیں، اس کے ہو بہو نمونے کی کتابیں لکھیں۔

'مولد شریف شہید' میں حمد و نعت کے مقامات مقفّٰی، عالمانہ اور عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب سے معمور ہیں۔ باقی مضمون سادہ عبارت میں ہے۔ لیکن اس میں بھی عربی فارسی کے الفاظ بیساختہ قلم سے نکلتے ہیں۔ الفاظ کی تقدیم و تاخیر کا وہی قدیم رنگ ہے۔ بعض مقامات سے مختصر نمونے دکھائے جاتے ہیں۔ حمد و نعت میں اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

''سبحان اللہ تعالیٰ شانہٗ کہ ذات مستجمع صفات اس کی، بَری ہے شرک اور زوال سے، اور الوہیت اور صمدیت اس کی پاک ہے ادراک وہم خیال سے، مشابہت اعراض اور جواہر سے قطعاً مبرّا، اور مناسبت

اوہام خواطر سے مطلقاً معرا۔ کیسا معبود مطلق کہ جس نے بنی آدم کے واسطے چراغ رہنمائی کا انبیاء کے ہاتھ میں دیا، اور تمام عالم کو سیدالانبیا، سیدالاصفیا، احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شمع جمال جہاں آرا سے روشن کیا۔"

تخلیق نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اے عاشقانِ روے محمدؐ واے شیفتگانِ گیسوے احمدؐ، جانو اور آگاہ ہو کہ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم مادۂ تمام موجودات اور خلاصہ جمیع کائنات کا ہے، یعنی جب صانع باکمال کو ظاہر کرنا اپنے حسنِ بے زوال کا منظور ہوا، پہلے نورِ احدیت سے نورِ احمدی پیدا کیا، اور تمام موجودات کو اس کے نور سے عالمِ ظہور میں لایا۔ اور ظہور اس ذات ستودہ صفات کا سب انبیا کے بعد محض اس واسطے تھا کہ جس طرح بعد طلوع آفتاب کے روشنی ماہتاب اور ستاروں کی چھپ جاتی ہے، فروغِ ملتِ محمدیؐ ناسخ سب ملتوں کی ہے۔ اگر وہ نورِ قدم پہلے سب کے جلوہ افروز ہوتا تو اور انبیاء رسالت اور نبوت سے محروم رہتے۔ رباعی لایعلم

پیش از ہمہ شاہان غیور آمدۂ ہر چند کہ آخر بظہور آمدۂ

اے ختم رسل قرب تو معلوم شد دیر آمدۂ از راہِ دور آمدۂ

سیرت پاک کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"جب عمر شریف آٹھ برس کی ہوئی تو عبدالمطلب کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی۔ دریافت کیا کہ اب ایام اپنی موت کے قریب آئے۔ ابوطالب وغیرہ سے کہا کہ اگرچہ موت سب کے واسطے ہے لیکن مجھے اس فرزند ہشت سالہ کی یتیمی پر کہ ابھی صغیر تر اور یتیم بے مادر و پدر ہے، سخت حسرت و تاسف ہے، کاش عمر میری اس کی تربیت تک وفا کرتی تو اپنے سامنے خاطر خواہ تربیت اور پرورش کرتا، اب تم میں سے کون اس کی پرداخت کا متکفل ہو سکتا ہے۔ ابولہب نے کہا میں بجان و دل حاضر ہوں، جواب دیا کہ تو دولت و مال البتہ بہت رکھتا ہے، لیکن سنگ دل اور بے رحم ہے، فرزندانِ یتیم اکثر مجروح دل، شکستہ خاطر، نازک مزاج ہوتے ہیں، تھوڑے سے رنج کا تحمل نہیں کر سکتے، شاید تجھ سے کسی بات میں خاطر نازک اس یتیم کی آزردہ ہو جائے۔ بعدہٗ حمزہ نے مثل ابولہب کے التماس کیا، جواب پایا کہ تو کوئی فرزند نہیں رکھتا، اس یتیم کے درد سے کیوں کر خبردار ہوگا۔ پھر عباس نے کہا اگر میں اس خدمت کا سزاوار ہوں تو شرط خدمت کی بجا لاؤں۔ کہا تو عیال و اطفال بہت رکھتا ہے۔ اپنے لڑکوں کے ہوتے یتیم

بے پدر کو کب یاد رکھے گا۔ تب ابو طالب نے کہا کہ میں ہر چند مال و سرمایہ کچھ نہیں رکھتا ہوں، لیکن اگر مجھے لائق اس خدمت کا جانو تو بدل و جان حاضر ہوں۔ کہا تو البتہ قابل اس کام کے ہے۔

'انشائے بہارِ بے خزاں' سے ایک ''رقعہ تہنیت و تعزیت آمیز'' کا مختصر اقتباس اول و آخر سے درج کیا جاتا ہے:-

''مجموعہ انشائے شیریں زبانی، دیباچۂ کتاب سخن معانی زاد حشمتہٗ۔ قلم بعد تشریح مراتب اشتیاق و آرزومندی کے، تعزیت کے مضمون سے آنسو بھی بہاتا ہے، اور کچھ خوشی میں آکر مبارکباد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے۔ زمانے میں خوشی اور غم دونوں کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے اور دنیا میں دھوپ چھاؤں کی طرح شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے۔ دو پھول ایک ہی شاخ میں پھولتے ہیں، ایک دولہا دلہن کے سہرے کے کام آتا ہے، دوسرا میت کی تربت پر چڑھایا جاتا ہے۔ دو موتی ایک سیپ میں پیدا ہوتے ہیں، ایک بادشاہ کے تاج میں لگاتے ہیں، دوسرے کو کھرل میں پیس کر دوا میں ملاتے ہیں۔ ایک ہی کافور سے دو شمعیں بنتی ہیں، ایک محفل سرود میں کام آتی ہے دوسری مردے کے مزار پر جلائی جاتی ہے...... حاصل یہ کہ آپ کے والد ماجد نے عین عید کے دن انتقال فرمایا، گویا اسی گردشِ لیل و نہار کی خزاں و بہار کا تماشا دکھایا، اور اس غم نے جتنا رُلایا تھا، آپ کی شادی نے اُتنا ہی ہنسایا......

رنج میں دو ہتڑ جو پہلے منھ پر مارا تو پھر خوشی میں وہی دونوں ہاتھ اُٹھا کر یوں دعا مانگی کہ خدایا اس مرحوم کو بہشت نصیب کرے، اور آپ سلامت رہیں اور شادی مبارک ہو۔''

شہیدؔ کی تمام انشا پردازی میں یہی قافیہ پیمائی و عبارت آرائی ہے اور اس طرزِ نگارش میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ تخلیق معانی، ایجاد اسالیب اور تزئینِ بیان کے بہتر سے بہتر نمونے شہیدؔ کی نثر میں ملتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون 'روضہ تاج گنج آگرہ' کے متعلق بہت مشہور ہے۔ اس طرح کے اسلوب تحریر سے محاکات و منظر کشی کا کام نہیں لیا جاتا۔ بلکہ مدح خوانی کی جاتی ہے۔ قصیدہ سے کسی بادشاہ کی شان و شوکت و عظمت جیسی کچھ ذہن نشین ہوا کرتی ہے وہی کام شہیدؔ کی نثر تاج محل کے متعلق کرتی ہے۔ بہر حال ان کے علم و فضل اور صنعت گری کا نہایت نادر نمونہ ہے۔ مختصر ٹکڑا نقل کیا جاتا ہے:-

''سبحان اللہ! کیا روضہ ہے! کہ رضوان جس کے لطف و لطافت سے راضی و خوشنود ہے۔ بارک اللہ، کیا

باغ ہے جس میں بہشت کی ہر نعمت موجود ہے۔ سورج اس باغ کا ایک زرد آلو ہے، چاند اس چمن کا گل شبو ہے، پہلے دروازے کی بلندی دیکھنے کو جو آسمان گردن اور سر اٹھائے تو اس کو آفتاب کی پگڑی سنبھالنی مشکل ہو جائے، دونوں بازو کے سرے سے محراب کی چوٹی تک کلام مجید کا سورہ چوب قلم سے جو لکھا ہے، عقل اس طلسمات سے حیران ہے کہ ہر حرف جیسا نزدیک سے نظر آتا ہے، ویسا دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس فن کے مبصر انصاف سے دیکھیں کہ یہ بات کیسی مشکل اور کس طرح کی تقسیم کامل ہے۔ سنگِ مرمر پر سنگِ موسیٰ کی پچی کاری کہیے یا آنکھوں کی سفیدی پر پتلیوں کی سیاہی کی نموداری، حرف ہیں یا کافور کے قرص پر مشک کے دانے پڑے ہیں، لفظ ہیں یا ہیرے کی تختی پر نیلم کے نگیں جڑے ہیں، مینار آسمان کی طرف تعجب کا ہاتھ اٹھائے ہے کہ یہ خم دیکھیے اور اس بارگاہ کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ اور دم دیکھیے محراب کا خم، ابرو سے اشارہ کر رہا ہے کہ اندر جا کر ذرا بہار کا عالم دیکھیے۔ نہیں نہیں غلطی ہوئی مجھ سے، بلکہ محراب کا یہ اشارہ ہے کہ پہلے حواس کو یہاں طاق پر رکھ جائیے تب آگے قدم بڑھائیے۔ پس جو ادھر چوکھٹ لانگھنے کی عزیمت ہوئی تو ادھر عقل اور حکمت رخصت ہوئی۔ سیر سے سیر ہونا تو نگاہ کے ہاتھ ہے، لیکن حیرت یہاں ہر قدم کے ساتھ ہے۔"

خواجہ غلام غوث بیخبرؔ: خلفِ خواجہ ظہور اللہ کشمیری۔ ان کے مورثِ اعلیٰ سلطان زین العابدین بادشاہ کشمیر کی اولاد سے تھے۔ سلطان مغلیہ کے تسلّطِ کشمیر کے زمانے میں خواجہ بیخبرؔ کے بعض بزرگ کشمیر میں قاضی رہے۔ بیخبرؔ کے والد کشمیر سے ترکِ وطن کر کے لاسہ (تبت) چلے گئے۔ وہاں سے ریاست نیپال پہنچے، مہاراجہ نیپال نے بڑی عزّت کی، خواجہ غلام غوث نیپال میں ۱۸۲۴ء (۱۲۴۰ھ) میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر تھی کہ ان کے والد ہندوستان آ گئے، اور بنارس میں قیام کیا۔ خواجہ صاحب نے یہیں پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی۔ ان کے خالو خان بہادر مولوی سیّد محمد خاں، لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغرب کے میر منشی تھے۔ بیخبرؔ ۱۶ سال کی عمر میں ۱۸۴۰ء میں میر منشی کے نائب مقرر ہوئے۔ صوبہ کا صدر مقام آگرہ تھا۔ بیخبرؔ مدّتوں آگرہ رہے۔ جب لارڈ ایلن برا گورنر جنرل (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۴ء) نے گوالیار پر حملہ کیا (۱۸۴۳ء) تو گورنر کے منشی خانہ کے

ساتھ بیخبر بھی شریک مہم ہوئے، اور خاتمۂ جنگ پر کارگزاری کے صلے میں خلعت پایا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۹ برس تھی۔ خالو کی پنشن کے بعد ان کی جگہ میر منشی ہو گئے۔ غدر کے زمانے میں صدہا ہندوستانیوں کی جان بچائی اور گورنمنٹ کے بھی انتہا درجے کے وفادار رہے۔ اس کے صلے میں سند اور خلعت ہفت پارچہ مع تین رقوم جواہر سرکار کی طرف سے مرحمت ہوئے۔ ملکہ وکٹوریہ کے خطاب شہنشاہی اختیار کرنے کے موقع پر لارڈ لٹن نے جو دربار کیا اس میں بھی خواجہ صاحب کو تمغۂ قیصری عطا ہوا۔ ۴۵ سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۸۵ء میں پنشن لی۔ گورنمنٹ نے خان بہادر ذوالقدر کا خطاب دیا، اور یہ مزید اعزاز بخشا کہ پنشن لینے کے لیے عدالت کی حاضری معاف کی۔ پنشن کے بعد نواب خلد آشیاں کلب علی خاں بہادر والیِ رامپور نے خواجہ صاحب کو ریاست کا مدار المہام بنانا چاہا، لیکن انھوں نے شکریہ کے ساتھ معافی چاہی اور آخر عمر کو یادِ الٰہی میں گذار کر ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔

بیخبر عربی و فارسی کے عالم تھے۔ فارسی کے ایسے بلند پایہ شاعر تھے کہ اہلِ زبان ایران جو وارد ہندوستان ہوئے انھوں نے ان کی زباندانی اور سخن سنجی کی داد دی۔ بیخبر مرزا غالب سے چھوٹے تھے، اور ان کا بیحد احترام کرتے تھے۔ غالب باوجود بڑا ہونے کے بیخبر کی نہایت عزّت کرتے تھے، اور خطوط میں 'قبلہ' اور 'مولانا' لکھتے تھے۔ بیخبر کی سخن گوئی کے ایسے مدّاح تھے کہ ان کو ایک خط میں لکھا تھا:- "رامپور ہی میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی، کیا کہنا ہے! ابداع اس کو کہتے ہیں، جدّتِ طرز اس کا نام ہے، جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم برروئے کار لائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے!" (۱)

رقعات غالب کا پہلا مجموعہ (عودِ ہندی) بیخبر کی اعانت و مشورہ سے طبع ہوا۔

---

(۱) "عود ہندی" میں رقعۂ غالب کے ساتھ بیخبر کی وہ غزل بھی درج ہے، مسلسل غزل کہی ہے۔ مطلع و مقطع اور ایک شعر نقل کیا جاتا ہے:-

چشم کہ باز شد ز خواب؟ فتنہ ازو بچار سوست — پردہ ز رخ کہ برکشاد؟ مہر ز شرم زرد روست

جامِ صبوحے کہ زد؟ شیشہ بسجدہ می رود — مے ز لب کہ کام یافت؟ جوشِ نشاط در سبوست

بخت کجاست بیخبر؟ تا برکاب او ز دم — بر سر رہ نشستہ ام، نیم نگاہم آرزوست

بیخبر کے رقعات و نظم فارسی کا مجموعہ 'خونابۂ جگر' کے نام سے شائع ہوا۔ رقعات و نثر اُردو کا مجموعہ 'فغانِ بیخبر' ہے، جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ بیخبر کے انتقال کے بعد ان کے ایک عزیز نے بقیہ نظم و نثر کا مجموعہ 'رشکِ لعل و گہر' کے نام سے ۱۹۰۸ء (۱۳۲۶ھ) میں شائع کیا۔ بیخبر اُردو کے بھی شاعر تھے، لیکن کم کہتے تھے۔ اُردو میں نثر نگاری و خطوط نویسی کی طرف ۱۸۴۶ء میں توجہ کی، یعنی غالب سے بھی کچھ پہلے۔ تقریظوں میں بیخبر کا بھی وہی رنگ ہے جو اس زمانے میں مقبول تھا۔ گویا تقریظ کا مفہوم نثر میں قصیدہ خوانی تھا۔ لیکن اور قسم کی نثریں اس سے بہتر اور سلیس تر لکھی ہیں۔ چند نمونے دکھائے جاتے ہیں۔

(۱) مولوی غلام امام شہید، بیخبر کے رشتے کے خسر ہوتے تھے۔ بیخبر ان کی بے انتہا عظمت کرتے تھے کہ لوگوں کو تلمذ کا شبہ ہونے لگا تھا۔ بیخبر نے شہید کی 'انشائے بہار بے خزاں' کی تقریظ لکھی ہے۔ مختلف مقامات سے اس کے چند فقرے یہ ہیں:-

''مردم دیدہ آج گھر بیٹھے، بہشت کی سیر کرتے ہیں، اللہ اللہ صفحۂ قرطاس پر کیا جوشِ بہار معانی ہے! تار نگاہ میں بے تکلف موتی پروئے جاتے ہیں، واہ واہ کلکِ گہر بار کی کیا دُر افشانی ہے......... حرفوں کی سیاہی سے کاغذ کی سفیدی وہ کیفیت دکھاتی ہے، گویا درختوں سے چاندنی کھیت کیا ہے، کاغذ کی سفیدی پر حرفوں کی سیاہی کی وہ بہار نظر آتی ہے، جیسے صحنِ باغ پر بادل چھا رہا ہے......... اب ان کی اُردو سے سودا کی روح کو سودا ہوگا، میر اپنا مرنا غنیمت جانے گا، ہوس کو پہلے ہی خوب سوجھی جو یہ تخلص اختیار کیا، یعنی در پردہ معذرت چاہی کہ میں تو ہوس کرتا ہوں، کمال حق اور کسی کا ہے۔ سوز کو بھی ان کی خبر پہنچ گئی تھی کہ آتشِ رشک سے جل کر یہ تخلص اپنے حسب حال رکھا۔ ناسخ اب ہوتا تو مصحفی سے تخلص اپنا منسوخ مشہور کرتا۔ آتش نہ مرتا تو کیسا کیسا جلتا۔ ان کی اس نثر نے رتبہ نظم کا کھو دیا، استادوں کا سفینہ دریا میں ڈبو دیا۔''

(۲) بیخبر نے شہید کا دیوان مرتب کر کے اس پر دیباچہ لکھا ہے، اس کے متعلق شہید کو خط لکھتے ہیں:-

''قبلہ، میری شوخی دیکھیے، یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں، خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں، گلزار میں پھول لے جاتا ہوں، ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں، دریا کے سامنے روانی کے معانی بیان کر رہا ہوں،

چاند کے روبرو نور افشانی کا معمہ حل کرتا ہوں، لعل کے حضور میں رنگ کی دکان کھولتا ہوں، قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں، مسیحا سے کہتا ہوں جاں بخشی کی روایت سنئے، موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں کہ یدِ بیضا کی چمک دیکھئے، یعنی حضرت کا دیوان مرتب کرکے آپ کے حضور پیش کرتا ہوں۔ میرے لیے اس کے دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسا تھا جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے، ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو کرے، اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارے سے حظ اٹھائے، گونگا چاہے کہ فصاحت کا سکہ بٹھائے............ میری خوش طالعی ہے اگر یہ قبول ہو، اس کے لیے شرف ہے اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت اسے حصول ہو۔"

(۳) بیخبرؔ نے اپنی انشا پردازی سے منظر کشی بھی کی ہے۔ صبح، دوپہر، شام کا سماں دکھایا ہے۔ ان مضامین میں مقفّٰی فقرے اور مبالغہ اور تشبیہ وغیرہ بھی ہیں اور سادہ و سلیس عبارتیں بھی۔ دوپہر کے منظر کا اقتباس یہ ہے:-

"دوپہر کا وقت ہوا، آفتاب سمت الراس پر آیا، زمین تپنے لگی، پاؤں رکھتے ہوئے خوف آتا تھا کہ چھالے نہ پڑیں۔ بیٹھے ہوئے جی ڈرتا تھا کہ سانس کی گرمی سے لب پر بتخالے نہ پڑیں۔ آسمان سے وہ آتش باری ہونے لگی کہ ہوا نے شعلۂ جوالہ کی صورت پیدا کی، خاک کے ذرّوں نے چنگاریوں سے ہیئت بدلی،............ برہمن بت خانے کے کونے میں یوں خاموش ہو کر بیٹھا کہ بُت بن گیا، میکدے میں مُغ زانو پر سر رکھ کے اس شکل سے ہو بیٹھا کہ معلوم ہوتا تھا مٹکے پر پیالہ اوندھا دیا۔ غریبوں نے اپنے گھروں میں گھاس کی ٹٹیاں لگالیں، مٹی کی صراحیوں پر کپڑا بھگو کے لپیٹ دیا۔ امیروں نے تہ خانوں میں آرام فرمایا، خس کی ٹٹیاں چھڑکی جانے لگیں، فرشی پنکھے کھنچنے لگے، خس کی خوشبو سے ہوا کے جھونکوں پر لخلخہ کا یقین آنے لگا، صراحیاں برف میں لگائی گئیں۔ شربت کی قلفیاں جمائی گئیں۔"

پہلے اور تیسرے نمونے کے خط کشیدہ فقروں میں کس قدر موزوں اور مکمل تشبیہیں پیدا کی ہیں۔ دوسرے فقرے میں لطیف ظرافت بھی ہے۔

بیخبرؔ کا اسلوب نثر اس زمانے سے جداگانہ نہیں ہے، لیکن روشِ قدیم کے محاسنِ تحریر کے لحاظ سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بیخبرؔ بیسویں صدی کے شروع تک رہے ہیں، لیکن ان کا طرزِ نگارش بھی انیسویں صدی کے نصف اول کا ہے۔ اور اسی زمانے کے لکھنے

والوں اور غالبؔ کے ہم عصروں میں ہیں۔ اس لیے ان کو اسی دور میں شامل کر لیا گیا ہے۔

مصنّفینِ دکن

(۱) محمد ابراہیم بیجا پوری: شمالی ہند کے ساتھ ساتھ دکن میں بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اس دور سے پہلے کے مصنفین دکن کا پہلے سلسلۂ دکن میں ذکر آ چکا ہے۔ دورِ چہارم میں بھی دکن کے اہل تصانیف کی خدمات گراں قدر ہیں، اس لیے ان کا امتیاز قائم رکھنے کے لیے علیٰحدہ ذکر کیا جاتا ہے۔

محمد ابراہیم بیجا پوری مرزا رجب علی بیگ سرورؔ لکھنوی کے ہم عصر ہیں۔ ان کا ترجمہ 'انوار سہیلی' اس سال طبع ہوا ہے جس سال سرورؔ نے اپنا 'فسانۂ عجائب' لکھا ہے، یعنی ۱۸۴۴ء ﴿۱۲۴۰ھ﴾ میں۔ تصنیف کا زمانہ کچھ پہلے ہوگا۔ اس کا نمونہ مولوی نصیر الدین ہاشمی کی تصنیف (دکن میں اُردو) سے نقل کیا جاتا ہے۔ یہ تحریر اسی دور کی تصانیفِ شمالی ہند کے مقابلے میں کس قدر بے جوڑ معلوم ہوتی ہے۔ دکنی الفاظ، محاورات، طرزِ بیان کی اتنی کثرت ہے کہ بعض معاصرینِ دکن، باقر آگاہ وغیرہ کی عبارت سے بھی زیادہ قدامت آمیز ہے۔ چند فقرے یہ ہیں:-

> ''چین کے ملک کے اورس چورس میں ایک بڑا بادشاہ تھا، اس کا نام ہمایوں فال، ہور اسے ایک بڑا پکا وزیر تھا، اس کا نام خجستہ رائے۔ ہمایوں فال ایک بار خجستہ رائے کو سات لے کر شکار کو گیا، وہاں سوئے لگتے تو دھوپ پڑی تھی۔ ایک پہاڑ کی انی پو جھاڑاں تھے۔ چھاؤں کی خاطر خجستہ رائے کو سات لے کر اسی چھاؤں کے تلے جا بیٹھا۔ ہور دیکھا تو کیا، کہ ایک جھاڑ اسی کا کھوڑ کا بڑا ہو گیا ہے، اس کے اندر شہد کی مکھیاں پوتی بندنے اندر گھستے اور بہار نکلتے ہیں..........''

---

(۲) شمس الامراء امیر کبیر ثانی: نظام حیدر آباد (دکن) کے دربار میں امیر الامراء تھے۔ ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوئے، اور تین شاہان آصفیہ (نواب نظام علی خاں

آصف جاہ ثانی، نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث ، اور نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع) کا زمانہ دیکھا۔ آخری عہد میں امیر کبیر کا خطاب ملا، اور پیشکاری اور مدار المہامی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ علم ریاضی کے بڑے ماہر تھے۔ 'شمس الہندسہ' ان کی مشہور تصنیف ہے۔ دیگر علوم و فنون میں بھی ان کی تصانیف موجود ہیں۔ ۱۸۶۳ء ﴿۱۲۸۰ھ﴾ میں رحلت کی۔

ا۔ 'رسالۂ شمسیہ' یہ علم طبیعات پر چھ رسالے ہیں۔ مؤلف 'دکن میں اُردو' کو ان کے مترجم کا نام تحقیق نہیں ہوا۔ ۱۸۳۷ء ﴿۱۲۵۳ھ﴾ میں طبع ہوئے۔ ان کا دیباچہ خود شمس الامراء امیر کبیر نے لکھا ہے، لیکن یہ نہیں لکھا کہ خود انھوں نے ترجمہ کیا ہے، نہ کسی مترجم کا نام لکھا ہے۔ اس لیے ان رسالوں کو شمس الامراء سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اہتمام بہرحال انھیں کا ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

''نیاز مند درگاہِ ایزدی کا محمد فخر الدین خاں الخاطب شمس الامرا اس طور پر گذارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبانِ فرنگ میں مرقوم ہیں بہ سبب میلان طبیعت کے نسبت اس کی طرف شوق رکھتا تھا، میری سماعت میں آئیں...... اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدے کے لیے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبانِ فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصتِ قلیل میں اس کی معلومات سے طالب علموں کو کچھ فائدہ میسّر ہووے۔ کس واسطے کہ اگر بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو طالب علموں کے ذہن پر اس کے مطالعے کا بار ہوگا، اور مختصر رسالوں کے دیکھنے سے ان کی طبیعت آشنائے علوم ہو جائے گی، پھر طالبین از خود ارادہ مبسوط کتابوں کے دیکھنے کا کریں گے۔ چنانچہ ان دنوں میں حسبِ مدّعا چند رسالے مختصر علوم فلسفہ کے بطریق سوال و جواب کے لکھے ہوئے ریودی رنٹ چالس صاحب کے انگریزی زبان میں جو ۱۸۱۸ء میں بیچ شہر لندن کے چھاپے گئے تھے، ہم پہونچے۔''

کتاب کے ترجمے کا نمونہ یہ ہے:۔

''کششِ ثقل کے بیان میں۔

استاذ: اب میں نے ارادہ کیا ہے کہ تم کو کیفیت و حقیقت کُلیہ مُمدہ کی آگاہ کروں، جس کو کششِ ثقل کہتے

ہیں، اور وہ ایک قوت ہے جس کے سبب اجسام بعیدہ باہم دیگر تجاذب رکھتے ہیں، اور یہ امر ظاہر ہے گرنے سے تمام اجسام ثقیلہ کے زمین پر۔

تلمیذ کلاں: گولی ہاتھ سے گرنا، اور اینٹ کا چھت سے ساقط ہونا، اور سیب کا جھاڑ سے زمین پر آنا، یہ سب کیا سبب اسی قوت کے ہیں؟

استاذ: ہاں یہ سب اسی قوت کے ہیں، جس کو ثقل تعبیر کرتے ہیں۔ پس وہ اجسام جس میں کچھ بھی میل ہے، اگر ان کو کوئی تھامنے والا نہ ہو تو سطح زمین پر قریب عموددار گریں گے........''

اس دیباچہ اور ترجمہ میں بہ نسبت ابراہیم بیجاپوری کے ترجمہ 'انوار سہیلی' کے دکنی زبان کا اثر بالکل نہیں ہے، حالانکہ ان دونوں میں دس بارہ سال کا پس و پیش ہے۔

۲۔ رسالہ اعمال کُرہ۔ یہ رسالہ بھی انھیں امیر کبیر کے اہتمام سے ترجمہ ہوا، اور ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا۔ اس میں چار باب ہیں۔ پہلے مقالے میں تعریفات، دوسرے میں جغرافیہ، تیسرے اور چوتھے میں ہیئت۔ دو ایک مقام سے اس کے نمونے یہ ہیں:۔

''سوال: جون کی دسویں کو آفتاب کون کون مقام میں عموددار رہتا ہے، اور کون کون مقام میں طلوع و غروب نہیں ہوتا؟

جواب: سندیلہ اور کلکتہ اور آوا اور مکاور جزیرہ چین وغیرہ میں آفتاب عموددار رہتا ہے، اور منطقہ مبردہ شمالی میں مکنزئی اور گرین دیدا اور کیپ میں غروب نہیں ہوتا، اور منطقہ مبردہ جنوبی میں اس جگہ کہ جہاں تمام بحور ہیں طلوع نہیں کرتا۔

''زحل کا بیان: یہ سیارہ مدھم روشنی سے نظر آتا ہے، آفتاب سے بہت دور ہے، اور باستعانت بہتر آلہ دور بین کے اہلِ علم کو اس سیارے کی پیٹی کے دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے، اور یہ پیٹی اسی سیارے کے اطراف بتمامہ ایک حلقہ رُوشن ہے۔ اور اس حلقہ کے باہر سات قمر گردش کرتے ہیں اور ان اقمار میں سے ایک قمر اس حلقہ کی سطح پر حرکت کرتا ہے۔''

محمد عثمان مبیّن: انھوں نے عقائد الاسلام اور مسائلِ فقہ کے متعلق ایک

کتاب 'لازم الاسلام' ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) میں مرتب کی۔ اس میں سے 'وحدت الوجود' کی بحث کا نمونہ 'دکنی اُردو' سے نقل کیا جاتا ہے:-

''جان کہ اے دوست تمام عالم میں نظر کرو تو خلق کئی کئی طرح کا ہے۔ جو حدیث میں آیا ہے، عالم اٹھارہ ہزار طرح کا ہے۔ بالفعل عالم دنیا کو دیکھو تو کوئی عاجز ہے، کوئی مختار ہے، اور کوئی قابل ہے اور کوئی نابکار ہے۔ اور کوئی نیک ہے، کوئی بد ہے اور کوئی بد شکل ہے اور کوئی خوش قد ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر سبب اپنے ہوتے ہیں، آپ ہی مختار ہوتے تو سب لوگ خوب و خوش اور نیک ہوتے جو پسند خاطر ہر ایک ہے۔ یہاں یقین یہ ہوا کہ پیدا کرنے ہارا ان کا کوئی جدا ہے کہ ان کی قابلیت کے موافق پیدا کیا جیسا کہ کمہار مٹی سے طرح طرح کے باسن قابلیت پر ہر ایک ظاہر کیا کرتا ہے۔ پس جان تو پیدا کرنے ہارا سب عالم کا شاید کوئی دوسرا ہے۔''

یہ عبارت بھی باوجود آسان طرز بیان کے، صاف نہیں ہے، گنجلک پیدا ہو گئی۔

غلام امام خاں ترین حیدر آبادی: انھوں نے دو کتابیں لکھی ہیں جو تاریخ دکن کے سلسلے میں نہایت معتبر مانی جاتی ہیں:-

(۱) تاریخ رشید الدین خانی۔ یہ سلاطینِ دہلی و دکن کی تاریخ ہے، جو غلام امام خاں نے شمس الامراء نواب رشید الدین خاں امیر کبیر ثالث کے حکم سے لکھی اور اپنے مربی مخدوم کے نام پر اس کا تاریخی نام 'رشید الدین خانی' رکھا، یعنی ۱۲۷۰ھ میں مرتب (۱) کی،

---

(۱) اس کتاب کے سال تالیف کے سلسلے میں مولوی نصیر الدین ہاشمی اپنی کتاب (دکن میں اُردو) میں لکھتے ہیں:- ''اگرچہ کتاب ۱۲۷۰ھ میں طبع ہوئی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ بہادر شاہ کے حال میں لکھا ہے:- ''سلطنت دہلی کو بہادر شاہ شاہ وقت کے جلوس سے ان اوراق کی تحریر تک آخر ذی حج ۱۲۳۸ھ سے سولہ برس چھ مہینے چھبیس دن ہوتے ہیں۔'' یہاں یہ ۱۲۳۸ھ یقیناً غلط ہے۔ خواہ ہاشمی صاحب سے نقل کرنے میں غلطی ہوئی ہو یا کتاب کے کاتب مطبع سے یا اصل تاریخ کے ناقل و کاتب سے۔ اس لئے کہ بہادر شاہ ظفر آخری تاجدار مغلیہ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں تخت نشین ہوئے تھے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور یہی سنہ اس کے نام سے نکلتا ہے جو ۱۸۵۴ء کے مطابق ہے۔ چنانچہ مصنف دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ (اقتباس درج کیا جاتا ہے):-

''امّا بعد، اس خوشہ چین خرمن اساتذہ متقدمین و متاخرین، خادم الطلبہ، نائب الشعرا غلام امام خاں ترین المتخلص بہ شہیدؔ ابن محمد منور خاں ملک غفراللہ ذنوبہٗ نے ۱۲۷۰ھ بارہ سو ستر ہجری میں بیچ عہد...... میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہٗ کے حسب الحکم.............. نواب معلّٰی القاب اقتدار الدولہ بہادر جنگ محمد رشید الدین خاں بہادر دام اقبالہٗ کے خلاصہ احوال فرماں روایان ہندو دکن کا راجہ ہائے کبار اور سلاطین والا اقتدار سے ضمیمہ کیفیت ورود و نزول افسران فرہنگ اہل فرنگ کے، اور جملہ سوانحات آشتی و جنگ ان کے روسا سے اس دیار کے ابتدائے عروج سے انتہائے زوال تک ہر ایک ریاست جداگانہ کے، کتب قدیم و جدید سے جمع فریق اور اخبارات حال کے انتخاب کرکے، سلیس فقرات ہندی میں یہ ایک کتاب مختصر تیار کی ہے۔ تا ارباب امارت اور اصحاب متانت کو وقت تقریر اور تدبیر کے کار آمد ہو اور نام اس کا اسم گرامی پر جناب ممدوح کے، رشید الدین خانی ہے۔ اور مادّہ تاریخ بھی 'رشید الدین خانی' ہے۔''

یہ ضخیم کتاب ہے۔ بڑی تقطیع کے تقریباً ۸۰۰ صفحوں پر چھپی ہے۔ راجگانِ ہند، سلاطینِ دہلی، اسلامی سلاطینِ دکن، مشاہیر دکن کے حالات لکھے ہیں۔ آخر میں انگریزوں کے دکن میں آنے، اور حیدر علی و ٹیپو سلطان سے جنگ کرنے کے واقعات بھی درج کیے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ غلام امام خاں مصنف 'رشید الدین خانی' نے یہ دیباچہ کی عبارت جو بالیقین ان کی اپنی تحریر ہے، ترجمہ نہیں ہے، بالکل طرزِ قدیم میں لکھی ہے، بے قاعدہ ہے۔ لیکن خود کتاب کی عبارت نہایت صاف، مربوط، سلجھی ہوئی ہے۔ نمونہ کے لیے 'دکن میں اُردو' سے آصف جاہ اول کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے:-

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سال زیر بحث بہادر شاہ کے باپ اکبر شاہ ثانی کے سال جلوس ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) سے سولہ سترہ برس بعد کا ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ مصنف 'تاریخ رشید الدین خانی' نے کم سے کم ۲۲ سال اس کتاب کی تالیف میں صرف کرکے ۱۲۷۰ھ میں اس کو ختم کیا، تو اتنے پہلے رشید الدین خاں کا زمانہ اور ان کا حکم نہیں ہو سکتا اور کتاب کے نام اور دیباچہ سے ظاہر ہے کہ انھیں کے لیے لکھی گئی۔

''نواب چونکہ بہ نفسِ نفیس جمیع مقدمات مالی و ملکی کا انصرام فرماتے تھے، مگر بعضے ندمائے فی الجملہ ان کے آرام کا خیال کر کے ایک معتمد علیہ مقرر کرانے کے لیے عرض کیا۔ نواب نے خدمتِ دیوانی کے لئے امرائے کبار میں سے ایک معتمد علیہ متدین کو تجویز کر کے، جن کا نام راقم کو تحقیق نہیں ہوا، اس عہدہ کا مژدہ ان کو پہونچایا۔ محمد ابوالخیر خاں بہادر جو ایک دور اندیش شخص اور خیر خواہ سرکار تھے۔ انھوں نے اس کو نامناسب جانا اور شب کے وقت جس کی صبح کو کارِ خدمت ان کے سپرد ہونے والا تھا ابوالخیر خاں در دولت پر حاضر ہوئے اور نواب کو اطلاع کرائی۔ نواب باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ ناوقت آنے کا کیا سبب ہے؟ عرض کیا جناب والا کل دیوان کیا چاہتے ہیں۔ میں اس بات کا خیال کرتا ہوں۔ شاہجہاں آباد میں جب اس تقرری کا علم ہوگا تو وہ یقین کریں گے۔ آصف جاہ کبر سنی کی وجہ سے آرام طلب ہو گئے ہیں۔ اور یہ بات نامناسب ہوگی، تو نواب نے فرمایا، میں تو حکم دے چکا ہوں۔ ابوالخیر خاں نے عرض کیا، کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ دربار کے وقت بجائے عرض بیگی کے بندہ کو اعلام کا حکم ہو، فدوی اس وقت کچھ حکمت عملی کر گذرے گا۔ صبح کو جب اعلام کا حکم خان موصوف کے لئے ہوا، تو خان موصوف نے اس معتمد علیہ کا نام زبانِ فارسی میں ندا کی کہ ''از خدمت صوبہ داری برہان پور فلاں شخص سرفرازی یافت۔'' ہر چند ناواقف لوگ مع خدام کے کہتے رہے، نہیں اعلام دیوانی کا حکم ہے، مگر چوبدار نے حسب ایما خان موصوف جلد مجرا ادا کرا دیا، اور نذر پیش کر دی۔''

یہ دونوں عبارتیں، دیباچہ اور اصل کتاب کی، مشکل سے ایک شخص کی لکھی ہوئی تسلیم کی جاسکتی ہیں۔ جو شخص اوپر کی سلیس و با اصول تحریر لکھ سکتا ہے، اس سے تعجب ہے کہ دیباچہ میں ایسی بے ربطی جائز رکھے۔ اس کے علاوہ اسی مصنف نے چودہ برس بعد دوسری تاریخ لکھی ہے جس کا نیچے ذکر آتا ہے۔ اتنے عرصے میں زبان اور طرزِ بیان صاف ہو جانا چاہئے، ورنہ ایسا ہی رہنا چاہئے۔ لیکن مندرجہ ذیل نمونوں سے معلوم ہوگا کہ دوسری کتاب (خورشید جاہی) کی دیباچہ اور اصل مضمون کی عبارتیں باہم مشابہ ہیں، لیکن اتنی با محاورہ و با قاعدہ نہیں ہیں جتنی 'رشید الدین خانی' کی مرقومۂ بالا عبارت ہے۔ (۱)

---

(۱) ہم نے دونوں کتابوں کے دیباچے مولانا احسن مارہروی کی تالیف (نمونۂ منشورات) سے، اور دونوں کتابوں کی درمیانی عبارتیں مولوی نصیر الدین ہاشمی کی کتاب (دکن میں اُردو) سے نقل کی ہیں۔

(۲) تاریخ خورشید جاہی۔ امیر کبیر ثالث موصوف الصدر کے فرزند خورشید جاہ محمد محی الدین خاں بہادر امیر کبیر رابع کے حکم سے مرتب ہوئی۔ دیباچہ میں حال تالیف لکھتے ہیں:۔

''سنہ ہذا میں کہ ایک ہزار دو سو چوراسی ہجری (۱۲۸۴ھ) ہے، اس کمترین عقیدت گزین، پیر وعلمائے دین، مولوی محمد امام خاں ترین ریاضی داں ملک متخلص کو فرمایا کہ ایک کتاب علم تاریخ میں مختصر مفید واسطے ملاحظہ اوقات گرامی ہمارے، اور فوائد عام خلائق کے، لکھ کر گزرانو، تاہم اس کو حلیۂ طبع سے آراستہ کر کے، انعام ارباب استعداد کا کریں۔ چوں کہ بعد تحریر کتاب لاثانی 'رشید الدین خانی' کے، کہ اس وقت متخلص نامہ نگار کا ہجر تھا، ان ایام میں فرصت حاصل تھی۔ حسب الفرمان واجب الاذعان کے کمر سعی کی میان جاں کے باندھ کر، ارادہ کیا ہے۔ حسبی اللّٰہ نعم الوکیل...... چونکہ اس میں احوال صوبہ جات کا براسہ نہ تھا، اس واسطے اس کی ابتدا صوبہ جات سے کی گئی ہے، اور ذکر اولیاؤں کا اور سوانحات بادشاہاں ایران و توران اور روم کے مندرج و مندمج ہیں۔ اور مفصل کیفیت حال چہاردہ سال (۱۴) کی ۱۲۷۰ ہجری سے زمانہ ہذا تک بیان کی گئی ہے، اور نام اس کا اسم گرامی پر ممدوح کے 'خورشید جاہی' ہے، اور مادہ تاریخ 'تاریخ جلیل' (۱۲۸۴ھ) ہے۔''

کتاب کی عبارت کا نمونہ یہ ہے۔ صوبہ خجستہ بنیاد کا حال لکھتے ہیں:۔

''اس صوبہ کو ملک مرہٹہ کہتے ہیں، پس زمانے میں نظام شاہیہ کے، صوبہ احمد نگر قرار پایا۔ صاحب نسخہ جدید لکھا ہے کہ زمانہ سابق میں نام اس کا دیوگڈھ تھا، اور عہد میں راجہ بھوج کے دہارا کہا کرتے تھے۔ جب فخر الدین جونا شاہ دہلی نے تمام دکن پر قبضہ کیا تو قلعہ دیوگڈھ کا نام دولت آباد رکھا، اور دار السلطنت اپنا فرمایا۔ بعدۂ جب نوبت فتوحات دکن کی اورنگ زیب عالمگیر کو پہونچی، نزدیک ہمایوں موضع کھڑکی میں ۱۰۶۸ھ میں ایک شہر کمال لطافت و استحکام کے ساتھ آباد کر کے نام اس کا خجستہ بنیاد اورنگ آباد رکھا۔''

شاہ علی: قلعہ ادھونی (حیدر آباد دکن) کے رہنے والے تھے۔ نواب رشید الدین خاں امیر کبیر ثالث کے حکم سے فنِ ریاضی کے دو رسالے ۱۸۶۴ء (۱۲۸۱ھ) میں مرتب کیے۔ ایک کا نام 'تذکرہ' رکھا اور دوسرے کا 'انوار بدریہ'۔

'انوارِ بدریہ' کا نمونہ یہ ہے:۔

''تعریف نسبتِ مساوات ۔ مقادیرِ دو نصف کی جو مراتب میں برابر اور نسبت میں ایسے ہوں کہ دو مقدار میں ایک صفت کے وہ نسبت ہو جو ہر دو مقدار میں صف آخر کی ہے پس اطراف ہر صفت کے نسبت دینے کو اوساط نسبت مساوات کہتے ہیں۔''

شمالی ہند میں اس زمانے میں اور اس سے پہلے ریاضی، سائنس، فلسفہ وغیرہ پر بہت سے علوم وفنون کی کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئی ہیں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔

دَورِ چہارم کی نثر پر تبصرہ

(۱) یہ دور اس لیے یہاں ختم کیا گیا ہے کہ اس کے بعد سر سیّد احمد خاں کے زمانے سے اُردو زبان و ادب میں نمایاں انقلاب شروع ہو جاتا ہے۔ سر سیّد کی تصانیف، اخبار، سوسائٹی، کالج کے ذریعہ سے تعلیم اور وسائل تعلیم بھی وسیع ہو گئے اور ان کے زیرِ اثر بہترین مصنف بھی پیدا ہونے لگے، جن کی اختراعات ادبی نے شمع راہ کا کام کیا۔ سر سیّد کی کوششوں کے ساتھ ساتھ دہلی، لکھنؤ، لاہور وغیرہ بہت سے مقامات پر تعلیمی ادارے قائم ہوئے، اور انفرادی و اجتماعی سعی و کاوش سے انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ''کائناتِ اُردو'' ہی بدل گئی۔

(۲) سر سیّد کی مساعی علمی و ادبی اسی دور میں شروع ہو گئی تھیں، لیکن بیشتر تصانیف اور وسیع تر کارنامے غدر کے بعد کے ہیں۔ اور آخر صدی تک جاری رہے ہیں۔ اس لیے ان کو دورِ آئندہ میں رکھا ہے، لیکن سب سے پہلے،

(۳) چوتھے دور میں زبان، محاورات، ترتیب الفاظ، پابندیِ قواعد، تمام مصنفین میں تھوڑے، بہت فرق کے ساتھ تقریباً یکساں ہیں۔ انشاء و غالب سے بہتر اُردو کسی نے نہیں لکھی۔ اس زمانے میں غالب اس اعتبار سے نہایت ممتاز و منفرد ہیں۔

(۴) عبارت میں قافیہ پیمائی بہت مقبول ہے، لیکن ''ادبیاتِ لطیف'' (فسانہ و

انشاء) میں زیادہ پائی جاتی ہے، مذہب اور علوم وفنون کی کتابوں میں نہیں ہے یا کہیں کہیں ہے۔ اس زمانے میں طرز بیان کی سادگی و شگفتگی عام نہیں ہے۔

(۵) اس دور میں یعنی انیسویں صدی کے ۷۰ سال میں (علاوہ فورٹ ولیم کالج کے) ہر علم وفن کی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اگرچہ ان کا ایک حصہ چھپنے کے بعد بھی اب کمیاب یا مفقود ہے، اور ایک حصہ مسودہ کی صورت میں رہا۔ لیکن بہت سا لٹریچر معلوم و موجود ہے۔

(۶) دہلی کالج اور دہلی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے رواج تعلیم اور اشاعت علوم میں بڑا کام کیا۔ ہزارہا ہندوستانیوں کو عالم وروشن خیال بنایا، اور درجنوں مصنف اور اہلِ قلم پیدا کر دیے، جنھوں نے آئندہ دور کی پیشوائی ورہنمائی کی۔

(۷) اس دور میں ہندو اہلِ قلم بھی اُردو نثر کی ترقی میں برابر کوشش کرتے رہے، اور ہر قسم کی کتابیں خصوصاً علوم وفنون، سائنس وغیرہ کی طرف بہت توجہ کی، جیسا کہ بعض نمونوں سے، اور مصنفین کی فہرست سے معلوم ہوا ہوگا، ان صاحبوں کی تصانیف کے نمونے زیادہ دستیاب نہ ہو سکے۔

(۸) یورپین مصنفین نے بھی اُردو میں اور اُردو کے متعلق اپنی زبانوں میں تصانیف کیں۔ اس دور کے یورپین مصنفین کے تذکرے اور نمونے، ان کی مساعی علمی کو ایک جا دکھانے کے لیے پہلے درج کر دیے گئے ہیں۔ ان میں فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی خاص طور پر قابل ذکر، اور اس کی تصانیف اور لکچر یادگار ہیں۔ اس کا حال اور فہرست تصانیف درج ہو چکی ہے۔

(۹) اس زمانے میں انگریز حکام کی اُردو سے دلچسپی کی یہ مثالیں بھی یادگار ہیں کہ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے ۷؍جنوری ۱۸۶۵ء کو لاہور میں دربار کیا، جس میں خطابات اور خلعت دیے گئے۔ اسی موقع پر لفٹنٹ گورنر نے انگریزی میں نہیں بلکہ اُردو میں تقریر کی۔ اس کے بعد فروری میں چیف کمشنر لکھنؤ نے اودھ کے تعلقداروں کا جلسہ کیا، اس میں بھی اس نے اُردو میں تقریر کی۔

(۱۰) لیتھواورٹائپ کے مطابع، خصوصاً لیتھو کے (سنگی) چھاپے خانے نہایت کثرت سے جاری ہوئے۔ ۱۸۳۲ء سے اُردو سرکاری زبان قرار پائی۔ ۱۸۳۵ء سے اخبارات کو آزادی ملی۔ اس لیے اس سال کے بعد سے ۱۸۷۰ء تک تمام ہندوستان میں ایک سو کے قریب اخبارات ورسائل جاری ہوئے، جن میں سے بعض اسی دوران میں بند ہو گئے، بہت سے بعد تک جاری رہے۔ چند اخبار مثلاً اودھ اخبار لکھنؤ، آگرہ اخبار، دبدبۂ سکندری رامپور آج تک جاری ہیں۔ مطابع میں جس نے سب سے زیادہ ترقی کی، مطبع نول کشور ہے۔ یہ بھی اب تک قائم ہے۔ اودھ اخبار اسی مطبع کا پرچہ ہے۔ آگرہ اخبار پریس اور دبدبۂ سکندری کا مطبع حُسنی بھی باقی ہیں۔ ان کے علاوہ اور چند چھاپے خانے اسی زمانے سے اب تک موجود ہیں۔

(۱۱) علمی واصلاحی انجمنیں بے شمار قائم ہوئیں، ان میں سب سے پہلی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی دہلی (قائم شدہ ۱۸۴۲ء) تھی، اور وسعت وخدمت کے لحاظ سے سب سے اعلیٰ سرسیّد کی سائنٹیفک سوسائٹی (قائم شدہ ۱۸۶۲ء) اور زمانۂ زیرِ بحث میں باعتبار ترتیب قیام سب سے آخری نینی تال انسٹی ٹیوٹ (قائم شدہ ۱۸۶۹ء) یہ امراء ورؤساء کی انجمن تھی۔ اس کا مقصد تصنیف وتالیف نہ تھا، بلکہ مختلف ذرائع سے ملک میں تعلیم وروشن خیالی کی اشاعت کرنا تھا۔ ان کے علاوہ شاہجہاں پور، اٹاوہ، بنارس، بدایوں، مرادآباد، الٰہ آباد، لاہور، بہار وغیرہ مقامات پر الگ الگ انجمنیں اور سوسائٹیاں قائم ہوئیں۔ جنھوں نے تصنیف، ترجمہ اخبار، تقریر وغیرہ تمام ذرائع علم وادب کی ترقی کے لیے استعمال کیے۔

(۱۲) مذہبی مناظرے، علمی مباحثے، اور شعر وسخن کے مشاعرے بھی جاری رہے، جن کے وسیلوں سے اُردو کی خدمت ہوتی رہی۔ گارساں دتاسی (جس کے خطبات سے اس تبصرہ کی اکثر معلومات اخذ کی گئی ہیں) کے آخری خطبے میں مذکور ہے کہ اس دور کا آخری شاندار مشاعرہ ۱۶/اکتوبر ۱۸۶۹ء کو آگرہ میں ہوا۔ دتاسی لکھتا ہے کہ "اودھ اخبار مورخہ ۲۸/ستمبر ۱۸۶۹ء میں ان شعراء کے لیے ہدایات کا اعلان شائع ہوا جو اس مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ ان ہدایات میں یہ بھی ہے کہ شعراء پہلے سے اپنے نام، مذہب،

عمر، استاد کا نام، اور یہ کہ آیا استاد زندہ ہے یا فوت ہوگیا، مطبوعہ دواوین کے نام اور دوسرے حالات کے متعلق اطلاع دے دیں۔"

غرض یہ "عہد اُردو" آئندہ ادبی انقلاب اور علمی ترقی کے لیے پیش خیمہ تھا۔ جس نے آنے والی نسلوں کے لیے راستہ بنایا۔

اُردو نثر کا پانچواں دَور

﴿۱۸۷۱ء﴿۱۲۸۸ھ﴾تا ۱۹۰۰ء﴿۱۳۱۸ھ﴾

سر سیّد احمد خاں: سیّد احمد خاں (۱) ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء مطابق ۵/ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ باپ کی طرف سے سیّد تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب امام نہم حضرت امام محمد تقی علیہ السلام تک پہنچتا ہے، اسی لیے وہ اپنے آپ کو "تقوی سیّد" کہتے تھے۔ غالباً ان کے بزرگ ہندوستان میں شاہجہاں کے عہد میں آئے، اور اس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک ان کو سلطنت مغلیہ کے ساتھ برابر کسی نہ کسی قدر تعلق رہا۔ سر سیّد کے بزرگوں میں سے ایک شخص سیّد محمد دوست دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ تھے اور مع اپنی جمعیت کے ایک مورچے پر متعین تھے۔ جب اس مورچے کو انھوں نے تنہا بلا شرکت کسی دوسرے افسر کے فتح کر لیا تو عالمگیر نے انھیں "یکہ بہادر" کا خطاب دیا۔ سر سیّد کے دادا سیّد ہادی تھے، ان کو بادشاہ عالمگیر ثانی کے سنہ ۲ جلوس (۱۷۵۵ء ﴿۱۱۶۸ھ﴾ میں جواد علی خاں کا خطاب اور منصب ہزاری ذات و پانصد سوار ملا، اور ان کے بھائی سیّد مہدی کو بھی وہی منصب اور قباد علی خاں خطاب دیا۔ قباد علی خاں دکن چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ جواد علی خاں (سر سیّد کے دادا) بدستور دہلی میں بادشاہ کے پاس رہے۔ جب عالمگیر ثانی کا زمانہ ختم ہوا، اور شاہ عالم بادشاہ ہوئے (۱۷۵۹ء﴿۱۱۷۳ھ﴾ تا ۱۸۰۶ء﴿۱۲۲۱ھ﴾) تو سر سیّد کے دادا کے خطاب میں جواد الدولہ کا اضافہ ہوا، اور عہدۂ احتساب و کرور صوبہ شاہجہاں آباد عنایت ہوا۔ اور پھر ۱۷۶۴ء﴿۱۱۸۸ھ﴾ میں عہدۂ قضائے لشکر پر متعین ہوئے۔ اسی سال انھوں نے انتقال کیا۔ سر سیّد کہتے تھے کہ "سیّد ہادی فارسی شعر کہتے تھے اور ان کا پورا دیوان ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر

---

(۱) سر سیّد کے حالات مولانا حالی کی 'حیات جاوید' سے ماخوذ ہیں، بلکہ اسی کتاب کی عبارت کو مختصر کر کے مسلسل کر دیا ہے۔

کے زمانے میں تلف ہو گیا۔" سیّد ہادی کے بیٹے یعنی سر سیّد کے والد میر متقی ایک آزاد طبیعت کے آدمی تھے۔ جب سیّد ہادی کے بعد ان کا خطاب اور منصب میر متقی کو دیا جانا تجویز ہوا تو انھوں نے اس کو قبول کرنا مصلحت نہ سمجھا، مگر چونکہ ان کو اکبر شاہ کے ساتھ شاہزادگی کے زمانے سے نہایت خلوص اور خصوصیت تھی اس لیے شاہ عالم کے انتقال کے بعد ان کا رسوخ دربار میں پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا، اور وہ دربار خاص میں جہاں خاص خاص لوگوں کے سوا کوئی نہ جا سکتا تھا، برابر جاتے تھے۔ سر سیّد کہتے تھے کہ "میں بارہا اپنے والد کے ساتھ اور نیز تنہا بھی اس خاص دربار میں گیا ہوں۔" سر سیّد کے والد کو حضرت شاہ غلام علی سے جن کی خانقاہ دہلی میں مشہور ہے، بیعت تھی، اور شاہ صاحب ان پر پدرانہ شفقت رکھتے تھے۔

سر سیّد کی ننھیال خواجہ میر دردؔ کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی۔ سر سیّد کے نانا خواجہ فرید الدین احمد، خواجہ محمد یوسف ہمدانیؒ کی اولاد میں تھے۔ آپ کے بھائی خواجہ نجیب الدین نواح دہلی میں "شاہ فدا حسین" کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ بڑے عالم اور خوش بیان تھے، لیکن "رسول شاہی" فرقہ میں داخل ہو گئے تھے، اس لیے چار ابرو کا صفایا کیے، ایک غرقی باندھے، بھبھوت ملے بیٹھے رہتے تھے۔ سر سیّد کے حقیقی نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ خاندان میں سب سے زیادہ با اقبال، لائق، دانشمند، صاحب علم و فضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ زیچ اور آلات رصد کے علم میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ اور خود آلات رصد کے بنانے پر قادر تھے۔ علم ہیئت اور آلات رصد کے متعلق چند رسالے بھی تصنیف کیے تھے۔ ان میں سے ایک کا سر سیّد نے اُردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ ان کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں سر سیّد کے ماموں بھی فنون ریاضی کے ماہر تھے۔ خواجہ فرید الدین تحصیل علوم کے بعد ۱۷۹۷ء (۱۲۱۲ھ) میں مدرسہ کلکتہ میں (جو فورٹ ولیم کالج سے پہلے قائم ہوا تھا اور آج تک ہے) سات سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر سپرنٹنڈنٹ ہو کر گئے۔ وہاں سے گورنر جنرل مارکوئس ویلزلی نے ان کو ایران میں سفارت پر بھیجا۔ اس کے بعد برما میں ایک پولیٹیکل معاملے کے طے کرنے کو بطور ایجنٹ کے بھیجا۔ ۱۸۱۵ء میں اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے کلکتہ سے

بلا کروزیر سلطنت بنایا اور خطاب دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ عنایت کیا۔ یہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح رسول شاہیوں میں داخل تھے۔ لیکن وہ وضع اختیار نہ کی تھی۔ مرنے سے دو سال پہلے اپنے مرشد کی پوری پوری پیروی کرنے کے لیے صرف ایک بار چار ابرو کا صفایا کرایا تھا۔

سرسیّد کی والدہ نہایت دانشمند، نیک دل، پاک سرشت تھیں۔ ان کی تربیت و اخلاق کا سرسیّد کی حیات و سیرت پر خاص اثر ہوا ہے۔ ان کا خاندان حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا معتقد و مرید تھا، لیکن وہ خود حضرت شاہ غلام علیؒ سے ارادت رکھتی تھیں۔ ان کی خانقاہ میں نذر نیاز، تعویذ گنڈے کا رواج نہ تھا۔ اس لیے سرسیّد کی والدہ بھی ان چیزوں کی معتقد نہ تھیں۔ لیکن ان سے بالکل منکر و مانع بھی نہ تھیں۔ سرسیّد کا بیان ہے کہ: "میری ننھیال والے اگرچہ عام توہمات میں مبتلا نہ تھے، مگر شاہ عبدالعزیز صاحب کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا، اس پر سب اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے ہاں کے بزرگ بچوں کو ایک گنڈا دیا کرتے تھے، اور اس کے ساتھ ایک تعویذ ہوتا تھا جس میں ایک ہندسہ یا حرف سفید مرغ کے خون سے لکھا جاتا تھا، اور جس بچے کو دیا جاتا تھا اس کو بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کی ممانعت ہوتی تھی۔ سیّد حامد اور سیّد محمود (سرسیّد کے بیٹے) کو بھی ننھیال والوں نے دو گنڈے پہنائے تھے۔ باوجود اس کے میری والدہ جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور کھانے میں انڈا یا مرغی ہوتی تو وہ بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔"

سرسیّد کے نانا خواجہ فرید الدین کا انتقال ۱۸۲۸ء ﴿۱۲۴۴ھ﴾ میں ہوا۔ والد کا ۱۸۳۸ء ﴿۱۲۵۴ھ﴾ میں۔ بڑے بھائی سیّد محمد خاں منصف ہنگام ضلع فتحپور کا ۱۸۴۵ء ﴿۱۲۶۱ھ﴾ میں، والدہ کا ۱۸۵۷ء ﴿۱۲۷۴ھ﴾ سرسیّد کے بھائی شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھے اور بڑے پاک باطن تھے۔ ان کا مرنا اہل اللہ کا سا مرنا تھا۔ دسہرے کی تعطیل میں دہلی آئے تھے۔ وہاں بخار کی فصل تھی۔ سیّد محمد خاں کو بھی بخار آنے لگا۔ ان کو یقین ہوگیا کہ اب وقت آگیا۔ اسی حالت میں حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ گئے۔ اپنی قبر کے لیے جگہ پسند کی۔ جب قبر تیار ہوگئی تو سوار ہو کر وہاں پہنچے، قبر میں اتر کر لیٹے۔ بہت پسند کی۔ دوسرے دن کفن کے لیے کپڑا منگوایا، سلوا کر پہنا، پسند کیا۔ ٹھ اک

دن حضرت شاہ احمد سعید صاحبؒ کو (جو ان کے پیرو مرشد کے سجادہ نشین تھے) بُلایا اور ان کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ اور تیسرے دن انتقال کیا۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے شیخ سعدیؒ نے کہا ہے:۔

عروسی بود نوبت ماتمت چو بر نیک روزی بود خاتمت

مفتی صدرالدین آزردہ نے جو سرسیّد کو ان کے بھائی کی تعزیت کا خط بھیجا تھا، اس میں یہ شعر لکھا تھا:۔

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

سرسیّد کی تعلیم: سرسیّد کی بسم اللہ کی تقریب حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آئی۔ شاہ صاحب حضرت میرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلۂ نقشبندیہ کے خلیفہ تھے۔ سرسیّد کو شاہ صاحب سے بسم اللہ پڑھنے پر بڑا فخر تھا۔ بڑے ہو کر انھوں نے اس موقع کے لیے یہ شعر کہا تھا، اور اپنی تقریب بسم اللہ کے ذکر پر اس شعر کو بھی پڑھا کرتے تھے:۔

بہ مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی زفیضِ نقشبندِ وقت، جانِ (۱) جانِ جانانی

اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ قرآن مجید کے بعد فارسی و عربی پڑھی، صرف ونحو، معانی و بیان و بدیع، منطق و فلسفہ، ریاضی، اقلیدس، ہیئت، تمام علوم میں بصیرت پیدا کی۔ فن طب بھی حاصل کیا اور چند مہینے مطب بھی کیا۔ دہلی میں جو اہلِ علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب، آزردہ وغیرہ، ان سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ پھر نوکر ہونے کے بعد، جب فتحپور سے بدل کر دہلی میں آئے تو مولوی نوازش علی دہلی کے مشہور عالم وواعظ سے پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا فقہ واصول فقہ پڑھا، مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے مقاماتِ حریری وسبعہ معلقہ پڑھے۔ مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبد العزیز صاحب کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین صاحب کے خلف الصدق تھے، حدیث پڑھی پھر قرآن مجید کی سند لی۔ استادوں سے تو اتنا ہی پڑھا، لیکن اپنا مطالعہ ہمیشہ جاری رکھا۔

---

(۱) جان جاناں حضرت میرزا مظہرؒ، اور ان کی جان حضرت شاہ غلام علیؒ۔

سر سیّد کے شوقِ علم کے متعلق یہ واقعہ بھی یادگار رہے کہ جب وہ دہلی سے قائم مقام صدر امین ہو کر رُہتک جانے لگے اس وقت مولوی نوازش علی سے تکمیل تعلیم کر رہے تھے۔ مولوی صاحب سے کہا، آپ میرے ساتھ چلیے، انھوں نے عذر کیا کہ میرے پاس بہت سے طالب علم ہیں ان کو چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔ سر سیّد نے کہا سب کو لے چلیے۔ ان کے مصارف کا میں ذمہ دار ہوں۔ مولوی صاحب بڑے حیران ہوئے۔ آخر سر سیّد مولوی صاحب کو اور ان کے سب شاگردوں کو لے گئے، اور جب تک وہاں رہے سب کے اخراجات کے کفیل رہے۔ اور یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ غازی پور میں سر سیّد کے پاس ایک یہودی سالم نام، صنعا (یمن) کا رہنے والا آیا، اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش میں پھرا ہوں، کہیں کوئی صورت نہیں نکلی۔ سر سیّد نے پوچھا کیا تنخواہ لو گے؟ اس نے دس یا پندرہ روپیہ کہے۔ سر سیّد نے کہا میں تم کو پچیس روپیہ مہینہ دوں گا، مجھے عبرانی زبان سکھاؤ۔ یہودی نے یہ سن کر خوشی کے مارے سر سیّد کی ڈاڑھی چوم لی، اور کہا کہ آج تک مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس نے درخواست سے زیادہ دیا ہو۔ سر سیّد نے اس کو نوکر رکھ لیا، مگر چونکہ وہ مُسرف اور آوارہ مزاج تھا، اس لیے اس کو بقدرِ ضرورت دیتے رہے، اور اس کی باقی تنخواہ جمع کرتے رہے۔ جب وہ وطن کو جانے لگا تو کئی سو روپیہ جو اس کا چڑھا ہوا تھا، حساب کر کے اس کے حوالے کر دیا۔

سر سیّد کی جوانی: سر سیّد کا زمانۂ شباب رنگین صحبتوں میں گزرا تھا، باغوں کی سیر، میلوں، تماشوں، راگ رنگ کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ خود بھی بڑے زندہ دل، بذلہ سنج، حاضر جواب تھے، دہلی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نہایت حسین تھی۔ لیکن اس کی ماں بھدّی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لیے آئی تھی، سر سیّد بھی تھے۔ اور وہیں ان کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے، "مادرش بسیار تلخ است۔" سر سیّد نے فوراً یہ مصرع پڑھا:-

گرچہ (۱) تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد

---

(۱) یہ مصرع اس طرح ضرب المثل ہے۔ "صبر تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد۔"

لیکن بھائی کے مرتے ہی سرسیّد کا دل رنگین صحبتوں سے اُچاٹ ہوگیا، لباس اور وضع میں جو اس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا یک قلم ترک کر دیا۔ سر گھٹوالیا، ڈاڑھی چھوڑ دی، پائچے متشرع کر لیے، کرتا پہن لیا، رنگین طبع نو جوانوں کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا۔

سرسیّد کی ملازمت: سرسیّد کے والد کو قلعہ شاہی سے تنخواہ ملتی تھی ان کے انتقال کے بعد وہ آمدنی بند ہوگئی۔ معافی کی ملکیں بھی والد کی حیات تک تھیں، وہ بھی ضبط ہو گئیں، تو ان کو سرکار انگریزی کی ملازمت کا خیال پیدا ہوا۔ ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں دہلی میں صدر امین تھے۔ انھوں نے ۱۸۳۸ء میں سرسیّد کو اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ پھر فروری ۱۸۳۹ء سے کمشنری آگرہ کے دفتر میں نائب منشی ہو گئے۔ وہیں منصفی کا امتحان پاس کیا۔ دسمبر ۱۸۴۱ء میں منصفِ مین پوری مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۸۴۲ء میں مین پوری سے فتح پور سیکری آگئے اور وہاں چار برس منصف رہے۔ فتح پور سیکری میں جہاں اکبر بادشاہ کی خواب گاہ تھی، حسنِ اتفاق سے وہی عالی شان مکان سرسیّد کو رہنے کے لیے ملا، یہ چاروں برس اسی مکان میں گزرے۔

اسی زمانے میں بہادر شاہ آخری تاجدار دہلی نے سرسیّد کو ان کا موروثی خطاب عنایت کیا۔ ۱۸۴۲ء میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ سے سفارش کی۔ بادشاہ نے سرسیّد کو بلا کر "جواد الدولہ سیّد احمد خاں عارف جنگ" کا خطاب دیا، اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسب قاعدہ ادا کی گئیں۔

۱۸۴۶ء میں فتح پور سیکری سے دہلی تبدیل ہو گئے۔ یہاں سے دو بار قائم مقام صدر امین ہو کر رہتک بھی گئے۔ جنوری ۱۸۵۵ء میں مستقل صدر امین مقرر ہو کر دہلی سے بجنور کو تبدیل ہو گئے۔ بجنور میں سوا دو برس گزرے تھے کہ غدر ہو گیا۔

غدر میں سرسیّد کی خدمات: ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء (۱۶ ررمضان ۱۲۷۳ھ) کو دہلی میں بغاوت ہوئی، اور ۱۲ رمئی کو یہ خبر بجنور پہنچ گئی۔ وہاں اس وقت بیس یورپین اور یوریشین عورتوں اور بچوں سمیت تھے۔ مسٹر شکسپیر کلکٹر و مجسٹریٹ تھے۔ جب بجنور میں بغاوت کے

آثار نمودار ہوئے تو یہ لوگ بہت گھبرائے، لیکن سر سیّد نے جا کر ان کی تشفی کی، اور کہا کہ ''جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے، جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے اُس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں۔'' چنانچہ سر سیّد مع اور ہندوستانی افسروں کے تمام رات مسلح ہو کر کلکٹر کی کوٹھی پر پہرہ دیتے تھے۔ ساری رات کرسیوں پر بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے، یا شہر میں گشت کرتے گزر جاتی تھی۔ آخر باغیوں کو نشیب و فراز کو سمجھا کر انگریزوں کے قتل سے باز رکھا، اور سب کو رُڑکی روانہ کر دیا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد بجنور میں باغیوں کی عملداری ہوگئی۔ اور وہ لوگ سر سیّد کے اور ان کے رفقاء میر تُراب علی اور ڈپٹی رحمت خاں کے قتل کے درپے ہوگئے۔ سر سیّد نے ایک مہینے تک بجنور کا انتظام بخوبی قائم رکھا۔ لیکن باغی دشمن ہو گئے تھے۔ اس لیے سر سیّد اور ڈپٹی رحمت خاں میرٹھ کے ارادے سے روانہ ہوگئے۔ راستے میں مختلف مقامات پر چند بار باغیوں نے ان کے قتل و غارت کا ارادہ کیا لیکن ہر موقع پر بعض خیر خواہ زمینداروں نے بچا لیا۔ اثنائے راہ میں چاند پور سے چل کر سر سیّد نے پھراؤں پہنچ کر علالت اور راستے کی کوفت کے سبب سے چند روز مولوی محمود عالم (۱) صاحب کے مکان پر، جو ان کے دوست تھے مقام کیا۔ اور اپنی مفصل سرگزشت حکام انگریزی کو لکھ کر بھیجی، اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔

---

(۱) مولوی محمود عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ خاکسار مؤلف کے پردادا تھے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر قدس اللہ سرہٗ العزیز کی اولاد میں تھے۔ اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ زمانۂ غدر میں اپنے وطن پھراؤں (ضلع مرادآباد) میں رضا و توکل اور سکون و وقار کے ساتھ بیٹھے رہے۔ اہلِ قصبہ نے لوٹ مار کے ڈر سے اپنا زر و زیور ان کے پاس رکھ دیا تھا۔ مولوی محمود عالم صاحب "مرزا غالبؔ" کے ہم عصر تھے، اور ان سے بھی مراسم رکھتے تھے۔ دہلی کی آمد و رفت کے زمانے میں سر سیّد سے بھی تعلقات ہوئے ہوں گے۔ غالبؔ سے دو سال پہلے ۴ رذی قعدہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۱ر مارچ ۱۸۶۷ء کو وفات پائی۔ سر سیّد کے قیام پھراؤں کا ذکر مولانا حالیؔ کی 'حیات جاوید' مطبوعہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶۱ سے ماخوذ ہے۔ باقی تمام حالات بھی اسی کتاب سے تقریباً مولانا حالیؔ ہی کے الفاظ میں نقل کیے گئے ہیں۔ قادری

سر سیّد میرٹھ میں کئی مہینے رہے۔ وہاں معلوم ہوا کہ دہلی میں انگریزی فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر اسباب سب لوٹ لیا۔ ان کے ماموں اور ماموں زاد بھائی مارے گئے۔ ان کی والدہ اور خالہ دہلی میں تھیں۔ سر سیّد میرٹھ سے دہلی آئے، گھر تباہ ہو چکا تھا۔ ماں خالہ کو میرٹھ لے گئے۔ انگریزوں نے رُڑکی میں اپنی فوج جمع کر لی۔ سر سیّد بھی تمام عملۂ بجنور کے ساتھ بحکم سرکار رُڑکی بلا لیے گئے۔ تمام روہیل کھنڈ سخت باغی تھا، بجنور، مراد آباد، بریلی کے ضلعے سرکشوں کے زیرِ اثر تھے۔ ان اضلاع پر قبضہ کرنے کے لیے رُڑکی سے فوج روانہ ہوئی۔ سر سیّد بھی ساتھ تھے۔ اس موقع پر سر سیّد نے کمال دلیری و دانشمندی سے کام لیا۔ حکّام سرکاری میں یہ بحث پیش آئی کہ اب ان اضلاع سرکش میں کون لوگ باغی تصور کیے جائیں۔ سر سیّد نے اس باب میں افسران فوج سے گفتگو کی، اور بہت بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے کرالیا کہ سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہئیں جواب سرکار سے مقابلے کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو فسادات رعایا، ہندو مسلمان، دونوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں کیے، ان کے سبب سے کسی کو سرکار کے مقابلے میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس وقت اگر سر سیّد یہ جرات نہ کرتے اور یہ فیصلہ نہ کرا دیتے تو ضلع بجنور بالکل تباہ ہو جاتا۔ خصوصاً کوئی مسلمان اس ضلع میں باقی نہ رہتا۔ سر سیّد کی اس دانشمندی کے سبب سے ضلع بجنور غدر کے نتائج میں سب سے کم مبتلا ہوا۔ اور ضلع مراد آباد میں ضبط شدہ جاگیریں سب سے زیادہ واپس دی گئیں۔

خدمات غدر کا صلہ: گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری جو سر سیّد سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ لیکن گورنمنٹ نے ان کی خدمات کی قدر کی اور ان کے صلے میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دو سو روپیہ ماہوار کی پولیٹکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی۔ میر صادق علی اور میر رستم علی رئیسانِ چاند پور ضلع بجنور کا تعلقہ اس جرم میں کہ ان کی عرضی بادشاہ دہلی کے دفتر سے برآمد ہوئی، سرکار نے ضبط کر لیا تھا، اور جس طرح دیگر خیر خواہانِ سرکار کو باغیوں کی ضبط شدہ جائدادیں دی گئی تھیں یہ تعلقۂ چاند پور سرکار نے سر سیّد کو دینا چاہا لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ سر سیّد نے خود ایک

مرتبہ اس کے متعلق کہا تھا کہ: ''بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہان آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔''

غدر کے بعد: اپریل ۱۸۵۸ء میں سرسیّد صدر الصدور ہو کر مراد آباد آ گئے۔ وہاں چند کتابیں لکھیں ۱۸۶۰ء میں وہاں سخت قحط پڑا۔ قحط کا انتظام سرسیّد نے اس خوبی سے کیا کہ انسانی ہمدردی کا اس سے بہتر نمونہ ملنا مشکل ہے۔ قحط زدوں کی سرکاری امداد کے علاوہ خود سرسیّد کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو تقسیم ہوتی تھیں۔

سرسیّد کی اہلیہ کے متعلق کچھ معلومات نہیں ملتی۔ حالیؔ نے 'حیاتِ جاوید' میں نام تک نہیں دیا۔ فرخ علی جلالی نے کاروانِ علی گڈھ کے کاروان اول میں یہ معلومات فراہم کی ہے کہ سیّد محمود کی والدہ کا نام پارسا بیگم عرف مُبارک بیگم تھا۔ وہ دہلی کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ خاندان نقیب الاولیا کا خاندان کہلاتا تھا۔ شاہی زمانے میں ایک عہدہ نقیب الاولیا کا ہوتا تھا جس کا کام درویشوں، صوفیوں اور ان کی اولاد کے معاملات اور معاش سے تھا۔ خواجہ غلام علی نقیب الاولیا اس خاندان کے ایک بزرگ تھے، ان کی وفات ۱۲۶۱ھ میں ہوئی۔ پارسا بیگم ان کے خاندان سے تھیں۔ پارسا بیگم کا انتقال ۱۸۶۱ء میں مراد آباد میں ہوا۔ اس خاندان کے ایک ممتاز فرد خواجہ عبدالعلی تھے جن کا انتقال پچاسی سال کی عمر میں ۲۴ر جنوری ۱۹۴۹ء میں ہوا۔ سرسیّد کی بیگم مراد آباد میں قاضی شوکت حسین صاحب کے قبرستان واقع شوکت باغ، محلہ فیض گنج، میں دفن ہوئیں۔ ان کے پہلو میں زین العابدین خاں صاحب کی بیوی دفن ہیں۔ سرسیّد کی اہلیہ پارسا بیگم کے ایک عزیز خواجہ محمد یوسف تھے جو علی گڈھ کے رئیس اور وکیل تھے اور قومی اور تعلیمی کاموں میں سرسیّد کے دست راست تھے۔

خواجہ محمد یوسف اور سمیع اللہ خاں سے سرسیّد کی رشتہ داری تھی۔ سرسیّد کی بیوی پارسا بیگم کے خاندان کے زیادہ تر افراد دہلی سے علی گڈھ منتقل ہو گئے تھے۔ خواجہ محمد یعقوب علی

سیّد محمود کے قریبی رشتہ دار تھے (شاید ماموں تھے) علی گڈھ میں قیام پذیر تھے۔ خواجہ محمد اسماعیل بھی اسی خاندان کے ایک فرد تھے جو کالج کمیٹی فنڈ کے ممبر تھے۔ سمیع اللہ خاں کی پہلی اور دوسری بیوی اسی خاندان سے تھیں۔'' [ماخوذ از کاروان علی گڈھ]

مراد آباد کے ایک عالم و رئیس مولوی عالم علی کو بغاوت کے الزام میں سزائے موت سے بچایا۔ مولوی صاحب نے چند یورو پین عورتوں اور بچّوں کو اپنے مکان میں پناہ دی تھی۔ باغیوں نے زبردستی گھر میں گھس کر سب کو قتل کر دیا، اور مولوی صاحب کے گھر کا کوئی آدمی نہ مارا گیا۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ ان کے اشارے سے یہ قتل عمل میں آیا۔ سر سیّد نے مولوی صاحب کی بے گناہی ثابت کر کے بری کرا دیا۔ چار برس کے بعد ۱۸۶۲ء میں سر سیّد کی بدلی مراد آباد سے غازی پور کو ہو گئی۔ وہاں بھی علمی و تعلیمی کام کرتے رہے۔ (ان کاموں کا ذکر الگ عنوان میں آئے گا) ۱۸۶۴ء میں غازی پور سے علی گڈھ کو تبدیل ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں عہدۂ جج خفیفہ پر ترقی پا کر علی گڈھ سے بنارس گئے۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے انگلستان روانہ ہوئے۔ دونوں بیٹے سیّد حامد اور سیّد محمود ساتھ تھے۔ سفر کا مقصد سیّد محمود کی تعلیم کے علاوہ ولایت کے طریقۂ تعلیم کا مطالعہ و مشاہدہ تھا۔ لندن میں ان کو سی، ایس، آئی، کا خطاب اور تمغہ ملا، مشاہیر و عمائد ملک سے ملاقات کی، ملکہ وکٹوریہ اور پرنس آف ویلز کی ''لیوی'' (دربارِ عام) میں شریک ہوئے۔ بعض کلب کے ممبر بنائے گئے۔ وہاں کی یونیورسٹیوں، کتب خانوں، عجائب خانوں کو غور سے دیکھا۔ ان سب باتوں کے سوا سر سیّد کا سب سے زیادہ ضروری اور اہم مقصد ولایت کے سفر سے ایک ایسی کتاب کا لکھنا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ شائع کرنا تھا جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوموں پر ظاہر ہو، اور جو غلطیاں اکثر عیسائی مصنفوں نے اور خاص کر سر ولیم میور (لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغرب) نے اپنی کتاب 'لائف آف محمدؐ' میں اسلام کی حقیقت اور بانی اسلام کی سیرت پاک کے متعلق کی ہیں ان کو رفع کیا جائے، چنانچہ سر سیّد نے لندن میں ایک مختصر رسالہ انگریزی میں شائع کیا، اور ولایت سے آ کر مفصل کتاب اُردو میں چھپوائی۔ ولایت میں تقریباً ڈیڑھ سال رہ کر سر سیّد مع اپنے بڑے بیٹے سیّد حامد کے اکتوبر ۱۸۷۰ء میں

ہندوستان آ گئے۔ اور بنارس میں اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔ بنارس ہی کے زمانۂ قیام میں ۱۸۷۵ء میں ایک ابتدائی مدرسہ علی گڈھ میں قائم کیا اور پھر جولائی ۱۸۷۶ء سے پنشن لے کر مستقل طور پر علی گڈھ میں رہنے لگے۔

سر سیّد کی وفات: پنشن کے بعد ۲۲ برس ہمہ تن قومی خدمات میں مصروف رہ کر ۲۷ / مارچ ۱۸۹۸ء کو ۱۰ بجے رات کے علی گڈھ میں انتقال کیا۔ اور کالج کی مسجد میں دفن ہوئے۔ تواریخ وفات عربی الفاظ اور قرآنی آیات سے بے نظیر نکلی ہیں، یعنی۔ غَفَرَ لَہٗ (۱۳۱۵) اِنَّ الْعَاقِبَۃَ لِلْمُتَّقِیْن (۱۳۱۵)۔ اِنِّی (۱) مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَھِّرُکَ (۱۳۱۵)

سر سیّد کے خطابات و اعزازات: شاہی خطاب ''جوادالدولہ عارف جنگ'' کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ گورنمنٹ نے سی، ایس، آئی، کے بعد ۱۸۸۸ء میں ''کے، سی، ایس، آئی'' کا خطاب دیا۔ ایڈنبرا یونیورسٹی نے ۱۸۸۹ء میں ''ایل، ایل، ڈی'' کی اعزازی ڈگری دی۔ لندن جانے سے پہلے ''رائل ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن'' کے فیلو مقرر ہو گئے تھے۔ لندن میں وہاں کے سب سے زیادہ نامی اور معزز کلب 'اتھی نم کلب' کے ممبر بنائے گئے۔ ۱۸۷۸ء میں وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر مقرر ہوئے اور چار برس ممبر رہے۔ ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے ممبر ہوئے اور شہادت دی۔ ۱۸۸۷ء میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔

سر سیّد کی ملکی اور قومی خدمات: سر سیّد نے ہنگامۂ غدر کے سلسلے میں اپنے ملک و قوم کی جو خدمتیں کیں ان کے علاوہ ہندوستان کے لیے عموماً اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً فلاح و صلاح کی جدوجہد شروع کر دی۔ تعلیمی میدان میں پہلا قدم یہ تھا کہ: (۱) ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی مدرسہ مرادآباد میں قائم کیا (۲) اسی سال رسالہ اسباب بغاوتِ

---

(۱) قرآن مجید سے یہ تاریخ علامہ اقبال نے نکالی تھی جیسا کہ انھوں نے ایک بار محمد حسین صاحب عرشی سے کہا ہے۔ (ملفوظات اقبال مرتبہ نظامی ص ۵۱)

ہند' لکھ کر مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کی بدگمانی رفع کرنے کی کوشش کی (۳) ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، اور علمی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرائیں (۴) اسی سال غازی پور میں انگریزی مدرسہ ہندو مسلمان دونوں کے لیے قائم کیا۔ غازی پور سے علی گڈھ بدلی ہوئی تو سوسائٹی کا دفتر بھی ساتھ آ گیا۔ علی گڈھ میں اس کے تیس ہزار روپیہ لاگت سے عمارت اور باغ تیار ہوا۔ اس میں ہر مہینے سائنس پر لکچر دیا جاتا تھا، اور آلات سے تجربے دکھائے جاتے تھے۔ تاریخ، معاشرت، کاشتکاری سے متعلق بہت سی کتابوں کے ترجمے شائع کیے گئے (۵) ۱۸۶۶ء میں علی گڈھ میں سر سیّد نے ایک انجمن 'برٹش انڈین ایسوسی ایشن' کے نام سے قائم کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کریں اور اس ایسوسی ایشن کے ذریعہ سے اپنے تمام مقاصد و مطالب گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں، چنانچہ ریل اور ڈاک خانے کی بعض آسانیاں حاصل کی گئیں (۶) ۱۸۶۷ء میں اور اس کے بعد سر سیّد کی تحریک سے مختلف اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں قائم کی گئیں جن میں ضلع کے رئیس اور زمیندار بھی شامل تھے (۷) ۱۸۶۶ء ہی میں سر سیّد نے سائنٹیفک سوسائٹی سے ایک اخبار علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا۔ جو آج تک جاری ہے، لیکن اس کا نام مسلم یونیورسٹی گزٹ رکھ دیا گیا ہے۔

(۸) ۱۸۶۷ء میں سر سیّد نے اُردو یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز گورنمنٹ کے سامنے پیش کی، جس میں تمام علوم و فنون کی تعلیم مادری زبان میں ہو، اسی زبان میں امتحان لیے جائیں، اور جو سندیں انگریزی خواں طلبہ کو علم کی مختلف شاخوں میں دی جاتی ہیں وہی سندیں ان طلبہ کو دی جائیں جو انھیں مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں۔ اس یونیورسٹی کے لیے تمام علوم و فنون کی کتابیں اپنی سوسائٹی کی نگرانی میں ترجمہ و تالیف کرانے کا سر سیّد نے ذمہ لیا، اور اہتمام شروع کر دیا۔ منجملہ دیگر اہل علم و قلم کے مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال آشوب، اور پنڈت دھرم نراین بھی اس خدمت کے لیے آمادہ ہو گئے۔ لیکن یونیورسٹی کی تجویز آگے نہ بڑھ سکی اس لیے سر سیّد کو گورنمنٹ کا یہ

ارادہ معلوم ہوا کہ وہ کلکتہ یونیورسٹی کو توڑ کر ورنیکولر یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے، جس میں انگریزی بطور اختیاری زبان کے رہے گی، اور سر سیّد یہ نہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی انگریزی زبان سے محروم رہ جائیں۔ اس کے علاوہ اُردو زبان کے مخالفوں نے اخباروں میں چھیڑ چھاڑ شروع کردی کہ سر سیّد کی مجوزہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اُردو اور ہندوؤں کے لیے ہندی زبان ہو، آخر سر سیّد نے اس کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

(۹) بنارس میں سر سیّد کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہومیو پیتھک علاج کے طریقے سے بہتر کوئی طریقۂ علاج عمدہ بے خطر نہیں ہے۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء میں انھوں نے بنارس میں اس علاج کے رواج کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس کے پریزیڈنٹ مہاراجہ بنارس اور سکریٹری سر سیّد تھے۔ اور ایک شفاخانہ بنام 'ہومیو پیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل' کھولا گیا۔ اس شفاخانہ کی چرچا چند روز میں نزدیک و دور ہو گیا۔ پہلے مہینے میں ہی پانچ سو سولہ مریض شفاخانہ میں آئے۔ سر سیّد نے اس علاج کے اصول پر لکچر بھی دیا، اور ایک رسالہ بھی لکھ کر چھپوایا۔

(۱۰) ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اُردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ چنانچہ ہندوؤں نے اس کام کے لیے کمیٹیاں اور سبھائیں بنائیں اور گورنمنٹ کو میموریل بھیجے۔ سر سیّد کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ سر سیّد نے اُردو کی حمایت میں مضامین لکھے۔ اُس وقت اُردو کے مخالفوں کی تدبیریں کارگر نہ ہوئیں۔ ۱۸۸۲ء میں پھر ہندوؤں نے ایجوکیشن کمیشن کو میموریل بھیجے۔ سر سیّد نے باقاعدہ طریقے سے کمیشن پر ظاہر کر دیا کہ یہ مسئلہ تعلیمی نہیں ہے بلکہ بہت بڑا پولیٹکل مسئلہ ہے، جس کے ساتھ گورنمنٹ کے مصالح ملکی وابستہ ہیں۔ اس کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔ اس کے بعد مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں کو سر سیّد نے دنیا سے رحلت کی، ہندوؤں نے سر انٹونی مکڈانل لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں پھر ایک میموریل اُردو کی

مخالفت اور ہندی کی حمایت کے لیے پیش کیا گیا۔ اگر چہ سرسیّد پر اس زمانے میں ہجوم رنج و الم کے سبب سے (جس کا سب سے بڑا باعث سرسیّد کے بڑے بیٹے سیّد حامد کی حالت اور سوءِ مزاج تھا) ایسا سکتہ کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے، مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مسئلہ پر ایک مضمون لکھا جو ۱۹ر مارچ کے "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں سرسیّد کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا۔ یہ غالباً ان کی آخری قومی تحریر تھی، اس میں بھی ان کی فطری صاف گوئی نمایاں ہے۔ مضمون کے شروع میں لکھتے ہیں:-

"غالباً اس وقت ان کے (یعنی ہندوؤں کے) اس جوش کے اُٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس صوبے کے ہز آنر لفٹنٹ گورنر بہادر اس زمانے میں، جبکہ صوبہ بہار میں کیتھی حرف اور بہاری زبان بعوض اُردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوئی تھی، کلکٹر و مجسٹریٹ معاون اس تجویز کے تھے، پس ان صوبوں میں بھی ہندی و ناگری حروف جاری ہونے میں تامل نہ فرمائیں گے، اور شاید یہ غلط خیال بھی اس پرانے مُردہ مضمون کے اُٹھانے کا باعث ہو کہ ان دنوں میں گورنمنٹ کی نظر عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے، اور وہ ان کو ناشکرا سمجھتی ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے میموریل کے خلاف اُردو زبان اور فارسی خط کی ترجیح پر دلیلیں پیش کی ہیں۔ اس وقت ہز آنر نے عدالتوں کی زبان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن سرسیّد کے انتقال کے بعد ۱۸ر اپریل ۱۹۰۰ء کو وہ مشہور رزولیوشن پاس ہوا جو دونوں قوموں کو سر انٹونی مکڈانل کا عہدِ حکومت ہمیشہ یاد دلائے گا۔ یعنی عدالت کی زبان بجائے ہندی و اُردو کے انگریزی قرار دے دی گئی۔

(۱۱) سرسیّد کا سفر لندن بھی قوم کی خاطر تھا، وہاں بھی قوم و مذہب کی خدمت سے غافل نہ رہے، جس کا پہلے ذکر کیا گیا۔ ولایت سے آ کر ایک رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا، جس کا پہلا نمبر ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء مطابق یکم شوال ۱۲۸۷ھ کو نکلا۔ اس پرچے کے ذریعہ سے اُردو صحافت میں، انشا پردازی میں، اخلاق و معاشرت میں، عام معلومات میں اس قدر ترقی اور اتنا اچھا انقلاب پیدا ہوا کہ اس زمانے کے بیسیوں اُردو رسائل و اخبارات سے نہ ہو سکا تھا۔ سرسیّد کے علاوہ بہترین اہل علم و قلم اس کے مضمون نگار تھے۔ 'تہذیب الاخلاق' کے

بعض مذہبی مباحث سے مسلمانوں نے اختلاف کیا، جوابات لکھے، سرسیّد پر کفر کے فتوے لگائے، اس رسالے کے جواب میں رسالے نکالنے شروع کیے، یہ سب کچھ ہوا لیکن اس سے اُردو زبان وادب کو بڑا نفع پہنچا۔ 'تہذیب الاخلاق' کی سلیس، بااصول، پُرزور نثر نگاری نے تمام ملک میں یہی طرزِ نگارش عام کردیا۔ 'تہذیب الاخلاق' پہلی بار ۱۸۷۰ء ﴿۱۲۸۷ھ﴾ سے ۱۸۷۶ء ﴿۱۲۹۳ھ﴾ تک جاری رہا۔ دوسری بار ۱۸۷۹ء ﴿۱۲۹۶ھ﴾ سے ۱۸۸۱ء ﴿۱۲۹۹ھ﴾ تک، تیسری بار ۱۸۹۴ء ﴿۱۳۱۱ھ﴾ سے ۱۸۹۷ء ﴿۱۳۱۴ھ﴾ تک۔ سرسیّد کی وفات کے بعد 'تہذیب الاخلاق' کی جلدوں سے سرسیّد، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، نواب وقار الملک وغیرہ مضمون نگاروں کے مضامین کے مجموعے مرتب کیے گئے، جو ان بزرگوں کی مستقل تصانیف کا حکم رکھتے ہیں۔

(۱۲) سرسیّد نے 'تہذیب الاخلاق' کے ساتھ ہی ۲۶ دسمبر ۱۸۷۰ء کو بنارس میں کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانانِ ہند قائم کی۔ اس کے مقاصد کا اعلان پہلے سے اشتہار و اخبار کے ذریعہ سے کردیا تھا کہ "انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے لوگ عام طور پر اٹھا رہے ہیں، اور مسلمان ان سے مستفید نہیں ہوتے اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متوجہ ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ اس بیماری کی اصل جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضرور ہے۔ پس مناسب ہے کہ ایک انعامی اشتہار جاری کیا جائے، اور مسلمانوں کو اس مسئلے پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی جائے، اور اس کام کے لیے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے۔" چنانچہ نواب کلب علی خاں بہادر رئیس رامپور، کنور وزیر علی خاں رئیس دانپور اور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر شمال مغرب نے اس کام کی طرف خاص توجہ کی۔ انعامی اشتہار جاری کیا گیا، تین انعام پانچ سو، تین سو اور ڈیڑھ سو روپیہ کے مقرر ہوئے۔ میعاد معین کے اندر ۳۲ مضمون مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے موصول ہوئے۔ مولوی مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) کا مضمون سب سے عمدہ تھا، مگر ان کی خواہش سے وہ انعام کی فہرست سے خارج رکھا گیا۔ اور پہلا انعام مولوی سیّد اشرف علی ایم۔ اے کو ملا، جو اس زمانے میں بنارس کالج کے طالب علم تھے۔ دوسرا انعام نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین (وقار الملک) کو، اور تیسرا انعام مولوی عبدالودود کو ملا۔ سرسیّد نے ان

مضامین سے رپورٹ تیار کر کے شائع کی۔ اسی رپورٹ میں مجوزہ علی گڈھ کالج کی اسکیم بھی تھی۔ گورنمنٹ ہند اور لوکل گورنمنٹوں نے قیام کالج کی تجویز کو پسند کیا اور ہر طرح کی امداد دینے کا وعدہ کیا۔

(۱۳) مجوزہ مدرسۃ المسلمین کا سرمایہ جمع کرنے کے لیے سر سیّد نے کمیٹی خزینۃ البضاعۃ قائم کی جس میں لارڈ نارتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل نے دس ہزار روپیہ اور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر نے ایک ہزار روپیہ دیے۔

(۱۴) ۲۴؍ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڈھ میں ابتدائی مدرسے کی رسم افتتاح ادا کی گئی۔ اور یکم جون سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہوگئی۔ قیام مدرسہ کی تاریخ مولوی صفدر حسین نے خوب کہی ہے۔ قطعہ کا آخری شعر یہ ہے:-

تھی فکر مجھ کو اک دن تاریخ مدرسہ کی — بولا یہ مُلہمِ غیب "اٹھارہ (۱) سے پچھتر"

۱۲۹۲ھ

(۱۵) ۸؍ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن وائسرائے نے علی گڈھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اور یکم جنوری ۱۸۷۸ء سے کالج کلاس قائم ہوگیا۔ ۱۸۸۳ء تک ایف۔ اے۔ بی۔ اے۔ ایم۔ اے اور قانون کے امتحانات کے لیے کلکتہ یونیورسٹی سے کالج کا الحاق ہوگیا۔ اس کے بعد سائنس، آرٹس اور قانونی تعلیم میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے اس کا تعلق ہوگیا۔ اور آج وہی کالج مسلم یونیورسٹی ہے۔

(۱۶) سر سیّد ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۳ء تک وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے اس عرصے میں انھوں نے دو قانونی مسودے کونسل میں پیش کیے۔ چیچک کے ٹیکے کا قانون، اور قاضیوں کے تقرر کا قانون۔ یہ دونوں مسودے پاس ہوگئے۔ اور اس وقت سے آج تک ان کے موافق ہندوستان کے اکثر حصوں میں عمل درآمد چلا آتا ہے۔ تیسرا نہایت

---

(۱) لفظوں میں عیسوی سنہ ظاہر کیا گیا ہے، جن کے اعداد سے ہجری سن نکلتا ہے۔ "سو ۱۰۰" کی جگہ "سے" پرانا روز مرّہ تھا۔ "اٹھارہ سے پچھتر" یعنی اٹھارہ سو پچھتر (۱۸۷۵ء)

ضروری و مفید مسودۂ قانون وقف خاندانی (یا وقف علی الاولاد) کے متعلق تیار کیا تھا۔ تاکہ ذی مقدور خاندانوں کی اولاد موروثی جائداد کو فروخت نہ کر سکے۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور قرضہ میں نیلام نہ ہو سکے۔ لیکن اُس وقت مختلف وجوہ سے سر سیّد یہ مسودۂ قانون کونسل میں پیش نہ کر سکے۔ اب ''قانون وقف علی الاولاد'' پاس ہو گیا ہے، اور رائج ہے۔

(۱۷) اس کے علاوہ سر سیّد نے قانون انتقال جائداد، قانون حقوق استفادہ، قانون ترمیم ضابطہ فوجداری، قانون لوکل سیلف گورنمنٹ متعلقہ اضلاع متوسطہ کے کونسل میں پیش ہونے پر جیسی پُر زور اور باوقعت تقریریں کیں، اُن کو سُن کر کونسل کے انگریز ممبر اور خود وائسرائے بھی حیران تھے۔ سر سیّد برائے نام انگریزی جانتے تھے۔ اپنے دستخط کر سکتے تھے اور چند ٹوٹے پھوٹے جملے بول سکتے تھے۔ لیکن کونسل میں اسپیچ دینے کے لیے اکثر چھوٹی چھوٹی تقریروں کو وہ اول خود اُردو میں لکھ کر ان کا انگریزی ترجمہ کراتے تھے، اور پھر انگریزی الفاظ کو فارسی حرفوں میں لکھ کر خود کونسل میں پڑھتے تھے۔ اور بڑی بڑی اسپیچوں کو کونسل کا سکریٹری پڑھ کر سنا دیتا تھا۔ سر سیّد کی ایک انگریزی اسپیچ پر جو فارسی حرفوں میں لکھ کر دی تھی لارڈ رپن نے بڑا تعجب ظاہر کیا تھا۔ سر سیّد کہتے تھے کہ ''جب میں اجلاس ختم ہونے کے بعد کونسل کے ہال سے اپنے کمرے کی طرف چلا تو لارڈ رپن بھی پیچھے پیچھے چلے آئے، اور مہربانی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہ سنی تھی۔''

(۱۸) ۱۸۸۲ء میں جب کہ سر سیّد کونسل کے ممبر تھے، ان کی شہادت بھی ایجوکیشن کمیٹی میں لی گئی تھی، جس سے ان کا بڑا تجربہ کار ایجوکیشنسٹ (ماہر تعلیم) ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کمیشن کے چند سوالات یہ تھے: ''آیا مغربی علوم کی تعلیم دیسی زبانوں میں بہ نسبت انگریزی کے زیادہ مفید ہوگی؟ کونسی تدبیر سے تعلیم کی آزادی اور اس کا اختلاف نوعی محفوظ رکھا جا سکتا ہے؟ گورنمنٹ کو کس حد تک ہر قسم کی تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے؟ گرانٹ ان ایڈ (امدادی تعلیم) کا قاعدہ جو بالفعل مروّج ہے وہ کافی ہے یا نہیں؟ گورنمنٹ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں کہاں تک کوشش کر سکتی ہے، اور اس میں کامیابی کی کیا توقع ہے؟'' اس طرح کے سب سوالوں کے جواب سر سیّد نے نہایت دانشمندی، معاملہ فہمی،

صداقت اور دلیری کے ساتھ دیے۔

(۱۹) ۱۸۸۳ء میں سر سیّد نے ''محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن'' قائم کی، تا کہ اس کے چندے سے مسلمان لڑکوں کو انگلستان بھیجا جائے، اور سول سروس کے امتحان مقابلہ، یا ولایت کی کسی یونیورسٹی کی ڈگری یا بیرسٹری، ڈاکٹری، انجینئری کا ڈپلوما حاصل کرنے میں اعانت کی جائے۔

(۲۰) ۱۸۸۶ء میں سر سیّد نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ یہ ہندوستان میں سب سے بڑی تعلیمی انجمن تھی۔ سر سیّد کی زندگی میں اس کے گیارہ اجلاس ہوئے۔ اتنے ہی عرصے میں اس کانفرنس کے ذریعے سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری پیدا ہو گئی۔ بے شمار انجمنیں، مکاتب، اسکول قائم ہوئے۔ کتابیں تصنیف و ترجمہ ہوئیں، تعلیمی مردم شماریاں ہوئیں۔ غیر سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ طالب علموں کو وظائف دئے گئے۔ اس طرح مسلمانوں کی اصلاح حال اور ترقی تعلیم کا ہر ممکن وسیلہ اختیار کیا گیا۔ یہ کانفرنس آج تک قائم ہے، اگرچہ آج کل ملکی انقلابات اور سیاسی حالات کے سبب سے پہلی سی سرگرمی نہیں رہی۔

(۲۱) ''انڈین نیشنل کانگریس'' کی مخالفت بھی سر سیّد کا ایک کارنامہ ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس سے ایک سال پہلے کانگریس قائم ہوئی تھی۔ پہلے یہ مجلس بنگالیوں نے بابو سرندرو ناتھ بنرجی کی سعی و مشورہ سے کلکتہ میں قائم کی تھی اور اس کا نام ''بنگال نیشنل لیگ'' رکھا تھا۔ پھر اسی سے انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کی گئی۔ پہلے اس کا جو مقصد مشتہر کیا گیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ گورنمنٹ نے جن حقوق کے دینے کا ہندوستانیوں سے وعدہ کیا ہے اس کا مطالبہ کیا جائے۔ اس کے بعد مختلف پمفلٹوں کے ذریعے سے جو خیالات شائع کیے گئے ان میں گورنمنٹ کی بے انصافی اور موجودہ طریقۂ حکومت کی برائی ایسے طور پر ظاہر کی گئی جس سے خاص کر جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے دل پر برا اثر ہوتا تھا، اور گورنمنٹ کی طرف سے غلط خیالات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ پھر بھی سر سیّد نے دو سال تک کانگریس کی رفتار اور کارروائی کو بغور دیکھا، آخر یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوئے کہ گورنمنٹ کے

انتظام پر نکتہ چینی کرنا اور ایجی ٹیشن (شورش پھیلانا) بعینہ ایسا ہے جیسے سلطنت سے بغاوت اختیار کرنا۔ پس مسلمانوں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ ایجی ٹیشن سے بالکل علیحدہ رہیں۔ چنانچہ ۲۸ ردسمبر ۱۸۸۷ء کو جبکہ محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں اور انڈین نیشنل کانگریس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہو رہا تھا، مسلمانوں کے عام جلسہ میں سر سیّد نے کانگریس کے خلاف نہایت مفصل اور پُر زور لکچر دیا۔ اس کے بعد ۶ رمارچ ۱۸۸۸ء کو میرٹھ میں دوسرا لکچر ایسا ہی طولانی دیا۔ اور پھر مضامین، تقریروں اور زبانی گفتگو کے ذریعے سے علانیہ مخالفت شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم مسلمان کانگریس میں شریک ہوئے۔ اس کام میں کانفرنس کے وجود نے بھی مدد دی۔ دونوں کا انعقاد دسمبر کے آخری ہفتہ میں ہوتا تھا۔ اس لیے ہزارہا مسلمان کانفرنس کی طرف متوجہ رہتے تھے۔

(۲۲) اس کے بعد اگست ۱۸۸۸ء میں سر سیّد نے علی گڈھ میں پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (مجلسِ محبانِ وطن) اس غرض سے قائم کی کہ جو قومیں اور جو رئیس اور تعلقہ دار وغیرہ کانگریس میں شریک نہیں ہیں، ان کی رائیں اور خیالات اور خط و کتابت بطور پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر اہلِ انگلستان اور ممبرانِ پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے ولایت کو بھیجی جائے اور نیز اخبارات کے ذریعے سے ہندوستان اور انگلستان میں عام طور پر شائع کی جائے۔ اس ایسوسی ایشن کے قائم کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بنگال، بہار، مدراس، بمبئ، ممالک متوسط، اضلاع شمال مغرب و اودھ، اور پنجاب کی بے شمار اسلامی انجمنوں میں کانگریس کے برخلاف جلسے کیے گئے۔ تمام تعلقہ دارانِ اودھ، مہاراجہ بنارس، ریاست حیدر آباد، اور دیگر ریاستوں کی طرف سے ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق کیا گیا۔ ان تدبیروں سے گورنمنٹ کو یقین دلایا گیا کہ کانگریس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاص کر مسلمان شریک نہیں ہیں۔ سر سیّد ایک خط میں بدر الدین طیّب جی جو کانگریس کے ایجی ٹیشن میں مسلمانوں کی شرکت کے نقصانات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ: ''غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل جلے تھے بیچ میں کود پڑے ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے، مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔''

سر سیّد کی گوناگوں خدمات کا یہ مختصر خاکہ ہے جو 'حیاتِ جاوید' سے تقریباً مولانا حالی ہی کے الفاظ میں اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس میں ان کی مذہبی خدمات شامل نہیں ہیں۔ اس کا ذکر ان کی تصانیف کے سلسلے میں آئے گا۔

سر سیّد کی تصانیف اور علمی و ادبی خدمات: ۱۸۳۵ء میں اخبارات کو آزادی ملی، اسی سال سر سیّد کے بڑے بھائی سیّد محمد خاں نے دہلی سے سیّد الاخبار جاری کیا۔ سر سیّد کی سب سے پہلی علمی و ادبی خدمت اس اخبار میں مضمون نویسی تھی۔

(۱) 'جام جم' (فارسی)۔ ملازمتِ آگرہ کے زمانے میں سر سیّد نے فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ کے مرتب کی۔ اس میں امیر تیمور سے بہادر شاہ تک ۴۳ بادشاہوں کا مختصر حال لکھا۔ ۱۸۴۰ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔

(۲) 'جلاء القلوب بذکر المحبوب'۔ مولفہ ۱۸۴۲ء ﴿۱۲۵۸ھ﴾۔ مولود شریف کی محفلوں میں پڑھنے کے لیے سر سیّد نے اس رسالے میں اس زمانے کے خیالات کے موافق صحیح روایتیں درج کیں۔

(۳) 'تحفۂ حسن'، مولفہ ۱۸۴۴ء ﴿۱۲۶۰ھ﴾ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی تصنیف تحفۂ اثنا عشریہ کے باب دہم و دوازدہم کا ترجمہ۔ یہ رسالہ شیعوں کی تردید میں لکھا تھا۔ اس کے بعد سر سیّد نے کبھی شیعوں کے عقائد و اعمال سے تعرض نہیں کیا۔

(۴) 'تسہیل فی جر الثقیل'، مطبوعہ ۱۸۴۴ء۔ ابوذر یمنی کے عربی رسالے سے کسی عالم بوعلی نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، اور 'معیار العقول' نام رکھا تھا، سر سیّد نے فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس رسالے میں مصنف نے جرِ ثقیل کے پانچ اصول بیان کیے ہیں۔ یعنی بھاری چیزوں کے اٹھانے، سخت چیزوں کے چیرنے، دبانے، نچوڑنے کے لیے پانچ کلیں بتائی ہیں، اور ان کے بنانے اور استعمال کرنے کا طریقہ اور مختلف ترکیبیں بیان کی ہیں۔

(۵) 'آثار الصنادید'۔ یہ کتاب سر سیّد کا نہایت عجیب و نادر کارنامہ و یادگار ہے، اور اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز۔ اور جس محنت و کاوش سے مرتب کی گئی ہے اس کے لحاظ سے کم از کم ہندوستان میں اور اُردو میں آخری چیز بھی ہے۔ اس میں عمارات دہلی کا حال

ہے۔ عمارات بیرونِ شہر، لال قلعہ وعمارات قلعہ، عمارات شہر دہلی، یعنی حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باولیوں، کنووں وغیرہ کے حالات، ان کے نقشے، تصویریں، کتبے، دہلی کے پرانے شہروں، قلعوں، محلّوں کا بیان پھر مشاہیر اہل دہلی کا حال لکھا ہے، جس میں ایک سو بیس مشائخ، علماء، فقرا، مجاذیب، اطبا، قرا، شعرا، خوش نویس، مصور، موسیقی داں وغیرہ کا بیان ہے۔ اکثر عمارتوں کے عرض وطول و بلندی کی پیمائش کرنی، ہر عمارت کی صورت حال قلم بند کرنی، کتبوں کے چربے اتارنے، ہر کتبہ کا بعینہٖ اس کے اصلی خط میں دکھانا، ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھچوانا، اور اس طرح سوا سو عمارتوں کی تحقیقات کرنا فی الحقیقت نہایت دشوار کام تھا۔ سر سیّد کہتے تھے کہ: ''قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب سے پڑھے نہ جاسکتے تھے، ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلّیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوالیا جاتا تھا۔ اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے، اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہوجاتا تھا۔''

باوجود اس قدر مشکلات کے ''آثار الصنادید'' کا پہلا ایڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں چھپ کر تیار ہوگیا۔ اس کی عبارت سر سیّد نے مولوی امام بخش صہبائی سے لکھوائی تھی، اس لیے رنگین و مقفّٰی تھی، سلیس و رواں نہ تھی۔ اسی زمانے میں مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ دہلی ولایت جاتے تھے، وہ اس کا ایک نسخہ ساتھ لے گئے، اور وہاں جا کر اس کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا ممبروں نے بہت پسند کیا اور اس کا ترجمہ انگریزی میں کرانا چاہا۔ مسٹر رابرٹس نے دہلی واپس آکر سر سیّد کی شرکت سے انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہا۔ اس وقت سر سیّد نے اس پر نظر ثانی کی۔ پہلے ایڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور مبالغہ و تکلفات کے سبب سے بے مزہ ہوگئی تھی۔ دوبارہ سادہ و سلیس عبارت میں لکھی گئی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ لیکن غدر میں اس کے تقریباً تمام نسخے تلف ہوگئے۔ مسٹر رابرٹس کی بھی دہلی سے تبدیلی ہوگئی تھی اس لیے انگریزی کا ترجمہ بھی رہ گیا۔ لیکن فرانس کے مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی

زبان میں کر کے مشتہر کیا، جس کی ایک جلد سرسیّد کو بھی بھیجی۔ اسی فرنچ ترجمے کو دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسیّد کو سوسائٹی کا آنریری فیلو مقرر کیا۔

'آثارالصنادید' کا تیسرا ایڈیشن منشی رحمت اللہ رعد نے اپنے نامی پریس کانپور میں ۱۹۰۴ء میں شائع کیا۔ جس میں پہلے دونوں ایڈیشنوں کی خوبیاں جمع کر دیں۔

(۶) 'کلمۃ الحق' مولفہ ۱۸۴۹ء۔ یہ رسالہ پیری مریدی اور بیعت کے طریقۂ مرّوجہ کے برخلاف لکھا ہے۔

(۷) 'راہِ سنّت در ردِ بدعت' مولّفہ ۱۸۵۰ء یہ رسالہ وہابیت کے جوش کے زمانے میں اہلِ بدعت کے برخلاف، متبعین سنّت کی تائید میں لکھا ہے۔ سرسیّد خود بھی غیر مقلد تھے اور مقلدین کو بدعتی سمجھتے تھے۔

(۸) 'نمیقہ در بیان مسئلہ تصوّر شیخ' مرقومہ ۱۸۵۲ء۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں بطور ایک فرضی یا واقعی مکتوب کے لکھا ہے، جس میں تصوّر شیخ مصطلح مشائخ نقشبندیہ کو وسیلۂ محبتِ خدا و محبت رحمتِ الٰہی بتایا ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ مشائخ نقشبندیہ جن کے تصوّر شیخ کو سرسیّد وسیلۂ محبت الٰہی بتاتے ہیں، وہ سب کے سب اہل تقلید تھے۔ یعنی سرسیّد ان کے اصل تصوف کو صحیح مانتے ہیں، لیکن ان کے اصول تقلید کو غلط جانتے ہیں۔

(۹) 'سلسلۃ الملوک' مرتبہ ۱۸۵۲ء۔ یہ ان راجاؤں اور بادشاہوں کی مختصر مگر مفید و صحیح فہرست ہے جو دہلی میں پانچ ہزار برس سے فرماں روا ہوتے چلے آئے ہیں۔ اس میں راجہ جدھشٹر سے ملکۂ وکٹوریہ تک ۲۰۲ بادشاہوں کا حال نقشہ و جدول کی صورت میں لکھا ہے۔ جو اب 'آثارالصنادید' کے تیسرے ایڈیشن میں شامل ہے اور دوسرے میں بھی تھی۔

(۱۰) 'قول متین در ابطال حرکت زمین'۔ اس رسالے میں قدیم خیالات کے مطابق سرسیّد نے زمین کی حرکت کو غلط ثابت کرنا چاہا تھا۔ لیکن بعد کو حرکت زمین کے قائل ہو گئے تھے اور اس کو یقینی جانتے تھے۔

(۱۱) 'فوائد الافکار فی اعمال الفرجار' مترجمہ ۱۸۶۴ء، سرسیّد کے نانا نواب دبیر الدولہ فرید الدین نے 'پرکار متناسبہ' کے اعمال پر، جو انھوں نے خود سوچ سوچ کر نکالے

تھے، فارسی میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ سرسیّد نے دو انگریز عالموں کے کہنے سے ان مسودات کا ترجمہ اُردو میں کیا، اور مثالیں اپنی طرف سے اضافہ کیں۔

(۱۲) 'سیرت فریدیہ'۔ سرسیّد نے یہ کتاب اپنے نانا دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین کے حالات میں لکھی ہے۔ اس میں اپنے بچپن کے حالات بھی درج کیے ہیں۔

(۱۳) 'تاریخ ضلع بجنور'۔ جنوری ۱۸۵۵ء میں سرسیّد صدر امین ہوکر بجنور گئے وہاں کلکٹر کی فرمائش سے ضلع بجنور کی تاریخ مرتب کی۔ کلکٹر نے اس کو گورنمنٹ میں بھیج دیا، ابھی وہاں سے واپس نہ آئی تھی کہ غدر ہوگیا، اور وہ غالباً آگرہ میں غدر کے سبب سے تلف ہوگئی۔

(۱۴) 'تصحیح آئین اکبری'۔ شہنشاہ مغلیہ اکبر اعظم (۱۵۵۶ء ﴿۹۶۳ھ﴾ تا ۱۶۰۵ء ﴿۱۰۱۴ھ﴾) کے وزیر و مشیر ابوالفضل (متوفّٰی ۱۶۰۲ء ﴿۱۰۱۱ھ﴾) نے بادشاہ کے اصول وطریقِ سلطنت پر 'آئینِ اکبری' لکھی تھی۔ اس کی فارسی زبان بالکل نئے طرز کی تھی، جس میں عربی کے الفاظ کم تھے۔ اور اسلوب بیان دشوار فہم تھا۔ کاتبوں کی بے پروائی سے اس کتاب میں غلطیاں بہت تھیں۔ سرسیّد نے بجنور میں ایک تاجر دہلی حاجی قطب الدین کی فرمائش سے آئینِ اکبری کی تصحیح کی۔ پہلی اور تیسری دو جلدیں ۱۸۵۶ء میں شائع ہوگئیں۔ دوسری جلد کی تصحیح میں دشواریاں تھیں۔ اس لیے اس کو موخر رکھا تھا۔ جب اس کی صحت مکمل ہوئی اور مطبع میں بھیجی گئی تو غدر ہوگیا اور وہ ضائع ہوگئی۔ اس کی پہلی جلد خاکسار راقم کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ دہلی کے نامور لوگوں نے آئینِ اکبری پر تقریظیں (i) لکھی تھیں۔

(۱۵) 'تاریخ سرکشی بجنور'، مراد آباد آ کر لکھی، اس میں مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات وواقعاتِ غدر جو ضلع بجنور میں گزرے بقید تاریخ نہایت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اس میں بہت سی تحریریں اور یادداشتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسیّد ابتدا سے اخیر تک اس کتاب کے لیے مواد جمع کرتے رہے تھے۔

(i) مولانا صہبائی، مفتی صدر الدین آزردہ، وغیرہ کے علاوہ مرزا غالب نے بھی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) منظوم تقریظ مثنوی کی صورت میں لکھی تھی۔ اہلِ ہند کی فارسی انشاپردازی سے نفرت وتحقیر غالبؔ کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی، اور انگریز پرستی کو انھوں نے اپنا شعار بنالیا تھا۔ اس لیے 'آئینِ اکبری' کی تعریف کرنا ان کے خلاف آئین تھا۔ چنانچہ اپنی تقریظ منظوم میں سرسیّد کی رائے تصحیح کو ننگ وعار ہمت والا بتایا ہے۔ 'آئینِ اکبری' کو متاع کس مخر کہا ہے۔ اس کے طرزِ تحریر سے اپنی انشاپردازی کو کنایۃً خوشتر بتایا ہے۔ سرسیّد کی اس کوشش کو ''مردہ پروردن'' سے تعبیر کیا ہے۔ اور اکبر بادشاہ کے آئین واصول حکمرانی کے مقابلے میں انگریزوں کی ریل، دخانی جہاز، تار برقی، بجلی کی روشنی وغیرہ کو سراہا ہے۔ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:-

مژدہ یاراں را کہ ایں دیریں کتاب — یافت از اقبالِ سیّد فتح باب

دیدہ بینا آمد و بازو قوی — کہنگی پوشید تشریف نوی

دیں کہ ہر تصحیح آئین رائے اوست — ننگ و عار ہمت والائے اوست

کس مخر باشد بگیتی ایں متاع — خواجہ را چہ بود امید انتفاع

گر ز آئیں می رود با ما سخن — چشم بکشا اندریں دیر کہن

صاحباں انگلستاں را نگر — شیوہ و انداز ایناں را نگر

تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند — آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد — گہ دخاں گردوں بہ ہاموں می برد

علتک گردوں بگرداند دُخاں — نرہ گاہ و اسپ وا ماند دُخاں

نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند — حرف چوں طائر بہ پرواز آورند

رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ — شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ

طرز تحریرش اگر گوئی خوش است — نے فزوں از ہر چہ می جوئی خوش است

ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است — گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است

مُردہ پروردن مبارک کار نیست — خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

سرسیّد نے یہ تقریظ نہیں چھپوائی اور یہ کہہ کر غالبؔ کو واپس کر دی کہ ایسی تقریظ مجھے درکار نہیں۔ غالبؔ کے کلیات فارسی میں چھپی ہوئی ہے۔ مولانا حالیؔ نے لکھا ہے کہ جب سے سرسیّد نے تقریظ چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ غالبؔ سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے، اور دونوں کو حجاب دامن گیر ہو گیا تھا۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایسی حالت میں جب کہ جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے، انگریزی عملداری بالکل اٹھ گئی تھی، لوگوں کے گھر بار لُٹ رہے تھے، اور خود سرسیّد نہایت خوف وہراس کی حالت میں تھے، وہ ان کاغذات اور یادداشتوں کو بحفاظت رکھتے جاتے تھے۔

(۱۶) 'رسالہ اسباب بغاوتِ ہند' مرادآباد ہی میں یہ رسالہ بھی ۱۸۵۸ء میں لکھ کر چھپوایا۔ یہ بھی سرسیّد کی ملکی خیر خواہی، قومی محبت اور اخلاقی جرأت کی یادگار ہے۔ ہنگامۂ غدر میں گورنمنٹ عموماً اہلِ ہند سے اور خصوصاً مسلمانوں سے بدظن ہوگئی تھی۔ سب سے زیادہ تباہیاں مسلمانوں پر آئی تھیں۔ سرسیّد نے اس کتاب میں غدر کو حکومت کی خامیوں اور خرابیوں کا نتیجہ ثابت کیا ہے۔ اور تمام بدتدبیریاں اور سختیاں گنائی ہیں۔ سرسیّد نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ اہلِ ہند نے سرکشی کے لیے پہلے سے کوئی سازش نہ کی تھی، مسلمانوں میں بھی جہاد کی کوئی سازش نہ تھی، اودھ کی ضبطی بھی اس عام فساد کا باعث نہ تھا، فوج میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اتفاق سے مرزا غالبؔ مارچ ۱۸۶۰ء میں رامپور سے دہلی کو جاتے میں مرادآباد اترے۔ سرسیّد مرادآباد میں صدر الصدور تھے۔ لیکن اسی حجاب کے سبب سے غالبؔ نے ان کو اطلاع نہ دی تھی اور سرائے میں ٹھہر گئے تھے۔ سرسیّد کو معلوم ہوا تو فوراً سرائے میں پہنچے اور مرزا غالبؔ کو مع اسباب اور ہمراہیوں کے اپنے مکان پر لے آئے۔ مرزا پالکی سے اترے تو ایک بوتل ان کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے اس کو مکان میں لاکر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سرسیّد نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا۔ مرزا نے بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے۔ سرسیّد نے کہا آپ خاطر جمع رکھیے میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے۔ مرزا صاحب نے کہا، بھئی مجھے دکھا دو، تم نے کہاں رکھی ہے۔ انھوں نے کوٹھری میں لے جاکر بوتل دکھادی۔ آپ نے اپنے ہاتھ میں بوتل اٹھا کر دیکھی، اور مسکرا کر کہنے لگے کہ بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے، سچ بتاؤ کس نے پی ہے۔ شاید اسی لیے تم نے کوٹھری میں لاکر رکھی تھی۔ حافظؔ نے سچ کہا ہے:-

واعظاں کایں جلوہ بر محراب و منبر می کنند　　چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

سرسیّد ہنس کر چپ ہو رہے، اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی، رفع ہوگئی۔ مرزا دو ایک دن وہاں ٹھہر کر دہلی چلے آئے۔

باہم بغاوت کی صلاح بھی نہ تھی، باغی فوج کی پہلے سے بادشاہ دہلی سے بھی سازش نہ تھی، بلکہ بہت سی باتیں برسوں سے جمع ہو رہی تھیں، جن سے ہندوستانیوں کا دل گورنمنٹ سے پھٹتا جاتا تھا، اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انتظام حکومت، قانون سازی اور مشورہ اور تدبیر میں ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہ تھا، اور حاکم و رعایا کے درمیان تبادلۂ خیالات کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ گورنمنٹ کے احکام و قوانین کی مصلحت کو اہل ہند نہ سمجھ سکتے تھے، بلکہ برعکس سمجھ لیتے تھے، اور ان کو سمجھانے کا کوئی وسیلہ اختیار نہ کیا گیا تھا۔ گورنمنٹ نے جو انتظامات کیے، اور جو قانون نافذ کیے ان سے ہندوستانیوں کو غلط فہمی پیدا ہوئی، اور انھوں نے اس کے دو نتیجے سمجھے۔ ایک یہ کہ سرکار ہندوستانیوں کو مفلس و تباہ کرنا چاہتی ہے، دوسرے یہ کہ ان کے مذہب میں مداخلت کرنا اور ان کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ یہ مسالہ مدتوں سے جمع ہو رہا تھا۔ اس کے بھڑک اٹھنے کے لیے کارتوس کاٹنے کا حکم اور نافرمانی کرنے پر میرٹھ کی فوج کو پابہ زنجیر کر کے رسوا کرنا، شتابہ بن گیا۔ بہر حال غدر کی معلومات کے متعلق سرسیّد کا یہ رسالہ آج بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ سرسیّد اگر اس کی مطبوعہ کاپیاں ہندوستان میں عام طور پر شائع کر دیتے، تو اہلِ ہند میں ازسرِ نو جوش پیدا کرنے کا سبب بن سکتا تھا، لیکن انھوں نے یہ دانشمندی کی کہ چھپوانے کے بعد اس کی ایک جلد گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیج دی، اور چند جلدیں اپنے پاس محفوظ و مخفی رکھیں۔ باقی کچھ کم پانسو جلدیں سیدھی ولایت کو گورنمنٹ کے پاس بھیج دیں۔ وہاں اس کے ترجمے ہوئے، اس پر بحثیں ہوئیں۔ اکثر نے اس رسالے کو سرسیّد کی خیرخواہی پر محمول کیا، لیکن بعضوں نے اس کی بنا پر سرسیّد کو غدار اور مفسد قرار دیا۔ اور گورنمنٹ سے سرسیّد کو سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب ان لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ سرسیّد نے شائع کرنا کیسا کسی کو یہ کتاب دکھائی تک نہیں، تو وہ حیران رہ گئے۔

(۱۷) 'لائل محمڈنز آف انڈیا' (ہندوستان کے وفادار مسلمان) چونکہ غدر کے بعد گورنمنٹ کی چشم غضب سب سے زیادہ مسلمانوں کی طرف تھی، ان کی غداری کا ہر جگہ چرچا تھا، اور وفاداری کا کہیں ذکر نہ تھا، اس لیے سرسیّد نے مسلمانوں کے حالات کا ایک سلسلہ اس نام سے شروع کیا۔ اور اس کو اُردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا۔ لیکن

یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ۲۷۳ صفحے چھپ کر اور شائع ہو کر رہ گئے۔ ۱۸۶۰ء میں جاری ہوا اور تین نمبروں کے بعد ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا۔

(۱۸) 'تحقیق لفظ نصاریٰ': غدر کے بعد بعض مسلمانوں کی ایسی تحریریں گورنمنٹ کو دستیاب ہوئیں جن میں انگریزوں کو ''نصاریٰ'' لکھا تھا۔ انگریزوں نے اس لفظ کو اپنی توہین و تحقیر سمجھا۔ اور یہ خیال کیا کہ جس طرح یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حقارت سے 'ناصری' (یعنی ناصرہ گاؤں کا رہنے والا) کہتے ہیں اسی طرح مسلمان ہم کو 'نصاریٰ' کہتے ہیں۔ اس بنا پر گورنمنٹ نے بعض مسلمانوں کو سزائیں دیں۔ سرسیّد کو جو یہ حال معلوم ہوا تو انھوں نے زمانہ قیام مراد آباد میں لفظ نصاریٰ کی تحقیق پر مختصر رسالہ لکھ کر شائع کیا۔ اس میں ثابت کیا ہے کہ یہ لفظ ناصری سے مشتق نہیں ہے، بلکہ نصر مشتق ہے۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ کو ناصری نہیں کہا گیا، نہ 'قریہ ناصرہ' کا کہیں ذکر ہے۔ بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں عیسائی خود اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے تھے۔ جب یہ رسالہ شایع ہوا تو کسی انگریزی اخبار نے لکھا کہ سیّد احمد خاں کا بیان غلط ہے، کیوں کہ کسی شخص کو نصاریٰ کا لفظ لکھنے پر سزا نہیں ہوئی۔ اس پر ایک معزز یوروپین افسر نے جواب دیا اور یہ لکھا کہ خود ہمارے سامنے ایک شخص کو اسی جرم میں کانپور میں پھانسی دی گئی! اس رسالے کی اشاعت کے بعد سے کسی سے اس لفظ پر مواخذہ نہیں ہوا۔

(۱۹) 'تصحیح تاریخ فیروز شاہی': مراد آباد ہی میں سرسیّد نے ضیاء الدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' کی تصحیح کی۔ یہ مؤرخ برن (یعنی بلند شہر) کا رہنے والا تھا، بہت بڑا فاضل اور راست بیانی میں مشہور تھا۔ اس لیے اس کی یہ تاریخ جو فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت کے متعلق ہے، بہت معتبر اور مستند ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے لیے سرسیّد نے چار مختلف نسخوں سے مقابلہ کر کے تصحیح کی، اور سوسائٹی نے ۱۸۶۲ء میں شائع کی۔

(۲۰) 'تبیین الکلام': یہ تصنیف بھی سرسیّد کی قومی محبت، تدبّر و دانش مندی، شوق علم و تحقیق، ہمت و استقلال کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ کہاں سرسیّد اور ان کی قدیم رنگ کی تعلیم اور سرکاری اور قومی مصروفیتیں، اور کہاں توریت و انجیل

کی تفسیر! لیکن بقول مولانا حالی کے ''مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمتِ دشوار'' سرسیّد نے غدر کے بعد جتنی کتابیں لکھیں ان سے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ عیسائی قوم اور انگریزی حکومت کے دل سے اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بدگمانی اور غداری کا خیال رفع کیا جائے، دوسرے یہ کہ اسلام کی ہمہ گیری و رواداری اور مطابقتِ عقل و سائنس کو مسلمانوں کے ذہن نشین کر کے ان میں بیداری، روشن خیالی اور آزادیِ رائے پیدا کی جائے، اور انگریزوں سے میل جول، ان کے علوم و فنون، اور ان کی حکومت سے فائدہ حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ انہی مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر سرسیّد نے پہلے انجیل کی تفسیر اور پھر قرآن کی تفسیر لکھی۔ ''خطباتِ احمدیہ'' اور اس کے مختلف مقالے جو علیحدہ شائع ہوئے، وہ بھی اسی کام کے لیے تھے۔ بلکہ ان کے صدہا مضامین 'تہذیب الاخلاق' کا بھی بیشتر یہی مدعا تھا۔

غدر سے پہلے جب دہلی و آگرہ وغیرہ میں مشنریوں کے کاروبار زیادہ پھیلنے لگے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے جا بجا مباحثے ہونے لگے۔ اس وقت سرسیّد کو خیال آیا کہ اسلام کی حمایت میں عیسائیوں کے اعتراضات کے جواب لکھے جائیں۔ عیسائیوں کے ساتھ زبانی یا تحریری مباحثہ کرنے کا مخاصمانہ طریقہ جو مسلمانوں میں غدر سے پہلے جاری تھا، اس کا نتیجہ اگرچہ ایک لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بہت اچھا ہوا کہ مسلمان اور قوموں کی طرح مشنریوں کے زیادہ شکار نہیں ہوئے، مگر عیسائیوں کے دل میں اسلام کی طرف سے کوئی عمدہ خیال پیدا نہ ہوا۔ وہ اسلام کو بدستور ظلم، خوں ریزی، تعصب اور دیگر برائیوں کا سرچشمہ سمجھتے رہے، اور مسلمانوں کو عیسائیوں کا دشمن اور عیسائی قوم کی حکومت کا بدخواہ خیال کرتے رہے۔ پس جس طرح مسلمانوں کو مشن کی زد سے بچانے کے لیے مناظرہ کا طریقہ جاری رکھنا ضروری تھا، اسی طرح یہ بھی ضرور تھا کہ مناظرہ کے مخاصمانہ طریقے کو چھوڑ کر آشتی اور مصالحت کا طریقہ اختیار کیا جائے، اور عیسائیوں کو دکھایا جائے کہ دنیا میں اگر کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست ہوسکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہوسکتا ہے اور بس۔ ظاہر ہے کہ اس مطلب کے حاصل ہونے کے لیے کوئی طریقہ اس سے بہتر نہ تھا کہ توریت اور انجیل کی تفسیر ایک مسلمان کے ہاتھ سے لکھی جائے۔ اور جو امور فی الواقع

دونوں مذہبوں میں موافق یا مخالف ہیں۔ ان کو اپنی اپنی جگہ صاف طور پر بیان کیا جائے، اوراس طرح اس بیگانگی اور وحشت کو جو دونوں قوموں کی غلط فہمی سے پیدا ہوگئی ہے رفع کیا جائے۔(۱)

اس تفسیر کے لیے عیسائی مذہب، بائبل کی حقیقت، اوراس کی تاریخ سے واقفیت ضروری تھی۔ اور بہت کچھ سامان درکار تھا۔ یہ سرسیّد کی بے نظیر ہمت ومحنت کا ثبوت ہے کہ انھوں نے عیسائی مذہب کی تمام ضروری کتابیں خریدیں، ایک انگریزی خواں نوکر رکھا جو ان کا ترجمہ سناتا تھا۔ کتب احادیث وتفسیر سے سندیں بہم پہنچانے کے لیے ایک عربی داں عالم کو نوکر رکھا، ایک یہودی سالم نام کو نوکر رکھ کر عبرانی زبان پڑھنی شروع کی، مولوی عنایت رسول چریاکوٹی عربی وعبرانی کے بہت بڑے عالم تھے، ان سے مدد لی، اپنی اُردو تحریر کو انگریزی میں ترجمہ کرانے کے لیے ایک یوروپین کو سو روپیہ ماہوار پر نوکر رکھا، کئی ہزار روپیہ کا پریس رڑکی سے منگوایا، اور اس کے لیے اُردو ٹائپ کے علاوہ عبرانی اور انگریزی ٹائپ کے حروف بھی منگوائے۔ چنانچہ تالیف کے ساتھ ساتھ طباعت بھی شروع ہوگئی۔ ایک کالم میں عبرانی توریت کی عبارت عبری خط میں، اوراس کا اُردو ترجمہ اور انگریزی ترجمہ اس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ دوسرے کالم میں اسی مضمون کی کوئی آیت قرآنی یا حدیث اوراس کا انگریزی اور اُردو ترجمہ اس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد تفسیر لکھی جاتی تھی۔ تفسیر شروع کرنے سے پہلے سرسیّد نے دس مقدمے جن میں سے اکثر بہت طولانی ہیں، بڑی محنت وتحقیق وتلاش سے لکھے ہیں۔ یہ مقدمے درحقیقت باہمی تنافر مذہبی کے دور کرنے کی تمہید ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی ناقدر دانی ومخالفت، اور طباعت کی کثرت مصارف کے سبب سے دو جلدیں چھپ کر رہ گئیں۔ ایک میں دس مقدمے اور دو تتمے ہیں دوسری میں تفسیر۔ اس کتاب کا پورا نام سرسیّد نے یہ رکھا ہے:۔ "تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ

---

(۱) یہ عبارت بجنسہ مولانا حالی کی 'حیاتِ جاوید' سے منقول ہے، دوسری کتابوں کے متعلق بھی اس سے پہلے اور بعد کی اکثر عبارتیں اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔ البتہ کہیں کہیں مقدم ومؤخر اور مختصر کردی گئی ہیں۔

والانجیل علی ملّتہ الاسلام' ۱۸۶۲ء ﴿۱۲۷۸ھ﴾ میں غازی پور میں شائع ہوئی۔ (اس کا نمونہ آئندہ درج کیا جائے گا)۔

(۲۱) 'علاج ہومیو پیتھک'۔ بنارس میں سر سیّد نے ہومیو پیتھک طریقۂ علاج کے رائج کرنے کی کوشش کی، شفاخانہ قائم کیا۔ اسی کے سلسلے میں ایک رسالہ بھی ۱۸۶۷ء میں لکھ کر شائع کیا۔

(۲۲) 'احکام طعام اہل کتاب'۔ مسلمانوں کے دلوں سے انگریزی معاشرت کی نفرت دور کرنے اور انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کی عادت ڈالنے کے لیے یہ رسالہ لکھا، اور قرآن وحدیث سے اہلِ کتاب کے کھانے کو جائز ثابت کیا۔ سر سیّد نے خود پہلے ہی سے انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا تھا۔ مسلمانوں نے حسبِ عادت اس پر بھی بہت لے دے کی۔

(۲۳) 'سفر نامہ لندن'۔ سر سیّد نے اس سفرنامے میں ہر ایک دلچسپ حال جو اثنائے راہ میں پیش آیا ہے قلمبند کیا ہے۔ یورپ کے عجائبات ایسے طور پر بیان کیے ہیں جن سے پڑھنے والوں کو یورپ کے سفر کی ترغیب ہو۔

(۲۴) 'خطبات احمدیہ'۔ سر سیّد کی مذہبی خدمات ماضی و مستقبل میں بہترین خدمت یہ تصنیف ہے۔ اس سے پہلے جتنی کتابیں لکھیں 'اسباب بغاوت ہند'، 'تبیین الکلام' وغیرہ وہ بھی قوم و مذہب کے سوز و درد کا نتیجہ تھیں، لیکن ان میں دنیا کے مقاصد وفوائد کا خیال بھی شریک تھا۔ 'خطبات احمدیہ' خالص اسلامی خدمت تھی۔ اس کے بعد سر سیّد نے 'تفسیر القرآن' لکھی، اور وہ بھی دینی خدمت اور اس سے زیادہ مہتم بالشان خدمت تھی۔

'خطبات احمدیہ' کی ضرورت واہمیت اور اس کی تالیف کے لیے سر سیّد کی کوشش و کاوش کا اندازہ مولانا حالی کے اس بیان سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام تین خطروں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ ان کا دانت مسلمانوں پر تھا، ان کی منادیوں میں، اخباروں اور رسالوں میں زیادہ تر بوچھار اسلام پر ہوتی تھی، اسلام کی بُرائیاں اور بانیٔ اسلام پر نکتہ چینیاں ان کی

تقریر وتحریر کا موضوع تھا۔ اور بعض جاہل و مفلس مسلمان ان کے دام میں آجاتے تھے۔ دوسرے مسلمان اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلش قوم نے مسلمانوں سے لی تھی، ہمیشہ حکمراں قوم کی نگاہ میں کھٹکتے تھے، اور انگریز مسلمانوں کے مذہب کو بغاوت وفساد کا سر چشمہ اور امن وعافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔ تیسرے مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم اور مغربی علوم وفنون کی طرف سے خطرہ تھا، جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتے جاتے تھے اور جن سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا، یہاں تک کہ خود سرسیّد کو یہ تعلیم پھیلانی پڑی۔ اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں اسلام کے عقائد واعمال اور اصول وقوانین کی طرف سے غلط فہمی پیدا ہو جائے۔

سرسیّد نے ان مقاصد کی طرف پہلے ہی بار اس وقت توجہ کی تھی جب مراد آباد میں 'تفسیر انجیل' کی بنیاد ڈالی۔ پھر جب سر ولیم میور (لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغرب) کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان میں پہنچی، جس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اس نے اسلام کی بیخ کنی میں تسمہ لگا نہیں رکھا، اس وقت سرسیّد کی بے چینی اور جوش وخروش کا عجب حال تھا۔ آخر کار جب انھوں نے دیکھا کہ غدر میں اسلامی کتب خانے برباد ہو گئے، اور جن کتابوں کی اس مضمون کے لیے ضرورت ہے وہ یہاں دستیاب نہیں ہو سکتیں تو ان کو ولایت جانے کا خیال ہوا۔ چنانچہ ایک ہی دو برس بعد جب سیّد محمود کا ولایت جانا قرار پایا تو وہ بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ان کے بعض دوست جو سرکاری عہدے دار اور سر ولیم میور کی گورنمنٹ کے ماتحت تھے، سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے سے مانع آئے تھے۔ مگر سرسیّد نے ان کا کہنا نہ مانا، اور ولایت پہنچتے ہی اس کی فکر میں مصروف ہو گئے۔ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں سے کتابیں اور اطلاعیں بہم پہنچائیں عربی کی کتابیں مصر وفرانس وجرمنی سے منگائیں، لیٹن اور انگریزی کی پرانی نایاب کتابیں بہت گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں، اور شب وروز کی لگاتار محنت سے بارہ مقالات لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے اور لندن ہی میں 'خطباتِ احمدیہ' کے نام سے ۱۸۷۰ء میں چھپوا کر شائع کیے۔

اس کتاب کے لکھتے وقت جس قدر جوش سر سیّد کے دل میں تھا، اور جو مالی مشکلات اس کے شائع کرنے میں پیش آئیں اور جو سخت محنت اس کے لکھنے میں ان کو کرنی پڑی اس کا کسی قدر اندازہ ان کے خطوں سے ہوتا ہے جو انھوں نے ولایت سے مولوی سیّد مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) کو لکھے تھے۔ مختلف خطوں کے اقتباسات یہ ہیں۔ لکھتے ہیں:- ''ولیم میور صاحب کی کتاب کو دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا، اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا، اور مصمم ارادہ کیا کہ آں حضرت صلعم کی سیَر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے .... لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں، جانا آنا، ملنا جلنا سب بند ہے۔ کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپیہ قرض لیجیے، سود اور روپیہ میں ادا کروں گا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے لیے دہلی لکھا ہے، اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسّی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو۔ کیا کہیے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے، خدا مدد کرے .... لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے، اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے۔''

غرض چار ہزار روپیہ کے قریب خرچ ہوا، اور کتاب چھپ گئی۔ اس کی ان کو بے انتہا خوشی اور فخر تھا۔ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں کہ:- ''اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر سمجھوں گا'' .... ''سر ولیم میور صاحب اور اور مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے، نہایت محققانہ جواب ہیں، اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو، وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو، اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام، ورنہ میرا نام نہیں۔'' ایک اور خط میں لکھتے ہیں:- ''میری کتاب 'خطبات احمدیہ' ایک مسلمان عالم متبحر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔ جو الفاظ کہ اس نے کہے، اور مجھے لکھے، اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اس کی لذت میں ہی جانتا ہوں۔''

اس کتاب کے متعلق انگریزوں کی رائے سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہے، اس لئے کہ انھیں کی تردید میں لکھی گئی ہے۔ ریورنڈ ہوپر پرنسپل ڈونٹی کالج لاہور لکھتے ہیں کہ ''مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ سیّد احمد خاں کو کافر، ملحد اور بدمذہب سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جو کام سیّد احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں

سیّد احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔'' مسٹر آرنلڈ مصنف 'پریچنگ آف اسلام' لکھتے ہیں کہ ''ایسی مثالیں تو پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی، اور اس کا ترجمہ کسی یورپ کی زبان میں ہو گیا لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر لکھ کر شائع کی ہو۔'' لندن کے ایک اخبار میں کسی انگریز نے لکھا تھا کہ ''عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انھیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں اس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں۔''

سر سیّد نے ولایت سے آ کر 'خطباتِ احمدیہ' کو تفصیل کے ساتھ مرتب کیا، اور اُردو میں شائع کیا۔ اُردو کتاب انگریزی کتاب سے بہت زیادہ طویل و مفصل ہے۔ اس کا نمونہ آگے درج کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں سر سیّد کی یہ خدمات بھی قابلِ ذکر ہیں کہ لندن پہنچ کر ان کو معلوم ہوا کہ وہاں کے ایک مصنف جان ڈیون پورٹ نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں ایک کتاب 'اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن' لکھی ہے۔ سر سیّد نے اس کے مضامین سنے اور بہت پسند کیے۔ مصنف کو اتنی استطاعت نہ تھی کہ اپنے روپیہ سے چھپواتا، اور لندن کا کوئی پبلشر اس کے چھاپنے کی ہامی نہ بھرتا تھا۔ سر سیّد نے فوراً روپیہ کا بندوبست کر کے وہیں اس کتاب کو چھپوا دیا اور اس کی کئی سو جلدیں ہندوستان کو بھیج دیں۔ یہاں اس کا ایک ترجمہ مولوی عنایت الرحمٰن دہلوی نے کیا، اور دوسرا مولوی ابوالحسن نے، دونوں ترجمے چھپ کر شائع ہو گئے۔

انگلستان کے ایک اور ذی وقعت مصنف گاڈ فری ہگنز کی کتاب جو اس نے کسی زمانے میں اسلام کی تائید میں لکھی تھی اور اب نایاب ہو گئی تھی، سر سیّد نے لندن میں ایک جرمن کتاب فروش کی دکان سے دس گنی قیمت پر خریدی اور ہندوستان میں آ کر ان لوگوں کے لیے جن کو مشنریوں سے مذہبی گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا ہے، پانسو روپیہ خرچ کر کے اس کا اُردو ترجمہ مولوی محمد احسن پروفیسر بریلی کالج سے کرا کے 'حمایت الاسلام' کے نام سے شائع کر دیا۔

(۲۵) 'رسالہ ابطال غلامی'۔ یہ مضمون اگر چہ بقدرِ ضرورت 'خطباتِ احمدیہ' میں لکھا جا چکا تھا مگر ولایت سے آنے کے بعد سرسیّد نے اس مضمون پر ایک مستقل رسالہ لکھ کر اول 'تہذیب الاخلاق' میں شائع کیا، اور پھر علیٰحدہ کتاب کی شکل میں چھپوایا۔ علمائے اسلام کو تو یہ بھی احساس نہ تھا کہ بردہ فروشی کا دستور جو عرب اور افریقہ میں جاری ہے، اس میں کیا برائی ہے اور وہ اصول اسلام کے موافق ہے یا نہیں۔ اور اس کی بھی پروا نہ تھی کی عیسائی قومیں اسلام پر بڑا طعن کرتی ہیں کہ اس نے لونڈی غلام بنانا جائز کیا ہے۔ اگر چہ اٹھارویں صدی تک یورپ و امریکہ میں بھی غلامی کی رسم جاری تھی اور وہاں غلاموں کی جو حالتِ زار تھی، اُس بے رحمی اور سنگ دلی کی اسلام میں کہیں نظیر نہیں پائی جاتی۔ لیکن انیسویں صدی سے وہاں غلامی کا بالکل انسداد ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ لوگ اسلام پر اعتراض کرنے میں دلیر تھے۔ سرسیّد پہلے شخص ہیں جنھوں نے نہایت مدلل طریقے سے ثابت کیا کہ اسلام نے اول اول غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور آزاد کرنے کی ترغیب دی اور پھر اس رسم کو بالکل ممنوع کر دیا۔ سرسیّد کے بعض دعووں اور دلیلوں میں علمائے اسلام سے اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۲۶) 'تفسیر القرآن'۔ سرسیّد نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے میں کمال جسارت سے کام لیا۔ ان کے پیش نظر وہی خطرے تھے جو 'خطباتِ احمدیہ' کے لکھنے کا باعث ہوئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نوجوان مسلمان مغربی فلسفہ و سائنس پڑھ کر اسلام کے ہر عقیدۂ قانون کو عقل سے جانچیں گے، اور عقل کے موافق نہ پانے کے سبب سے اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے، اس لیے سرسیّد نے یہ طے کیا کہ اسلام کے ہر عقیدے، ہر قانون، ہر حکم، ہر قصے کو عقل کے مطابق ثابت کیا جائے۔ اور جو اس کسوٹی پر کھرا نہ نکلے اس کو ٹکسال باہر کر دیا جائے۔ سرسیّد کا یہ خیال صرف ایک حد تک درست تھا، یعنی اسلام کی بہت سی باتیں عقلِ انسانی اور قدرت کے قوانینِ معلومہ و مسلمہ کے بالکل موافق ہیں۔ بلکہ جملہ مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس کی صداقت و فضیلت علم و عمل اور عقل و تجربے نے ہمیشہ تصدیق کی ہے۔ لیکن نفسِ مذہب ایسی چیز ہے جس میں بعض ان دیکھی اور بن سمجھی باتوں

کے ماننے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اور اسلام بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

سرسیّد کا تفسیر القرآن میں تمام معجزات اور خلاف عادت اور غیب کی باتوں سے انکار کرنا، ایمان بالغیب کی غلط تاویل کرنا، جنوں سے صحرائی اقوام مراد لینا وغیرہ وغیرہ اصلاحی نظر سے غیر ضروری تھا، اور اسلامی نگاہ میں غلط فہمی پر مبنی۔ چنانچہ مولانا حالیؔ کی بھی یہی رائے ہے۔ کہتے ہیں: ''آخر عمر میں سرسیّد کو خود رائی یا جو وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیاتِ قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیوں کر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے۔'' سرسیّد نے ایمان بالغیب کی ضرورت اور اہمیت پر نظر نہیں کی۔ انھوں نے یورپ کے ایک فلاسفر کولٹن کا یہ مقولہ سنا تھا کہ ''وہ شخص جو صرف ان چیزوں پر اعتقاد رکھتا ہے جن کو وہ پوری طرح سمجھ لیتا ہے، یا تو اس کا سر بہت لمبا ہے یا اس کا مذہب بہت چھوٹا ہے۔'' اس قسم کی باتوں کے علاوہ سرسیّد نے اپنی تفسیر میں قرآن کے اور مسائل کی تشریح و توجیہ میں البتہ کار نمایاں کیا ہے۔ مثلاً قصص قرآنی پر عیسائیوں کو اعتراض تھا کہ غلط بیان ہوئے ہیں یا بعض واقعات کی سرے سے کوئی اصل ہی نہیں۔ سرسیّد نے ہر ایسے قصے یا واقعے کا بائبل میں سراغ لگایا ہے اور قرآن و بائبل کی تطبیق کی ہے، یا عدم مطابقت کی وجہ بیان کی ہے، اور جس قصے کا پتہ موجودہ بائبل میں نہیں لگا، اس کا ثبوت اور ذریعوں سے دیا ہے۔ اسی طرح ارکان و فرائضِ اسلام نماز، روزہ، حج وغیرہ کے مصالح بیان کیے ہیں۔ جہادِ اسلام کی تشریح اس قدر واضح اور مدلل طریقے سے کی ہے کہ اس پر انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اسی طرح تعدّدِ ازدواج، طلاق، غلامی وغیرہ قوانین و احکام کی تفسیر قول فیصل کا حکم رکھتی ہے۔

اگر سرسیّد بجائے پوری تفسیر اور آیت آیت کی تشریح و توجیہ کے، صرف ایسے ہی مسائل پر الگ الگ مضامین لکھ دیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ بہر حال ان کی نیت بخیر تھی، ان کے خلوص و صداقت میں کوئی کلام نہیں، اس لیے ان کو خطائے اجتہادی پر بھی ثواب ملے گا۔ سرسیّد پر اس سے پہلے بھی کفر کے فتوے لگائے جا رہے تھے، ''یہ تفسیر مسمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا۔'' انھوں نے کافر گروں کو اپنے اس شعر سے جواب دیا ہے:-

خدادارم، دلِ بریاں زعشقِ مصطفےٰ دارم
ندارد ہیچ کافر سازوسامانے کہ من دارم

'تفسیر القرآن' کی پہلی جلد ۱۸۸۰ء (۱۲۹۷ھ) میں چھپ کر شائع ہوئی، اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً اور جلدیں شائع ہوتی رہیں۔ نصف قرآن سے کچھ ہی زیادہ کی تفسیر لکھنے پائے تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا اور چھ جلدیں چھپی ہوئی آخر سورۂ بنی اسرائیل تک اور ایک جلد بن چھپی سورۂ انبیاء تک اور چند چھوٹے چھوٹے رسالے مثل تفسیر السمٰوات، ازالۃ الغین عن قصہ ذی القرنین، ترقیم فی قصۂ اصحاب کہف والرقیم وغیرہ جن کو تفسیر کے اجزا سمجھنا چاہئے، سرسیّد سے یادگار رہ گئے۔

(۲۷) 'النظر فی بعض المسائل'۔ چند مسائل اسلامی وقرآنی پر بحث کی ہے۔

(۲۸) 'سفر نامہ پنجاب'۔ علی گڈھ کالج کی کوشش کے سلسلے میں سرسیّد نے ۱۸۸۴ء میں پنجاب کا سفر کیا۔ وہاں انھوں نے جو لکچر دیے اور تقریریں کیں وہ سب برجستہ و برمحل زبانی تقریریں تھیں، لیکن سیّد اقبال علی کی حیرت انگیز زود نویسی کے سبب قلم بند ہو گئے۔

(۲۹) 'جواب امہات المومنین'۔ یہ گویا سرسیّد کی آخری تصنیف ہے۔ کسی دیسی عیسائی نے حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے تعددِ ازدواج پر اعتراض کیا، اور 'امہات المومنین' کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔ سرسیّد نے باوجود ضعف ومرض کے اس کا جواب لکھا۔

(۳۰، ۳۱) 'انشاء اللہ'، 'نادان خدا پرست'۔ یہ دو مضمون قصے کے طور پر سرسیّد نے لکھے ہیں۔ 'تہذیب الاخلاق' میں شائع ہونے کے بعد ان کو الگ بھی چھاپ دیا گیا۔

(۳۲) 'مضامین تہذیب الاخلاق'۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ سرسیّد کا رسالہ 'تہذیب الاخلاق' تین دفعہ کر کے گیارہ بارہ برس جاری رہا، اس میں اور لوگوں نے بھی مضامین لکھے لیکن سب سے زیادہ سرسیّد کے مضامین ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے سب مضامین علیحدہ چھاپ دیے گئے ہیں۔ اور یہ بھی سرسیّد کی ایک تصنیف ہے۔ یہ رسالہ اُردو کا پہلا

رسالہ نہ تھا، اس سے پہلے درجنوں نکل چکے تھے اور نکل رہے تھے۔ لیکن مضمونوں اور مضمون نگاروں دونوں کے لحاظ سے ہندوستان کا بہترین پرچہ تھا۔ سرسیّد کے مجموعۂ مضامین میں زبان، طرزِ بیان، مضمون کی ایسی رنگارنگی، اتنی جدّت، اس قدر دلکشی ہے کہ بغیر مطالعہ کے اندازہ دشوار ہے۔ اس میں مذہبی، قومی، اخلاقی، اصلاحی، ہر قسم کے مضامین ہیں۔ اور ان کے اسلوبِ نگارش میں فکر و تخیل، منطق و فلسفہ، جوش و خروش، متانت و جزالت، شوخی و ظرافت ہر رنگ کا حسب موقع جلوہ ہے۔ بعض نمونے پیش کیے جائیں گے۔

(۳۳) 'خطوطِ سرسیّد'۔ سرسیّد کے پوتے مرحوم سر راس مسعود (نواب مسعود جنگ) متوفّی ۱۹۳۷ء میں چند سال ہوئے ان کے خطوط کا مجموعہ شائع کر دیا ہے۔ غالب کے بعد سرسیّد پہلے شخص ہیں جن کے خطوط زبان و ادب اور علم و عمل کے نقطۂ نظر سے دلکشی اور افادہ کا گنجینہ ہیں۔ ان میں پرائیویٹ خط بھی ہیں اور قومی و ملکی و مذہبی معاملات کے متعلق بھی۔ صرف ان خطوں سے سرسیّد کی سیرت و اخلاق کا صحیح و اصلی نقشہ مرتب ہو سکتا ہے۔

(۳۴) 'مجموعہ لکچرز و اسپیچز': سرسیّد کی تمام تقریریں یک جا شائع کر دی گئی ہیں۔

سرسیّد کا طرزِ تحریر اور اس کے نمونے: (۱) دورِ قدیم۔ سرسیّد کے بڑے بھائی سیّد محمد خاں نے غالباً ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء میں دہلی سے 'سیّد الاخبار' جاری کیا۔ سرسیّد نے سب سے پہلے اس میں مضامین لکھنا شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۸۵۷ء تک متعدد کتابیں لکھیں۔ ان سب کا اسلوبِ تحریر قدیم ہے۔ یعنی الفاظ کی بے محل تقدیم و تاخیر، یا قواعد سے بے پروائی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں "وہ تحریر یا تقریر کی رَو میں گریمر کی کچھ پروا نہ کرتے تھے، وہ ان قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں، بالکل آزاد تھے۔" اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ یہ بے پروائی و آزادی فی نفسہٖ پسندیدہ، ضروری اور قابلِ تقلید ہے، بلکہ سرسیّد کے زمانے میں قواعدِ زبان کی پابندی سخت نہ تھی، الفاظ کی بے ترتیبی عام تھی، اُردو فقروں پر اکثر دھوکا ہوتا تھا کہ فارسی کا ترجمہ ہیں۔ مضاف الیہ کو اکثر مضاف کے بعد لکھتے اور بولتے تھے۔ متعلقاتِ فعل کو فعل کے بعد رکھ دیتے تھے۔ بعض فارسی اسلوب اور فارسی محاورات کے ترجمے اس زمانے میں

مستعمل تھے، جواب نہیں ہیں۔ یہ سب باتیں سر سیّد کی تحریر میں بھی ہیں۔ لیکن یہ بات نہیں کہ ان کو اس کا احساس نہ تھا، اصل میں عادت یوں ہی تھی۔ ان کے ہم عمروں میں کوئی ایسا نہ تھا جس کو یہی عادت نہ ہو۔ غالبؔ کے رقعے خالص ادبی ٹکڑے ہیں، لیکن وہاں بھی غالبؔ کی اس عادت کی یادگاریں موجود ہیں۔ یہ عادت رفتہ رفتہ چھوٹی ہے۔ سر سیّد کے 'رسالہ اسباب بغاوت' میں جا بجا ایسے فقرے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں بہت کم ہیں۔ ''اسباب بغاوت'' کا ایک فقرہ ہے۔ ''جس کی (یعنی انگریزی گورنمنٹ کی) ابتدا ۱۷۵۷ء وقت شکست کھانے سراج الدولہ کے پلاسی پر سے شمار ہوتی ہے۔'' یہ تعقید بعد کو تقریباً جاتی رہی۔ ''وہ'' کی جگہ ''وے'' انھوں نے بعد کو بہت کم کر دیا تھا۔ ''کر کے'' کی جگہ ''کر کر'' آخر تک لکھتے بولتے رہے۔ ان لفظوں میں بھی یہ بات نہ تھی کہ التزام کے ساتھ بولتے تھے۔ بلکہ جیسا چاہا کہہ دیا۔ اسی طرح ''چونکہ'' کی جگہ ''جو کہ'' لکھتے تھے۔

'اسباب بغاوتِ ہند' کی تحریر کا نمونہ یہ ہے:-

''لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک نہونے سے صرف اتنا ہی نقصان نہیں ہوا کہ گورمنٹ کو اصلی مضرت قوانین وضوابط کی جو جاری ہوئے، بخوبی معلوم نہیں ہوسکی، اور اغراض عام رعایا جس کا لحاظ رکھنا گورمنٹ کو واجبات سے تھا، ملحوظ نہیں رہیں، اور رعایا کو اس مضرت کے رفع کرنے اور اپنے مطلب کے پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہیں ملی، بلکہ بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ رعایا کو منشا اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورمنٹ کا معلوم نہوا۔ گورمنٹ کی ہر تجویز پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی۔ جو تجویز گورمنٹ کی ہوتی تھی، ہندوستانیوں کو بسبب اس کے کہ وہ لوگ اس میں شریک نہ تھے اور ہم اس تجویز سے واقف نہ تھے، اس کی بنیاد معلوم نہوئی۔ اور ہمیشہ یہی سمجھے کہ یہ بات ہمارے اور ہمارے وطنوں کو خراب اور برباد اور ذلیل اور بے دھرم کرنے کو ہے۔ اور وہ بعضی باتیں جو در حقیقت گورمنٹ سے برخلاف رواج اور مخالف طبیعت اور طینت ہندوستانیوں کے صادر ہوئی تھیں قطع نظر اس سے کہ وہ فی نفسہ اچھی نہیں یا بری، زیادہ تر ان کے غلط خیالات کو تقویت دیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہونچ گئی کہ رعایائے ہندوستان ہماری گورمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی، اور پھر اس کو اپنے دل میں سچ سمجھتی تھی، اور یہ جانتی تھی کہ اگر ہم آج گورمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں، اور کل ہیں تو

پرسوں نہیں۔ اور کوئی شخص ان کے حالات کا پوچھنے والا اور کوئی تدبیر ان کے اس خیال کو دور کرنے والی نہ تھی۔ جب کہ رعایا کا گورمنٹ کے ساتھ یہ حال ہو جو دلی دشمن کے ساتھ ہونا چاہیے، تو پھر کیا توقع ہو سکتی ہے وفاداری کی ایسی گورمنٹ کو ایسی رعایا سے، اور جب کہ ہماری گورمنٹ درحقیقت ایسی نہ تھی تو ان غلط خیالات کا ہندوستانیوں کے دل میں جمنا اور جو رنج کہ ان کے دل پر تھا اس کا علاج نہ ہونا، صرف اسی سبب سے تھا کہ لجس لیٹف کونسل میں ہندوستانی شریک نہ تھے۔ اگر ہوتے تو یہ سب باتیں رفع ہوتی جاتیں۔ اب اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف یہی ایک بات ہے جس نے اپنی بہت سی شاخیں پیدا کر کر تمام ہندوستان میں بیجا فساد کر دیا۔"

اس اقتباس میں سر سیّد کے طرزِ تحریر کے علاوہ ان کا نرم و گرم بیان، صاف گوئی، جرأت اور صحت رائے بھی قابلِ دید ہے۔ اس مضمون کے لکھنے کا وہ زمانہ (۱۸۵۸ء) ہے جب نتائج و مواخذات غدر سے امن بھی نہ ہوا تھا۔ اور یہ وہ تحریر ہے جو سیدھی ولایت بھیجنے کے لیے چھپوائی گئی تھی، چنانچہ سب سے پہلے لندن کی گورنمنٹ نے دیکھی، ترجمہ کرائی اور اس پر رائے زنی کی۔ ۱۸۵۸ء کے بعد سر سیّد نے اپنی زندگی میں اس کو دوبارہ نہیں چھپوایا، پھر ۴۵ برس کے بعد علی گڈھ کالج کے ڈیوٹی بک ڈپو نے ۱۹۰۳ء میں مطبع مفید عام آگرہ میں چھپوایا۔ وہی اشاعت ہمارے پیشِ نظر ہے۔

'آثار الصنادید' کا اقتباس یہ ہے:-

نشیمن ظل الٰہی یا سنگین تخت

اس مکان کے بیچوں بیچ میں مشرقی دیوار سے ملا ہوا سنگِ مرمر کا تخت ہے چار گز کا مُربع۔ اور اس پر چار ستون لگا کر بنگلے کے طور پر اس کی چھت بنائی ہے، اور آدمی کے قد سے زائد کرسی دی ہے، اس کے پیچھے ایک طاق ہے سنگِ مرمر کا بنا ہوا، سات گز لمبا اور ڈھائی گز کا چوڑا، اس پر ہر ہر قسم کے چرند و پرند کی تصویریں عجب عجب رنگین پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ اور اس میں ایک آدمی کی تصویر ہے جو دوتارہ بجایا کر گا رہا ہے۔ ملک اٹلی میں جو فرنگستان میں واقع ہے، آرفیوس کلاونت کی کہانی یوں مشہور ہے کہ وہ علمِ موسیقی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا، اور ایسا خوش آواز تھا کہ جب گانے بیٹھتا تو چرند و پرند اس کی آواز سن کر مست ہو جاتے، اور اس کے گرد آبیٹھتے تھے۔ اسی ملک میں رفیل ایک مصور تھا کہ تصویر کھینچنے میں اپنا نظیر نہیں

رکھتا تھا۔ اس مصور نے آرفیوس کے گانے کی جو کہانی مشہور تھی اس کے مطابق اپنے خیال سے ایک مُرقع کھینچا تھا، اور چرند و پرند اس کے گرد گانا سننے کو بیٹھے ہوئے بنائے تھے۔ یہ مصور ۱۵۲۰ء میں مرا۔ مگر یہ مرقع اس کا بنایا ہوا ملک اٹلی اور ولایت فرنگستان میں بہت مروج اور نہایت مشہور ہے، اور اب تک اس کی نقلیں موجود ہیں۔ وہی مرقع اس طاق میں پتھر کی پچی کاری میں کھودا ہے۔ پس یہ تصویر اسی آرفیوس کی ہے، اور جو کہ اس مرقع کا سوائے فرنگستان کے اور کہیں رواج نہ تھا، اس سبب سے یقین پڑتا ہے کہ اس قلعہ کے بنانے میں کوئی نہ کوئی انگریز اٹلی کے ملک کا شریک تھا۔ اس محراب کی بغل میں دروازہ ہے، اور اندر سے بھی آنے کا رستہ ہے۔ بادشاہ اس تخت پر دربار عام کے دن اجلاس کرتے تھے۔ اس تخت کے آگے ایک تخت سنگِ مرمر کا بچھا ہوا ہے۔ امراء میں سے جس کسی کو عرض کرنا ہوتا تھا، اس تخت پر چڑھ کر بادشاہ سے عرض کرتا تھا۔ یہ تخت اتنا اونچا ہے کہ اس تخت کے چڑھنے پر بھی آدمی کا گلا تخت تک پہونچتا ہے۔''

یہ تحریر 'اسبابِ بغاوت' سے چار سال پہلے (۱۸۵۴ء) کی ہے۔ اور اسی اسلوب کی ہے۔

(۲) دورِ جدید: غدر کے بعد جب سر سیّد نے اپنا مقصدِ حیات، مسلکِ زندگی اور لائحہ عمل متعین کرلیا، اور تحریر و تقریر کے ذریعے سے قومی و ملکی، مذہبی و معاشرتی، اصلاحی و اخلاقی، علمی و تعلیمی خدمات شروع کیں، اس وقت سے ان کے فکر و قلم اور زبان و بیان کا اصلی جوہر اور حقیقی کمال نمایاں ہوا۔ ان سے پہلے کسی ایک شخص کے زبان و قلم سے اس قدر گوناگوں مضامین ادا نہ ہوئے تھے۔ سر سیّد کی مختلف موضوعات کی کتابیں، اخبار و رسالہ کے مضامین، پبلک تقریریں اور پرائیویٹ خطوط شاہد ہیں کہ ہر نوع کی بہتر سے بہتر تحریر کی بنیاد ڈالنے والے سب سے پہلے سر سیّد ہیں۔

سر سیّد کی تحریر میں زبان و محاورہ کی لطافت، بیان کی سادگی و صفائی، استعارہ و تشبیہ اور دیگر صنائع کا اعتدال و بے ساختگی، بیان کا جوش، طرزِ ادا کی روانی، استدلال کا زور، محاکات و منظر کشی، حسب موقع متانت و ظرافت، اس قدر کثرت صحت اور موزونیت کے ساتھ ہے کہ ان سے پہلے کہیں نہ تھی، ان کے ساتھیوں میں ان سے بہتر نہ تھی، اور ان کے ہم زمانہ لوگوں میں اکثر انہی کی اتباع کی بدولت تھی۔ سر سیّد پیچیدہ سیاسی مسائل، باریک

مذہبی نکات اور دشوار اصلاحی مباحث کو نہایت صفائی، سادگی، بے تکلفی اور زور و قوت کے ساتھ بیان کر سکتے تھے۔ ان کی برجستہ تقریروں اور قلم برداشتہ تحریروں میں بھی وہی انداز پیدا ہے، جو غور و فکر سے لکھی ہوئی کتابوں اور مضامین میں ہے۔ حسب موقع اسلوب بیان اختیار کرنا، شوخی و سنجیدگی سے برمحل کام لینا، جذب و اثر پیدا کرنا ان کے لیے بالکل فطری اور طبعی بات تھی۔ کسی خاص کوشش و ارادہ کو دخل نہ تھا۔ گویا ان کو خبر بھی نہ ہوتی تھی اور صحیح انداز خود بخود پیدا ہو جاتا تھا۔ جن الفاظ و محاورات کو بولنے کی ان کو عادت تھی بے تکلف ان کو استعمال کر دیتے تھے، یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ اہل زبان یا اہل دہلی کیا اور کس طرح بولتے ہیں، دقیق علمی، فلسفیانہ، سائنٹفک، تنقیدی مضامین اس قدر سلجھا کر بیان کرتے تھے کہ اس فن میں گویا ان کو اولیت حاصل تھی۔ بعض مضامین میں علمائے یورپ کی فکر و رائے پر تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ فضلائے عرب و عجم کی تحقیق پر نقد و نظر کی ہے، اپنے زمانے کے اہل قلم اور اپنے مخالفوں کے مباحث کی تنقیح کی ہے۔ خود سر سیّد کی تصانیف میں تاریخ و سیرت، مذہب و اخلاق، سیاست و حکمت وغیرہ موضوعات شامل ہیں۔ ہر جگہ سر سیّد کا جوشِ بیان اور زورِ قلم نمایاں ہیں۔ اور انھوں نے اُردو زبان میں ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کی قابلیت ثابت کر دی ہے۔ جہاں ان کو اِصابتِ رائے حاصل نہیں ہے وہاں بھی ان کا خلوص اور دلسوزی ناقابلِ انکار ہے۔

مزاح و ظرافت سر سیّد کا فطری رنگ تھا۔ لیکن یہ موقع و محل پر صرف ہوتا تھا، خصوصاً پرائیویٹ خطوط میں یا مخالفوں کے مباحثے میں اس رنگ کی شوخی نہایت دلچسپ اور کارگر ہے۔ جذب و اثر پیدا کرنے کے موقع پر کوئی روحانی قوت ان کے اندر کام کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اب ان کے مختلف اسالیب بیان کے نمونے ان کی تصانیف، لکچروں اور خطوں سے پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) "تبیین الکلام" (تفسیر توراۃ و انجیل)۔ مطبوعہ ۱۸۶۲ء کے مقدمۂ تاسعہ (۹) میں لکھتے ہیں:-

"اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ایک لفظ یا فقرہ کئی معنی رکھتا ہے، اور اس کے مقابلے میں دوسری زبان کا ایسا

لفظ نہیں ہوتا جس سے وہ سب معنی حاصل ہوں، اس لیے مترجم بجبوری یا تو اس کا ترجمہ کسی ایک پہلو پر کرتا ہے، یا صرف بموجب اپنی رائے اور اپنے اعتقاد اور اپنے مسلّمات کے اس کا ترجمہ کر دیتا ہے جو درحقیقت کلام الٰہی کی وسعت کو ناواجب تنگی میں ڈالتا ہے، کیوں کہ ہر شخص یہ حق رکھتا ہے کہ جب تک بذریعہ الہام کے کوئی خاص معنی کسی کلام الٰہی کے مقرر نہوئے ہوں، اس وقت کلام الٰہی سے جس قدر مطالب ہوں ان سب کو سمجھے اور سب پر غور کرے، اور جو مطلب حق اور صحیح ثابت ہو اس کو اختیار کرے۔ پس جب کہ مترجم نے اس کلام الٰہی کو جس میں متعدد پہلو تھے ایک پہلو پر جو اس کے اعتقاد کے مطابق تھا، ترجمہ کر دیا تو اس نے ایک عام حق تلفی کی۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ اس کا اعتقاد جس کے بموجب اس نے ترجمہ کیا، درحقیقت غلط ہو۔ ان وجوہات سے ہم مسلمانوں کے ہاں ضرور تر ہے کہ جس زبان میں مذہب کی اصلی کتابیں ہوں اس زبان سے واقف ہونا چاہئے، اور جب تک اصل زبان سے واقفیت نہ ہو، صرف ترجمہ پر اعتقادیات میں اعتماد نہیں ہوسکتا۔ دیکھو کیسی غلطی کی کتنے بڑے مترجم ایکویلا اور تھوڈوش اور سیمیکس نے کہ کتاب اشعیاہ باب ۷ درس ۱۴ میں جو 'علمہ' کا لفظ عبری زبان کا تھا، اس کا ترجمہ بجائے 'کنواری' کے 'جوان عورت' کر دیا۔ اس لئے ہمارے مذہب میں یہ حکم ہے کہ جب تک بخوبی صورت نہو جاوے، اس وقت تک ترجموں کی نہ تصدیق کرنی چاہئے نہ تکذیب کرنی چاہئے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ جو کچھ خدا نے اتارا ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔''

(۲) 'خطباتِ احمدیہ' میں ''تعدّدِ ازدواج'' پر بھی نہایت طویل و مدلّل بحث کی ہے۔ اس کے ایک حصے کا مختصر نمونہ یہ ہے:-

''اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدّدِ ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے، اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے، تعدّد کو صرف ایک نہایت محدود خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا، جو اس کی مرضی کے موافق ہو جس نے مرد و عورت کو جوڑا پیدا کیا، ضرور ایسا ہوگا، جو قانونِ قدرت کے تو برخلاف نہو، اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے، اور وہ یہی ہوسکتا ہے کہ عموماً کثرتِ ازدواج کی ممانعت، اور صورت ہائے خاص اور حالاتِ مستثنیٰ میں اجازت ہو، اور یہی مسئلہ ٹھیٹ اسلام کا ہے۔ قرآن مجید نے اس نازک معاملے اور دقیق و پُر پیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے:- جہاں فرمایا ہے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا

فَوَاحِدَۃً (یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروؤں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیے) .... اس آیت کے اگر وہی ظاہری معنی لئے جائیں جیسے کہ اکثر فقہا اور علما نے لئے ہیں تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعدّدِ ازواج کو گویا بالکل روک دیا ہے، کیوں کہ جو سچا دیندار ہوگا وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعدّد ازواج کی، جو ایسی سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کو بہ تعمق نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعدّد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعاً ناجائز ٹھہرایا گیا ہے۔ کیوں کہ یہ نہیں کہا گیا کہ اَنْ لَّمْ تَعْدِلُوْا (۱) بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنْ (۲) خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا پس اگر یہ ممکن بھی ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کر سکے تو بھی عدل نہ ہو سکنے کا اندیشہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا۔‘‘

(۳) ’تفسیر القرآن‘ میں ’’سورۂ توبہ‘‘ کی تفسیر میں مسئلۂ جہاد پر بحث کرتے ہوئے آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے غزوات (لڑائیوں) کی نسبت لکھتے ہیں:-

’’تمام انبیاء جب کہ قوم کی اصلاح اور ان کی درستی کو کھڑے ہوتے ہیں تو ابتدا میں عموماً ان کے دشمن چاروں طرف ہوتے ہیں۔ اگر وہ مخالفوں سے محفوظ رہنے کی کوشش نہ کرتے تو دنیا میں نہ آج یہودی مذہب کا وجود ہوتا، اور نہ کسی اور مذہب کا، اور نہ عیسائی مذہب کا نام باقی رہتا اگر بعد حضرت مسیح کے اس کے لئے ایسا زمانہ نہ آتا جس میں اس کے پیروؤں کی مخالفین سے حفاظت کی گئی اور بزور حکومت اس کو ترقی دی گئی .... پس یہ کہنا کہ انبیا کو ایسی لڑائیاں نازیبا ہیں، ایک ایسا قول ہے جس کو قانونِ قدرت مردود ٹھہراتا ہے۔ لوگ حضرت موسیٰ کے کاموں کو تو بھول جاتے ہیں اور غریبی اور مسکینی اور مظلومی کی مثال میں حضرت مسیح کو پیش کرتے ہیں۔ مگر حضرت مسیح نے جب اپنے تئیں خلقت کے سامنے پیش کیا اس وقت سے ان کی وفات تک نہایت قلیل زمانہ قریب تین برس کے گزرا تھا، اور صرف ستر آدمیوں کے قریب (اس عرصہ میں) ان پر ایمان لائے تھے۔ ان کو مطلق ایسی قوت جس سے وہ اپنے دشمنوں کو

---

(۱) یعنی اگر عدل نہ کر سکو۔

(۲) یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے۔

دفع کر سکیں حاصل نہیں ہوئی تھی اور اسی سبب سے کالوی کے پہاڑ پر وہ افسوسناک واقعہ (یعنی مصلوب ہونا) واقع ہوا۔ اس کے بعد اگر اس کے (یعنی دینِ مسیح کے) ایسے حامی نہ پیدا ہو جاتے جو دشمنوں کو دفع کر سکے تو آج دنیا میں ایک بھی گرجا اور ایک بھی خانقاہ دکھائی نہ دیتی۔"

(۴) 'تہذیب الاخلاق' کے ذریعے سے سر سیّد نے جو خدمت قوم و مذہب کے ساتھ اُردو زبان و ادب کی انجام دی اس کے نتائج و فوائد نہایت وسیع و جلیل اور زود اثر و دور رس ثابت ہوئے۔ سر سیّد کے مخالف کثرت سے تھے جو ان کی ہر اصلاح و تحریک اور ہر تجویز و رائے کی مخالفت کرتے تھے، خواہ وہ قومی ہو یا مذہبی یا تعلیمی۔ سر سیّد حسب ضرورت ان کا جواب لکھتے تھے۔ اس طرح سر سیّد کی جولانی قلم کے لیے میدان بڑھ گیا، اور دوسرے مخالف مصنفوں اور رسالوں نے بغیر ارادہ وہی سادہ و صحیح اسلوب بیان اختیار کر لیا جو سر سیّد نے شروع کیا تھا۔ مضامینِ سر سیّد کے چند نمونے درج کیے جاتے ہیں۔

(الف) تہذیب الاخلاق پہلی مرتبہ ۱۸۷۰ء (۱۲۸۷ھ) میں جاری ہوا تھا۔ اس کے سب سے پہلے پرچے میں سر سیّد نے اس کے جاری کرنے کا مقصد بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:-

"اس پرچے کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اول درجے کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے، تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہووے، اور وہ بھی دنیا میں مہذب قومیں کہلاویں۔ سویلزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے، مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں، اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہونچانا، اور ان کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے برتنا، جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے، اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔"

(ب) اس سے تین سال بعد نئے سال ہجری کے پہلے پرچے میں جو "افتتاحیہ" سر سیّد نے لکھا ہے، اس سے ان کی ہلکی سی شوخیِ تحریر، ظرافت و طنز، اور مخالفین کو جواب

دینے کا انداز معلوم ہوگا۔ فرماتے ہیں:-

''الحمد للہ کہ سنہ ۹۰ نوے پورا ہوا اور ۹۱ اکنانوے شروع ہوگیا۔ ہمارے اس پرچے کو جاری ہوئے سوا تین برس ہوگئے۔ پچھلا سال بھی خندۂ گل و نالۂ بلبل سے خالی نہیں گیا۔ ہمارے آہ و نالہ نے بدستور غلغلہ رکھا، اور ہمارے ناصحانِ شفیق کا بھی شور و شغب کم نہوا

حسن شہرت، عشق رسوائی تقاضا می کند — جرم معشوق و گناہ عاشق بیچارہ نیست

ناصحانِ شفیق نے ہم کو کبھی کچھ کہا اور کبھی کچھ، آخر کار ہم کو کافر و ملحد ٹھہرا ہی دیا، دور و نزدیک کے مولوی صاحبوں سے کفر کے فتووں پر مہریں چھپوا ہی منگوائیں، اور ہمارے اوپر ہمارے ناصح شفیق جناب مولوی حاجی سید امداد العلی صاحب نے ایک رسالہ چھاپ ہی دیا، اور ''امداد الآفاق'' اس کا نام رکھا۔ بھلا اور کچھ ہوا یا نہ ہوا، بیچارے غریب چھاپے والے کو تو فائدہ ہوگیا۔ اسی سال میں ہماری تحریرات کی تردید میں مولانا علی بخش خاں صاحب بہادر نے (جو امید ہے کہ اب تک حاجی بھی ہوگئے ہوں گے اور انشاء اللہ تعالیٰ آیندہ سے ان کو بھی حاجی لکھا کریں گے) دو رسالے تحریر فرمائے، جن میں سے ایک کا نام ''شہاب ثاقب'' اور دوسرے کا نام ''تائید الاسلام''۔ اخباروں میں ''نور الانوار'' اپنا نور عالم میں برساتا ہی تھا، مگر اس سے ایک اور پرچہ ان کے گھر کا اُجالا مسمّی بہ ''نور الآفاق لامع ظلمۃ النفاق'' پیدا ہوا ہے، جو نہایت ہی دلچسپ ہے، اور ہمارے اس پرچے ''تہذیب الاخلاق'' کے جواب میں نکلا ہے۔ اس کے مضامین ظاہرا تو جناب حاجی مولوی سید امداد العلی صاحب بہادر کے طبع زاد معلوم ہوتے ہیں، مگر بعض لوگ ان مضامین کو لے پالک بتاتے ہیں۔ بہر حال ہم کو اس سے کیا کہ وہ میاں نذیر کے ہیں یا میاں بشیر کے، کسی کے ہوں مگر دلچسپ ہیں۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔''

(ج) اسی سلسلے میں ایک اور اقتباس بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مولوی علی بخش خاں (سب آرڈینیٹ جج گورکھپور) سر سیّد کے شاید سب سے بڑے مخالف تھے۔ سب سے زیادہ تردیدی کتابیں اور مضامین انہی نے لکھے ہیں، یہاں تک کہ مکۂ مکرمہ اور مدینۂ طیبہ کے علما سے سر سیّد کے کفر کے فتوے لکھوا کر لائے۔ ان کی مذکورۂ بالا کتاب ''تائید الاسلام'' کے جواب میں سر سیّد نے ایک مضمون ''دافع البہتان'' لکھا۔ اس مضمون کو ذیل کے فقرے پر ختم کیا ہے۔ شوخی و ظرافت قابلِ دید ہے:-

''جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سیّد الحاج (یعنی مولوی علی بخش خاں) نے کیوں ایسے سخت اور محض غلط بہتان مجھ پر کئے ہیں؟ ظاہراً اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سیّد الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریب اسی زمانے کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے۔ انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ لاؤ حج کو تو جاتے ہی ہیں، جتنے گناہ کرنے ہیں سب کرلیں۔ حج کے بعد تو سب پاک ہی ہوجاویں گے۔ جیسے کہ بعض آدمی جب مسہل لینا چاہتے ہیں تو خوب بدپرہیزی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسہل سے سب کھایا پیا نکل جاوے گا۔ مگر جناب سیّد الحاج کو معلوم کرنا چاہئے کہ گو حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہوگئے ہوں گے، اور شبلیؔ و جنیدؔ کے مرتبے پر آپ پہونچ گئے ہوں گے، مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں، نہ کسی بشارت سے۔ آپ نے جو اتہام مجھ پر کئے ہیں، جب تک میں ہی معاف نہ کروں، معاف نہیں ہوسکتے۔ پس مقتضائے ایمانداری یہ ہے کہ آپ 'حج در احمد' کا احرام باندھئے اور گناہوں کی معافی چاہئے، ورنہ روزِ جزا اپنے کرتوتوں کا مزا آپ کو معلوم ہوجائے گا۔''

(د) سرسیّد نے ''آزادیِ رائے'' پر ایک اخلاقی و اصلاحی مضمون عالمانہ تحقیق کے رنگ میں لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے ایک انگریز محقق کے مقالے سے استفادہ کیا ہے۔ جیسا کہ آغازِ مضمون میں ذکر کرتے ہیں کہ ''ہم اپنے اس آرٹیکل کو ایک بڑے لائق اور قابل زمانۂ حال کے فیلسوف کی تحریر سے اخذ کرتے ہیں۔'' اس کا ایک فقرا (پیراگراف) یہ ہے:-

''اگرچہ رسم و رواج بھی اس کے برخلاف رایوں کے اظہار کے لئے ایک بہت قوی مزاحم کار گنا جاتا ہے، لیکن مذہبی خیالات، مخالف مذہب رائے کے اظہار اور مشتہر ہونے کے لئے نہایت اقوی مزاحم کار ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ اس مخالف رائے کا اظہار ہونا ان کو ناپسند ہے بلکہ اسی کے ساتھ جوشِ مذہبی امنڈ آتا ہے، اور عقل کو سلیم نہیں رکھتا، اور اس حالت میں ان سے ایسے افعال و اقوال سرزد ہوتے ہیں جو انھیں کے مذہب کو جس کے وہ طرفدار ہیں مضرت پہونچاتے ہیں۔ وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ بسبب پوشیدہ رہنے ان اعتراضوں کے، انھیں کے مذہب کے لوگ ان کے حل پر متوجہ نہوں، اور مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیق کئے اور بلا دفع کئے باقی رہ جاویں۔ وہ خود اس بات کا باعث ہوتے ہیں کہ ان کی آئندہ نسلیں بسبب ناتحقیق باقی رہ جانے ان اعتراضوں

کے، جس وقت ان اعتراضوں سے واقف ہوں، اسی وقت مذہب سے منحرف ہو جاویں۔ وہ خود اس بات کا باعث ہوتے ہیں کہ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ اس مذہب کو جس کے وہ پیرو ہیں، مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت ہی اندیشہ ہے۔ اگر انہی کے مذہب کا کوئی شخص بغرض حصول اغراض مذکورہ ان کو پھیلانا چاہے تو اس کو خود معترض کی جگہ تصور کرتے ہیں، اور اپنی نادانی سے دوست کو دشمن قرار دیتے ہیں۔''

یہ مضمون بھی سر سیّد کے طویل محققانہ مقالات میں سے ہے۔ اس طرح کے اخلاقی مقالے مختلف عنوانات، سویلزیشن، سیلف ریسپکٹ، رسم و رواج، خوشامد، ریا وغیرہ پر بڑی کثرت سے لکھے ہیں۔ یہ فن مقالہ نگاری سر سیّد کے زمانے سے پہلے اُردو میں داخل نہ ہوا تھا۔ اخبارات و رسائل کے جاری ہونے سے اس کا آغاز ہوا۔ سر سیّد کے اخبار ''سوسائٹی گزٹ'' اور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' سے پہلے اور بہت سے اخبار اور رسالے جاری تھے اور ان میں مذہبی، اخلاقی، علمی مقالات شائع ہوتے تھے۔ لیکن سر سیّد نے نئے نئے مفید و دلچسپ عنوانوں پر مضامین لکھے، بڑی کثرت سے لکھے، اور نہایت صحیح اسلوبِ بیان اختیار کیا۔ اس لیے اولیت اور افضلیت کا سہرا سر سیّد ہی کے سر ہے۔

(ہ) مقالات کی ایک قسم تمثیلی یا رمزیہ ہے۔ جس کو انگریزی میں 'ایلیگوری' کہتے ہیں۔ اس طرزِ نگارش میں مستقل کتابیں ''سب رس''، ''اخوان الصفا''، ''بستانِ حکمت'' وغیرہ پہلے بھی اُردو میں لکھی گئی ہیں، جن کا ذکر آ چکا ہے۔ لیکن مختلف و متفرق موضوعات پر مختصر مقالات تمثیلی لکھنے کا رواج سر سیّد کے زمانے سے، بلکہ انہی کے قلم سے شروع ہوا۔ اگرچہ ان کے ساتھ ہی ساتھ اور لوگ بھی شریک کار ہو گئے۔ آزاد کے مضامین ''نیرنگِ خیال''، محسن الملک کی ''موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ'' حالؔی کی ''زبانِ گویا'' اور ان سب سے بڑھ کر شرر لکھنوی کے مضامین ''دلگداز'' اُردو کی قابلِ قدر یادگاریں ہیں۔

سر سیّد کی تمثیل نگاری کا ایک نادر نمونہ ان کا مضمون ''امید کی خوشی'' ہے۔ اس کے مختلف مقامات کے اقتباسات سر سیّد ہی کے الفاظ میں مسلسل کر کے لکھے جاتے ہیں:-

''او نورانی چہرے والے 'یقین' کی اکلوتی خوب صورت بیٹی 'امید'! یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو

ہی ہماری مصیبتوں کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی خوشی کے لئے، نام آوری نام آوری کے لئے، بہادری بہادری کے لئے، فیاضی فیاضی کے لئے، محبت محبت کے لئے، نیکی نیکی کے لئے تیار ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں۔

وہ پہلا گنہگار انسان، جب کہ شیطان کے چنگل میں پھنسا، اور تمام بدیوں نے اسے گھیرا، تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی، تو نے اس نا امید کو نا امید ہونے نہیں دیا، تو نے ہی اس موت میں پھنسے دل کو مرنے نہیں دیا۔ تو نے ہی اس کو ذلت سے نکالا، اور پھر اس کو اعلیٰ درجے پر پہونچایا، جہاں کہ فرشتوں نے اسے سجدہ کیا تھا۔

وہ پہلا ناخدا، جب کہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا، اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا، تو تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی، اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے، کوچ پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ ہزاروں خطرے درپیش ہیں، مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے۔ لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں، اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا عالم ہوتا ہے، دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے، اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہونچتی ہے، اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے، اور جب کہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں، اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے، اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے، تو اسے بہادروں کی قوت بازو، اور اے بہادری کی ماں، تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال ان کے دلوں کو تقویت دیتا ہے، ان کا کان نقارہ میں سے تیرے نغمے کی آواز سنتا ہے۔

وہ (۱) قوم کی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے، دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے، انھیں کو دشمن پاتا ہے، دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں، عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں، بھائی بند، عزیز، اقارب سب سمجھاتے ہیں، اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں۔

بھائی سید تو کچھ دوانے ہیں　　　وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں، مگر ہار کر کر، محنت اور دلسوزی سے دور رہ کر، بہت سے ہمدردی کرتے ہیں، پر کوٹھی کٹھلے سے الگ کر کر، مگر اے بیقرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت، تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے۔ اور ہمارے دل کی عزیز، اور ہمارے پیارے مہدی کی پیاری (۲) "امید" تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید، جب کہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے، اور دنیاوی حیات کا آفتاب لب بام ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، رنگ فق ہو جاتا ہے، منھ پر مُردنی چھاتی ہے۔ ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے، تو ترے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔ اس وقت اس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ملتے ہوئے ہونٹوں، اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں، اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے، تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے، تیری صدا کان میں آتی ہے، اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے، اور ایک نئی لازوال زندگی کی، جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی، امید ہوتی ہے۔

اور ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا! جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، جہاں سورج کی کرن اور زمانے کی لہر بھی نہیں پہونچتی، تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے۔ ایمان کے توشہ، اور امید کے ہادی، اور موت کی سواری سے۔ مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے، جس کا پیارا نام امید ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی، مگر میں دیکھتا ہوں کہ

---

(۱) یہاں سر سید خود اپنی مثال دیتے ہیں۔

(۲) یعنی نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں۔

تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے، اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے۔ وہ اپنے اس بے تکلف آنے والے زمانے کی امید میں نہایت بردباری سے اور رنجوں کے زمانے کے اخیر ہونے کی خوشی میں، نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے:-

بقدر ہر سکوں راحت بود، بنگر تفاوت را
دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

(و) سر سیّد نے بعض مضامین "مکالمہ" کے طرز میں لکھے ہیں۔ اُردو میں یہ روش مرزا غالبؔ کی ایجاد ہے۔ لیکن سر سیّد کی مقالہ نگاری کے دور میں مکالمہ یا ڈرامہ کا انداز اور لوگوں نے بھی شروع کر دیا تھا۔ "تہذیب الاخلاق" کے جاری ہونے سے پہلے مولوی نذیر احمد دہلوی کی "مراۃ العروس" شائع ہو گئی تھی۔ جس میں افرادِ قصہ کی گفتگو پرانی داستانوں کی طرح نہیں، بلکہ نئے ناولوں کے انداز میں تھی۔ پھر "تہذیب الاخلاق" کے دوسرے دور میں اخبار "اودھ پنچ" لکھنؤ (مجریہ ۱۸۷۷ء) نکلنے لگا تھا، اور اس میں مزاحیہ مضامین مکالمہ کے طرز میں بھی لکھے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۸۷۸ء سے پنڈت رتن ناتھ سرشار نے "اودھ اخبار" میں اپنا 'فسانۂ آزاد' شائع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان سب کے اندازِ تحریر سے سر سیّد باخبر تھے، تاہم ان کے طرزِ مکالمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے غالبؔ کا اتباع کیا ہے۔ ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے۔ انھوں نے عجائباتِ مذہب یا معجزات کے انکار میں ایک مضمون 'عجائبات کا ذہول اور قبول' لکھا ہے۔ اس کو مکالمہ کے رنگ میں شروع کرتے ہیں:-

"ہیں! تم نے یہ کیسی متضاد باتیں کیں؟"

"حضرت میں کیا کروں، انسان کی جبلت ہی ایسی متضاد باتوں پر واقع ہوئی ہے۔"

"اس متضاد جبلت کے سبب بڑے بڑے بزرگوں، یہاں تک کہ انبیاء کو بھی نہایت مشکلیں پیش آئی ہیں۔ مذہب سی عمدہ چیز کا بھی اسی جبلت نے ستیاناس کر دیا۔"

"حضرت اب تک تو ہماری سمجھ میں یہ معما نہیں آیا۔ اگر آپ کچھ تفصیل سے بتا دیں تو شاید سمجھ میں

آجاوے۔"

"میاں سمجھو! دنیا میں قدرتی عجائبات اس قدر ہیں کہ انسان نہ ان کو سمجھ سکتا ہے نہ گن سکتا ہے۔ دن کا ہونا، رات کا آنا، چمکدار سورج کا نکلنا، باریک چاند کا دکھائی دینا اور پھر بڑھتا جانا، بدر ہونا اپنی چاندنی سے اندھیری دنیا کو روشن کرنا، پھر گھٹتا جانا اور پہلی طرح باریک سا ہو کر چھپ جانا، کیا عجائبات قدرت سے نہیں ہے؟"

(اس کے بعد بہت سے عجائباتِ قدرت، کالی گھٹا کا اٹھنا، درختوں کا اگنا، پرندوں کا ہوا میں اُڑنا، شہد کی مکھی کے کرتب وغیرہ بیان کرتے ہیں، اور ہر بات پر کہتے ہیں کہ کیا عجائباتِ قدرت نہیں ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں)۔

مگر جو کہ یہ باتیں روز مرہ دیکھنے میں آتی ہیں، ان کا عجیب بلکہ عجیب تر ہونا انسان کے خیال میں نہیں رہتا۔ اور اس سے ذہول (فراموشی یا غفلت) ہو جاتا ہے، مگر انسان جب کسی مذہب پر اعتقاد لاتا ہے، یا کسی شخص کو مقدس سمجھتا ہے، تو عجائبات کو اس کے ساتھ لگاتا ہے، اور جو عجائبات اس کے ساتھ لگائے گئے ہیں، ان سب کو قبول کرتا ہے، بلکہ بغیر ان عجائبات کے مذہب کی حقیقت یا اس شخص کے تقدس کو تسلیم نہیں کرتا۔" (اس کے بعد حضرت نوح، سلیمان، موسیٰ، یونس عیسیٰ علیہم السلام کے معجزات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں)

"یہی خیال اولیا اللہ تک بھی پہونچ گیا۔ جب تک ان میں کرامتیں نہ پائی جائیں، اور ان پر یقین نہ کیا جائے کہ ولیوں نے مُردوں کو بھی زندہ کر دیا ہے، اور برسوں کی ڈوبی ہوئی برات کو دریا میں سے زندہ نکال دیا، اور چنیں اور چناں کیا، اس وقت تک ان کے ولی ہونے کا بھی یقین نہیں ہوتا......

رفتہ رفتہ لوگوں کے خیال میں یہ بات جم گئی کہ عجائبات کے بغیر نہ مذہب چلتا ہے، نہ لوگ ایسے مذہب کو جس میں کچھ عجائبات نہوں قبول کرتے ہیں۔ مگر یہ سخت غلطی ہے۔ کوئی مذہب جو سچا ہے، اور سچا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس میں کبھی ایسے عجائبات نہیں ہوتے جو فطرت کے خلاف ہوں، عقل انسانی کے خلاف ہوں، اور کوئی سمجھ دار آدمی ان کو تسلیم نہ کرے، بلکہ اصلی اور سچا مذہب ایسے عجائبات، خلاف فطرت اور خلاف عقل سے بالکل پاک اور خالی ہوتا ہے۔ گو کہ بعد کو اس کے ماننے والوں نے عجائبات پرستی کی راہ سے اس میں بہت سے عجائبات شامل کر دئے ہوں۔ اس میں جس قدر حصہ عجائبات کا ہے،

وہ ان عجائبات پرستوں کا شامل کیا ہوا ہے، جو قدرت کے عجائبات کو ذہول کرتے ہیں، اور خلاف قدرت اور خلاف عقل عجائبات کو قبول کرتے ہیں۔ خدا ان عجائبات پرستوں سے بچائے۔"

(ز) سر سیّد کو حسب موقع جدید اسالیب بیان پیدا کرنے، اور ہر موضوع کو قوت و قدرت کے ساتھ بیان کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ مثلاً بقول مولانا حالیؔ کے: "واقعات و حالات کے حسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچتے تھے کہ جو بُرائیاں بسبب اِلف و عادت کے دلوں میں گُھب گئی ہوں ان کی بُرائی، اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چُھپ گئی ہوں ان کی خوبی، فوراً دلوں پر نقش ہو جائے۔" یہ کمال جو سر سیّد کی تحریر میں دیکھا جاتا ہے، ان سے پہلے نہ تھا۔ اور ان کے بعد کی تحریروں کے مقابلے میں بھی ان کی انفرادیت آج تک قائم ہے۔ اس کی مثالیں خاص کر "تہذیب الاخلاق" کی قدیم و جدید جلدوں میں بکثرت موجود ہیں۔ جن میں سے بہترین نمونہ سر سیّد کا مضمون 'بحث و تکرار' ہے۔ اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:-

"جب کتّے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے، اور پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے، اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں، اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھیں چڑھ کر کانوں سے جا لگتی ہیں، اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، داڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منھ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں، اور عنیف آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں۔ اس کا کان اس کے منھ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں۔ اِس نے اُس کو کاٹا، اور اُس نے اِس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا، جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کے آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، رُخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں، باچھیں چڑھ جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں،

تھوک اُڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا، اس کی گردن اس کے ہاتھ میں، اور اس کی داڑھی اس کی مٹھی میں، لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا، تو غراتے ہوئے ایک اِدھر چلا گیا، اور ایک اُدھر۔ اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا، تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے، سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرغش ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں تو تکار تک نوبت آجاتی ہے، کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے پر ہی خیر گذر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلافِ رائے ضرور ہوتا ہے، اور اس کے پرکھنے کے لئے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہئے۔"

(۸) **سر سیّد کی تقریر:** بقول مولانا حالیؔ کے ہندوستان میں انیسویں صدی سے پہلے قومی اور ملکی مجمعوں میں اسپیچ یا لکچر دینے کا رواج نہیں پایا جاتا۔ سیّد احمد خاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی ملکی زبان میں پبلک اسپیکنگ کی راہ نکالی ہے۔ مولانا حالیؔ سر سیّد کے سیرت نگار کرنل گریہم کی رائے نقل کرتے ہیں کہ "وہ (یعنی سر سیّد) ایک پیدائشی اوریٹر (مقرّر) ہیں۔ جب وہ اپنے خاص مقصد کے متعلق جوش میں بھری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو ان کی طرزِ تقریر مسٹر گلیڈ اسٹن سے مشابہ ہوتی ہے۔ اسی جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں ان کے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں آواز دردناک ہو جاتی ہے، اور چہرہ متغیر ہو جاتا ہے، اور یہ تمام درد و غم کی علامتیں ان کے سامعین پر بجلی کی طرح اثر کرتی ہیں۔"

مولانا حالیؔ کہتے ہیں کہ "اس کا تماشا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ سر سیّد نے پنجاب کا پہلا سفر ۱۸۷۳ء میں کیا تھا جب کہ 'تہذیب الاخلاق' کو جاری ہوئے پورے تین برس گزر چکے تھے۔ اس وقت راقم بھی لاہور میں موجود تھا...... ۲۹ر دسمبر کو جو لکچر کر

سیّد صاحب نے راجہ دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں جہاں کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا، دیا۔ اس کا سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکتہ کا سا عالم تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جو زار و قطار نہ روتا ہو، اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو...... خصوصاً مندرجہ ذیل الفاظ نے تمام حاضرین کی حالت دگرگوں کر دی تھی:-

''اے بزرگانِ پنجاب، میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں، مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے۔ آپ کی دولت سرا بنانے میں، جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لئے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوہڑے، چمار، قلی، کافر، بُت پرست، بدعقیدہ، سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت سرا کے دشمن ہوتے ہیں، اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ بس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجئے، اور میری محنت و مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے، اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا، اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے، اپنے گھر کو مت ڈھایئے۔ کیا آپ صاحب مجھ بدبخت نامہ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی تمام قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسلٍ ڈبونا اور خراب و خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ سب صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو، اس سے عبرت پکڑو، اور برائے خدا اپنی قوم کی، اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کرو۔''

(ب) اوپر کی تقریر سے گیارہ برس بعد ۱۸۸۴ء میں سرسیّد نے بمقام گورداسپور خاتونانِ پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں تقریر کی تھی۔ یہ ایڈریس مسلمان عورتوں کی طرف سے سرسیّد کی خدمت میں پیش کیا تھا، جس کی بانی سردار محمد حیات خاں بہادر کی بیگم صاحبہ تھیں، مگر اس کے نیچے بعض ہندو اور عیسائی عورتوں کے بھی دستخط تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی تقریر تھی جس میں شریف ہندو، مسلمان، عیسائی عورتوں کو مخاطب کیا گیا تھا۔ سرسیّد کے چند فقرے یہ تھے:-

''اے میری بہنو! آج کی رات میرے لئے شب قدر سے کچھ کم قدر کی نہیں ہے۔ جو ایڈریس تمہاری

طرف سے مجھ کو دی (۱) گئی ہے وہ میرے لئے ایسی عزت ہے جو آج تک ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ میں تمھاری اس شفقت کا دل سے شکر گذار ہوں۔

اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی مستورات کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگ نشان بدستور موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلیؔ اور جنیدؔ موجود نہیں ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں۔

تمھاری نیکی، تمھاری بُردباری، تمھاری محبت، ہر قسم کی مشکلات کی برداشت اور اس پر صبر، بچوں کی پرورش، گھر بار کا انتظام، ہمارے فخر کا باعث ہے۔ اگر کوئی قوم تمام دنیا میں اپنے تئیں کسی قسم کا فخر دے سکتی ہے تو ہم اپنی قوم کی مستورات کو دنیا کی قوموں پر فخر دے سکتے ہیں۔ یہ ہمارا فخر تمھارے ہی سبب ہے۔ میں نے تمھارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں، بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت میں تمھارے لڑکوں کے لئے کر رہا ہوں، درحقیقت وہ لڑکوں لڑکیوں دونوں کے لئے ہے۔

میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمھاری دادیاں نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانے کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانے میں پھیلتی جاتی ہیں۔ مردوں کو جو تمھارے لئے روٹی کما کر لانے والے ہیں، زمانے کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آتی ہو مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم کے متعلق تم کو پہلے تھی، اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔

اے میری ہندو اور عیسائی بہنو! تم نے جو اپنی محبت اور وطنی یگانگت سے اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ اس ایڈریس میں اور اس امداد میں جو مدرسۃ العلوم کے غریب طالب علموں کو دی گئی ہے، شرکت کی، وہ ایک نمونہ تمھاری محبت اور یگانگت کا ہے۔ میں دل سے اس کے لئے تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ تم پر بھی خدا تعالیٰ کی برکت ہو، اور ہر طرح کی ترقی اور خوشی تم کو نصیب ہو۔ آمین۔"

---

(۱) سر سید نے ایڈریس کو مؤنث کہا ہے، لیکن اب مذکر بولنا فصیح مانا جاتا ہے۔

(ج) سرسیّد نے اپنے پوتے سیّد مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں (غالباً ۱۸۹۴ء میں) بمقام علی گڈھ ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے بعد تمام ممبروں کے سامنے ایک تقریر کی تھی، اس کے چند آخری فقرے یہ تھے:-

"اے حضرات! اگو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہے، مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم خراب حالت میں ہے۔ اس لئے اسی کا گیت گایا جاتا ہے، ورنہ ہم اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے۔ اس وقت اس کے دو علانیہ ثبوت موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سیّد محمود اور مسٹر راس سے نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے۔ جب سیّد مسعود پیدا ہوا تو مسٹر راس اور ان کی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے، اپنا نام اس نومولود مسعود کو دیا، اور ہم نے نہایت خوشی سے ان کا نام اس کے نام کے ساتھ شامل کیا، اور اسی سبب سے اس کا نام سیّد راس مسعود قرار پایا۔ دوسرا نمونہ (راجہ جے کشن داس بہادر سی، ایس، آئی کی طرف سے نہایت جوشِ محبت کے ساتھ اشارہ کر کے کہا) یہ ہمارا ڈاڑھی منڈا دوست یہاں موجود ہے۔ اور سیّد راس مسعود کو اپنی بغل میں بٹھائے ہوئے ہے۔ ان کو میں اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں، اور سیّد محمود ان کو چچا کہتے ہیں، اور سیّد راس مسعود "دادا راجہ" پس ہم اپنے دوستوں سے محبت کرنے میں کچھ بھی فرق نہیں کرتے۔"

(۶) سرسیّد کے خطوط: خطوط میں بھی سرسیّد کی طرزِ تحریر اور افتادِ طبع کی تمام خصوصیات نمایاں ہیں۔ القاب غالبؔ کی طرح مختصر لکھتے ہیں، "بھائی"، "مخدومی" وغیرہ۔ ظرافت جو غالبؔ کی طرح سرسیّد کی بھی طبیعت ثانیہ ہے جا بجا چمکتی ہے۔ سرسیّد کے لائق پوتے سر راس مسعود مرحوم (متوفی ۱۹۳۷ء) نے "خطوطِ سرسیّد" کا مجموعہ شائع کر دیا ہے۔ چند خطوں کا اقتباس بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

(الف) سرسیّد کے کسی نہایت عزیز دوست کو ایک زمانے میں ایک افسر سے سابقہ پڑا جو نماز پر تعرض کرتا تھا، اور اس امر کی اطلاع انھوں نے سرسیّد کو بھی کی تھی۔ اس کے متعلق سرسیّد ان کو لکھتے ہیں:-

"بھائی..... کل میں سارے دن متردد رہا، کیونکہ تمھارا کوئی خط نہیں آیا، آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو

میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا، اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا، دو دو اکٹھی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی، یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔ مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا نہایت لچرپنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے، اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے، جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لحہ بھی نہیں ہو سکتا، یہ بات سُنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے، جس کے بخشے جانے کی توقع ہے، اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامت اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی، اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا، اور حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں، کہنا واہیات تھا۔ تڑاق سانی استعفا دے دینا تھا، صاف کہنا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے مر جاتے، نہایت اچھا ہوتا۔ والسلام۔''

(ب) خان بہادر مولوی سیّد زین العابدین خاں سے سر سیّد کو خاص محبت و یگانگت تھی، اور اسی خصوصیت کے سبب سے ان پر سب سے زیادہ خفگی اور ناراضگی بھی رہتی تھی۔ جب خان بہادر صاحب ریاست رامپور کی اسٹیٹ کونسل کے جوڈیشل ممبر ہو کر رامپور چلے گئے تو سر سیّد نے اپنی علالت کے زمانے میں (غالباً ۱۸۹۷ء میں) ان کو یہ خط بھیجا تھا:-

''مکرمی زینو، ابھی تمھارا خط پہونچا، کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا، مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے، مگر مجھ کو تمھارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اس کو بُرا کہوں، دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اس پر غصہ نکالوں، ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمھارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہو گیا۔ صبح کو اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔ ''اے کہ ہرگز فراموشت نکنم'' کا نقشہ ہو گیا ہے۔''

تحریرِ سرسیّد کی خصوصیات

(۱) سرسیّد کی تحریر میں جو طرزِ قدیم کا اثر اور متروک الفاظ کا استعمال ہے، وہ کوئی عیب نہیں۔ اس زمانے کے سب لوگ ایسا ہی لکھتے تھے۔ البتہ یہ بات ضرور محسوس ہوتی اور ذرا گراں گزرتی ہے کہ کبھی کبھی ان کے فقرے زیادہ طویل اور پیچدار ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں تقسیم کر دیا جائے تو زیادہ سلیس ہو جائیں۔ الفاظ کی بے قاعدہ تقدیم و تاخیر بھی کہیں کہیں الجھن پیدا کر دیتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی کمی ان کی تحریر میں نہیں ہے۔

(۲) سرسیّد نے مختلف موضوعات و مضامین پر قلم اٹھایا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ ہر موضوع اور ہر موقعہ کے ۔لیے اس کے مناسب زبان و بیان اختیار کیا ہے۔ کسی دعوے پر دلیل لاتے ہیں تو ایسی قوت کے ساتھ کہ اس سے بہتر کا امکان نظر نہیں آتا۔ جذبات سے اپیل کرتے ہیں تو ایسی ہی تاثیر کے ساتھ۔ کسی مسئلے کی تحقیق کرتے ہیں تو اس کے کسی جزو کو نہیں چھوڑتے، کوئی منظر و واقعہ بیان کرتے ہیں تو تصویر کھینچ دیتے ہیں، ظرافت و مزاح کا موقع ہوتا ہے تو بے اختیار ہنسا دیتے ہیں۔ الفاظ کی متانت، لطافت، شوخی و رنگینی کو حسب موقع صرف کرنے پر حیرت ناک اختیار رکھتے تھے۔ اس صفت کے بغیر کوئی شخص ادیب نہیں بن سکتا۔ اور یہ صفت سرسیّد سے پہلے ان سے بہتر کسی تنہا مصنف میں نہیں پائی جاتی۔

(۳) سرسیّد کی تحریر و تقریر ان کے مسلک و مشن کے سبب سے نہایت دوررس اور وسیع الاثر تھی۔ اس لیے ان کے دوستوں کے ساتھ ان کے دشمنوں نے بھی نادانستہ اور بے اختیار وہی طرز و روش اختیار کر لی، اور اس طرح دوسروں کی تصانیف اور اخبارات و رسائل کی زبان میں بھی سلاست اور صفائی پیدا ہو گئی۔

(۴) سرسیّد کی بعض تصانیف مثلاً 'خطباتِ احمدیہ' اور اکثر مضامین تہذیب الاخلاق ایسے موضوعوں اور اس قدر خوش اسلوبی کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ ان سے پہلے اُردو میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ سرسیّد کی کتابوں سے زیادہ ان کے مضامین مفید ہیں، جن

سے اُردو میں فنِ مقالہ نگاری پیدا ہو گیا۔

(۵) سرسیّد کے مذہبی عقائد اور قومی و تعلیمی مشاغل کو بہت سے مسلمان ناپسند کرتے تھے اور ان کی مخالفت میں کتابیں لکھتے تھے، اخبار نکالتے تھے، مضامین شائع کرتے تھے۔ اس ذریعہ سے اُردو میں بڑا لٹریچر پیدا ہو گیا۔ یہ بھی بالواسطہ سرسیّد ہی کا احسان تھا۔

(۶) سرسیّد کی براہِ راست تربیت سے اور ان کی تصنیف و تحریر کے اثر سے ملک میں نامور مصنف پیدا ہو گئے۔ مولوی وحید الدین سلیم نے سالہا سال اور مولانا شبلی نے چند سال سرسیّد کو ان کی 'تفسیر قرآن' کی ترتیب میں مدد دی ہے، سرسیّد کو دیکھ کر ان بزرگ میں صاحب تصنیف بننے کا ذوق و سلیقہ پیدا ہوا۔ شبلی کا علم الکلام کی طرف رجحان سرسیّد کی تفسیر اور خطبات سے پیدا ہوا۔ مولانا حالیؔ اور نواب محسن الملک بھی سرسیّد کے زیرِ اثر اور پیشِ نظر رہتے تھے۔ مولوی چراغ علی، نواب وقار الملک، نواب حاجی محمد اسمٰعیل، سرسیّد ہی کی تحریر و صحبت کے اثر سے مضمون نگار و مصنف بنے۔ مولوی عبدالحلیم شررؔ لکھنوی کی تحریر پر سرسیّد کی مقالہ نگاری کا اثر پڑا۔ مولوی عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین، ظفر علی خاں، خوشی محمد خاں ناظر، سرسیّد سے اثر پذیر اور تربیت یافتہ ہیں۔

ان اعتبارات سے سرسیّد اپنے دور کے منفرد شخص ہیں۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف 'آثار الصنادید' (۱۸۵۴ء) کے بعد سے ان کی زندگی کے ۴۵ برس میں بلکہ پوری انیسویں صدی میں کوئی دوسرا مصنف ایسا نہیں ہے جس نے تعداد میں اتنی زیادہ، مضامین میں اتنی مختلف، ضخامت میں اتنی گراں، خوبیوں میں اتنی اعلیٰ، فوائد میں اتنی کثیر، اثر میں اتنی وسیع تصنیف کی ہوں۔ یہ تمام محاسن و فضائل کسی ایک مصنف میں جمع نہیں ہیں۔

اس دور کے غیر مشہور مصنفین

سرسیّد کے زمانۂ تصنیف یا غدر سے پہلے بھی مختلف اطراف ہند میں مصنف پیدا ہو گئے تھے۔ جیسا کہ صفحہ ۱۷۲ اور صفحہ ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴ کی فہرستوں سے معلوم ہوا۔ سرسیّد کے زمانے میں انیسویں صدی کے آخر تک اتنی کثرت سے اور ایسے اعلیٰ درجے کے مصنف پیدا ہوئے کہ ان کی تصانیف پر آج تک اُردو زبان و ادب کو فخر ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔ بعض کتابیں اُردو میں بالکل نئی ایجاد تھیں، اور بعض ایسی تھیں کہ موضوع و مضمون یا زبان و طرزِ بیان کے اعتبار سے آج تک ان سے بہتر نہ لکھی جا سکیں، جب تصانیف و اہلِ تصنیف کی اتنی کثرت ہو تو ادب اُردو کے مؤرخ کے لیے بجز اس کے چارۂ کار نہیں کہ ان میں سے انتخاب کر کے چند ممتاز ہستیوں کا تذکرہ کر دے۔ یہی راہِ عمل ہم بھی اختیار کرتے ہیں، لیکن ناظرین کے اندازے کے لیے چند غیر مشہور لیکن ممتاز مصنفوں اور ان کی تصانیف کی فہرست درج کرتے ہیں اور ان میں سے بعض کے حالات اور نمونے بھی۔

(۱) تواریخ راسلس مترجمہ سیّد محمد میر لکھنوی (۱۸۳۹ء)

(۲) عجائباتِ فرنگ سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش (۱۸۴۷ء)

(۳) نجاتِ قاسم مصنفہ شاہ محمد قاسم ابوالعلائی داناپوری (۱۸۵۷ء)

(۴) تذکرۃ المشاہیر مرتبہ منشی سداسکھ لال (۱۸۶۰ء)

(۵) تصویرِ شعرا مرتبہ مفتی اکرام اللہ صدیقی گوپاموی (۱۸۶۱ء)

(۶) ترجمہ سہ دفتر ابوالفضل مرتبہ مولوی قمر الدین اکبرآبادی (۱۸۶۱ء)

(۷) تذکرہ شعر و سخن مرتبہ نیاز علی پریشاںؔ (۱۸۶۹ء)

(۸) گلستانِ بے خزاں مرتبہ حکیم سیّد قطب الدین خاں باطنؔ اکبرآبادی (۱۸۶۱ء)

(۹) آثارِ شعرائے ہنود مترجمہ دیبی پرشاد (۱۸۸۵ء)

(۱۰) سفرنامۂ یورپ مرتبہ مرزا نثار علی بیگ اکبرآبادی (۱۸۸۵ء)

(۱۱) زبدۃ الحکمہ مصنفہ مولانا عبدالحق خیرآبادی

(۱۲) خلاصۃ المنطق مصنفہ منشی دیبی پرشاد بدایونی (۱۸۷۲ء)

(۱۳) منہاج المنطق مترجمہ مولوی رضا خاں لکھنوی (۱۸۸۱ء)

(۱۴) انتخاب یادگار مرتبہ منشی مفتی امیر احمد مینائی (۱۸۷۳ء، ۱۲۹۰ھ)

(۱۵) البرہان (سرسیّد کی تفسیر قرآن کا رد) مصنفہ مولوی محمد علی تحصیلدار بچھرایونی (۱۸۸۰ء کے بعد)

(۱۶) آئینۂ وکالت مصنفہ پنڈت گرراج کشور دت مصنف ایڈ (۱۸۸۹ء، ۱۳۰۶ھ)(۱)

ان میں پہلی دو کتابیں غدر سے پہلے کی ہیں باقی انیسویں صدی کے نصف آخر کی ہیں۔ یہ فہرست بہت طویل ہو سکتی تھی لیکن یہاں اُن چند کتابوں کا نام لیا گیا ہے جو بلحاظ موضوع یا باعتبار مصنفین ممتاز ہیں اور اُردو ادب کے لیے اضافہ۔ ان میں سے بعض کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

سیّد محمد میر لکھنوی : ان کا حال دریافت نہیں ہوا۔ ۱۸۳۹ء میں ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کے سرورق پر نام ونشان اس طرح درج ہے:-

تواریخ راسلس شہزادہ حبش کی، جس کو عالم تبحر جانسن صاحب (سیموئیل جانسن ایل، ایل، ڈی) نے تصنیف کیا، سیّد محمد میر لکھنوی نے آگرہ اسکول بک سوسائٹی کے واسطے اُردو زبان میں اس کو ترجمہ کیا، اور پادری جان جیمس مور صاحب نے منشی محمد فتح اللہ خاں اکبر آبادی کی استعانت سے تصحیح کر کے گرین وے صاحب کے چھاپے خانے میں چھپوایا۔ ۱۸۳۹ء مسیحی۔

اس کا مختصر دیباچہ یہ ہے:-

"عاصی کمال الدین حیدر عرف محمد میر حسنی الحسینی نے واسطے صاحبانِ عالیشان آگرہ اسکول بک سوسائیٹی کے، تاریخ راسلس شہزادے کی، کہ جسے ڈاکٹر جانسن صاحب نے بکمال فصاحت اور بلاغت تحریر کیا ہے، اور صاحبان عالیشان بھی اس رسالے کو بہت عزیز رکھتے ہیں، زبانِ اُردو میں ترجمہ کیا کہ صاحبانِ فہم وفراست کو تہذیب اخلاق بخوبی دریافت ہو۔"

---

(۱) ان کتابوں میں سے کچھ خاکسار مؤلف کے پاس ہیں اور اکثر جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کے کتب خانے میں ہیں۔

ترجمہ کا نمونہ یہ ہے:۔

''شہزادی نے جواب دیا کہ میں نے بہت مجرد لوگوں سے ملاقات کی جو اسی سبب سے بغیر شادی کے اپنی زندگی کو عالمِ تجرید میں بسر کرتے ہیں، لیکن کبھی نہ دیکھا کہ ان کی تمیز و فراست اور لوگوں کے حسد کرنے کے لائق ہو۔ ان کی زندگانی بغیر دوستی و محبت کے مثل خواب وخیال کے گزرتی ہے۔ ہر ایک روز ان کو بے فائدہ اور بارِ خاطر معلوم ہوتا ہے، اس واسطے کہ بیکار و بے شغل و بے یار و یاور پڑے رہتے اور خستگیِ دل سے رہائی کے لئے بیہودہ مشغلوں اور خطاؤں میں مشغول ہوتے ہیں۔ ان کے چلن ان شخصوں کے موافق ہیں جو اپنے تئیں پست رتبوں میں جانتے ہیں۔ اسی سبب سے دل حسد اور بغض سے بھر جاتے ہیں اور زبان پر لوگوں کی غیبت و عیب جوئی جاری ہوتی ہے۔ گھر میں بدمزاج رہتے ہیں اور باہر بدظن۔ جیسے چور و قزاق جو شرع سے باہر ہو کر یہی چاہتے ہیں کہ صحبتِ انسانی کو برہم کریں۔ اس رشک سے کہ اس کی منفعت سے آپ محروم رہتے ہیں۔''

یہ ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے۔ اُس زمانے میں لوگوں نے فارسی زبان سے بھی ایسا اچھا ترجمہ مشکل سے کیا ہے۔

یوسف خاں کمبل پوش : حیدرآباد وطن اصلی تھا، سیر و سیاحت کے لیے گھر سے نکلے، تمام ہندوستان کی سیر کر کے انگلستان کا سفر کیا۔ یورپ کے دوسرے مقامات اور مصر وغیرہ کی بھی سیر کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندوستانی سیاحوں میں سب سے قدیم تھے۔ ۱۸۲۸ء سے سیاحت شروع کی، ۱۸۳۷ء میں ولایت کا سفر کیا۔ حالات سفر لکھتے گئے، جن کو ۱۸۴۷ء میں دہلی میں چھپوایا، پھر دوبارہ ۱۸۷۳ء میں مطبع نول کشور میں چھپا۔ 'عجائباتِ فرنگ' اس کا نام ہے۔ یہ اُردو میں سب سے پہلا سفرنامہ ہے۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ محض ایک سیاح کا سفرنامہ ہے، جس کی کوئی قومی، ملکی یا تعلیمی غرض نہ تھی۔ اور سب لوگوں کے سفرنامے مثلاً مولوی مسیح الدین، سرسیّد احمد خاں، راجہ رام موہن رائے وغیرہ کے اس سے بعد کے ہیں۔ اور بغرض سیر و سیاحت نہ تھے۔ پھر انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی میں بھی لوگوں نے یورپ کے سفرنامے لکھے ہیں۔

یوسف خاں کمبل پوش ۳۰ر مارچ ۱۸۳۷ء کو کلکتہ سے انگلستان روانہ ہوئے تھے، اور ۲۵ر جولائی ۱۸۳۸ء کو واپس کلکتہ پہنچے۔ سفر کے حالات بقید تاریخ لکھے ہیں۔ راستے کے ہوٹلوں اور لندن وغیرہ کے محلّوں کے نام اور نمبر تک درج کیے ہیں۔ اپنا مذہب سلیمانی بتایا ہے۔ ہر جگہ اس کا ذکر کیا ہے، اصولِ مذہب بھی لکھے ہیں اور اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا مذہب بتایا ہے۔ ''سلیمانی'' نام کا یہی سبب ہے۔ شراب پیتے تھے، بڑی بے تکلفی سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ بلکہ ایک جگہ کمال جسارت سے شراب کو جائز بتادیا ہے، لکھتے ہیں:۔

''وہاں کے مالک نے بہت اخلاق سے ملاقات کی اور شراب انگوری ہم کو پلائی، عجب ذائقہ کی تھی کہ کبھی دل سے نہیں بھولتی۔ ایک شخص قوم ملائی سے میرا نوکر تھا اس نے مجھ سے کہا کہ تم مذہب مسلمانی رکھتے ہو، شراب کیوں پیتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ حضرت پیغمبر نے شیرۂ انگور کو منع نہیں کیا۔''

انگریزوں کے اخلاق کی بیحد تعریف کرتے ہیں، سفر میں جن مصائب میں انگریزوں نے ان کی مدد کی ہے ان کا ذکر بڑی احسان مندی سے کرتے ہیں۔ اور ہندوستانیوں کے اخلاق سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یورپ ولندن کے حسن وجمال کے نہایت مداح ہیں۔ ہر جگہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں۔ حسین عورتوں سے اپنی محبت کا حال لکھتے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں: ''مگر خالی اغراض نفسانی سے تھی۔'' وہاں کی بدکاری کے چشم دید واقعات بیان کرتے ہیں۔ غرض کمبل پوش صاحب نے سفر اور سفرنامہ دونوں کا حق ادا کردیا ہے۔

اس 'عجائباتِ فرنگ' کی زبان بالکل وہی ہے جو سوا سو برس پہلے کی ہونی چاہئے۔ قافیہ پیمائی بھی ہے لیکن دلچسپ واقعات اور ذاتی تاثر کے سبب سے فسانہ وناول کا سا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ مختصر اقتباسات یہ ہیں۔ شروع میں لکھتے ہیں:۔

''آغاز حال مؤلف۔ یہ فقیر بیچ سنہ اٹھارہ سو اٹھائیس عیسوی (۱۸۲۸ء) مطابق سنہ بارہ سو چوالیس ہجری (۱۲۴۴ھ) کے حیدرآباد وطن خاص اپنے کو چھوڑ کر عظیم آباد، ڈھاکہ، مچھلی بندر، مندراج، گورکپور، نیپال، اکبرآباد، شاہجہاں آباد وغیرہ دیکھتا ہوا بیت السلطنت لکھنؤ میں پہونچا۔ یہاں بمددگاری نصیبے اور یاوری کپتان ممتاز خاں منکس صاحب بہادر کے، ملازمت نصیر الدین حیدر بادشاہ سے عزت

پانے والا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ نے ایسی عنایت اور خاوندی میرے حال پُر اختلال پر مبذول فرمائی کہ ہرگز نہیں تابِ بیان اور یارائے گویائی۔ رسالہ خاص سلیمانی میں عہدہ جماعہ داری کا دیا۔ بعد چند روز کے صوبہ داری اسی رسالہ کی دے کر درماہہ بڑھایا۔ بندہ چین سے زندگی بسر کرتا اور شکرانہ منعم حقیقی کا بجالاتا۔ ناگہاں شوق تحصیل علم انگریزی کا دامن گیر ہوا۔ بہت محنت کر کے تھوڑے دنوں میں اسے حاصل کیا۔ بعد اس کے بیشتر کتابوں تاریخ کی سیر کرتا، دیکھنے حال شہروں اور راہ و رسم ملکوں سے محظوظ ہوتا۔ اکبارگی سنہ اٹھارہ سو چھتیس عیسوی (۱۸۳۶ء) میں دل میرا طلب گار سیاحی جہان، خصوص ملک انگلستان کا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ سے اظہار کر کے رخصت دو برس کی مانگی۔ شاہ گردوں بارگاہ نے بعد عنایت و انعام اجازت دی۔ عاجز تسلیمات بجالایا، اور راہی منزل مقصود کا ہوا۔ تھوڑے دنوں بعد دارالامارہ کلکتہ میں پہونچا۔ پانچ چھ مہینے وہاں کی سیر کرتا رہا۔ بعد ازاں جمعرات کے دن تیسویں تاریخ مارچ کے مہینے سنہ اٹھارہ سو سینتیس (۱۸۳۷ء) میں جہاز پر سوار ہو کر بیت السلطنت انگلستان کو چلا۔ نام جہاز کا ازابیلہ، کپتان اس کا ڈیبد بران صاحب مع اپنی بی بی کے تھا۔ جہاز وزن میں چھ سوٹن کا کنارے گنگا پر آ لگا تھا۔"

پیرس کی سیر میں لکھتے ہیں :۔

"پندرھویں دن ایک مکان میں گیا، وہاں صدہا آدمی قالیچے شطرنجیاں بُن رہے تھے۔ بناوٹ میں تصویر عمدہ کھینچتے۔ دریافت ہوا کہ وہ سب مصور تھے، تصویریں قالین اور دریوں پر ایسی معلوم ہوتیں کہ کسی مصور کامل نے تصویریں کاغذ پر کھینچی ہیں۔ ان کی کاریگری دیکھ کر متحیر ہوا۔ حال ان کا پوچھا ظاہر ہوا کہ واسطے فرش دیوان عام شاہ فرانس کے بُنتے ہیں، اور کہیں نہیں بیچتے۔ زبان فرانسیسی میں اس کام کو ٹپسٹری کہتے ہیں۔ اس کے بعد کونسل کے مقام پر گیا۔ ایک مکان فلک بنیاد دیکھا ستون سنگِ مرمر کے ایکڈ ال راست اس میں لگے۔ صاحبان کونسل اپنے رتبہ کے موافق جا بجا بیٹھے۔ ہر ایک کے لبر لکھے۔ اس مکان کی شکست و ریخت کے لئے مزدور لگے تھے۔ میں یہ حال دیکھ کر باہر نکلا۔ پانی برسنے لگا، سارے کپڑے تر ہوئے، گر گرتے پڑتے گھر چلے۔ راہ میں دو رنڈیاں (۱) ایک خوب صورت دوسری کریہہ الہیئت ملیں۔ میری وضع خلاف اس شہر کے دیکھ کر ٹرگ ٹرگ کہتی تماشا دیکھتی پیچھے دوڑی آئیں۔ اکبار پانو پھسلا، دونوں لڑکھڑا کر گریں۔ میں نے قریب جا کر زن جمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، بدشکل کو ویسے ہی

---

(۱) اُس زمانے میں لکھنؤ میں عورت کو رنڈی کہتے تھے۔ یہاں کسی عورتیں مراد نہیں ہیں۔

چھوڑا، وہ بڑی محنت سے اٹھ کر اپنی بولی میں کچھ کہنے لگی، مگر اس زبان سے مجھ کو آگہی نہ تھی، آخر اس نے ایک دھکا دیا۔ مجکو زمین پر گرایا، دوسری عورت خوبصورت نے جس کو میں نے اٹھایا تھا، میری طرف ہو کر اس سے مقابلہ کیا۔ میں جان بچانی غنیمت سمجھا وہاں سے بھاگا۔ لڑکے کیچڑ بھرے ہوئے کپڑے اور بیگانہ وضع دیکھ کر تالیاں دیتے میرے پیچھے دوڑتے آتے۔ بہزار خرابی بھاگتے بھاگتے سرا میں پہونچا۔ میرا حال دیکھ کر سب ہمراہی ہنسنے لگے۔ میں سخت نادم و شرمندہ ہوا۔ پانو میں چوٹ آئی تھی، اس سبب سے دو ایک دن قیام کیا۔"

شاہ محمد قاسم داناپوری : سیّد شاہ محمد قاسم ابوالعلائی ابن سیّد تراب الحق داناپور کے ایک ذی علم صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے سلسلۂ ابوالعلائیہ کے سجادہ نشین تھے۔ لیکن آپ کو اس شغل سے زیادہ ملازمت کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں کچہری صدر دیوانی الہ آباد میں رہے۔ پھر صدر دیوانی الہ آباد سے آگرہ کو منتقل ہوئی تو ۱۸۴۵ء ﴿۱۲۶۱ھ﴾ میں شاہ محمد قاسم صاحب بھی آگرہ آ گئے۔ صدر نظامت میں "مسل خواں" تھے۔ ایک مرتبہ انگریز حاکم کے سامنے مسل پڑھ رہے تھے، واقعات مقدمہ نے ان کے دل پر ایسا اثر کیا کہ یکا یک جذب پیدا ہو گیا، زور سے "اللہ!" کا نعرہ مارا اور مسل پھینک کر نکل گئے۔ بہت دنوں تک کچہری کا رُخ نہ کیا۔ لیکن انگریز حاکم ان سے بہت خوش تھا، پھر بلایا اور اپنے دفتر والوں سے کہا کہ آئندہ ان کو کوئی "اللہ والی" مسل نہ دی جائے۔

آگرہ کے صدر نظامت میں بیشتر حکّام و وکلاء مسلمان تھے۔ مفتی انعام اللہ خاں بہادر گوپاموی وکیل صدر تھے۔ ان سے شاہ محمد قاسم صاحب کے خاص تعلقات ہو گئے۔ مولوی غلام امام شہید بھی دفتر نظامت آگرہ میں ملازم تھے۔ مولوی کریم اللہ خاں (۱) صدر الصدور (سب جج) تھے۔ ان سب کی نشست مفتی انعام اللہ خاں کے مکان پر رہتی تھی۔ اس زمانے کا یہ عجیب واقعہ یادگار ہے کہ نواب چیناپٹن (میسور) کے برادر زادہ

---

(۱) مولوی کریم اللہ خاں ابن قاضی فقیر اللہ نیاز مند مؤلف کے بزرگوں میں تھے۔ صدر الصدور ہونے کی وجہ سے نام کے ساتھ خان لکھا جاتا تھا، بچھراؤں ضلع مراد آباد وطن تھا۔ ۱۸۰۳ء ﴿۱۲۱۸ھ﴾ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۸ء ﴿۱۲۷۴ھ﴾ میں وفات پائی

سیّد شاہ احمد علی قادری عرف ضیاء الدین دلاور جنگ کو جہاد کا شوق پیدا ہوا، اور میسور سے چل کر آگرہ آئے۔ بخت و اتفاق سے مفتی انعام اللہ کے مہمان ہوئے۔ یہاں آگرہ کے اکثر علماء و رؤسا کا مجمع رہتا تھا۔ سب نے سیّد احمد علی صاحب کے عزمِ جہاد کی تائید کی اور امداد بہم پہنچائی۔ سیّد میسوری اپنے مریدوں اور رفیقوں کو لے کر شاہجہانپور کی طرف روانہ ہوئے، پوربیوں سے جہاد کیا۔ اس واقعہ کے بعد آگرہ کے بعض وکلاء و حکام و رؤساء پر رشوت ستانی کا مقدمہ برپا ہوگیا، جس میں مفتی انعام اللہ، مولوی غلام امام شہید، شاہ محمد قاسم وغیرہ متہم گردانے گئے۔ اس مقدمے کی سماعت کے لیے مسٹر ولسن جج مراد آباد خاص طور پر متعین کر کے بلائے گئے۔ مفتی انعام اللہ کے داماد خواجہ غلام غوث خاں بہادر میرمنشی اس وقت لفٹنٹ گورنر کے میر منشی تھے، لیکن وہ بھی اپنے خسر کی مدد یا سفارش نہ کر سکے۔ آخر مقدمے کا ثبوت بہم نہ ہو سکا۔ تمام حضرات میں سے صرف شاہ محمد قاسم کو ۶ ماہ کی سزا کا حکم ہوا تھا، وہ بھی اپیل میں منسوخ ہوگیا۔ یہ ہنگامہ آگرہ میں ''ولسن گردی'' کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔

اس مقدمے کا اصل سبب رشوت ستانی نہ تھا۔ مولوی امام شہید وغیرہ رشوت سے بالاتر ہستیاں تھیں، چنانچہ اس کا کوئی ثبوت بہم نہ پہنچ سکا۔ اصل میں انگریزوں کو اس پر غصہ تھا کہ ان عالموں، مفتیوں، صوفیوں نے سیّد احمد علی شاہ میسوری کے جہاد کی حمایت کی۔ اس کا انتقام انگریزی حکومت کو لینا تھا۔ لیکن اعانت جہاد کے جرم کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ صرف اس قدر معلوم و مشہور تھا کہ سیّد میسوری، مفتی انعام اللہ کے مکان پر مقیم تھے۔ باقی تمام کارروائی نہایت خفیہ ہوتی تھی۔ اس واقعہ سے بیس برس پہلے (۱۸۲۸ء میں) مولوی سیّد احمد بریلوی اور مولوی اسماعیل دہلوی سکھوں سے جہاد کر چکے تھے۔ ''ترغیبِ جہاد'' وغیرہ کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ مسلمانوں کے جوش کا اندازہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو تھا۔ لیکن یہ واقعہ جہاد اس طرح پیش آیا کہ سیّد احمد میسوری کو روکنا انگریزوں کے اختیار سے باہر تھا۔ سیّد مجاہد جلد شہید ہو گئے۔ ان کا لشکر منتشر ہوگیا۔ اس لیے انگریزوں نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو ان کے بس میں تھے اور اس کام کے لیے ۱۸۴۷ء میں ''ولسن گردی'' برپا کر دی۔

اسی سال تمام وکلاء وعہدے دار جو "ولسن گردی" کی لپیٹ میں آئے، ترکِ وکالت وملازمت کر کے صدر سے علیٰحدہ ہو گئے۔ شاہ محمد قاسم بھی آگرہ سے اپنے وطن دانا پور چلے گئے۔ وہیں وفات پائی۔

شاہ محمد قاسم صاحبِ تصانیف ہیں۔ 'اسرار قاسمی' اور 'اعجازِ غوثیہ' فارسی میں لکھیں۔ 'اسرار قاسمی' کا اُردو ترجمہ مفتی انعام اللہ نے کیا ہے۔ شاہ صاحب نے اُردو میں 'نجات قاسم' تصنیف کی ہے جس میں سیّدنا امیر ابوالعلا کے حالات وکرامات کا ذکر ہے۔ ۱۸۵۷ء ﴿۱۲۷۳ھ﴾ میں بمقام نینی تال لکھی ہے، اور مطبع اشرف الاخبار آگرہ میں اسی سال چھاپی گئی ہے۔

'نجاتِ قاسم' کا نمونہ مختلف مقامات سے یہ ہے:-

"یہ کاتب گنہگار جب پہلے پہل شہر اکبر آباد میں حاضر ہوا ہے تو سال بارہ سو اکسٹھ ہجری تھا۔ جس وقت روضہ منورہ پر حاضر ہو کر بعد قدمبوسی اور فاتحہ کر کے، آنکھیں بند کر کے پائیں مزار شریف کے بیٹھا معا کانوں میں یہ آواز آئی کہ کوئی شخص کہتا ہے کہ حضرت کے انتقال کے پورے دوسو(۱) برس بعد تو زیارت سے مزار انور کے مشرّف ہوا۔"

"جس روز یہ کاتب عاصی صدر دیوانی کی کچہری کے ساتھ بلدہ متبرکہ اکبر آباد میں پہونچا اس کی صبح کو مکان فرودگاہ سے بتمنائے زیارت روضۂ منورا پنے پیشوا حضرت امیر ابوالعلا قدس سرہٗ کے چلا، مگر جو کہ اس وقت تک شہر کے محلوں اور سوادِ شہر سے محض نا بلد تھا، اور جو آدمی ہمراہ تھے وہ بھی بالکل ناواقف تھے۔ گونہ تردّد ہوا، پھر یہ خیال کیا کہ شہر سے باہر نکل کر کسو سے راستہ درگاہ شریف کا پوچھ لیں گے۔ جب چار سو دروازے سے آگے بڑھا ہنوز نوبت پوچھنے کی کسو سے نہیں پہونچی تھی کہ دو لڑکے نہ معلوم کدھر سے آکے میری پالکی کے ساتھ ہوئے اور خود بخود پوچھنے لگے کہ تم اتّو لالا کی درگاہ پر جاؤ گے۔ فائدہ۔ واضح ہو کہ شہر اکبر آباد کے بازاری لوگ اور سب لڑکے ہمارے حضرت کو اتّو لالا کہتے ہیں، اور یہ لفظ ان کی زبان

---

(۱) حضرت سیّدنا امیر ابوالعلاء رحمۃ اللہ کا وصال ۱۰۶۱ھ ﴿۱۶۵۱ء﴾ زمانہ شاہجہاں میں ہوا ہے۔ حضرت کی ولادت ۹۹۰ھ ﴿۱۵۸۲ء﴾ میں بعہد شہنشاہ اکبر ہوئی۔

سے اتنا پیارا معلوم ہوتا ہے کہ لطف اس کا تحریر میں نہیں آسکتا......"

حضرت ابوالعلاءؒ کے حالات میں لکھتے ہیں:-

"جاننا چاہیے کہ جب حضرت خواجہ فیضی قدس سرہٗ کسو لڑائی میں شہید ہو گئے تب راجہ مان سنگھ نے اس عہدۂ نظامت پر بردوان کے جناب حضرت امیر ابوالعلاء قدس سرہٗ کو مقرر کر کے منصب سہ ہزاری ذات اور سہ ہزاری سوار کا بادشاہ کے حضور سے دلوایا۔ آپ کے پاس اسباب تجمل اور شوکت کا از قسم ہاتھی گھوڑے اور اونٹ اور رتھ وغیرہ سامانِ اُمرائی بہت تھا۔ چنانچہ نقل ہے کہ بعد ترک دنیا اور جلوہ افروزی مسند فقر درویشی کے بھی یہ حال تھا کہ جب کبھی آپ شکار کو تشریف لے جاتے تو بیالیس نفر صرف باز دار ہم رکاب فیض اکتساب کے ہوتے تھے۔ اور سامان کو اسی پر قیاس کرنا چاہیے۔ الغرض راجہ مان سنگھ باوصف ایسے احتشام ظاہری کے کہ تمام قلمرو بنگالہ کا مالک اور حاکم تھا، حضرت کی اس قدر تعظیم و تکریم کرتا تھا کہ اپنی مجلس میں جمیع امراء بلکہ اپنے فرزندوں سے بھی بالاتر جگہ آپ کو دیتا تھا۔

مفتی اکرام اللہ صدیقی: مفتی انعام اللہ صدیقی گوپاموی کے فرزند رشید تھے۔ ۱۸۳۵ء ﴿۱۲۵۱ھ﴾ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد اور علمائے عصر سے اکتساب علم کیا۔ ڈاکٹر مکند لال اکبر آبادی سے ڈاکٹری پڑھی پھر مختاری کا امتحان پاس کر کے الٰہ آباد میں مختار رہے۔ تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا۔ متعدد کتابیں فارسی اور اُردو میں لکھیں۔ مثلاً 'علمائے اودھ'، 'اخبار واصلین'، 'تذکرۂ مصنفین'، 'قواعد اُردو فارسی جدید'، 'مفید الطلاب'۔

ان میں 'تصویر شعراء' خاص چیز ہے۔ اسی زمانے میں آگرہ شعرائے شہر و بیرونِ شہر کا اچھا خاصا مرکز بن گیا تھا۔ اکثر شعر و شاعری کے چرچے رہتے تھے۔ مولوی غلام امام شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات نے اس میں عجیب روح پھونک دی تھی۔ چنانچہ ۱۸۶۱ء ﴿۱۲۷۷ھ﴾ میں بابو بینی پرشاد وکیل صدر کے مکان پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کے سخنوروں کے کلام و حالات مفتی اکرام اللہ صاحب نے مرتب کیے، اور اس گلدستہ کا تاریخی نام 'تصویر شعراء' (۱۲۷۷ھ) رکھا۔ ۱۸۶۱ء میں مرزا علی حسین قیصر کے

مطبع حیدری میں طبع ہوا۔ اس کی تمہید مختصر کر کے درج کی جاتی ہے:۔

بشنو از انصاف اگر مقبلی	شعر بود حُجت روشن دلی
در شرف شعر رسولؐ خدا	گفت بے قول بمدح و ثنا
شعر کہ اصحاب نبی گفتہ اند	چون دُر و یاقوت و گہر سفتہ اند
شعر علیؑ گفت و حسینؑ و حسنؑ	کعبؓ و انسؓ گفت و اویسؓ قرن
شعر کہ حسانؓ عرب گفتہ است	سیّد کونینؐ پذیر رفتہ است
منع ز اشعار نکردش نبیؐ	تائب ازاں کار نکردش نبیؐ
بلکہ بر او کرد ہزار آفریں	سیّد کونین رسولؐ امیں

سخنورانِ معنی آفرین پر واضح اور آشکارا ہے کہ سخن کی قدر افزائی کے لئے طبع سلیم اور ذہن فہیم درکار ہے۔ سخنور کو ہمیشہ سخنداں کی جستجو ہے، کس واسطے کہ گوہر کی جوہر شناس سے قدر اور آبرو ہے۔

نرسد ہیچ کمالے بہ سخن سنجیدن	کہ سخن را صلۂ نیست بجز فہمیدن

جو لوگ اس قاعدے کو نہیں مانتے ہیں، وہ آپ اپنی قدر نہیں جانتے ہیں۔ بیشک سخن کی تمیز کے لئے مخاطب معنی فہم درکار ہے۔ اپنی ستائش اپنی زبان سے کب سزاوار ہے۔ شاعر جب تک سخن فہم سے داد نہ پائے گا اپنے موہنہ میاں مٹھو کہنے سے سخن گو نہو جائے گا۔ بیت

طوطی ز معنی سخن خویش غافل است	ہر کس سخنور است سخنداں نمی شود

اس نظر سے شعرائے فخر البلاد اکبر آباد کو اہل جوہر جوہر شناس کی جستجو اور سخنور سخن فہم کی آرزو رہتی ہے۔ الحمدللہ کہ دعائے باطنی نے مدعائے دلی کی صورت دکھائی، اور بعد عرصہ دراز کے مراد اُن کی باحسن وجوہ برآئی کہ ان دنوں بحسن اتفاق جناب برگزیدہ آفاق جوہر آئینہ کمال، صورت گر حسن و جمال، معنی آفریں نازک خیال ۔ نکتہ سنج، عدیم المثال، استاد یکتا، امام الشعراء فاضل وحید مولانا غلام امام شہید مدظلہم اور سخنور شیریں مقال، معنی سنج نازک خیال (۱)...... برادر گرامی قدر منشی غلام غوث صاحب بیخبر، میر منشی نواب مستطاب لفٹنٹ گورنر بہادر اس شہر میں رونق افروز ہوئے۔ ہر طرف ان کے مقدم سعید سے عید ہوگئی

---

(۱) چار پانچ سطریں مدحیہ الفاظ کی تھیں وہ چھوڑ دی ہیں۔

خاص و عام فیض یاب اور مسرت اندوز ہوئے۔ معنی پروران سخنور نے موقع وقت غنیمت سمجھ کر اس بات کا ارادہ کیا کہ کلام ہمدگر سے چاشنی گر مذاق ہوں، اور جوہر طبع آزمائی دکھائیں۔ یہ بات سنتے ہی انجمن آرائے سخن و معانی، رموز شناس اسرار یخندانی سر دفتر ارباب ہنر، جوہر شناس صاحب جوہر، نوبادہ گلشن مراد بابو بینی پرشاد صاحب عالی قدر وکیل عدالت صدر زاد حشمتہٗ نے اپنے دولت خانہ فیض کاشانہ کو فروش منقش اور مصفا اور کنول جھاڑ و، مردنگیاں، دیوار گیریاں، فانوس اور مرأت حیرت افزا سے جسے دیکھ کر آفتاب و مہتاب پھڑک جاوے اور پردہائے رنگا رنگ گل ہائے بوقلموں عطریات گونا گوں سے جس کی خوشبو سے چمن زار بہشت مہک جاوے، پیراستہ کر کے صلائے عام دی، اور ارباب ذوق و شوق کو خبر کی کہ نکتہ وران صیح نفس اور سخن سنجان دقیقہ رس تشریف لاویں، ہم کو مرہون منت فرماویں۔ پس تمام شہر میں اس مشاعرہ کی شہرت ہوئی، عجب طرح کی رنگین صحبت ہوئی .... یہ مجموعہ اس مجمع کا جامع کلام ہے، "تصویر شعرا" اس کا تاریخی نام ہے۔"

کلام شعرا کا بھی نمونہ دکھایا جاتا ہے۔ طرحی و غیر طرحی غزلوں کے علاوہ چار پانچ شاعروں نے بانی مشاعرہ بابو بینی پرشاد صاحب کی مدح میں رباعیاں بھی پڑھی تھیں۔ ان میں سے مرزا عباس بلیغ اکبر آبادی کی رباعی درج کی جاتی ہے:۔

بابو کا ہے دل حُبِ علی سے آباد	ہے دوستی علی سے ہر دم دل شاد
اس "دوستی علی" کے گن لو اعداد ۵۹۰	ہے ہم عدد اس سے "بابو بینی پرشاد" ۵۹۰

طرحی غزلوں کا مختصر انتخاب یہ ہے:۔

اسیر میر گلزار علی خلف و جانشین میاں نظیر اکبر آبادی:۔

ساقیا ہوش میں آ ظرف کو دیکھ، آنکھیں کھول	ان تنگ ظرفوں کو اتنا نہیں بھر دیتے ہیں
آنکھ اپنی سر محفل نہیں ملنے پاتی	دیکھتے ہیں وہ کدھر، جام کدھر دیتے ہیں

باطن۔ حکیم سیّد قطب الدین اکبر آبادی:۔

راز داران حقیقت کے لبوں پر ہے مہر	خود خبردار ہیں وہ کس کو خبر دیتے ہیں

بہادر۔ بابو رن بہادر سنگھ:۔

اے مسیحا ترے بیمار شب ہجراں کو — جام خورشید میں تبرید سحر دیتے ہیں
دل بھر آتا ہے، اب خیر نہیں عالم کی — آج طوفاں کی خبر دیدۂ تر دیتے ہیں

راجہ۔ مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر راجہ کاشی:۔

یار کے حسن پُر آشوب کی ہے دل میں جگہ — یہ وہ دریا ہے جسے کوزے میں بھر دیتے ہیں
راجہ یہ شوق اسیری ہے کہ مرغانِ قفس — اپنے منقار سے پر اپنے کتر دیتے ہیں

صغیر۔ لالہ گنگا سہائے:۔

اُڑ گئے ہجر کی شب، وصل کے دشمن میرے — آج آواز نہیں مُرغ سحر دیتے ہیں

مہر۔ میرزا حاتم علی بیگ مہر شاگرد ناسخ:۔

یہ نئی طرزِ مسیحائی ہے، سبحان اللہ — جان آجاتی ہے، وہ دم بھی اگر دیتے ہیں
ہم تو اللہ کو بھی یوں نہیں کرتے سجدہ — اے صنم سر کو ترے پاؤں پہ دھر دیتے ہیں

حکیم قطب الدین باطن: حکیم میر محمدی ظاہر کے فرزند، محلّہ تاج گنج آگرہ میں رہتے تھے۔ غالباً ۱۲۲۶ھ﴿۱۸۱۱ء﴾ میں پیدا ہوئے۔ اس لیے کہ تذکرہ 'شعر وسخن' مرتبہ نیاز علی پریشان میں (جو ۱۲۸۶ھ میں لکھا گیا ہے، اور جس کا ذکر اس کے بعد آتا ہے) حکیم باطن صاحب نے اپنی عمر ۶۰ سال بتائی ہے۔ حکیم صاحب کے اسلاف طبیب شاہی رہے ہیں۔ انھوں نے عربی و فارسی میاں نظیر اکبرآبادی سے حاصل کی۔ شاعری میں بھی انھیں کے شاگرد تھے۔ حکیم صاحب کے دادا حکیم سیّد واجد علی اکبرآبادی حضرت مولانا فخر الدین قدس سرّہٗ کے خلیفہ خاص تھے۔ اور حکیم صاحب خود حضرت سیّد غلام نصیر الدین دہلوی عرف ''میاں کالے'' (۱) کے مُرید تھے۔ اپنے پیشہ آبائی طبابت کے سلسلے میں صاحبزادہ محمد یٰسین خلف ٹیپو سلطان شہیدؒ کی سرکار سے وظیفہ پاتے تھے۔

باطن صاحب نے چار دیوان، ایک مثنوی اور مختلف منظومات یادگار چھوڑی ہیں،

---

(۱) حکیم مومن خاں دہلوی نے میاں صاحب کے نام کا کیا خوب سجع کہا ہے:۔ ''ہردم نام میاں کالے''

اور ایک عجیب وغریب پُر گوئی کا ثبوت یہ دیا ہے کہ تمام 'مثنوی میر حسن' کا خمسہ کر دیا ہے، اور اس کا نام 'اعجاز رقم' رکھا ہے۔ یہ سب نظم کی تصانیف ہیں۔ ایک نثر کی تصنیف تذکرہ 'گلستانِ بے خزاں' ہے جو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے 'گلشنِ بے خار' کے جواب میں لکھی ہے۔ چنانچہ حکیم باطن اپنے تذکرہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

خامہ نے جب دیا جواب سوال	روبرو رکھ کے ''گلشنِ بے خار''
منصفانِ زمانہ کہنے لگے	ہے ''گلستانِ بے خزاں'' میں بہار
بُلبلِ فکر پھر تو اے باطن	چہچہایا یہ کھول کر منقار
نام تاریخی اس شگوفے کا	''نغمۂ عندلیب''، کہہ اے یار
	۱۲۶۱ھ

نواب شیفتہ کے ساتھ حکیم باطن کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ شیفتہ نے اپنے تذکرہ ''گلشنِ بے خار'' میں میاں نظیر اکبر آبادی کے متعلق یہ رائے لکھی تھی:۔ ''اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقین جاری ست و نظر برآں ابیات در اعداد شعرا نشاید ش شمرد''...... یعنی میاں نظیر کے اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر جاری ہیں۔ ان اشعار کی بنا پر نظیر شاعروں میں شمار ہونے کے لائق نہیں۔

میاں نظیر حکیم باطن کے استاد تھے۔ اس لیے حکیم صاحب کو شیفتہ کی رائے نہایت ناگوار ہوئی۔ شیفتہ کے تذکرے کے مقابلے میں اپنا تذکرہ لکھ ڈالا۔ اور اس میں جہاں موقع پایا شیفتہ، شیفتہ کے استاد مومن کو، شیفتہ کے احباب آزردہ وغیرہ کو خوب بُرا بھلا کہا۔ شیفتہ نے آزردہ کی بڑی تعریف کی ہے، اس لیے باطن نے آزردہ کی ہجو ملیح وصریح دونوں لکھیں۔ ان کے اشعار میں اصلاحیں دیں، ان کے بعض الفاظ کو غلط بتایا اور اس پر بڑا طومار لکھا۔ گویا حکیم باطن صاحب نے اپنا تذکرہ اسی کام کے لیے لکھا تھا۔

حکیم صاحب نے تذکرہ 'گلستانِ بے خزاں' میں بے مزہ عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کی ہے۔ اس لیے طویل نمونہ درج کرنا بے لطف ہوگا۔

حمد باریِ تعالیٰ عزّ اسمہٗ صنعت براعۃ الاستہلال یا تلازمۂ شعر وشاعری کے ساتھ

لکھتے ہیں:-

''مطلع انوار انواع صفات، حسنِ مطلع تجلیات غزل کائنات، حمد اس شاعر یکتا کی ہے، جس نے بے مدد استاد، بوقلموں مضامین، بیت الغزل عالم میں بحسن حسن مقطع از مطلع تا مقطع ایک فکر کے بیاض عدم سے لاکر قلمِ قدرت سے صفحۂ دیوان وجود پر لکھیں۔''

تذکرے میں حکیم مومن خاں دہلوی کا حال اس طرح شروع کرتے ہیں:-

''مومن تخلص، مومن خاں نام ساکن شاہ جہاں آباد، شاگردانِ سخن کے استاد، اگر نور باف سحر بیاض فکر دیکھے تو صحن خانہ سے کوچ کر جائے۔ کشش الفاظ سے اس کے ہوش میں خرابی پائی جائے۔ رشتۂ جاں تار تار ہو، رشک مضمون سے ہر شاعر ہاتھ مل مل کے بیقرار ہو۔ کلام میٹھا ایسا گاڑھا کہ جس کی حیرت سے شیریں زبان مثل کوہ کن کے شور مچائیں۔ نشہ شراب الفاظ سے مخموران خمخانۂ سخن دستار کو ہوا میں اُڑائیں۔''

تذکرے کے اعتبار سے یعنی انتخاب کلام، حالات و تنقید میں حکیم باطنؔ کا 'گلستانِ بے خزاں' یا 'نغمۂ عندلیب' بالکل ہیچ و پوچ ہے۔ شیفتہ نے اپنے تذکرے میں بہترین اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ باطنؔ نے جہاں اس کے علاوہ اپنا انتخاب دیا ہے، نہایت معمولی ہے۔ باطن سخن سنجی سے بالکل عاری ہیں۔ اسی لیے ان کا تذکرہ آج کسی گنتی میں نہیں۔

نیاز علی پریشاںؔ: خلف شیخ رجب علی۔ شیخ صدیقی تھے۔ ان کے اسلاف قدیم دہلی کے تھے، جو سعادت خاں بُرہان الملک کے ساتھ دہلی سے اودھ گئے اور سندیلہ کو مسکن بنایا۔ لیکن پریشاںؔ کے قریبی بزرگ آگرہ آگئے۔ ان کی ولادت و تربیت آگرہ ہی کی ہے۔ پریشاں مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کے شاگرد تھے۔ مثنوی، واسوخت، غزل، قصیدہ سب کچھ کہا ہے لیکن ان کی بہترین یادگار 'تذکرہ شعر و سخن' ہے۔ اس کی ترتیب ان کو بالیقین حکیم قطب الدین باطنؔ کے تذکرے کو دیکھ سُن کر سوجھی ہوگی۔ لیکن اس پر بہت اضافہ کیا اور ترتیب کے لیے بڑا اہتمام کیا۔ یعنی ۱۶ / اکتوبر ۱۸۶۹ء ﴿۱۰/ رجب ۱۲۸۶ھ﴾ کو آگرہ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کرنے کا ارادہ کیا، اور کئی مہینے پہلے اس کا اعلان تقسیم کیا اور اخباروں میں چھپوایا،

یہاں تک کہ ہندوستان سے باہر بھی اس کی خبر پہنچ گئی۔ چنانچہ فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے اپنے خطبہ ۱۸۶۹ء میں اس مشاعرے کا ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

''ایک بڑا مشاعرہ آگرہ میں ۱۶ر اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ہونے والا تھا۔ اودھ اخبار مؤرخہ ۲۸ر ستمبر ۱۸۶۹ء میں ان شعرا کے لیے ہدایات کا اعلان شائع ہوا ہے جو اس مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔''

(از خطبات گارساں دتاسی۔ ص ۸۰۲ مطبوعہ انجمن ترقی اُردو)

پریشاںؔ نے مشاعرے کے اشتہار میں ایک نقشہ درج کیا تھا، اور شرکائے مشاعرہ سے اس کی خانہ پُری کی درخواست کی تھی۔ خانے یہ تھے: نام شاعر، تخلص، ولدیت، نام استاد، مدّت شاعری، استاد زندہ ہیں یا نہیں، سکونت قدیم و جدید، تصنیفات، حالات۔ اشتہار میں مشاعرے کی غرض پریشاںؔ نے یہ لکھی ہے:۔

''غرض اس جلسہ دلچسپ سے یہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شہروں یا قصبوں کے مشاعروں کا حال مفصل ایک خاص تذکرے میں واسطے یادگاری کے لکھا جاوے، تا کہ اس طرح واحد کے ذریعہ سے ان کی فکر کا نتیجہ ظاہر ہو۔''

یہ مشاعرہ مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ کاشی کے مکان واقع کشمیری بازار آگرہ میں منعقد ہوا۔ اس کا حال پریشاںؔ لکھتے ہیں:۔

''استی شاعروں نے اپنی اپنی غزلیں بعد ایک دوسرے کے بہت صفائی کے ساتھ پڑھیں۔ مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہرؔ جب پڑھ چکے تو خلیفہ سید گلزار علی صاحب اسیرؔ نے پڑھ کر لوگوں کو محظوظ کیا۔ اس کے بعد جناب راجہ صاحب بہادر نے کلام دلآویز سنایا۔ آفتاب طلوع ہو گیا تھا۔ مشاعرہ برخاست ہوا۔''

دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

''اب سنئے کہ ایک روز جی نے چاہا کہ کوئی ایسا کام کیجیے جس سے نام باقی رہے۔ مگر یہ فقیر بادشاہ نہ تھا کہ رعایا پر رحم کرتا، غنی نہ تھا کہ محتاجوں کو مال و زر دیتا، زور آور نہ تھا کہ رُستم کی طرح گُرز اٹھاتا، سپاہی نہ تھا کہ تیر و شمشیر کے وار دکھاتا، صاحبِ کرامت نہ تھا کہ کشف سے کرشمے ظاہر کرتا، عالم نہ تھا کہ جھگڑے چکاتا، سخی نہ تھا کہ ایثار کرتا، حکیم نہ تھا کہ معالج ہوتا، شاعر تھا، جھوٹ سچ بکتا تھا۔ پھر کون سی صورت نام باقی رہنے کی تھی۔ غزل، رباعی، مثنوی، واسوخت، مخمس، مسدس وغیرہ کہنے والے کہہ گئے،

کسی نے کوئی بات اُٹھا نہ رکھی۔ نہ مضمون آرائی، نظم ونثر کی صفائی مجھ سے کب بن پڑتی ہے۔ بالفرض دو چار شعر سرمت کر کہے تو کیا کہے۔ اس پر فخر کرنا نرا اوچھا پن ہے۔ وضع میں دھبا لگتا ہے۔ سب سے قطع نظر کر کے یوں ٹھہرائی کہ ایک تذکرہ نئی طرز کا تالیف ہو تو کیا خوب ہو۔ پھر یہ بھی خیال ہوا کہ تذکرے تو بہت سے ہیں، محمد نیاز علی تم کیا تدبیر کرو گے؟ بھی ایسا کرو کہ تذکرہ بطور مشاعرے کے مرتب ہو، جس میں زمانہ حال کے سخن وروں کا کلام خواہ فارسی، خواہ اُردو، ایک ہی طرح پر لکھا جاوے۔ غرضیکہ نیا پہلو یہ نکالا کہ طرح زیر طبیعت کے آزمانے کی کسوٹی ہوتی ہے، کھوٹا کھرا پرکھا جاتا ہے، قافیہ اور ردیف کی نشست، بندش اور ترکیب کی خوبی، الفاظ اور معانی کی درستی، مضمون اور محاورہ کی چستی معلوم ہو جاتی ہے۔ خیر ان باتوں کو سوچ سمجھ کر استاد نامدار جناب مرزا صاحب گردوں وقار سے کہا، انھوں نے فرمایا، ہاں بات تو ٹھیک ہے، ضرور تدبیر کرو۔ لاؤ طرح کہہ دیں، شاعر پسند کرلیں۔ چنانچہ مصرع طرح اُردو کا فرمایا۔

تری دیوار کے سائے تلے آکر ہما ٹھہرے

دوسرا مصرع میرے بڑے مہربان مولوی احمد خاں صاحب تخلص صوفی نے تجویز کیا، وہ یہ ہے۔

در سرم از نکہت زلف است سودائے دگر

فارسی کا مصرع کیا شگفتہ ہے اور اُردو کا بہت پہلو دار، قافیہ وسیع، بحر رواں، تمام حسن رکھتا ہے۔ ایک اشتہار میں دونوں مصرعے مع ایک نقشہ مجوزہ مؤلف کے لکھ کر جابجا بھیجے گئے۔"

پریشان کو تذکرہ کا تاریخی نام 'شعر وسخن' (۱۲۸۶ھ) خوب ہاتھ آیا ہے۔ اس تذکرہ میں شعرائے آگرہ کی فارسی و اُردو غزلیں ایک سو ایک ہیں۔ باہر کے شاعروں میں الٰہ آباد کی ۱۴ غزلیں درج ہیں۔ جن میں اعظم علی اعظم شاگرد خواجہ آتش لکھنوی، اور منیر شکوہ آبادی ممتاز ہیں۔

شعرائے آگرہ میں بعض سن رسیدہ وکہنہ مشق ہیں۔ لیکن اکثر نوجوان وکم سن ہیں۔ بعض شاعروں نے غالب کو اپنا استاد بتایا ہے۔ مثلاً مدد علی تپش۔ شیخ عبدالمجید رسوا۔ رسوا نے اپنے حال میں لکھا ہے کہ "ایک مدت جناب میرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب کی خدمت میں رہ کر نظم ونثر فارسی کی مہارت کی۔" یہ مشاعرہ غالب کے انتقال سے آٹھ مہینے

بعد ہوا ہے۔

ایک ضروری عرض

'داستان تاریخ اُردو' میں مولانا عبدالحق خیر آبادی کے حالات کے ضمن میں مولانا فضل حق خیر آبادی کا ذکر ملتا ہے اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے سلسلے میں والد صاحب قبلہ نے ایک "دلچسپ لطیفہ" لکھا ہے۔ اور اس کا حوالہ دیا ہے "ماخوذ از فضلائے ہند مرتبہ مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب۔" وہ لطیفہ راقم الحروف (خالد حسن) نے کتاب کے متن سے حذف کر دیا ہے۔ اس کی تفصیلات دینے سے پہلے وہ لطیفہ نقل کیا جاتا ہے۔

"......مولوی فضل حق کے قیام لکھنؤ کے زمانے کا ایک لطیفہ بہت دلچسپ ہے جو حضرت قبلۂ عالم مولانا الحاج پیر سید جماعت علی شاہ صاحب امیر الملت محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا کہ جس زمانے میں مولوی فضل حق صاحب لکھنؤ میں مقیم تھے منشی نولکشور نے ان کی خدمت میں درخواست کی کہ اوقاتِ فرصت میں مطبع کی عربی کتابوں کی صحت کتابت فرمایا کریں۔ مولانا فضل حق نے قبول کر لیا۔ ایک مرتبہ مجتہد العصر لکھنؤ کی ایک مناظرہ کی کتاب مطبع نول کشور میں طبع ہونے کے لیے آئی۔ اس کی کاپیاں تصحیح کے لیے مولانا فضل حق کے پاس آئیں۔ آپ کتابت کی تصحیح بھی کرتے جاتے تھے اور مجتہد صاحب کے اعتراض کا جواب حاشیہ پر لکھتے جاتے تھے۔ جب کتاب چھپ کر مجتہد العصر کے پاس پہنچی تو انھوں نے سر پیٹ لیا کہ تمام عمر کی کمائی برباد گئی۔ اور منشی نول کشور سے دریافت کیا۔ انھوں نے اصل واقعہ بیان کر دیا۔ آخر مجتہد العصر صاحب نے کتابوں کے انبار میں آگ لگوا دی۔"

راقم الحروف (خالد حسن) نے اس لطیفہ کو اصل کتاب سے نکال دیا ہے کیونکہ یہ بات بالکل بے اصل اور غلط ہے۔

مولانا فضل حق خیر آبادی غدر میں انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کے ساتھ تھے۔ فتح دہلی کے بعد جب انگریزوں کا دوبارہ تسلط ہوا اور انھوں نے گرفتاریاں شروع کیں تو مولانا فضل حق کو بھی گرفتار کر لیا اور بغاوت اور غداری کے الزام میں مقدمہ قائم کیا گیا۔

گرفتاری اور مقدمات کا سلسلہ ۱۸۵۹ء تک چلتا رہا اور آخر کار انھیں بغاوت کے الزام میں ۱۸۵۹ء میں حبسِ دوام بعبور دریائے شور "کالے پانی" بھیج دیا گیا۔ وہ FIRE QUEEN نامی جہاز پر سوار کر کے انڈمان بھیج دیے گئے ان کا جہاز ۸/ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پورٹ بلیئر پہنچا۔ جہاں ۲۰/ اگست ۱۸۶۱ء (۱۲/ صفر ۱۲۷۸ھ) کو وفات پائی۔

یہاں ہم نے بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ تفصیلی حالات کے لیے مالک رام صاحب کا مضمون مولانا فضل حق خیر آبادی دیکھیے۔

ایک بات بالکل واضح ہے کہ گرفتاری سے لے کر (۱۸۵۹) جلاوطنی تک امکان سے خارج ہے کہ مولانا کسی قسم کا کام یا تصحیح کتابت وغیرہ کا کام کر سکتے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ مطبع نول کشور لکھنؤ میں ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا۔ امکان عقلی اس بات کا ہے کہ مولانا فضل حق کو علم تک نہ ہو کہ لکھنؤ میں نول کشور نامی کوئی مطبع ہے۔ وہاں نول کشور کا درخواست کرنا اور ان کا عربی کتاب کی کتابت کی تصحیح کرنا محض افسانہ ہے۔ یہ معلومات کہ مولانا کو انڈیمان جلاوطن کب کیا گیا اور لکھنؤ میں مطبع نول کشور کس سنہ میں قائم ہوا والد صاحب قبلہ کی خود اپنی تحریر میں موجود ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنی کتاب میں یہ باتیں درج کرنے کے بعد مجتہد العصر والی بات کی تنقیح آپ نے کیوں نہ فرمائی اور اسے کیوں خارج نہ کیا۔

ہماری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ جس زمانے میں والد صاحب 'داستان تاریخ اُردو' تالیف کر رہے تھے تو اس زمانے میں مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب برابر ان کے پاس آتے جاتے رہتے تھے اور والد صاحب نے "دیباچہ" میں لکھا ہے:-

> "احباب میں اتفاق سے مجھے ایک ہی صاحب سے ممنون ہونے کا موقع ملا۔ یعنی مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی صدیقی گوپاموی ثم اکبر آبادی کا۔ آگرہ میں مفتی صاحب اپنے علمی و تصنیفی ذوق وشوق میں انفرادی مرتبہ رکھتے ہیں انھوں نے اپنے کتب خانے سے مجھے مطبوعہ و قلمی کتابیں اور مصنفوں کے حالات و نمونے مرحمت فرمائے......"

میں اس زمانے میں اسکول کی چھوٹی جماعت میں پڑھتا تھا اس لیے اس قسم کی ادبی

سرگرمیوں اور معلومات سے دور تھا۔ لیکن مفتی صاحب کو اپنے بزرگوں میں شمار کرتا تھا۔ اس زمانے میں آگرے کی ایک ادبی شخصیت جناب محمد رحیم چمن دہلوی کی خدمت میں میرا آنا جانا تھا۔ ایک دن محمد رحیم صاحب نے بر سبیل تذکرہ کہا کہ ''میاں مفتی صاحب آئے تھے وہ کہتے تھے کہ آپ کے والد صاحب کوئی ادبی تاریخ لکھ رہے ہیں اور میں ان کو حوالہ جات فراہم کرتا ہوں۔ مفتی صاحب کی شہرت اس معاملے میں اچھی نہیں ہے اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ خود ساختہ حوالے اور واقعات لکھ دیتے ہیں۔''

یہ بات میں نے والد صاحب قبلہ سے عرض کردی۔ انھوں نے فرمایا کہ میں ان کے حوالے پرکھ لیتا ہوں اور اچھی طرح دیکھے بغیر قبول نہیں کرتا۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مفتی صاحب نے بعض حوالے دیے ہوں گے جنھیں والد صاحب قبلہ نے قبول نہیں کیا۔

اب مفتی صاحب نے عجیب زیرکی سے کام لیا۔ یہ بات مفتی صاحب پر روشن تھی کہ والد صاحب قبلہ مولانا مولوی حامد حسن صاحب قادری اور چچا صاحب مولانا مولوی عابد حسن صاحب فریدی سلسلۂ نقشبندیہ میں حضور قبلۂ عالم محدث علی پوری سے بیعت ہیں۔ دونوں بھائی ان کے خلیفۂ مجاز بھی تھے۔ اور ہر ہفتہ سلسلۂ نقشبندیہ کا ذکر ہمارے ہاں منعقد ہوتا تھا۔ مفتی صاحب کو یہ بھی علم تھا کہ یہ حضرات فنافی الشیخ کا درجہ رکھتے ہیں۔ جب والد صاحب نے ان کے بعض حوالوں کو قبول نہیں کیا تو انھوں نے ایک فرضی حکایت گڑھی اور زیرکی سے اسے ان کے پیر و مرشد کی زبانی بیان کردیا۔ والد صاحب قبلہ کا حال یہ تھا کہ:-

عاشقاں راچہ کار با تحقیق
ہر کجا نامِ اوست قربانیم

ان کے پیر و مرشد کا اسمِ گرامی آجانے کے بعد ان کو شک وشبہ کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس ''لطیفہ'' کو بیان کردیا اور خود اپنی تحریروں پر بھی غور نہ فرمایا کہ ان سے ہی اس لطیفے کی تکذیب ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالٰی مفتی انتظام اللہ شہابی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ اس طرح

کی بہت سی ادبی غلط بیانیاں انھوں نے کی ہیں۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی : مولانا عبدالحق کے دادا مولوی فضل امام خیرآبادی تھے جن کی تصنیف 'مرقات' علم منطق میں آج تک شامل درسیات ہے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ریاست پٹیالہ میں ملازمت کی۔ پھر دہلی میں صدر الصدور رہے۔ ۱۸۴۲ء ﴿۱۲۵۹ھ﴾ میں وفات پائی۔ ان کے فرزند مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔ جو ۱۷۹۷ء ﴿۱۲۱۲ھ﴾ میں پیدا ہوئے۔ مرزا غالبؔ کے بالکل ہم عمر تھے اور بڑے مخلص اور بے تکلف دوست۔ علوم معقول اپنے والد سے حاصل کیے، اور علم حدیث حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے۔ دہلی میں سررشتہ دار رہے۔ پھر جھجر، الور، ٹونک کی ریاستوں میں ممتاز عہدوں پر رہے۔ لکھنؤ میں بھی صدر الصدور رہے۔ ریاست رامپور میں نواب یوسف علی خاں نے بلایا اور تلمذ اختیار کیا۔ نواب کلب علی خاں نے بھی کچھ پڑھا۔ بڑے عالم متبحر تھے، اور عربی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر۔ ہندوستان میں ان کا جواب نہ تھا، بلکہ عرب کے شعرائے معاصرین سے بھی تحسین حاصل کی۔ کثیر التصانیف تھے، عربی میں درجنوں کتابیں اور حاشیے لکھے ہیں۔

سرسیّد احمد خاں نے 'آثار الصنادید' میں اور منشی امیر احمد مینائی نے 'انتخاب یادگار' میں مولانا فضل حق کے عربی قصائد کا انتخاب درج کیا ہے۔ ۱۸۵۹ء میں جب غدر کے بعد انگریزوں کا تسلط ہو گیا، تو اور لوگوں کے ساتھ مولانا فضل حق پر بھی جرمِ بغاوت عائد کیا گیا، اور حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم صادر ہوا، لیکن مولانا کے فرزند ثانی اور منشی غلام غوث بیخبر نے مقدمہ کی پیروی جاری رکھی، اور آخر رہائی کا حکم حاصل کر لیا۔ لیکن ''تا تریاق از عراق'' والا مضمون صادق آیا جس وقت پروانۂ آزادی رنگون پہنچا اسی وقت مولانا کا جنازہ نکل رہا تھا۔ ۱۸۶۱ء ﴿۱۲۷۸ھ﴾ میں وفات پائی اور رنگون میں سپرد خاک ہوئے۔

مولانا عبدالحق ان کے فرزند اکبر تھے۔ ۱۸۲۸ء ﴿۱۲۴۴ھ﴾ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد سے تحصیل علوم کی۔ ۱۶ سال کی عمر میں سندِ فضیلت حاصل کر کے درس و

تدریس میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دنوں ٹونک میں رہے۔ پھر نواب کلب علی خاں نے رامپور بلا لیا، اور اپنے پوتے نواب حامد علی خاں کا اتالیق مقرر کیا۔ ۱۸۶۵ء ﴿۱۲۸۱ھ﴾ سے ۱۸۸۶ء ﴿۱۳۰۴ھ﴾ تک یعنی نواب کلب علی خاں کی تمام مدتِ حکومت رامپور میں رہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد کلکتے گئے، وہاں حاکم مرافعہ اور مدرسہ عالیہ کے افسر رہے۔ شمس العلماء کا خطاب پایا، وہاں سے ۱۸۹۶ء ﴿۱۳۱۴ھ﴾ میں نواب حامد علی خاں نے رامپور بلا لیا اور خود تلمذ اختیار کیا۔ یہاں سے بیمار ہو کر وطن خیر آباد گئے اور ۱۸۹۹ء میں انتقال کیا۔

مولانا عبدالحق خیر آبادی اپنے زمانے میں امام فلسفہ تھے۔ آپ کے شاگردوں میں سے متعدد نامور علماء نکلے۔ مولانا نے ۴۰ کے قریب کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے ایک کتاب 'زبدۃ الحکمۃ' اُردو میں لکھی۔ یہ منطق کی قدیم کتابوں میں ہے، اور ایک کامل فن کے قلم سے نکلی ہے۔ اس سے پہلے منطق کی ایک اور کتاب کا پتہ چلتا ہے، یعنی 'ترجمہ شمسیہ' مرتبہ سیّد محمد، مطبوعہ دہلی ۔۱۸۴۴ء لیکن وہ ترجمہ ہے اور اب ناپید۔ مولوی عبدالحق کی کتاب کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ مولوی نذیر احمد دہلوی نے بھی منطق میں ایک کتاب 'مبادی الحکمۃ' کے نام سے لکھی ہے۔ اسی زمانے میں اور لوگوں نے بھی منطق کے رسالے لکھے ہیں۔ ان کا نمونہ اس کے بعد دیا جاتا ہے۔

'زبدۃ الحکمۃ' میں مولوی عبدالحق صاحب نے علمائے سابق کا اختلاف اور ان پر اپنا محاکمہ بھی لکھا ہے۔ مختصر نمونہ یہ ہے:-

''جاننا چاہئے کہ علم دو قسم ہے، ایک تصوّر دوسرے تصدیق۔ اس واسطے کہ جو چیز جانی جاوے بغیر حکم کے، یعنی اثبات یا نفی کے ساتھ نہ ہو، بلکہ صرف معنی اور مفہوم اس چیز کا ذہن میں حاصل ہو، اس کو تصوّر کہتے ہیں۔ جیسا کہ ادراک زید کا یا قائم کا بغیر اس کے کہ حکم کیا جاوے زید پر ساتھ قائم کے۔ اور اگر جانی جاوے اس طور پر کہ حکم ہو اس پر اثبات یا نفی کا، اس کو تصدیق کہتے ہیں، جیسے جاننا زید قائم کے معنی کا اور یقین کرنا اس کا۔ اور تصدیق کی حقیقت میں اختلاف ہے، حکماء کے نزدیک تصدیق صرف حکم کا نام ہے اور تصوّر موضوع محمول کا اور ایسا تصوّر نسبتِ حکمیہ کا اس کی تحقیق کی شرط ہے، یہ

تصورات اس کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں۔ اس تقدیر پر تصدیق ادراک بسیط کا نام ہے۔"

منشی دیبی پرشاد سحرؔ (۱) بدایونی: منشی دیبی پرشاد سحرؔ بدایوں کے کائستھ خاندان سے تھے۔ اپنے زمانے کے مشہور ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ ۱۸۹۵ء میں اسی خدمت پر بدایوں میں تھے۔ وہیں ۱۸۹۶ء میں پنشن لی اور مولوی محمد ذکریا خاں ذکیؔ دہلوی (تلمیذ مرزا غالبؔ) سب ڈپٹی انسپکٹر کو چارج دیا۔ نہایت ذی جوہر، صاحب ذوق آدمی تھے۔ پنشن لے کر اپنے وطن بدایوں میں مستقل قیام اختیار کیا تو مرتے دم تک اربابِ علم و ادب ہی سے صحبت رہی۔ ان کے مکان پر بھی ادیبوں اور شاعروں کا مجمع رہتا تھا۔ خود بھی شاعر تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کے جلسۂ تعزیت میں ایک مرثیہ لکھ کر پڑھا۔ 'سحر سامری' دیوان ان کی یادگار ہے۔ غالباً ۱۹۰۲ء میں انتقال کیا۔

دیوان غزلیات کے علاوہ مختلف مضمونوں پر بہت اور بہت اچھی کتابیں لکھی ہیں۔ ادب کے تمام فنوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ خوش نویسی پر ان کی 'ارژنگ چیں' اور 'نظم پرویں' اُردو میں بہترین کتابیں ہیں۔ بار بار شائع ہو چکی ہیں اور اب بھی ملتی ہیں۔ ایک کتاب املا اور رسم خط پر ہے: 'معیار الاملا (دوسری اشاعت ۱۸۹۷ء)۔ ایک تالیف 'معیار البلاغت' ہے جو ۱۸۶۶ء میں لکھی گئی تھی۔ جب سے ۱۹۳۳ء میں کئی بار چھپی۔ اس میں معانی، بیان، بدیع، عروض، قافیہ، اقسام نظم ونثر کے بیان میں اچھے باب ہیں۔ سحر کی دوسری تصنیف 'مرأۃ العلوم'، 'رکاز الفیوض' اور 'خلاصۃ المنطق' ہیں۔ 'خلاصۃ المنطق' ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا اور ۱۸۷۲ء میں مطبع نول کشور میں چھپا۔ اس کا نمونہ یہ ہے:-

"فصل چہارم بحث حجت میں۔ حجت تین قسم ہے۔ اول قیاس اور وہ استدلال ہے حال کلی کا حال جزئی پر۔ جیسے کل انسان حیوان ہیں۔ اور کل حیوان جسم ہیں، پس قیاس ہوا کہ کل انسان جسم ہیں۔

---

(۱) منشی دیبی پرشاد کے یہ حالات ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (الٰہ آباد یونیورسٹی) اور جناب محمد سلیمان صاحب بدایونی مہاجر کراچی نے خطوط میں لکھ کر مؤلف کو آگرہ بھیجے تھے۔

پس حال کُلّی یعنی حیوان سے حال جُزئی یعنی انسان پر دلالت ہوئی۔ دوم۔ استقرا یعنی استدلال حال جُزئی سے حال کُلّی پر جیسے ہر انسان وطیور و بہائم کھانے کے وقت نیچے کا جبڑا ہلاتا ہے، پس معلوم ہوا کہ سب حیوانات کھانے کے وقت نیچے کا جبڑا ہلاتے ہیں۔ یہاں حال جُزئیات یعنی انسان وطیور و بہائم سے حال کُلّی حیوانات پر دلالت کی گئی۔ سوم۔ تمثیل وہ دلالت کرنا ہے حال جزئی سے حال جزئی پر۔ بسبب اشتراک کسی امر کے اُن میں۔ جیسے کہیں کہ بنگ حرام ہے کیونکہ شراب حرام ہے، اور دونوں جزئی ہیں سُکر کے یعنی دونوں میں نشہ ہے۔ مگر واضح ہو کہ استقرا و تمثیل مفید ظن ہیں قیاس مفید یقین۔"

مولوی محمد رضا لکھنوی: علماء فرنگی محلی کے خاندان سے تھے۔ قطب شہید فرنگی محلی ان کے اجداد میں ہیں۔ ان کے والد مولوی غلام یحییٰ خاں بنارس میں صدر الصدور رہے اور ساتھ ہی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ مولوی محمد رضا بدایوں میں بھی ڈپٹی کلکٹر رہے۔ طبیب حاذق تھے۔ مطب بھی کرتے تھے۔ پنشن کے بعد بھوپال میں ملازم ہو گئے تھے۔ جس وقت رسالہ 'منہاج المنطق' لکھا ہے مولوی محمد رضا خاں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع کھیری تھے۔ یہ کتاب ڈاکٹر بیلنٹین کے انگریزی رسالہ منطق کا اُردو ترجمہ ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"بجائے مصطلحات والفاظ متداولہ منطق انگریزی کے بجنسہٖ مصطلحات والفاظ مستعملہ منطق عربی داخل ترجمہ کیے، اور التزام اس امر کا رکھا کہ محاورۂ زبانِ اردو بھی ساقط نہ ہو اور ترجمہ بھی لفظاً بلفظ ہو۔"

یہ ترجمہ ۱۸۸۰ء ﴿۱۲۹۸ھ﴾ میں مرتب ہوا اور ۱۸۸۱ء میں مطبع نولکشور میں طبع ہوا۔

انگریزی میں کتب منطق کی ترتیب اور پڑھانے کا طریقہ عربی کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ ہے۔ یہی فرق اوپر کے دو مصنفوں کی تالیفات اور مولوی محمد رضا خاں کے ترجمہ میں ہے، اگرچہ ترجمہ کی زبان ان دونوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ صاف نہیں ہے۔ 'منہاج المنطق' کا نمونہ یہ ہے:۔

"۲۶۔ قضیہ صادقہ کا عکس کچھ ضرور نہیں کہ صادق ہی ہو۔ مثلاً 'کُل گھوڑے حیوان ہیں' قضیۂ صادق ہے، مگر اس کا عکس کہ 'کُل حیوان گھوڑے ہیں' کاذب ہے۔ اصل قضیہ میں ہم نے سب گھوڑوں کا ذکر

کیا ہے، نہ سب حیوانات کا، اس لئے اس کے عکس میں ہم کوکُل حیوان کے ذکر کرنے کے بجائے صرف بعض حیوان کا ذکر کرنا چاہیے، اور اصل قضیہ میں اس بات کا ایما نہیں پایا جاتا کہ کُل حیوان گھوڑے ہیں، البتہ بعض کے ہونے کا پایا جاتا ہے۔

۲۷۔ یہ اقوال جو دفعہ ۲۲ سے ۲۶ تک مذکور ہوئے، بواسطہ اشکال کے بخوبی بیان ہو سکتے ہیں۔ پہلے یہ قضیہ لو "کُل گھوڑے حیوان ہیں" اور فرض کرو کہ سب گھوڑے ایک مثلث میں گھیرے جاویں اور سب حیوان ایک دائرے میں۔ پس اس صورت میں اگر قضیہ مذکورہ صحیح ہے تو بالکل مثلث دائرہ کے اندر گھر جائے گا، اس طور پر اور بالکل مثلث کے دائرے میں گھر جانے کی وجہ یہ ہے کہ گھوڑے کے کُل افراد پر حکم ہے، اور چونکہ گھوڑے کے سوا اور بھی حیوان ہیں، اس لیے مثلث دائرے کی تمام سطح پر محیط نہیں۔ اور اگر ہم اصل قضیہ کو منعکس کریں تو اس صورت میں کُل حیوان تو محکوم علیہ ہو ہی نہیں سکتے مگر چند۔ پس ہم کو حیوان کے ساتھ لفظ بعض کی بھی قید لگانی ضرور ہوگی، اور ہم شکل میں بھی دیکھتے ہیں کہ دائرے کی بعض سطح مثلث کے ساتھ منطبق ہے حالانکہ بالکل مثلث بعض دائرے کے ساتھ منطبق ہے۔"

مولوی محمد علی تحصیلدار: بچھراؤں ضلع مرادآباد وطن تھا۔ ۱۸۱۷ء ﴿۱۲۳۲ھ﴾ میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کی ابتدا ۱۸۳۳ء میں سررشتہ داری صدر الصدور سے ہوئی۔ صیغہ نظامت اور سررشتہ داخل خارج میں رہے۔ حدود تحصیلات قائم کرنے پر مامور رہے۔ رجسٹرار دیوانی رہے، پھر ۱۸۴۹ء میں تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں تحصیلدار ہوئے۔ تبادلے ہوتے رہے۔ بلاری ضلع مرادآباد سے جون ۱۸۷۶ء میں پنشن پائی اور ۱۸۸۷ء ﴿۱۳۰۵ھ﴾ میں رحلت فرمائی۔ مولوی عبدالرشید صاحب نے قطعہ تاریخ کہا:-

جناب محمد علی حامیِ دیں   بہ معقول و منقول فردِ یگانہ
بگویم سنِ رحلتش با دلائل   "مفسر محدث فقیہ زمانہ"

۷۵ + ۱۲۳۰ھ = ۱۳۰۵ھ

مصرع تاریخ کے اعداد (۱۲۳۰) میں دلائل کے اعداد (۷۵) جمع کرنے سے

۱۳۰۵ھ سالِ وفات نکلتا ہے۔

سرسیّد کی مذہبی تحریروں نے علمائے ہند کو نہایت مضطرب کر دیا تھا۔ ہر طرف سے ان کی مخالفت میں کتابیں اور اخبار و رسائل شائع ہو رہے تھے۔ حدِ اعتدال کو قائم رکھنا عالم و جاہل دونوں کے لیے دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ جوشِ مخالفت میں سرسیّد پر کفر کے فتوے لگا دیے گئے۔ پھر جب ۱۸۸۰ء سے سرسیّد نے تفسیرِ قرآن کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تو مخالفت اور بڑھ گئی۔ ان مخالفوں میں ایک زبردست مخالف مولوی محمد علی صاحب بھی تھے۔ انھوں نے سرسیّد کے ایک ایک فقرے، ایک ایک بات کا جواب لکھنا شروع کر دیا اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحوں کی کئی جلدیں تصنیف کیں۔ یہ مجلّدات 'البرہان' کے نام سے مشہور ہیں۔ پورا نام یہ ہے:- البُرهان عَلیٰ تَجْهِیْلِ مَنْ قَالَ بِغَیْرِ عِلْمٍ فِی القُرآن۔ اب نہ سرسیّد کی کوئی تفسیر پڑھتا ہے نہ اس کا ردِّ عمل دیکھنے کی کسی کو ضرورت ہے۔ لیکن اس قسم کا لٹریچر بھی انیسویں صدی کی ایک عجیب و غریب پیداوار ہے۔ مولوی محمد علی صاحب بڑے عالم اور باخبر بزرگ تھے۔ اس زمانے میں ایک طرف عیسائی اسلام پر حملے کر رہے تھے۔ دوسری طرف سرسیّد اور مولوی چراغ علی نے عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں اسلام کے بعض مسلّم قوانین و اصول کی توجیہ اور رائے زنی شروع کر دی۔ ایسے معرکۂ آرا میں مطابق حدیث شریف اِختلافُ اُمَّتِی رَحْمَةٌ (میری اُمّت کا اختلاف رائے و اجتہاد بھی رحمت ہے) کبھی ایک فریق حق پر ہوتا ہے، کبھی دوسرا۔ بہر حال مولوی محمد علی صاحب نے عیسائیوں اور (بقول خود) نیچریوں، دونوں کے جواب لکھے۔ ۱۸۷۴ء میں کانپور سے ایک رسالہ 'نور الآفاق' اسی مذہبی مناظرے اور مناقشے کے لیے جاری ہوا تھا۔ اس میں مولوی صاحب نے مضامین لکھے۔

مولوی محمد علی صاحب کی متعدد غیر مطبوعہ تصانیف کے علاوہ مطبوعہ کتابیں یہ ہیں:-

(۱) رَدُّ اشفاقٍ فِی جَوازِ الاِسْتِرقاق۔ سرسیّد کے رسالہ 'ابطال غلامی' کا جواب۔ اسلام میں لونڈی بنانے کے رواج کو جائز ثابت کیا ہے۔ مطبوعہ نظامی پریس، کانپور ۱۸۷۳ء (۱۲۹۱ھ)

(۲) 'ظفر مبین' مسٹر اینڈرسن کے اعتراضات کا جواب۔

(۳) 'سَوطُ اللہ الجبار' یہ بھی اینڈرسن کا جواب ہے۔

(۴) 'اَلْبُرھان' اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ مطبوعہ مطبع گلزار احمدی، مراد آباد۔

مولوی محمد علی نے اپنی تصنیف 'البرہان' میں سر سیّد کی ہر قسم کی غلطیاں، قرآن فہمی و عربی دانی کے متعلق، صرف ونحو، علمِ زبان، علم کلام، اصول تفسیر کے حوالوں کے ساتھ بیان کی ہیں۔ زبان میں قدامت کا اثر ایسا ہی ہے جیسا سر سیّد کی تحریر میں۔ سر سیّد کو ہر جگہ ''سیّد الطائفہ'' یا ''سیّد الطائفہ النیچریہ'' لکھا ہے۔ اول لفظ قَالَ لکھ کر سر سیّد کی تفسیر کا حصہ نقل کیا ہے۔ پھر قُلْتُ لکھ کر اپنا جواب لکھا ہے۔ نمونہ یہ ہے:۔

''قَالَ، جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم علانیہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ بجز اس کی قدرتِ کاملہ کے ایک عظیم الشان کرشمہ کے ان کو نہیں دکھا سکتے تھے۔ پس وہ ان کو قریب اس پہاڑ کے لے گئے جس کی آتش فشانی اور گڑگڑاہٹ اور زور وشور کی آواز اور پتھروں کی آواز کے خوف سے بیہوش ہو گئے۔ قُلتُ۔ بیان واقعہ میں کس قدر مغالطہ کو کام میں لا رہے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ کلمات ہیں لَنْ نُؤمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہ جَھْرَۃً، یعنی ہم تجھ پر ایمان نہ لاویں گے جب تک اللہ کو عیاناً نہ دیکھ لیں گے۔ اس گستاخی اور کفر کی سزا میں ان پر یہ عذاب نازل ہوا تھا۔ اگر یہ کہتے کہ ہم خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ان پر یہ عذاب نازل نہ ہوتا، بلکہ حضرت موسیٰ ان کو سمجھا دیتے کہ تم خدا کو اس دار دنیا میں نہیں دیکھ سکتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو سمجھا دیا تھا کہ (لَنْ تَرَانِیْ)......(۱) اور چونکہ بقول سیّد الطائفہ کے وہ پہاڑ آتش فشاں تھا، اور آتش فشاں پہاڑوں کا حال جو کچھ ہے وہ کوئی عجائبات سے نہیں، ایک معمولی بات ہے، اس سے تو بدرجہا زائد عجائبات وہ دیکھ چکے تھے کہ ان کی نظروں کے سامنے بحرِ قلزم پھٹ گیا، اور پانی کے تودے کوہ ہائے عظیم کے برابر ان کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے، اور وہ خشکی میں ان تودوں کے درمیان عین قعرِ دریا میں ہو کر نکل گئے۔ عصا کی کیفیت دیکھ چکے تھے کہ اژدھا ہو کر ساحروں کی لاٹھیوں اور رسّیوں کو نگل گیا۔ مقام رفیدیم ایک سنگِ خارا سے بارہ چشمے پانی کے جاری کر دیے

---

(۱) یہاں شاہ عبدالعزیز صاحب کی تفسیر عزیزی سے ایک طویل فارسی عبارت اپنے قول کی تائید میں نقل کی ہے۔ وہ حذف کر دی گئی۔

ان عجائبات کے مقابلے میں ایک ایسے امر کو دستور مُستمر کے موافق ظہور اس کا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے وہ لوگ کس طرح پر عجائبات اور کرشمہ سمجھ سکتے تھے، اور ایک ایسا امر معمولی کہ اس میں موسیٰ علیہ السلام کی نہ کچھ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے، نہ ان کی عظمت، نہ ان کی نبوّت و تقرب پر دلالت کرتا ہے، کسی طرح پر باعث اس کا نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے اس مقولہ کفریہ سے کہ (لَنْ نُؤمِنَ لَکَ) رجوع کریں، بلکہ یہ امر تو موجب ازدیادِ کفر اور بدگمانی کا تھا کہ قوم کو دھوکا دیا۔ خدا کے دکھانے کا تو اظہار کیا تھا اور کوہ آتش فشاں میں لے جا کر ان کی مٹی خراب کی۔ اور کیا سیّد الطائفہ کے نزدیک وہ سب کے سب اندھے، بہرے، نادان ایسے مسلوب الحواس تھے کہ دور سے نہ گڑگڑاہٹ کی آواز سنی نہ آگ کے شعلے دیکھے نہ آگ کی گرمی ان کو محسوس ہوئی، اپنی موت ان کو نظر نہ آئی۔ یہاں تک کہ اس مقام سے کہ جہاں سے یہ امور محسوس ہو سکتے تھے آگے تک بڑھے چلے گئے، یہاں تک کہ ایسے قریب پہونچ گئے کہ مرنے تک کی نوبت پہونچ گئی...... پس کسی طرح عقل باور نہیں کرتی کہ ایسے لوگ موسیٰ علیہ السلام کے کہنے سے دیدہ و دانستہ آتش فشاں پہاڑ کے قریب اپنی جان کھونے کو چلے جاتے اور ان سے یہ جھگڑا نہ کرتے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے دکھانے کے تجھ سے خواہاں تھے تو ہمیں اس آتش فشاں پر مار ڈالنے کے واسطے لئے جاتا ہے۔"

اضافۂ حال علّام مولوی سیّد امداد العلی

۱۴۲۴ھ

سر سیّد کی مذہبی تحریروں نے مسلمانوں کے ایک خاص طبقہ میں بہت ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اور متعدد نامور علماء نے ان تحریروں کی سخت مخالفت کی۔ سر سیّد کے ان مخالفین میں مولوی سیّد امداد العلی اکبر آبادی بھی تھے۔ سر سیّد اور مولوی سیّد امداد العلی میں بعض باتیں مشترک بھی تھیں۔ دونوں سادات کے قدیم اور نامور خانوادوں سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں سیّد تھے۔ دونوں سرکاری ملازمتوں میں تھے۔ دونوں نے انگریزوں کی نہ صرف ملازمت کی بلکہ حق نمک بھی ادا کیا۔ دونوں نے غدر میں انگریزوں کی بڑی خدمت کی۔ دونوں کو انگریزوں نے خطاب دیے۔ دونوں مسلمانوں کے سچے خیر خواہ اور ان کی زبوں

حالی کو دور کرنے میں کوشاں رہے۔ دونوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے راہ ہموار کی اور مدارس قائم کیے۔ دونوں ادیب، انشا پرداز اور مصنف تھے۔ فرق یہ تھا کہ مولوی سیّد امداد العلی باضابطہ علوم دینی کی تکمیل کے ساتھ عالم تھے، سر سیّد نے باضابطہ علوم دینی کی تحصیل نہیں کی تھی۔ سیّد امداد العلی قدیم نہج کے راسخ العقیدہ تھے اور دینی و تشریعی امور میں توجیہہ و تاویل کے قائل نہیں تھے۔ اسی لیے باوجود ابتدائی دور میں سر سیّد سے دوستانہ تعلقات کے آخیر دور میں ان کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ مگر یہ مخالفت ذاتی نہ تھی۔ الحب للّٰہ البغض للّٰہ۔

جس وقت والد صاحب قبلہ علیہ الرحمہ (مولوی حامد حسن قادری) نے یہ کتاب مرتب کی اس وقت مولوی سیّد امداد العلی کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم نہ ہو سکی اس لیے 'داستان تاریخ اُردو' کی کسی اشاعت میں مولوی سیّد امداد العلی کے حالات، کارنامے، خدمات اور تصانیف کا حال درج نہ ہو سکا۔

مولوی سیّد امداد العلی مشہور ادیب و نقاد و مدیر جناب دلگیر شاہ صاحب اکبر آبادی کے اجداد میں سے تھے۔ دلگیر شاہ صاحب کے منجھلے صاحبزادے جناب سیّد قیام الدین شاہ صاحب اکبر آبادی نے اپنے بزرگوں کے احوال میں ایک مختصر مگر نہایت وقیع کتاب 'سلسلۂ قادریہ اور مشاہیرِ اکبر آباد' تالیف فرمائی۔ یہ کتاب ۲۱۷ صفحہ پر مشتمل ہے اور ۱۹۹۵ء میں ادارہ تحقیقات شرقیہ، میوہ کٹرہ، آگرہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں سیّد قیام الدین صاحب نے کئی ماہ لندن میں اپنے چھوٹے بھائی سیّد معین الدین شاہ کے ہاں قیام فرمایا۔ افسوس کہ دونوں بھائی اب آغوش رحمت رب میں پہنچ چکے ہیں۔ مولوی سیّد امداد العلی صاحب کی تقریباً تمام تصانیف برٹش لائبریری میں موجود ہیں۔ سیّد قیام الدین شاہ صاحب نے بالاستیعاب ان سب کا مطالعہ کیا اور متعلقہ ریکارڈ بھی دیکھا۔ جو مواد انھوں نے جمع کیا وہ اس سے پہلے کہیں نہیں ملتا۔ اس لیے راقم الحروف (خالد حسن) نے یہ مناسب سمجھا کہ یہ تمام مضمون بہ تمام و کمال سیّد قیام الدین شاہ صاحب کی تحریر میں ہی نقل کر دیا جائے۔ اس میں ایک حرف کی ترمیم نہیں کی گئی۔ بلکہ یہ کہنا

مناسب ہوگا کہ صرف ایک لفظ کی ترمیم کی گئی۔

وہ ذرا دلچسپ ہے۔ مولوی سیّد امداد العلی کا نام اسی طرح ہر جگہ خود ان کے سامنے شائع شدہ کتابوں میں بھی صرف اتنا ہی ملتا ہے۔ بعد میں انھیں انگریزی حکومت نے سی۔ ایس۔ آئی۔COMPANION STAR OF INDIA کا خطاب دیا۔

اس خطاب کے ملنے کے بعد بھی جو کتاب ان کی زندگی میں شائع ہوئی اس میں صرف مولوی سیّد امداد العلی سی۔ ایس۔ آئی۔ (ستارۂ ہند) ہی چھپا ہے۔ یہی خطاب سی۔ ایس۔ آئی۔ سر سیّد کو بھی ۱۸۷۰ء میں ملا تھا۔ اس خطاب کے نام کے ساتھ 'سر' کا لفظ نہیں لکھا جاتا۔ معلوم نہیں کیوں سیّد قیام الدین شاہ صاحب کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ لوگوں نے مولوی سیّد امداد العلی کے نام کے ساتھ 'سر' کا لفظ نہیں لکھا چنانچہ انھوں نے علی الرغم انفائے اعدا کے طور پر اپنے طویل تحقیقی مقالے میں ہر جگہ 'سر' کا لفظ اضافہ کیا۔ سر سیّد امداد العلی۔ بلکہ اکثر جگہ تو وہ صرف سر سیّد امداد ہی لکھتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک تاریخی غلطی ہے بلکہ پڑھنے والے کو الجھن ہوتی ہے۔ سر سیّد کو سی۔ ایس۔ آئی۔ کا خطاب جب وہ لندن گئے ہیں ۱۸۷۰ء میں ملا تھا مگر کبھی اس کے بعد سر کا لفظ ان کے نام کے ساتھ نہیں لکھا گیا۔ جب ۱۸۸۸ء میں انھیں کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ KNIGHT COMMANDER STAR OF INDIA کا خطاب ملا تو ان کے نام کے ساتھ 'سر' کا اضافہ ہوا۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ اور یہ ایسا مقبول ہوا کہ اب اُردو ادب میں اور مسلمانوں کی ادبی و سماجی تاریخ میں سر سیّد کے نام سے صرف ایک ہی شخص پہچانا جاتا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں میں اور بھی متعدد مقتدر اصحاب تھے جو سیّد بھی تھے اور 'سر' بھی۔ اس لیے راقم الحروف (خالد حسن) نے بڑی محنت سے قیام الدین شاہ صاحب کی تحریروں سے سیّد امداد العلی سے پہلے 'سر' کے لفظ کو حذف کیا ہے۔ اگرچہ یقین نہیں ہے کہ ہر جگہ سے نکل پایا ہو۔

تو اب سیّد قیام الدین شاہ صاحب کا مقتدر مقالہ مولوی سیّد امداد العلی پر ملاحظہ فرمائیے۔

حاجی مولوی سیّد امداد علی: سی۔ایس۔آئی۔(ستارۂ ہند) پیدائش ۱۸۲۰ء وفات ۱۸۸۳ء۔حاجی مولوی سیّد امداد علی آگرہ کے ایک عالم صوفی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔آپ کے والد سیّد غلام مصطفیٰ مولوی سیّد امجد علی شاہ کے برادر خورد تھے۔آپ کی پیدائش بموجب عدالتی بیان مقدمہ نمبر ۵۰، ۱۸۸۰ء (جب آپ کی عمر ۶۰ سال تھی) ۱۸۲۰ء ہے۔آپ کی پیدائش محلّہ پنجہ مدرسہ شاہی، آگرہ میں ہوئی۔آپ کی ابتدائی تعلیم آپ کے والدین کے زیرِ سایہ ہوئی۔آپ عربی اور فارسی کے عالم تھے۔انگریزی طرزِ معاشرت اور ثقافت سے بیزار تھے۔آپ اپنے والد سیّد غلام مصطفیٰ سے بیعت تھے اور مولوی سیّد غلام مصطفیٰ اپنے والد مولوی سیّد احمدی (خاندانِ مدینہ منورہ) سے مرید تھے، جیسا کہ ان کا عدالتی بیان ہے۔آپ فقہ و اصول، حدیث شریف و تفسیر، کلام منطق اور فلسفہ کے عالم تھے۔ آپ نہایت صلح کن، ذہین، منکسر المزاج اور قابل مجسٹریٹ تھے۔اپنی تمام عمر علاوہ ملازمت کے تعلیم کی ترقی، عوام کی فلاح و بہبود اور ادب کی خدمت میں گزاری۔اپنی زندگی میں اعلیٰ کارنامے انجام دیے۔پُر مغز مقالہ نگار تھے اور علم کے بحرِ بیکراں۔جس شہر میں آپ کا تبادلہ ہوا وہاں کے حکام نے آپ کی کارکردگی اور عدل کو بہت سراہا ہے۔آپ عوام الناس میں بے انتہا مقبول تھے۔سر سیّد احمد خاں آپ کے ہم عصر تھے اور ان کے مذہبی خیالات میں مدِ مقابل تھے۔

۱۰ر فروری ۱۸۴۰ء بعمر بیس سال آپ کی ملازمت کا آغاز ہوا۔بحیثیت تحصیلدار بمقام کوسی ضلع متھرا میں آپ کا تقرر ہوا۔مراد آباد سے بہ عہدہ اسسٹنٹ کلکٹر ۱۸۸۱ء میں آپ نے پنشن حاصل کی۔آپ نے نہایت قابلیت سے اپنے فرائض انجام دیے اور خالی وقت میں بھی آپ کوئی نہ کوئی مفید کام انجام دیتے رہے۔ایام غدر میں آپ کوسی میں تحصیلدار تھے۔

اپنی ملازمت کے دوران سینہ سپر ہو کر بہ نظر نمک حلالی آپ نے اپنے آقا کے لیے اپنے سینے پر گولی کھائی اور ہزار ہا روپیہ کا مال ان سے چھڑایا اور وہ گولی چھ ماہ بعد ڈاکٹر مرے نے آپریشن کر کے نکالی، جس کا خون مسٹر لو، داماد لفٹیننٹ گورنر اور مسٹر جے ار لیسٹ،

کلکٹر متھرا نے پونچھا۔

یو۔ پی کے لفٹیننٹ گورنر مسٹر میور نے ایک سرٹیفکیٹ دیا تھا جس میں یہ بھی لکھا تھا:

"اس آزمائش کے ایام میں امداد علی سے زیادہ کسی اور شخص کو میں مستحق نہیں جانتا جو ہم لوگوں کا خیر خواہ اور نہایت ایمان دار ہو۔

مولوی سیّد امداد علی کو آپ کی کارکردگی، بے ریائی، خیر خواہی اور ہمدردی کے عوض حکومتِ برطانیہ نے COMPANION STAR OF INDIA (ستارۂ ہند) کے خطاب سے نوازا تھا، اس کے علاوہ جاگیر موضع کجولی، تحصیل اعتماد پور، خلعت اور خاص مراعات برطانیہ سرکار سے عطا ہوئیں جیسا کہ روئداد نمبر ۸۷ گورنر جنرل کے دربار منعقدہ ۱۸۵۹ء کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔

"سیّد امداد علی ڈپٹی کلکٹر متھرا نے قابلِ امتیاز خدمات ایام غدر میں سرانجام دی ہیں۔ بُری طرح سے اس ایکشن میں زخمی ہوئے۔ اس صلہ میں ان کو خلعت، ایک ہزار روپیہ کی مالکانہ اختیارات مواضعات جس کی جمع ایک ہزار دوصد روپیہ سالانہ ہے، جس کی نصف تا حیات ان کی معاف کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص اضافہ مبلغ پچاس روپیہ ان کو ریٹائر ہونے پر ان کی پنشن کے علاوہ دیا جائے گا۔ دستخط الیکزنڈر روس (A.Ross) بنام کمشنر۔

آپ کوسی، ضلع متھرا تحصیلدار (۱۸۴۰ء)، ڈپٹی مجسٹریٹ اور کلکٹر، متھرا (۱۸۵۸ء)، ڈپٹی مجسٹریٹ اور کلکٹر، مرادآباد (۱۸۶۰ء)، ڈپٹی مجسٹریٹ اور کلکٹر، شاہ جہاں پور (۱۸۶۱ء)، ڈپٹی مجسٹریٹ اور کلکٹر، مین پوری (۱۸۶۵ء)، سٹی مجسٹریٹ، کانپور (۱۸۷۳ء)، اسسٹنٹ کلکٹر علی گڑھ، (۱۸۷۷ء)، اسسٹنٹ کلکٹر مرادآباد (۱۸۸۱ء) رہے۔ اسی سال آپ ریٹائر ہو کر آگرہ تشریف لائے، اور ۱۸۸۳ء میں انتقال فرمایا۔

سیّد امداد علی کے فیصلے نہایت جامع، حتمی اور ناطق ہوتے تھے جو عدالتِ اپیل سے بھی ویسے ہی برقرار رکھے جاتے تھے جیسا کہ سالانہ رپورٹ گورنمنٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔

"مد ۹۔ عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ سیّد امداد علی نے ۱۹ مقدمات فوجداری منجملہ ۵۹

مقدمات سیشن عدالت کے سپرد کیے تھے۔ ان میں سے ایک بھی ملزم بَری نہیں ہوا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے فیصلے کتنے جامع ہوتے تھے۔

دستخط جے۔ پاور سیشن جج، مراد آباد

مد نمبر ۹، مسٹر جان پاور قائم مقام مجسٹریٹ نے اپنے ماتحت افسر کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہار کیا ہے:۔

''سال شروع ہونے پر میر امداد علی کے چارج میں پرگنہ مراد آباد تھا۔ اس کے بعد حسن پور اور اب سنبھل ان کے چارج میں ہے۔ اس افسر کا کردار اور انداز طبیعت ہمیشہ عمدہ رہا ہے، جس کو وہ برابر قائم رکھے ہوئے ہیں۔ امداد علی نے سب سے زیادہ دو سو ستر (۲۷۰) فوجداری کے مقدمات فیصل کیے۔''

مد ۱۲ میں مسٹر مینڈرسن، قائم مقام مجسٹریٹ مراد آباد نے اپنے ماتحت افسر کے بارے میں ان الفاظ کا اظہار کیا ہے:۔

سیّد امداد علی جو یہاں اچھی طرح مشہور ہیں ان کا میں قصیدہ لکھوں۔ وہ بلا استثنا سخت ترین کام کرنے والے مجسٹریٹ ہیں، جیسا کہ میں نے ان کو ہمیشہ دیکھا ہے (جیسا کہ نقشہ سے جو آپ کو روانہ کیا جا رہا ہے، ظاہر ہوگا) وہ ایک بلند کردار کے مالک ہیں اور باشندگانِ ضلع میں بھی وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں بابت سچائی کے نہ گمراہ ہونے والے اور راست باز ہیں۔ امداد علی ڈپٹی مجسٹریٹ نے ۲۸ مقدمات سپرد سیشن ججی کیے جن میں سے ۲۸ فی صدی مقدمات میں سزا دی گئی جو ان کے لیے قابلِ قدر بات ہے۔

شاہ جہاں پور سے آپ کا تبادلہ بحیثیت سٹی مجسٹریٹ کانپور ہوا، جہاں آپ ۱۸۷۳ء تک رہے۔ ۱۸۷۱ء میں آپ نے ۶ ماہ کی چھٹی بغرض ادائیگی فریضۃ الحج بیت اللہ کے لیے لی تھی۔ آپ کانپور میں باشندگان و حکام میں نہایت مقبول رہے۔ آپ نے یہاں بھی کارہائے نمایاں قابلِ ستائش انجام دیے، جیسا کہ سرکاری رپورٹ و سارٹیفکیٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔

لوگوں میں تعلیم کو وسیع کرنے، بالخصوص تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں آپ کی جدوجہد

کو بھی دخل حاصل تھا۔ ضلع اسکولوں میں بھی آپ نے دلچسپی لی اور اسکول قائم کیے اور مختلف علوم و عنوانات پر نہ صرف کتابیں تصنیف کیں بلکہ اسکولوں کو ان کی خاص تعداد مفت بطور عطیہ روانہ کیں۔ ان کی خدمات کا اعتراف اور شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی چٹھیوں میں خود انگریز سرکاری افسروں نے کیا ہے۔

۱۸۵۴ء میں آپ تحصیلدار پرگنہ کوسی ضلع متھرا تھے۔ اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی تعلیم کو عام کرنے کے لیے حلقہ بندی اسکول قائم کر رہی تھی۔ مولوی صاحب نے بھی اس میں تعاون کیا۔ اپنے مواضعات میں دیہی (Village) اسکولوں کو وسعت دینے اور طلبا کی تعداد بڑھانے اور نگرانی کرنے میں آپ بھی عملی طور پر دلچسپی لے رہے تھے۔ نہایت جاں فشانی سے آپ نے اس فرض کو انجام دیا۔ اشاعتِ تعلیم کے سلسلے میں آپ کی ان عوامی خدمات کو برطانیہ سرکار نے اس حد تک سراہا کہ ان کو اس صلہ میں خلعت پانے کا مستحق سمجھا۔

یہاں اس امر کو واضح کرنا مناسب ہوگا کہ مسٹر ایم۔ کیمپسن (M. Kempson) جو ہند میں ڈائریکٹر تعلیم (Director of Public Instructions) تھا، اس نے مولوی صاحب کو ایک چٹھی پارلیمنٹ اسٹریٹ، لندن سے مورخہ ۲۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء کو لکھی تھی جس میں تحریر کیا تھا:-

”مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کے خط اور سارٹیفکیٹ کا دل سے شکریہ ادا کروں جو بالکل ویسا ہی تھا جس کی مجھے ضرورت تھی...... اب میں ہندوستان کو چھوڑ چکا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے کام کو آپ جیسے لوگوں نے زیادہ پسند کیا۔ کوئی بھی آپ سے زیادہ تعلیم کے بارے میں میری مدد نہ کر سکا...... سر ولیم میور نے میری مدد اپنی سفارش سے میری درخواست برائے پروفیسر لندن یونیورسٹی کی ہے۔ لیکن مجھے ایک ہندوستانی طالب علم کی طرف سے سارٹیفکیٹ کی درخواست کی بڑی خوشی ہوتی ہے۔ جس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ دستخط: ایم۔ کیمپسن

ان صاحب کو ایک اُردو داں عالم کے سارٹیفکیٹ کی ضرورت تھی اور انھوں نے

مولوی صاحب سے اپنے لیے طلب کیا تھا، جس کی بنا پر ان کو لندن یونیورسٹی میں اُردو پروفیسری مل گئی تھی۔ آپ نے مرادآباد میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو ہنوز موجود ہے اس کے لیے جائداد بھی وقف کی تھی جس کا احتساب (آڈٹ) یو۔ پی۔ وقف بورڈ کرتا ہے۔ آپ ہی کے نام سے مدرسہ امدادیہ ہے۔ انھوں نے کانپور میں پٹواریوں کے لیے اسکول قائم کیے اوران کی تربیت کرنے میں بڑے مددگار ثابت ہوئے۔

آپ کے دورانِ قیام کانپور میں وہاں کے قبرستان منتشر تھے۔ مسلمانانِ کانپور قبرستان کے علاوہ اپنے گھروں میں مُردے دفن کرتے تھے جو مضرِ صحت تھے۔ آپ نے اس کام کے لیے ایک زمین حکومت سے بجانب شمال مشرق برائے قبرستان مقرر کرادی اور شہر میں جگہ جگہ تدفین پر سختی سے پابندی لگادی۔ آپ نے اس کام میں بھی میونسپلٹی کی مدد کی جس پر اس کے سکریٹری جے۔ ایم۔ ہیرس نے ۲۶ راگست ۱۸۷۰ء کو تحریر میں شکریہ ادا کیا، جیسا کہ انتخاب سالانہ رپورٹ ۱۸۷۰ء مد نمبر ۷ سے واضح ہے۔

آپ نے کانپور کے باشندوں کو ترغیب دی کہ مردانہ خیراتی شفاخانہ کے لیے چندہ دیں۔ چنانچہ پراگ نراین تیواری وغیرہ نے اس میں دل کھول کر چندہ دیا تھا، جس پر مسٹر T.H.Colson نے تیواری جی کا شکریہ بذریعہ مولوی صاحب ادا کیا تھا۔ اس نے اپنی چٹھی محررہ ۱۰ ر مارچ ۱۸۷۴ء میں مولوی امداد علی کا بھی شکریہ ادا کیا تھا جو انھوں نے خیراتی شفاخانہ کانپور کے لیے مدد کی تھی۔

"میں امداد علی ڈپٹی مجسٹریٹ کا شکر گزار ہوں جنھوں نے خیراتی شفاخانہ کے لیے بڑی محنت کی۔ چندہ جو کانپور کے رہنے والوں نے شفاخانہ کو دیا وہ صرف ان ہی کے ذریعہ سے ملا۔ اور سردی کے موسم میں انھوں نے کپڑے بشمول ۴ عدد کمبل شفاخانہ کو دیے تھے۔"

دستخط J.A.Condon سول سرجن، نومبر ۱۸۷۳ء۔ آپ نے کانپور میں فلاح و بہبود کے لیے ایک Welare Society بنائی تھی۔ اس کے ذریعے بھی وہ عوام الناس کے لیے کارِ خیر کرتے رہے۔

آپ آگرہ کالج میں آگرہ کے امانت دار اصحاب میں سے ایک غیر سرکاری ممبر

تھے۔ آپ کے ساتھ سیّد منور زماں، مولوی سیّد فرید الدین شاہ بھی تھے۔ آپ نے ان نادار طلبا کے لیے جو اچھی ڈویژن امتحان میں لاتے تھے حقِ وظیفہ (اسکالرشپ) دس روپے ماہانہ اپنی جیب خاص سے جاری کیا تھا جب کہ لارڈ رپن پندرہ روپیے ماہانہ دیتے تھے۔

''جناب میر امداد علی صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ اور رائے متھرا داس صاحب جن دو صاحبان نے ۱۸۸۲ء میں وفات پائی ایسی جاں فشانی اور محنت اس مدرسہ کی بابت فرمائی کہ کبھی بھولی نہیں جاسکتی۔'' آگرہ میں سینٹ پیٹرکس کالج، سینٹ جانس کالج اور وکٹوریہ اسکول میں باہمی رقابت تھی اور فیس زیادہ تھی۔ آگرہ کالج کی مالی حالت قابلِ اطمینان نہ تھی۔ طلبا کی تعداد آگرہ کالج میں کم ہوگئی۔ گورنمنٹ نے آگرہ کالج کو قائم رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ لوکل گورنمنٹ کو یہ اختیار دیا کہ جس طور سے اور جب مناسب خیال کرے اس کالج کو بند کردے۔ مگر یہ بھی تحریر کیا کہ اگر ساکنانِ آگرہ وقرب وجوار کے باشندگان کی دلی خواہش یہ پائی جاوے کہ موجودہ کالج قائم رہے تو گورنمنٹ کو عذر نہ ہوگا کہ مدرسہ کو ایک حصہ عطیہ کے ایک جماعت امانت داران یا لوکل کمیٹی کے سپرد کردے بشرطیکہ وہ اصحاب وعدہ کریں کہ اس کالج کو عمدہ طور پر قائم رکھیں گے۔ جب ۱۸۷۰ء میں آگرے کا مدرسہ توڑا جائے گا اور کل یا جزو ایک بڑا زرِخیر وقف علی گڑھ کالج اسلامیہ کو دیا جائے گا تو ساکنانِ آگرہ کے کان کھڑے ہوئے۔ عرضداشتیں تیار ہوئیں اور بالاتفاق رائے یہ قرار پایا کہ گورنمنٹ ہند سے ترمیم کرانے کی سعی بلیغ کی جاوے۔ جن صاحبان ذیشان نے ہمت فرمائی ان کی فہرست میں میر امداد علی صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ کا نام بشمول دیگرے صفحہ ۱۰ پر درج ہے۔

اعلیٰ حکامان برطانیہ سرکار کا جب بھی کبھی دربار ہوا آپ کو طلب کیا جاتا تھا۔ دربار میں آپ کو خلعت ملتی تھی۔ ۲۰/فروری ۱۸۶۹ء کو لفٹینٹ گورنر کا دربار کانپور میں ہوا تھا۔ آپ وہاں بھی مدعو کیے گئے اور آپ نے اس دربار میں بھی شرکت فرمائی۔ ۱۸/جنوری ۱۸۷۰ء میں ڈیوک آگرہ تشریف لائے۔ اس موقع پر گورنمنٹ نے آپ کو کانپور سے مدعو کیا۔ اسی طرح ۱۰/دسمبر ۱۸۷۲ء بروز ہفتہ وائسرائے ہند کا دربار ہوا۔ کانپور سے آپ کو مدعو کیا اور آپ نے اس میں شرکت فرمائی۔ بموجب چٹھی محررہ ۸/دسمبر ۱۸۷۲ء لیفٹینینٹ گورنر

نے آپ کو دعوت نامہ روانہ کیا تھا تاکہ آپ کا تعارف وائسرائے سے کرائیں۔ اس میں مولوی سیّد امیر علی شاہ صاحب بھی مدعو تھے جنھوں نے اس دربار میں شرکت فرمائی تھی۔

تصانیف

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:-

ہدایت نامہ پٹواری

پہلا حصہ، حسب الارشاد جناب سیکریٹری صدر بورڈ ریوینو، ممالک مغربی وشمالی، سیّد امداد علی نے تالیف کیا، گورنمنٹ پریس الٰہ آباد، ۱۸۷۱ء

2nd ed. 5000 copies

Price per copy 8 Annas

طبع دوم ۵۰۰۰ جلد

قیمت فی جلد ۸ آنے

''ہدایت نامہ پٹواری'' میں تین باب اور خاتمہ شامل ہے۔

پہلا باب۔ اس باب میں لفظ ''پٹواری'' کی شرح ہے اور عہدہ پٹواری اور رسوم پٹواری کا ذکر ہے۔ وہ کون سے طریقے ہیں جن سے حلقہ بندی پٹواریوں کے لیے مقرر کی جائے۔ بیان ہے اس کا کہ رضامندی اوّل جن کی لی جاوے تقرری پٹواری میں اور کس قدر لیاقت پٹواری کے لیے درکار ہے اور ذکر ہے سزاؤں کا جو پٹواری بصورت غفلت یا جعل سازی وغیرہ کے پاوے گا۔

دوسرا باب۔ اس بیان میں ہے جس سے کہ پٹواری روزنامچہ و بہی کھاتہ متعلق حسابات اور معاملات گاؤں کے ہوں گے اس کی تعمیل کریں گے۔

تیسرا باب۔ اس میں بیان ہے ان کاغذات کا جو پٹواری کو سالانہ داخل کرنا ہیں اور یہ کہ کس مہینے کی کس تاریخ تحصیل میں داخل کرے اور دیگر کاغذات کا ذکر ہے۔

خاتمہ۔ اس میں ہدایت ہے جانچ و پڑتال کاغذات پٹواری کی جس کو کلکٹر سے

لے کر قانون گو تک ہر سال کیا کریں گے۔ پٹواری خوب سمجھ لیں کہ جانچ و پڑتال کاغذات کی ہر سال ہوگی۔ صحیح بنانا کاغذات کا ان پر واجب ہے۔

پٹواری کی تقرری، لیاقت اور کام کی تشریح کی ہے اور فیس مقرر کی ہے۔ پٹواری کے لیے چار قسم کی سزا، تنبہ اور جرمانہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی سزائے موقوفی ہے۔ زمیندار کی سزا کا ذکر، سزائے گرفتاری و مقیدی اور چوتھی سزا سپردگی ہے۔ اس کے علاوہ بہی کھاتہ کا ذکر ہے اور اس کا نمونہ دیا ہے۔ روزنامہ اور بہی کھاتہ کے متعلق دو امور ہیں اور اس کا نمونہ دیا گیا ہے۔ بہی خرچ کا نمونہ ہے۔ یہ کتاب سیّد امداد علی نے حکومت کی درخواست پر لکھی تھی۔ (برٹش لائبریری کتاب نمبر Urdu T V 8 7 7)

ہدایت نامہ پٹواری

2nd ed. 10 000 copies

Price 8 Annas

حسب الارشاد جناب معلیٰ القاب نواب گورنر جنرل بہادر کے

سیّد امداد علی

تحصیلدار پرگنہ کوسی ضلع متھرا نے مرتب کیا

بہ اہتمام چرنجی لعل کے در مطبع نول کشور مقام لکھنؤ میں چھپا

دوسری بار چھپا، دس ہزار، قیمت فی جلد آٹھ آنے، صفحات ۸۱

اس ہدایت نامہ میں پٹواری کے کاموں کی تفصیل اور اس کے کاغذات کی ترتیب اور ان اصطلاحوں کی جو مالی کام میں رائج ہیں تشریح کی گئی ہے۔

یہ ہدایت نامہ چھ ابواب میں لکھا گیا ہے اور حسب موقع قانون و نمبر کے دفعات کا آخر میں حوالہ دیا گیا ہے۔

پہلا باب۔ اس باب میں لفظ پٹواری کی تشریح، پٹواری کے کاموں اور اس کی تقرری کی شرطوں اور اس کی لیاقت مطلوبہ کا بیان ہے۔

دوسرا باب۔ اس باب میں الفاظ فارسی یا عربی کے معنی دئے گئے ہیں جو مالی کام

میں رائج ہیں حتی الامکان ہندی (اُردو) میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ بہ حروف تہجی ہیں۔

تیسرا باب۔ اس باب میں بیان تینوں قسموں کے کاغذات کا ہے جو پٹواری خواہ اپنے پاس رکھے یا خود بنائے۔

چوتھا باب۔ اس باب میں بندوبست کے کاغذات کا بیان ہے جس کو پٹواری اپنے پاس رکھتا ہے۔

پانچواں باب۔ اس باب میں روز مرہ اور متفرق کاموں کے کاغذات، درسی حساب اور معاملات گاؤں کے پٹواری کو اپنے پاس رکھنے چاہئیں۔

چھٹا باب۔ اس باب میں ان ہفت گانہ یا نکاسی کاغذات کا ذکر ہے جو سالانہ پٹواری کو دفتر کلکٹری میں داخل کرنے پڑتے ہیں۔

یہ کتاب نو آموز پٹواریوں کے لیے لکھی گئی ہے جو لوگ پٹواری بننا چاہتے تھے۔ کھوٹ کس طرح تیار کی جاتی ہے اس کا طریقہ بتایا ہے۔ اس کے علاوہ پرگنہ کوسی، ضلع متھرا کے چار گاؤں دہنگانو، امرالہ، کوٹون اور نبی پور میں جو بندوبست کیا گیا ہے اور مالگذاری اور گاؤں کے اخراجات کا حال درج کیا گیا ہے۔ اس سے پہلی کتاب 'ہدایت نامہ پٹواری' جس کا ذکر اس سے پہلے کیا گیا ہے، بالکل مختلف ہے۔ (برٹش لائبریری، لندن، کتاب نمبر 14119.C.17)

حالات موضع دہنگانو و موضع امرالہ و موضع کوٹون و موضع نبی پور، پرگنہ کوسی، ضلع متھرا

حسب الحکم جناب نواب لفٹننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی

بموجب تجویز صاحب وزیٹر جنرل بہادر، مدارس اضلاع مغربی کے

سیّد امداد علی

تحصیلدار پرگنہ کوسی، ضلع متھرا نے تصنیف کیا۔ آگرہ

صدر جیل خانے کے چھاپہ خانہ میں پنڈت کیسری داس

جیلر محبس آگرہ نے چھپوایا ۱۸۵۳ عیسوی۔

پہلی دفعہ ۲۰۰۰ جلد چھاپی گئی

قیمت ڈیڑھ آنہ (صفحات ۱۷)

مولوی سیّد امداد علی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

''معلوم ہو کہ مجھ سیّد امداد علی تحصیلدار پرگنہ کوسی ضلع متھرا نے اقرار نامہ کھوٹ سے تین باتیں ایک جن میں ذکر ہے کہ کیا دستور باچھ اور ادائے مالگذاری سرکار کا آئندہ بندو بست تک کے لیے ٹھہر گیا ہے۔ دوسرے جو جو آمدنی سوائے کی آئے گی اس کی تعداد اور اوس (اُس) کے خرچ ہونے کا دستور تیسرے جس میں ذکر گانو (گاؤں) خرچ اور اختیار خرچ کرنے کا جس طرح سے ٹہرا ہے صاف صاف رکھا گیا ہے۔ چُن کر چار دیہات حلقہ بندی ایک چپٹ سال کی بابت تیار کی گئی ہے۔ اس کے پڑھنے سے سب حال باچھ اور ادائے مالگذاری سرکار اور خرچ گانو (گاؤں) وغیرہ جیسا کہ ترتیب بندوبست حال میں قرار پایا ہے خوب لڑکوں کو یاد ہو جاوے گا۔ جو لوگ باہم ایک دوسرے کے حق پر نظر نہیں رکھتے ہیں اور اس سبب سے آپس میں تکرار واقع ہوتی ہے۔ واسطے رفع ہونے کے اس قبیل کی تکرار کے یہ کتاب مفید ہوگی۔'' (برٹش لائبریری، لندن، کتاب نمبر Urdu (I.O.L. 355

امداد المتقین من اغالیط الفرسولین

مطبع مطلع العلوم واخبار نیّر اعظم، مراد آباد، ۲۸ مارچ ۱۸۷۸ء کو چھپا

''سیّد امداد العلی اکبر آبادی کہتا ہے کہ یہ رسالہ ہے رد میں رسالہ موسومہ بہ 'نصر المسلمین' اور 'نصر النبیین' کے جو منسوب ہیں طرف بعض متعلمین مکتب معلم کتابی خلف شیخ اللہ ابیین کے نام۔ اس کا 'امداد المتقین من اغالیط الفرسولیین' ہے۔ اگر چہ اس متعلم بے باک نے زبانِ سفاہت و وقاحت کو کھولا ہے اور ساتھ مسخراپن کے مانند ارزالِ جہال کی اپنے لسان کو دراز کیا ہے لیکن ہم نے اس سے درگذر کیا اور کلمات ناسزا کا کچھ جزا نہ دیا۔''

اس کتاب میں مضامین کی فہرست یہ ہے:-

۱۔ کتابتِ اسامی سور اور عد و آیات

۲۔ بیع و شراء و اسیجار کتابت قرآن مجید

۳۔ ذکر عمٰین در خطبہ

۴۔ تلفظ بالنیۃ

۵۔ دعائے رفع طاعون

۶۔ رجعتِ قہقہری

۷۔ قیام بہیت صلوۃ زیارت

۸۔ جمع مصحف و بنائے مدارس و تدوین علوم کتابت

۹۔ اعرابِ قرآن مجید

۱۰۔ بدعتِ مذمومہ

۱۱۔ صلوٰۃ الرغائب وغیرہ

۱۲۔ ذکر احیائے غزالی وقوت القلوب

۱۳۔ مصافحہ ومعانقہ بہ تخصیص

۱۴۔ صلوۃ الرغائب

۱۵۔ افراد یوم جمعہ بہ موسوم

۱۶۔ تشبہ بہ کفار

۱۷۔ انعقاد اجماع پر عدم تخفیفِ عذابِ کفار

۱۸۔ ثبوت تخفیف برابولہب

۱۹۔ معنیٰ نص

۲۰۔ ترجمہ ابن قیم

۲۱۔ ذکر ابن تمیہ

۲۲۔ ذکر بیعت کا یزید سے

۲۳۔ غنا ورقص

۲۴۔ عملِ اہلِ مدینہ

۲۵۔ عدم ثبوت عمل مولد از اصول شرعیہ

۲۶۔ تتمہ در رفع یقیہ شہادت الطبیین

۲۷۔ تقلید مذموم

۲۸۔ حسن تسمیہ در بیان سورۃ فاتحہ

اس کتاب میں عربی زبان کے جو حوالے دیے گئے ہیں ان کو خط کشید کیا ہے اور یہ عبارت بغیر اعراب کے نستعلیق رسم الخط میں تحریر کی گئی ہے۔ تعداد صفحات ۳۶۔ اس کتاب کا نمبر ہے (برٹش لائبریری، لندن، 14104.g.4)

مختلف سرکلرات

مقام صدر رو ہائی کورٹ مغربی وشمالی

مرتبہ جناب معلیٰ القاب عالی مراتب والا مناصب

سیّد امداد علی صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کانپور

متعلقہ ایکٹ ۴۵، ۱۸۴۰ء و ایکٹ ۲۵، ۱۸۶۱ء بابت ۱۸۶۶ء

باہتمام محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خاں، مطبع نظامی، کانپور، صفر ۱۲۸۴ھ

اس کتاب میں ایکٹ نمبر ۴۵، ۱۸۴۰ء اور ایکٹ نمبر ۲۵، ۱۸۶۱ء کے متعلق درج ہیں۔ یہ کام حکومت کے کہنے پر سیّد امداد علی نے کیا تھا۔ اس کتاب کے آخر میں ہدایات اور علامات ایک خوبصورت نقشہ میں دیے گئے ہیں۔ اس میں جنگل، باغ، سرحد، درخت، ریتا، کہار، تالاب پختہ، تالابِ خام، جھیل، چاہِ پختہ، چاہِ خام، جھرنا، دریا، ندی و نالہ، آبادی خام، آبادی پختہ، مسجد، شوالہ، تحصیل، تھانہ، چوکی، نمکسار، پڑاوہ، قلعہ، بازار، قبرستان پختہ، سڑک پختہ، سڑک خام، پُل، پگ ڈنڈی، بیہڑ، بہار وغیرہ کی شکلیں دی ہیں جن کو مختلف رنگوں سے رنگا گیا ہے۔ اس کتاب کا نمبر ہے: (برٹش لائبریری، لندن Urdu I.O.L.658)

فتویٰ کراہیتِ نمازِ جنازہ در مسجد

محررہ جناب مولوی سیّد امداد العلی صاحب، ڈپٹی کلکٹر مراد آباد

در مطبع خورشید ہند، مراد آباد، باہتمام منشی بشن سروپ۔ (صفحات ۱۶)

اس کتاب میں سیّد امداد علی نے دیگر علماء سے پوچھا ہے کہ کیا فرماتے ہیں علمائے

دین اس مسئلہ میں کہ اندر مسجد کے جنازہ رکھ کے نماز پڑھنا مذہبِ حنفی میں کیسا ہے؟ آیا مکروہ ہے یا جائز بلا کراہت؟ مولوی صاحب نے اس کا جواب لکھا ہے کہ

"بدون کسی عذر کے اندر مسجد کے خواہ مسجد محلّہ ہو یا مسجد جامع جنازہ رکھ کے نمازِ جنازہ پڑھنا مذہبِ حنفیہ میں مکروہ ہے۔"

اس مسئلہ کا حوالہ مولوی سیّد امداد علی نے ان کتب سے دیا ہے: کنز، وقایہ، لقایہ، محقق، تنویر، مجمع البحرین، ہدایہ، کفایہ، عنایہ، نہایہ، فتح القدیر، مستخلص، زیلعی، بحر، نہر، اشتباہ، جامع قدسی، منح الغفار، درمختار، خلاصۃ الفتاوئ، سراجیہ، فتاویٰ صغریٰ اور فتاویٰ عالمگیریہ وغیرہم۔

مولوی سیّد امداد علی نے یہ رسالہ لکھ کر دیگر علماء کو دکھایا ہے اور ان سے اس مسئلہ کے متعلق ان کی رائے معلوم کی ہے۔ یہ علماء اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ جن علماء نے یہ رسالہ دیکھا ہے اور مولوی سیّد امداد علی کے حق میں رائے دی ہے ان کے نام یہ ہیں: محمد بشارت، ملاّ عبدالواحد خاں، محمد تقی الدین شمسی، محمد شمس الدین شمسی، محمد بشیر، نور الحسن، محمد عالم علی، سعد اللہ، سیّد امیر علی، محمد احتشام الدین، محمد تلطف حسین، محمد عبدالعزیز، سیّد محمد نذیر حسین، حفیظ اللہ، عبدالباسط، عبدالحمید، قمر الدین، محمد شہاب الدین الغزنوی، شریف حسین، الٰہی بخش، سیّد محمد حسین، علی احمد، محمد یوسف، بہاء الدین احمد، محمد عبدالرشید، محمد عبدالحلیم، محمد عبدالخورشید، خواجہ صباح الدین احمد، محمد عبدالغنی اور محمد ابراہیم۔

رسالہ میں ان علماء کی آراء کے ساتھ ان کے ناموں کی مہریں بھی لگی ہوئی ہیں۔

(برٹش لائبریری، لندن، {6 - 1} 14119. c. 20)

نسخہ مصححہ ایکٹ نمبر ۲۵، ۱۸۶۱ء وا یکٹ نمبر ۸، ۱۸۶۹ء

مع ضمیمہ ایکٹ ۸

مرتبہ جناب مولوی سیّد امداد العلی صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ

ضلع کانپور، دام اقبالہٗ موسوم مجموعہ۔ ضابطہ فوجداری

مطبع شعلہ طور، کانپور (صفحات ۲۰۲)

شیخ عبداللہ اس کتاب کے دیباچے میں فرماتے ہیں: ایکٹ نمبر ۲۵، ۱۸۶۱ء صحیح

شدہ مع ایکٹ نمبر ۸، ۱۸۶۹ء جو دفعہ ترمیم یا منسوخ ایکٹ نمبر ۸، ۱۸۶۹ء سے ہوئی تھی۔ وہ ایکٹ ۲۵، ۱۸۶۱ء کی ہر دفعہ منسوخ شدہ کی جگہ یا زیرِ دفعہ جہاں لکھا جانا ضروری تھا، ایکٹ ۸، ۱۸۶۹ء سے لے کر جس مقام پر ایکٹ ۲۵، ۱۸۶۱ء میں لکھ دینی چاہیے تھی قائم کی گئیں تاکہ ضرورت ملاحظہ ایکٹ ۸، ۱۸۶۹ء کی نہ رہے اور یہی ایکٹ ۸، ۱۸۶۹ء مولانا سیّد امداد العلی صاحب کو لگا دیا گیا اور اس کو جناب فیض مآب حاکم زبردست اقلیم قوانین مولانا سیّد امداد العلی صاحب سلمہ الوئی، ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ کانپور نے بکمال خوبی ترتیب فرما کر مہتمم شعلہ طور، کانپور کو واسطے طبع کے ارشاد فرمایا اور شیخ عبداللہ پرنٹر کے اہتمام سے مطبع شعلہ طور میں رونق طبع پائی۔

اس کتاب میں یہ ابواب ہیں:

۱۔ تعریفات کے بیان میں

۲۔ در بابِ حدود و اختیار عدالتہائے فوجداری

۳۔ قواعد ابتدائی

۴۔ سمن کے بیان میں

۵۔ وارنٹ اور اس کی تعمیل کے بیان میں

۶۔ گرفتاری بلا وارنٹ کے بیان میں

۷۔ حراست سے بھاگ جانے اور مکرر گرفتار ہونے کے بیان میں

۸۔ وارنٹ گرفتاری کے بیان میں

۹۔ تحقیقاتِ ابتدائی، معرفت پولیس کے بیان میں

۱۰۔ احکام کی تحقیر اور ان سے عدول کرنے کے بیان میں

۱۱۔ ثالثات متعلقہ حالات خاص کے بیان میں

۱۲۔ تحقیقاتِ ابتدائی معرفت مجسٹریٹ کے بیان میں

۱۳۔ مقدمات کا جو عدالتِ سیشن کے تجویز کے لائق ہیں

۱۴۔ فرد قرارداد جرم کے بیان میں

۱۵۔ ذکر مقدمات قابلِ تجویز مجسٹریٹ جن میں نالش پر وارنٹ جاری ہوسکتا ہے

۱۶۔ مقدمات قابلِ سماعت مجسٹریٹ کے بیان میں جن میں نالش پر علی العموم سمن جاری کیا جائے گا

۱۷۔ تحقیقات و تجویز مقدمہ بحضور مجسٹریاں ماتحت کے بیان میں

۱۸۔ جس مقام پر تحقیقاتِ ابتدائی و تجویز عمل میں آئی وہ عدالت عام سمجھا جائے گا

۱۹۔ مچلکہ اور ضمانت حفظ امن کے بیان میں

۲۰۔ نیک چلنی کے بیان میں

۲۱۔ اشیائے موجب خلائق کے بیان میں

۲۲۔ زوجات و اطفال کی پرورش کے بیان میں

۲۳۔ نزاعات متعلقہ قبضۂ آراضی یا حق استعمال آراضی یا آب کے بیان میں

۲۴۔ اہل جوری اور اسیسروں کے بیان میں

۲۵۔ پریزیڈنسی مندراس کے ججان ماتحت اور صدر الصدور کے بیان میں

۲۶۔ بابت تجویز مقدمہ بحضور عدالت سیشن

۲۷۔ رائے اور تجویز اور سزا کے بیان میں

۲۸۔ ججانین کے بیان میں

۲۹۔ عدالت صدر اس حیثیت سے کہ وہ ایسی عدالت ہے جس کے حضور میں مقدمات بھیجے جاتے ہیں

۳۰۔ عدالتِ صدر اس حیثیت سے کہ وہ ایسی عدالت ہے جو مقدمات پر نظر کرتی ہے

۳۱۔ اپیلیں

۳۲۔ قواعدِ عامہ

ان تمام ابواب میں دفعہ ایک سے دفعہ ۴۴۵ تک ہیں۔ اس کے بعد ضمیمہ شروع ہوتا ہے جس میں سمن کا نمونہ، وارنٹ گرفتاری کا نمونہ، سپردگی کے وارنٹ کا نمونہ، نمونہ مچلکۂ حفظِ امن، نمونہ مچلکہ پیروی نالش یا ادائے شہادت کے صفحہ ۱۲۲ سے ۱۲۵ تک موجود

ہیں۔ ضمیمہ ۱۲۶ صفحے سے ۲۰۲ صفحے تک ہے۔

باب ۵۔ اعانت کے بیان میں

باب ۶۔ جرائم خلاف ورزی کا سرکار کے بیان میں

باب ۷۔ جرائم متعلقہ افواج بحری و بری کے بیان میں

باب ۸۔ ان جرائم کے بیان میں جو آسودگی عامہ خلائق کے مخالف ہیں

باب ۹۔ ان جرموں کے بیان میں جو سرکاری ملازموں سے سرزد یا ان سے متعلق ہوں

باب ۱۰۔ سرکاری ملازموں کے اختیارات جائز کی تحقیر کے بیان میں

باب ۱۱۔ جھوٹی گواہی اور جرائم مخالف معدلت عامہ کے بیان میں

باب ۱۲۔ ان مجرموں کے بیان میں جو سکہ اور گورنمنٹ اسٹامپ سے متعلق ہیں

باب ۱۳۔ ان جرموں کے بیان میں جو باٹوں اور پیمانوں سے متعلق ہیں

باب ۱۴۔ ان جرموں کے بیان میں جو عامۂ خلائق کی عاقبت اور امن اور آسائش اور حیا اور عادات پر مؤثر ہیں

باب ۱۵۔ ان جرموں کے بیان میں جو مذہب سے متعلق ہیں

باب ۱۶۔ ان جرموں کے بیان میں جو انسانی جسم و جان پر مؤثر ہیں

باب ۱۷۔ اسقاطِ حمل کرانے اور جنین کو ضرر پہنچانے اور بچوں کو باہر ڈال دینے کے بیان میں

باب ۱۸۔ اور اخفائے تو کے بیان میں

باب ۱۹۔ مزاحمتِ بیجا اور حبسِ بیجا کے بیان میں

باب ۲۰۔ جرم مجرمانہ اور حملے کے بیان میں

باب ۲۱۔ انسان کو لے بھاگنے یا بھگا لے جانے اور غلام بنانے اور محنتِ بالجبر کے بیان میں

باب ۲۲۔ استحصال بالجبر کے بیان میں

باب ۲۳۔ مال کے تصرف بیجا مجرمانہ کے بیان میں

باب۲۴۔ مالِ مسروقہ لینے کے بیان میں

باب۲۵۔ دغا کے بیان میں

باب۲۶۔ فریب آمیز وثیقوں اور مال کو فریباً قبضہ سے علیحدہ کرنے کے بیان میں

باب۲۷۔ نقصان رسانی کے بیان میں

باب۲۸۔ مداخلت بیجا مجرمانہ کے بیان میں

باب۲۹۔ ان مجرموں کے بیان میں جو دستاویزوں سے اور حرفہ یا ملکیت کے نشانوں سے متعلق ہیں

باب۳۰۔ خدمت کے معاہدوں کے نقص ہرجانہ کے بیان میں

باب۳۱۔ ان جرموں کے بیان میں جو ازدواج سے تعلق رکھتے ہیں

باب۳۲۔ ازالہ حیثیت عرفی کے بیان میں

باب۳۳۔ تخویف مجرمانہ و توہین مجرمانہ و رنج مجرمانہ کے بیان میں

باب۳۴۔ جرموں کے ارتکاب کرنے کے اقدام کرنے کے بیان میں

باب۳۵۔ جرائم خلاف ورزی قوانین دیگر

''تعزیرات ہند'' کے بعد جرائم فوجداری پر یہ بہت اہم اور معتبر کتاب ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال میں اس سے بہتر قانون فوجداری پر کوئی ایسی کتاب اُردو زبان میں نہیں لکھی گئی ہے۔ (برٹش لائبریری، لندن، Urdu I.O.L. 498)

امداد الحساب

تالیف جناب مستطاب معلّی القاب مولوی سیّد امداد العلی خاں صاحب بہادر

ڈپٹی کلکٹر کانپور، دام اقبالہٗ

اوائل جمادی الآخر ۱۲۸۷ھ مطابق اوائل ستمبر ۱۸۷۰ء

باہتمام امیدوار غفران محمد عبدالرحمٰن

مطبع نظامی، کانپور، (صفحات ۴۴)

نوآموزوں خصوصاً لڑکیوں کے لیے جیسا کہ کتاب میں درج ہے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ مولوی سیّد امداد العلی کتاب کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

''بعد حمد اوس واحد حقیقی کے کہ جس کا ثانی نہیں ہے، میر امداد العلی ولد مولوی سیّد غلام مصطفیٰ اکبر آبادی حنفی نے یہ پہلا حصہ از نام 'امداد الحساب' واسطے تعلیم مبتدیوں خصوص لڑکیوں کے تالیف کیا ہے۔''

'امداد الحساب' میں ہندسہ، صورتِ رقم اور الفاظ گنتی کے دیے ہیں۔ مرتبوں کی تعداد یعنی اکن[۱] دہن [۱۰] سین [۱۰۰] ، ہزارن [۱۰۰۰]، لکھن [۱۰۰۰۰۰]، دہ لکھن [۱۰۰۰۰۰۰] کرورن [۱۰۰۰۰۰۰۰]،دہ کرورن [۱۰۰۰۰۰۰۰۰]، اربن[۱۰۰۰۰۰۰۰۰۰]،دہ اربن، کھربن،دہ کھربن وغیرہ دیے ہیں۔

کتاب میں اس کے علاوہ ایک سے بیس تک پہاڑے طلبا کے یاد کرنے کے لیے دئے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ پونا، سوایا اور ڈیوڑھا کے پہاڑے بھی دیے ہیں۔ اس کتاب میں رقوم لکھنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ دمڑی سے ٹکے تک لکھنے کا قاعدہ بتایا ہے۔ پائی کس طرح لکھی جاتی ہے۔ وزن میں رتّی، ماشہ، تولہ اور من، سیر، چھٹانک، آدھی، سوا، پون چھٹانک کس طرح لکھی جاتی ہے۔ ناپ کے باب میں گز اور گرہ کس طرح لکھتے ہیں۔ اس کتاب میں زمین کی پیمائش کے سلسلے میں بیگھہ، بسوہ، بسوانسی اور کچوانسی کا بیان ہے اور اس کو کس طرح لکھا جاتا ہے، بتایا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں ہندی، انگریزی اور اسلامی مہینوں کے نام دئے ہیں۔ اسلامی مہینوں کے ناموں کے ساتھ وہ نام بھی دئے ہیں جو عورتوں میں مروج ہیں۔ مثلاً محرم[محرم]، تیرا تیزی[صفر]، بارہ وفات [ربیع الاول]، میران جی[ربیع الآخر]، مدار [جمادی الاول]، خواجہ معین الدین[جمادی الآخر]، رجب [رجب]، شب برات [شعبان]، رمضان[رمضان]، عید[شوال]، خالی[ذیقعدہ]، بقرعید[ذی الحجہ]۔

ایک روپیہ سے سو روپیہ تک ہندسوں کے علاوہ کس طرح روپیہ لکھا جاتا ہے۔ سو سے ہزار، لاکھ، دس لاکھ، کرور، دس کرور وغیرہ وغیرہ مثلاً ایک روپیہ کے لئے عہ، دو روپیے کے لئے عب لکھتے ہیں۔

مولوی سیّد امداد علی تمام مسلمانوں کی تعلیم کے خواہاں تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ

مسلمان تعلیم میں کسی سے پیچھے رہیں۔ خاص طور سے آپ خواتین کی تعلیم کے بڑے علمبردار تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہماری عورتیں تعلیم کے معاملے میں کسی سے پیچھے رہیں۔ اس لیے آپ نے درس وتدریس کی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ حساب سکھانے کے لیے یہ کتاب خاص طور سے لڑکیوں کے لیے لکھی گئی ہے جیسا کہ اس کتاب کے سرورق پر تحریر ہے۔ کتاب کے آخر میں ذکر ہدایت ونمونۂ ہدایت بھی درج ہے۔ ذکر بہ، تربیت اور نمونہ ہے۔ (برٹش لائبریری، لندن، Urdu I.O.L. 831)

امداد المساحت حصہ اول

مؤلفہ جناب فیض مآب سیّد امداد علی صاحب، ڈپٹی کلکٹر بہادر، ضلع کانپور

مطبع مطلعِ نور، کانپور، ۱۸۷۰ء (کل صفحات ۱۶)

'امداد المساحت' (حصہ اول) پہلا قاعدہ مرتب ہوا ہے واسطے دریافت شکلوں، کھیتوں کے جو اکثر پیمایش میں واقع ہوتی ہیں۔ اس طریقۂ پیمائش کے جاننے سے غلطی نہیں رہتی۔ ایک نقشہ میں ۳۷ شکلیں دی ہیں اور ان شکلوں کے نام ہیں زاویہ قائمہ، مثلث، مربع مستطیل، دائرہ، قطر، مسدس، بیضوی، شکلِ ہلال، مدور میں مستطیل، منحرف، متوازی الاضلاع وغیرہ وغیرہ۔ ہر شکل کی پیمائش کرنے کے قاعدے بھی درج کیے گئے ہیں۔

امداد المساحت حصہ دوم

مؤلفہ جناب فیض مآب سیّد امداد العلی صاحب، ڈپٹی کلکٹر بہادر، کانپور

۱۸۷۰ء (صفحات ۴۷)

اس کتاب میں قواعد پیمائش، نقشہ حد بست، کشتوا کھینچنے کے طریقے اور جانچ اور امتحان کے قاعدے معہ مطالب مفیدہ مسطور ہیں۔ مولوی سیّد امداد علی اس کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

"اس رسالے سے پٹواریوں کو ایک مہینے میں پیمائش بخوبی آجاتی ہے۔ ممتحن اور منصرم لوگوں کو بھی یہ کتاب کافی مدد پہنچاتی ہے۔ یہ رسالہ مشتہر کیا گیا کہ پیمائش سیکھنے والے اور واقف پیمائش دونوں کے لیے مفید ہو۔

باب ا۔ قواعد پیمائش

باب ۲۔ طریقہ پیمائش حدوبست

باب ۳۔ طریقہ پیمائش تقاطع

باب ۴۔ طریقہ پیمائش انگل

باب ۵۔ طریقہ پیمائش حد بست صرف آلہ کراس ٹاف سے

باب ۶۔ طریقہ کھینچنے نقشہ کشتوار

باب ۷۔ طریقہ پیمائش شعاعی جس سے ایک مقام پر تختہ قائم کرنے سے چند کھیتوں کا نقشہ بن سکتا ہے

باب ۸۔ طریقہ پیمائش آبادی، موضع یا قصبہ، یا شہر مع احاطہ جو انتظام فکس چوکیداری وغیرہ سرکار کی مفید مطلب ہو مع نمونہ مدات خسرہ کہ جس سے مالک مکان و باشندہ و قوم و پیشہ مفصل ظاہر ہو سکے

باب ۹۔ طریقہ جانچ نقشہ حدوبست کے موقع پر

باب ۱۰۔ طریقہ جانچ نقشہ کشتوار کے موقع پر

باب ۱۱۔ طریقہ جانچ نقشہ حدوبست کے مقام صدر کچہری ہیں

باب ۱۲۔ طریقہ جانچ کشتوار صدر کچہری میں

باب ۱۳۔ طریقہ نقشہ حدوبست کے جس کی پیمائش ختم ہو گئی اور آخر میں غلطی معلوم کرنا پڑی اس کے دریافت کرنے کا طریقہ کہ کس مقام پر غلطی ہوئی

باب ۱۴۔ طریقہ تصفیہ سوانہ کہ جس سے مطابقت نقشہ صاحب سرویر و پیمائش حال کی ہوتی ہے

باب ۱۵۔ طریقہ طیاری [تیاری] نقشہ خسرہ صرف ایک جگہ دائرہ رکھ کر

باب ۱۶۔ طریقہ بنانے نقشہ سے خسرہ اور خسرہ سے نقشہ

باب ۱۷۔ دیکھنے جھنڈے زمین نشیب و فراز کے اور قاعدہ اس کی پیمائش کا

باب ۱۸۔ طریقہ نکالنے عمود داخلی خارجی کا

باب ۱۹۔ طریقہ جوڑنے کاغذ کے تختے پر

باب ۲۰۔ طریقہ گھٹانے و بڑھانے نقشہ کا اور نصف کرنا خواہ دونا کرنا رقبہ کا۔ پہلی طریقہ جاری کیا جاتا ہے

باب ۲۱۔ طریقہ پیمائش کا اوس صورت جب کہ چند کس پیمائش کنندہ ایک موضع میں مقرر کئے گئے ہوں

باب ۲۲۔ طریقہ نکالنے رقبہ حد و بست کا کشت ہائے مربع بنا کر جس سے رقبہ بصحت تمام نکل سکتا ہے

رسالے کے آخری صفحے پر پرنٹر کی التماس درج ہے۔

"التماس یہ ہے کہ جناب فیض مآب سیّد امداد العلی صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر کانپور نے تین حصہ [جلدیں] طریقہ وغیرہ واسطے پٹواریوں وامتحان کے طیار [تیار] کر کے حق تالیف اس کا اس بندہ کو عطا فرمایا ہے۔

امداد المساحت حصہ سوم

"اس میں خاص وہ احکام صاحبان صدر بورڈ کے ہیں جو پیمائش سے اور ترتیب خسرہ و کھتونی وغیرہ سے متعلق ہیں واسطے پٹواریان ضلع کانپور حسب ارشاد جناب مسٹر ہانسی صاحب کلکٹر بہادر کے سیّد امداد العلی صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر کانپور نے طیار [تیار] کیا۔

مطبع مطلع نور، کانپور

قیمت فی جلد ۴/۰/ (ساڑھے چار آنے)

اس کتاب میں دفعہ ۳ سرکلر نمبر ۵ مورخہ فروری ۱۸۶۷ء اور دفعہ ۵ سرکلر نمبر ۲۵ مورخہ جون ۱۸۶۷ء بھی درج کیا گیا ہے۔ (برٹش لائبریری، لندن Urdu I.L.o. 884)

نصیحۃ النسواں

مولفہ جناب افضل العلما، ابلغ البلغا نودعی والمعی علامی وفہامی سیّد امداد العلی

باہتمام منشی بہاری لال در مطبع نور، کانپور (صفحات ۲۸)

فارسی زبان میں ایک کتابچہ "گوہر شاہوار نصائح" جس کا اُردو ترجمہ سیّد امداد علی

نے کیا ہے جیسا خود فرماتے ہیں:۔

"بعد حمد پروردگار وثنائی سیّد ابرار سیّد امداد العلی ولد سیّد غلام مصطفیٰ اکبرآبادی نے گوہر شاہ وارِ نصائح کو رشتہ عبارت اُردو میں کھینچ کر نام اس رسالہ سراپا منافع کا 'نصیحۃ النسواں' رکھا۔" (صفحہ۲)

'نصیحۃ النسواں' میں یہ ابواب ہیں:۔

۱۔ عورت کو چاہئے کہ جس میں شوہر کی خوشی ہو اوس کو اپنی خوشی سمجھے اور اطاعت شوہر کی کرے۔

۲۔ عورت کو چاہئے کہ بلا اجازت شوہر کے کوئی حال شوہر کا کسی کو نہ دے۔

۳۔ عورت کو چاہئے کہ راز اپنا اور اپنے شوہر کا کسی ماما یا مغلانی یا ددا یا دائی سے نہ کہے اور نہ بہت دوست بنائے۔

۴۔ عورت کو چاہئے کہ شریک رنج شوہر کے رہے۔

۵۔ عورت میں صلاحیت اور عفت بڑی نعمت ہے۔

۶۔ عورت کو چاہئے کہ بے اجازت اپنے شوہر کے گھر سے باہر نہ جاوے۔

۷۔ عورت کو چاہئے کہ حیا اور شرم کو نگاہ میں رکھے یعنی شرم کی خصلت سب خصلتوں سے بہتر اور پسندیدہ ہے۔

۸۔ بڑی نیک بخت وہ عورت ہے جو اپنے شوہر کا شکوہ کسی سے نہ کرے۔

۹۔ عورتوں کو علم حاصل کرنا خانہ داری کے معاملات کے لیے نہایت ضروری ہے عورتوں کو علم ہی کے سبب سے مردوں پر شرف ہوا ہے۔

۱۰۔ عورتوں کو لازم ہے کہ بہت درستی سے کاروبار گھر کا کریں اور کسی مرد یا عورت کو جس کا آنا شوہر کو پسند نہ ہو نہ آنے دیں۔

۱۱۔ شوہر کے پیچھے چیخ کر نہ دوڑیں۔

۱۲۔ تمام اہلِ علم کہتے ہیں کہ بدن کو ڈھکنا بے پوشاک اور بدن میں قوت بے کھائے ہو نہیں سکتی، اور حاصل ہونا قوت اور لباس کا بدون کسب کے ہو نہیں سکتا۔

ان بارہ نصائح کے متعلق مولوی صاحب نے دلچسپ اور پُر لطف کہانیاں بیان کی ہیں ۔ مولوی صاحب تعلیم نسواں کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے سیّد امداد العلی فرماتے ہیں :-

''اے عورتو! علم سے دنیا میں عزت اور شرف آخرت ہے۔ علم کی سلطنت کو کبھی زوال نہیں ۔ چور کو علم کی دولت چورانے [چرانے] کی مجال نہیں ۔ جس کو علم نہیں وہ مثل خانہ تاریک کے ہے کہ جس میں چراغ نہیں۔ علم ہی کے سبب عورت عاقل کہلاتی ہے۔ اگر بوڑھی کی عقل ہے تو وہ بیکار مثل چشمۂ خشک کے ہے۔ علم ہی سے ادب حاصل ہوتا ہے۔ اگر عورت جوان بے علم و بے ادب ہے وہ مثل ایک باغ کے ہے جس میں پھل اور پھول نہیں ۔ حیا ہی علم سے نصیب ہوتی ہے۔ اگر عورت صاحبِ جمال ہے اور اس میں بے علمی سے حیا نہیں ہے تو وہ مانند کھانے بے نمک کے ہے۔'' (صفحہ ۲۲)

آزادیِ نسواں اور عورتوں کی تعلیم کے سیّد امداد علی بہت حامی تھے۔ انھوں نے اپنی دورانِ ملازمت مراد آباد میں لڑکیوں کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو آج تک جاری و ساری ہے ۔ مدرسے کے سارے اخراجات ''وقفِ امدادیہ'' برداشت کرتا ہے۔ مولوی صاحب نے رفاہِ عامہ کے لیے اپنی زندگی میں کافی جائداد وقف کی تھی جو آج کل یو۔ پی۔ وقف کے تصرف میں ہے۔

علم حاصل کرنے کے سلسلے میں مولوی صاحب نے نصیحت کی کہ:-

''تحصیلِ علم کا یہ فیض ہے کہ اگر کہتر ہو تو مہتر ہو جاوے اور اگر فقیر ہووے تو صاحبِ دولت ہو جاوے۔ بس بہر حال عمرِ عزیز کو شغل تحصیل علم میں صرف کرنا چاہیے۔''

(برٹش لائبریری، لندن، Urdu I.O.L. 884)

امداد الادب ہر چار حصہ

''علم صرف میں نہایت عمدہ کتاب ہے۔ مسائلِ صرف کا بیان لاجواب ہے۔''

تصنیف لطیف و تالیفِ نظیف

فاضل اجل و محقق اکمل جناب مولوی سیّد امداد العلی صاحب بہادر

ڈپٹی کلکٹر ضلع کانپور، دام فیوضہ
برائے افادہ طالبانِ علمِ تصریف
مطبع نول کشور، کانپور یکم اکتوبر ۱۸۷۱ء (صفحات ۳۰۶)
سیّد امداد العلی اس کتاب کے مقدمے میں فرماتے ہیں:-

''سیّد امداد العلی ولد مولوی سیّد غلام مصطفیٰ اکبر آبادی حنفی کہ یہ کتاب علم تصریف میں کہ علم صرف بھی اس کو کہتے ہیں ترتیب اس کی ایک مقدمہ اور چار حصہ یہ اس مراد سے ہے کہ تھوڑی عمر کے لڑکے کہ اون [اُن] کو دفعتاً باریک مطلب سمجھنا مشکل ہے اس طریقے سے بتدریج ہر مطلب کو اس علم کی بآسانی حاصل کریں اور نام اس کتاب کا 'امداد الادب' ہے۔ مقدمہ میں بیان اون [اُن] چیزوں کا مقصود کے سمجھتے ہیں اون [اُن] سے تائید ہے اور پہلے حصے میں عرب [عربی] کے لفظوں کے وزنوں اور بعض اون [اُن] کے متعلقات کا بیان ہے کہ اون [اُن] کے جاننے پر جاننا صیغوں کا موقوف ہے۔ اور ہر حصہ میں بیان اون [اُن] قاعدوں کا ہے کہ اون [اُن] سے تغیر اور تبدل عرب [عربی] کے لفظوں کا معلوم ہوتا ہے اور تیسرے حصے میں دوسرے حصے کے قاعدوں کی شرطوں اور اختلافات کا بیان ہے اور چوتھے حصے میں بیان اون [ان] چیزوں کا ہے کہ اس علم کی اعلیٰ تحصیل والوں کو اون [اُن] کا جاننا ضرور ہے۔'' (صفحہ۲)

مقدمہ میں موضوع علم، کلمہ، تعریف علم، معنی مرکب، معنی مفرد، کلمہ، فصل، اسم، حرف، ماضی، حال، مستقبل، مضارع، امر، نہی، ثلاثی، رباعی، اور رباعی کی اقسام، بحر ثلاثی مجرد، رباعی مجرد نقشہ اوزان فعل ثلاثی مجرد، گردان اوزان فعل ثلاثی مجرد، نقشہ اوزان اسم جامد، نقشہ اوزان مصدر، نقشہ اوزان مبالغہ، مصدر ثلاثی مجرد، نقشہ اوزان مصادر ثلاثی مزید، غیر ملحق یا ہمزہ۔ وصل، نقشہ اوزان مصادر ثلاثی ملحق بافشرا (کہ چار وزن میں) نقشہ وزنِ رباعی مجرد کہ ایک وزن ہے، اسم مشتق اور اس کی چھ اقسام، اسم فاعل، اسم مفعول، اسم تفضیل، اسم آلہ، اسم ظرف، صفتِ مشبہہ، نقشہ اوزان ملحقات اسم فاعل، نقشہ اوزان اسم بمعنیِ مفعول از ثلاثی مجرد، نقشہ اوزان صفتِ مشبہہ، نقشہ گردانِ مشتقاتِ ثلاثی مجرد، نقشہ گردان ابوابِ ثلاثی

مجرد، نقشہ گردانِ ثلاثی مزید مطلق با ہمزۂ وصل اور اس کے نو باب ہیں۔

یہ عربی قواعد ہے۔

نقشہ گردان ابوابِ ثلاثی مزید ملحق، شد جرح رباعی مزید کہ نو باب ہیں، الفاظ جمع مذکر، نقشہ اوزانِ جمع کثرت، نقشہ اوزانِ اسمِ جمع، نقشہ اوزانِ اسم مصغر۔

دوسرا حصہ

اس کتاب کا دوسرا حصہ صفحہ ۱۳۶ سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں بیان ہے ان قاعدوں کا کہ ان سے تغیر اور تبدل عرب [عربی] کے لفظوں کا معلوم ہوتا ہے۔ قواعد کے مذکور ہونے سے پہلے جان لینا چند امور کا ضرور ہے۔ سب فعل اور اسم عرب [عربی] کے چار قسم ہیں۔

۱۔ صحیح ۲۔ مہموز ۳۔ معتل ۴۔ مضاعف

اصول مضاعف اور اس کے متعلقات کے جن میں تخفیف ادغام کی درمیان حرفین متجانسین کی آتی ہیں۔

تیسرا حصہ

کتاب کا تیسرا حصہ صفحہ ۱۶۷ سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں شرطوں اور اختلافات اور متعلقات اور ان قاعدوں کا بیان ہے جو کہ دوسرے حصے میں مذکور ہیں اور نقشہ ذیل میں علامت قاعدہ کے ساتھ ذکر کرنے مثال کے جو اس قاعدے میں مرقوم ہے ٹھہرائی گئی ہے۔

نقشہ شروط قواعد تخفیف ہمزہ اور اختلافات اور متعلقاتِ قاعدہ یقال و بیاع قاعدہ اوائل، قاعدہ عجائز

چوتھا حصہ

چوتھا باب صفحہ ۱۹۰ سے شروع ہوتا ہے۔ اس حصے میں بیان ان امور کا ہے کہ علم صرف کو اعلیٰ تحصیل والوں کو جاننا ان کا ضرور ہے اور یہ امور: ۱۔ خاصیات ابواب، ۲۔ نسبت، ۳۔ التقائے ساکنین، ۴۔ ابتدا، ۵۔ وقف، ۶۔ امالہ، ۷۔ زیارت، ۸۔ ابدال، ۹۔ قلب، ۱۰۔ حذف، ۱۱۔ تمرین اور ۱۲۔ تتمہ اس حصے کا خاتمہ ہے کہ جس میں ذکر ہے رسم الخط کا

اس میں نقشہ خاصیت ابواب کے ہیں۔

کتاب کے آخر میں تحریر ہے: ''یہ نسخہ جامع قواعد صرف نہایت نادر و اغرب مسمّی بامداد الادب مولفہ مولوی سیّد امداد العلی اکبر آبادی ڈپٹی کلکٹر ضلع کانپور واسطے معلمان و متعلمان علم و ادب کے ممد و معاون بیمثال ہے اور فی الواقع کہ حضرت مولف موصوف نے باجتماع قواعد کلیہ بحذف و اسقاط زواید و تخفیف از دیاد تفصیل باتیانِ ہر گونہ قواعد بنہایت قل و دل کتاب ہذا کو اس طرح سے مدون فرمایا کہ دراصل درس و مطالعہ اس کے سے جس قسم کا خدشہ فنِ صرف میں طلبہ علوم کے دلوں میں نصب ہو تو فوراً رفع ہو کر منجر باسکان و تسلیہ ہوگا۔'' (صفحہ ۲۰۶) اس کتاب میں ۲۰۶ صفحات ہیں۔ اُردو زبان میں یہ ایک ضخیم اور معرکتہ الآرا عربی قواعد پر کتاب ہے۔ (برٹش لائبریری، لندن، Urdu (I.O.L.564

امداد المسلمین بالانتصار خصم من المبتدعین
مولفہ جناب فیض مآب جناب مولوی سیّد امداد العلی صاحب بہادر
ڈپٹی کلکٹر ضلع کانپور
مطبع نول کشور کانپور ۷ر دسمبر ۱۸۷۰ء (صفحات ۲۶)

مولوی سیّد امداد العلی کتاب کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں:۔

''اما بعد سیّد امداد العلی سنی حنفی اکبر آبادی کی طرف سے واضح ہو کہ فی الحال تین رسالہ درباب جواز عمل مولد نام سے طالب علموں مدرسہ قادریہ کے جو مولوی عبد القادر صاحب اور مولوی فضل رسول صاحب کے شہر بدایوں میں جاری ہے چھپ کر مشتہر ہوئی۔ مولوی عبد الصمد سہوانی اوس مدرسہ کے طالب علم نے رسالہ 'کبریٰ' کے صفحہ ۶ میں لکھا کہ رواوی وہابیہ نے رسالہ 'امداد المسلمین' میں اون ناموں کو بشمول اور ناموں کے حصول میں داخل کیا انتہیٰ اور اسے رسالہ کے صفحہ ۱۸ میں وہابیہ کا حال نقل کیا کہ نکلے وہ نجد سے اور متغلب ہو کر حرمین پر اور انتحال کرتے تھے مذہب حنابلہ کا لیکن اونھوں نے اعتقاد کیا کہ وہی مسلمان ہیں جو اون کے اعتقاد کے خلاف ہے وہ مشرک ہے اور مباح جانا بسبب اس

کے قتل اہلِ سنت اور اون کے علماء کا انتہیٰ اور بھی اسے رسالہ کے صفحے ۲۲ میں لکھا کہ وہابیہ کا یہی عقیدہ ہے کہ جو اون کے طریقے کے خلاف ہے وہ کافر ہے اور اون کا خون مباح ہے انتہیٰ سوا استکشاف اس کا منظور ہے کہ صاحب 'امداد المسلمین' کو روا وی وہابیہ کس وجہ سے لکھا گیا۔ 'امداد المسلمین' میں صفات اور عقائد وہابیہ کے جو اس رسالہ کے صفحہ ۱۸ یا صفحہ ۲۲ میں مسطور ہیں مذکور ہیں۔ اگر ہیں تو اس کی نشاندہی چاہئے اگر نہیں ہیں تو مولوی فضل رسول صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب اون کے حلیف مہتمین مدرسۂ مذکار کے لئے ایسے طالب علم کو کہ ایک قوم کے برے صفات اور اعمال وعقائد بیان کر کے کسی مسلمان سنی حنفی کو کہ اون صفات واعمال وعقائد سے یقیناً بیزار ہے اوس قوم میں سے از روئے افترا شمار کرنا اور یہ فعل اس کا بلاشبہ ایسا ہے جیسے کہ صاحب بوارق کو مثلاً باوجود ادعائے محمدیہ کے یہودی کہے کہ صریح افترا ہوگا آیا اپنے مدرسہ میں جگہ دینا جائز ہے۔ ہر چند رسائل ثلثہ اہلِ سنت اور اصحاب تقویٰ اور ذہانت کے عیب چھینٹوں سے پُر ہیں اور سب وشتم سے مالا مال اور یہ طریقہ اپنا نہیں لیکن واسطے اظہار برأت اہلِ تقویٰ اور ذہانت کے اور صیانت مسلمین کے عقائدِ مخالفین سے چارہ جوئی بدون تحریر جواب کے نہیں بریں موجب الضرورات تبیح المطورات یہ رسالہ لکھا گیا۔" (صفحہ ۱،۲)

اس کتاب میں ایک مقدمہ اور تین باب ہیں:

باب اوّل میں بیان ہے حکم عمل مولد کا۔

باب دوم میں بیان ہے بعض ہفوات اور اکاذیب اور اغلاط مبتدعین اور مجوزین عمل مولد کا۔

باب سوم میں جواب ہے مطاعن مندرجہ رسائل ثلثہ کا۔

(برٹش لائبریری، لندن، Urdu I.O.L. 523)

امداد المساجد

محررہ جناب مولوی سیّد امداد العلی صاحب بہادر، ڈپٹی کلکٹر، ضلع مراد آباد

سیّد امداد العلی تحریر کرتے ہیں:-

کہتا ہے مسکین سیّد امداد العلی ولد مولوی سیّد غلام مصطفیٰ اکبرآبادی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ 'مسجدیں گھر اللہ کے ہیں۔'

مفتی مولوی ارشاد حسین رامپوری نے فنا مسجد (رامپور) میں اپنے اور اپنی بیوی کے رہنے کے لیے مسجد کے ایک دالان میں عمارت اور پاخانہ وغیرہ بنوایا۔ اس کی اجازت جامع مسجد آگرہ کے ممبروں نے بھی دی ہے۔ اس پر مولوی سیّد امداد العلی اعتراض کیا ہے کہ یہ خلافِ شرع ہے۔

تمام علمائے رامپور یعنی مولوی حاجی لطف اللہ، مولوی ظہور الحق، مولوی شاہ علی اور مولوی اکبر علی خاں۔ مولوی سدید الدین خاں نے مولوی ارشاد حسین کو ٹوکا۔ لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

مولوی سیّد امداد العلی نے علمائے دہلی اور دیگر دیاروں کی خدمت میں یہ فتویٰ پیش کیا:۔

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین و متقیانِ شرعِ متین ان مسئلوں میں بموجب حنفیہ کہ نقشہ جس مسجد کا ہے اس کے تسبیح خانہ جنوبی کے نیچے سے تا تسبیح خانہ شمالی کے دالان صحن مسجد سے ملحق ہیں .... مگر تحریر یہ بھی ہو کہ وطی کرنا اس پر اور پیشاب اور پاخانہ اس واسطے کہ وہ مسجد ہے، ظاہر آسمان تک مرقوم ہے پس فنا مسجد پر شب و روز رہنا اور بول و براز کرنا جائز ہے یا ناجائز اور جس مسجد میں حوض ہو اوس میں جنبی اور حائضہ کو حوض تک جانا جائز ہے یا ناجائز؟

اس کا جواب مولوی ارشاد حسین نے یہ دیا کہ یہ دالان جس کے نیچے دکانیں ہیں داخل مسجد نہیں ہیں۔

مولوی لطف اللہ، مولوی اکبر علی خاں، مولوی شاہ علی اور مولوی عبدالکریم وغیرہم سکناءِ رام پور نے رد فرمایا۔ مولوی عبدالقادر نے فتویٰ مولوی ارشاد حسین کا دکھایا لیکن انھوں نے نہ مانا۔ اس سلسلے میں علمائے غازی پور، جلیسر، اعظم گڑھ، مرادآباد وغیرہم کے فتاویٰ شائع کیے ہیں۔ بھوپال جس میں محمد مجید الدین، سیّد محمد عبدالرشید، محمد حسین، محمد ظہور الحق، سیّد مظہر حسین، شرافت علی، محمد علی، فضل الرحمٰن، محمد عثمان، محمد شکر اللہ، محمد تصدق حسین،

محمد حبیب اللہ، محمد عبدالعظیم، محمد اسماعیل، محمد بشیر الدین خاں، محمد ایوب مفتی، سیّد محمد، محمد عبدالحئی، ابوالحسنات محمد اکرم، محمد عبدالحلیم (فرنگی محلی) وغیرہم تمام علماء کے فتاوے کے جواب اوران کے نام کی مہریں بھی صفحہ ۷۰ تک ثبت ہیں۔

کتاب کے آخر میں مولوی محمد گل خاں نے یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے:۔

گفت ہاتف وصف، تالیفِ کتاب مظہرِ حق مبطل باطل شدہ
ایں سبب عالم ہمہ ایں لفظ خوش با تو گوید شاد باش دہر گہ
=۱۲۶۹ھ

اور دوسرا قطعہ تاریخ مولوی سیّد عبدالرشید نے لکھا ہے:۔

چو امداد العلی فخر سادات تعلم و فضل سرخیل اماجد
رقم فرمود فرخندہ کتابے ز بہر نفع ہر راکع و ساجد
سر دشمن شکن تاریخش آمد رضائے حق بامداد المساجد
=۱۲۶۹ھ

بامداد الحجاج

تالیف سیّد امداد العلی سی۔ ایس۔ آئی، ڈپٹی کلکٹر درجہ اول، ضلع مراد آباد
در مطبع ہند، باہتمام منشی بشن سروپ
صفحات ۵۴۰ جلد اول، ۱۸۸۱ء

سیّد امداد علی کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں:۔

"فقیر حقیر سیّد امداد العلی سی۔ ایس۔ آئی۔ ولد مولوی سیّد غلام مصطفیٰ اکبر آبادی سب بھائی مسلمانوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے [آیتِ ربّانی] (ترجمہ) اور واسطے اللہ کے ہے اوپر لوگوں کے حج کرنا اوس گھر کا یعنی کعبہ کا۔ جو کوئی پا سکے طرف اوس کی راہ اور جو کافر ہوا پس تحقیق اللہ بے پرواہ ہے عالموں سے۔"

مولوی سیّد امداد العلی حج کی تعریف کرتے ہوئے یہ شرائطِ شرعیہ عائد کرتے ہیں:۔

پہلی شرط وجوب اسلام۔ (کافر جو دولتمند تھا اسلام لانے کے بعد محتاج ہوا وجوب حج کا اس کے ذمے قائم رہے گا)۔

دوسری شرط وجوب حج حریت یعنی آزادی (غلام یا لونڈی پر فرض نہیں)

تیسری شرط وجوب حج عقل (مجنون پر فرض نہیں)۔

چوتھی شرط وجوب حج بلوغ (نابالغ لڑکا لڑکی پر فرض نہیں)۔

پانچویں شرط وجوب حج وقت (مراد حج کا مہینہ)

چھٹی شرط وجوبِ حج دینا نفقہ عیال اور امورِ ضروری کا لوٹنے تک (نفقہ کھانا کپڑا دینا)۔

ساتویں شرط وجوب حج زادو راحلہ۔

حج منرورا (جس میں کوئی گناہ نہ کرے)، کبھی حج حرام کہلاتا ہے (یعنی مالِ حرام سے حج کرنا)، کبھی حج مکروہ کہلاتا ہے (بغیر اجازت والدین، زوجہ، عزیز، جن کا نفقہ اس شخص پر واجب ہے)۔

آٹھویں شرط وجوبِ حج زادو راحلہ (چھوٹی کاٹھی والا اونٹ)۔

نویں شرط ادائے وجوب حج صحت بدن (یعنی بیماری وغیرہ نہ ہو)۔

دسویں شرط ادائے وجوب حج، راہ کا امن (راستے میں امن و ایمان)۔

اس کے علاوہ دو شرطیں اور ہیں:-

اوّل شرط ادائے وجوب حج خالی ہونا عدّت سے۔

دوسری شرط ادائے وجوب حج خاوند یا محرم کا ساتھ ہونا۔

سیّد امداد علی نے قرآن کریم اور احادیث شریف کے عین مطابق جگہ جگہ مفصل بحث کی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں یہ ابواب قائم کیے ہیں:-

عمرہ سنّت ہے جن کے نزدیک۔

عمرہ واجب ہے جن کے نزدیک حج کے سفر میں جو مرتا ہے، ثوابِ حج و عمرہ پاتا ہے۔

صفتِ حاجی:

فضیلت حج و عمرہ

طواف

لبیک
حق العباد
مطلع سفر
مطلع سفر کے باب میں بہت تفصیل سے کتاب میں درج ہے۔ اس کے بعد میقات احرام، حج کی دو قسمیں بتائی ہیں جن میں:۔
غسلِ احرام
خشکی کا بیان
تری کا بیان
مکے کی تعریف
صحت احرام (اور)
حج و احرام نائب واجبر، بیان کیا گیا ہے۔
بیان اس کا کہ تمتع افضل ہے یا قران (اور پھر)
تمتع کا بیان (تمتع = عمرہ کیا جاوے)
متمتع کا تعریف
شرائط تمتع
بیان تمتع
بکری عضب کے ذبح کرنا
قران کی تعریف
قارن کیوں کر ہوتا ہے
تعریف بدنہ
مفرد بالحج
دخول مکہ
طواف قدوم

طوافِ صحیح

طوافِ صبی

طوافِ قارن

اضطباع طواف میں

گانٹھ لگانا متعلق اضطباع

رمل کا بیان

حجر اسود کا بیان

رکن یمانی وشامی وعراقی

زمزم وملتزم کا بیان

مسائل داخلی کوٹھہ کعبہ افضلیت تمام وطواف داخل کوٹھہ کعبہ

دوسرا فرض وقوف عرفہ کے دن

عرفات میں ٹھہرنا

جمع نماز وتعلیم غرہ

احکام امام متعلق بہ عرفات

واجب عرفہ میں ٹھہرنا کب تک ہے

مزلفہ

حلق یا تقصیر واجب ہے

ترک اس کے سے دم لازم ہے

تیسرا فرض حج طواف

زیارت (ہے)

شرائط صحت طواف زیارت

واجبات طواف زیارت

امام مالک اور دیگر علماء کے اعتقادات کے لحاظ سے لکھے ہیں اور یہ مسائل ایک ہی

جگہ لکھے ہیں۔

ارکان حج کے متعلق یہ نہایت جامع اور مستند تصنیف ہے جو مولوی صاحب نے فرمائی ہے۔ حج کے مسائل کے بعد اور حج کے مسائل پر غالباً اُردو زبان میں سب سے پہلی کتاب ہے جس میں قرآن مجید اور احادیث شریف کے جگہ جگہ اقتباسات دے کر مستند بنایا گیا ہے۔

راقم الحروف نے برٹش لائبریری میں بہت تلاش کیا لیکن حج پر اس سے زیادہ قدیم اور ضخیم کتاب نہیں دیکھی۔ حج کے متعلق تمام مسائل درج ہیں اور اگر کسی مسئلے پر چاروں فقیہوں میں اختلاف ہے تو ہر امام کے بارے میں ان کے الگ الگ اعتقادات بتائے ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے حصے میں ان احکامات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اسلام کی رو سے جو خاص طور پر عورتوں کے لیے ہیں = اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سیّد امداد العلی کو کس قدر خیال آزادیِ نسواں کا تھا اور عورتوں کے حقوق کو کس قدر اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس کتاب میں صفحہ ۱۸۰ سے ۱۹۵ تک احکامِ حج کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ (برٹش لائبریری، لندن، 14104.F.28

امداد الآفاق برجم اہل النفاق بجواب تہذیب الاخلاق

تالیف مولوی سیّد امداد العلی خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔

ڈپٹی کلکٹر کانپور، مطبع نظامی، کانپور، صفحات ۸۸، ۱۲۹۰ھ

جوابات تحریرات جناب سیّد احمد خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ جج عدالت خفیفہ بنارس مندرجہ تہذیب الاخلاق از طرف جناب مولوی سیّد امداد العلی خاں صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ ڈپٹی کلکٹر کانپور۔

سیّد امداد العلی کی شروع میں بہت دوستی تھی۔ لیکن سر سیّد کے ملحدانہ خیالات پر ان کو لکھ کر منع کیا جس سے سر سیّد ناراض ہو گئے۔ سیّد امداد لکھتے ہیں:۔

"میرے بعضے قدیم دوست نئے نئے خیالات اور عجیب عجیب معاملات مختلف صورتوں میں ظاہر کرتے ہیں .... بحث کرنے سے قلم اور زبان کو ہمیشہ روکتا ہوں،

ہاں مذہبی مسائل ہیں جو انھوں نے صریح قرآن اور حدیث اور اجماع اہل اسلام میں خلاف کیا ہے۔ اس میں البتہ حق کو ظاہر کرتا رہا ہوں اور مسائلِ دینی کو جو انھوں نے ملحدانہ طور پر بیان کیا ہے اوس پر مسلمانوں کو بلکہ غیر مذہب والوں کو بھی آگاہ کرتا رہا ہوں۔ مدرسہ العلوم کی نسبت سوائے لکھنے اوس خط کے جواب کے جو انھوں نے اس بارے میں میرے پاس بھیجا تھا کوئی رائے خاص میں نے ابھی تک نہیں دی تھی۔ اب پرچہ تہذیب الاخلاق نمبر ۳ مورخہ ۱۰ ر صفر ۱۲۹۰ھ میں جو کہ میں بھی بزمرۂ مخالفین تجویز مدرسہ العلوم معدود کیا گیا ہوں کچھ لکھنے اور کہنے کا مجھ کو موقعہ ملا ہے۔"

"جناب سی۔ ایس۔ آئی۔ سیّد احمد خاں صاحب بہادر نے مخالفین تجویز مدرسہ العلوم کو جو سات قسم پر بیان فرمایا ہے۔ کس کو خبیث النفس اور بد باطن کہا، کس کو یار اپنا بنا کے حاسد اور اپنی ترقیات پر خفا ہونے والا قرار دیا، کسی کو متعصب وہابی بیہودندہ الامت ٹھہرایا اور کسی کو خود غرض اور خود پرست فرمایا۔ اور کسی کو ٹٹ پونجیا اخبار نویس لکھا، اور کسی کو بے تمیز اور کسی کو نادان مسلمان بیان کیا۔ سو مخالفین اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم کو اس کی کچھ شکایت جناب سیّد احمد خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ سے نہیں ہے کہ شاید وہ معذور ہوں۔ (صفحات ۲ اور ۳)

سیّد امداد پرچہ تہذیب الاخلاق کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"پرچہ تہذیب الاخلاق نمبر مورخہ یکم محرم ۱۲۹۰ھ میں جو موثر ہونا اس پرچے کا اس سے سمجھتے ہیں کہ کانپور اور گورکھپور اور مراد آباد سے اس کے مضامین رد ہوتے ہیں اور قوم کے دلوں میں ایک تحریک آگئی ہے۔" (صفحہ ۳)

سیّد امداد جو خود بھی ماہر تعلیم تھے انھوں نے اپنے زمانہ قیام مراد آباد میں ایک مدرسہ وہاں قائم کیا تھا۔ سر سیّد کے علی گڑھ کے مدرسہ العلوم میں جو کتابیں داخل نصاب تھیں ان پر تنقید کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

"بہت سی کتابیں درس میں ایسی داخل ہیں جن سے عمر ضائع ہوتی ہے اور بعضے علوم ایسے پڑھائے جاتے ہیں جو نہ دین کے کام کے ہیں، نہ دنیا کے، ناز کرتے ہیں جا بجا

مدارسِ اسلامی مقرر ہونے کو بھی اثر تجویز مدرسہ العلوم کا جانتے ہیں تو یہ سب آثار اور مخواص اسی مرض کے ہیں جب کوئی مفسد عالم میں فساد پھیلاتا ہے یا کوئی نادان بے وقوفی کا کام کرتا ہے تو اصلاح کرنے والے اس مفسد کے فساد پر لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں تاکہ بندگانِ خدا اس کے شر سے محفوظ رہیں اور عقلاً اس نادان کی بے وقوفی کو عام لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہیں تاکہ لوگ اس بے وقوفی کے کام کو نہ کریں اگر چہ اس مفسد کا فساد اور اس نادان کی بے وقوفی جیسی واسطے اس مفسد اور اس نادان کے خران کا موجب ہے ویسے ہی اس کے لیے جو اس فساد کی اصلاح کرنے والا ہے اور اس بے وقوفی پر لوگوں کو متنبہ کرنے والا منفعت کا جو موجب

برخم و پیچی کہ شد از تارِ زلفِ یار شد　　　دام شد، زنجیر شد، تسبیح شد، زنار شد"
(صفحہ ۳)

سیّد امداد العلی تحریر فرماتے ہیں:-

"بہت سے ہندو اور مسلمان ہندوستان میں ایسے ہیں کہ اون کو سی۔ ایس۔ آئی۔ ملے اور قاعدہ پچپن سالہ سے علٰحدہ ہو گئے اور اون کو کچھ مہلت ملی اون کی ترقیات کو دیکھ کر اون کے کسی پورانے یار نے ان پر حسد نہ کیا اور اپنے فخر اور دل کی ٹھنڈک کو اس میں نہ سمجھا کہ اون کے کاموں میں جھوٹے سچے عیب نکالیں، جھوٹی سچی تہمتیں اون کو لگائیں اور اس طرح دل کے جلے پھپھولے پھوڑیں سبب خصوصیت اس حسد کا ساتھ سیّد احمد خاں صاحب کے میں نہیں معلوم کر سکتا ہوں۔"

"جو لوگ تجویز مدرسہ العلوم کے مخالف ہیں اون میں سے بعض وجاہت دنیا میں جناب سیّد احمد خاں صاحب سے بمراتب فائق ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ اگر چہ اون کو جاہِ دنیا بھی حاصل ہے لیکن قناعت کے سبب ان کو کسی چیز کا غنا نہیں۔"

سیّد امداد العلی پر سرسیّد نے یہ تہمت رکھی تھی کہ ان کا مسلک وہابی ہے اس بات کے دفاع میں سیّد امداد فرماتے ہیں:-

"سیّد احمد خاں صاحب بہادر اپنے آپ کو بذریعہ اپنی تحریر کے وہابی مشتہر کر چکے

ہیں اور وہابی دو قسم کے ہیں۔ ایک نجدی حقیرہ دوسرے ہندوستان کے وہابی جو قیاسات کو ڈھکوسلہ اور اصول فقہ کو شکنجہ سمجھتے ہیں۔ اول قسم کے وہابیوں کا سلطان روم سے لڑنا سب لوگوں پر مشہور و معروف ہے اور ان کے دوسرے قسم کا وہابیوں کا شیوہ جھوٹ بولنے اور فساد کرنے کا پیش نظر عالم ہے۔" (صفحہ ٦)

سیّد امداد سرسیّد پر سخت قسم کی تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"عجب نہیں کہ اون کو (سرسیّد) بسبب افراطِ فکر کے تجویز مدرسہ العلوم بسبب اختیار محنتوں شاقہ کے علوم جدیدہ میں اور بہ سبب استعمال اغذیہ ضارہ دماغ اور مولدہ سودا زائد از قدر طبعی کے مانند بعض طیور منخنعتہ اور بقرہ موقودہ کے حاضری اور ٹپن اور چھوٹے بڑے کھانوں میں اور بہ سبب اکثر پہننے لباس گرم کے مانند لال ٹوپی وغیرہ کے جس کی کبھی اون کو عادت نہ تھی ایک مرض پیدا ہو گیا ہے جس کی صفت تغیر ظنون و افکار ہے۔ محرمی طبعی سے فساد کے یہ مرض آدمی کو افکار سلیمہ اور ظنون سالمہ سے باز رکھتا ہے اور صاحب اس مرض کا ہمیشہ بدگمان رہتا ہے، اپنے ناصحوں کو حاسد اور دشمن سمجھتا ہے اور نسبت اپنے احباب اور خیر خواہوں کے ظنون فاسدہ مختلفہ خاطر میں لاتا ہے۔ اطبائے معالجین کو کہتا ہے کہ یہ سب میری ہلاکت کے درپے ہیں۔ بیچارے سیّد احمد خاں کس گنتی شمار میں ہیں۔ آخر میں یہ مرض بڑے بڑے فلاسفہ امصا و افلاطون اور فارابی کو لاحق ہو گیا ہے۔" (صفحہ ٣)

کہا جاتا ہے کہ سرسیّد نے انگریزوں کا غدر میں بہت ساتھ دیا تھا۔ اس بیان کی تردید کرتے ہوئے سیّد امداد فرماتے ہیں:-

"جناب سیّد احمد خاں صاحب بہادر کو آسان ہے۔ ہمدردی کا امتحان کا وقت گزر گیا۔ وہ وقت غدر کا تھا۔ کسی کی ہمدردی یہ کہ بجنور سے اوٹھے راجہ پرتاپ سنگھ کے پاس رہے۔ وہاں سے پھر اوں ضلع مرادآباد میں آرام فرمایا۔ دہلی تھا جو باغیوں اور مفسدوں کا گھر تھا۔ جب دیکھا کہ دہلی کی شکست ہوئی، میرٹھ میں تشریف فرما ہوئے۔ دعویٰ بڑی ہمدردی کا ہے اور افسوس کہ کسی مقام پر کسی باغی کے مقابلے میں بھاگنے کے وقت بھی کوئی لاٹھی اپنی پشت مبارک پر نہ کھائی۔ زخم تلوار یا بندوق تو دیگر چیز ہے۔"

سرسیّد احمد خاں نے اپنے پرچے 'تہذیب الاخلاق' میں لکھا تھا کہ سیّد امداد العلی حکومت برطانیہ کے خیر خواہ نہیں تھے۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے سیّد امداد لکھتے ہیں:۔

''جس خیر خواہ سرکار کی نسبت حضرت سیّد احمد خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ہمدردی کو کفر خیال کرتے ہیں۔ اس تحریر کا محاکمہ حکام وقت اور جملہ مسلمانان اور اہلِ ہنود پر چھوڑتا ہوں کہ آیا جو شخص سینہ سپر ہو کر بنظر نمک حلالی اپنے آقا کے سینے پر گولی باغیوں کی کھاوے اور ہزار ہا روپیہ کا مال اون سے چھڑاوے اور وہ گولی چھ مہینے بعد ڈاکٹر مری صاحب بہادر نکالیں جس کا خون مسٹر لو صاحب داماد جناب لفٹننٹ گورنر صاحب بہادر اور مسٹر بیسٹ صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ متھرا پونچھتے جاویں اور اس گولی کا نشان ایک تمغہ ہمدردی اور نمک حلالی ملکہ وکٹوریہ کا جس بہادر کے سینے پر موجود ہو تو انصاف فرمایا جاوے کہ وہ شخص ہمدردی کو کفر سمجھنے والا ہے یا جو اوس کو کہے ایسے لفظ وہ شخص تمام دنیا کا جھوٹا اور مفسد اور خبیث النفس ہے۔''

ہمدردی کے ثبوت میں ترجمہ مسٹر وکرم منی صاحب کمشنر پرمٹ محررہ ۱۲ر مئی ۱۸۶۱ء کو ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ترجمہ چٹھی مسٹر وکرم منی صاحب:۔

مجکو [مجھ کو] نہایت خوشی اوس خیر خواہ کی تصدیق کرنے میں جو امداد العلی نے شروع سے نہایت برے وقت اوس ایام تکلیف میں ظاہر کی۔ مہینے جون ۱۸۵۷ء میں متھرا کے ضلع کوسی میں جہاں کہ وہ تحصیلدار تھے ایسے وقت میں گیا تھا جب کہ بغاوت روز بروز پھیلتی تھی اور نہایت خوفناک کیفیتیں روز پہنچتی تھیں اور جب باغیوں کا پہلو نہایت زور میں تھا اور بند نہیں ہو سکتے تھے اور جب روز بروز لوگوں کے کارخانے کی صورت کی تیرگی ہوتی جاتی تھی اس نہایت آزمائش کے تمام ایام میں امداد العلی نے نہایت مستحکم اور بے ریا خیر خواہی سرکار کی قائم رکھی اور اپنے مقام پر جب تک کہ ایک عرصہ تک حفاظت چاروں طرف کی نہیں ہو گئی تھی موجود رہے۔ واقع میں نہایت مغلق خطرہ میں ایسے لوگوں سے پڑے ہوئے تھے جو علانیہ اون کو مار ڈالنے کے لیے متلاشی تھے۔ بہ سبب ہونے ایک دوست اور

رفیق صادق سرکار کے۔"

ترجمہ فقرہ لفٹیننٹ بہادر:-

"میں کسی شخص کو نہیں جانتا جو ہم لوگوں کا مستحق زیادہ ہے واسطے اپنی خیر خواہی اور ایمانداری اوس آزمائش کے ایام میں امداد علی سے۔" (صفحہ ۷)

انتخاب چٹھی نمبر ۱۲۷ مورخہ ۶ رجولائی ۱۸۵۸ء منجانب مسٹر کلیفرڈ جنٹ مجسٹریٹ بنام مجسٹریٹ متھرا۔

"اگر غلام حسین کو تیزی اور چالاکی امداد العلی کی سی ہوتی، مجھ کو شک نہیں کہ وہ خزانہ جو باغی بعد پہلے بلوہ کے چھوڑ گئے تھے کبھی لُٹ نہ جاتا اور حصہ کثیر ہم لوگوں کے مال کا فوراً شہر میں انتقال ہوتا اور بچ جاتا۔ خیال ہے کہ غلام حسین چالاک اور تیز آدمی نہیں ہے۔ اوس کا مقابلہ یا کسی دوسرے حاکم کا مقابلہ امداد العلی کے وزن سے کرنا کبھی درست نہیں۔ کیونکہ امداد العلی بالکل یکتا ہیں اور مجھ کو شبہ ہے کہ کسی شخص نے ان ممالک مغربی وشمالی میں ایسی خیر خواہی سرکار کی کی ہے۔"

اور یہ صاحب اب کلکٹر بہادر مجسٹریٹ ضلع مراد آباد کے ہیں۔ میری ہزاروں جھٹپیات خاگی وسرکار سے ایسے وقت میں کہ جس وقت میں قبل از فتح دہلی کے بہت ہی تھوڑے آدمی دوست اور ہمدردی کرنے والے برٹش گورنمنٹ کے ثابت رہے اور میری ہمدردی موافق پکے مسلمانوں کے ہے۔ صرف باتوں اور زبان درازی اور چھوٹے چھوٹے مسئلے خوشامد کے لیے چھاپ دینے اور ٹوسٹ کی مجلس جس کا منشا محض شراب پینا اور پلانا ہے البتہ نہیں ہے۔ خدانخواستہ ہمدردی کا وقت اگر آئے گا تو میں اپنے بھائی مسلمانوں اور لوگوں کے ہمراہ لے کر اوّل دشمن برٹش انڈیا کے مقابلے ہوں گا جیسا کہ ایام غدر میں مجھ سے ظہور میں آیا ہے۔

سرسیّد احمد نے سیّد امداد پر وہابی ہونے کا الزام اپنے پرچے تہذیب الاخلاق میں لگایا تھا، جس کا جواب دیتے ہوئے سیّد امداد کہتے ہیں:-

"جناب سیّد احمد خاں صاحب کہیں آپ اصلی وہابیت کے حامی بنتے ہیں اور کہیں

دوسروں کو متعصب وہابی قرار دے کر مانند اون کے جن کو خبیث النفس اور بد باطن فرما چکے ہیں اون کے تمام افعال کو دکھاوے پر محل کرتے ہیں۔ میں حامی وہابیت اور متعصب وہابی دونوں کی بحث کا تماشہ دیکھتا ہوں اور چھپی جھوٹی بات کھول دینے اور سچی بات کے کہہ دینے سے درگزر نہیں کرتا۔ اگرچہ بعض لوگ اس پر آزردہ ہوتے ہوں اور میں کسی کے آزردہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا اور بالخصوص اپنے دوستوں کے آزردہ کرنے پر افسوس کرتا ہوں لیکن حق بات کہنے میں مجبور ہوں۔ امید رکھتا ہوں کہ معاف کیا جاؤں۔" (صفحہ ۸)

اسی سلسلے میں سیّد امداد مزید فرماتے ہیں:۔

"بعض غیر مقلد بلکہ غیر مقلد جن کو میں منافق ہذہ الامتہ سمجھتا ہوں جن کے تمام افعال خود پسندی اور ہوائے نفسانی اور الحاد پر منحصر ہیں اور قیاسات کو ڈھکوسلہ جانتے ہیں اور اصول فقہ کو شکنجہ سمجھتے ہیں، اسلامی امور کو جن کی کنہ اون کی عقل خام نہیں پاسکتی ہے اور ٹھٹھے اڑاتے ہیں اور ان افعال و اقوال اور عقائد دعویٰ اسلام کا کیے جاتے ہیں اور جاکٹ پتلون انگریزی جوتا پہن لینے اور چھری کانٹے سے میز و کرسی پر بیٹھ کر حاضری ٹپن کھانے سے دو ایک کتے اور پلے پال لینے اور گود میں بٹھا لینے اور لوگوں کی تصویریں کھینچنے اور کھنچوا لینے، گھر میں رکھ کو جو اون کی اپنی بیہودہ عقل کے موافق یہ باتیں دینی ہیں ٹھٹھ اسلام سمجھتے ہیں۔ اور آپ تو جیسے ہیں ویسے ہیں لیکن خدا کی ساری مخلوق کو بہکانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور حکام وقت جو دین اسلام سے واقف نہیں اون کو دھوکہ دینے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔"

سیّد امداد اسی سلسلے میں فرماتے ہیں:۔

"کسی متعصب سے متعصب وہابی کو ہم نے نہیں دیکھا کہ کسی قوم کی زبان انگریزی ہو یا سنسکرت سیکھنے کو عموماً حرام کہتا ہو۔ ہاں غیر مذہب والوں کے مذہبی علوم پڑھنے کو بہ نسبت کسی شخص خاص کے کسی وقت خاص میں یا اون تاریخوں کے پڑھنے کو جن میں متعصب غیر مذہب والوں نے پیغمبروں اور بزرگوں کو برا کہا ہے گو وہ انگریزی زبان میں ہوں حرام کہا ہو تو وہ دوسری بات ہے لیکن وہ کہنے والا کسی وہابی یا بدعتی کے نزدیک اس کہنے سے متعصب وہابی نہیں ہو سکتا ہے۔" (صفحہ ۸)

اور:-

''کسی کو مسلمان نہ خدا ترس، کسی کو متعصب وہابی، اور کسی کو خبیث النفس، بد باطن اور کسی کو حاسد اور کسی کو خود غرض، خود پرست اور کسی کو بے تمیز اور کسی کو نادان مسلمان کہہ دینے سے بجی خفیفہ کی کچھ رونق بڑھ سکتی ہے، یا سی۔ ایس۔ آئی۔ پر کچھ ترقی مل سکتی ہے یا وہابی حقیقی ہونے سے جس کا اقرار ہو چکا ہے انکار کا کچھ موقع مل سکتا ہے یا خود غرضی اور خود پرست اور ناخدا پرستی اور بے تمیز اور نادان اور خباثت نفس جس کا خیال آپ کی طرف سے مسلمانوں کو ہے کچھ مٹ سکتا ہے۔'' (صفحہ ۹)

کوئی مسلمان کافر کے ساتھ دوستی رکھنے کو عین اسلام یا رکن اسلام مانند خدا کے ایک ہونے پر یقین کرنے کو نہیں سمجھ سکتا ہے اور اگر عین اسلام یا رکن اسلام اوس کا خیال کیا گیا ہے اور اس بنا پر کافر سے سچی دوستی اور سچی محبت اعلیٰ مسئلہ اسلام سمجھا گیا ہے تو یہ عجب اسلام اور رکن اسلام ہے۔ قرآن میں جس پر مدارِ اسلام ہے حرام کیا گیا ہے.......... یعنی ''اے ایمان والو! نہ بناؤ تم میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو دوست۔''

وہابی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے سیّد امداد فرماتے ہیں:-

''فلسفہ اور منطق اور طبیعات کو حرام بتانے سے اگر کوئی متعصب وہابی ہو سکتا ہے تو اول ممبران تجویز مدرسۃ العلم کو متعصب وہابی کہنا چاہئے پھر اور کسی کو ممبران مذکورین خود فلسفہ اور منطق کو حرام بتانے والے ہیں۔ صفحہ ۳۴، حصہ دوم مدرسۃ العلوم میں مسطور ہے سیّد احمد خاں نے کہا اب مجھ کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع ملا ہے۔ مولوی اشرف علی صاحب نے جو تقریر لکھی اوس کو کامل طور سے اس طرح یہ بیان کرنا چاہئے کہ سوائے علم فقہ کے تمام علوم قوعہ جو مسلمانوں کے یہاں رائج تھے محض بے فائدہ اور غیر مفید تھے۔'' (صفحہ ۹)

امداد الاحتساب علی المذنبین فی احکام طعام اہل کتاب

تالیف جناب معلّٰی القاب عالی مراتب والا مناصب

سیّد امداد العلی صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کانپور

مطبوعہ بہاری لال، کانپور

۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء

یہ کتاب اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے کے مسائل پر اسلامی شریعت کے مطابق لکھی گئی ہے۔

مظاہر الحق

مولف جناب سیّد امداد العلی صاحب بہادر

ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع کانپور

مطلع مطبع نور، کانپور

۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء

سیّد امداد العلی نے تین کتابیں یعنی 'امداد الاحتباب علی المذنبین فی الا حکام طعام اہلِ کتاب'، 'امداد الافاق بر جم اہل النفاق بجواب پرچہ تہذیب الاخلاق' اور 'مظاہر الحق' یہ تینوں تصانیف سر سیّد احمد خاں پر لکھی تھیں جس میں سر سیّد کے خیالات پر جو اسلام کے منافی تھے سخت تنقید کی گئی تھی۔

دلائل فضیل العلوم

تالیف سیّد امداد العلی صاحب بہادر

ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ، ضلع کانپور

مطبع نظامی، کانپور

سیّد امداد العلی نے یہ کتاب تعلیم نسواں پر لکھی ہے۔ (۱۲۳)

بہار المصائب

تالیف جناب سیّد امداد العلی صاحب بہادر

ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ، ضلع کانپور

لکھنؤ ۱۸۷۴ء دو جلدیں

اس کتاب میں تفصیل سے خانۂ کعبہ کا حال درج کیا ہے۔ سیّد امداد کی یہ خانۂ کعبہ پر اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے اور مستند بھی کیوں کہ سیّد امداد نے بہ نفس نفیس دورانِ حج

میں خانہ کعبہ کا مشاہدہ کیا ہے۔

برٹش لائبریری، لندن حصہ اوّل Urdu I.O.L. 1139 اور حصہ دوم Urdu I.O.L. 876

امداد المتقین

تالیف سیّد امداد العلی

صفحات ۳۶

مراد آباد ۱۸۷۸ء

اسلامی فقہ پر یہ کتاب ہے۔

برٹش لائبریری، لندن، Urdu I.O.L. 809

امداد السنین

تالیف سیّد امداد العلی

مطلع نور، کانپور، صفحات ۲۶

یہ رسالہ حنفی سنی مسلمانوں کی ہدایت کے لیے لکھا گیا۔ برٹش لائبریری، لندن، Urdu I.O.L. 523

ضابطہ فوجداری

تالیف جناب سیّد امداد العلی صاحب بہادر، ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ، کانپور

مطلع نور، کانپور

فوجداری قانون پر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ برٹش لائبریری، لندن Urdu I.O.L.498

نور الانوار، نظامی پریس، کانپور تیرھویں صدی سے آگرہ (۱۲۴) تائید الاسلام مراد آباد سے شائع ہوئی بموجب چٹھی نمبر ۲۹۷۶ میمورنڈم جنرل ڈیپارٹمنٹ این ڈبلو پی۔ محررہ ۲۳ رجون ۱۸۷۱ء نینی تال۔ آپ نے دوسو ۲۰۰ کاپیاں 'امداد الحساب' 'دلائل فضیل علوم' روانہ گورنمنٹ کو کی تھیں، جس کی رسید کی اطلاع قائم مقام جونیر سکیریٹری گورنمنٹ

شمالی ومغربی نے دی تھی اور اس سلسلے میں مولوی سیّد امداد علی ڈپٹی کلکٹر کانپور کا سکریٹری صاحب موصوف نے شکریہ ادا کیا تھا اور لفٹننٹ گورنر سے ان کی عملی دلچسپی تعلیم نسواں کے بارے میں تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ یہ کتاب مدرسۂ تعلیم نسواں میں تقسیم کردی جاوے گی۔ دستخط J. Lloyid جے۔ لائڈ۔ اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ یہ کام انھوں نے فارغ اوقات میں اپنے ذوق وشوق سے انجام دیا تھا۔

گورنمنٹ کی چٹھی محررہ ۲۵ رنومبر ۱۸۷۰ء میں آپ کے عہدے میں ترقی دی گئی اور یہ بھی تحریر کیا تھا کہ:۔

''عزت مآب نے مجھ سے یہ بھی خواہش ظاہر کی تھی کہ میں اس خط میں یہ بھی اضافہ کروں کہ آپ بنا بر وفاداری عرصہ دراز سے گورنمنٹ کے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے خاص طور سے توجہ تعلیم نسواں میں دی ہے۔'' W. Stewart Lillingston ڈبلو۔ اسٹیورٹ لیلنگسٹن (۱۲۴)

سر سیّد احمد خاں کے رفقا کی فہرست میں کچھ نام تھے۔ یہ نام رسالہ 'ہما' میں شائع ہوئے ہیں جو یہ ہیں۔ میر امداد علی، راجہ کشن داس، بلدیو بخش اور رحمت اللہ بیگ۔ اس رسالہ کے صفحہ ۱۷۵ میں مولوی سیّد امداد علی اور مولوی سیّد فرید الدین وکیل آگرہ کے نام بحیثیت ممبر سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ درج ہیں۔ اس سوسائٹی کا کام انگریزی کتب سے اُردو ترجمہ کرنا تھا۔

مولوی سیّد امداد علی سر سیّد احمد خاں کے قدیم دوستوں میں تھے لیکن سر سیّد احمد خاں کی واپسی لندن پر اور میم لانے پر بقول اکبر الٰہ آبادی جج ''یوں تو نہ سر سیّد کا ذکر ہے نہ کسی کے لندن جانے اور میم لانے کا'' مولوی صاحب سے تعلقات خراب ہو گئے تھے۔ لندن کی واپسی پر سر سیّد احمد خاں کے خیالات اور طرزِ معاشرت میں تبدیلی آئی، اور جن دوستوں نے ان کے عیبوں پر ان کو آگاہ کیا ان کو انھوں نے اپنا دشمن سمجھا اور خیالاتِ فاسدہ پر ستائش کرنے والے سر سیّد کے یار انجمن ہو گئے۔ سیّد امداد علی بھی بزمرہ مخالفین تجویز کیے گئے اس پر بھی مولوی سیّد امداد علی نے سر سیّد احمد خاں کی دل آزاری کرنا جہل سمجھا۔ سر سیّد

نے مدرسہ العلوم کی نسبت سیّد امداد کی رائے طلب کی تھی، جس پر سیّد امداد نے کوئی خاص رائے خاں صاحب موصوف کو نہیں دی۔ پرچہ 'تہذیب الاخلاق' نمبر ۳ مورخہ ۱۰ ر صفر ۱۲۹۰ھ میں خاں صاحب نے مولوی صاحب کو بزمرہ مخالفین تجویز مدرسہ العلوم مصدود کیا اور مخالفین تجویز مدرسہ العلوم کو سات اقسام پر بیان کیا:-

''کسی کو خبیث النفس اور بد باطن کہا، کسی کو اپنا یار بنا کر حاسد اور اپنی ترقیات پر خفا ہونے والا قرار دیا، کسی کو بدتمیز اور کسی کو نادان مسلمان بیان کیا۔''

اس لیے سیّد امداد علی نے جو ان کے دوست تھے اس 'پرچہ تہذیب الاخلاق' کا جواب اپنی کتاب 'امداد الآفاق' میں دیا ہے جو مفت تقسیم کی گئی۔ 'تہذیب الاخلاق' نمبر ا مورخہ یکم محرم ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں جو مضامین شائع ہوئے تھے کانپور، گورکھپور اور مراد آباد سے اس کے مضامین رد کیے گئے۔ اس وجہ سے پرچہ مذکور نمبر ۳ میں سرسیّد احمد خاں نے مخالفین کو کچھ اعزاز بخشے تھے جس کے جواب میں 'امداد الآفاق' شائع ہوئی۔ جب ان کے رفیق سرسیّد احمد خاں ہی ان کو مطعون کریں تو اس کا جواب لازم تھا۔ اس کتاب میں سرسیّد کے افعال و رہن سہن آشکارہ کیے گئے ہیں جس میں فتاوے اور حدیث شریف سے حوالے جات بھی دیے گئے ہیں۔ مولوی سیّد امداد علی سرسیّد احمد خاں کے مخالف نہیں تھے بلکہ سرسیّد سیّد امداد کے مخالف تھے۔ سرسیّد کے بارے میں لکھا ہے:-

''افعال و اقوال اور عقائد پر دعوئ اسلام کا کیے جاتے ہیں اور جاکٹ، پتلون، انگریزی جوتہ پہن لینے اور چھری کانٹے سے میز کرسی پر بیٹھ کر حاضری ٹِفن کھا لینے اور دو ایک کتے اور پلّے پال لینے، گود میں بٹھا لینے اور لوگوں کی تصویریں کھینچنے اور کھچوا لینے، گھر میں اون کو رکھ لینے جو اون کو اپنی بیہودہ عقل کے مطابق یہ باتیں دکھائی دیتی ہیں ٹھیٹھ اسلام سمجھتے ہیں، جب کہ بمصداق حدیث شریف 'من تشبہ بقولِ جھوا من ہم' کے ہیں۔

بنائے مخاصمت:-

ا۔ اسلامی تہذیب کو بالائے طاق رکھ دینا۔

۲۔ اپنے رفیقوں کو جو ان کے مضامین رد کرتے ہیں دشمن سمجھنا۔

۳۔افعال واقوال ،عقائد وطرزِ معاشرت ورہن سہن اوران کے انگریزی تعلیم کے لیے بھوت بن کر چندہ کرنا۔

اپنی کُل جائداد سکنہ جو مشتمل دو مواضعات گجول اور بگدا، دکانات ،مکانات اراض وقف فی سبیل اللہ بغرض خرچ دو مساجد جو انھوں نے تعمیر کروائی تھیں واسطے مدارس، امداد غرباء وفاتحہ کے کردی تھیں تاکہ صدقۂ جاریہ رہے اوران کی روح کو ثواب پہنچتارہے۔

آپ اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ سمجھ دار اور معاملہ فہم تھے۔ آپ کے معاصر علماء میں حاجی امداداللہ مہاجر مکی قابلِ ذکر ہیں۔آپ نے کربلا کے متصل ایک قطعہ اراضی خریدی تھی جس کے بیع نامے کی نقل حاصل کرلی گئی ہے۔یہ آراضی آپ نے اپنے مقبرہ کے واسطے خریدی تھی۔اب اس پر چاروں طرف پختہ دیواریں اور ایک بڑا دروازہ تعمیر کرایا۔اس میں باغ لگایا جو نہایت سرسبز وشاداب تھا۔اس کے بلند دروازے پر یہ کتبہ کندہ ہے:۔

الٰہی از تو حبِ مصطفٰے را محمد از تو می خواہم خدارا

۲۳ رماہ صفر ۱۳۰۰ھ سے اس باغ کا اہتمام ہوا............امدادالمقارب اس کا نام ہوا

آپ کا وصال ۱۸۸۲ء میں ہوا اور اسی قبرستان امدادالمقارب میں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔امدادالمقارب میں کئی مقبرہ ہیں جن میں سے ایک قبر پر جو ایک بلند چبوترہ پر سنگین بنی ہوئی ہے، مولوی سیّدامدادعلی کی ہے۔اس کے تعویذ پر بہت خوب صورت بہت خوشنما بیل بوٹے اور گلدستہ کندہ ہیں۔اس قبرستان میں پختہ لال پتھر کی ایک مسجد بھی ہے جیسی کہ دو مساجد واقع شاہی مدرسہ، پنجہ اور کچہری گھاٹ میں تعمیر کرائی تھیں۔ان مساجد کا ذکر مولوی سعید احمد مارہروی نے اپنی کتاب 'مرقع اکبرآباد' میں کیا ہے۔(۱۲۵)

اس مختصر تذکرے میں ایک علمی وادبی خانوادے کی خدمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مقصد اس تصنیف کا صرف اتنا ہے کہ ہماری تہذیب وتاریخ کے جتنے بھی قابلِ قدر حصے ممکنہ طور پر محفوظ کیے جاسکیں اتنا ہی بہتر ہوگا تاکہ آنے والی نسلوں کا ذخیرہ برقراررہ سکے۔اس کے تذکروں کو محض افراد یا خانوادوں کی مدح وقصیدہ گوئی میں شمار کرنا بہت

ناانصافی کی بات ہوگی، کیوں کہ اگر ہم نے اس نقطۂ نظر سے دیکھا تو پھر ہم کو خود تاریخ کی افادیت کے بارے میں بھی بحث الجھنا پڑے گا۔

زندہ قومیں جس طرح اپنے ''زندوں'' کی قدر و منزلت میں کوئی کوتاہی نہیں رکھتیں اسی طرح زندہ جاوید ہستیوں کے اذکار و افکار کو اجاگر کرنے میں بھی کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتیں۔ اگر ہم خود فلسفہ، تاریخ کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھیں تو جدلیاتی عوامل کے تناظر میں افکار و طبقات کی سرگرمیوں اور تگ و تاز کا مطالعہ ہی اہم منصب تاریخ ہے۔ اور اسی مطالعے کے ضمن میں پھر نظر ارباب کمال اور عصر آفریں ہستیوں پر ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ہمارے مطالعے کے سلسلے میں اور عہد آفریں شخصیات کے کارناموں کی فہرست میں ذکر مرحوم سیّد امداد العلی صاحب کی مساعیِ جلیلہ اور خدمات عالیہ کا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔

سیّد صاحب محض ایک عالی مرتبت و فرض شناس عہدے دار ہی نہیں تھے بلکہ وہ اپنی جگہ ایک مکمل اور بھرپور شخصیت کے حامل تھے۔ تعلیم و تہذیب کی کمی کے زمانے میں جس طرح انھوں نے خواتین کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کی اس کو کسی طرح بھی سیّد احمد کے کارناموں سے کم نہیں کہا جا سکتا۔ سیّد صاحب نے اپنے عہد کی ذمہ داریوں کے باوجود اس کام کے لیے بڑا وقت نکالا اور جس کام کا بیڑہ اٹھایا اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر چھوڑا۔

رفاہِ عام کے کاموں میں انھوں نے اس طرح تن من دھن سے دلچسپی لی کہ یہ سوچ کر ہی حیرت ہوتی ہے کہ ان کا جیسا بڑا ذمہ دار عہدیدار اپنی فرض شناسی اور مصروفیت کے باوجود دوسرے کاموں کے لیے اپنا وقت کیسے نکال لیتا تھا۔ اس سے صرف یہی نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ سیّد صاحب اپنے وقت کا کوئی ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔

ان کے دور کے حالات پر سرسری نظر ڈالنے سے یہی پتہ چلتا ہے کہ خود ان کے معاصرین نے بھی ان سے غیر مفید امور میں لایعنی بحثیں کیں مگر آفریں ہے سیّد صاحب پر کہ بلا کسی غصے یا برہمی کے اظہار کے بہت شائستگی سے اختلافی نکات کی توضیح کی۔ اپنی فہم و بصیرت کی بنا پر وہ زندگی کے گوناگوں مسائل کے بارے میں جن نتائج پر پہنچے ان کا برملا اظہار کیا۔ اس بارے میں کسی طرح کے خوف یا مصلحت پسندی کو جگہ نہ دی۔ اکثر مسائل پر

ان کی قیمتی رائے آج بھی استنادی حیثیت رکھتی ہے۔ بارہا ایسی مثالیں بھی سامنے آئیں کہ درک واستنباط کی راہ میں اگر کہیں کوئی ناگزیر پیچ وخم آئے تو وہاں انھوں نے اپنی رائے پر نظرِ ثانی سے بھی گریز نہیں کیا۔ علمی وادبی میدان میں جو اصحاب کٹ حجتی سے کام لیے بغیر اپنے مخالفین کے نقطۂ نظر پر سنجیدگی سے غور کرنے یا ان کی بنا پر اپنے استخراج واستنباط پر دوسرے نقطۂ نظر سے بھی دیکھنے کے اہل ہوتے ہیں ان کو ہم صحیح معنوں میں عالمِ باعمل اور فہیم ودانشور شمار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں دیکھیے تو علم ہوگا کہ سیّد امداد العلی صاحب قبلہ اپنے دور کے ایک انتہائی ممتاز عالم اور دانشور بھی تھے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان جیسی کثیر الجہات شخصیات کا نہ صرف سیر حاصل تجزیہ ومطالعہ کیا جائے۔ ان کو مشعلِ راہ بنا کر نئے زمانوں کے نئے امکانات پر غور ونظر سے بھی کام لیا جائے۔

سیّد امداد العلی صاحب مرحوم ومغفور ہمارے خانوادے کے لیے ہی نہیں بلکہ عام مسلمانوں کے دینی وعلمی حلقوں کے لیے بھی ایک منارۂ روشنی تھے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

شکر نعمت ہائے تو گفت

۲۰۰۲ء

راقم الحروف خالد حسن نے جیسا اوپر بیان کیا مولوی سیّد امداد العلی کا تمام حال مولوی سیّد قیام الدین شاہ صاحب نے تحریر کیا ہے۔ انھوں نے دنیا کے بہترین کتب خانے برٹش لائبریری میں تمام دستیاب ذرائع سے بڑی محبت، محنت اور تن دہی سے معلومات جمع کی ہیں۔

ہمیں تعجب ہوا کہ سیّد امداد العلی کی ایک کتاب 'نور الہدیٰ' کا انھوں نے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

والد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ مولوی حامد حسن قادری کے ذاتی کتب خانے کی جو

چند کتابیں راقم الحروف کے پاس ہیں ان میں یہ نسخہ مل گیا۔ یہ قیاس کرنا بیجا نہ ہوگا کہ شاید ساری دنیا میں یہ واحد نسخہ ہو۔ یکم مئی ۱۸۶۹ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا اور بلا قیمت تقسیم کیا گیا۔ یہ رسالہ صرف چوبیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ہم ذیل میں اس پورے نسخہ کی نقل بطور یادگار و تبرک درج کرتے ہیں اور اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ۱۲

بسم اللہ وتوکلت علی اللہ

نسخہ متبرکہ من تصنیف لطیف وتالیف فاضل اجل عالم بے بدل

سیدّ امداد العلی

صاحب بہادر اکبر آبادی ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع کان پور مسمّیٰ بہ

نور الہدیٰ

محض برائے تقسیم برادران دینی بلا اخذ قیمت سی وکیم مئی ۱۸۶۸ عیسوی
مطابق ہشتم صفر ۱۲۸۵ ہجری

بکانپور مطبع منشی نول کشور بہ طبع عنبریں دماغ ریحان نفساں وعطر آگیں نمود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی زین الشهور بشہر رمضان الذی امر فیہ بالصیام والقیام والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ سیّد المرسلین وآلہ واصحابہ الکرام۔ بندہ راجی الی رحمت اللہ الغنی سیّد امداد العلی حنفی اکبر آبادی خدمت میں سب اہل اسلام کے گذارش کرتا ہے کہ ان دنوں میں ایک استفتاء التراویح خلیفہ صاحب کا کہ نام اپنا الجواب صحیح کے نیچے احقر الخلیفہ بل لاشی فی الحقیقہ تراب اقدام علمای زمانین محمد فصیح لکھا ہے جس کو حضرت نے آپ اور اپنے اقربا اور بعض طلبا سے مزین بدستخط کروا کر بواسطۂ مولوی پیغمبر بخش صاحب صدر اعلیٰ اکبر آباد کے چھپوایا ہے میرے پاس پہونچا میں حیران ہوا کہ خلیفہ صاحب نے ایک سوال اپنی طرف سے قائم کر کے جواب تحریر کروائی اور خود الجواب صحیح لکھا اور سخت کلامیاں اور غلطیاں برملا روا رکھیں بلکہ مولوی سراج الدین صاحب ایسے بڑھے کہ کفر کا حکم دے دیا جب کہ یہ حال مجھ خیر خواہ خلائق خادم العلماء نے دیکھا تب ایک جواب مختصر ان حضرات کا اور تحریر مفصل جس میں جواب معقول ہر امر کا ہے اور بھی حسنی تحقیق اس مسئلے کی بخوبی ہر مسلمان کو ہو جائے گی لکھی ہے فقط منجملہ ان حضرات کے جن کا فتویٰ ہے ایک حضرت مولوی سراج الدین صاحب واعظ ہیں حال اون کا یہ ہے کہ وعظ میں اکثر فرماتے ہیں کہ چند جبرئیلؑ ہیں چنانچہ سننے والے اس بات کے اکثر اکبر آباد میں موجود ہیں اور پھر انھیں مولوی سراج الدین صاحب نے وعظ میں فرمایا کہ جو شخص تقویت الایمان کو پڑھے گا اور جو شخص گھر میں رکھے گا تو تمام گھر اوس کا دوزخی ہوگا۔ چنانچہ مجکو مکان پر مولوی پیغمبر بخش صاحب کے اکبر آباد میں بلوایا خود اور شرط کی جو شخص ساکت ہوگا وہ توبہ کرے گا۔ میں جا کر حاضر ہوا۔ مولوی سراج الدین صاحب بھی تشریف لائے۔ وہاں ایسے چپ ہوئے کہ بہر بات نہ کی میں سمجھا تہا۔ حضرت نے توبہ کر لی ہے اب آئندہ باز رہیں گے مگر پہر ایک ذریعہ پا کر ایسا تعصب کو کام میں لائے کہ اکابروں کو اور اہل قبلہ کو کافر بتایا۔ یہ شعر مولوی روم صاحب کا اون کی زبان سے میں پڑھتا ہوں۔ شعر: گفت یارب بارہا برگشتہ ام ☆ توبہ ہا وعہد ہا بشکستہ ام، اور دوسرے حضرت مولوی عبد الرحمٰن صاحب وغیرہ کا یہ دستور ہے کہ بلا خود سمجھے

فرمادیتے ہیں اور لکھ دیتے ہیں بے تامل سختی سے جیسا کہ اب بھی لکھا ہے کہ اصل مطلب کتاب فتح القدیر کا نہیں سمجھا۔ یہ ایسی بات ہے جیسا کہ دُرمختار کا خود مطلب نہ سمجھے تھے۔ اور جب علمائے رامپور اور دہلی اور مولوی محمد یوسف صاحب یکے از علمائے فرنگی محل مقامی جونپور سے دریافت کیا میں نے تب وہ لوگ خوب ہنسے چنانچہ مولانا قاضی مفتی حاجی مولوی محمد سعد اللہ صاحب نے لکھا تھا: احتمال بودن قولہ ولو کان بسیر نفسہا تعمیم وقوف سخنی است نہایت عجیب وغریب کہ مجیب را از جائے خود بردہ بر غفران زار حیرت می رساند وسامعین را از فرط استعجاب برقص ووجدمی درآرد۔ اور علمائے دہلی نے لکھا تھا: تعمیم سیر منفی ست نہ تعمیم وقوف مثبت وکیست کہ آنرا تعمیم وقوف مثبت می گوید۔ چنانچہ اصل فتویٰ دستخطی ہر جگہ کے عالموں کے بمقام اٹاوہ مولوی صاحب ممدوح نے منگوا کر ملاحظہ فرمائے ہیں اور بڑے حضرت خلیفہ صاحب کا یعنی مولوی محمد فصیح صاحب کا یہ حال ہے کہ فتویٰ لکھا ہے کہ حضرت معاویہ کو معاویہ کہو اور حضرت معاویہ مت کہو اب جائے غور ہے کہ جو شخص سنت عمری کہے تراویح بیس رکعت کو حسب قول محیط برہانی کے التراویح یقال لہا سنۃ عمر الخ یعنی تراویح کہا جاتا ہے اس کو سنت عمری تو وہ جاہل اور رافضی ٹھہرے اور جو خلیفہ صاحب بپاس خاطر ایک بڑے آدمی تعزیہ دار کے جو حضرت معاویہ پر طعن کرتا ہے فتویٰ لکھیں اور فرمائیں کہ حضرت معاویہ مت کہو، معاویہ کہو۔ اب فرمائیں اہل سنت وجماعت کہ ایسا خلیفہ حضرت معاویہ کو معاویہ کہلانے والا اور کہنے والا کون ہوا۔ ان سب سخت کلامیوں کی بابت جواب اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔ شعر عدو کیا بدزباں کھولیں گے ہم پر بدشعاری سے ☆ کہ منہ میں خاک بھر دی ان کے ہم نے خاکساری سے۔

تحریر راقم اوّل محمد زین العابدین المدعو محمد ظہور
جس پر الجواب محمد فصیح صاحب کا ہے

خلاصہ یہ ہے کہ اصل اس نماز کی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور تعداد بست رکعت کی اور تقرر اس کا بالاجماع ہوا ہے اوس میں جائے کلام نہیں اور زیر الجواب کے ابتدا میں تحریر ہے کہ پڑھنا تراویح کا سنت موکدہ ہے اور تعداد اس کی بقول صحیح بیس رکعت ہیں۔

تحریر مولوی سراج الدین واعظ مسجد اکبرآباد مدرس بہ مسجد اکبرآبادی

بست رکعت میں حصر کیا ہے سنت تراویح کو سب علمائے اہل سنت و جماعت نے الغرض جو شخص کہ اس اجماع کو توڑ کے یہ روایت غیر معمول بہ کو مروج کرتا ہے وہ شخص مبتدع ہے اور جو انکار اجماع امت کرے گا وہ شخص بالاتفاق امت کافر ہے۔

جواب مختصر

حضرت مولوی محمد فصیح و مولوی سراج الدین وغیرہ نے افسوس ہے کہ تعریف اجماع کو کتب اصول فقہ میں نہیں دیکھ لیا۔ آگاہ ہو جی حضرات کہ اجماع سے مراد اجماع مجتہدین ہے نہ میں اور تم۔ پس منجملہ مجتہدین اربعہ کے جناب امام مالک صاحب ۳۶ رکعت سوائے وتر کے پڑھنے کے قائل ہوئے اور استدلال ان کا یہ ہے جیسا کہ قاضی خان نے بھی نقل کیا ہے قال مالک رح ان یصلی ستہ وثلاثین رکعۃ سوائے الوتر لما ردے عن عمر و علی رضی عنہما کانا یصلیان ستہ وثلاثین یعنی پڑھتے تھے حضرت علی و حضرت عمر رضی اللہ عنہما ۳۶ رکعت سوائے وتر کے۔ پس جب کہ اتفاق چاروں مجتہدوں کا نہیں ہے تو اجماع چہ معنی دارد اور لکھنا لفظ بالاجماع کا ۲۰ رکعت محض غلط ہے اور اگر مراد اجماع سے اجماع صحابہ کرامؓ مراد ہے تو اول تو یہ مذہب اہل ظواہر کا ہے بالفرض فرض کیجئے کہ وہی مراد ہے تو بھی اجماع صحابہ کا نہیں ہو سکتا کس لئے کہ جب امام مالک نے ثابت کیا ہے کہ حضرت علیؓ و حضرت عمرؓ ۳۶ رکعت پڑھتے تھے سوائے وتر کے اور یہی عمل تھا اہل مدینہ کا تب ۲۰ رکعت پر اجماع اصحاب کا کہاں ثابت ہوتا ہے اور موطا میں امام مالک نے سائب بن یزید سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا ابی بن کعب کو واسطے پڑھانے تراویح گیارہ رکعت کے کہ مع وتر کے گیارہ رکعت ہوتی ہیں۔ اس روایت سے بھی اجماع بیس رکعت پر ثابت نہیں ہوتا بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ۲۰ رکعت پڑھنے کا بھی سوائے وتر کے حکم دیا ہے اور گیارہ رکعت پڑھانے کا بھی سوائے وتر کے حکم دیا ہے۔ اور خود حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ نے ۳۶ رکعت سوائے وتر کے پڑھی ہیں اور اہل مدینہ بھی ۳۶ رکعت پر عمل کرتے تھے سوائے وتر کے۔ اب پوچھتا ہوں حضرات سے کہ فرمایئے جو شخص سنت جماعت گیارہ رکعت کو مع

وتر کے حکم حضرت عمرؓ سمجھ کر اور امام مالک کے موطا کو معتبر جیسا کہ بخاری وغیرہ حدیث کی کتابیں ہیں پڑھے اور پڑھاوے اور بیس رکعت کو بھی حضرت عمرؓ کا حکم سمجھ کر پڑھے اور پڑھاوے اور پھر موافق قول حضرت امام مالک کے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ ۳۶ رکعت پڑھتے تھے خود سوائے وتر کے اور اہل مدینہ کا بھی یہی عمل تھا اسی پر پڑھے اور پڑھاوے اور گیارہ رکعت مع وتر کی سنت رسولؐ اللہ کو بھی پیش نظر کرے تو فرمایئے کہ ایسا فعل کرنے والا جو فعل حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ اور رسولؐ اللہ کا ہے اور جس کو اماموں نے اور صلحاء اور اولیاؤں نے اور صحابیوں نے کیا ہے وہ شخص بموجب قول خلیفہ مولوی محمد فصیح اور محمد سراج الدین اور مولوی عبدالرحمٰن صاحب وغیرہ کے رافضی ہوگا یا مبتدع یا جاہل ہوگا یا کافر ہوگا یا کیا ہوگا۔ توبہ کریں حضرات اپنی اپنی تحریروں سے کہ قول اون کا کن کن اکابروں پر پہونچتا ہے اور اہل قبلہ و پیرو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم واصحاب کرام کو مبتدع و جاہل وغیرہ بناتا ہے۔ اور اگر اجماع سے مراد اجماع علمائے مقلدین ہے تو اول تو علمائے مقلدین کا اجماع معتبر نہیں اور بالفرض فرض کیا جاوے تو بھی اجماع واتفاق علمائے حنفیہ وغیرہ کا ۲۰ رکعت پر کہ سنت موکدہ ہے اور دیگر امور پر نہیں ہے اور نہ اجماع بنتا ہے مثلاً درمختار سے حضرات نے لکھ دیا کہ سنت موکدہ تو ینابیع میں لکھا ہے جو شرح قدوری کی ہے اختلف المشائخ فی التراویح قال بعض ہی نفل وقال بعض ہی سنت یعنی مختلف ہوئی ہیں مشائخ حنفیہ نماز تراویح میں کہ مستحب ہے یا سنت ہے یا کیا۔ بعض مشائخ نے کہا کہ نماز تراویح نفل ہے اور کہا بعض مشائخ نے کہ نماز تراویح سنت ہے اور فتحات رشیدی میں مرقوم ہے عبارت عربی طول ہے جواب مفصل جو آیندہ لکھا ہے اوس میں درج ہے وہاں دیکھ لی جاوے یہاں ترجمہ لکھتا ہوں بجنسہ مختلف ہوئے ہیں علماء عدد رکعت تراویح میں کہ قیام کرتے ہیں لوگ ساتھ اوس کی رمضان میں کہ کیا مختار ہے رکعت تراویح میں اس لئے کہ نہیں بض ہے رکعت تراویح میں سو اختیار کیا ہے بعض اون کی نے بیس رکعت سوائے وتر کی اور مستحسن رکھا ہے بعض اون کی نے ۳۶ رکعت کو اور وتر کو ۳ رکعت کو اور یہی امر قدیم ہے کہ تھی اوس پر صدر اول اور وہ چیز کہ کہتا ہوں ساتھ اوس کی اسباب میں یہ ہے کہ نہیں تعین ثابت ہے اس میں پس اگر ہے

ضروری اقتدا کسی کی پس اقتدا ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس باب میں لائق تر ہے پس تحقیق ثابت ہوا ہے آپ سے کہ نہیں زیادہ کیا ہے آپ نے گیارہ رکعت پر ساتھ وتر کے کچھ نہ رمضان میں نہ غیر رمضان میں مگر تحقیق تھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم درازی کرتے تھے اون رکعت میں پس وہی پسند رکھتا ہوں میں اوس کو درمیان قیام رمضان کے اور اقتدا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تحقیق ہے واسطے تمھارے بیچ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا نیک۔ اب جناب حضرت بڑے خلیفہ صاحب یعنی مولوی محمد فصیح اور حضرت مولوی سراج الدین صاحب جو مکفر ہیں اور دیگر صاحبان کی خدمت میں گذارش کرتا ہوں کہ اس روایت کو ملاحظہ فرمائیں خوب غور سے کہ صاف لکھا ہے تعین رکعت کا ثابت نہیں ہوتا ہے تو اقتدا ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائق تر ہے کہ گیارہ رکعت سے آپ نے زیادہ نہیں کیا ہے ساتھ وتر کے رمضان و غیر رمضان میں تو نفحات رشیدی والا لکھتا ہے کہ میں پسند کرتا ہوں اس کو درمیان قیام رمضان کے اور اقتدا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہے اقتدا نیک۔ پس بیس رکعت کو قبول نہیں کیا اور گیارہ رکعت کو اقتدا ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقتدا نیک سمجھ کر قبول کیا تو اب فرمایئے کہ اوس کے حق میں حکم خلیفہ صاحب کا اور مولوی سراج الدین وغیرہ کا کفر کا ہے یا رافضی ہونے کا ہے یا مبتدع ہونے کا ہے یا جاہل ہونے کا یا گمراہ ہونے کا یا کیا حکم ہے۔ کس واسطے کہ اوس نے بیس رکعت کو قبول نہیں کیا تو چاہیئے کہ نام اوس کا لے کر صاف صاف حکم دیجئے۔ روایت کو دیکھ کر جیسا کہ اس استفتاء التراویح میں سخت کلامی کی ہے مگر ناقل کو معاف رکھے اگر ناقل کے حق میں کچھ لکھے گا تو جواب ترکی بہ ترکی ہوگا۔ فقط۔

یہ جواب مفصل ہے جس سے اصل حقیقت مسئلے کی سب اہل اسلام پر کھل جاوے گی

سب اہل اسلام کی خدمت میں گذارش ہے کہ ان دنوں میں عمل لوگوں کا بیچ عدد رکعت تراویح کے ۲۰ رکعت پر ہے اور یہی قول جمہور کا ہے۔ لیکن شیخ کمال الدین ابن ہمام فی فتح القدیر میں لکھا ہے کہ ان قیام رمضان سنۃ احدی عشرہ رکعت بالوتر فی جماعۃ فعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم ترکہ بعذر یعنی بیشک قیام رمضان جس کو تراویح کہتے ہیں

سنت اوس میں گیارہ رکعتیں ساتھ وتر کی جماعت میں ہیں۔ کیا ہے اوس کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر چھوڑ دیا ہے اوس کو بسبب عذر کے اور یہی فتح القدیر میں لکھا ہے وکونہا عشرین سنۃ الخلفاء الراشدین وقولہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین یذہب الی سنتہم ولا یستلزم کون ذلک سنۃ اذ السنۃ ما واظبہ بنفسہ اور ہونا تراویح کا بیس رکعت سنت خلفائے راشدین کی ہے اور قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ لازم پکڑو تم سنت میری کو اور سنت خلفائے راشدین کو بلاتا ہے طرف سنت خلفائے راشدین کی اور نہیں مستلزم ہے یہ قول سنت موکدہ ہونی تراویح کو اس لئے کہ سنت وہ ہے کہ جس کی مواظبت فرمائی ہو خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ وہ کہ جس کی مواظبت کی ہو صرف خلفائے راشدین نے اور یہی فتح القدیر میں لکھا ہے۔ فیکون العشرون مستحبا سو ہون کی بیس رکعت تراویح کی مستحب نہ سنت اور اس کو اختیار کیا ہے صاحب بحر الرائق نے عبارت بحر رائق کی یہ ہے: وقولہ عشرون رکعۃ بیان لکمیتہا وھو قول الجمہور لما فی الموطا عن یزید بن رومان قال کان الناس یقومون فی زمن عمر بن الخطاب بثلث عشرین رکعت وعلیہ عمل الناس الیوم شرقا وغربا لکن ذکر المحقق فی فتح القدیر ما حاصلہ ان الدلیل یقتضی ان یکون السنۃ بین العشرین ما فعلہ صلی اللہ علیہ وسلم منہا ثم ترکہ خشیۃ ان یکتب علینا والباقی مستحبا وقد ثبت ان ذلک کان احدی عشرۃ رکعۃ بالوتر کما ثبت فی الصحیحین من حدیث عائشہ فاذا یکون المسنون علی اصول مشائخنا ثمانیۃ منہا والمستحب اثنا عشر رکعۃ انتہی اور قول ماتن کا عشرون رکعت بیان ہے کمیت اور مقدار رکعات نماز تراویح کا اور یہی قول جمہور ہے اس لئے کہ موطا میں یزید بن رومان سے روایت ہے کہ کہا یزید بن رومان نے کہ تھے لوگ نماز تراویح پڑھتے زمان عمر بن الخطاب میں ساتھ تیئیس (۲۳) رکعت یعنی بیس رکعت نماز تراویح کی اور تین رکعت نماز وتر کی اور اسی پر ہی عمل لوگوں کا ان دنوں بیچ مشرق اور مغرب کے لیکن ذکر فرمایا ہے محقق نے فتح القدیر میں کہ جس کا حاصل یہ ہے کہ دلیل چاہیئے ہے اس کو کہ ہوں سنت بیس رکعت میں بھی اوس قدر کہ کیا ہے اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اون بیس رکعات میں بھی پھر چھوڑ دیا ہے اوس کو اس خوف سے کہ فرض ہو جائیں ہم پر اور باقی

بیس رکعت میں سے ہے کہ بارہ مستحب ہیں اور تحقیق ثابت ہوا ہے کہ وہ مقدار کہ کیا ہے
اوس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گیارہ رکعت ہیں ساتھ وتر کے جیسا کہ ثابت ہوا ہے صحیحین
میں حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پس اس وقت ہوں گی مسنون ہماری مشائخ
حنفیہ کے اصول پر آٹھ رکعت بیس رکعت تراویح میں سے اور مستحب بیس رکعت میں سے
بارہ رکعت ہیں۔ راقم کہتا ہے کہ مشائخ حنفیہ مختلف ہیں استحباب اور سنت نفس تراویح میں
ظاہر الروایۃ امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ سے استحباب ہے اور روایت حسن بن زیاد کی امام
ابی حنیفہ رحمۃ اللہ سے سنت ہے لیکن بعض فقہا نے لکھا ہے کہ اصح یہ ہے کہ نماز تراویح سنت
ہے لیکن سنت موکدہ ہونا اس کا بطور جمہور مشائخ حنفیہ کہ قائل سنت موکدہ نہوتی نماز تہجد کی
ہیں دلیل سے ثابت نہیں ہوسکتا ہے اس لئے کہ نماز تراویح آنحضرت کی نماز تہجد سے تھی
اور شیخ عبدالحق دہلوی نے فتح سر المنان فی تائید مذہب النعمان میں لکھا ہے ثم الصحیح انہا
کانت صلوۃ التی یصلیہا باللیل وہی احدی عشرۃ رکعت کما فی اول باب الصلوۃ اللیل من
حدیث ابی سلمہ انہ سال عائشہ رضی اللہ عنہا کیف کان صلوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی
رمضان قالت ماکان یزید فی رمضان ولافی غیرہ علی احدی عشرۃ رکعت ولم یثبت روایۃ
عشرین رکعت منہ صلی اللہ علیہ وسلم کما ہو المتعاف الان الافی روایۃ ابن ابی شیبہ من حدیث
ابن عباس کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی رمضان عشرین رکعت والوتر قالوا اسنادہ
ضعیف وقد عارضہ حدیث عائشہ وہو صحیح وکانت عائشہ اعلم بحال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من غیرہا
پھر صحیح یہ ہے کہ تھی نماز تراویح آں حضرت کی نماز آپ کی گزارتے تھے اوس کو رات میں
یعنی نماز تہجد اور وہ گیارہ رکعت ہیں۔ جیسا کہ گزر چکا ہے اول باب صلوٰۃ اللیل میں حدیث
ابی سلمہ سے کہ اونھوں نے پوچھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہ کس طرح تھی نماز رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رمضان میں فرمایا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہ نہ تھے رسول خدا
صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ کرتے رمضان میں اور نہ غیر رمضان میں گیارہ رکعت پر اور نہیں
ثابت ہوئی ہیں روایت بیس رکعت کی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جیسا کہ وہ متعارف
ہے اب مگر روایت ابن ابی شیبہ میں حدیث ابن عباس سے ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ

وسلم نماز پڑھتے تھے رمضان میں بیس رکعت اور وتر کہا ہے علما نے کہ اسناد اس حدیث کے ضعیف ہیں اور تحقیق معارض اس کی ہے حدیث حضرت عایشہ رضی اللہ عنہا کی اور وہ صحیح ہے اور تھیں حضرت عایشہ زاید جاننے والین حال نبی صلعم کا بہ نسبت اور کے۔ اور نہر الفائق میں مسطور ہے اعلم ان التراویح سنۃ وذکر فی الجامع الصغیر بلفظ الاستحباب یعنی جان تو بیشک تراویح سنت ہے اور مذکور کیا ہے جامع الصغیر میں کہ کتب ظاہر الروایات میں سے ہے نماز تراویح کو ساتھ لفظ استحباب کے اور بتایج میں ہے کہ اختلف المشایخ فی التراویح قال بعضہم ہی نفل وقال بعضہم ہی سنۃ یعنی مختلف ہوئے ہیں مشایخ حنفیہ نماز تراویح میں کہ مستحب ہے یا سنت کہا بعض مشایخ نے کہ نماز تراویح نفل ہے اور کہا بعض مشایخ نے کہ نماز تراویح سنت ہے اور فتاوی عالم گیری میں ہے والنفس التراویح سنۃ علی الاعیان عندنا کما روی الحسن عن ابی حنیفہ وقیل مستحب والاول اصح والجماعۃ فیہا سنۃ علی الکفایۃ کذا فی مبتیین و ہو الصحیح کذا فی محیط السرخسے اور نفس تراویح سنت عینیہ ہے ہر ہر شخص پر نہ سنت کفایہ نزدیک حنفیہ کے جیسا کہ روایت کیا ہے اوس کو حسن نے ابی حنیفہ سے اور کہا گیا ہے کہ مستحب ہے اور اول اصح ہے اور جماعت نماز تراویح میں سنت علی الکفایہ ہے ایسا ہی ہے مبتیین میں اور یہی صحیح ہے ایسا ہے محیط سرخسی میں اور خزانۃ المفتیین میں مسطور ہے یستحب اداہا بالجماعت اور مستحب ہے ادا کرنا نماز تراویح کا ساتھ جماعت کے اور محیط برہانی میں مرقوم ہے کہ التراویح یقال لہا سنۃ عمر لان عمر رضی اللہ عنہ واظب علیہا وسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مانواظب علیہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی تراویح کہا جاتا ہے اوس کو سنت عمر کی اس لئے کہ حضرت عمر نے مواظبت فرمائی ہے اوس پر اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ہے۔ کہ مواظبت فرمائی رسول خدا صلعم نے اوس پر اور جواہر اختلاطی میں ہے کہ ہی سنت رسول اللہ صلعم وقیل ہی سنۃ عمر والاول اصح یعنی نماز تراویح سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ سنت ہے عمر اور قول اصح ہے کہ جب نفس تراویح کی صرف سنت ہونے میں اختلاف حنفیہ ہے گو اصح سنت ہونا اوس کا ہے بس سنت موکدہ ہونا بیس رکعت تراویح کا کیوں کر باتفاق حنفیہ ثابت ہوسکتا ہے اور نووی فی شرح صحیح

مسلم میں لکھا ہے واتفق العلماء علی استحبابہا اور متفق ہوئے علماء نماز تراویح کے مستحب ہونے پر پس توفیق درمیان کلام اون علماء کے کہ جنھوں نے اختلاف استحباب اور سنت نماز تراویح میں نقل کیا ہے اور کلام نووی کے کہ اتفاق علماء استحباب پر ہے یوں ہے کہ جس کام کو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے وہ سنت ہے پس اگر اوس کام کو بر سبیل عادت کیا ہے تو وہ سنت زایدہ ہے اور اگر بر سبیل عبادت کیا ہے اور اوس پر مواظبت نفلاً فرمائی ہے تو وہ سنت موکدہ ہے والا سنت غیر موکدہ اور اطلاق مستحب کا کبھی سنت غیر موکدہ پر آتا ہے اور کبھی افعال صحابہ وغیرہم پر پس کلام ناقلین اختلاف استحباب اور سنت تراویح میں مراد استحباب سے فعل خلفائے ثلثہ ہے اور مراد سنت سے سنت غیر موکدہ اور کلام نووی میں مراد استحباب سے سنت غیر موکدہ لیکن جو کہ قول اون لوگوں کا کہ تراویح کو فعل صرف صحابہ کا نہ آنحضرت کا ٹھہراتے ہیں اور اس معنی کر اوس کو مستحب کہتے ہیں صحیح نہ تھا لہذا نووی نے اون کے قول کا اعتداد نہ کر کے اتفاق علماء استحباب یعنی سنت غیر موکدہ ہونے تراویح پر بیان کیا ہے۔ ہر گاہ ثبوت سنت موکدہ ہونے آٹھ رکعت نماز تراویح کا بھی دشوار ہے اس لئے کہ آٹھ رکعت تراویح آنحضرت کی نماز تہجد تھیں اور نماز تہجد کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزدیک جمہور حنفیہ کے فرض ہے تو مداومت آٹھ رکعت پر نفلاً آنحضرت صلعم سے کہ مدار سنت موکدہ ہونے کا ہے محقق نہیں تو بیس رکعت کا سنت موکدہ کیوں کر ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر بیس رکعت سنت موکدہ ہوتیں تو حضرت عمر بن ابی کعب وغیرہ کو ساتھ بڑھانے گیارہ رکعت کے حکم نفرماتے امام مالک نے اپنی موطا میں سابت بن یزید سے روایت کیا ہے کہ قال امر عمر بن الخطاب ابی بن کعب وتمیم الداری ان تقوما للناس باحدی عشر رکعتہ یعنی کہا سائب بن زید نے کہ حکم دیا عمر بن الخطاب نے ابی بن کعب اور تمیم الداری کو کہ تراویح پڑھاویں لوگوں کو گیارہ رکعت اور سعید بن منصور نے اپنی مسند میں بھی ایسا ہی روایت کیا ہے اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں بھی ایسا ہی بہ تبدیل تمیم داری ساتھ سلیمان بن ابی خشمہ کی روایت کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر ترک مواظبت نفس تراویح سے نہیں فرمایا ہے۔ بلکہ ترک مواظبت جماعت تراویح سے عذر فرمایا ہے پس مواظبت حکمیہ

جماعت تراویح کی مستحق ہوئے نہ بیس رکعت تراویح کی کہ پڑھنا ہی بیس رکعت کا آنحضرت صلعم سے ثابت نہیں ہوتا ہے پس جب کہ جماعت نماز تراویح کی سنت موکدہ علی الاعیان ٹھہرے بلکہ سنت علی الکفایہ یا مستحب علی الاختلاف القولین قرار دی گئی تو بیس رکعت تراویح کیوں کر سنت موکدہ علی الاعیان ہو سکتے ہیں ہیں۔ اختلاف ہے عدد رکعات تراویح میں روایت بیس رکعت کے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ضعیف ہے لائق حجت کے نہیں لیکن رواج دینا حضرت عمر کا بیس رکعت کو باختراع خود بطور ابتداع نہو کا کوئی اصل اور سند اوس کی قول یا تقریر آنحضرت سے اون کی پائیں ضرور ہوگی اور پڑھنا گیارہ رکعت کا آنحضرت سے حدیث صحیحین سے ثابت ہے اور چھتیس رکعت عمل اہل مدینہ کا ہے شیخ عبد الحق دہلوی نے فتح سر المنان میں لکھا ہے واہل المدینہ یقومون بست وثلثین رکعۃ اور اہل مدینہ تراویح پڑھتے ہیں چھتیس رکعت اور ردالمختار حاشیہ درمختار میں مسطور ہے وعن مالک ست وثلثون اور مروی ہے نماز تراویح میں امام مالک سے چھتیس رکعت اور نفحات رشیدی میں مرقوم ہے واختلفوا فی عدد رکعاتہا التی یقوم بہا الناس فی رمضان ما المختار منہا اولا نص فیہا فاختار بعضہم عشرین رکعت سوای الوتر واستحسن بعضہم ستا وثلثین رکعۃ والوتر ثلث رکعات وہوالامر القدیم الذی کان علیہ الصدر الاول والذی اقول بہ فی ذلک ان لا توقیت فیہ فانکان لولا بد من الاقتداء فالاقتداء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذلک فانہ ثبت عنہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ ما زاد علی احدی عشرہ رکعۃ بالوتر شیئا لا فی رمضان ولا فی غیر الا انہ کان یطولہا فہذا ہو الذی اختارہ تجمع بین قیام رمضان والاقتداء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ تعالیٰ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ اور مختلف ہوئے ہیں علماء عدد رکعات تراویح میں کہ قیام کرتے ہیں ساتھ اوس کے لوگ رمضان میں کہ کیا مختار ہے رکعات تراویح میں اس لیے کہ نہیں نص ہی رکعات تراویح میں سو اختیار کیا ہے بعض اون کے نے بیس رکعت کو سوا وتر کے اور مستحسن رکھا ہے بعض اون کے نے چھتیس رکعت کو اور وتر کو تین رکعت اور یہی امر قدیم ہے کہ تھی اوس پر صدر اول اور وہ چیز کہ کہتا ہوں میں ساتھ اوس کے اسباب میں یہ ہے کہ نہیں تعین ثابت ہی اس میں پس اگر ہے ضروری اقتدا کسی کی پس اقتدا ساتھ رسول

خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اسباب میں لائق تر ہے پس تحقیق ثابت ہوا ہے آپ سے کہ نہیں
زیادہ کیا ہے آپ نے گیارہ رکعت پر ساتھ وتر کے کچھ نہ رمضان میں اور نہ غیر رمضان میں
مگر تحقیق تھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم درازی کرتے تھے اون رکعات میں پس یہ وہ ہے
کہ پسند رکھتا ہوں میں اوس کو واسطے جمع کے درمیان قیام رمضان اور اقتدائے رسول خدا
صلعم کے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے البتہ تحقیق ہے واسطے تمھارے بیچ رسول خدا صلی اللہ علیہ
وسلم کی اقتدا نیک بالجملہ ہم معاشر اہل سنت و جماعت حنفی مذہب کو بیس رکعت تراویح سے
انکار نہیں ہے بلکہ ہم ۲۰ رکعت تراویح کو مستحب اور سنت خلفاء اور صحابہؓ جانتے ہیں ہاں
سنت موکدہ ہوئی ہیں بیس رکعت کی کلام ہے اور ہے مذہب یہی محققین حنفیہ کا اور اگر کسی
صاحب کو طعن اس ہمارے قول پر ہے تو طعن اون صاحب کا اکابر حنفیہ مانند ابن ہمام
صاحب فتح القدیر اور ابن نجیم صاحب بحرالرائق وغیرہما پر ہی

نہ ہم پر کہ ہم موافق تحقیق ان اکابر کی کہ مبرہن
بہ براہین قاطعہ ہی قائل اس قول کی ہیں۔

فقط

تمام شد

اصحاب ہماری تاج ہیں جن کے شاہ رسول حسنینؓ نبیؐ کے پھول ہیں زہرہؓ بنت رسولؐ
شفاعت کے لئے امداد پلہ اپنا بھاری ہی

عمدہ اضافے

۴ ۲ ۴ ۱ ھ

۷۸۶
۹۲

راقم الحروف، خلف مولف، خالد حسن اس وقیع اور مہتم بالشان تالیف، 'داستان تاریخ اُردو' میں درج ذیل دو اضافے کی جرات کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خود حضرت والد صاحب قبلہ مولوی حامد حسن صاحب قادری علیہ الرحمہ نے اپنے ایک مکتوب میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری، اللہ تعالیٰ ان کی لحد پر رحمتوں کا نزول فرمائیں بہت بڑے عالم ادیب اور مورخ تھے۔ والد صاحب قبلہ نے ایک مرتبہ انھیں لکھا:۔

کراچی۔ ناظم آباد۔ نمبر ۱۵ ای ۵/۲۳ ۷/ اکتوبر ۱۹۶۰ء

۷۸۶
۹۲

مکرمی قادری صاحب السلام علیکم

'العلم' کراچی میں مولانا محمد احسن نانوتوی پر آپ کا مفصل مضمون نظر سے گذرا۔ بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے بہت محنت اور تحقیق سے نانوتوی صاحب کے حالات لکھے ہیں۔ اللھم زد فزد

میں چاہتا ہوں آپ اس کا خلاصہ کر دیں تا کہ میں اپنی کتاب 'داستان تاریخ اُردو' میں شامل کر سکوں۔ فقط

احقر۔ حامد حسن قادری

یہ خط والد صاحب قبلہ رحمتہ اللہ علیہ کے بالکل اواخر ایام کا ہے کیوں کہ ۱۹۶۴ء میں آپ نے وصال فرمایا۔ جناب محمد ایوب صاحب قادری اپنی مصروفیات کی بنا پر اس مضمون

کا خلاصہ نہ کر سکے۔ بعد میں ۱۹۶۶ء میں انھوں نے اس کو اور زیادہ تفصیل سے لکھ کر ایک مقتدر کتاب بعنوان 'مولانا احسن نانوتوی' مکتبہ عثمانیہ، کراچی سے شائع کی۔ کتاب دوسو پچیاسی صفحات پر مشتمل ہے اور نانوتوی خانوادہ پر معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ راقم الحروف نے بمشکل تمام ایک مضمون کی قدر مواد اس میں سے اخذ کر کے یہاں درج کر دیا ہے۔ مفصل معلومات کے لیے اس مقتدر تالیف کا بہ تمام کمال مطالعہ ضروری ہے۔ اس خلاصہ کا صرف امتیاز یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ لفظاً لفظاً جناب ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی اپنی تالیف ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے مطلق کوئی اضافہ نہیں کیا۔

مولانا محمدؒ احسن نانوتوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا اقتدارِ حکومت کم و بیش آٹھ نو سو سال رہا۔ اس مدّت میں انھوں نے بڑے بڑے شہر و قصبات آباد کئے۔ مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں بنائیں۔ خاص خاص مرکزی مقامات دہلی، لاہور، ملتان، ٹھٹھ، آگرہ، بدایوں، جونپور، گوڑ وغیرہ جیسے مقامات کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قصبات وقریات بھی علماء وفضلاء کی سکونت کی وجہ سے علوم و معارف کے مراکز بن گئے۔ دہلی سے قریب دامنِ کوہ کے علاقہ میں کئی ایسے قصبے کلیر، گنگوہ، انبیٹھہ، جھنجھانہ، تھانہ بھون، دیوبند، کاندھلہ، منگلور، کیرانہ، پھلت، رامپور (منہاران) اور نانوتہ وغیرہ وہ مسلم آبادیاں ہیں جو مسلمانوں کے قیام وسکونت کے باعث ایک خاص اہمیت کی حامل ہو گئیں۔ یہاں ہمیں اِن ہی مردم خیز مقامات میں سے قصبہ نانوتہ کے ایک نامور عالم مولانا محمد احسن نانوتویؒ کا تذکرہ لکھنا مقصود ہے جن کی تمام زندگی ترویج اشاعت علم کے لیے وقف رہی اور جنہوں نے دین و مذہب کی بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

خاندان: سکندر لودی کے عہد میں خلیفہ اول حضرت سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالٰی عنہٗ کی اولاد میں ایک بزرگ قاضی مظہر الدین دہلی آئے اور جہاں آباد کے قاضی

مقرر ہوئے۔ ان کے بیٹے میران بڈھے نہایت جری اور بہادر تھے۔ انھوں نے نانوتہ کے قرب وجوار کے سرکش راجپوتوں کو سلطنت دہلی کا مطیع ومنقاد بنایا۔ جس کے صلے میں قاضی میراں بڈھے علاوہ املاک و جاگیر عہدۂ قضا پر سرفراز ہوئے۔ دورِ شاہجہانی میں ان ہی میراں بڈھے کی اولاد میں ایک بزرگ مولوی محمد ہاشم ہوئے جو دربارِ شاہی میں مقرب تھے ان کو بھی چند دیہات جاگیر میں ملے تھے۔ نانوتہ میں مولوی محمد ہاشم کی اولاد خوب پھلی پھولی مولانا محمد احسن ان ہی مولوی محمد ہاشم کی اولاد میں ہیں۔(۱)

مولوی محمد ہاشم کے پرپوتے شیخ ابوالفتح تھے جن کے تین بیٹے ہوئے۔ حکیم عبداللہ، شیخ محمد عاقل اور شیخ علاؤالدین۔

حکیم عبداللہ کی اولاد نہ صرف خوش حال تھی بلکہ علم وحکمت کی دولت سے بھی مالا مال تھی۔ حکیم عبداللہ کے بیٹے حکیم غلام اشرف تھے جن کے تین بیٹے مولوی احمد علی، حکیم ولی محمد اور حافظ محمد حسن ہوئے۔

حافظ محمد حسن کے بیٹے حافظ لطف علی تھے۔ مولانا محمد احسن نانوتوی کے والد ماجد تھے۔

اس خانوادۂ صدیقی کے اراکین علم وامارت کے ساتھ ساتھ دینداری، اتباع سنت اور پابندیٔ شرع جیسے صفات حسنہ سے بھی متصف تھے۔ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ جو تحریک ولی اللہی کے ایک سرگرم کارکن اور مشہور صاحب نسبت بزرگ تھے، کی ننہیال بھی اسی صدیقی خاندان میں تھی۔ جس کے ایک رکن مولانا محمد احسن نانوتوی بھی تھے۔ نانوتہ میں حاجی صاحب کی بہن بھی بیاہی تھیں اس لیے حاجی صاحب اکثر نانوتہ تشریف لاتے تھے۔ نانوتہ میں حاجی صاحب کے مرید بھی تھے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی لکھتے ہیں:۔

"جناب مخدوم العالم حاجی امداداللہ صاحب سے جو ربط نسب تھا حضرت مخدوم (حاجی صاحبؒ)

---

(۱) یہ تمام تر خاندانی روایات ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مکتوبات مولانا محمد یعقوب ص ۱-۴ (مطبع احمدی علی گڑھ ۱۳۲۷ھ)

کی ننہال ہمارے خاندان میں تھی، اور بہن ان کی یہاں بیاہی تھیں، اکثر نانوتہ تشریف لاتے تھے۔ (ہم) ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور (وہ) نہایت محبت واخلاص فرماتے۔ جزو بندی کتاب کی حضرت سے ہم دونوں (مولانا یعقوبؒ ومولانا محمد قاسمؒ) نے سیکھی۔"

پیدائش: مولانا محمد احسن کی تاریخِ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہ ہوسکی۔ البتہ ارواح ثلاثہ میں مولانا محمد احسن کے بڑے بھائی مولانا محمد مظہر نانوتوی کے سلسلے میں ایک روایت ہے کہ:-

"مولوی محمد مظہر نانوتوی مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی محمد قاسم نانوتوی دونوں سے بڑے تھے۔"(۱)

مولوی محمد قاسم نانوتوی کا سال پیدائش ۱۲۴۸ھ ﴿۱۸۳۴ء﴾ اور مولوی رشید احمد گنگوہی کا سالِ پیدائش ۱۲۴۴ھ ﴿۱۸۲۸ء﴾ ہے۔ مولوی محمد مظہر کا سالِ پیدائش ۱۲۳۷ھ ﴿۱۸۲۱ء﴾ ہے کیونکہ "محمد مظہر" تاریخی نام ہے اور خاندانی روایات کے مطابق مولانا محمد احسن مولوی محمد مظہر سے تین چار سال چھوٹے تھے۔ اس طرح مولانا محمد احسن کا سالِ پیدائش تقریباً ۱۲۴۱ھ ﴿۱۸۲۵ء﴾ ہوتا ہے۔

مولانا محمد احسن کا سالِ وفات ۱۳۱۲ھ ﴿۱۸۹۵ء﴾ ہے نانوتہ کے اسی خاندان شیخ زادگان کے ایک ذی علم بزرگ اور شجرۂ شیخ زادگان نانوتہ کے واقف وماہر منشی ظفر احمد وکیل (۲) نانوتوی ایک ایسے شخص ہمیں ملے جنھوں نے مولانا محمد احسن کو دیکھا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق مولانا محمد احسن کی عمر قریب ستر اکہتر سال کے ہوئی۔ اس طرح بھی مولانا محمد احسن کا سالِ پیدائش تقریباً ۱۲۴۱ھ ﴿۱۸۲۵ء﴾ قرار دیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) ارواح ثلاثہ (ترتیب واصلاح مولانا اشرف علی تھانوی) ص ۳۲۵ (مظاہر العلوم سہارنپور (۱۳۷۰ھ)

(۲) منشی ظفر احمد ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۰۳ھ ﴿۱۸۸۶ء﴾ کو نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ مشتاق احمد۔ بچپن میں والد کا انتقال ہوگیا۔ ۱۳۲۰ھ ﴿۱۹۰۲ء﴾ میں اپنے پھوپا داؤد احمد مرحوم کی وجہ سے بھوپال پہنچے۔ وکالت کا امتحان پاس کیا۔ نہایت کامیاب وکیل تھے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آئے۔ نہایت خلیق اور بامروت تھے۔ قیام پاکستان کے زمانے میں نانوتہ اور شیوخ نانوتہ کے حالات دو رجسٹروں میں تحریر کیے۔ ۲۰ مئی بروز شنبہ ۱۹۵۷ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔

تعلیم: مولانا محمد احسن کے سالِ پیدائش کے سلسلے میں جس طرح معلومات محدود ہیں اسی طرح تعلیم و تدریس کے باب میں بھی ہماری معلومات تشنہ ہیں۔

مولانا محمد احسن کے خاندان میں علم و فضل کا چرچا تھا۔ دادا اور والد حافظ قرآن تھے مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ مولانا نے اپنے والد حافظ لطف علی مرحوم سے حفظ قرآن فرمایا۔ مولانا کے والد کے حقیقی چچازاد بھائی ''استاذ العلماء مولانا مملوک العلی'' اس وقت دار الحکومت دہلی میں مجلس علوم و معارف کے صدر نشین تھے مولانا محمد احسن ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی میں مولانا مملوک العلی کے پاس تحصیل علم کی غرض سے پہنچے۔

بعض آثار و قرائن کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ مولانا محمد احسن نے دہلی کالج میں بھی تعلیم پائی۔ مولانا محمد احسن کی قلمی بیاض میں ۱۸۵۲ء کی ایک یادداشت میں دہلی کالج کے مشہور استاد ''ماسٹر رام چندر دہلوی (۱) المتوفی ۱۸۸۰ء'' کے تعلقات کا بھی ایک جگہ ذکر ہے۔ ماسٹر رام چندر دہلوی سے تعلقات زمانہ طالب علمی ہی کے ہوں گے۔ مولانا محمد احسن نے دہلی کالج میں انگریزی بھی پڑھی تھی۔ ان کی قلمی بیاض میں خود مولانا محمد احسن کے ہاتھ کی لکھی بعض انگریزی تحریریں ہیں۔ مولانا محمد احسن نے سر سیّد احمد خاں کی فرمائش پر گاڈفری ہیگنس کی کتاب کا انگریزی سے اُردو ترجمہ کیا۔ دہلی کالج کے ایک استاذ مولوی سبحان بخش شکارپوری کے تلمذ کا بھی ذکر مولانا محمد احسن نے کیا ہے۔ مولانا محمد احسن نے نیچرل فلاسفی پر ایک مضمون لکھا تھا جو مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج کی نگرانی میں دو مرتبہ طبع ہوا۔ (۲)

مولانا محمد احسن کے تعلیمی حالات کی صرف اسی قدر نشاندہی ہو سکی۔ خلاصہ یہ ہے کہ

---

(۱) ماسٹر رام چندر دہلوی کے حالات کے لیے دیکھیے مرحوم دہلی کالج از مولوی عبد الحق ص ۱۵۹-۱۶۴ (انجمن ترقی اُردو [ہند] دہلی ۱۹۴۵ء)

(۲) HISTOIRE DE LA LITTERATURE HINDOUE ET HINDOUSTANIE BY M. CARCIN DE TASSY. VOL. 1 P. 146 (PARIS 1870)

ابتدائی تعلیم اور حفظ قرآن نانوتہ میں کیا پھر حضرت مولانا مملوک العلی کے پاس دہلی پہنچے اور دہلی کالج میں پڑھا۔ اس وقت کے ممتاز علماء مولانا مملوک العلی نانوتوی مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، شاہ عبدالغنی مجددیؒ اور مولوی سبحان بخش شکارپوری وغیرہ سے تحصیل علم کیا۔ یہ تمام حضرات حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان کے فیض یافتہ تھے اور ان حضرات کا مسلک بھی وہی تھا۔ مولانا محمد احسن کو بھی اسی خاندان سے علمی فیض حاصل ہوا۔ مولانا محمد احسن کے یہ الفاظ کسی قدر تاکیدی ہیں۔

''جس خاندان سے مترجم کو فیض ہوا اسی خاندان کا یہ فقیر بھی زلہ رُبا ہے۔''

علم حدیث کی تکمیل و تحصیل حضرت شاہ عبدالغنی مجددی (المتوفی ۱۲۹۶ھ ﴿۱۸۷۹ء﴾ سے کی۔ شاہ عبدالغنی مجددی شاہ محمد اسحق دہلویؒ کے شاگرد تھے۔ نہایت متقی و پرہیز گار بزرگ و عالم تھے۔ نقشبندی سلسلے کے مشہور شیخ اور خانقاہ حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ کے مسند نشیں تھے۔ شاہ صاحب ہی سے مولانا محمد احسن بیعت ہوئے۔

وصال: مولانا محمد احسن کی عمر تقریباً ستر سال ہوئی۔ شروع ۱۳۱۲ھ ﴿۱۸۹۴ء﴾ میں بیمار ہوئے۔ علاج کی غرض سے دہلی گئے۔ لیکن افاقہ نہ ہوا۔ رمضان میں دہلی سے واپس آئے راستے میں مولانا ذوالفقار علی نے دیوبند میں ٹھہرنے کے لیے اصرار کیا۔ مولوی محمد منیر بحیثیت مہتمم دارالعلوم اس وقت دیوبند میں مقیم تھے۔ مولانا محمد احسن اپنے برادر عزیز مولوی محمد منیر کے یہاں ٹھہر گئے۔

زمانۂ مرض الموت کا ایک خاص واقعہ یہ ہے کہ جب مولانا محمد احسن کے صاحبزادے منشی محمد اسمٰعیل گرداور قانون گو جو قصبہ باغپت یا سردھنہ میں تعینات تھے، کو اطلاع ملی تو انھوں نے رخصت لے کر دیوبند آنا چاہا۔ حاکم ضلع نے رخصت دینے سے انکار کر دیا، جس پر منشی محمد اسمٰعیل نے استعفاء دے دیا اور اس کی منظوری یا عدم منظوری کا انتظار کیے بغیر دیوبند چلے آئے۔ جب مولانا محمد احسن کو محمد اسمٰعیل صاحب کا یہ واقعہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا:-

''یاد رکھو روزگار بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے قیامت میں جہاں اللہ تعالیٰ اپنی دیگر نعمتوں کے

بارے میں سوال کرے گا وہاں بندے سے روزگار کے متعلق بھی پوچھے گا کہ میں نے تجھے روزگار کی نعمت دی اور تو نے اسے ٹھکرا دیا تو اس وقت کیا جواب دو گے۔ یہ کفرانِ نعمت ہے ویسے جاؤ میں تم سے بیحد خوش ہوں۔"

مولوی محمد منیر نے دیو بند کے اس مختصر سے قیام میں مولانا محمد احسن کی ہر قسم کی خدمت کی مگر موت کا وقت معین ہے۔ منشی محمد اسمٰعیل کی واپسی کے دو روز بعد آخر ہفتہ رمضان ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۵ء) میں مولانا محمد احسن کا انتقال ہو گیا۔

علم و فضل: مولانا محمد احسن جامع فضائل و کمالات تھے انھوں نے علوم متداولہ کی با قاعدہ تحصیل کی تھی۔ تصنیف و تالیف سے ان کو خاص شغف رہا۔ انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی معرکتہ الآرا تصنیف 'حجتہ البالغہ' اور 'ازالتہ الخلفاء عن خلافتہ الخلفاء' کی تصحیح و ترتیب بہت محنت سے کی اور حسب ضرورت حاشیے بھی لکھے۔

مولانا نے حضرت شاہ صاحب کے رسالہ 'عقد الجید' پر مفید اور تنقیدی حاشیے لکھے ہیں۔

مولانا محمد احسن کے شغف علمی کا انداز اس سے کیجئے کہ امام غزالیؒ کی مشہور کتاب 'احیاء العلوم' کا اُردو ترجمہ منشی نول کشور آنجہانی کی فرمائش پر چار ضخیم جلدوں میں کیا۔ اسی درمیان میں صرف سات ماہ کے اندر ابن قیمؒ کی مشہور کتاب 'اغاثتہ اللھفان' کا ترجمہ اور خلاصہ 'تہذیب الایمان' کے نام سے کیا۔ یہ کتاب ۶۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور مطبع صدیقی بریلی سے طبع ہوئی ہے۔

علامہ سلیمان ندوی مرحوم نے بر سبیل تذکرہ ایک مرتبہ فرمایا:

"مولانا محمد احسن مرحوم نے احیاء العلوم کے ترجمے میں بڑا کام یہ کیا ہے کہ موضوعات کی نشاندہی کرتے چلے گئے ہیں۔"

اسی طرح 'درمختار' کا بقیہ ترجمہ 'کتاب الاذان' کے بعد ایک قلیل عرصے میں کیا۔ ان ضخیم اور اہم کتابوں کے تراجم کا کام مولانا محمد احسن نے بڑی قابلیت اور حسن و خوبی کے ساتھ انجام کو پہنچایا۔

مولانا محمد احسن کے پاس اکثر فتوے آتے تھے۔ مولانا ان کے جوابات نہایت مدلل تحریر فرماتے۔ ان کے فتاویٰ میں طویل تمہیدات و مقدمات نہیں ملتے بلکہ وہ نفس جواب اور صریح سند پر اکتفا کرتے ہیں۔ بریلی میں وہ حضرات بھی جن کو مولانا سے اختلافِ رائے تھا فتاویٰ پر مولانا محمد احسن کی مہر ضروری سمجھتے تھے۔ جیسا کہ تنبیہ الجہال سے اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا محمد احسن صاحب نے انگریزی زبان کی بھی باقاعدہ تحصیل کی تھی۔ آپ کی قلمی بیاض میں اکثر یادداشتیں انگریزی میں تحریر ہیں۔ سر سیّد احمد خاں بہادر کی تحریک پر گاڈ فری ہیگنس کی کتاب کا ترجمہ حمایت الاسلام کے نام سے کیا۔

مولانا کے تراجم کے متعلق مؤلف مظہر العلماء تحریر فرماتے ہیں:-(۱)

''مولوی محمد احسن نانوتوی، فرید العصر، وحید الدہر، مترجم لاثانی، یگانہ روزگار، مشہور ہر دیار و امصار، ایک دفترِ عظیم کتب دینیات عربیہ کا ترجمہ نہایت دلچسپ پیرایہ میں تا قیام قیامت آپ سے یادگار رہے گا۔''

مولانا محمد احسن کو شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ احسن تخلص فرماتے تھے۔ مولانا کی تصنیفات میں اکثر قطعات تاریخ ان کے اپنے لکھے ہوئے ہیں۔ رسالہ عروض میں مثالوں میں بعض جگہ خود مولانا کے اشعار ہیں۔ اغاثۃ اللہفان اور احیاء العلوم کے ترجمے میں اشعار کا ترجمہ اشعار میں کیا ہے۔ مولانا خود لکھتے ہیں:-(۲)

''اس ترجمہ (احیاء العلوم) میں اشعار کا ترجمہ اشعار میں کیا ہے اور یہ التزام نہیں کیا کہ اشعار اُردو ہی ہوں بلکہ بعض جگہ فارسی بھی ہیں جہاں بندش فارسی کے الفاظ کی ہی بن پڑتی ہے اور یہ ترجمہ سب اس طرح لکھا ہے کہ نوبت مسودہ کی نہیں آئی۔ فکر اول ہی میں جو عبارت ذہن میں گذری قلم برداشتہ لکھ دی۔ اور بہ ہمیں وجوہ جو اشعار کتاب میں مکرر واقع ہوئے ہیں ان کا ترجمہ ہر جگہ مختلف ہوا ہے۔''

---

(۱) مظہر العلماء فی تراجم العلماء والکملاء (قلمی) ص ۲۰۸

(۲) مذاق العارفین (ترجمہ احیاء العلوم) از مولانا محمد احسن نانوتوی جلد اول مطبوعہ لکھنؤ

چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں:-(۱)

تم نے بات نہ میری مانی کس کام آئی یہ نادانی

غرض کیا کہوں کیا ہے میرا سوال کہ ظاہر ہے دل پر ترے سب کا حال

الٰہی کروں کس سے جا التجا عنایت نہ ہو تجھ سے گر مدعا

کہتی ہے گل سے یوں صبا کیوں خندہ بیجا کیا اس کی عوض میں چاک ہے تیری بقا کا پیرہن

ہرچند ظاہر تھیں تری سب خلق میں بے باکیاں لیکن نہ تھیں تجھ سے کبھی اس طور کی چالاکیاں

ہے برا تو ہی اگر تکتا ہے تو سب کی خطائیں تو ہی اچھا ہے تری نظروں میں گر خوب سب آئیں

ہاتھوں سے چھٹ گیا ہے کیسے سخی کا داماں جو مثل تار زر ہے ٹکڑے مرا گریباں

غم کے عالم میں پڑا رہتا ہوں جو کچھ گزرے اسے سدا سہتا ہوں
اس غم میں یاں نہیں جو کوئی مونس دل ہی دل میں خدا خدا کہتا ہوں

گر کیسا ہی پیدا کرو طاعت میں کمال دن رات رہے ذکر و عبادت کا خیال(۱)
کچھ فائدہ احسنؔ نہ ہوا اس محنت سے کھانے کے لیے گر نہ ہو مالِ حلال

احسنؔ غفلت میں کٹے ہے دن رات لا تعلم ان ما مضیٰ لیس مات
کھوتا ہے خرافات میں کیوں عمر عزیز فاعبد مولاک فی جمیع الاوقات

---

(۱) آخر کی دو رباعیاں مذاق العارفین سے لی گئی ہیں اور باقی تمام اشعار رسالہ عروض سے مقتبس ہیں۔

مولانا محمد احسن فن تاریخ گوئی میں بھی بہت مہارت رکھتے تھے۔ مولانا نے اپنی تصنیفات نیز اکثر مطبوعات مطبع صدیقی بریلی پر قطعات تاریخ خود لکھے ہیں جن کی تفصیل حسب موقع درج ہے۔ اس کے سوا ایک خاص بات یہ ہے کہ مولانا محمد احسن مطبوعات مطبع صدیقی کی لوح کی عنوان سطر ایسی عبارت سے ترتیب دیتے تھے جس سے سنہ طباعت نکلتا تھا۔ یہ بڑے کمال کی بات تھی۔ 'ازالۃ الخفاء' کی سطر لوح عنوان: "اللہ لطیف بعبادہ یرزق من یشاء ھو القوی العزیز" (۱۲۸۶ھ﴿۱۸۶۹ء﴾) 'غایۃ الاوطار' کی: "فقیہ واحد اشد علی الشیاطین من الف عابد" (۱۲۸۸ھ﴿۱۸۷۱ء﴾) اور 'عقائد نظامیہ' کی: "بعون ایزد متعال احد بے مثال" (۱۲۸۷ھ﴿۱۸۷۰ء﴾) ہے جس سے سال طباعت ظاہر ہوتا ہے۔

تصانیف و تراجم: مولانا محمد احسن کی زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف سے عبارت ہے۔ مطبع صدیقی بریلی کی وجہ سے اس سلسلے کو اور بھی وسعت ہوئی کیوں کہ مطبع اپنا تھا مولانا نے زیادہ تر ضخیم اور اہم کتابوں کے اُردو میں ترجمے کیے ہیں۔ بریلی کے قیام میں تصنیف و تالیف کا کام زیادہ ہوا تو آخر زمانے میں جب نانوتہ قیام رہا تو اس وقت مطبع مجتبائی دہلی کا تصحیح و حواشی کا کام ہوا۔ اُس زمانے میں بعض ترجمے بھی ہوئے۔ مولانا محمد احسن نے جو ترجمے کیے ہیں اُن کی زبان بامحاورہ، صاف اور سلیس ہے۔ مولانا بڑی حد تک قواعد زبان اور صحت عبارت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مولانا لفظی ترجمے کی بجائے بامحاورہ ترجمے کو ترجیح دیتے تھے۔ اُس وقت نثر اُردو ابتدائی حالت میں تھی اس لیے نثر اُردو کے ارتقا میں مولانا محمد احسن کی تصانیف و تراجم خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ اب ہم ذیل میں مولانا محمد احسن کے علمی کارنامے پیش کرتے ہیں۔

(۱) تحفۃ المحصنین: مولانا محمد احسن کی غالباً یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ انھوں نے یہ مختصر سا رسالہ باشندگان بنارس کی درخواست پر اُن عورتوں کے بیان میں لکھا ہے جن سے مرد کو نکاح کرنا حرام ہے۔ یہ رسالہ ۱۲۶۵ھ﴿۱۸۴۹ء﴾ مابین عیدین لکھا گیا۔ یہ رسالہ ایک مقدمہ، نو فصلوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ہر فصل کا مضمون بیان کرنے کے

---

(۱) یہ تمام تفصیل قلمی بیاض میں درج ہے

بعد متعلقہ مسائل بھی اس فصل کے ساتھ درج کر دیے ہیں۔ بلکہ مقدمے اور خاتمے کے ساتھ بھی بعض مسائل شامل ہیں۔ زبان عام فہم اور با محاورہ ہے۔ تمام مسائل کا جواب فقہ حنفی کے موافق لکھا گیا ہے۔ بعض مسائل میں مختلف ائمہ فقہ کی رائیں بھی نقل کی گئی ہیں جس سے مولانا کی وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب میں تین فتوے بھی مع جواب شامل ہیں۔ اس کتاب کے کئی اڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ ہمارے پیش نظر مطبوعہ محرم ۱۲۶۹ھ ﴿۱۸۵۲ء﴾ [مطبع مصطفائی کانپور] رہا ہے۔

(۲) اصول جرثقیل: نام سے مضمون کتاب ظاہر ہے۔ ۱۸۵۴ء میں بنارس میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔ (۱)

(۳) نافعہ خریداران: یہ رسالہ مولانا محمد احسن نے بیع وشریٰ کے مسائل کے بیان میں لکھا ہے۔ جیسا کہ آغاز رسالہ میں خود تحریر فرماتے ہیں:۔ (۲)

''اس زمانے میں اکثر لوگ اپنے ہاتھ کی کمائی تو کم کرتے ہیں اور تجارت وغیرہ کیا کرتے ہیں۔ لیکن معاملات بیع وشریٰ میں مسلمانوں کے نفع کے لیے ضروری جان کر یہ رسالہ کہ اسم تاریخی اس کا ''نافعہ خریداران'' ۱۲۷۲ھ ﴿۱۸۵۶ء﴾ ہے، لکھا گیا اور قبل بیان مسائل کسب حلال اور برائیاں کسب حرام کی درج کی گئیں اور اکثر روایتیں اس رسالہ کی ہدایہ، درمختار اور عالمگیری سے نقل ہیں۔''

مولوی محمد رضا مائل مرادآبادی نے قطعہ تاریخ لکھا ہے:

جب رسالہ یہ ہو گیا پورا — جو پسند آیا ایک عالم کو
مائل خستہ نے کہی تاریخ — بائع و مشتری کے نافع ہو

۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۵ء

(۴) قواعد اُردو حصہ چہارم: ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن صوبہ شمالی ومغربی (یوپی) کے حسب الحکم نصاب کی غرض سے قواعدِ اُردو کو چار حصوں میں ترتیب دیا گیا۔ اس

---

(۱) تاریخ داستانِ اُردو، از حامد حسن قادری ص ۱۹۰ (آگرہ ۱۹۴۱ء)

(۲) نافعہ خریداران، از مولانا محمد احسن ص ۲ مطبع نظامی کانپور ۱۲۷۵ھ

سلسلے کا چوتھا حصہ مولانا محمد احسن نے مرتب کیا ہے۔ شروع کے تین حصے دوسرے حضرات نے لکھے۔ مولانا محمد احسن آغاز رسالہ میں لکھتے ہیں:۔(۱)

''جاننا چاہئے کہ یہ رسالہ قواعد اُردو بموجب ارشاد فیض بنیاد جناب مستطاب معلّی القاب جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر تعلیم ممالک شمالی ومغربی کے احقر العباد محمد احسن مدرس اول فارسی مدرسہ بریلی نے ۱۸۶۲ء میں تالیف کیا اور تا بمقدور عبارت سہل اور قواعد ضروری کا ہونا ملحوظ رکھا اور بعض باتیں عربی فارسی کی جن کا جاننا نو آموزوں کو ضروری موجب ہوشیاری کا تھا وہ بھی درج کی گئیں اور پہلے بیان مطلب سے کچھ اصطلاحیں جو قواعد میں مذکور ہوں گی لکھی گئیں اور چونکہ اس زبان کی صرف ونحو ابھی خوب منضبط نہیں ہوئی لہٰذا ناظرین بوقت ملاحظہ کے خود جان لیں گے کہ کس طرح کی کاوش کر کے یہ باتیں لکھی گئیں۔ اس رسالہ میں چار باب ہیں، اول میں اصطلاحات، دوسرے میں صرف، تیسرے میں نحو اور چوتھے میں ترکیب کرنے کا طور اور کچھ قواعد ضروری لکھے گئے ہیں۔''

چونکہ یہ کتاب نصاب میں شامل رہی لہٰذا بیسیوں اڈیشن اس کے شائع ہوئے۔ ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ احسن القواعد مولانا محمد احسن نانوتوی کی تالیف ہے۔ حالانکہ احسن القواعد میں مولف کا نام صراحت سے محمد نجف علی خاں متوطن مراد آباد لکھا ہے۔ احسن القواعد کے مولف محمد نجف علی خان مولانا محمد احسن کے شاگرد تھے اسی لیے انھوں نے اپنے استاد مولانا محمد احسن کے نام پر اپنی کتاب کا نام ''احسن القواعد'' رکھا۔ مولانا محمد احسن صاحب کی ایک تقریظ احسن القواعد میں ضرور شامل ہے۔

(۵) رسالہ عروض: فنِ عروض میں مولانا محمد احسن کا مختصر مگر جامع رسالہ ہے۔ سبب تالیف کے سلسلے میں خود مولانا محمد احسن لکھتے ہیں:۔(۲)

''یہ رسالہ عروض وقوافی میں بموجب ارشاد ہدایت بنیاد قدردان اہل علم صاحب والانسب جناب مستطاب کیمپسن صاحب بہادر ایم۔اے۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ممالک مغربی وشمالی (یوپی) کے احقر العباد

---

(۱) قواعدِ اُردو حصہ چہارم از مولانا محمد احسن ص ۱-۳ (مطبوعہ میرٹھ ۱۹۰۵ء)

(۲) رسالہ عروض از مولانا محمد احسن 'مقدمہ' (طبع الہ آباد ۱۸۷۲ء)

محمد احسن مدرس اول فارسی مدرسہ بریلی نے ۱۲۸۰ھ ﴿۱۸۶۴ء﴾ میں تالیف کیا۔ اس میں قواعد ضروری عروض اور قافیہ کے اور مشہور مروج بحروں کے نام اور مشہور زحافات لکھے جاتے ہیں۔ جو بحریں کہ غیر مشہور ہیں یا زحافات مرکب خواہ غیر مشہور ہوں یا بحروں مروجہ حال میں نہیں آتے ان کا ذکر اس میں نہیں لکھا۔ اور عبارت کا آسان ہونا اور اس میں سے مطلب کا بخوبی سمجھ میں آنا تمام رسالہ میں ملحوظ رکھا ہے۔ اس رسالہ میں دو باب ہیں۔ باب اول میں عروض کا بیان ہے اور دوسرے میں قوافی کا ذکر ہے۔"

رسالہ میں اکثر مثالوں میں مولانا محمد احسن نے اپنے اشعار دیے ہیں۔ یہ رسالہ بھی متعدد بار طبع ہو چکا ہے۔

(۶) زاد المخدرات: یہ کتاب تعلیم نسواں کے بیان میں تالیف کی گئی اس لیے گورنمنٹ نے از راہِ قدر دانی زاد المخدرات کی پانچ سو جلدیں خریدیں اور تین سو روپیہ انعام بھی دیا۔ (۱)

یہ کتاب ۱۲۸۸ھ ﴿۱۸۷۱ء﴾ میں لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے۔ مطبع صدیقی بریلی میں طبع ہوئی ہے۔ کتاب تمہید، چار ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔

(۷) مفید الطالبین: عربی کے ابتدائی طلباء کے لیے نصاب کی ضرورت سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں قریب ڈیڑھ سو امثال و مواعظ کے مختصر جملے ہیں اور باب دوم میں تقریباً چالیس سبق آموز حکایات و نقلیات شامل ہیں۔ دار العلوم دیو بند، دار العلوم کراچی نیز دیگر مدارس عربیہ میں یہ کتاب داخلِ نصاب ہے۔ ادیب شہیر مولانا اعزاز علی امروہی المتوفی ۱۳ر رجب ۱۳۷۴ھ ﴿۱۹۵۵ء﴾ نے اس پر حاشیہ لکھا ہے۔

(۸) مذاق العارفین: حجۃ الاسلام امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء العلوم کا اُردو ترجمہ مولانا محمد احسن نے منشی نول کشور (مالک مطبع نول کشور لکھنؤ) کی فرمائش پر (۱۲۸۱ھ ﴿۱۸۶۴ء﴾ تا ۱۲۸۶ھ ﴿۱۸۶۹ء﴾) چار ضخیم جلدوں میں کیا۔ 'مذاق العارفین' تاریخی نام ہے

---

(۱) تنبیہ الجہال: از مولانا مفتی حافظ بخش بدایونی ص ۲۲

ترجمہ با محاورہ اور سلیس ہے۔ مولانا محمد احسن نے تخریج عراقی سے احادیث کے مخارج کا حوالہ حاشیہ پر لکھ دیا ہے۔ اور یہ التزام رکھا ہے کہ جن احادیث کی نسبت عراقی نے کہا ہے کہ ان کی سند صحیح ہے وہاں کچھ نہیں لکھا۔ اور جن احادیث کو عراقی نے کسی وجہ سے معلول کہا ان کے ساتھ ضعیف وغیرہ ہر جگہ حاشیہ پر لکھ دیا ہے۔ آخر دو جلدوں کا ترجمہ پہلے کیا گیا، اس کے بعد پہلی جلد کا اور سب سے آخر میں دوسری جلد کا ترجمہ ہوا ہے۔ ترجمہ کا کام ۱۲۸۱ھ ﴿۱۸۶۴ء﴾ میں شروع ہو کر ۱۲۸۶ھ ﴿۱۸۶۹ء﴾ میں اختتام کو پہنچا۔ قرآنی آیات کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمہ کے مطابق ہے۔ اشعار کا ترجمہ اشعار میں کیا گیا ہے۔ شروع میں امام غزالی کا مختصر سا ترجمہ شامل ہے۔

قطعات تاریخ از مولانا محمد احسن صاحب

جلد سوم

ہوا جب کہ آوازۂ ختم ہر سو — تو دل کو ہوئی فکر تاریخ نیکو

بلا جودتِ طبع احسنؔ کو فوراً — کیا بہر تعمیل ایمائے ابرو

"کہا اس نے تو ترجمہ سے ہو" "فارغ" — "یہ تاریخ لکھ" "جلد ثالث باردو"

۱۲۸۱ھ-۱۸۶۴ء--۱۲۸۱ھ۱۸۶۴ء — ۱۲۸۱ھ-۱۸۶۴ء--۱۲۸۱ھ۱۸۶۴ء

جلد چہارم

مزہ احباب جب اس سے اٹھائیں گے تو بولیں گے

نہ تھا آسان کچھ کوزے میں لانا بحر قلزم کا

لکھا جب ترجمہ عمدہ تو احسنؔ یہ لکھو تاریخ

عجائب ہے یہ اُردو ترجمہ جلد چہارم کا

۱۲۸۲ھ-۱۸۶۵ء

جلد دوم

ہوئی ختم جب یہ کتاب نفیس — جو ہر اک کو مرغوب و مطلوب ہے

تو احسنؔ سے ہاتف نے تاریخ کو — کہا لکھ دے کہ ترجمہ خوب ہے

۱۲۸۶ھ-۱۸۶۹ء

نول کشور پریس لکھنؤ سے یہ کتاب متعدد بار چھپ چکی ہے۔ ہمارے پیش نظر اپریل ۱۸۸۷ء کا مطبوعہ نسخہ ہے۔ اس کتاب کا جو اڈیشن حال میں چھپا ہے اس میں امام غزالی کے حالات ''الغزالی'' مولفہ مولانا شبلی نعمانی سے لے کر شامل کر دیے گئے ہیں۔

(۹) **تہذیب الایمان:** حافظ ابن قیم کی مشہور کتاب 'اغاثۃ اللہفان' کا اُردو ترجمہ وخلاصہ حسب فرمائش جمال الدین مدار المہام ریاست بھوپال 'تہذیب الایمان' کے نام سے کیا۔ کتاب کا مضمون رد بدعات ہے۔ ۶۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا کو صرف ایک ہی نسخہ مل سکا۔ لہٰذا تصحیح میں دوسری متعلقہ کتابوں سے مدد لی گئی۔ کتاب کے ترجمہ اور طباعت کا کام صرف سات ماہ میں ختم ہوا۔ پیرایہ بیان صاف اور سلیس ہے۔ ترجمہ نظم کا نظم میں کیا ہے۔ یہ کتاب رجب ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں مطبع صدیقی بریلی میں طبع ہوئی ہے۔

مولانا محمد احسن صاحب نے یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے:-

مکائد یہ شیطاں کے جب چھپ چکے ہوا بہر تاریخ دیوانہ قلب
ندا ہاتفِ غیب نے دی اسے کہ لکھ دے ''لذکریٰ لمن کان قلب''

۱۲۸۳ھ-۱۸۶۶ء

(۱۰) **احسن المسائل:** فقہ کی مشہور کتاب 'کنز الدقائق' کا فارسی ترجمہ شاہ اہل اللہ دہلوی (برادر شاہ ولی اللہ دہلوی) نے کیا تھا۔ مولانا محمد احسن نے اپنے بھائی مولوی محمد نصیر کی فرمائش پر فارسی سے اُردو میں اس کا ترجمہ کیا۔ اور 'احسن المسائل' نام رکھا۔ توضیح و تشریح کے لیے حاشیہ اور حسب ضرورت متن میں اضافہ فرمایا۔ مولانا محمد احسن صاحب نے قطعہ تاریخ یہ لکھا ہے:-

ہوئی فقہی مسائل کتاب بے نظیر احسن نہ ہووے سیر جس کے دیکھنے سے نفس شائق کا
سن ختم اس کا میں چاہا تو ہاتف غیب سے بولا لکھو گنج حقائق ترجمہ کنز الدقائق کا

۱۲۸۴ھ - ۱۸۶۷ء

(۱۱) **غایۃ الاوطار:** فقہ حنفی کی مشہور اور متداول کتاب درمختار کا اُردو ترجمہ مشہور عالم مولانا خرم علی بلہوری نے حسب فرمائش نواب ذوالفقار الدولہ رئیس باندہ ۱۲۵۸ھ

﴿۱۸۴۲ء﴾ میں کتاب النکاح سے شروع کیا۔ محرم ۱۲۷۱ھ ﴿۱۸۵۴ء﴾ میں قریب اختتام تھا کہ پیغام اجل آ گیا۔ مولانا محمد احسن نے اس ترجمہ کو ان کے ورثاء سے اشاعت کی غرض سے خریدا اور بقیہ ترجمہ از باب الاذان تا کتاب الصلوٰۃ مکمل کیا اور جن مقامات کو مولانا خرم علی بلہوری نے چھوڑ دیا تھا ان کو مکمل اور اس ترجمہ کو ہر طرح سے صحیح اور درست کر کے چند اصحاب کی شرکت میں اول چوتھی جلد مطبع صدیقی بریلی سے شائع کی۔ نام غایۃ الاوطار رکھا۔ لیکن یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ مولانا محمد احسن کو سخت فکر ہوئی اور ایک اشتہار اس باب میں طبع کر کے مشتہر کیا۔ نواب کلب علی خاں رئیس رامپور (المتوفی ۱۳۰۴ھ ﴿۱۸۸۷ء﴾ نے طباعت کے جملہ مصارف برداشت کیے۔ مولانا محمد احسن نے نواب رامپور کی معارف پروری کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کی تصحیح و تکمیل میں مولانا محمد احسن کے بڑے بھائی مولانا محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ ﴿۱۸۸۴ء﴾ صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور بھی شریک رہے۔ اس ضخیم اور گراں قدر کتاب کی چاروں جلدوں کی طباعت ۱۲۸۸ھ ﴿۱۸۷۱ء﴾ میں ہوئی جیسا کہ قطعات ذیل سے ظاہر ہے۔

قطعات تاریخ از مولانا محمد احسن صاحب

رشک گلزار چو گردید ز طبع ایں نسخہ — سال ختمش ز رہِ فکر بجستم پیہم
از دل غیب ندا داد سروشم ناگاہ — پے تاریخ بگو فقہ امام اعظم
۱۲۸۸ھ - ۱۸۷۱ء

دیگر

جب ہو چکی یہ کتاب مطبوع — ہم رنگ بہار تازہ گلشن
پایا سر حسن سے حسن طبع — خرم سے ہے یادگار احسن
۱۲۸۸ھ - ۱۸۷۱ء

از میر ہدایت علی ہدایت بریلوی

باہتمام مولوی صاحب سے جب — مسئلے آسان و مشکل چھپ گئے
سال یہ دل سے ہدایت کے ملا — دین اعظم کے مسائل چھپ گئے
۱۲۸۸ھ - ۱۸۷۱ء

یہ کتاب نول کشور پریس لکھنؤ میں بھی چھپی ہے۔ ہمارے پیش نظر مطبع صدیقی بریلی کا چھپا ہوا نسخہ رہا ہے۔

(۱۲) حمایت الاسلام: جب سر سیّد احمد خاں ۱۸۶۹ء میں لندن گئے تھے تو ان کے پیش نظر مشہور مصنف ولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جواب لکھنا بھی مقصود تھا۔ چنانچہ انھوں نے لندن میں کافی مواد جمع کیا۔ انگلستان کے ایک معروف مصنف گاڈ فری ہیگنس GODFREY HIGGINS کی کتاب APOLOGY جو اس نے تائید و حمایت اسلام اور عیسائیوں کے اعتراضات کی تردید میں لکھی تھی سر سیّد احمد خان نے بہت تلاش و جستجو کے بعد کسی جرمن کتب فروش سے دس گنی قیمت دے کر حاصل کی۔ اور خطبات احمدیہ کی تالیف میں اس سے مدد لی۔ سر سیّد احمد خاں کو خیال ہوا کہ اس کتاب کا اُردو ترجمہ بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے مولانا محمد احسن کو یہ کام سپرد کیا۔ مولانا نے اس کتاب کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ (۱) مولف تنبیہ الجہال کا کہنا ہے (۲) کہ اس ترجمہ میں مولانا محمد احسن کے شاگرد فضل رسول (طالب علم بریلی کالج) بھی مددگار رہے۔ چونکہ اس زمانے میں کچھ لوگ ''اثر ابن عباس'' کی وجہ سے مولانا محمد احسن کے خلاف تھے اس لیے مولانا نے اس ترجمہ کو منشی عبدالودود کے نام سے ۱۹۲۰ء ﴿۱۸۷۳ء﴾ میں مطبع صدیقی بریلی سے شائع کیا۔ منشی عبدالودود کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون صاحب تھے۔ ترجمہ نہایت صاف اور سلیس ہے۔ نمونہ درج ذیل ہے:-

''عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مسائل نے وہ درجہ نشہ دینی کا اپنے پیروؤں میں پیدا کیا کہ جس کو عیسیٰ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔ جب عیسیٰ (علیہ السلام) کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے۔ ان کا نشہ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے

---

(۱) حیات جاوید (حصہ دوم، دینی خدمات) ص ۱۵۴۔ از مولانا الطاف حسین حالی مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ (طبع ثانی ۱۹۰۳ء)

(۲) تنبیہ الجہال ص ۲۰

پنجے میں چھوڑ کر چل دیئے برعکس اس کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیرو اپنے پیغمبر اسلام کے گرد آئے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا۔''

کتاب 'حمایت الاسلام' سر سیّد احمد خاں کے مصارف سے طبع ہوئی اور اس کے جملہ حقوق محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی کے لیے محفوظ رہے۔ اصل کتاب کا کوئی نسخہ نہ مل سکا۔ ہم اپنے محترم بزرگ جناب پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی (شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے چند اقتباسات، تمہید مترجم، التماس مصنف اور حرف آخر لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے نقل کر کے بھیجے۔

(۱۳) کشاف: حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مشہور رسالہ الانصاف فی بیان سبب اختلاف کا اُردو ترجمہ مالک مطبع مجتبائی دہلی کی درخواست پر رسالہ 'کشاف' کے نام سے ۱۳۰۷ھ﴿۱۸۸۹ء﴾ میں کیا۔ اگر چہ اس رسالہ کا ترجمہ اس سے پہلے بھی بعض لوگوں نے کیا تھا۔ مگر ان میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ مولانا محمد احسن نے نہایت محنت و کاوش سے بہت صحیح اور درست ترجمہ کیا۔ رسالہ میں ایک فہرست مضامین بھی لگا دی۔ قطعہ ذیل سے تاریخ نکلتی ہے:-

جس گھڑی یہ ترجمہ پورا ہوا — جس کا ہر مطلب نہایت صاف ہے
مصرع تاریخ ہاتف نے کہا — ترجمہ انصاف کا کشاف ہے
۱۳۰۷ھ - ۱۸۸۹ء

اس رسالہ کا ترجمہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی (ف ۱۳۸۱ھ﴿۱۹۶۲ء﴾) نے بھی کیا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں اس کتاب کا اُردو ترجمہ مولوی صدر الدین اصلاحی صاحب نے ''اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ'' کے نام سے کیا ہے جو دفتر جماعت اسلامی اچھرہ لاہور سے شائع ہوا ہے۔

(۱۴) سلک مروارید: حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مشہور رسالہ 'عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید' کا اُردو ترجمہ بھی مولوی عبدالاحد، مالک مطبع مجتبائی دہلی کی فرمائش پر 'سلک مروارید' کے نام سے کیا۔ ترجمہ نہایت صاف اور آسان ہے۔ حسب ضرورت

تشریح ووضاحت کی ہے اور مضامین کو آسان کرکے پیش کیا ہے۔حاشیہ پر مفید حواشی بھی لکھے ہیں۔قطعہ تاریخ درج ذیل ہے:۔

فضل اور توفیق یزدانی سے عقد الجید کا　　جانفشانی سے کیا جب میں نے پورا ترجمہ
مصرعہ تاریخ کا ہاتف نے احسن سے کہا　　سلک مروارید ہے دیکھا یہ زیبا ترجمہ
۱۳۰۹ھ-۱۸۹۱ء

(۱۵) خیر متین: حصن حصین کا اُردو ترجمہ ۱۲۵۳ھ ﴿۱۸۳۷ء﴾ میں مولانا نواب قطب الدین خاں مرحوم نے باسم تاریخ ''ظفر جلیل'' کیا مولانا محمد احسن نے مجتبائی پریس دہلی کی درخواست پر اس ترجمہ کو بامحاورہ اُردو میں کیا اور تصحیح ودرستی کے فرائض بھی انجام دیے اور تاریخی نام خیر متین رکھا۔مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ لکھا:۔

یہ مجموعہ عجیب حصن حصین ہے　　بیان قول ختم المرسلین ہے
ارادہ تھا لکھوں تاریخ اتمام　　کہ ہاتف نے کہا ''خیر متین'' ہے
۱۳۱۰ھ-۱۸۹۲ء

منشی امیر احمد مینائی: حضرت امیر مینائی لکھنوی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مشاہیر مصنفین نثر میں ان کا شمار نہیں ہوتا۔لیکن انھوں نے بھی نثر کی چند کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے ایک 'تذکرہ شعراء' ہے۔اس لیے اہم اور قابلِ ذکر ہے۔دوسری اُردو لغت کی کتاب 'امیر اللغات' ہے۔یہ اُردو کی بہترین خدمت تھی اگر مکمل ہو جاتی۔لیکن ناتمام بھی حضرت امیر مینائی کا کارنامہ ہے۔یہ راہ پہلے انھیں نے نکالی۔جن اصول پر لکھنا شروع کیا تھا اُن پر چل کر اور لوگوں نے کامیابیاں حاصل کیں۔

امیر مینائی مولوی کرم محمد کے فرزند رشید تھے۔حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے۔نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے عہد حکومت میں ۱۸۳۲ء ﴿۱۲۴۴ھ﴾ میں پیدا ہوئے۔درسیات کی تکمیل مفتی سعد اللہ رامپوری اور علمائے فرنگی محل سے کی۔شاعری کا بچپن سے شوق تھا، منشی ظفر علی اسیر سے تلمذ حاصل کیا۔اُس زمانے میں

آتش و ناسخ کے شاگردوں کے باہم معرکے، اور انیس و دبیر کے مقابلے زور شور پر تھے۔ جرح وقدح اور نقد و نظر کا بازار گرم تھا۔ اس لیے کسی ادنیٰ شاعر کو فروغ حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت امیر مینائی نے شروع ہی سے شاعری پر محنت کی اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ شہرت حاصل کر لی کہ ۱۸۵۲ء ﴿۱۲۷۵ھ﴾ میں جب کہ امیر صاحب کی عمر بیس سال کی تھی، واجد علی شاہ نے ان کو طلب کیا اور کلام سنایا۔ بادشاہ کے حکم سے دو کتابیں 'ارشاد السلطان' اور 'ہدایت السلطان' لکھ کر پیش کیں اور دربار شاہی سے خلعت پایا۔ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء ﴿۱۲۷۵ھ﴾ میں نواب یوسف علی خاں نے رامپور بلا لیا اور بڑی عزت کی۔ اپنے کلام پر اصلاح بھی لی۔ پھر ان کے بعد نواب کلب علی خاں نے امیر کو اپنا استاد بنا لیا۔ ان کے بعد نواب حامد علی خاں نے قدر و منزلت کی۔ ۴۲ برس ریاست رامپور میں بڑی عزت و راحت سے رہے۔ پھر نواب مرزا داغ نے امیر صاحب کو حیدر آباد بلا لیا۔ حضور نظام کا ایما پہلے ہو چکا تھا۔ امیر حیدر آباد گئے، لیکن جاتے ہی بیمار ہو گئے اور اکتوبر ۱۹۰۰ء ﴿جمادی الآخر ۱۳۱۸ھ﴾ میں وصال فرمایا۔

خاکسار مولف نے تاریخ وفات کہی تھی:- "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند" (۱۳۱۸) عیسوی تاریخ قرآن مجید سے نکلی: وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی = ۱۹۰۰ء
یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب حضرت امیر مینائی سفر دکن پر جانے لگے تو اپنا یہ شعر پڑھا۔

اب نہ ٹھہروں جو کرے میری خوشامد بھی وطن   کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے مجھ کو

اس میں لفظ 'غریب الوطنی' سے ان کا سال وفات (۱۳۱۸ھ) نکلتا ہے۔

امیر مینائی بڑے عالم، مفتی، عابد و زاہد، اور صاحب عرفان تھے۔ سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں رامپور کے ایک عارف کامل حضرت امیر شاہ قدس سرہٗ کے مرید اور صاحب اجازت تھے۔ باوجود مشاغلِ شعر و ادب اور خدمت سلاطین کے ریاضت روحانی میں فرق نہ آتا تھا۔ دیانت کا یہ حال تھا کہ جس زمانے میں امیر صاحب رامپور میں عدالت دیوانی کے حاکم تھے، نواب خلد آشیاں کلب علی خاں ولی عہد تھے۔ ایک مرتبہ ولی عہد بہادر کے کسی خادم خاص کا مقدمہ حضرت امیر مینائی کی عدالت میں پیش ہوا۔ ولی عہد نے امیر صاحب

سے اس کی سفارش کہلا بھیجی۔ لیکن انھوں نے انصاف و دیانت کو ہاتھ سے نہ دیا اور روئداد مقدمہ کے لحاظ سے اس شخص کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ اس وقت ولی عہد کو یہ بات ناگوار گزری، لیکن جب خود تخت نشین ہوئے، اور مصالح عدالت و سیاست پر نظر پڑی تو ایک دن خود امیر صاحب سے فرمایا کہ اب آپ کی اس کارروائی کا مجھ سے زیادہ قدر شناس کوئی نہیں۔

حضرت امیر مینائی عربی و فارسی کے عالم ہونے کے علاوہ ہندی و سنسکرت بھی خوب جانتے تھے۔ طب بھی پڑھی تھی۔ علم جفر میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ جفر میں دو کتابیں 'امورِ غیبیہ' (۱) اور 'رموزِ غیب' بھی لکھی تھیں۔ امیرِ مغفور کی تصانیف مطبوعہ و غیر مطبوعہ کثرت سے ہیں۔ ۲۵ سے کم نہیں۔ لیکن اکثر نظم کی ہیں، جن میں دو دیوان عشقیہ، 'مرأۃ الغیب' (۱۲۸۹ھ)، اور 'صنم خانۂ عشق' (۱۳۰۶ھ)، ایک دیوان نعتیہ 'محامد خاتم النبیین' (۱۲۸۷ھ)، ایک مجموعہ واسوخت، 'مینائے سخن' (جو بعد وفات شائع ہوا) خاص چیزیں ہیں۔ نثر میں رسالہ میلاد شریف 'خیابان آفرینش' (۱۳۰۵ھ) 'نماز کے اسرار'، 'زاد الامیر'، 'امیر اللغات' اور 'انتخاب یادگار' مطبوعہ یادگاریں ہیں۔ امیر مرحوم کی وفات کے بعد ان کے شاگرد رشید مولوی احسن اللہ خاں ثاقب اکبر آبادی مرحوم (سابق پروفیسر وکٹوریہ کالج، گوالیار) نے 'مکتوبات امیر مینائی' کے نام سے مجموعۂ خطوط شائع کر دیا ہے۔

امیر صاحب کے مکان رامپور میں ۱۸۹۹ء میں آگ لگ گئی تھی۔ جس سے ان کے کتب خانے کا بڑا حصہ جل گیا (۲) یہ حضرت امیر مینائی کے ذاتی نقصان کے علاوہ ملک وقوم

---

(۱) ممکن ہے یہ نام تاریخی ہوں۔ پہلے سے ۱۲۶۴ھ اور دوسرے سے ۱۲۶۵ھ نکلتے ہیں۔ امیر مرحوم کی اکثر کتابوں کے نام تاریخی ہیں۔ اس لیے یہ قیاس ہوتا ہے۔

(۲) بعض تذکروں میں آگ لگنے کا سال ۱۸۹۵ء درج ہے۔ اگر ایسا ہے تو ممکن ہے وہ آگ پہلے لگی ہو۔ ۱۸۹۹ء میں آگ لگنا خود مجھے یاد ہے۔ میں رامپور میں حضرت امیر مینائی کے محلے میں ان کے مکانات سے قریب ہی رہتا تھا۔ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ آگ ایسے غضب کی تھی کہ اگرچہ مکان آتش زدہ سے میرا مکان فاصلے پر تھا پھر بھی وہاں سے جلے ہوئے کاغذ اڑ کر میرے گھر آتے تھے۔ اس حادثہ سے ہم سب پر عجیب ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ امیر صاحب اور جلیل صاحب کا دیکھنا اچھی طرح یاد ہے۔ بعض تقریبیں جن میں شریک ہوا یاد ہیں۔ حامد حسن قادری

اور زبان وادب کا اتنا بڑا نقصان تھا کہ جس کی کوئی تلافی ممکن نہ تھی۔ کتنی غیر مطبوعہ تصانیف خاک سیاہ ہو گئیں۔ جن میں ان کے دوسرے دیوان کے بعد کا کلام بھی تھا، جس کے متعلق خود حضرت امیرؔ کا بھی خیال تھا کہ 'صنم خانہ' سے بہتر ہے۔ 'صنم خانۂ عشق' کو وہ اپنا بہترین کلام نہ سمجھتے تھے۔

امیرؔ مرحوم کی تصانیف نثر میں 'انتخاب یادگار' (۱۲۹۰ھ) سب سے قدیم ہے۔ یہ نام تاریخی ہے۔ ۱۸۷۳ء ﴿۱۲۹۰ھ﴾ میں مرتب ہوا۔ اس میں صرف اُن شاعروں کا حال وکلام درج ہے جو رامپور کے رہنے والے یا دربار رامپور سے تعلق رکھنے والے تھے۔ نواب خلد آشیاں کلب علی خاں بہادر کے حکم سے لکھا گیا۔ امیرؔ مرحوم دیباچے میں لکھتے ہیں:-

''ایک دن بندگان حضور کو خیال آیا کہ ایک تذکرہ شعرائے ماضی وحال کا ایسا تیار ہو کہ اس سے خاص اس دارالریاست کے متوطن اور متوسل شاعروں کی مختصر کیفیت، سخن گوئی کی حقیقت نقش صفحۂ روزگار ہو۔ اس ضمن میں اعزاز اس ہیچمداں کا بھی منظور ہوا، لہٰذا یہ ہیچمرز اس خدمت پر مامور ہوا، اور محض باقتضائے عطوفت خسروانی آغاز سے انجام تک برابر حضور نے التفات فرمایا۔ تب یہ تذکرہ ایک سال میں تمامی پر آیا۔''

چھ سو صفحہ کے قریب ضخامت ہے۔ اور چار سو سے زیادہ شاعروں کا حال ہے۔ شروع میں ۱۶۸ صفحوں میں تمام والیان ریاست رامپور کا مفصل حال لکھا ہے، اور ان میں سے جو شاعر تھے ان کا کلام بھی۔ اس کے بعد عام شعراء کا تذکرہ حروف تہجی کی ترتیب سے۔ عربی، فارسی، اُردو، ہندی جس زبان کا جو مسلمان یا ہندو شاعر ہے اس کا تھوڑا یا بہت تذکرہ ضرور ہے۔ عربی اور ہندی کے تمام اشعار کا اُردو ترجمہ بین السطور میں لکھ دیا ہے۔

'انتخاب یادگار' میں چونکہ شعرائے رامپور کا احاطہ کرنا تھا، اس لیے ہر قسم کے شاعر شامل کر لیے گئے، بہر حال یادگار رہنے میں شک نہیں۔ کتنے اچھے شاعر ایسے بھی ہیں جو اور کسی تذکرے میں نہ مل سکتے 'خم خانۂ جاوید' جیسے تذکروں کو 'انتخاب یادگار' سے بہت مدد ملی۔

اس کی طرزِ تحریر میں کوئی خاص بات نہیں۔ جس زمانے میں امیرؔ مغفور نے یہ کتاب لکھی ہے مقفّیٰ عبارت کا رواج تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ سر سیّد کی صاف اور رواں تحریریں شائع ہو رہی تھیں، مولوی نذیر احمد دہلوی کی 'مراۃ العروس' وغیرہ مشہور ہو گئی تھیں۔ عام کتابوں اور رسالوں میں قافیہ کی آرائش باقی نہ رہی تھی۔ لیکن غالباً کچھ تو حضرت امیر کی اپنی پسند، کچھ یہ خیال کہ شاہی فرمان سے کتاب لکھی جاتی ہے تو اس پر محنت بھی ہونی چاہیے اور کچھ خصوصیت اور زیب و زینت بھی، 'انتخاب یادگار' کی اس خاص طرز کے باعث تھے۔ مختصر نمونہ یہ ہے:-

"حیاؔ، صاحب عالم مرزا رحیم الدین خلف صاحب عالم مرزا محمد کریم الدین رساؔ، اٹھتر برس کا سن ہے، جیسا ظاہر ہے ویسا ہی باطن، نہایت خوش طبیعت، نیک خصال ہیں۔ آفرینش سخن میں بڑے ذی کمال ہیں، شطرنج بھی خوب کھیلتے ہیں، وطن قدیمی ان کا دہلی ہے، مگر مدّت سے اسی سرکار فیض آثار میں تعلق ہے، مع اہل و عیال یہیں رہتے ہیں، مشق کا یہ عالم ہے کہ موا جی طبیعت سے دریا کی طرح بہتے ہیں، زبان اچھی مذاق اچھا ہے، فکر بلند ذہن رسا ہے۔ شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد رشید ہیں، اشعار ان کے قابلِ دید ہیں:-

تھے اک نگاہ میں مرے عقدے تمام حل — اتنا سا کام آپ کو دشوار ہو گیا

تڑپنا میرا نہ دیکھا گیا یہ محض غلط — نہ بیٹھنے کا مگر ان کو اک بہانہ ہوا

دشمن صد چاک دامن اور سودا عشق کا — یہ بھی کیا میں ہو گیا میرا گریباں ہو گیا

چین کیا آئے شب غم موت بھی آتی نہیں — یاں تو دم کا بھی نکلنا دل کا ارماں ہو گیا

ہاتھ ہے دل پر پس مرگ اس لیے — درد نکل جائے نہ دم کی طرح

یہ میدانِ محشر ہے دنیا نہیں ہے — کہ ٹکڑے اڑا دو گے گھر سے نکل کر

امیرؔ صاحب نے حیاؔ کے بہت سے شعر درج کیے ہیں، یہاں امیرؔ کی پسند اور انتخاب کی خوبی دکھانے کے لیے چند شعر نقل کر دیے گئے ہیں۔

امیرؔ مینائی مرحوم کا دوسرا کارنامہ 'امیر اللغات' ہے۔ ان سے پہلے بھی اُردو لغات (۱)

---

(۱) اُردو لغات۔ اُردو کی چند قدیم لغت کا ذکر یورپین مصنفین کے ذکر میں آ چکا ہے۔ اہل یورپ کی لغات اُردو سے پہلے ملا عبدالواسع ہانسوی نے 'غرائب اللغات' لکھی تھی، جس کو سراج الدین علی خاں آرزوؔ نے دوبارہ صحت کے ساتھ 'نوادر الالفاظ' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد کسی ہندوستانی نے کوئی قابل ذکر لغات کی کتاب نہیں لکھی۔ یورپ والوں کو ہندوستان میں آکر اُردو زبان سیکھنے کے سلسلے میں اُردو کی فرہنگ کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک مشنری ایم۔ ٹی۔ غیبس نے ۱۷۰۴ء میں اُردو لغات مرتب کیے۔ پھر ۱۷۷۳ء میں فریکس نے ہندوستانی انگریزی لغت لکھی۔ پھر ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے ۱۷۹۳ء میں انگریزی ہندوستانی ڈکشنری شائع کی، اس کے بعد اہل یورپ نے کثرت سے اُردو لغت لکھے، جن میں یہ کتابیں ممتاز ہیں:- (۱) کپتان ٹیلر کی اُردو انگریزی لغت (۱۸۰۸ء)، (۲) گلیڈون کی ڈکشنری (۱۸۰۹)، (۳) کپتان روبک کی 'لغت جہاز رانی' (۱۸۱۱ء)، (۴) جان شکسپیر کی اُردو لغت (۱۸۱۳ء)، (۵) ڈنکن فوربس کی ہندوستانی لغت (۱۸۴۷)، (۶) فرانسیسی برٹرینڈ کی اُردو لغت (۱۸۵۸ء)، (۷) ڈاکٹر فیلن کی چار اُردو ڈکشنریاں، عام الفاظ کی الگ اور قانونی الفاظ کی الگ (۱۸۷۳ء سے ۱۸۸۰ء تک)، (۸) پلیٹس (Platts) کی اُردو ہندی ڈکشنری (۱۸۸۴)۔

اہل ہند نے بھی لغت نویسی کی طرف توجہ کی، (۱) میر اوحد الدین بلگرامی نے اُردو لغات اور محاورے 'نفائس اللغات' میں جمع کیے۔ کتاب فارسی میں لکھی ہے۔ عربی مترادف الفاظ بھی لکھے ہیں۔ محمد علی شاہ اودھ کے عہد حکومت (تا ۱۸۴۲ء) میں مرتب ہوئی۔ (۲) اس کتاب میں جو لغت رہ گئے تھے ان کو بھی شامل کر کے محبوب علی رامپوری نے 'منتخب النفائس' کے نام سے نئی ترتیب کے ساتھ مرتب کی، یعنی تمام لغت جدولوں میں لکھی ہے۔ تین خانے بنائے ہیں، پہلے خانے میں اُردو لفظ، اس کے سامنے دوسرے خانے میں فارسی مترادف، اور تیسرے میں عربی۔ متن میں کوئی عبارت نہیں۔ لغات کے اعراب، تشریح، سند کے اشعار وغیرہ سب حاشیہ میں لکھے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء میں امجد علی شاہ اودھ (عہد حکومت تا ۱۸۴۷ء) کے زمانے میں مرتب ہوئی اور ۱۸۷۰ء میں مطبع نظامی کانپور میں چھپی۔ مصنفین لغت میں علی اوسط رشکؔ، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی کتابیں بہت لکھی گئیں، لیکن ایسی جامع کتاب کوئی نہ تھی۔ امیرؔ مرحوم نے اُردو محاوروں کا احاطہ اور سند کے اشعار کا اضافہ بڑی کاوش کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن صرف دو جلدیں الف ممدودہ والف مقصورہ کے الفاظ کی ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئیں تکمیل نہ ہو سکی۔

امیر اللغات کا دیباچہ امیرؔ صاحب نے نہایت سلیس اور رواں اُردو میں لکھا ہے۔ قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے 'امیر اللغات' کی داستانِ تالیف بھی معلوم ہوگی۔

"میں نے ہوش سنبھالا، آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھا کہ اچھے اچھے اہل زبان اور زباندان سرزمین سخن کے فرمانروا ہیں۔ انھیں صحبتوں میں اُردو زبان کی چھان بنان کا شوق مجھے بھی ہوا، اسی زمانے میں یہ آرزو پیدا ہوئی، اور بڑھ کر بے چین کرنے لگی کہ اُردو الفاظ کے بکھرے ہوئے موتیوں کی ایک خوشنما لڑی بناؤں۔ اتنے میں لکھنؤ کی سلطنت مٹ گئی، اور غدر ہو گیا، وطن کی تباہی اور گھربار کے لٹنے سے چندے حواس ہی جمع نہ ہو سکے، الفاظ کیسے؟ لیکن اس آرزو کی آگ دل میں سلگتی رہی، یہاں تک کہ فردوس مکاں نواب محمد یوسف علی خاں بہادر والی رامپور نے مجھے طلب فرما کر عزت کا خلعت اور اطمینان کا سرمایہ دیا

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) مرزا مچھو بیگ عاشقؔ، حکیم ضامن علی جلالؔ، لالہ چرنجی لال، اور مولوی سبحان بخش کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ (۳) مولوی سیّد احمد دہلوی کی 'فرہنگ آصفیہ' ۱۸۹۲ء، (۴) امیر اللغات (۵) فصیح اللغات مولانا احسن مارہروی نے مرتب کرنی شروع کی تھی، حضرت داغؔ سے اس کے سند کے اشعار لکھوائے تھے لیکن ناتمام رہ گئی۔ (۶) نواب عزیز جنگ کی 'آصف اللغات' یہ ڈکشنری کیا انسائیکلو پیڈیا تھی، لیکن ناتمام رہ گئی۔ تقریباً آٹھ ہزار صفحوں میں حرف (ت) تک نوبت پہنچی تھی۔ (۷) 'نور اللغات' مولوی نور الحسن علوی نیرؔ کاکوروی نے ۱۹۳۰ء میں مکمل کر کے شائع کی۔ (۸) اس کے بعد پنجاب سے 'جامع اللغات' مولوی عبد المجید نے شائع کی۔ یہ 'نور اللغات' سے زیادہ ضخیم ہے۔ ان بڑی کتابوں کے علاوہ خواجہ عبد الرؤف عشرتؔ لکھنوی، مرزا عزیزؔ لکھنوی، مولوی فیروز الدین وغیرہ نے مختلف اُردو لغات شائع کی ہیں۔ (۹) انگریزی لغات کے اُردو معانی کے لیے اب تک کوئی مکمل و مستند ڈکشنری نہ تھی۔ یہ کمی حال میں ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب نے پوری کر دی کہ 'اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری' کے نام سے نہایت ضخیم لغت انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔

اب میں پھر اپنی تمنا کے سلسلے کو بڑھانے لگا۔ مگر اس زمانے میں رامپور کی عدالت دیوانی میرے متعلق تھی۔ نواب فردوس مکاں اپنے کلام میں بھی مشورہ فرماتے تھے، اور فنِ شاعری کے مشغلے جو نئی نئی شکلوں سے پیش آتے ہیں۔ وہ یوں بھی کم فرصتی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اتنی مہلت تو میں نہ پاسکا کہ اپنے ارادے کو پورا کروں تاہم کچھ کچھ شغل چلا گیا۔ جب خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کا عہد آیا تب فرصت کی کمی اور بڑھی، لیکن کچھ ہی ہوا، یہاں وہی دھن بندھی رہی۔ ۱۸۸۴ء میں علوم کے قدردان سر الفرڈ لائل صاحب بہادر (لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی و چیف کمشنر اودھ) نے نواب خلد آشیاں طاب ثراہ سے اُردو کے ایک جامع لغت کی فرمائش کی۔ نواب خلد آشیاں نے مجھے حکم دیا۔ یہاں تو یہ تمنا ہی تھی۔ فوراً "آنکھ" کے لفظ کا ایک نمونہ تیار کیا، جسے نواب خلد آشیاں نے جنرل محمد اعظم الدین خاں بہادر (سابق سفیر ریاست وحال وائس پریسیڈنٹ کونسل آف ریجنسی) کے ذریعہ سے سر الفرڈ لائل صاحب بہادر کے پاس بھیجا۔"

آگے کا قصہ یہ ہے کہ لفٹنٹ گورنر نے نمونہ پسند کیا اور سرپرستی و امداد کی امید دلائی۔ لیکن وہ چلے گئے اور نواب خلد آشیاں کا انتقال ہو گیا۔ امیر اللغات کا کام رک گیا۔ آخر نواب حامد علی خاں کے عہد میں اس کی اشاعت شروع ہوئی۔ 'امیر اللغات' کا نمونہ یہ ہے:—

"آنکھوں کی سوئیاں نکالنی رہ گئی ہیں۔ یہ مثل اُس جگہ بولتے ہیں جہاں کسی کام میں بہت کچھ محنت و مشقت ہو چکے، تھوڑی سی کوشش باقی رہے۔ داغؔ۔

جو بیٹھیں آنکھیں تو پلکیں بھی کوئی پل کی ہیں رہی ہیں بس یہی آنکھوں کی سوئیاں باقی

اس مثل کی نسبت ایک کہانی مشہور ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی عورت نے ایک شخص کو دیکھا کہ مُردہ سا پڑا ہے اور تمام بدن میں سوئیاں چبھی ہوئی ہیں۔ سمجھی کہ کسی نے اس پر جادو کیا ہے، اس لیے کہ بقول مشہور ایک قسم کے جادو میں سوئیاں بھی چبھوتے ہیں۔ وہ سوئیاں نکالنے لگی۔ سارے بدن کی سوئیاں نکال لیں، صرف آنکھوں کی باقی رہ گئی تھیں کہ ایک عورت وہاں اور آ گئی۔ اس نے اس سے کہا کہ اب آنکھوں کی سوئیاں نکالنی باقی ہیں تو یہاں ٹھہری رہ میں ابھی آتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کسی ضرورت کو گئی۔ اس عورت نے اس کی آنکھوں کی سوئیاں نکال لیں، اور وہ شخص سحر سے نجات پا کر اُٹھ بیٹھا۔ محبت اور

ہمدردی اس عورت کی ثابت ہوئی جس نے آنکھوں کی سوئیاں نکالی تھیں۔''

امیر مینائی کے خطوط بھی ان کی عمدہ یادگار ہیں۔ بعض میں شعروادب کے مسائل بیان کیے ہیں۔ بعض پرائیوٹ خط بہت دلچسپ ہیں۔ اس طرح کا ایک خط حضرت داغ دہلوی کو لکھا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں مرزا داغ کو حضور نظام دکن نے ''استاد السلطان'' کا خطاب دیا۔ اخباروں میں اس کا تذکرہ چھپا، امیر صاحب نے بھی دیکھا۔ اُنھیں دنوں میں مرزا داغ کا خط امیر صاحب کے پاس آیا، لیکن انھوں نے اپنے خطاب واعزاز کا ذکر نہ لکھا تھا۔ اس خط کے جواب میں امیر لکھتے ہیں:۔

''مصدر لطف اتم قدیمی مکرم سلامت۔ سلام مسنون اخلاص مقرون۔ مدت کے بعد نوازش نامہ آیا، ممنون یادآوری فرمایا۔ بندہ نواز مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی خط کا جواب قلم انداز کیا ہو۔ یہ میرے مقدر کی نارسائی کہ خط نہ پہونچا ہو۔ بہر کیف جرم ناکردہ کا عذر خواہ ہوں۔ اخبار گورکھپور میں ریاض نے آپ کا مخاطب بخطاب 'استاد السلطان' ہونا اور بہات سو روپیہ مشاہیرہ مقرر ہونا چھاپا۔ یہ دیکھ کر نہایت سرور ہوا تھا، مگر اس تحریر میں ان دونوں اعزازوں کا ذکر نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ سرور کھیت گیا۔ عزت افزائی جو سرکار دولت مدار نے تلمذ سے فرمائی وہ میرے سرور آیندہ ترقی کی امیدوں کو بڑھا رہے ہیں۔ خدا جلد ظہور میں لائے۔ شکایت جو آپ نے 'صنم خانۂ عشق' دیوان دوم کے نہ پونچنے کی لکھی ہے، وہ دیوان چھپا کہاں، ورنہ ممکن تھا کہ نہ پونچتا۔ تالیفات کہنہ کا حضور میں آپ کے واسطے سے نہ پونچنا معاذ اللہ اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ نے رشک وحسد سے گزاریں۔ افسوس کہ اتنی مدت تک یکجائی اور میری طبیعت کی صفائی دیکھ کر بھی آپ کو بدگمانیاں باقی ہیں۔ میاں بوڑھے ہوگئے ہو، یہ شیوہ چھوڑ دو کہ زبردستی رکاوٹ کے لئے ایک بات قرار دی ہے۔''

(داغ نے امیر کے خطاب کے متعلق استفسار کیا ہوگا، اس کا جواب اسی خط میں دیتے ہیں)

''اول تو میں خطاب لینے ہی کے قابل اپنی قابلیت کو نہیں سمجھتا، اور پھر درخواست دے کر خطاب مانگنا، یہ تو بالکل پسند نہیں۔ میاں اب تو وہ وقت آگیا کہ 'مرحوم ومغفور' کا خطاب بارگاہ شہنشاہ حقیقی سے عطا ہو، کوئی اور حوصلہ نہیں ہے۔

آپ کا تازہ کلام دیکھ کر جی خوش ہوجاتا ہے۔ میں کہتا کیا ہوں جو بھیجوں، جی افسردہ رہتا ہے، کبھی

کسی گلدستے والے کے اصرار سے کچھ بکتا ہوں تو وہ چھپ جاتا ہے۔ یہ فراغتیں چشم بد دور، آپ کے واسطے ہیں کہ شعر کے سوا کوئی فکر نہیں، خدا جمعیت خاطر بڑھائے۔"

(اسی خط کی آخری سطروں میں کس بے تکلفی اور خلوص سے لکھتے ہیں)

"ارے یار، استاد السلطان ہونے کی مٹھائی تو لا۔ 'یا استادیا استاد' برسوں کہا کیا ہے۔ اب جو وقت آیا تو استاد کی شیرینی ندارد۔ امید ہے کہ کبھی کبھی رسم رسل و رسائل رہے، میں ابتدا سے تمھارا دوست اور خیر خواہ ہوں، میری طرف سے گمان فاسد نہ کیا کرو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

امیر فقیر ۳۱ر مارچ ۹۱ء"

یہ خط 'مکتوبات امیر مینائی' میں شامل نہیں ہے۔ رسالہ 'نیرنگ' (۱) دہلی کے 'امیر نمبر' سے نقل کیا گیا ہے۔ اس لیے نادر یادگار ہے۔

ایک اور خط حکیم عابد علی کوثر خیر آبادی کے نام یہ ہے:-

۸ر مارچ ۱۸۹۸ء

مجی حکیم صاحب

سلام مسنون دعا مشحون۔ مہربانی نامہ نے پونچ کر شکر گزار یاد آوری کیا۔ اب تک آپ کا فائز المرام نہ ہونا

---

(۱) مولوی عزیز اللہ خاں رامپوری مرحوم نے غالباً ۱۹۲۷ء میں ریاست رامپور سے 'نیرنگ' جاری کیا۔ گھر کا چھاپہ خانہ۔ ان کے والد مغفور سعید اللہ خاں صاحب عیش رامپوری کا قائم کردہ (مطبع سعیدی) موجود تھا۔ سعید اللہ خاں بھی بڑے صاحب ذوق تھے۔ ایک رسالہ 'تہذیب' نام مدتوں نکال چکے تھے۔ بعض نادر کتابیں اپنے مطبع سے شائع کیں۔ منیر شکوہ آبادی کے کئی دیوان چھاپے۔ منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کا دیوان شائع کیا، منشی احمد علی شوق قدوائی کی نظموں کا مجموعہ "گنجینہ" کے نام سے شائع کیا۔ ان کے فرزند رشید عزیز اللہ خاں نے 'نیرنگ' کو علمی و ادبی شان کے ساتھ جاری رکھا۔ بعض خاص نمبر بڑے اہتمام سے شائع کیے۔ جن میں 'منیر نمبر' اور 'امیر نمبر' ممتاز ہیں۔ عزیز اللہ خاں بیمار رہنے لگے تو ان کے دوست عشرت رحمانی صاحب رامپوری نے ہاتھ بٹایا اور 'نیرنگ' کا اہتمام اپنے ذمہ لے کر دہلی سے نکالنا شروع کیا۔ عزیز اللہ خاں کی بے وقت جوان موت نے ایسا صدمہ پونچایا کہ نیرنگ دہلی میں بھی اس کا متحمل نہ ہو سکا۔ اور کچھ عرصہ جاری رہ کر بند ہو گیا۔

سخت افسوس کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حسب دلخواہ کامیاب فرمائے۔ یہ داعی خیر دعا سے کسی وقت غافل نہیں ہے۔

بھانا پسند آنا کے معنی میں اگلی زبان ہے۔ اب میرے نزدیک بھی مستحسن الترک ہے۔ مہیں (میں ہی) کی جگہ بول چال میں چاہے آجاتا ہو، مگر کسی معتبر کلام میں اب تک نظر سے نہیں گزرا۔ حکم اس کے استعمال کا نہیں دیا جاسکتا۔ حضرت امیرؔ مرحوم کی نظر سے آپ کے شعر میں نہیں معلوم کیوں کر رہ گیا۔ اور میں نے بھی اسے دیکھا تو سوا اسے اپنے سہو نظر کے اور کیا کہا جائے۔ **انکھڑیاں** چشم معشوق کے لئے مخصوص ہے، اور یہ لفظ مجھے پسند نہیں ہے۔ **بھدنا** لفظ نہیں ہے بدھنا ہے اور سرایت کرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ صباؔ۔

شور جس کا ہے وہ ہے عشق جنوں زا دل میں

بدھ گیا ہے نمکیں حسن کا سودا دل میں

ایجاد مذکر ہے۔ سند کے واسطے شعر ذیل میں دیکھئے۔ آج کل اس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اخباروں میں مضامین دیکھے جاتے ہیں، اور جا بجا سے میرے پاس استفتے آتے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں داغؔ کا قول ہے کہ دِلّی میں مونث ہے مگر کلام میں مونث کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مونث کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے، اور بغیر کلام میں آئے ہوئے کہیں کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں۔ تسیم دہلوی

قبر پر آیا ہے دینے کو مبارکباد مرگ — یہ نیا ایجاد ہے میرے ستم ایجاد کا

میرؔ۔

یہ تازہ لگا ہونے ایجاد گلستاں میں — راتوں کو لگا رہنے صیاد گلستاں میں

اگر چہ اس شعر میں ایجاد کا لفظ جس صورت میں آیا ہے وہ سند کے لیے پورے طور سے کافی نہیں ہوسکتا۔ مگر دیوان میں اسی طرح چھپا ہے، اور ثقات کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے۔ غافل لکھنوی ۔

اتنی بینائی کہاں دیکھیں جو سیر جز و کل — عالم ایجاد میں تو سیکڑوں ایجاد ہیں

دشنام زیادہ مونث ہے مگر ظفر نے ایک جگہ مذکر لکھا ہے، لہٰذا مختلف فیہ کہا جاسکتا ہے۔ ناسخؔ ۔

کسی نے جو حیدر کو دشنام دی — تو گویا پیمبر کو دشنام دی

ولہٗ ۔

بارہا میں گیا ہوں نزد امام　　کبھی مجکو نہ دی کوئی دشنام

ظفر ۔

ہم کو پوشیدہ ہیں پیغام کسو کے آتے　　خط پہ خط روز ہیں بے نام کسو کے آتے

ہوس بوسہ اگر کھینچ نہ لاتی ہم کو　　کاہے کو سننے کو دشنام کسو کے آتے

سب بندہ زادے اور جلیل حسن بالتخصیص تسلیم گذار و سپاس گذار ہیں۔

امیر فقیر

پنڈت گرراج کشور دت: ان کا مفصل حال معلوم نہیں۔ آگرہ کے رہنے والے تھے، سینٹ جانس کالج آگرہ میں تعلیم پائی۔ مختلف مقامات پر منصف رہے۔ سب جج سے پنشن لے کر آگرہ میں قیام کیا۔ اپنے پرانے کالج کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے پریزیڈنٹ رہے۔

پنڈت صاحب متعدد قانونی کتابوں کے مصنف و مترجم ہیں۔ جن میں سے ایک کتاب 'آئینۂ وکالت' ہے جو ۱۸۸۹ء (۱۳۰۶ھ) میں اور نیمنگل جوب پریس آگرہ سے شائع ہوئی۔ پنڈت جی اس کتاب کے دیباچہ میں ان کتابوں کا ذکر کر کے جن سے اس کی تالیف میں مدد لی ہے لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ کتاب ہٰذا کی نسبت کسی قسم کی اختراع کا دعویٰ کرنا منجانب میرے ایک قسم کی گستاخی ہوگی، مگر اس قدر میں جرات کر کے کہہ سکتا ہوں کہ نصف سے زیادہ مضمون کتاب ہٰذا کا میرے ذاتی تجربہ اور فکر کا نتیجہ ہے۔"

پنڈت گرراج کشور صاحب سے پہلے قانون کی بہت کتابیں لکھی گئی تھیں۔ تمام قوانین اُردو میں منضبط ہو گئے تھے۔ اور اس قسم کی کتابیں برابر مرتب و شائع ہو رہی تھیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا کام الہ آباد کا مطبع نظائر قانون ہند کر رہا تھا۔ جس نے شاید کوئی ایکٹ اور کوئی نظیر اُردو میں منتقل کرنے میں نہ چھوڑی تھی۔ بقول خود اہلِ مطبع کے "ہر چہار

عدالت ہائے ہائی کورٹ واقع ہند'' یعنی کلکتہ و مدراس و بمبئی والہ آباد کے نظائر قانونی کا لفظ بلفظ ترجمہ ضخیم جلدوں میں کر دیا تھا۔ مسٹر جسٹس سیّد محمود جج ہائی کورٹ الہ آباد کے 'قانون شہادت' کی شرح اسی مطبع نے شائع کی تھی۔

لیکن پنڈت گرراج کشور کی تصنیف 'آئینۂ وکالت' اپنی وضع کی خاص کتاب ہے۔ پنڈت جی نے مقدمہ کی پیروی، استغاثہ واپیل، جرح و جواب دہی کے قانون اور طریقہ کار بتانے کے علاوہ وکیلوں کو ایسے اصول سمجھائے ہیں جو ایک تجربہ کار اور ہمدرد حاکم ہی سمجھا سکتا تھا۔ قانون جیسے خشک موضوع کو مثالوں اور تمثیلوں سے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ زبان میں البتہ پرانا پن موجود ہے۔ وکیل کے ذاتی اخلاق کی بحث میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

''خودی اور طمع سے ہمیشہ وکیل کو سخت پرہیز کرنا چاہیے...... خودی یا غرور ایسی بری چیز ہے کہ جس شخص میں یہ ہوتی ہے وہ اپنے آپ پر نامناسب اور بیجا طور پر فخر اور ناز کرتا ہے، مگر بالعموم لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور اپنے دل میں کچھ اس کی وقعت نہیں سمجھتے...... طمع ایسی بری شے ہے کہ یہ انسان کی طبیعت سے نیکی اور بالعموم عمدہ اور پسندیدہ صفات کی بیخ کنی کرتی ہے...... ایک مشہور مصنف فارسی نے کیا خوب کہا ہے مصرع ''طمع را سہ حرف است و ہر سہ تہی'' یعنی طمع کے تین حروف ہیں اور تینوں خالی ہیں۔ اور ایک انگریزی مصنف نے طمع کے مندر کا ذکر کیا ہے، اور اس مندر کا طمع کو دیوتا قرار دیا ہے، اور طمع کی صورت اور اس کے تعلقات (۱) کا فوٹو اس طرح پر کھینچا ہے کہ اندر مندر کے طمع کا دیوتا بیٹھا تھا، اور اس کی غلیظ (۲) لمبی داڑھی تھی۔ اور ضعیف چہرہ بھوک کا مارا ہوا تھا، اور اس کے چاروں طرف روپیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اور اس کے دو مصاحب یعنی دائیں طرف 'ظلم صاحب' اور بائیں طرف 'بخل صاحب' تشریف رکھتے تھے، اور پانچ چھ افسران منتظم مسمیان 'بے ایمانی' اور 'رشوت

---

(۱) تعلقات کا لفظ متعلقات کی جگہ لکھا ہے۔

(۲) غلیظ سے مراد ''گھنی'' ہے اور یہ استعمال درست۔ اگرچہ ہندوستان میں رائج نہیں۔ غلیظ کے معنی سخت اور موٹے کے ہیں۔ نجس و ناپاک نہیں۔ قران مجید میں ہے: میثاقاً غلیظاً (سخت اور پکا عہد)

ستائی' اور 'استحصال بالجبر' اور 'فریب' وغیرہ تھے، اور وہاں بہت سے بڈّھے اشخاص قریب المرگ (۳) روپیوں کی تھیلیوں پر تکیہ لگائے ہوئے لیٹے تھے، اور جوں جوں ان کی حالت جانکنی کی ہوتی تھی، اتنی ہی حسرت کے ساتھ وے روپیوں کی تھیلیوں کو اپنے ہاتھوں سے جلدی پکڑ لیتے تھے۔ مگر وے سب ایک بڑے زبردست جن سے جس کا نام 'افلاس' ہے، بہت کانپتے تھے۔ بعد اس طور پر صورت طمع اور اس کے تعلقات کے بیان کرنے کے ہمارے مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ جس وقت اس مقام پر 'افلاس' داخل ہوا سب لوگ خوف سے کانپنے لگے، مگر ہم نے آگے بڑھ کر اس طور پر التجا کی: اے 'افلاس' تو مجکو کبھی دکھلائی نہ دینا، اور اگر تو یہ میری عرض قبول نہ کرے تو اس بات کا خیال رہے کہ تیری دھمکی اور گیدڑ بھبکی سے مجھ میں کوئی بات ناشکرے پن یا غیر منصفی کی نہ آوے...... اور اگر 'دولت' میرے پاس مع اپنے ہمراہیان 'خودی' اور 'طمع' کے آوے تو اے 'افلاس' تو جلدی سے آکر مجکو بچا، مگر اپنے ساتھ اپنی دو بہنوں یعنی 'آزادی' اور 'بے گناہی' کو لا، جن کی صحبت میں تو ہمیشہ خوش رہتا ہے۔''

اس دور کے مشاہیر ادب

اوپر جن مصنفوں کا ذکر کیا گیا ان میں امیرؔ مینائی کے علاوہ اور کسی کا تذکرہ کسی بڑے چھوٹے تذکرہ و تاریخ میں نہیں ملتا۔ اس طرح کے بیشمار مصنف ہیں، لیکن یہ سب لوگ کچھ خاص صاحب طرز نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ سرسیّد کے اثر سے اور ان کے رفیقوں میں جو مصنف پیدا ہوئے، وہ اُردو ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے چند مشاہیر کا ذکر کیا جاتا ہے۔

نواب محسن الملک: سیّد مہدی علی نام۔ میر ضامن علی کے خلف رشید۔ سادات بارہہ کے ایک شیعہ خاندان کے فرد تھے۔ اٹاوہ وطن و مولد ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے تھے جو محض اپنے جوہر ذاتی سے مرتبۂ کمال پر پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ دس روپیہ کی تنخواہ سے تین

---

(۳) قریب المرگ کی غلط ترکیب اس قدر مستعمل ہے کہ اس کو علمائے زبان و ادب کے سوا سب ہی بولتے ہیں۔

ہزار روپیہ ماہوار تک ترقی کی، اور گمنامی سے بیرون ہند تک نام پایا۔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اٹاوہ میں حاصل کی۔ پہلے کلکٹری میں ملازم ہوئے۔ مسٹر ہیوم کلکٹر تھے (جو انڈین نیشنل کانگریس کے محرّک و بانی تھے) انھوں نے ان کے جوہر پہچانے اور اہلمد کردیا۔ پھر غدر کے بعد پیشکار اور سررشتہ دار بنا دیا۔ ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہو گئے۔ تحصیلداری کے زمانے میں انھوں نے اُردو میں دو کتابیں لکھیں، 'قانون مال' اور 'قانون فوجداری' اسی زمانے میں انھوں نے اپنے شیعہ سے سُنّی ہونے کا اعلان کیا، اور اس کے بعد ان کے اختلافات عقائد کے متعلق ایک کتاب 'آیات بینات' کے نام سے لکھنا شروع کی۔ ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کے امتحان مقابلہ میں اعلیٰ کامیابی حاصل کی، ۱۸۶۷ء میں مرزاپور میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ ان فرائض کے ساتھ بعض ریاستوں کا انتظام و مشورہ بھی ان کے سپرد رہا۔ حیدر آباد کے وزیر اعظم سر سالار جنگ نے شہرت سنی، پھر اتفاق سے کلکتہ جاتے ہوئے مرزاپور میں وزیر کی ان سے ملاقات بھی ہوگئی۔ سر سالار جنگ نے ۱۸۷۴ء میں ان کی خدمات حیدر آباد کے لیے لے لیں۔ وہاں اول بارہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر ناظم بندوبست اور انسپکٹر جنرل صیغہ مال مقرر ہوئے۔ پھر چند روز میں پندرہ سو روپیہ تنخواہ ہوگئی اور کمشنر بندوبست ہو گئے۔ اور نواب منیر نواز جنگ بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۸۷۶ء میں ریونیو سکریٹری (اعلیٰ معتمد مال) ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں سر سالار جنگ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد فنانشل اور پولیٹکل سکریٹری بنائے گئے۔ سہ ہزاری منصب اور تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اور خطاب میں محسن الدولہ محسن الملک کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد ریاست کے معدنیات کے متعلق کچھ معاملات حکومت اعلیٰ اور پارلیمنٹ سے طے کرنے کے لیے انگلستان بھیجے گئے۔ محسن الملک نے یہ خدمت نہایت حسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دی۔ اور وہاں کے مشاہیر سے بھی ملے۔ جن میں سے وزیر اعظم برطانیہ مسٹر گلیڈ اسٹن سے خاص تعلقات قائم ہوگئے کہ بعد کو بھی رسم مراسلت جاری رہی۔

آخر بیس سال ریاست کی خدمت نیک نامی سے انجام دینے کے بعد آٹھ سو روپیہ ماہوار پنشن پر رخصت ہوئے۔ سر سیّد سے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ شروع میں تو

سر سیّد کے مذہبی عقائد اور آزاد خیالی سے بہت بیزار تھے۔ لیکن ملازمت مرزا پور کے زمانے میں سر سیّد کو قریب سے دیکھا اور سمجھا تو پھر محسن الملک سے زیادہ سر سیّد کا عاشق کوئی نہ تھا۔ چنانچہ حیدر آباد سے آکر سر سیّد کے ساتھ علی گڑھ میں قیام کیا، اور باقی زندگی قومی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ سر سیّد کے انتقال (۱۸۹۸ء) کے بعد سر سیّد کی وصیت و تمنا کے مطابق ان کے صاحب زادے سیّد محمود علی گڑھ کالج کے سکریٹری ہوئے۔ پھر ۳۱ر جنوری ۱۸۹۹ء کو محسن الملک سکریٹری منتخب ہو گئے۔

۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۷ء ﴿۱۳۲۵ھ﴾ کو شملہ میں انتقال کیا۔ وہاں سے علی گڑھ لا کر سر سیّد کے قریب دفن کیے گئے۔ (۱)

جس وقت کالج کا انتظام نواب محسن الملک کے ہاتھ میں آیا کالج کی حالت بہت

---

(۱) خاکسار مولف نے آیہ کریمہ سے تاریخ وفات کہی: "اُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ یُرْزَقُوْنَ فِیْھَا" (سورہ مومن۔ رکوع ۵ پارہ ۲۴) ۱۳۲۵ھ نکلتے ہیں۔ وہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا۔ میں نے نواب صاحب کا ایک مرثیہ بھی بصورت ترکیب بند اُسی وقت لکھا تھا۔ جس کے چند شعر یہ ہیں:-

تیرگی ملک پہ چھائی ہے سیہ بختی کی — قوم کا ڈوب گیا آج ستارہ افسوس
اور کیا اس سے سوا ہوگی تباہی اے قوم — محسن الملک کریں تجھ سے کنارہ افسوس
ان سے وابستہ تھیں امیدیں ہزاروں اپنی — قوم کا ٹوٹ گیا آج سہارا افسوس

مولانا حالی نے اس موقعہ پر نہایت دردناک قطعہ کہا تھا اور دسمبر ۱۹۰۷ء میں کانفرنس کے اجلاس کراچی میں (جس کے خود مولانا حالی پریسیڈنٹ تھے) سنایا تھا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:-

وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غمخوار — سر کر کے مہم، قوم کے کام آگیا آخر
سیّد کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا — اس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر
یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قوموں کے فدائی — دنیا کو تماشا یہ، وہ دکھلا گیا آخر
مہدی کے لیے قوم عزادار ہے ساری — کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

حامد حسن قادری مولف

نازک تھی۔ سرسیّد کے آخری دنوں میں ایک لاکھ روپیہ کا غبن ہو جانے کے سبب سے کالج پر قرضے کا بار گراں آپڑا تھا۔ اس کے علاوہ اب تک کالج پر ملک وقوم کا پورا اعتماد نہ تھا۔ نواب محسن الملک نے اپنے خلوص، ہمت، کوشش اور اثر سے چند سال میں تمام مشکلیں حل کر دیں، اتنا چندہ جمع ہو گیا کہ تمام قرضہ ادا کر دیا گیا، کثرت سے طلباء داخل ہونے لگے، اور اعتماد قائم ہو گیا۔ نواب صاحب کی تقریر نہایت پر جوش اور موثر ہوتی تھی۔ ان کے خلوص کا خاص طور پر اثر پڑتا تھا، اور ان کی تدبیریں نہایت کارگر ہوتی تھیں۔ نواب صاحب نے سرسیّد کی زندگی میں اور ان کے بعد اپنی جیب سے ہزار ہا روپیہ چندوں میں دیے۔ جب لندن میں سرسیّد کو روپیہ کی ضرورت پیش آئی تو نواب محسن الملک نے اپنی ایک مہینے کی پوری تنخواہ بھیج دی۔

نواب محسن الملک نے کثرت سے کتابیں تصنیف نہیں کیں۔ دو قانونی کتابوں (جن کا نام پہلے لیا گیا ہے) اور دو تین مذہبی کتابوں کے علاوہ ان کی یادگار ادبی ان کے مضامین 'تہذیب الاخلاق' اور لکچر اور خطوط ہیں، لیکن ان میں ایک خاص شان ادب پائی جاتی ہے۔ جوش وخلوص ان کی ہر تحریر کے نمایاں عنصر ہیں۔ طرزِ تحریر نہایت صاف مدلل و موثر ہے۔ بعض مضامین خالص ادیبانہ رنگ اور شاعرانہ تخیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ زبان و بیان میں کچھ قدامت کا اثر ضرور ہے۔ بعض تحریروں کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں:-

(۱) 'آیات بیّنات' خالص مذہبی کتاب ہے۔ سب سے پہلے اس کی پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں مرزا پور کے مشن پریس میں ٹائپ میں چھپی۔ پھر لیتھو کے مطبع میں بھی چھاپی گئی۔ اس کی تحریر کا سلسلہ جاری تھا کہ نواب صاحب کے تعلقات سرسیّد سے قائم ہو گئے اور وہ خدمت قومی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ 'آیات بیّنات' کا موضوع اس مسلک کے خلاف تھا اس لیے تین جلدیں لکھ کر اس کو ناتمام چھوڑ دیا۔ اس کتاب میں نواب محسن الملک نے فرقۂ مخالف کے تمام عقائد و اعمال سے طویل بحث کی ہے، اور مدلل تردید کی ہے۔ وہی حصے قابلِ نقل و اقتباس ہیں، لیکن اس کو مصلحتاً چھوڑ کر دیباچہ سے چند سطریں بطور نمونہ عبارت درج کی جاتی ہیں:-

''پس ہم لوگوں کو فقط اسلام کے نام پر خوش ہونا اور توحید اور نبوت کے اقرار پر اپنے کو ناجی سمجھنا نہ چاہیے، بلکہ ہر عقیدے کی تحقیق کرنا اور ہر اعتقادی مسئلے کی تطبیق کتاب اللہ اور کتاب الرسول سے دینا ضرور ہے۔ اور یہ ممکن نہیں کہ جو شخص اپنے سچے اور صاف دل سے صرف اپنی نجات کی امید پر خدا کی کتاب کو دیکھے اور تعصب اور عناد کو دخل نہ دے، وہ حق اور باطل میں تمیز نہ کر سکے، اور ایسے حق کے طالب کو خدا گمراہی میں پڑا رکھے۔ ہاں جو کوئی پہلے سے سچائی کا طالب نہ ہو اور مذہبی تعصب میں گرفتار ہو، اور سوائے مجادلے اور مکابرے کے اسے اور کچھ منظور نہ ہو اور اپنے آبائی دین و مذہب کو تقلیداً سچ جانتا ہو، وہ بے شک اپنی گمراہی میں پڑا رہے گا، اور اپنے دل کو باطل عقیدوں سے کبھی پاک وصاف نہ کر سکے گا۔''

(۲) مضامین تہذیب الاخلاق۔ یہ مضامین نواب محسن الملک کا ادبی کارنامہ ہیں۔ سر سیّد نے ۱۸۷۰ء میں رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا۔ اس میں نواب صاحب نے بھی مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، تاریخی، اصلاحی مضامین لکھے۔ جن کا مجموعہ بعد کو شائع ہو گیا ہے۔ ایک مضمون تمثیلی رنگ میں بہت دلچسپ لکھا ہے۔ اس قسم کی طرزِ نگارش کا ذکر سر سیّد کے مضامین کے سلسلے میں آچکا ہے۔ نواب محسن الملک کے مضمون (موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ) کے مختلف اقتباسات انہی کے الفاظ میں مسلسل نقل کیے جاتے ہیں:-

موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ۔ ایک روز خیال نے مجھے عالم مثال تک پہنچایا اور اس طلسم کدے کو جہاں سب چیزوں کی شبیہ اور تمام حالتوں کی تصویر مصور قدرت نے کھینچ رکھی ہے، دکھایا۔ درحقیقت میں نے اسے ویسا ہی پایا جیسا سنا کرتا تھا۔ بلاشبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی تصویر کا مرقع ہے۔

جب میں اس طلسم خانہ کی مغربی جانب پہنچا تو ایک چار دیواری دیکھی جو میرے خیال سے بھی زیادہ مضبوط تھی...... میں نے وہاں ایک رفیق پایا، جس کا نام 'خرد' تھا۔ اس سے حقیقت اس کی پوچھی تو اس کے اندر ایک ایسا پر فضا باغ ہے جسے جنت عدن بھی دیکھے تو شرمندہ ہو...... میں چندے اس باغ میں رہا پر مجھ کو اپنی صورت کا کوئی رفیق نہ ملا جس سے دل بہلتا...... آخر بعد چند سال کے مشرق کی طرف مجھے ایک چار دیواری نظر پڑی جس کی صورت بھی ویسی ہی تھی اور چشمہ بھی ویسا ہی تھا جہاں سے

میں نکلا تھا...... مگر دروازہ کھلا ہوا اور دیوار شکستہ...... میں نے اپنے رہنما سے پوچھا...... اُس نے کہا یہ وہ باغ نہیں ہے، دوسرا ہے۔ پہلے اسی باغ کی طرح آراستہ تھا، خزاں کی ہوا نے اس کو سکھا دیا اور زمانے کے انقلاب نے پامال کر دیا...... جب میں نے ان چشموں کا حال پوچھا تو 'خرد' نے 'تحقیق' نامی رفیق کو میرے ساتھ کر دیا اور اس کے ساتھ میں ان دونوں چشموں کی حقیقت دریافت کرنے کو چلا...... تب 'تاریخ' نامی ایک روشن ضمیر ملا۔ اس نے کہا ہزار برس ہوتے ہیں تب میں اس باغ میں آیا تھا۔ نہایت تروتازہ سبز و شاداب تھا، جیسا وہ باغ جو تم نے اول دیکھا ہے۔ اس باغ کی نہروں میں صاف چشمہ کا پانی آتا تھا اور گندے چشمے پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ مگر سر کتے سر کتے اب وہ چشمہ پر آ گیا ہے۔ تب میں نے خیال کیا، اس پتھر کو ہٹا دوں۔ چنانچہ میں 'ہمت' کو ساتھ لے کر چلا، مگر چند خونخوار وحشی درندوں نے مجھ پر حملہ کیا، اور پتھر سرکانے پر مجھ کو موت کا خوف دلایا۔ میں جان بچا کر ہٹا...... میں نے چاہا کہ اس خیال کو چھوڑ دوں اور یہ پتھر جیسا ہے ویسا ہی رہنے دوں، پر 'استقلال' نامی ایک رجز خواں نے میرا دل بڑھایا، اور مجھے ایک تدبیر بتائی۔ اُس نے کہا، میں نے 'ایمان' نامی فقیر سے سنا ہے کہ اس چشمے کا ایک کھودنے والا ہے، وہ سب مشکل حل کر سکتا ہے۔ مگر بڑی مشکل ہے انسان کی رسائی اس تک ہو سکتی ہے۔ اس کی راہ میں اول تو مصیبت کا ایک بڑا میدان لق و دق ملتا ہے جس میں سوائے آنکھ کے پانی پینے کو کچھ نہیں۔ اگر اس سے بچ گئے تو 'رسوائی' اور 'بدنامی' کے سات سمندر ملتے ہیں، جہاں 'صبر' کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے سوا عبور کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تب دروازہ اس کو ملتا ہے۔ جہاں 'اخلاص' کی نذر پیش کرنی پڑتی ہے۔ اور 'دعا' کے پاک وصاف ہاتھوں سے پہنچائی جاتی ہے، تب وہ نذر قبول ہوتی ہے، اور اجابت کا خلعت ملتا ہے...... پس اگر تم کو اس پتھر کے سرکانے کی خواہش ہے تو وہاں تک جاؤ۔ اگر اس تک تمھاری رسائی ہوئی اور اس نے تمھاری نذر لے لی تو وہ 'اقبال' کو تمھارے ساتھ کرے گا۔ جب تم اس کو لوگوں کے سامنے لاؤ گے، سب کی آنکھیں کھل جائیں گی جو اب بند ہو رہی ہیں۔ تب وہ اپنے سوکھے ہوئے باغ کو دیکھ کر تعجب کریں گے اور تمھارے ساتھ پتھر سرکانے پر مستعد ہوں گے......

جب میں عالم مثال سے لوٹا اور لوگوں سے قصہ کہا تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے۔ میں صرف یہ کہہ کر، "جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا وہ علوم وفنون جدید کا باغ ہے، جس کے پھل پھول ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں، پر ہمارا دل بہلانے والا وہاں کوئی نہیں ہے، اور

جو باغ خشک میں نے مشرق میں دیکھا وہ ہمارے ہی علوم قدیمہ کا باغ ہے، جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے۔ وہ پتھر جو سرچشمہ پر آ گیا ہے، جہالت ہے۔ وہ ندی نالے گندے پانی کے رسم و رواج کی پابندی، نیکی نما تعصب، علم نما نادانی، جھوٹا زہد، جھوٹی شیخی، جاہلانہ تقریر، عامیانہ غلامی، ضرر انگیز حرارت، وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے۔ جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے۔ ''میں چُپ ہو رہا۔

(۲) مسلمانوں کی تہذیب، نواب صاحب کا اصلاحی اور اخلاقی مضمون ہے، اس کا موضوع پہلے ہی فقرے میں بیان کرتے ہیں:۔

''میرا یہ مضمون مسلمانوں کی تہذیب پر ہے کہ وہ پہلے کیسی تھی اور اب کیسی ہے اور آیندہ کیسی ہو گی۔''

بڑی تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ قدیم مسلمانوں کی مکمل تہذیب کا خاکہ کھینچا ہے۔ تمام علوم و فنون میں مسلمانوں اور عربوں کی اولیات اور کارنامے بیان کیے ہیں، اور پھر مسلمانان ہند کی موجودہ حالت کو بیان کرتے وقت ان ہی علوم و فنون میں سے ایک ایک کی حالت کو الگ الگ لکھتے ہیں۔ اور اس میں ظریفانہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ نواب محسن الملک کی تحریر کا مزاحی پہلو عام طور پر معلوم و مشہور نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ رنگ کم اور ہلکا ہے لیکن جہاں ہے، دلچسپ ہے۔ ان فقروں کو دیکھیے:۔

''طبیعات جاننے والا مسلمانوں میں کوئی نہیں رہا۔ ہاں چند مسائل کا بیان اس زمانے کے عالم اس طرح پر کرتے ہیں کہ عناصر چار ہیں: خاک، باد، آب، آتش۔ یہ چاروں بسیط ہیں۔ خاک کے اوپر آب اور آب کے اوپر باد اور باد کے اوپر آگ ہے، اور بہت بڑا ناری کرہ ہے۔ آسمان کی حرکت سے مشتعل رہتا ہے، مگر چونکہ قطبین کی طرف حرکت کم ہے اس لیے وہاں مشتعل بھی کم ہے، اور اسی سبب سے اس کی شکل 'اہلیلجی' ہو گئی ہے۔ جب شاگرد پوچھتا ہے کہ 'اہلیلجی' کی کیا شکل ہے، تو استاد اپنی سُرمہ دانی نکال کر دکھلاتے ہیں کہ ایسی بیچ سے موٹی، دونوں طرف سے پتلی۔ پس اس زمانے میں عالموں کی یہ طبیعات رہ گئی ہے، جس پر ہر کوئی ہنستا ہے۔''

''ہندسہ و حساب کچھ باقی ہے۔ اقلیدس کا ایک مقالہ اور خلاصۃ الحساب کی تحصیل 'اربعہ' یا 'جذر' تک فضیلت کی پگڑی بندھوا دیتی ہے، مگر طالب علم یہ سوچتے ہیں کہ تحریر اقلیدس کے پڑھنے اور ان ٹیڑھی

سیدھی شکلوں کے بنانے میں کیا فائدہ ہے۔"

"علم نباتات کی تحقیقات اعلیٰ درجے پر پہنچ گئی ہے۔ اچھے پڑھے لکھے مسلمانوں نے لکھا ہے کہ 'سراندیپ' میں ایک درخت ہے۔ جس پر کلمہ لکھا ہوا ہے، نہ زمین پر اس کا پتہ گرتا ہے، نہ کوئی جانور اسے کھا سکتا ہے۔ ہمیشہ تر و تازہ رہتا ہے۔ بڑے بڑے عالموں کا اس پر یقین ہے کہ بعض بوٹیاں ایسی ہیں جن سے سونا چاندی بن سکتا ہے۔"

"علم حیوانات میں بلاشبہ بڑی ترقی ہے، کیونکہ ہم نے اپنے ہاں کے بڑے بڑے عالموں کو تقریر کرتے سنتے ہیں کہ اگر بکری کتے سے بچہ پیدا ہو تو اس کا کھانا درست ہے یا نہیں۔"

شادی بیاہ کے دستور کو لکھتے ہیں:-

"نہ مرد عورت کو دیکھنے پاتا ہے نہ عورت مرد کو، یُؤمِنُونَ بِالْغَیْب پر نکاح کا مدار آرہا ہے۔"

(۴) مسلمانوں کی ترقی اور ان کے تنزل کے اسباب، یہ مضمون بہت طویل ہے مسلمانوں کی ترقیوں کو تاریخی حوالے کے ساتھ بیان کر کے ان کے تنزل کے پانچ سبب بتائے ہیں اور تفصیلی بحث کی ہے۔ پانچواں سبب 'غلط مذہبی خیالات' کو بتایا ہے۔ یہ حصہ بہت پر جوش لکھا ہے۔ قرآن و حدیث سے خوب خوب استدلال کیا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:-

"غرضکہ سارا قرآن اور ساری تعلیم ہمارے ہادی کی یہی ہے کہ وہ استعداد جو بدو فطرت میں خدا نے رکھی ہے، وہ کام میں لائی جاوے اور دنیا و دین کی ساری نعمتیں حاصل کی جاویں۔ قرآن سر دلیم کی سمجھائی ہوئی وہ زنجیر نہیں ہے جس میں ہم دنیاوی ترقیات کے لیے جکڑے ہوئے ہیں، بلکہ برخلاف اس کے وہ ان بندوں کو توڑنے والے ہیں جو عیسائیت نے یا عیسائیوں نے انسانوں پر اس سے روکنے کے لیے لگائے تھے۔ غور کرو خدا کی اس جھڑکی پہ جو رہبانیت اور جوگی بننے کے لئے ہے۔ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (کس نے خدا کی وہ نعمت حرام کی جو خدا نے بندوں کے لئے پیدا کی) پڑھو خدا کی یہ آیت جو دنیاوی لذتوں سے متمتع ہونے کے لئے ہے۔ کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا (اچھی چیزیں جو ہم نے روزی کی ہیں کھاؤ اور اچھے کام کرو)...... دیکھو کیسا عام اجازت نامہ ہے خدا کا، دنیا کمانے کے لئے۔ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ

اللّٰہ، (زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کی روزی تلاش کرو)۔ پھر خدا اپنے اچھے بندوں کو کیا دعا سکھاتا ہے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (اے خدا ہم کو دنیا اور آخرت میں بھلائی دے) یعنی دنیا اور دین دونوں کی بھلائی۔ جبکہ قرآن کے یہ احکام ہوں اور طلب معیشت اور تجارت اور کسب حلال کے لئے صاف صاف ترغیبیں اور بشارتیں جیسا کہ ہمارے ہادیؐ نے طلب معیشت کے لئے فرمایا ہو۔ اِنَّ مِنَ الذُّنُوْبِ ذُنُوْبًا لَا یُکَفِّرُ بِهَا اِلَّا الْهَمُّ فِیْ طَلَبِ الْمَعِیْشَةِ (بعض ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ صرف یہ ہے کہ معاش کی فکر میں رنج اٹھایا جاوے)، اور تجارت کے لئے ارشاد کیا ہو کہ اَلتَّاجِرِ الصُّدُوْقُ یُحْشَرُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مَعَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَاءِ (سچا سوداگر قیامت کے دن صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ اٹھے گا)، اور طلب دنیا کے لئے صاف صاف لفظوں میں یہ خوش خبری سنائی ہو کہ مَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلَالًا تَعَفُّفًا عَنِ الْمَسْئَلَةِ وَ سَعْیًا عَلٰی عِیَالِهٖ وَ تَعَطُّفًا عَلٰی جَارِهٖ لَقِیَ اللّٰهَ وَجْهُهٗ کَالْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ (جو شخص دنیا کو بطریق حلال تلاش کرتا ہے اور جس کا مقصد سوال کرنے سے بچنا اور آل اولاد کے لئے کوشش اور ہمسایہ پر مہربانی کرنا ہوتا ہے، اس کا منھ خدا کی ملاقات کے وقت چودھویں رات کے چاند کا سا ہوگا)۔ تو کیا ایسا مذہب دنیاوی خوشیوں کے حاصل کرنے کے لئے انسان کے پاؤں کی زنجیر ہے، ہرگز نہیں، بلکہ وہ ان کے لئے خط آزادی ہے۔"

(۵) ایک کھلا خط۔ نواب محسن الملک نے ۱۰ راکتوبر ۱۸۹۶ء کو بمبئی سے ایک خط سرسیّد کے نام لکھا ہے، جس میں ایجوکیشنل کانفرنس کی اصلاح و ترقی کے لیے چھ تجویز پیش کی ہیں، اور سرسیّد سے درخواست کی ہے کہ اس خط کو کانفرنس کے دوسرے اجلاس (منعقدہ ۲۹ ردسمبر ۱۸۸۷ء بمقام لکھنؤ) کے منظور شدہ نویں رزولوشن اور اس کی تائیدی تقریروں کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی طرح بصورت کتاب چھاپا گیا ہے۔ اس نویں تجویز کا خلاصہ یہ تھا:-

"ہر شہر و قصبہ میں کانگریس (۱) کے مقاصد کے لئے کمیٹیاں مقرر ہوں اور وہ کمیٹیاں اپنی ماتحت کمیٹیاں

---

(۱) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء میں بنگالیوں کی انڈین نیشنل کانگریس کے جواب میں قائم کی گئی تھی، اس لئے اس کے نام میں بھی "کانگریس" کا لفظ رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد رفع اشتباہ کے لئے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مقرر کریں اور انجمن ہائے اسلامی جو بالفعل ہیں وہ اس کانگریس کے مقاصد کی تکمیل اپنے ذمہ لیں۔"

نواب صاحب کے خط کے چند فقرے یہ ہیں:-

"..........پس باوجود ان تمام باتوں کے اس مجلس کا ترقی نہ کرنا بلکہ روز بروز اس میں تنزل ہونا ایک حیرت انگیز معاملہ ہے۔ مگر میرے نزدیک کوئی اور بڑا قومی سبب اس کا سوائے اس کے نہیں ہے کہ وقت سے پیشتر مجلس کے مقام اور مجلس کی تمام کارروائی سے لوگوں کو اطلاع نہیں ہوتی۔ جب بہت ہی تھوڑا وقت رہ جاتا ہے تب لوگوں کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں مقام پر اس کا اجلاس ہوگا، اور چونکہ دوسرے لوگ اس کی اشاعت میں اور اس میں شریک ہونے کے لئے ترغیب دینے کی تدبیریں نہیں کرتے اس لئے سوائے چند پرانے ارکان اور چند مدرسہ کے طلبہ اور چند وزیٹر کے باہر سے نئے نئے لوگ نہیں آتے، اور بوجہ اس کے کہ رزولیوشن بہت کم پیش کئے جاتے ہیں اور ان پر تنگیٔ وقت سے بحث کی نوبت نہیں آتی، لوگوں کے دل سرد ہوتے اور ان کے ولولے اور جوش ٹھنڈے پڑتے جاتے ہیں اور نظم اور قصائد نے اس مجلس کو بزم مشاعرہ بنا دیا ہے، اور واہ واہ قاہ قاہ کی آواز نے اس مجلس کو بجائے قومی مجلس کے ایک دل لگی کا جلسہ کر دیا ہے۔"

(۶) تقریر نواب محسن الملک۔ کانفرنس کی تقریروں میں نواب صاحب کی آخری تقریر انیسویں اجلاس میں ۳۱ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہوئی تھی۔ آئندہ اجلاس سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ تقریر بہت طویل اور نہایت پر جوش ہے۔ اس کا مختصر اقتباس یہ ہے:-

حضرات! کانفرنس کے اب تک کامیاب نہ ہونے کا اصل سبب یہ ہے جو میں نے بیان کیا۔ رہی قوم کی حالت، اس میں بھی کسی قسم کی ترقی نظر نہیں آتی، نہ ان کی صلاح و فلاح کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کانفرنس کا لفظ تجویز کیا گیا اور پورا نام محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس رکھا گیا۔ پھر اینگلو اورینٹل کی جگہ آل انڈیا کر دیا گیا۔ پھر گزشتہ جنگ عظیم کے بعد بیداری ہند کے اثر سے لفظ محمڈن کی ناموزونیت محسوس ہوئی۔ یہ لفظ اہل یورپ کی ساخت اور لفظ کرسچین کی تقلید تھی، اس لئے محمڈن کی جگہ مسلم کا لفظ نہ صرف کانفرنس کے نام میں بلکہ تمام تحریروں اور تقریروں میں استعمال ہونے لگا۔

روز بروز ان کا افلاس بڑھتا جاتا ہے، اوران کی قوتیں دن بدن منتشر اور ضائع ہوتی جاتی ہیں۔ اس کا سبب کچھ پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ قوموں کی صلاح وفلاح دو فرقوں پر منحصر ہے، اول علماء دوسرے اُمراء، مگر علماء اپنے اصلی فرائض کا خیال نہیں رکھتے اور زمانے کی رفتار اور زمانے کی ضرورتوں کو نہیں دیکھتے.......... مثلاً اگر کسی عالم سے کہا جائے کہ اس زمانے میں جب کہ مسلمان مفلس اور تباہ ہورہے ہیں اور علوم فنون اور صنعت وحرفت سے ناواقف ہیں، ان کو علوم وفنون جدیدہ اور سائنس کی تعلیم کی ہدایت کیجیے، اور صنعت وحرفت سیکھنے کی ترغیب دیجیے، تو وہ یہ کہہ کر کہ سائنس اسلام کے مخالف ہے اور صنعت وحرفت دنیاداروں کا کام ہے، ہماری بات کو نہایت نفرت سے سنیں گے، اور اَلدُّنیا جِیفَۃٌ وَ طُلَّابُھَا کِلَابٌ (۱) کہہ کر مسلمانوں کو اور نفرت دلائیں گے۔ حالانکہ یہ باتیں اور اس قسم کی ہدایت و نصیحت اس زمانے میں ان پر فرض کفایہ ہے اور اس کے ادا نہ کرنے سے وہ خود گنہگار ہورہے ہیں، اور ساری قوم کو عذاب میں مبتلا کررہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ بوجہ ناواقفیت علوم اور نہ جاننے صنعت و حرفت کے وہ دنیا کی اور قوموں کے مقابلے میں ذلیل وخوار ہیں، مگر وہ ہرگز اس کی ہدایت نہ کریں گے، اور بجز نماز جنازہ اور دفن میت اور جواب سلام وغیرہ کے ان باتوں کو فرض کفایہ نہ سمجھیں گے۔ ہمارے زمانے کے ایک مصری عالم نے اس افسوسناک حالت کو دیکھ کر نہایت رنج وغم سے یہ لکھا ہے کہ انھیں علماء کا فرض کفایہ سے ناواقف ہونا اصلی سبب اس کا ہے کہ ساری قوم صنعت وحرفت کے فوائد سے محروم ہوگئی ہے.......... اس کی تائید میں وہ عالم لکھتا ہے کہ اس وقت جو شخص مسلمانوں میں کسی صنعت کے زندہ کرنے یا آلہ کے ایجاد کرنے یا کوئی کمپنی قائم کرنے یا صنعتی مدرسہ جاری کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے گا تو شریعت کے مطابق اس نیک کام کا، اور قیامت تک اس پر عمل کرنے والوں کا اس کو اجر ملے گا، اور وہ شخص قوم میں اعلیٰ درجہ کا مصلح اور مجدّد ہوگا۔ اسے لکھ کر وہ عالم صاف صاف کہتا ہے کہ مغربی علوم میں جو قرآن مجید کے سمجھنے کا ذریعہ ہیں، اور اسلامی علوم میں کچھ فرق نہیں ہے، کیونکہ وہ بقائے زندگی کا ذریعہ ہے، اور یہ روحانی زندگی قائم رکھنے کا وسیلہ ہے، بغیر ان دونوں کے اسلام اور ایمان کی تکمیل نہیں ہوسکتی..........

---

(۱) دنیا مُردار ہے اور اس کے طالب سگ مُردار خوار۔

حضرات! کتنے ایسے عالم اس وقت ہم میں ہیں جو ان باتوں کو سُن کر غصے میں نہ آویں گے، اور ان باتوں کو نیچریانہ کلام سمجھ کر اس سے تنفر نہ ہوں گے، اور یہ سن کر صنعت و حرفت کا سکھانا، اور اس کی ہدایت کرنا اصل عبادت ہے، کہنے والے کو نیچری اور کافر نہ کہیں گے۔ جب کہ ہادیانِ طریقت کا یہ حال ہو، اور وہ خود سیدھی راہ سے بہکے ہوئے ہوں، تو قوم اور امت کیوں کر منزلِ مقصود پر پہنچ سکتی ہے۔"

نواب وقار الملک: مشتاق حسین (۱) نام، امروہہ (ضلع مراد آباد) کے رہنے والے ۱۸۳۹ء ﴿۱۲۵۷ھ﴾ میں پیدا ہوئے، والد کا نام شیخ تفضّل حسین ہے، ان کے اجداد میں ایک بزرگ دیوان عبدالمومن خاں تھے، جو شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں دیوان تن کے عہدے پر ممتاز تھے۔ یہ عہدہ وزارت سے کم نہ تھا۔ شاہی بجٹ اور منصب و جاگیر کی عطا و ترقی اسی عہدے سے متعلق تھی۔ نواب صاحب کمبوہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا انتقال ان کی شیر خوارگی کے زمانے میں ہو گیا تھا۔ والدہ نے تربیت کی۔ رسمی تعلیم سے فارغ ہو کر سب سے پہلے اسی سرکاری مدرسے میں جہاں خود تعلیم حاصل کی تھی ۱۸۵۹ء میں ملازم ہوئے۔ ۱۸۶۰ء میں سخت قحط پڑا۔ جا بجا محتاج خانے قائم ہوئے۔ امروہہ کے محتاج خانے کا انتظام ان کے سپرد ہوا۔ اس کے بعد عدالت صدر الصدور علی گڑھ میں سر رشتہ دار اور پھر منصرم ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں تحصیلداری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار ہوئے۔ گورنمنٹ نے علی گڑھ کی میونسپلٹی کا ممبر بھی مقرر کر دیا۔ ۱۸۷۴ء میں سرسیّد کے ساتھ گورکھپور، بستی وغیرہ کے قحط کا انتظام کیا۔

---

(۱) مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی بی۔ اے۔ نے اپنے ترجمہ تاریخ ادب اردو میں نواب وقار الملک کو "خلافت علی گڑھ کا خلیفۂ ثانی" لکھا ہے۔ اس تشبیہ کا ایسی کتاب میں جس کا مناظرہ و مظاہرہ مذہبی سے تعلق نہیں، کوئی محل نہ تھا، خاص کر جب کہ ترتیب صحیح کی بنا پر بھی غلط ہے۔ یعنی علی گڑھ کالج کے سکریٹریوں میں نواب وقار الملک کا چوتھا نمبر ہے۔ یاد رہے کہ سرسیّد کے بعد سیّد محمود باقاعدہ سکریٹری ہوئے تھے اگرچہ چند روز کے بعد ہی ان کو دست کش ہونا پڑا۔ اس لئے سیّد محمود کو شمار حذف نہیں کر سکتے۔

نواب صاحب سرکاری ملازمت کے علاوہ سر سیّد کے ساتھ قومی کام بھی کرتے رہے۔ ۱۸۶۶ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں ایک مدرسہ مفید الخلائق جاری کیا۔ ۱۸۶۹ء میں سررشتہ تعلیم کے ممبر ہوئے اور مدارس ضلع کے نگران رہے۔ اسی سال نواب صاحب نے بطور کثیر چندہ جمع کر کے ایک یونانی شفا خانہ اور دوا خانہ جاری کرایا۔ ۱۸۷۰ء میں 'تہذیب الاخلاق' جاری ہوا تو اس میں مضامین لکھے اور اکثر لکھتے رہے۔ ۱۸۷۱ء میں جب سر سیّد نے کمیٹی خواستگار تعلیم مسلمانان کی طرف سے ایک مضمون لکھوانے کا اعلان کیا (جس کا ذکر سر سیّد کے حال میں ص ۳۲۵ پر آچکا ہے) تو نواب وقار الملک نے بھی مضمون لکھا اور اس پر دوسرے نمبر کا انعام دیا گیا۔ سوسائٹی اور اس کے پریس اور 'تہذیب الاخلاق' کا انتظام بھی نواب صاحب کے سپرد تھا۔

۱۸۷۴ء میں حیدر آباد کے مدار المہام سر سالار جنگ اول کو سلطنت دکن کے انتظام کے لیے بہترین مدبّروں کی تلاش ہوئی۔ سر سیّد سے بھی مشورہ کیا، انھی کی سفارش سے نواب محسن الملک کے بعد نواب وقار الملک بھی حیدر آباد گئے۔ اس سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ نواب وقار الملک نماز کے نہایت پابند تھے۔ کچہری میں جب ظہر کی نماز کا وقت آتا اُٹھ کر نماز پڑھنے چلے جاتے۔ علی گڑھ میں جب یہ صورت پیش آئی تو مسٹر کالون کلکٹر نے روکا، نواب صاحب نے نہ مانا۔ کلکٹر نے ضد کی، انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن اس قصور پر برخاست کرنا مصلحت کے خلاف تھا، چھ مہینے کی رخصت دے دی۔ اس عرصے میں اللہ تعالیٰ نے رزق کا دوسرا دروازہ کھول دیا، ۱۸۷۵ء کے شروع میں نواب صاحب حیدر آباد بلا لیے گئے۔

نواب وقار الملک دو مرتبہ حیدر آباد گئے، پہلی بار ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء تک رہے۔ حیدر آباد میں مدار المہام (سر سالار جنگ) صدر المہام (سر آسمان جاہ) امیرِ کبیر (نواب رشید الدین خاں) اور ریزیڈنٹ (سر رچرڈ میڈ) کے باہم تعلقات خوش گوار نہ تھے، اور نواب صاحب کو ان ہی افسروں سے سابقہ پڑتا تھا۔ نواب صاحب دیانت، فرض شناسی اور اخلاقی جرات میں ایسا مضبوط کیریکٹر رکھتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو

مرعوب نہ کرسکتی تھی۔ ایک مرتبہ سر سالار جنگ نے چاہا کہ نواب صاحب اپنی اصلی رائے کے خلاف سرآسمان جاہ کے سامنے رائے ظاہر کریں۔ نواب صاحب نے انکار کردیا۔ سر سالار جنگ اس پر ناخوش ہو گئے، نواب صاحب نے فوراً استعفا بھیج دیا۔ اور لکھ دیا کہ میں کل ہی اپنے وطن جانا چاہتا ہوں۔ لیکن جیسے نواب وقار الملک متدیّن اور راستباز تھے، ایسے ہی سر سالار جنگ فراخ دل اور قدر شناس تھے۔ استعفا دیکھ کر نواب صاحب کو بلایا۔ صاف طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا کہ بیشک مجھے کوئی حق نہ تھا کہ غلط بیانی پر مجبور کرتا۔ اس ملاقات میں دونوں پر رقت کا عالم طاری تھا۔ نواب صاحب نے استعفا واپس لے لیا۔ لیکن امیر کبیر اور ریزیڈنٹ نواب صاحب کے مخالف تھے، انھوں نے کچھ عرصہ بعد موقع پاکر سر سالار جنگ پر زور ڈالا کہ اگر مولوی مشتاق حسین برخاست نہ کیے گئے تو ہماری آپ کی دوستی میں فرق آجائے گا۔ نواب صاحب اس وقت رخصت پر وطن آئے ہوئے تھے، ان کو اس بات کا علم ہوا تو فوراً سر سالار جنگ کو لکھا کہ میں نہیں چاہتا ہوں کہ میرے سبب سے آپ لوگوں میں نااتفاقی ہو اور ریاست کے کاروبار میں خلل آئے۔ آپ بے تامل مجھے خدمت سے سبکدوش کردیجئے، میں خوش ہوں گا کہ یہ بھی مجھ سے اپنی سرکار کی ایک عمدہ خدمت ادا ہوئی۔ چنانچہ نواب صاحب کو علیحدہ کردیا گیا۔ لیکن سر سالار جنگ نے سیکرٹ سروس فنڈ سے چار سو روپیہ ماہوار مقرر کردیا، اور نواب وقار الملک علی گڑھ میں بیٹھے ہوئے سرکار نظام کی خدمت انجام دینے لگے، اس عرصے میں قانون مال گذاری مرتب کیا اور دفتروں کے قواعد وضوابط بنائے۔

ساڑھے تین سال کے بعد جب امیر کبیر کا انتقال ہو گیا اور سر رچرڈ میڈ ریزیڈنٹ چلے گئے تو سر سالار جنگ نے نواب صاحب کو پھر بلالیا۔ اس موقع پر سر سالار جنگ نے اپنے قلم سے خط لکھا (مرقومہ ۲۷ر جمادی الاول ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء) فارسی میں خط ہے، نواب صاحب کو ''عدالت پناہ'' القاب لکھا ہے۔ نواب صاحب فوراً چلے گئے، اور پھر دس بارہ سال خدمت کرکے سات سو روپیہ ماہوار پنشن پر واپس آئے۔

نواب وقار الملک نے حیدرآباد میں فلاح ملک، اصلاح سلطنت اور استحکام

سیاست کے سلسلے میں جو عظیم الشان خدمات انجام دیں وہ نواب محسن الملک کی شاندار خدمات سے کم نہ تھیں۔ کسی دوسرے ہندوستانی کا توان سے مقابلہ ہی نہیں ہوسکتا۔ ان خدمتوں کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ سادس میر محبوب علی خاں بہادر (مرحوم) نے نواب صاحب کو ۱۸۸۵ء ﴿۱۳۰۲ھ﴾ میں ''خان بہادر'' اور ''انتصار جنگ'' اور ۱۸۹۰ء ﴿۱۳۰۸ھ﴾ میں ''وقار الدولہ وقار الملک'' کے خطابات عطا کیے۔ پھر حکومت ہند کی طرف سے بھی ''نواب'' کا خطاب ملا۔ لارڈ منٹو نے اپنے ہاتھ سے سند دی۔

نواب صاحب حیدر آباد میں سرسیّد کے قومی کاموں میں اعانت اور خاص کر علی گڑھ کالج کے استحکام میں امداد کرتے رہے۔ ہزاروں روپے اپنے پاس سے دیے۔ جب ان کی تنخواہ میں اضافہ ہوتا تھا تو پہلے مہینے کا اضافہ سرسیّد کو بھیج دیتے تھے۔ جب سرسیّد ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد گئے توان کے ساتھ دورہ کرکے وہاں کے امیروں سے چندہ دلوانے کے علاوہ ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی طرف سے بتقریب دورہ ودعوت پیش کیا۔ حیدر آباد سے آکر ہمہ تن کالج کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ کالج کی کوئی عمارت، کوئی شعبہ، کوئی مصرف ایسا نہ تھا جس میں نواب وقار الملک کی مالی مدد شامل نہ ہو۔

اسی طرح انتظامی معاملات نہایت خلوص وصداقت کے ساتھ انجام دیے۔ نواب صاحب حق گوئی میں اس قدر بے خوف تھے کہ سرسیّد کا احترام ومحبت بھی ان کو اپنی سچی رائے سے باز نہ رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ جب ۱۸۸۹ء میں سرسیّد نے اپنے بعد سیّد محمود کو سکریٹری مقرر کرنے کی تجویز پیش کی تو نواب صاحب نے شدید مخالفت کی۔ یہاں تک کہ سرسیّد کے دل میں ان کی طرف سے کشیدگی پیدا ہوگئی۔ لیکن نواب صاحب کا دل ویسا ہی صاف رہا، اور سرسیّد کی وہی محبت قائم رہی۔ آخر جب یہ تجویز منظور ہوگئی تو نواب صاحب نے بھی کثرت رائے کے فیصلے کو تسلیم کرلیا، اور پھر جب سرسیّد کے انتقال کے بعد سیّد محمود سکریٹری ہوئے اور چند روز ہی میں ان کی مخالفت اوران کی معزولی کی کوشش ہر طرف سے ہونے لگی، تو نواب وقار الملک پہلے شخص تھے جنھوں نے اس فیصلے کے احترام کو

پیشِ نظر رکھا اور خود سیّد محمود کی اصلاحِ حال وخیال کی کوشش کی تا کہ وہ سکریٹری کے عہدے پر قائم رہ سکیں۔

نواب محسن الملک کے سکریٹری ہونے پر ان کے دست و بازو بن کر کام کیا۔ ۱۹۰۳ء میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کی سرگرم کوشش کی اور اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔ لیکن جب نواب محسن الملک کے بعد کالج کے سکریٹری ہوئے تو مسلم لیگ کا عہدہ چھوڑ دیا، لیکن اس کے حامی ومعاون رہے۔

۱۹۱۰ء میں جب ہز ہائی نس سر آغا خاں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ناگپور میں علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی تجویز پیش کی اور گورنمنٹ کی منظوری کی امید دلائی تو نواب صاحب نے اس کے لیے ایسی جان توڑ کوشش کی کہ ڈیڑھ سال میں تیس لاکھ کے قریب چندہ جمع کر لیا۔ لیکن ان کی سخت جسمانی محنت سے ان کی صحت پر بہت بار پڑ گیا اور وہ اگست ۱۹۱۲ء میں ضعف وعلالت کے سبب سے مستعفی ہوگئے۔ لیکن پھر بھی وہی دھن لگی رہی۔ اور ۱۹۱۵ء تک ہر قومی و مذہبی تحریک وخدمت میں حصہ لیتے رہے۔ جنگ بلقان وطرابلس کے سلسلے میں مجروحین طرابلس کے لیے اپنے گاؤں کا ایک حصہ فروخت کر کے ایک ہزار روپیہ چندہ دیا۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ، کانپور کی مسجد مچھلی بازار کے انہدام، ایران میں روس کی مداخلت وغیرہ تمام واقعات پر بڑی آزادی اور دلیری کے ساتھ اظہار رائے کرتے رہے۔

آخر ۲۸ر جنوری ۱۹۱۷ء روز شنبہ کو امروہہ میں انتقال کیا۔ اور ہندوستان، اسلام اور کالج کا محترم بزرگ، بے ریا خادم اور درد مند رہنما اُٹھ گیا۔ راقم نے قرآن مجید سے تاریخ نکالی:-(۱) خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَ اَحْسَنُ مَقِيْلًا = ۱۹۱۷ (سورہ فرقان رکوع ۳)

علی گڑھ کالج کو یہ دو نواب محسن الملک اور وقار الملک، یکے بعد دیگرے ایسی ہستیاں

---

(۱) ترجمہ:-"ٹھکانہ بھی بہتر سے بہتر اور خواب گاہ بھی عمدہ سے عمدہ۔"

ملیں کہ تمام ہندوستان میں ان سے بہتر انتخاب نہیں ہوسکتا تھا۔ اگرچہ دونوں کی افتادِ طبع اور طریقِ عمل میں یک گونہ اختلاف تھا، لیکن منتہائے نظر اور منزلِ مقصود دونوں کی ایک تھی اس لیے دونوں دو راستوں سے ایک ہی جگہ پہنچ جاتے تھے۔ نواب محسن الملک کا مسلک یہ تھا کہ ''زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز''، اور نواب وقار الملک اس پر عامل تھے (بقول علامہ اقبالؔ) کہ ''زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز۔''

نواب وقار الملک اچھے لیڈر کے ساتھ اچھے ادیب بھی تھے۔ بے ریائی و بے خوفی، سادگی و صفائی ان کے دل، زبان اور قلم تینوں کے یکساں اور اٹل اصول تھے۔ انھوں نے کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی۔ سر سیّد کی قائم کردہ سائنٹیفک سوسائٹی کے ممبر و معاون تھے۔ اس کا مقصد علمی کتابیں ترجمہ و تالیف کرانا تھا۔ اس سلسلے میں نواب وقار الملک نے بھی ایک انگریزی کتاب 'فرنچ ریوولیوشن اینڈ نپولین' (انقلاب فرانس اور نپولین) کا اُردو میں ترجمہ 'سرگزشت نپولین بونا پارٹ' کے نام سے کیا جو ۱۸۷۱ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئی۔ لیکن نواب صاحب اتنی انگریزی نہ جانتے تھے، اس لیے ان کے دو مددگار منشی گلزاری لال اور بابو گنگا پرشاد انگریزی کا ترجمہ سناتے اور نواب صاحب اپنی عبارت میں لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ نواب صاحب نے تہذیب الاخلاق میں کثرت سے مذہبی و قومی مضمون لکھے، اور آخر عمر تک مختلف اخباروں میں حسب ضرورت لکھتے رہے۔ بعض تحریروں کے مختصر نمونے پیش کیے جاتے ہیں:۔

(ا) ۱۸۸۹ء میں سیّد محمود کے آئندہ سکریٹری بنانے سے جب نواب صاحب نے سر سیّد کی پُر زور مخالفت کی تو اپنی رائے کے سلسلے میں لکھا تھا:۔

''میری خود کبھی ہمت نہ پڑتی کہ میں آزادی سے اپنی رائے لکھتا اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ ایک دن مرنا ہے اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب بھی دینا ہے۔ اگر ایک خدا کا گناہ ہو جائے تو ممکن ہے کہ اس سے توبہ کریں اور وہ اپنی رحیمی سے بخش دے، انسانوں کے متعلق اگر ایک دو کی نسبت کچھ خطا ہو جائے تو ان سے معذرت کر کے صفائی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن قوم اور ملک کا گنہ گار کس کس سے اور کہاں کہاں تک اپنا گناہ بخشواتا پھرے گا۔ تمام عمر بھی اگر صرف ہو جائے تو عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

(۴) جب ۱۹۱۱ء کے شاہی دربار دہلی کے موقع پر گورنمنٹ کی طرف سے تقسیم بنگال کو منسوخ کیا گیا، تو مسلمانوں کو حکومت کی پالیسی سے ایسی مایوسی ہوئی کہ کانگریس میں شامل ہو کر ہندوؤں کا ساتھ دینے کا ارادہ کرنے لگے۔ اس موقع پر نواب وقارالملک نے یہ غلط قدم اُٹھانے سے مسلمانوں کو روکا۔ اور گورنمنٹ کی بے دردانہ پالیسی کے متعلق اپنی بے لاگ رائے لکھی۔ فرماتے ہیں:-

''جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، یہ رائے عام سمجھنی چاہیے کہ یہ الحاق عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے، اور بعد اس کے کہ وزرائے سلطنت نے یکے بعد دیگرے الحاق کے خلاف امیدیں دلائی تھیں، الحاق کا عمل میں آنا گورنمنٹ کی کمزوری اور آیندہ اس کے قول و فعل کی بے اعتباری کی ایک وجہ قرار دی جائے گی۔

آگے چل کر پھر اسی رائے کا اعادہ کرتے اور مسلمانوں کی ہمت بندھاتے ہیں:-

''یہ تو آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کے دیکھنے کے بعد جو اب مشاہدہ میں آئے یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہیے، لاحاصل مشورہ ہے، اب زمانہ ایسے لاحاصل بھروسوں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس چیز پر ہم کو بھروسہ کرنا چاہیے، وہ ہماری اپنی قوت بازو ہے، اور اس کی نظیر جو ہمارے قابل ابنائے وطن نے پیش کی ہے۔ ہمارے سامنے موجود ہے۔''

آخر میں پھر گورنمنٹ کی اسی پالیسی (دونوں بنگال کے الحاق) پر تنقید کرتے ہیں:-

''گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانہ کی تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گزر گیا، بدوں اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان بھی ہے، اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ کس کا 'مراکو' اور کس کی 'ٹرپولی' اور کہاں کا 'ایران' سرے سے اسلام ہی کا قلع قمع ہوا جاتا ہے۔''

مسلمانوں کو شرکت کانگریس سے روکتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''اس سے ہم کو قطعی اختلاف ہے کہ اپنے قومی شیرازہ کو منتشر کر کے ہم دوسرے زبردست گروہ کے ساتھ اسی طرح شامل ہو جائیں جس طرح کوئی دریا سمندر میں شامل ہو کر اپنی ہستی کو معدوم کر دیتا ہے۔

ہماری علیحدگی کانگریس وغیرہ سے اس بنا پر نہیں کہ ہم کو گورنمنٹ کے ساتھ وفادار رہنا چاہئے۔ وفاداری خود غرض ہے، وہ جوہر نہیں ہے۔ اس کی بنیاد بھی کسی اور چیز پر قائم ہوتی ہے، اور جس قدر اس بنیاد میں تزلزل ہوگا، وفاداری بھی لامحالہ متزلزل ہوگی۔ پس مسلمان جو من حیث القوم نیشنل کانگریس سے اب تک علیحدہ ہیں، اس کی بنیاد یہ ہے کہ کانگریس کے بعض اہم دعاوی مسلمانوں کے حق میں مضرت بخش ہیں، ان کا سوراج مسلمانوں کے حق میں تباہ کن ہے......"

(۳) اگست ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کی شکست کے سلسلے میں بقول نواب وقارالملک ''ہنگامہ محشر'' برپا ہوا۔ یہی ان کے مضمون کا عنوان ہے جو انھوں نے اس واقعہ کے متعلق لکھا تھا، اس میں اپنی بے لاگ اور بے دھڑک رائے لکھتے ہیں:۔

''بدمزاج سے بدمزاج حاکم بھی زیادہ عرصے تک اپنی بدمزاجی پر قائم نہیں رہ سکتا، اگر رعایا اپنی آزادی کی حفاظت اعتدال و استقلال کے ساتھ کرتی رہے۔ اب جو معاملات کانپور کے متعلق مسلمانانِ صوبہ متحدہ کے سامنے ہیں، یہ ایک ایسا موقع ہے کہ اگر ہم نے اس کو بغیر کافی توجہ کے ہاتھ سے جانے دیا تو ایک 'ٹائلر' نہیں آیند؛ ہم کو توقع رکھنی چاہئے کہ ہر ایک سب انسپکٹر ہمارے لیے 'ٹائلر' ثابت ہوگا۔ اگر اس وقت ہم نے اعتدال و استقلال سے کام لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بڑے سے بڑا حاکم بھی دفعتہً ہمارے جذبات کے خلاف کارروائی کرنے میں بہت زیادہ احتیاط برتے گا، اور اب یہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ اپنی آزادی و عزت کو برقرار رکھیں، یا پیروں کے تلے پامال ہونے دیں۔(۱)

مولوی چراغ علی: نواب (۲) اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی ''خدا ساز اور خود آموز و خود افروز'' ہستیوں میں تھے جو اپنے ذاتی جوہر اور کاوش و کوشش سے ممتاز و سر بلند ہو جاتے ہیں۔ ان کے آبا و اجداد کا اصلی وطن کشمیر تھا وہاں سے ان کا خاندان پنجاب

---

(۱) نواب وقارالملک کے حالات و اقتباسات تحریر میں ''بشیر پاشا سیریز'' (اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ) کے شائع کردہ تذکرہ نواب وقارالملک (مرتبہ مولوی محمد امین زبیری) سے مدد لی گئی ہے۔

(۲) یہ حالات ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے مضامین (چند ہم عصر) سے لیے گئے ہیں۔

آیا، اور پھر میرٹھ منتقل ہو گیا۔ ان کے والد مولوی محمد بخش میرٹھ و سہارنپور میں ملازم رہے۔ پھر ۱۸۴۹ء میں پنجاب و سرحد میں مہتمم بندوبست رہے۔ یہ منصب کلکٹر کے عہدے سے کم نہ تھا۔ اس سے مولوی محمد بخش کی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مولوی چراغ علی ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے، اور دس برس کے تھے کہ والد عین شباب میں ۱۸۵۶ء میں رحلت کر گئے۔ مولوی صاحب کے تین بھائی اور تھے، اور یہ سب میں بڑے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت میرٹھ میں ہوئی۔ لیکن اُردو، فارسی انگریزی کی معمولی تعلیم ہو سکی۔ کوئی امتحان پاس نہ کر سکے۔ ابھی طالب علم تھے کہ ضلع بستی میں خزانے کے منشی ہو گئے۔ بیس روپیہ تنخواہ ہوئی۔ چند سال بعد غالباً ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ میں ڈپٹی منصرم ہو گئے اور پھر سیتاپور تبادلہ ہو گیا۔ اس زمانے میں سرسیّد لکھنؤ آئے تو مولوی چراغ علی سیتاپور سے لکھنؤ آ کر ان سے ملے، اور دونوں میں بڑا ارتباط پیدا ہو گیا۔ جس کا سبب یہ تھا کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف تھا اور اسلام کی فضیلت و حقانیت غیر مسلم اقوام خصوصاً عیسائی پادریوں کے سامنے پیش کرنے اور ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ چنانچہ اس سے پہلے اس قسم کی کتابیں اور مضامین لکھ چکے تھے۔ سرسیّد بھی یہی کام کر رہے تھے۔ اور ان دونوں میں باہم خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ سرسیّد نے اس ملاقات کے بعد ان کو کچھ ترجمہ کا کام دیا۔ جو حیدرآباد سے سرسیّد کے پاس آیا تھا اور اس کا معاوضہ بھی دلوایا۔ ۱۸۷۶ء میں مولوی صاحب نے علی گڑھ رہ کر یہ کام کیا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں سرسیّد نے مولوی چراغ علی کو سر سالار جنگ کے پاس بھیج دیا۔ وہاں ان کو مددگار معتمد مال گذاری کا عہدہ دیا گیا۔ چار سو روپیہ تنخواہ ہوئی۔ اس کے بعد سات سو روپیہ ہو گئے ورنگل اور گلبرگہ کے صوبہ دار ہوئے اور پھر معتمد مال و فنانس ہو گئے۔ یہ سب خدمات ایسی محنت، قابلیت اور دیانت کے ساتھ انجام دیں کہ صلے میں 'نواب اعظم یار جنگ بہادر' کا خطاب ملا۔

مولوی چراغ علی نہایت مستقل مزاج، صائب الرائے، بے لوث، غیر متعصب اور انتہا درجے کے جفاکش آدمی تھے۔ جس زمانے میں فنانشل سکریٹری تھے، خبر ملی کہ

مسٹر کرالی کنٹرولر جنرل ہو کر آرہے ہیں۔ مولوی صاحب نے فنانس پر انگریزی کی سب اعلیٰ درجہ کتابیں منگالیں اور ان کا ایسا مطالعہ کیا کہ جب مسٹر کرالی سے ملاقات ہوئی اور اس موضوع پر گفتگو کا موقع پیش آیا تو وہ ان کی قابلیت اور وسعت معلومات پر حیران رہ گئے۔

مولوی چراغ علی کو ابتدائے عمر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ لیکن اپنے شوق اور محنت سے سب کمی پوری کرلی۔ عربی و فارسی کے عالم تھے۔ کلدانی، لاطینی اور یونانی زبانوں میں بھی مہارت پیدا کرلی تھی۔ انگریزی زبان پر تو ایسی قدرت حاصل تھی کہ بڑے بڑے انگریزی اخبارات ان کی قابلیت کے معترف تھے۔ مطالعہ کا ایسا شوق تھا کہ گویا عمر بھر طالب علم رہے۔ ایسا انہماک ہو جاتا تھا کہ ایک بار تہ خانہ میں آگ لگ گئی۔ یہ شہ نشین میں بیٹھے پڑھتے رہے، خبر تک نہ ہوئی۔ ریاست کے ایسے سچے خیر خواہ اور دیانتدار امین تھے کہ اپنے اصول کے مقابلے کسی کی سفارش نہ سنتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب وقارالامرا بہادر نے کسی کی سفارش کی۔ مولوی صاحب نے پہلے تو ٹالا۔ پھر ادھر سے اصرار ہوا تو نواب صاحب سے صاف کہہ دیا کہ "آپ اس لیے وزیر نہیں بنائے گئے کہ سرکاری خزانہ لٹا دیں۔ آپ کا کام خزانے کی حفاظت ہے۔"

بے تعصب ایسے تھے کہ کسی فرقہ مذہب سے کوئی پرخاش نہ تھی۔ یہاں تک کہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے کچھ تعلق نہ تھا، چنانچہ مردم شماری کے موقع پر "فرقہ" کے خانے میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے تو "شیعہ" لکھ دیا، اور اپنے بیٹوں کے نام کے آگے صفر لکھ دیے۔

۱۵ر جون ۱۸۹۵ء ﴿ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ﴾ کو ۵۰ برس کی عمر میں مرض ذیابیطس کے آپریشن کے بعد یکایک بمبئی میں انتقال کیا۔ 'چراغ حق' (۱۳۱۲ھ) تاریخ ہے۔ جسٹس سیّد محمود (خلف سرسیّد) کو صنعت تاریخ گوئی بہت پسند تھی۔ انھوں نے ایک فقرہ نثر میں عیسوی سنہ نکالے۔ مولانا حالیؔ نے اس فقرے کو قطعہ میں موزوں کر دیا۔ ان تینوں بزرگوں کی یادگار کے طور پر اس کو نقل کیا جاتا ہے:۔

زخمے از مرگِ چراغ علی آمد بردل — کہ ازو خاطر افکار بصد غم شدہ جفت
از خرد سال وفاتش چو بجستم محمود — ''شد نہاں حیف چراغ علی از دنیا'' گفت
۱۸۹۵ء

مولوی چراغ علی نے اس قدر کثیر و ضخیم کتابیں تصنیف کی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا مصروف و کثیر الاشغال انسان کیوں کر اتنا وقت نکال سکتا تھا۔ ان کی اکثر کتابیں انگریزی زبان میں ہیں۔ مولوی صاحب کا پسندیدہ و محبوب موضوع اسلام و حقانیت اسلام تھا۔ لیکن ملازمت کے سلسلے میں قانون اور فنانس سے بھی کافی شغف پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ زیادہ کتابیں اسی مضمون پر لکھی ہیں۔ اسلام پر بھی چند ضخیم کتابیں بڑی تحقیق کے ساتھ مجتہدانہ شان کی لکھی ہیں۔ جن کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ مثلاً:-

(۱) تحقیق الجہاد، عیسائیوں کے اس اعتراض کے جواب میں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔

(۲) اعظم الکلام فی ارتقاء اسلام۔ اسلام کی سوشل اصلاحات کے متعلق۔ اس کے پہلے ۱۴ صفحوں کا ترجمہ مولوی چراغ علی نے کیا تھا۔

(۳) محمد پیغمبر برحق۔ سیرت پاک پر محققانہ تالیف ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ غالباً نہیں ہوا۔

(۴) تعلیقات (اُردو) ایک پادری کی کتاب ''تاریخ محمدی'' کے جواب میں یہ رسالہ مولوی چراغ علی کی سب سے پہلی تالیف ہے۔ مطبوعہ ۱۸۷۲ء۔

(۵) اسلام کی دنیوی برکتیں۔ نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ بہت پسند کی گئی اور بار بار شائع ہوئی۔

(۶) قدیم قوموں کی مختصر تاریخ۔ قرآن مجید میں جن جن اقوام قدیمہ کا ذکر ہے ان کا حال قدیم تاریخوں سے تلاش کیا ہے۔ اور عیسائیوں کے اس اعتراض کو اٹھایا ہے کہ قرآن کی مذکورہ اقوام کا کوئی وجود کبھی نہ تھا۔

(۷) رسائل چراغ علی۔ مولوی صاحب نے بہت سے مضامین حیدر آباد آنے

سے پہلے سیتا پور و لکھنؤ میں لکھے تھے۔ جو مسودے کی صورت میں رہ گئے تھے۔ ان چھوٹے بڑے ۴۵ رسالوں میں سے چار رسالے مولوی عبداللہ خاں نے بڑی محنت سے مرتب و درست کر کے 1918ء (۱۳۳۶ھ) میں کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد سے شائع کیے۔ مولوی چراغ علی کے ہر مسودہ کے آخر میں ان کے دستخط اور مقام و تاریخ تحریر درج ہے۔ اس مجموعے میں یہ رسالے ہیں:۔

(الف) تہذیب الکلام فی حقیقۃ الاسلام۔ سب سے بڑا رسالہ ہے۔ ۱۲۳ صفحوں میں شائع ہوا ہے۔ آخر میں ۲۳/ اکتوبر ۱۸۷۵ء سیتا پور ملک اودھ درج ہے۔ اس میں مولوی سیّد محمد عسکری تحصیلدار لکھنؤ اور مولوی محمد علی بچھرایونی تحصیلدار بلاری ضلع مراد آباد کے چند اعتراضات کا جواب ہے۔

(ب) مجموعہ روایات استرقاق و تسری۔ اس رسالہ میں صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث و سیر و مغازی سے چند ایسی معتبر روایتیں جمع کی ہیں، جن میں رسم غلامی کی بیخ کنی پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غزوات میں آپ کے عمل مبارک سے دکھائی ہے۔ مارچ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیتا پور لکھا گیا۔

(ج) تدبیر الاسلام فی تحریر الامۃ والغلام۔ مولوی محمد علی بچھرایونی کے ایک مضمون مطبوعہ نور الآفاق کانپور کا جواب جس میں ثابت کیا ہے کہ فتح مکہ (۸ھ) کے بعد غلام بنانا قطعاً موقوف کر دیا گیا۔

(د) تحقیق مسئلہ تعدد ازواج۔ مولوی محمد حسین بٹالوی ایڈیٹر رسالہ ''اشاعۃ السنۃ'' کے ایک مضمون متعلق نکاح و طلاق پر تنقید۔ اس میں یورپین مخالفین اسلام کے اعتراضات کے جواب بھی آ گئے ہیں۔ یہ رسالہ نا تمام ہے اس لیے تاریخ تحریر درج نہیں۔

(۸) العلوم جدیدہ والاسلام۔ یہ مولوی چراغ علی کی آخری تصنیف تھی، لیکن اس کی صرف تمہید رسالہ 'تہذیب الاخلاق' میں چھپی تھی کہ یکا یک ان کا انتقال ہو گیا۔

مولوی چراغ علی صاحب کی فضیلت علمی اور کمال تحقیق کے سلسلے میں یہ ذکر بھی

دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ مولوی صاحب کے کاغذات میں مرزا غلام احمد قادیانی (۱) کے چند خطوط نکلے ہیں، جن میں مرزا صاحب نے اپنی تصنیف 'براہین احمدیہ' کی تیاری میں مولوی صاحب سے علمی اعانت چاہی ہے۔ ۱۸۷۸ء اور ۱۸۷۹ء میں مرزا صاحب نے کئی خط مولوی صاحب کو لکھے ہیں اور ان کی تحقیقات و مضامین کا اشتیاق و انتظار ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

> "براہ عنایت بزرگانہ بہت جلد مضمون اثبات حقانیت فرقان مجید تیار کر کے میرے پاس بھیج دیں۔ اور میں نے ایک کتاب جو دس حصے پر مشتمل ہے تصنیف کی ہے، اور اس کا نام 'براہین احمدیہ حقانیہ کتاب اللہ القرقان والنبوۃ المحمدیہ' رکھا ہے۔ اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اس میں درج کروں، اور اپنے مختر کلام کو ان سے زیب و زینت بخشوں۔"

مولوی چراغ علی کا طریقۂ استدلال وہی ہے جو سر سیّد کا ہے۔ ہر مسئلہ کے ایک ایک پہلو، بلکہ حسب ضرورت ہر محاورہ و لفظ پر بحث کرتے ہیں۔ ہر ممکن ذریعہ عقلی و نقلی سے اس پر دلیل لاتے ہیں، جوبات لکھتے ہیں نہایت متانت اور قوت سے لکھتے ہیں۔ طرزِ تحریر و زبان سر سیّد کے مقابلے میں زیادہ صاف و رواں اور با محاورہ ہے۔ سر سیّد، نواب محسن الملک، مولوی محمد علی وغیرہ، اس زمانے کے اکثر لکھنے والے الفاظ کی صحیح ترتیب کا خیال نہیں

---

(۱) مرزا غلام احمد قادیانی، قادیان ضلع گورداسپور (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ شروع میں عیسائی اور آریہ مخالفین اسلام سے تحریری و زبانی مناظرے کیے، اور متعدد کتابیں اسی موضوع پر لکھیں۔ ۱۸۸۰ء میں 'براہین احمدیہ' شائع کی۔ اس کتاب میں سب سے پہلے اپنے 'مجدد' ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس سے پہلے سب مسلمان مرزا صاحب کے طرف دار تھے۔ اس دعوے سے سب چونک گئے۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے پے در پے قسم قسم کے دعوے کرنے شروع کر دیے۔ آخر میں 'نبوت' کا دعویٰ کر دیا۔ 'مسیح موعود' اور 'مہدی معہود' بن گئے۔ پھر 'کرشن اوتار' ہونے کا بھی دعویٰ کر دیا۔ ۱۸۹۰ء میں اپنا فرقۂ احمدیہ الگ قائم کر لیا۔ مئی ۱۹۰۸ء میں لاہور میں انتقال کیا۔ قادیان میں دفن ہوئے۔ مرزا صاحب بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے خیالات اور تحریروں پر سر سیّد کی آزادیٔ رائے، تاویل آیات اور طرزِ استدلال کا بہت اثر پڑا ہے۔

رکھتے۔ مولوی چراغ علی میں یہ بات نہیں ہے۔

نمونۂ تحریر یہ ہے:۔

(۱) اعظم الکلام کے ابتدائی صفحات میں جو خود مولوی چراغ علی نے اُردو میں لکھے ہیں، ان کا مختصر اقتباس یہ ہے:۔

''جدید قانون زن وشو کی وجہ سے، جس کی پیغمبرِ خدا نے اپنے پیروؤں کو تلقین کی، اور بعض دانشمندانہ، عادلانہ اور سخت قیود سے، آپ نے طلاق کی سہولت کو بھی رفع کیا ہے۔ یہ قیود بہت ہی معقول ہیں، اور ان میں طرفین کے فائدے کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ قرآن میں اہلِ عرب کو نصیحت اور تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنی بی بیوں کے بارے میں خراب رسوم کو ترک کر دیں۔ آنحضرت صلعم نے غلامی کو موقوف کر کے لونڈیوں کے رکھنے کے رواج کو بھی موقوف کیا، اور اس وقت جو عورتیں غلامی کی حالت میں تھیں ان سے عقد کر لینے کی تاکید کی۔ ورنہ وہ لونڈیاں بنا کر رکھی جاتیں۔ شیر خوار لڑکیوں کے ہلاک کرنے کے خلاف نہایت سخت اور شدائد احکام ہیں، اور اس جرم کے ارتکاب کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے کہ عقبیٰ میں اس کا بڑا عذاب ہوگا، اس طرح عرب اور دیگر اسلامی ممالک سے دختر کشی کی رسم بالکل اٹھ گئی۔ سب سے اول قرآن میں قانون وراثت ایسا قائم کیا گیا کہ اس میں عرب کی عورتوں کے حقوق کا بھی لحاظ رکھا گیا۔''

(۲) رسائل چراغ علی میں سے تیسرے رسالے (تدبیر الاسلام فی تحریر الامۃ والغلام) میں اپنا جواب اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

۱۔ مولوی محمد علی صاحب کی تقریر جو فاضلانہ تحریر کی پوری تصویر ہے، 'نور الآفاق' نمبر (۵) مطبوعۂ کانپور، مطبع نظامی میں چھپ کر میرے پاس پہنچی۔ جو تعلیم ہم مسلمانوں میں ان دنوں عمدہ اور کافی تصور کی جاتی ہے، اس کا یہ ٹھیک ٹھیک فوٹوگراف ہے۔

۲۔ آزاد اور خودمختار مخلوقات کا غلام بنانا ایک ایسی بدنامی اور ارباب دانش کی نظر میں حقارت و ذلت ہے جس کو ہر ایک شخص، جو ادنیٰ سی بصیرت رکھتا ہو، اچھی طرح معلوم کر سکتا ہے، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ خدا نے ہر ایک شخص کو آفرینش کی راہ سے ایک ہی سی حیثیت عقلی وجسمانی کا پیدا کیا ہے، اور تمام مخلوقات فطرت کی راہ سے باہم مساوی ہیں پس اگر فطرت میں آزادی ہے تو سب کے

سب آزاد ہونے چاہئیں یا اس کے بالعکس، ورنہ در اصل قدرتی فرق اور فطرتی تمیز آزاد اور غلام میں نہیں پائی جاتی۔

۳۔ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ (روم ۳۰۔ آیت ۲۹) خدا کی بناوٹ میں ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔

ایک بڑی مضبوط اور قوی دلیل ہے اس بنائی ہوئی حالت اور جبری وقہری صورت کے بطلان کی جو ابتدا میں ناملائم حرکات والی زبردست قوم نے اپنے مغلوب قیدیوں کو غلام بنا کر جبر یہ ان کو فطری حقوق، قدرتی اختیار اور طبعی آزادی سے محروم رکھا تھا۔ پس غلام بنانا اور اس کی جان و مال پر تصرف کرنا خلقت الٰہی میں تغیر کرنا ہے، اور اسی بات کی پیشین گوئی شیطان نے پہلے سے کی ہے۔

وَلَاٰمُرَنَّھُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰہِ (النساء ۴۔ آیت ۱۱۸)۔ اور ضرور ان کو یہ سمجھاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ کی بناوٹ بدل دیں۔

اور جب غلامی کی یہ صورت ہو تو کیوں کر تسلیم کیا جائے کہ اسلام نے باوجود حق اور رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور تمام جہان کو تہذیب اور حکمت سکھلانے کے، پھر بھی ایسی رسم قبیح و مخالف فطرت کو کسی صورت میں جلا رکھا ہو۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اسلام اور استرقاق (غلام بنانا) دونوں جمع ہو سکیں۔

۴۔ آغاز اسلام اور ابتدائے وحی سے غلاموں کی حالت میں اصلاح اور غلامی کے انسداد کے لیے کوشش، ترغیب اور فکر و تدبیر کی گئی اور شروع ہی میں اخلاق اور موعظت کی راہ سے قیدیوں کی آزادی کی رغبت دلائی گئی۔

بعض تقصیرات کا کفارہ غلام آزاد کرنا قرار دیا گیا مثلاً:-

مَآ اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَۃُ فَکُّ رَقَبَۃٍ (البلد ۹۰۔ آیت ۱۳) — اے پیغمبرؐ تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ وہ کسی کی گردن کا چھڑا دینا ہے۔

(الف) کفارہ قتل خطا میں ارشاد ہوا: فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ (النساء ۴ آیت ۹۲)

(ب) کفارہ قسم میں ارشاد ہوا: اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ (المائدہ ۵ آیت)

(ج) کفارۂ ظہار میں ارشاد ہوا: فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ (المجادلہ ۵۸ آیت ۳)

(د) مسلم نے کئی اسناد سے یہ حدیث نقل کی ہے:-

من لطم مملوکہ او ضربہ فکفارتہ ان یعتقہ (مسلم ج ۲ ص ۱۹ مصر ۱۲۹۰ھ وغیرہ) جو شخص اپنے

غلام کو طمانچہ مارے یا زدوکوب کرے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کردے۔

اور جو غلام ان تحریص وترغیب پر بھی بے آزادی کے رہ جائیں ان کے لئے کتابت (۱) کا حکم ہوا۔

(یہاں سورہ نور ۲۴۔ آیت ۳۳ مع ترجمہ نقل کی ہے، جس کو ہم حذف کرتے ہیں) اور قیدیوں اور غلاموں کو مال دینے پر بھی ترغیب دی گئی۔

و فی الرقاب (البقرۃ ۲۔ آیت ۱۷۷) اور (غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں۔

مکہ میں جب غلاموں کی آزادی کا بہت چرچا اسلام کی بدولت ہوا تو غلاموں کے مالکوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ جیسی کہ اب غلامی کی حمایت کرنے والوں میں ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے 'سیرت محمدی' میں لکھا ہے:-

''جب محمدؐ نے غلامی کی آزادی کا اعلان کیا تو ان میں بہت جوش پھیلا، حتیٰ کہ عبداللہ بن جدعان نے جس کے پاس بہت سے (۱۰۰) غلام تھے، بناچاری ان کو مکہ سے کہیں اور بھیج دیا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ سب کے سب مسلمان ہو جائیں۔''

(سیرت محمدی صفحہ ۱۵۹ مطبوعہ الہ آباد ۱۸۵۱ء)

سبحان اللہ اس زمانے میں تو اس طرح قولاً فعلاً موعظۃً اور شرعاً غلاموں کی آزادی کا حکم دینے اور آزاد کر دینے سے اسلام کی نیک نامی اور غیر مسلم اقوام کا حسن ظن حاصل کیا جاتا تھا، اور ایک یہ زمانہ ہے جس میں اگر کہیں ضمناً بھی غلامی کے عدم جواز کا ذکر آجائے تو بڑے بڑے مولوی صاحب اسلام کو بدنام کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں، اور 'نورالآفاق' کے اوراق سیاہ کیے جاتے ہیں۔

---

(۱) مالک غلام سے وعدہ کر لیتا تھا کہ اتنی رقم محنت مزدوری سے جمع کر کے دے دے تو پھر آزاد ہے۔ اس کو کتابت ومکاتبت کہتے ہیں۔

پانچویں دور کی نثر پر تبصرہ

(۱) زمانے کے لحاظ سے پانچواں اور چھٹا دور الگ الگ نہیں ۔ دونوں کی ابتدا اور انتہا تقریباً ساتھ ساتھ ہے۔ بلکہ یہ تفریق نثر نگاری کی خصوصیات کے سبب سے کی گئی ہے۔

(۲) پانچویں دور میں جن مصنفوں کا ذکر کیا گیا انھوں نے باعتبار موضوع و مضمون مختلف قسم کی کتابیں لکھیں جس میں بعض مضامین اپنی نوعیت میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً سر سیّد، مولوی چراغ علی اور ان کے مخالفوں نے مذہبی مضامین جیسی جامعیت کے ساتھ لکھے، اس سے پہلے نہ لکھے گئے تھے۔ سر سیّد کی 'آثار الصنادید' اور مضامینِ تہذیب الاخلاق اُردو میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دور میں شعراء کے تذکرے بھی بجائے خود دلچسپ اضافے ہیں۔

(۳) لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے اور ایجاد و اسالیب کے اعتبار سے ان تمام مصنفوں میں بجز سر سیّد کے کسی کا کوئی خاص مرتبہ نہیں ہے۔ قدیم طرز کا اثر سب میں ہے، کہیں قافیہ بندی کی حد تک، کہیں الفاظ کی بے ترتیبی، اور زبان و محاورہ کی بے پروائی کی صورت میں۔ ان میں سے کوئی مصنف ''صاحبِ طرز'' نہیں کہا جا سکتا۔

(۴) اسی امتیاز کو نمایاں کرنے کی غرض سے انیسویں صدی کے دوسرے اہلِ قلم کو علیٰحدہ لکھا جاتا ہے۔ جنھوں نے مختلف قسم کے بالکل جدید، موزوں اور انفرادی اسالیب بیان کیے۔

(۵) چھٹے دور کے مصنف صرف طرزِ نگارش کے سبب سے ممتاز نہیں، بلکہ نئے نئے موضوعاتِ تصنیف کے موجد بھی ہیں۔

(۶) اُردو تصانیف میں اب تک جو کمی نظر آتی ہے وہ صحیح تنقید اور عالمانہ تحقیق و

تدقیق کی ہے۔ کوئی مضمون و موضوع ہو، زبان و ادب ہو یا تاریخ یا سیرت یا شاعری یا اور کچھ، اس کے لکھنے کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ہر پہلو پر غور نہ کیا جائے اور ہر ممکن ذریعہ سے ایک ایک جزو، ایک ایک رُخ کی تحقیق و تنقید نہ کی جائے۔ یہ کام گذشتہ دور میں صرف مذہب کے متعلق کیا گیا ہے۔ تصنیف و تالیف کی کسی اور شاخ کے لیے ایسی کاوش نہیں کی گئی۔

(۷) یہ نقد و نظر، تحقیق و تنقیح، موازنہ و مقابلہ آیندہ مصنفین کی امتیازی و انفرادی خصوصیت ہے۔

نثر اردو کا

چھٹا دور

(غدر کے بعد سے بیسویں صدی کے شروع تک)

مولوی محمد حسین آزاد: والد کا نام مولوی محمد باقر ہے۔ شیعہ مجتہدین کے خاندان سے تھے۔ غالباً ۱۸۳۲ء (۱) میں پیدا ہوئے۔ آزاد کے والد نے ۱۸۳۷ء میں 'اُردو اخبار' دہلی سے نکالا تھا۔ جو اُردو کا پہلا اخبار نہیں تو دہلی کا پہلا اخبار ضرور تھا۔ ان کے والد کے استاد ذوق دہلوی سے بڑے تعلقات تھے۔ اسی سبب سے آزاد ذوق کے شاگرد ہوئے، اور ان کے ساتھ دہلی کے مشاعروں میں بھی شرکت کی۔ آزاد کو اپنے استاد سے جیسی محبت تھی، اس کی مثال دنیا میں کم ملتی ہے۔ آزاد نے قدیم دہلی کالج میں بھی تعلیم پائی، جہاں مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال آشوب، ان کے رفقائے تعلیم تھے۔ استاد ذوق کے انتقال (۱۸۵۴ء) کے بعد آزاد نے حکیم آغا جان عیش سے کچھ دنوں فیض سخن حاصل کیا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آزاد کے والد بھی گرفتار کر لیے گئے۔ اور دہلی دروازے کے باہر ایک میدان میں باغیوں کے ساتھ نظر بند اور محصور کر دیے گئے۔ یہ حادثہ آزاد کے لیے کیا کم المناک و جاں گداز تھا کہ آزاد کو غایت محبت کے سبب اس حالت میں والد کی زیارت کا شوق ہوا۔ اس وقت دہلی کی فضا ایسی تھی کہ باہر چلنا پھرنا بھی خطرناک تھا۔ آخر آزاد کو فوج کے ایک سکھ جرنیل کا خیال آیا جو ان کے والد کا دوست تھا۔ اس

---

(۱) جنوری ۱۹۱۰ء میں آزاد کا انتقال ۷۷ سال کی عمر میں ہوا ہے۔ اس سے سال ولادت نکالا گیا ہے۔ اور کوئی ذریعہ اطلاع نہ تھا۔

کے پاس گئے اور اپنی آرزو بیان کی۔ اس نے اس ارادے سے باز رکھنا چاہا۔ انھوں نے اپنے دل کی تڑپ کا اظہار کیا۔ آخر اس نے کہا تم میرے سائیس کا لباس پہن کر میرے ساتھ چل سکتے ہو، اور کوئی تدبیر نہیں۔ چنانچہ آزاد سائیس کے حلیے میں سکھ جرنیل کے گھوڑے کے ساتھ دوڑتے ہوئے اس میدان محشر میں پہنچے، جہاں قیدی اپنی زندگی کی آخری ساعتیں گزار رہے تھے۔ انھیں لوگوں میں ایک طرف کو ایک مرد خدا عبادت میں مصروف تھا، چہرے پر اطمینان وسکون کے آثار تھے۔ یہی آزاد کے شفیق بڈھے باپ تھے، جن کی عمر اس وقت ستر سال سے زاید تھی۔ بہت دیر کے بعد نظر اٹھائی تو تھوڑے فاصلے پر اپنا پیارا، لاڈوں کا پیارا جگر گوشہ سائیس کے لباس میں کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک دم چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوئے۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ادھر یہی حالت بیٹے پر گزری۔ دنیا آنکھوں کے سامنے اندھیر ہوگئی۔ جب نظر نے یاوری کی تو دیکھا کہ ہاتھ سے اشارہ کر رہے ہیں کہ بس آخری ملاقات ہوگئی، اب رخصت ہو اور دیر نہ کرو۔ اس اشارے کے بعد انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ آزاد نے اس وقت لاکھ ضبط کیا، لیکن نہ ہوسکا۔ وہاں سے روتے ہوئے رخصت ہوئے۔ اور اس وقت تک اس وفادار جرنیل کی حفاظت میں رہے جب تک شاہجہاں آباد کی یہ مظلوم روحیں قفسِ عنصری میں قید رہیں۔'' (۱) جب شہر میں یہ افواہ پھیلی کہ تمام قیدیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تو آزاد اسی سکھ جرنیل کی مدد سے باہر نکلے۔ بغل میں استاد ذوق کی نظموں کا بستہ تھا، جس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

جب غدر کی دار و گیر سے کچھ امن کی صورت نظر آئی تو آزاد مع اہل و عیال لکھنؤ چلے گئے۔ لیکن وہاں بھی گردشِ تقدیر ساتھ رہی، آخر ایک مدت بعد ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے،

---

(۱) یہ کیفیت بلکہ آخری سطریں (جو علامات اقتباس سے محدود ہیں) تقریباً بجنسہٖ رسالہ 'کتابی دنیا' (شائع کردہ کتاب گھر دہلی) کے ایک مضمون سے لی گئی ہیں۔ اس رسالے میں 'آزاد کے مکمل سوانح حیات' سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے۔ اب تک آزاد کے مفصل حالات کہیں نہیں ملتے۔

اور پنڈت من پھول میر منشی لفٹنٹ گورنر پنجاب کی سفارش سے سر رشتہ تعلیم میں پندرہ روپے کے ملازم ہو گئے۔ اس زمانے میں میجر فُلر ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ میجر صاحب بڑے علم دوست تھے اور ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی سے خاص اُنس رکھتے تھے۔ آزاد اور ماسٹر صاحب کے تعلقات نہایت دوستانہ اور مخلصانہ تھے۔ آزاد نے ماسٹر صاحب سے فرمائش کی کہ میجر صاحب سے ہمیں بھی ملوا دیجئے۔ ایک بار موقع مل گیا۔ میجر فُلر نے کوئی اُردو کی تحریر لکھی تھی وہ ماسٹر صاحب کو دکھائی۔ اس میں میجر صاحب نے 'ایجاد' کو مونث لکھا تھا۔ ماسٹر صاحب نے اعتراض کیا کہ 'ایجاد' مذکر ہے۔ میجر صاحب نے کہا یہ تحریر مولوی کریم الدین صاحب سر رشتہ دار کو دکھالی ہے۔ مولوی صاحب بلائے گئے۔ انھوں نے اعتراض سن کر کہا کہ مذکر بولنے کی سند درکار ہے۔ ماسٹر پیارے لال صاحب نے میجر صاحب سے کہا کہ آپ کے محکمہ میں جو مولوی محمد حسین دہلوی ہیں ان کو بہت سے شعر یاد ہیں۔ میجر نے آزاد کو بلا کر سوال کیا۔ آزاد نے فوراً سودا کا یہ شعر پڑھ دیا:-

نسخہ میں معجون زر نباد ہے ہائے یہ کس بھڑوے کا ایجاد ہے

میجر صاحب بہت خوش ہوئے اور آزاد کی قدر کرنے لگے۔ میجر فُلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر ہوئے۔ اس زمانے میں لاہور سے ایک سرکاری اخبار 'اتالیق پنجاب' نکلتا تھا۔ ماسٹر پیارے لال آشوب اس کے ایڈیٹر تھے۔ کرنل ہالرائڈ نے آزاد کو اس اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا دیا اور ۵۷ روپیہ تنخواہ کر دی۔ پھر 'اتالیق پنجاب' بند کر کے اس کی جگہ 'پنجاب میگزین' جاری ہوا، تو آزاد اس کے بھی سب ایڈیٹر رہے۔ آزاد کے بعد حالی نے بھی یہ خدمت انجام دی۔

آزاد ۱۸۶۵ء میں کسی سرکاری کام کے لیے کلکتہ گئے۔ اسی سال پنڈت من پھول کے ساتھ سرکاری سفارت کی غرض سے کابل و بخارا گئے۔ ایران کا بھی سفر کیا۔ دوبارہ ۱۸۸۳ء میں ایران گئے۔ ایران میں آزاد نے فارسی جدید میں مہارت پیدا کی۔ اور وہاں سے آکر ایرانی فارسی کے متعلق کچھ درسی کتابیں بھی مرتب کیں۔ آزاد ایک عرصہ تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی و عربی کے پروفیسر رہے۔ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کے ۵۰ سالہ جشن تاجپوشی کے موقع پر آزاد کو 'شمس العلما' کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء میں آزاد کے

دماغ میں کچھ اختلال کے آثار شروع ہوئے۔ پھر یہ کیفیت بڑھ کر مستقل ہوگئی۔ اور زندگی کے باقی بیس برس اس حالت میں گزرے کہ کبھی جذب و بیخودی نظر آتی تھی، کبھی جنون کی شان پیدا ہو جاتی تھی۔ آخر ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء﴿۹ محرم ۱۳۲۸ھ﴾ کو رحلت فرمائی۔

اُردو شاعری پر آزاد کا احسان جس زمانے میں آزاد پنجاب کے سررشتہ تعلیم میں منسلک تھے، اور حالی بھی بک ڈپو کے اہتمام کے لیے وہاں ملازم ہو کر پہنچ گئے تھے۔ آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ کی تائید سے جدید شاعری (۱) کا دور شروع ہوا۔ یعنی

---

(۱) جدید اُردو شاعری۔ اُردو شاعری کی ابتدا سے شاعری کی جو قسمیں عام طور پر رائج ہیں وہ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، واسوخت وغیرہ تھیں۔ یہ قدیم شاعری اور ادبیات قدیم (کلاسیکل لٹریچر) کہلاتی ہیں۔ ان اصناف سخن کا موضوع و مقصود حسن و عشق، مدح و ہجو، قصص و حکایات، اخلاق و تصوف تھا۔ ان کے مقابلے میں جدید شاعری سے یہ مراد ہے کہ کسی جذبہ یا منظر یا حقیقت یا واقعہ کے متعلق چھوٹی یا بڑی مستقل نظم لکھی جائے۔ اس میں یہ اقسام شامل ہیں: (۱) تخیلی شاعری یعنی محبت، عداوت، مسرت، غم، ایثار، خودداری وغیرہ میں سے کسی جذبہ کی تصویر کشی۔ (۲) منظر کشی۔ یعنی کسی وقت، موسم، مقام یا اوضاع و احوال وغیرہ کی تصویر کشی مثلاً صبح و شام، بہار، برسات، دریا، باغ، تیتری، کوئل، اشنان، تیرتھ، دیوالی، عید وغیرہ کا منظر نظم میں بیان کرنا۔ (۳) بیانیہ شاعری۔ کسی خاص واقعے کو نظم کرنا۔ مثلاً حاتم کی سخاوت، سکندر و قزاق کی گفتگو، رام چندر جی کا بن باس۔ (۴) تمثیلی یا رزمیہ شاعری۔ یعنی غیر ذی روح یا غیر ذی عقل چیزوں کو انسانی خواص و افعال دے کر ان کے قصے یا مکالمات لکھنا، جس سے کوئی اخلاقی پہلو ذہن نشین کرنا مقصود ہو۔ جیسے نظیر اکبر آبادی کی نظم ہنس پر یا حالی کا مناظرہ دولت یا وقت یا تاجر و طوطی کا مشہور واقعہ۔ (۵) وطنی و قومی شاعری۔ یعنی ملک و قوم کی اصلاح و فلاح کے متعلق نظمیں۔

مختصر تاریخ (۱) پہلا دور۔ قدیم زمانے میں اس طرح کی نظمیں لکھنے کا عام رواج نہ تھا۔ قصیدوں کی تشبیب، مثنویوں اور مرثیوں کے ضمنی مناظر میں ان جدید نظموں کی مشابہت موجود ہے۔ اگر یہ ٹکڑے قصائد وغیرہ میں سے الگ کر لیے جائیں تو جدید شاعری کے ذیل میں آسکتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ قدیم زمانے میں بعض شاعروں نے الگ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً گول کنڈہ کے بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ (متوفی ۱۶۱۱ء) کے قلمی دیوان میں متعدد نظمیں پھول، پھل، ترکاری، شادی بیاہ، شب برات، ہولی، بسنت وغیرہ پر (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) موجود ہیں۔ ایک نظم میں صراحی و پیالہ کا مناظرہ ہے۔ ان نظموں کی زبان دکھنی اُردو ہے۔ دکن کے اور شاعروں نے بھی ایسی نظمیں لکھی ہیں۔

(۲) دوسرا دور۔ اس سے سو برس بعد دہلی میں مرزا سودا (۱۷۱۳ء-۱۷۸۰ء) اور میر تقی میر (۱۷۲۴ء-۱۸۱۰ء) اور بعض دوسرے شاعروں نے مناظر قدرت، مظاہر صنعت اور واقعات و حوادث کے متعلق نظمیں لکھیں۔ خصوصاً میر کی نظمیں آج تک اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں۔

(۳) تیسرا دور۔ میر و سودا کے زمانے میں، لیکن ان سے عمر میں چھوٹے اور شاعری میں کم رتبہ ایک بے نظیر شاعر میاں نظیر اکبرآبادی (۱۷۴۰ء-۱۸۳۰ء) تھے۔ میاں نظیر اس جدید شاعری کے ایسے عجیب علم بردار تھے کہ ان کا نام سب سے الگ لکھنے کے قابل ہے۔ گویا وہ اپنے دور میں اکیلے ہیں۔ نظیر فنِ شاعری کے اصول و قواعد کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ اور جو موضوع اپنی شاعری کے لیے پسند کیا تھا وہ مقبول و رائج نہ تھا۔ اگرچہ شاعرانہ محاسن میں نظیر کا کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ تاہم انھوں نے صدہا نظمیں اپنے جذبات و تاثرات سے لکھیں جن میں قدرتی مناظر، فطری جذبات، اخلاق و نصائح، مشاغل حیات، سب کچھ شامل ہے۔ آدمی نامہ، فقیر کی صدا، پیسہ نامہ، برسات کی لہریں، تیراکی کا میلہ، ہولی، دیوالی، بسنت، عید، عرس وغیرہ پر عجیب و غریب نظمیں لکھی ہیں۔ جو اس رنگ میں نہ پہلے لکھی گئی تھیں، نہ آج تک لکھی گئی ہیں۔

(۴) چوتھا دور۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے علم و ادب، تہذیب و تعلیم، فکر و تخیل کے انقلاب کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ نظم جدید کی اس تحریک و اشاعت کا مولوی محمد حسین آزاد، اور خواجہ حالی کے سر سہرا ہے۔ ۱۸۷۴ء سے اُردو میں یہ مستقل صنف شاعری شروع ہوگئی۔ حالی و آزاد کے ہم عصر انیسویں صدی کے بہترین شاعر مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی ہیں، جن کی نظمیں محاسنِ شاعری میں آزاد و حالی دونوں سے بہتر ہیں۔ قدامت و افادہ و کثرت میں حالی کو اسمٰعیل پر تفوق ہے۔ ان بزرگوں کے ساتھ اکبر الٰہ آبادی، بے نظیر شاہ، جوالا پرشاد برق، درگا سہائے سرور جہاں آبادی، شوق قدوائی وغیرہ امتیاز خاص رکھتے ہیں۔

(۵) پانچواں دور۔ بیسویں صدی کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ جس کی رفتار و ترقی میں بعض ماہوار رسالوں نے بڑی مدد دی، مثلاً رسالہ 'مخزن' لاہور (جاری شدہ ۱۹۰۲ء)، اور رسالہ 'زمانہ' کانپور (جاری شدہ ۱۹۰۳ء) ان کے علاوہ بیسویں صدی کے ان پچاس سالوں میں بے شمار رسالے جاری ہوئے اور ان کے ذریعہ سے ہزارہا جدید نظمیں شائع ہوگئیں۔ ہر مہینے بلا مبالغہ کئی سو نظموں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس زمانے کے چند (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک بزم ادب انجمن پنجاب کے نام سے قائم ہوئی جس میں بجائے طرحی غزلوں کے مختلف موضوعات قومی واخلاقی اور مناظر وحقائق پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ چنانچہ آزاد کی مثنوی 'زمستاں'، 'ابر کرم' وغیرہ اور حالی کی 'حب وطن' اور 'برکھا رُت' وغیرہ اسی عہد کی یاد گاریں ہیں۔ اس جدت وایجاد کا خیال سب سے پہلے آزاد کو آیا اور انھوں نے خود کہہ کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر جدید نظموں کو رواج عام دیا۔ اس لیے یہ انقلاب شاعری آزاد کی اولیات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ انجمن پنجاب کا سب سے پہلا مشاعرہ ۸ رمئی ۱۸۷۴ء کو ہوا تھا۔ اس میں آزاد نے (شام کی آمد اور رات کی کیفیت) پڑھ کر سنائی۔ یہ مشاعرہ صرف گیارہ مہینے جاری رہا۔

آزاد کی تصانیف: سررشتۂ تعلیم پنجاب کی ملازمت کے زمانے میں کرنل ہالرائڈ کی فرمائش سے آزاد نے اُردو ریڈریں، فارسی ریڈریں، قواعد اُردو، قصص ہند (تاریخی کہانیاں) مرتب کیں۔ یہ اُردو زبان میں اپنی نوع کی بہترین کتابیں ہیں۔ بچوں کی درسیات میں اس سے بہتر کتابیں موجود نہ تھیں۔ اوران کے بعد بھی مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے سوا کسی سے ان سے بہتر نہ بن سکیں۔ خصوصاً قصص ہند کی فصاحت ودلکشی اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ممتاز شاعر یہ ہیں: ڈاکٹر اقبال، مرزا عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، چکبست لکھنوی، ظفر علی خاں، ونائک پرشاد، طالب بناری، تلوک چند محروم، نادر کاکوروی، سیماب اکبر آبادی، ان کے علاوہ اور بھی ہیں۔ یہاں صرف چند نام لکھ دئے گئے ہیں، لیکن ترجیح بلا مرجح نہیں ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جن کی جدید شاعری ۱۹۰۱ء سے کچھ پہلے یا کچھ بعد شروع ہوئی۔ اب ان میں کتنے رحلت فرما گئے اور جو زندہ ہیں ان میں سے کسی کی عمر ۶۰ سال سے کم نہ ہوگی۔

(۶) چھٹا دور۔ ان جدید شاعروں کا ہے جن کی شاعری جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) یا تحریک آزادی (۱۹۲۰ء) کے بعد منظر عام پر آئی ہے۔ ان میں نسبتاً قدیم شاعر جوش ملیح آبادی ہیں۔ جوش سے زیادہ مکمل، خوبصورت اور کثرت سے لکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ لیکن نئے زمانے میں ایسے جوہر قابل بھی موجود ہیں کہ تکمیل شاعری کے بعد ان پر اُردو اور ہندوستان کو ناز ہوگا۔ اگر چہ آج کل شاعروں کی کثرت اس قدر ہوگئی ہے کہ اعلیٰ معیار کا قائم رہنا دشوار ہے۔ اندیشہ ہے کہ کمال سے پہلے زوال نہ شروع ہو جائے۔

لطف و تاثیر کا آج تک جواب نہ ہو سکا۔ قند پارسی بھی فارسی جدید کے متعلق آزاد کی مفید کتاب ہے۔ 'نصیحت کا کرن پھول' اخلاقی و تعلیمی قصہ ہے جو لڑکیوں کے لیے آزاد نے تصنیف کیا ہے۔ ان سے زیادہ عظیم الشان آزاد کے علمی و ادبی و لسانی کارنامے یہ ہیں:۔

۱۔ 'آبِ حیات' (تذکرہ شعراء)۔ ۲۔ 'نیرنگِ خیال' دو حصے (رمزیہ یا تمثیلی مضامین)۔ ۳۔ 'دربارِ اکبری' (شہنشاہ اکبر اعظم کے زمانے کی تاریخ)۔ ۴۔ 'سخندان فارس' (فارسی علم اللسان)۔ ۵۔ 'نگارستانِ فارس' (تذکرہ شعرائے فارسی)۔ ۶۔ 'دیوان ذوق' (مع حالات و تشریحات)۔ ۷۔ 'نظم آزاد' (قومی و اخلاقی نظموں کا مجموعہ)۔ یہ سب کتابیں آزاد کی زندگی میں شائع ہوگئی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے ورثاء نے قلمی مسودات سے بہت سی کتابیں مرتب کر کے شائع کی ہیں، وہ یہ ہیں:۔

۸۔ 'تذکرۂ علماء' (۴۰ مشاہیر ہند کا تذکرہ)۔ ۹۔ 'سپاس و نماک' (آزاد کی مجذوبانہ تحریر)۔ ۱۰۔ 'کائناتِ عرب' (جغرافیہ اور احوالِ عرب)۔ ۱۱۔ 'لغت آزاد' (اُردو الفاظ کے فارسی مترادفات پر)۔ ۱۲۔ ڈرامہ اکبر (فسانۂ جہانگیر و نور جہاں)۔ ۱۳۔ 'سیرِ ایران' (سفرنامہ)۔ ۱۴۔ 'فلسفۂ الٰہیات' (مجذوبانہ تصنیف)۔ ۱۵۔ 'جانورستان' (حالات حیوانات)۔ ۱۶۔ 'مکتوباتِ آزاد' (مجموعۂ خطوط)۔ ۱۷۔ 'بیاضِ آزاد' (آزاد کے پسندیدہ اشعار)۔ ۱۸۔ خمکدۂ آزاد (غزلیات و منظومات)۔

آزاد کا طرزِ تحریر: اگر کسی شخص کو آزاد کی سوانح زندگی، انقلابات و مصائب، افتادِ طبع اور جذب و جنون کا حال معلوم نہ ہو، اور وہ ان کی 'آبِ حیات'، 'نیرنگِ خیال'، 'قصص ہند'، 'دربارِ اکبری' اور 'سخندانِ فارس' وغیرہ کتابیں جو آثارِ جنوں سے پہلے کی لکھی ہوئی ہیں، مطالعہ کرے تو پڑھنے والا آزاد کے اسلوبِ تحریر کی جدّت و دلکشی اور آزاد کی ذہانت و لطافتِ طبع سے متاثر ہونے کے ساتھ یہ بھی محسوس کرے گا کہ یہ مصنف ''خیالی بندہ'' اور ''عالمِ خیال'' کا رہنے والا ہے۔ اس کی ذہنی فضا، احساسات و تاثرات سے بھری ہوئی یا اس کے دماغ پر تخیل کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔

علامہ آزاد کی تمام تصانیف اس ''نظریہ'' کی دلیل ہیں۔ صرف 'نیرنگِ خیال' کے

تمثیلی ورمزیہ (ایلیگوریکل) مضامین پر یہ قیاس قائم نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح کی مستقل کتابیں عربی و فارسی میں بھی لکھی گئی ہیں۔ اور اُردو میں بھی۔ ایسے مضامین سر سیّد، محسن الملک، حالؔی وغیرہ نے بھی لکھے ہیں، اور وہ یقیناً خیالی بندے نہ تھے۔ 'نیرنگِ خیال' کے علاوہ آزادؔ کی 'آبِ حیات' ہر دور کی تمہید و خاتمہ، 'آبِ حیات'، 'دربارِ اکبری'، 'سخندانِ فارس'، 'دیوانِ ذوقؔ' کے صدہا چھوٹے جملے اور بڑی عبارتیں، آزادؔ کی اس ذہنیت کی شاہد ہیں۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:-

(ا) سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جو طرزِ نگارش سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آزادؔ اپنے تخلص (آزاد) کو جا بجا ضمیر متکلم کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ انداز کہیں کہیں قدیم مصنفوں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن نہ اس کثرت سے اور نہ اس طور پر جیسے:-

(الف) ''آزاد ہندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے۔'' (آبِ حیات کا سب سے پہلا جملہ)

(ب) ''ایک 'سحر البیان'، دوسرے 'گلزار نسیم'، اور تعجب یہ کہ دونوں کے رستے بالکل الگ الگ ہیں۔ اس واسطے آزاد کو واجب ہے کہ کچھ لکھے اور اہل سخن سے اپنی رائے کی صحت و سقم کا حال پوچھے۔'' (آبِ حیات ذکر میر حسنؔ)۔

(ج) ''استاد مرحوم یہ حسرت ساتھ لے گئے، والد میرے شہید آرزو ہوئے ہیں۔ بڑھاپا ہو گیا۔ اب خطر ہے کہ امانت رہے، اور آزاد کو مسافر خانے سے کوچ کا حکم آجائے۔'' (دیباچہ 'دیوانِ ذوقؔ' کی پہلی سطریں)۔

(د) ''ایک زمانہ تھا کہ بندہ آزاد کو سب یاد تھا۔ افسوس کہ نہ وہ رہے، نہ وہ رہے، نہ بیاض رہی۔'' (دیوان ذوقؔ صفحہ ۳۴۹)۔

(ہ) ''آہ استاد، کہاں استاد۔ خیر آزاد۔ بہار زندگی کے لطف ہوتے ہیں۔'' (دیوان ذوقؔ صفحہ ۳۵۳)

(و) 'آزادؔ' نے جو کچھ کیا، نیک نیت اور پاک عقیدت سے کیا ہے۔'' (دیوان ذوقؔ صفحہ ۳۵۴)

(ز) ''کاغذی تختے گلزار نظر آتے ہیں، مگر آزادؔ تم سے کہتا ہے کہ اندر کچھ نہیں، وہ حقیقت میں لفظوں کی بہار تھی اور معنوں کی خزاں۔'' (سخندان فارس صفحہ ۶۷)

(ح) ''جب ان کے چراغ خاندان سیّد خورشید علی نفیسؔ بھی شعاع توجہ دریغ فرمائیں تو غیروں سے کیا امید۔ اُنھوں نے آزادؔ خاکسار کو 'آبِ حیات' کی رسید سے بھی شاداب نہ کیا۔'' (آبِ حیات، تذکرہ میر انیسؔ)۔

نام کا یہ استعمال عجب آزادروی کی شان رکھتا ہے۔

(۲) دوسرا جدید اسلوب یہ ہے کہ جابجا استعارہ کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ دوسرے مصنفوں نے کہیں اتفاق سے ہی کیا ہوگا۔ مثلاً

(۱) ''قدردانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں سے دیکھا، اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اڑایا۔'' (آبِ حیات، تذکرہ میر تقی میرؔ)۔

(۲) ''فتحیاب لڑکے صاحب ملک اور صاحب زبان تھے۔ ان کی حب الوطنی اور بلند نظری فارس کی زبان کو مخالفت کے کانوں سے سنتی تو عجب نہ تھا۔'' (سخندانِ فارس۔ فارسی زبان میں انقلاب)۔

(۳) ''اقبال مندوں کے دربار میں علوم وفنون کے ساتھ انشاپردازی بھی امیدوار آئی۔ انھوں نے فقط امید کا پیٹ نہ بھرا، بلکہ ذوق وشوق کو چمکا کر تصنیفات کے میدان کھلوادیے۔'' (سخندانِ فارس کا وہی مضمون)۔

(۴) ''دیکھو مُلّا صاحب نے ظرافت کا نشتر مارا تھا، وہاں سے سخاوت کا چشمہ بہہ نکلا۔'' (دربار اکبری، تذکرہ بیرم خاں)۔

(۵) ایک مضمون میں اہلِ وطن کو ''تم'' اور ''تمھارے'' لفظوں سے خطاب کرتے کرتے یکا یک تخاطب بدل کر فرماتے ہیں:۔

''اے خاکِ ہندوستان، اگر تجھ میں امراء القیسؔ اور لبیدؔ نہیں تو نہیں۔ کالیداسؔ ہی نکال۔ اے ہندوستان کے صحراو دشت فردوسیؔ اور سعدیؔ نہیں تو کوئی والمیکؔ ہی پیدا کردو۔'' (لکچر انجمن پنجاب ضمیمہ 'نیرنگِ خیال' حصہ اول)۔

(۶) ''خان خاناں اور خانِ اعظم کے ایوان ملک ملک کے صنائع وبدائع سے ایک کامل نمائش گاہ بنے ہوئے تھے، جن کے در ودیوار فصلِ بہار کی چادر کو ہاتھوں پر پھیلائے کھڑے تھے، اور ہر ستون ایک باغ

کو بغل میں دبائے تھا۔" (دربار اکبری، جشن نوروزی جلال الدین اکبر)۔

(۷) استاد ذوقؔ کو سرکار ولیعہدی سے چار روپیہ ماہوار تنخواہ ملنے کے ذکر پر لکھتے ہیں:-

"اِدھر تو شاعروں کے جمگھٹ کی دل لگی نے اُدھر کھینچا، اُدھر قسمت نے آواز دی کہ للعہ (چار) نہ سمجھنا، یہ ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون قائم ہوتے ہیں۔" (دیوانِ ذوقؔ)

یہ شاعرانہ فقرے اور تخئیلی انداز آزادؔ کی تمام تصانیف میں بڑی کثرت سے ہے لیکن بالکل آورد ہے۔ یہ اسلوب مرزا غالبؔ کے رقعوں میں کہیں پایا جاتا ہے تو اس انداز سے کہ آورد نہیں معلوم ہوتا، لیکن دور اصلاح و ترقی یعنی سرسیّد اور ان کے بعد کے مصنفوں میں نہیں ہے۔ بہرحال یہ آزادؔ کی خصوصیت ہے۔

(۳) علامہ آزادؔ کی طبیعت میں نازک خیالی اور لطافت و موزونیت خداداد تھی۔ فارسی زبان کی محبت و شغف نے اس جوہر کو چمکا دیا تھا۔ ظہوریؔ اور نعمت خاں عالیؔ کی نثر کو پسند کرتے تھے، اور ان کی نازک خیالیوں اور بلند پروازیوں کا اثر دل و دماغ پر تھا۔ چنانچہ 'سخندانِ فارس' میں لکھتے ہیں:-

"ان کے نازک خیال، خوبصورت استعارے، نئی نئی تشبیہیں، خوشنما ترکیبیں، لفظوں کی عمدہ تراشیں، خیالوں کی نزاکتیں، طبیعتوں کی بلند پروازیاں، صنعتوں کے ہجوم، جواب نہیں رکھتے۔ ظہوریؔ نے جس فقرے کے ساتھ فقرہ جوڑا ہے، مجال نہیں کہ ایک کو اٹھا کر کوئی دوسرا فقرہ اس کی جگہ رکھ سکے۔ ذرا دیکھنا، بادشاہ کی فصاحت کی تعریف میں کہتا ہے: نکتہ ہائے برجستہ، غنچہ ہائے سربستہ (پھر کہتا ہے) ہر صفحش چمنے، ہر سطرے انجمنے، ہر حرفش فصلے، ہر فرعش اصلے۔ (حسن کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے) ابروان خجستہ، کلید دل ہائے بستہ۔"

اس کے بعد اس طرز تحریر کے استعمال کے متعلق ہدایت کرتے ہیں:-

"بات یہ ہے کہ ان کتابوں کو بڑی غور اور احتیاط سے پڑھنا چاہئے۔ انھوں نے خوبیِ الفاظ، اور نزاکتِ خیال، اور زورِ طبع کو بے مطلب و بے مدعا خرچ کیا ہے۔ تم انھیں لو، اور بیان مطلب کے کام میں لاؤ۔ پھر دیکھو گے تمھاری عبارت کیا کیفیت اور کیا تاثیر پیدا کرتی ہے۔"

چنانچہ آزاد خود اپنی تصانیف میں اس سے کام لیتے ہیں۔ اوپر جو مثالیں متفرق جملوں کی لکھی گئی ہیں، ایسا ہی اسلوب نگارش آزاد کے ہاں طویل و مسلسل عبارتوں میں بھی ملتا ہے۔ نمونے دیکھئے:۔

(الف) ''اُردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا، مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا، البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدلؔ اور ناصر علیؔ کا زمانہ قریب گذر چکا تھا، اور ان کے معتقد باقی تھے۔ وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے، اس واسطے گویا اُردو بھاشا میں استعارہ اور تشبیہ کا رنگ بھی آیا۔ یہ رنگ اگر اسی قدر آتا کہ جتنا چہرے پر ابٹنے کا رنگ یا آنکھوں میں سرمہ تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید تھا۔ مگر افسوس کہ اس کی شدت نے ہماری قوت بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا، اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بنادیا۔'' (آبِ حیات، زبان اُردو کی تاریخ، صفحہ ۴۹)

(ب) ''جب وہ صاحب کمال (استاد ذوقؔ) عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا، جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہاں میں پھیلی، اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی، وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبِ حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اُردو کا خاتمہ کیا گیا۔'' (آبِ حیات، تذکرۂ ذوقؔ)۔

(ج) ''نظم اُردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف (یعنی مرزا سوداؔ) نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کردیا ہے۔ ان کے بعد شیخ مرحوم (یعنی استاد ذوقؔ) کے سوائے کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا، اور انھوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ انوریؔ، ظہیرؔ، ظہوریؔ، نظیریؔ، عرفیؔ فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں، لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان بنادیا۔'' (آبِ حیات و دیوانِ ذوقؔ، قصائد پر رائے)۔

(د) ''حضرت عشق نے شادی کی تھی اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھایا تھا۔ ہمایوں کو دم بھر کی جدائی گوارا نہ تھی۔ دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا...... جودھپور کا رُخ ہے کہ ادھر سے امید کی آواز آتی ہے۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھی، دغا آواز بدل کر بولی تھی۔ وہاں تو موت منہ کھولے بیٹھی ہے۔'' (دربار اکبری، صفحہ ۲)۔

(ہ) اسی کے آگے اکبر بادشاہ کی ولادت کا ذکر کرتے ہیں:-

''اس عالم میں ایک دن ملازم نے آکر اطلاع دی کہ مبارک، اقبال کا تارا طلوع ہوا۔ یہ ستارہ ایسے ادبار کے وقت جھلملایا تھا کہ کسی کی آنکھ اُدھر نہ اٹھی، مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا، آفتاب ہو کر چمکے گا اور سارے ستارے اس کی روشنی میں دھندلے ہو کر نظروں سے غائب ہو جائیں گے۔'' (دربار اکبری، صفحہ۲)

نثر میں شاعرانہ تخیل و اسلوب بیان کی ایسی دلکش و برجستہ مثالیں آزاد کے ہم عصروں میں کہیں نہیں ملتیں۔ یہ بھی آزاد کے ''عالم خیال'' کی تصویریں ہیں۔

(۴) خیالی طرزِ ادا کی ایک اور دلچسپ صورت آزاد یہ اختیار کرتے ہیں کہ تاریخی واقعات و قیاسات، جن کو دوسرے مصنف واقعہ فرض کر کے واقعے کے طور پر بیان کرتے ہیں، ان کو آزاد قیاسی و احتمالی انداز سے لکھتے ہیں۔ مثلاً زبانوں کی ساخت کے متعلق فرماتے ہیں:-

(الف) ''مگر ایک زمانہ ضرور ہوگا کہ جس میں ان کی ایک زبان ہوگی، اسی کے الفاظ ایک گھرانے کے آدمی ایک گھر میں رہ سہ کر بولتے ہوں گے۔ اور ایک ہی الفاظ گھروں کے کاروبار میں کام دیتے ہوں گے، یا یہ دونوں زبانیں ایک زبان سے اس طرح نکلی ہوں گی جس طرح ایک ماں باپ کی دو بیٹیاں جدا ہو گئیں۔'' (سخندانِ فارس، صفحہ۱)

(ب) 'کوٹھی' کے لفظ کی اصل اور اس کے رواج کی صورت بیان کرتے ہیں:-

ہندوستان میں صاحب لوگ لباسِ تجارت میں آئے تھے۔ چونکہ تاجروں کا رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین تاجروں ہی سے ہوتا تھا، اول اول معاملات بھی بنگالہ کے تاجروں اور مہاجنوں ہی سے ہوتے ہوں گے۔ عام مسافرت میں انھیں نوکر چاکر درکار ہوئے ہوں گے۔ وہ بھی انھی سے لئے ہوں گے۔ عالی شان مہاجنوں اور سوداگروں کی دکانوں کو 'کوٹھی' کہتے ہیں، کیونکہ صاحب لوگ لباس تجارت میں تھے، جب کسی سے ملتے جلتے ہوں گے، 'کوٹھی' پر جا کر ملتے ہوں گے، وہ پوچھتے ہوں گے آپ کی 'کوٹھی' کہاں ہے، یہ پتا بتا دیتے ہوں گے، اور سمجھتے ہوں گے کہ 'کوٹھی' گھر کو کہتے ہیں، کیوں کہ مسافر تھے، ان کی دکان اور 'کوٹھی' ایک ہی تھی۔ ان کے نوکر بھی کوٹھی ہی کہتے ہوں گے۔ کام کے موقع پر آپ کہتے ہوں

گے یہ چیز ہماری 'کوٹھی' پر لے آؤ۔ اور لوگ کہتے ہوں گے، یہ چیز صاحب کی کوٹھی پر دے آؤ۔ مدت کے بعد تجارت کا پردہ اٹھا دیا۔ وہی گھر دارالحکومت ہو گئے۔ جب سے 'کوٹھی' کا نام جو محاورہ میں آ گیا تھا، وہی رہا۔ اور یہ نیک نیتی کا پھل ہے۔'' (سخندانِ فارس)

(ج) عبدالرحیم خانخاناں کے بچپن کے مصائب کا ذکر کرتے ہیں:۔

''وہ تین برس کی جان (عبدالرحیم خانخاناں) کیا کرتا ہوگا، سہم کر رہ جاتا ہوگا۔ ان کی گود میں دبک جاتا ہوگا، ڈرتا ہوگا، انا کے پاس چھپ جاتا ہوگا، افسوس وہ بچاریاں کہاں چھپالیں کہ آپ ہی چھپنے کو جگہ نہیں۔ الٰہی! تیری پناہ! عجب وقت ہوگا، شامِ غریباں اسی کو کہتے ہیں، رات قیامت کی رات گزری ہوگی، دن ہوا تو روزِ محشر۔'' (دربارِ اکبری، صفحہ ۵۶)۔

(د) ''زبانِ اُردو کی تاریخ'' کے سلسلے میں ہندوستان کی قدیم تاریخ بیان کرتے ہیں۔:۔

فتح یابوں نے ہندوکش کے پہاڑ اتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے، پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے، اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مرتے دائیں بائیں جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھستے گئے ہوں گے، کچھ بھاگے ہوں گے، وہ دکن اور مشرق کو ہٹتے ہوں گے، کچھ فتح یابوں کی غلامی اور خدمت گاری میں کام آئے ہوں گے، اور وہی 'شودر' کہلائے ہوں گے، چنانچہ اب تک بھی ان کی صورتیں کہے دیتی ہیں کہ وہ کسی اور بدن کی ہڈی ہیں۔ (آبِ حیات، صفحہ ۷)

(ہ) اسی طرح جن شاعروں کا ذکر آئندہ کرنے والے ہیں، ان کے کلام کی خصوصیات جب خلاصہ کے طور پر پہلے بیان کرتے ہیں تو وہاں بھی وہی پروازِ خیال دکھاتے ہیں۔ 'آبِ حیات' کے ہر دور کی تمہید میں اس طرح کے فقرے لکھے ہیں۔ مثلاً ''دورِ سوم'' پر تنقید کرتے ہیں:۔

''تم دیکھنا، وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے، آسمان سے تارے اتاریں گے، قدردانوں سے فقط داد نہ لیں گے، پرستش لیں گے۔ لیکن نہ وہ پرستش کہ سامری کی طرح عارضی ہو۔ ان کے کمال کا دامن قیامت کے دن سے بندھا پاؤ گے۔ یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے، مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم، یا تصویر پر آئینہ۔ ان کا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ لطف زیادہ کرے گا، اس کی خوبی پر پردہ نہ

ہوگا۔ تم میرؔ صاحب اور خواجہ میر دردؔ کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے، سوداؔ کا کلام باوجود بلندی مضمون اور چستی بندش کے تاثیر کا طلسم ہوگا۔'' (آبِ حیات، تمہید دورِ سوم)

یہ اسلوبِ تحریر نہایت دلچسپ، لطیف اور پُر تاثیر ہے۔ اور محاکات پیدا کرنے کا بالکل صحیح طریقہ۔ لیکن یہ بھی ''خیالستانِ آزادؔ'' کے جلوے ہیں، کوئی اور مصنف اس طرح نہیں لکھتا۔ آزاد کی ایجاد ہے۔

(۵) علامہ آزادؔ کی تحریر پر فارسی نثر کی کتابوں میں سے 'گلستانِ سعدی' کی طرزِ تحریر کا اثر ہے۔ 'سخندانِ فارس' میں ایک جگہ 'گلستان' کا ذکر لکھتے ہیں:-

'' عجائباتِ اتفاق سے یہ ہے کہ اسی صدی کے ۶۵۶ھ میں شیخ سعدی کی زبان پر جوشِ طبیعت نے ایک چشمہ کھول دیا۔ اس میں فصاحت نے شربت اور سلاست نے دودھ بہایا، اور 'گلستان' ایک ایسی کتاب سر سبز ہوئی جس کا آج تک جواب نہیں...... چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں، اور کُتری کُتری عبارت ہے، مگر خدا نے اس کے بیان میں جو گھلاوٹ اور زبان میں ایسا لوچ دیا ہے کہ ریشم کے لچھے مسلسل معلوم ہوتے ہیں۔ صنائع و بدائع کی دستکاری نے اسے قلم نہیں لگایا، مگر سادگی کے منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ اس کے ننھے ننھے فقرے آیت اور حدیث کی طرح اب تک تقریروں اور تحریروں کو قوت دیتے ہیں، مزا یہ ہے کہ جو چٹخارہ زبان کو نظم پڑھنے میں آتا ہے وہ اس کی نثر میں آتا ہے کیونکہ اس کی قدرتی فصاحت نظم و نثر کو ایک قالب میں ڈھالتی ہے۔ (سخندانِ فارس، تیسرا لیکچر صفحہ ۶۳)

اگرچہ آزادؔ کی زبان کو صنائع و بدائع کی دست کاری نے قلم لگایا ہے، پھر بھی منھ سے پھول جھڑتے معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ آزادؔ کے فقرے 'گلستان' کے فقروں کی طرح تقریروں اور تحریروں کو قوت نہیں دیتے، تاہم ان کے پڑھنے میں زبان کو نظم کا سا چٹخارہ ملتا ہے۔

یہی وصف طرزِ آزادؔ کی سب سے بڑی خصوصیت اور بالکل انفرادی شان ہے، جس میں کوئی دوسرا مصنف ان کا شریک نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، تشبیہ و استعارے کی لطافت و برجستگی، بیان کی سلاست و روانی، الفاظ کی شیرینی اور موسیقیت، سب مل کر سادگی و پُرکاری کا عجیب و نادر نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اور یہ اسلوب علامہ آزادؔ کی

ہر تحریر میں موجود ہے۔ اسی کو سہلِ ممتنع کہتے ہیں کہ بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن لکھ کر دیکھئے تو صفحے دو صفحے لکھنے مشکل ہیں۔ آزاد اسی اسلوب کے بیان کے سبب سے صاحب طرز کہلاتے ہیں۔ مذکور بالا سب چھوٹی بڑی عبارتیں اس کے نمونے ہیں۔ ان کے علاوہ اور نمونے آزاد کی تصانیف کے سلسلے میں آئندہ آتے ہیں۔

طرزِ آزاد کا نقص: علامہ آزاد نے مختلف موضوعوں پر کتابیں لکھی ہیں۔ خیالی و تمثیلی مضامین (نیرنگِ خیال)، تذکرۂ شعراء (آبِ حیات)، تاریخ و سیرت (دربارِ اکبری)، فلسفۂ زبان (سخندانِ فارس)، تاریخی کہانیاں (قصص ہند) وغیرہ۔ ان میں سے ہر موضوع کے لیے الگ اسلوبِ بیان ہوتا ہے، لیکن آزاد نے ہر تصنیف اپنے خیالی رنگ میں لکھی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ واقعات جو تشبیہ و استعارہ میں بیان کیے گئے، وہ اگر صحیح و اصلی تھے، تب بھی ان میں فسانہ کا رنگ آ گیا۔ اور درست و واقعی تنقید بھی جب مبالغہ کے انداز میں لکھی گئی تو خیالی ہو گئی۔ ان کی 'آبِ حیات' میں 'نیرنگِ خیال' کا لطف ہے، اور 'دربارِ اکبری' میں 'قصص ہند' کا مزہ۔ اسی لیے کہیں کہیں آزاد کی تحقیق تحقیق نہیں معلوم ہوتی، اور تنقید تنقید نہیں رہتی۔ لیکن کچھ نہ رہنے پر بھی انشا پردازی کا عجیب لطف و اثر رہتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ آزاد کے متعلق علامہ شبلی کی یہ رائے ہے:-

"آزاد کی کتاب آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں، تاہم ادھر ادھر گپیں ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔"

آزاد کی طبیعت کا عجیب خاصہ: علامہ آزاد مورخ بھی ہیں اور نقاد بھی۔ اور مورخ و نقاد کا پہلا فرض صداقت، انصاف اور بے تعصبی ہے، لیکن آزاد کی یہ عجیب عادت ہے کہ اپنی رائے کی تائید میں، یا اپنے مفروضات کو ثابت کرنے کے لیے یا اپنے پسندیدہ یا ناپسندیدہ شخص کی مدح و ذم کی خاطر، کبھی واقعات فرض کر لیتے ہیں، کبھی خلاف واقعہ نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ اس کام کے لیے اسلوب بیان بڑا دلچسپ و عجیب اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کے حالات بیان کر رہے ہیں، اس کے جملہ محاسن و فضائل نہایت عقیدت و ارادت سے لکھتے ہیں گویا بے تعصبی کے ساتھ انصاف کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن لکھتے لکھتے

کبھی درمیان میں، کبھی آخر میں چٹکی لے لیتے ہیں۔ 'آبِ حیات' اور 'دربارِ اکبری' میں اس کا زیادہ موقع تھا۔ وہیں یہ باتیں خوب نظر آتی ہیں۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ 'دربارِ اکبری' تو صرف اسی غرض سے لکھی گئی ہے۔ یہ تمام کتاب ملاّ عبدالقادر بدایونی کی تصنیف 'منتخب التواریخ' پر مبنی ہے۔ بلکہ ملا صاحب کی تضحیک و تردید کے لیے لکھی گئی ہے۔ علامہ آزاد کو اکبر بادشاہ کی ذات اور حکومت سے کوئی خاص تعلق و ہمدردی نہیں، اس کے اس لیے مداح ہیں کہ وہ ابوالفضل، فیضی، خانخاناں وغیرہ کا قدر دان ہے۔ اور چونکہ ملا عبدالقادر نے مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر فیضی وغیرہ کی زمانہ سازی و اسلام کشی کو صداقت اور جوشِ اسلامی کے ساتھ بیان کیا ہے، اس لیے آزاد ملاّ صاحب سے بیزار ہیں۔ آزاد کی تصنیف سے چند مثالیں یہ ہیں:۔

(۱) 'آبِ حیات' دورِ سوم میں حضرت میرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کی جو مذمت آزاد نے کی ہے وہ صفحہ ۱۳۶ و ۱۳۸ پر درج ہے۔

(۲) 'آبِ حیات' دورِ پنجم میں شاہ نصیر دہلوی کے حسنِ اعتقاد کے سلسلے میں آزاد نے جو کچھ لکھا ہے اس سے آزاد کا حسنِ ظن اور حسنِ بیان مترشح ہے۔

(۳) 'آبِ حیات' کی اشاعت اول میں آزاد نے حکیم مومن خاں دہلوی کا حال اپنی ذاتی رنجش و کدورت کے سبب سے دانستہ ترک کر دیا تھا، ورنہ خلاف قیاس ہے کہ جب علاّمہ آزاد ۲۵ برس تک دہلی میں رہے تھے، مومن خاں کو دیکھا تھا، اور ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی تھی، ان کا کلام ان کی زبان سے سنا تھا، تو ان کے حالات سے اتنی آگاہی نہ ہوتی کہ 'آبِ حیات' کے لیے ان کا تذکرہ مرتب کر سکتے۔

(۴) 'دربارِ اکبری' میں علاّمہ آزاد ہر موقع پر ملاّ عبدالقادر بدایونی کو لعن وطعن کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں کہ دل کا بخار نکالنے کے سوا کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا۔ مثلاً مُلاّ صاحب نے ابوالفضل کے حال میں ایک جگہ لکھا ہے:۔

"وتفسیر آیت الکرسی کہ دقائق و نکاتِ قرآنی دراں خیلے درج شدہ و می گویند کہ تصنیف والدش بود گذرانیدہ، عزوتحسین یافت و "تفسیرِ اکبری" تاریخ آں شد۔" (منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۹۸)

اس پر علاّمہ آزادؔ'دربارِ اکبری' (صفحہ ۴۹۳) ملاّ عبدالقادر کے متعلق لکھتے ہیں:-

''مگر روئے حسد سیاہ، تفسیرِ اکبری پیش کرنے کا حال اپنی کتاب میں لکھا بھی تو شوشہ لگا دیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے باپ کی تصنیف ہے۔ اچھا یہ ہی ہے تو اس کے باپ کا مال ہے۔ آپ کے باپ کا تو نہیں۔ اس کا باپ تو ایسا تھا، تمھارا تو باپ بھی ایسا نہ تھا۔''

یہ ایک مثال ہے جس کے نمونوں سے 'دربارِ اکبری' بھری پڑی ہے۔

دیوانِ ذوق میں آزادؔ لکھتے ہیں:-

۱۸۴۵ء میں نواب اصغر علی خاں کے ہاں رامپور کے بعض خوانین آئے۔ بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ کیا تھا۔ اصغر علی خاں مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ انھیں ساتھ لے کر استاد مرحوم (ذوقؔ) کے پاس آئے۔ اور بڑے اصراروں سے مشاعرہ میں آنے کا اقرار لیا..... ملاقات مذکورہ بالا کی باتوں میں استاد نے یہ بھی بیان کیا کہ مومنؔ خاں نے مجھ سے کہا، کچھ ان دنوں کا کہا ہوا سنایئے، مدّتیں گذر گئیں آپ کے منھ سے کچھ نہیں سنا۔ میں نے کہا، حضور کی غزلیں فرصت کہاں دیتی ہیں؟ پھر کہا، پھر کہا، خیر میں نے دو شعر سنا دیے، جو انھیں دنوں میں ہوئے تھے:-

خط بڑھا ، کاکل بڑھے، زلفیں بڑھیں ، گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے
بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے دل
اب مناسب ہے یہی ، کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

والد نے کہا، انھوں نے بھی کچھ سنایا؟ فرمایا نہیں، یہی کہتے رہے، نجوم کا مرض ایسا لگا ہے کہ ایک دم مفارقت نہیں کرتا، دل نہیں لگتا، چرچا جاتا رہا، وغیرہ وغیرہ۔ اس بیان سے بندہ آزادؔ کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا کہہ نہ سکتے تھے، بے شک ان کے دیوان میں کئی ایسے مطلع موجود ہوں گے، مگر تخن سنج نکتہ شناس تھے۔ ساتھ اس کے عاشق معشوق مزاج تھے۔ ایک ایسا شعر کہ مطلع ہو، اور اس میں اثباتِ مضمون ہم گواہوں سے قائم ہو۔ اس پر غزلیت کے اوصاف سے متصف۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسے سن کر جو پڑھتے تو اسی رتبہ کا مطلع پڑھتے، وہ زبان پر نہ دھرا تھا، اور وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے کہ شعر سنا اور شعر خوانی شروع کر دی۔ بات کو سمجھتے تھے اور محل و مقام پہچانتے تھے۔''

دیکھیے علامہ آزاد کس قدر خوبصورت طریقے سے مومن خاں کی تنقیص کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ مدح کر رہے ہیں۔

آزاد کی سخن سنجی: عجیب بات یہ ہے کہ علاّمہ آزاد نثر کے لفظوں اور فقروں، ترکیبوں اور بندشوں کے تناسب و ترنم اور صفائی و سلاست کے متعلق، اور تخئیل وطرزِ ادا کے لحاظ سے جس قدر ذوق صحیح اور طبع سلیم رکھتے تھے، نظم کی لفظی و معنوی خوبیوں میں اس کے بالکل برعکس مذاق پایا تھا۔ ان کے خواص طبیعت کے سلسلے میں اس کی بعض مثالیں دیکھیے:-

(۱) اوپر کی مثال میں ذوقؔ کے مطلع کی اس قدر تحسین خود آزاد کی سخن سنجی کی داد دے رہی ہے، اہلِ ذوق جانتے ہیں کہ اس مطلع کا اُردو شاعری اور صنف غزل میں کوئی مرتبہ نہیں۔ یہ مضمون اور اس کے اثبات کے چاروں گواہ نہ شاعری کا شاہکار، نہ ذوقؔ کا کارنامہ۔

(۲) آزاد نے 'آبِ حیات' پہلے لکھی ہے، دیوانِ ذوق اس کے ایک عرصہ کے بعد مرتب کیا ہے۔ دیوان کی بعض غزلوں میں آزاد نے تصرّف کیا ہے۔ اس کی توجیہہ دیوان کے آغاز ہی میں کرتے ہیں:-

> ''ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔ صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے، دیوان مرجبہ میں کچھ چھپے، اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سنے، کبھی کچھ بنے۔ پھٹے پرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا۔ کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا، مٹے حرفوں کا اجالنا، اُس زمانے کے خیالات کو سمیٹنا، حالتوں کا تصور باندھنا، بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا، میرا کام نہ تھا۔ خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل حال تھی۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح ہو گئیں اور دن اندھیرے ہو گئے۔ جب یہ مہم سرانجام ہوئی ہے۔''

یعنی علامہ آزاد کے جو کچھ جی میں آیا، اور جہاں جیسا مناسب سمجھا، لکھ دیا۔

آزاد کے مرتبہ ''دیوان ذوق'' میں جو غزلیں دیوان مروجہ سے علیحدہ ہیں، ان

کے متعلق تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن جو غزلیں خود آزاد 'آبِ حیات' میں درج کر چکے تھے، ان کو دیوان میں درج کرتے وقت جو حک و اصلاح کی ہے، اس سے آزاد کے ذوقِ سخن کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً 'آبِ حیات' میں ذوق کا مطلع ہے:-

مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

اس کو آزاد نے دیوان ذوق میں اس طرح لکھا ہے:-

مزے تو دل کو ملے تھے، ہوئے زباں کے لئے پہ ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

ذوقِ سلیم جانتا ہے کہ آزاد کے تصرّف نے دونوں مصرعوں کو سست اور مضمون کو پست کر دیا۔

اسی غزل کا ایک اور شعر 'آبِ حیات' میں یوں ہے:-

الٰہی کان میں کیا اس صنم نے پھونک دیا کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے

اور دیوان میں اس طرح:-

الٰہی کان میں ہے کیا صنم نے پھونک دیا کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے

اس ترمیم میں دو عیب پیدا ہو گئے، ایک بندش کا ایک مضمون کا۔ اور تعجب ہے کہ آزاد کی نظر ان پر نہ پڑی۔ پہلے مصرع میں (ہے) کا لفظ آنے سے تعقید پیدا ہو گئی، جب کہ (ہے) کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ پہلی صورت میں (اُس صنم) سے اپنے محبوب کی تخصیص میں بہت لطف تھا جو دوسری صورت کی عمومیت سے جاتا رہا۔

اسی غزل کا ایک اچھا خاصا شعر تھا:-

نہیں ہے خانہ بدوشوں کو حاجتِ ساماں اثاثہ چاہئے کیا خانۂ کماں کے لئے

اس کو آزاد نے اس طرح بدل کر مہمل کر دیا:-

قدِ خمیدہ پر اپنے ہیں بال زیب وبال اثاثہ کچھ تو رہے خانۂ کماں کے لئے

استاد ذوق کے بہت سے اشعار میں اس طرح کے تصرّفات کیے ہیں۔

(۳) آزاد خود اپنی نظموں میں بھی جا بجا تعقید کا عیب پیدا کر دیتے ہیں۔ آزاد کی

نظم (شام کی آمد اور رات کی کیفیت) کے بعض شعر دیکھئے:۔

زاہد مراقبے کا ہے دم سب کو دے رہا — اور آپ مارے نیند کے جھونکے ہے لے رہا
سونے کو مہر بھی ہے بہ خواب عدم گیا — دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا
دل دے رہا جو شیر محبت کے جام ہے — ماں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے

اولیات آزاد۔ آزاد کا مرتبہ: آزادان ''خدا ساز'' ہستیوں میں تھے جن کو دنیائے زبان و ادب میں ''پیغمبر'' بنا کر بھیجا جاتا ہے۔ ان کا ذہن زبان و محاورہ، الفاظ و بندش کے انتخاب کے متعلق صحیح توازن و تناسب رکھتا تھا، اور ان کی طبیعت میں ندرت آفرینی و جدت طرازی اعلیٰ درجے کی تھی۔ زبان و بیان کی شیرینی و نرمی میں کوئی ادیب ان کا شریک نہیں ہے۔

اس لیے آزاد اپنے زمانے کے پہلے صاحب طرز ہیں۔ آزاد کے طرز کو شاعرانہ و عاشقانہ زبان میں بیان کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ آزاد تنہا ''طرحدار'' ادیب ہیں۔ ان کی تحریر کا بانکپن، سچ یہ ہے کہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ گویا ''مزے یہ دل کے لئے ہیں، نہیں زبان کے لئے۔''

اسی جدت پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ علامہ آزاد نے طرزِ عبارت کی ایجاد کے علاوہ مضامین و موضوعات کی ترتیب و تالیف میں وہ جدتیں پیدا کیں جو ان سے پہلے موجود نہ تھیں، اور یہ اولیات آزاد ہیں، مثلاً

(۱) شعراء کے تذکرے آزاد سے پہلے بھی بہت لکھے گئے، لیکن سب نہایت مختصر تھے، اکثر میں حروف تہجی کی ترتیب تھی، کسی میں زمانے کی تقدیم و تاخیر کا لحاظ رکھا گیا تو مجمل اور سرسری طور پر، کسی میں حالات و کلام کے متعلق تحقیق و تفصیل نہ تھی، مقابلہ و موازنہ نہ تھا، زبان و محاورہ اور طرزِ کلام کا تجزیہ اور ارتقاء نہ تھا۔

آزاد کو سب سے پہلے ان اجزاء و لوازم تالیف کا خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے 'آبِ حیات' میں یہ سب خامیاں رفع کر دیں۔ اور ایسی کتاب لکھ دی کہ آج بھی کوئی تذکرہ نویس 'آبِ حیات' کے استفادے سے بے نیاز نہیں ہے۔ پھر اس میں اگر کچھ غلط بیانیاں

اور بیجا طرفداریاں بھی ہوں تو ان سے آزاد کے فضلِ تقدم اور 'آبِ حیات' کی اولیت میں فرق نہیں آتا۔

(۲) زبان کی ساخت اور ارتقا کے متعلق آزاد کی 'سخندانِ فارس' اور 'مقدمہ آبِ حیات' سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آزاد کی زباندانی، شوقِ تحقیق اور قوت ایجاد نے اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی تصانیف پیدا کردی ہیں۔

(۳) رمزیہ اور تمثیلی مضامین اور ان کے اسالیب نگارش کا اس قدر تنوع اور ایسا کمال آزاد کے 'نیرنگِ خیال' سے پہلے نظر نہیں آتا۔ آزاد نے اس پیرایہ میں مسائل مذہبی و علمی و ادبی کی تحقیق بھی کی ہے اور نقد و تبصرہ بھی۔ طعن و طنز بھی کیا ہے اور اخلاق بھی سکھائے ہیں۔

(۴) اگرچہ مولانا شبلی کی تاریخ و سیرت کی تصانیف 'الفاروق' وغیرہ کے سبب سے علامہ آزاد کی 'دربارِ اکبری' کو اولیت کا درجہ حاصل نہیں ہے، تاہم تاریخ میں ادبی شان پیدا کرنا اور افسانہ و ناول سے زیادہ دلچسپ بنادینا آزاد ہی کا پہلا کمال ہے۔ خصوصاً اکبر بادشاہ کے حالات خاص اہتمام سے لکھے ہیں، اگرچہ آزاد نے اکبر کی بیدینی اور علماء کی توہین کو بہت سراہا ہے۔

اس لحاظ سے آزاد کا درجہ موجد کا بھی ہے، نقاد کا بھی، صاحب طرز کا بھی۔ آزاد سب سے پہلے انشا پرداز ہیں، پھر مورخ، تذکرہ نویس، سیرت نگار، ان کی تحقیق و تنقید سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن ان کی انشا پردازی سے انکار نہیں ہوسکتا۔ اس لیے بقائے دوام کے اعتبار سے آزاد بحیثیت انشا پرداز کے زندہ جاوید ہیں۔ زبان و بیان کی دلکشی میں ان کی ہر کتاب سدا بہار گلزار ہے، مطالعہ و حوالہ کے لیے ان کی ہر کتاب مفید و ضروری ہے۔ لیکن تحقیق و تنقید کی نظر میں ان کی ہر کتاب پرانی ہوچکی ہے۔ 'آبِ حیات' کے نظریے بدل چکے ہیں اور بہتر تبصرے لکھے جاچکے ہیں۔ 'سخندانِ فارس' کے تجزیے اور تقریظیں اب قول فیصل نہیں رہیں۔ 'دربارِ اکبری' تاریخ کے طالب علموں اور استادوں کے لیے پہلے بھی کچھ عجوبہ نہ تھی، اب تو بہت بااصول، مفصل اور مکمل تاریخیں موجود ہیں۔

'نگارستانِ فارس' (تذکرہ شعرائے فارسی) صرف آزاد کے شغف و عشق فارسی کا ایک چھینٹا ہے۔ لیکن اتنا ہلکا پڑا ہے کہ خود آزاد کی تالیفات میں بھی اس کا کوئی درجہ نہیں۔ قدیم تذکرات، تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی، آتشکدۂ آزر، سرد آزاد وغیرہ کے مقابلے میں بھی کچھ نہیں ہے، چہ جائیکہ مولانا شبلی اور پروفیسر براؤن کی تالیفات سے مقابلہ ہو سکے۔ 'نیرنگ خیال' آزاد کی دوسری کتابوں سے زیادہ دیرپا ہے اس لیے کہ یہ نہ تاریخ ہے، نہ تذکرہ، نہ سیرت، نہ فلسفہ زبان، بلکہ صرف انشا ہی انشا ہے۔ اگرچہ یہ طرز رمز و تمثیل مقالہ نگاری کی صورت میں رائج نہیں ہے۔ لیکن یہ شانِ مجاز اور مصرف استعارہ شعر و ادب کا جزوی عنصر ہے۔ اور اب بھی فسانے اور ناول، مزاحیات و طنزیات، بلکہ تنقیدیں اور تبصرے اور ادبیات و عملیات بھی نیرنگِ خیال کے رنگ تحریر کے نمونے ضمنی و جزئی طور پر اپنے اندر رکھتے ہیں۔

علامہ آزاد جدید شاعری کے پیش رو ہیں، اور جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے یہ چیز ان کی اولیات میں شامل ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا تذکرہ و تبصرہ ہماری کتاب کے ''حصہ نظم'' کا حق ہے۔

تصانیفِ آزاد کے نمونے: علامہ آزاد کی مختلف تحریروں کے بہت سے چھوٹے بڑے نمونے پہلے پیش کیے جا چکے ہیں، وہ سب آزاد کے اسلوب خاص کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ تاہم ان کی تمام تصنیفات سے ایک ایک دو اقتباس ایسے پیش کیے جاتے ہیں، جن سے آزاد کی انشائے خصوصی کے علاوہ، مختلف مضامین و موضوعات میں ان کا طرزِ بیان اور قوت تحریر بھی نظر کے سامنے آ جائے۔

(۱) 'آبِ حیات' کا مقدمہ کافی طویل لکھا ہے، جو خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ''بھاشا پر فارسی کا اثر'' بھی دکھایا ہے۔ ایک جگہ اس مضمون کو بیان کرتے ہیں کہ ''ہند کی تشبیہیں جاتی ہیں، فارسی اور عرب کی تشبیہیں اور خیالات ان کی جگہ قابض ہو گئے۔''

دونوں زبانوں کے باب تشبیہات میں ایک نکتہ کے بغیر جھ سے آگے نہیں بڑھا جاتا۔ یعنی مختلف افراد

انسان کے طبائع پر غور کرو کہ ہزاروں کوس پر پڑے ہوں، اور مختلف طبیعت کے ملکوں میں ہوں، لیکن چونکہ طبیعت انسانی متحد ہے، اس لئے دیکھو ان کے خیالات کس قدر ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بالوں کی تعریف میں ناگوں کے لہرانے اور بھونروں کے اڑنے سے تشبیہ دیتے تھے، فارسی میں زلف کی تشبیہ سانپ کے ساتھ آئی ہے، مگر بھونرے اڑ گئے، اور اس کی جگہ مشک، بنفشہ، سنبل، ریحاں آگئے۔ جو کبھی یہاں دیکھے بھی نہیں۔ مگر عرب کا سادہ مزاج فصیح اپنی نیچر کا حق ادا کرتا ہے، اور زلف کو کویلے سے تشبیہ دیتا ہے۔ سانولی رنگت کی تعریف میں شام برن اور میگھ برن کہتے تھے، اس سے کھلتا رنگ ہوتا تو چنبک برنی کہتے تھے، اب سمن رنگ اور سیم رنگ کے الفاظ حسن کی بہار دیتے ہیں، مگر چندر مکھ اور ماہ رخ مشترک ہے۔

آنکھ کی تعریف میں یہاں مرگ کی آنکھ اور کنول کے پھول اور ممولا کی اچپلاہٹ سے تشبیہ دیتے تھے، اُردو میں آہو چشم رہے مگر ممولے ہوا ہو گئے اور کنول کی جگہ ساغر لبریز اور نرگس شہلا آگئی جو کسی نے یہاں دیکھی بھی نہ تھی، بلکہ ترک چشم، شمشیر نگاہ سے قتل کرنے لگے۔

رفتار کے لئے بھاشا میں ہتنی اور ہنس کی چال ضرب المثل ہے۔ اب ہنس کے ساتھ ہاتھی بھی اُڑ گیا۔ فقط کبک دری، شورِ محشر اور فتنۂ قیامت نے آفت برپا کر رکھی ہے۔

پھر فارسی، اُردو اور ہندی کی انشاپردازی کا حال بیان کرتے ہیں۔ ایک طویل مضمون درمیان سے کچھ حذف کر کے آزاد ہی کے الفاظ میں مسلسل کر کے لکھا جاتا ہے:۔

فارسی اور اُردو کی انشاپردازی میں جو دشواری ہے، اور ہندی کی انشا میں آسانی ہے، اس میں ایک باریک نقطہ غور کے لائق ہے۔ وہ یہ ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے، اس کی کیفیت ہمیں اس خدوخال سے سمجھاتی ہے جو خاص اسی شے کے دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے، یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش وخروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی، مگر سننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا وہ سننے سے آجاتا ہے۔ برخلاف شعرائے فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں، صاف اسی کی برائی یا بھلائی نہیں دکھاتے، بلکہ اسی کے مشابہ ایک اور شے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا برا سمجھا ہوا ہے، اس کے لوازمات کو شے اول پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں۔ مثلاً پھول کی نزاکت رنگ اور خوشبو میں معشوق سے مشابہہ ہے، جب گرمی کی شدت میں معشوق کے حسن کا انداز

دکھانا ہو تو کہیں گے کہ مارے گرمی کے پھول کے رخساروں سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے لگا۔ اور اسی رنگ میں شاعر کہتا ہے۔ خواجہ وزیر وزیر:-

ہوں وہ بلبل جو کرے ذبح خفا تو کر   روح میری گلِ عارض میں رہے بو ہو کر

یہ تشبیہیں اور استعارے اگر پاس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے، لیکن اگر دور جا پڑیں اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقت ہوتی ہے۔

ان خیالی رنگینیوں اور فرضی لطافتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو باتیں بدیہی ہیں اور محسوسات میں عیاں ہیں ہماری تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں آ کر وہ بھی عالم تصور میں جا پڑتی ہیں کیونکہ خیالات کے ادا کرنے میں ہم اول اشیائے بے جان کو جاندار بلکہ انسان فرض کرتے ہیں، بعد اس کے جانداروں اور عاقلوں کے لئے جو باتیں مناسب حال ہیں، ان بے جانوں پر لگا کر ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں جو اکثر ملک عرب، یا فارس یا ترکستان کے ساتھ قومی یا مذہبی خصوصیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لئے اس قدر تعریف پر قناعت نہیں کرتے کہ وہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطوئے ثانی ہے۔ بلکہ بجائے اس کے کہتے ہیں کہ اگر اس کا ہُمائے عقل اوج اقبال سے سایہ ڈالے تو ہر شخص کشور دانش و دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے۔ بلکہ اگر اس کے سینے میں دلائل عقلی کا دریا جوش مارے تو طبقۂ یونان کو غرق کر دے۔ اول تو ہُما کی یہ صفت خود ایک بے بنیاد فرض ہے، اور وہ بھی اسی ملک کے ساتھ ہے جس پر اقبال کا ایک فلک الافلاک تیار کرنا، اور اس پر نقطۂ اوج کا دریافت کرنا دیکھئے، وہاں ان کے فرضی ہُما کا جانا دیکھئے پھر زمین پر اس خیالی آسمان کے نیچے ایک تدبیر کا یونان بسانا دیکھئے، پھر اس فرضی ہُما کی برکت کا اس قدر عام کرنا دیکھئے، جس سے دنیا کے جاہل اس خیالی یونان میں جا کر ارسطو ہو جائیں۔

بھاشا کا فصیح استعارہ کی طرف بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ جو جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے، اور جن خوش آوازیوں کو سنتا ہے، یا جن خوشبوؤں کو سونگھتا ہے، انہی کو اپنی میٹھی زبان سے بے تکلف بے مبالغہ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ہندوستان میں مبالغہ کا زور تھا ہی نہیں۔ سنسکرت کا انشا پرداز ذرا بگڑ جائے تو زمین کے ماتھے پر پہاڑ تیوری کے بل ہو جائیں، اور دہانِ غار پتھروں سے دانت پیسنے لگیں۔

'آبِ حیات' میں شاعروں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ خصوصاً شاعرانہ نوک جھونک، ذاتی رنجشیں اور سیرت و اخلاق کے لطیفے کوشش و تلاش سے درج کیے ہیں۔ ان میں ایسی باتیں بھی ہیں جو علامہ آزاد نے کتابوں سے دیکھ کر لکھی ہیں، اور ایسی بھی جو ان کو اپنے استاد یا بزرگوں سے سینہ بسینہ پہنچی ہیں۔

شیخ قلندر بخش جرأت کے حال میں لکھتے ہیں:۔

جرأت، میاں جعفر علی حسرت (۱) کے شاگرد تھے۔ علاوہ فنِ شاعری کے نجوم میں ماہر تھے، اور موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے۔ چنانچہ ستار خوب بجاتے تھے۔ اول نواب محبت خاں خلف حافظ رحمت خاں نواب بریلی کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ میر انشاء اللہ خاں کی اور ان کی صحبتیں بہت گرم رہتی تھیں، چنانچہ حسب حال یہ شعر کہا:۔

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ ایک دفعہ تنخواہ کو دیر ہوئی، حسنِ طلب میں ایک غزل کا مقطع لکھا:۔

جرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم

کہ خدا دیوے نہ جب تک تو سلیماں کب دے

فارسی کی ضرب المثل ہے، "تا خدا ندہد سلیماں کے دہد۔"

میاں جرأت کے حال میں، بلکہ ساری کتاب میں افسوس کی بات تو یہ ہے کہ عین جوانی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حادثہ چیچک سے ہوا، مگر استاد مرحوم (یعنی حضرت ذوق) نے ایک

---

(۱) اس پر آزاد خود ہی یہ حاشیہ چڑھاتے ہیں:۔ حسرت بھی نامی شاعر تھے، مگر اصلی پیشہ عطاری تھا۔ دیوان موجود ہے، پھیکے شربت کا مزہ آتا ہے۔ مرزا رفیع (یعنی سودا) نے انہی کی شان میں غزل کہی ہے، جس کا مطلع ہے:۔

بہدانہ کا آندھی سے اُڑا ڈھیر ہوا پر ہر مرغ اسے کھا کے ہوا سیر ہوا پر

اسی طرح ہجو کی آندھی میں ساری دکان کا خاکہ اُڑا دیا ہے۔" (حاشیہ آبِ حیات صفحہ ۲۲۶)

دن فرمایا کہ یہی زمانے کی دو آنکھیں ہیں۔ نیکی کی آنکھ نے ان کے کمال کو بڑی قدر دانی سے دیکھا، بدی کی آنکھ نہ دیکھ سکی، اور ایک بدنما داغ ان کے دامن پر دکھایا۔ مشہور کرتے ہیں کہ پہلے وہ اصلی اندھے نہ تھے۔ بعض ضرورتوں سے کہ شوخی عمر کا مقتضیٰ ہے، خود اندھے بنے، رفتہ رفتہ اندھے ہی ہو گئے۔

تفصیل اجمال بہ عبرت احوال۔ بزرگوں کا قول ہے کہ شرافت ونجابت غریبی پر عاشق ہے، دولت اور نجابت آپس میں سوکن ہے۔ یہ حق ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ شرافت کے اصول و آئین غریبوں سے ہی خوب نبھتے ہیں۔ امارت آئی، قیامت آئی۔ دولت آئی شامت آئی۔ میاں جرأتؔ کی خوش مزاجی، لطیفہ گوئی، مسخرہ پن کی حد سے گزری ہوئی تھی۔ اور ہندوستان کے امیروں کو نہ اس سے ضروری کوئی کام، نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت۔ کہتے ہیں مرزا قتیلؔ، سیّد انشاؔ کا اور ان کا یہ حال تھا کہ گھر میں نہ رہنے پاتے تھے۔ آج ایک امیر کے ہاں ہیں، دوسرے دن دوسرے امیر آئے، سوار کیا اور ساتھ لے گئے۔ ۴، ۵ دن وہاں رہے، کوئی اور نواب آئے وہاں سے وہ لے گئے۔ جہاں جائیں آرام و آسائش سے زیادہ عیش کے سامان موجود، رات دن قہقہے اور چہچہے۔ ایک بیگم صاحب نے گھر میں ان کے چٹکلے اور نقلیں سنیں، بہت خوش ہوئیں، اور نواب صاحب سے کہا ہم بھی باتیں سنیں گے۔ گھر میں لاکر کھانا کھلاؤ۔ پردے یا چلمنیں چھٹ گئیں۔ اندر وہ بیٹھیں، باہر یہ بیٹھے چند روز کے بعد خاص خاص بی بیوں کا برائے نام پردہ رہا، باقی گھر والے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یگانگی کی یہ نوبت ہوئی کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں۔ گھر میں کوئی دادا، نانا، کوئی ماموں، چچا کہتا۔ شیخ صاحب کی آنکھیں دکھنے آئیں۔ چند روز ضعفِ بصر کا بہانہ کر کے ظاہر کیا کہ آنکھیں معذور ہو گئیں۔ مطلب یہ تھا کہ اہل حسن کے دیدار سے آنکھیں سکھ پائیں۔ چنانچہ بے تکلف گھروں میں جانے لگے۔ اب پردہ کی ضرورت کیا؟ یہ بھی قاعدہ ہے کہ میاں بیوی جس مہمان کی بہت خاطر کرتے ہیں نوکر اس سے جلنے لگتے ہیں۔ ایک دن دوپہر کو سو کر اُٹھے۔ شیخ صاحب نے لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھر لا۔ لونڈی نہ بولی۔ انھوں نے پھر پکارا۔ اس نے کہا بیوی جاءِ ضرور میں لے گئی ہیں۔ ان کے منھ سے نکل گیا کہ ''غیبانی دوانی ہوئی ہے، سامنے تو رکھا ہے، دیتی کیوں نہیں؟'' بیوی دوسرے دالان میں تھیں۔ لونڈی گئی اور کہا کہ ''وُ دی بیوی یہ موا کہتا ہے کہ وہ بندہ اندھا ہے، یہ تو خاصا سجھا ہے، ابھی میرے ساتھ یہ واردات گذری۔'' اس وقت یہ راز کھلا۔ مگر اس میں شبہ نہیں کے آخر آنکھوں کو رو بیٹھے۔

مزن فال بد کا ورد حال بد مبادا کسے کو زند فال بد

آزاد نے 'آبِ حیات' میں اپنے استاد ذوق کا حال سب سے طویل ۶۰ صفحوں میں لکھا ہے۔ ان کے ساتھ آزاد کی محبت و عقیدت کا حال پہلے بھی لکھا گیا ہے۔ اسی حسن ارادت کے ساتھ ہر بات کی تفصیل کی ہے۔ ابتدا اس طرح کرتے ہیں:-

ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق۔ جب وہ صاحب کمال ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہاں میں پھیلی، اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا، اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اُردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا، وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہم صفیر رہے نہ ہم داستاں رہے۔ نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اس زبان کے لیے ٹکسال تھا وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر ہو گیا۔ اُمرا کے گھرانے تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے، وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں جو بات بات میں دلپسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانے کی فارغ البالی نے اس قسم کی ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں، وہ اور اصل کی شاخیں ہیں۔ انھوں نے اور پانی سے نشو و نما پائی ہے، وہ اور ہی ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں۔ پھر اس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ............ان کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے مگر کیا کروں، جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے، لیکن نہیں، اس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے پرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو، یہ کام کا نہیں، اور کونسی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا۔ جو بات ان کے سلسلہ حالات میں مسلسل ہو سکے گی، ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

چنانچہ آزاد نے استاد ذوق کے حالات کا ایک حرف نہیں چھوڑا۔ لیکن بعض باتیں بڑی عجیب لکھی ہیں۔ ایک یہ کہ بہادر شاہ ظفر اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کے کلام کو ذوق کا کہا ہوا بتایا ہے۔ بادشاہ کے کلام کے متعلق آزاد کا یہ دعویٰ مشہور ہے اور اس پر ردّ و قدح ہوچکی ہے۔ معروف کے متعلق آزاد لکھتے ہیں:۔

ان کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے، جس میں ردیف وار (۱۰۱) مطلع ہے، اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اسی رعایت سے اس کا نام "تسبیح زمرد" رکھا گیا۔ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پروئی تھی۔

دوسرے ذوق کے مذہب کو چھپایا ہے اور اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"فقراء اور بزرگانِ دین کے ساتھ انھیں ایسا دلی اعتقاد تھا کہ اس کی کیفیت بیان نہیں ہوسکتی، علماء اور اساتذہ سلف کو ہمیشہ بادب یاد کرتے تھے اور کبھی ان پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے۔ اس واسطے ان کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھلا۔"

حالانکہ آزاد کے والد اور استاد دونوں ہم عمر و ہم مکتب تھے، اور (بقول آزاد)

"وہ رابطہ ان کا عمروں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور اخیر وقت تک ایسا نبھ گیا کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا۔"

آزاد اکثر سارا سارا دن ذوق کی خدمت میں گذارتے تھے۔ ان کے وضو، نماز، وظیفے سب کا ذکر کیا ہے۔ اس پر بھی آزاد کو اور اہلِ دہلی کو ان کے مذہب کا حال نہ کھلا کہ سُنّی تھے یا شیعہ!!

حالاتِ ذوق کا ایک دلچسپ اقتباس یہ ہے:۔

"ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ اس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے۔ "شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت۔" چڑیاں سائبان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں، اور ان کے تنکے جو گرتے تھے، انھیں لینے کو بار بار ان کے پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی۔ انھوں نے ہاتھ سے اڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔ انھوں نے پھر اڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا تو ہنس کر کہا کہ اس غیابی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے۔ وہ نابینا ہیں۔ انھوں نے پوچھا

کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ وہ ہنس بولے کہ ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھتی۔ استاد نے کہا کہ بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ مُلا ہے، عالم ہے، حافظ ہے۔ ابھی اُحِلَّ لکُمُ الصَّیۡد کی آیت پڑھ کر کُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا بِسۡمِ اللہِ ا۔ للہُ اَکۡبَرۡ کر دے گا۔ دیوانی ہے جو تمھارے سر پر آئے۔"

استاد ذوقؔ کے کلام پر جو لوگ اعتراض کرتے تھے، ان کے ذکر میں آزاد لکھتے ہیں:۔

ایک دن میں اوجؔ (عبداللہ خاں اوجؔ) سے ملا اور استاد کے مطلع کا ذکر آیا:۔

مقابل اس رخ روشن کے شمع گر ہو جائے　　صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد راستے میں ملے اور دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا:۔

یاں جو برگِ گل خورشید کا کھڑکا ہو جائے　　دھول دستار فلک پر لگے تڑکا ہو جائے

اور کہا کہ دیکھا! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ طنز کرتے ہیں کہ "سحر ہو جائے" جو استاد نے باندھا ہے یہ جائز نہیں۔ مگر تجاہل کر کے میں نے کہا کہ ہاں حقیقت میں پات کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا۔ اور استعارہ میں لا کر! میری طرف دیکھ کر ہنسے، اور کہا کہ بھئی واہ، آخر شاگرد تھے، ہماری بات ہی بگاڑ دی۔

دوسرے دن میں استاد مرحوم کی خدمت میں گیا، اور یہ ماجرا بیان کیا، فرمایا کہ شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے تو اس گستاخی کی سزا میں صبا اسے ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے۔ اور ایسی بجھے کہ وہی اس کے حق میں سحر ہو جائے، یعنی روشنی نصیب نہ ہو۔ کبھی دوسری تیسری رات ہوئی ہوئی، نہوئی نہوئی، وہ اور بات ہے۔ اب یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا۔ خیر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی پیدا ہوا، بلکہ طرزِ بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا، قباحت کیا ہوئی۔ اور یہ بھی دیکھو، وہ محاورہ تھا تو کیا تھا۔ مبتذل، عامیانہ۔ اب ثقہ، متین اور شریفانہ ہے۔"

اس عبارت کا آخری فقرہ علامہ آزاد کی انشا پردازی کا دلچسپ نمونہ ہے۔ بظاہر استاد کی زبان سے اوجؔ کے مضمون کو سراہتے ہیں، لیکن دراصل طعن وطنز مقصود ہے، یعنی اوجؔ کا محاورہ "دھول لگنے سے تڑکا ہو جانا" مبتذل اور عامیانہ ہے۔ اس سے تو ذوقؔ ہی کا محاورہ "سحر ہو جانا" متین وثقہ تھا۔ لیکن حقیقت میں آزاد نے استاد کی طرف سے جو

جواب دیا ہے، وہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ جب ہماری زبان میں پہلے سے ایک محاورہ موجود ہے کہ ''ایسی ڈھول لگی کہ تڑ کا ہو گیا''، تو پھر اس محاورے میں تڑکے کا کوئی عربی و فارسی میں مترادف استعمال کرنا جائز نہیں۔ اگر ''ڈھول لگنے'' کا مضمون نہ ہوتا تو جو چاہتے کہتے۔ اب سحر ہو جانے کو ثابت کرنے کے لیے مضمون کو طول اور پیچ دینا، بات کی پیچ اور طولِ امل ہے۔

ذوقؔ کے حالات میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکان ضرور جاتے تھے۔ اور تین چار چلمیں حقہ کی وہاں پیتے تھے۔ میں چھٹی کے دن اس وقت جایا کرتا تھا، اور دن بھر وہیں رہتا تھا۔ مکانِ ضرور ڈیوڑھی میں تھا۔ پاؤں کی آہٹ پہچانتے تھے، پوچھتے تھے کہ تم ہو؟ میں تسلیم عرض کرتا، چھوٹی سی انگنائی تھی، پاس ہی چارپائی۔ وہیں بیٹھ جاتا، فرماتے، اجی ہمارا وہ شعر اس دن تم نے کیا پڑھا تھا؟ ایک دو لفظ اس کے پڑھتے۔ میں سارا شعر عرض کرتا۔ فرماتے، ہاں اب اسے یوں بنالو۔ ایک دن ہنستے ہوئے پائخانے سے نکلے۔ فرمایا کہ لو جی ۳۳ برس کے بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ حافظ ویرانؔ نے کہا، حضرت کیونکر؟ فرمایا، ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے۔ اس میں مصرع تھا ''کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ۔'' ابتدائے مشق تھی، اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیے، اور جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا۔ عرض کی، حضرت پھر کیا؟ فرمایا ''کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ۔'' کمر کو اوپر ڈال دو۔ عرض کی، پھر وہ کیوں کر؟ تین چار مصرع الٹ پلٹ کیے تھے۔ ایک اس وقت خیال میں ہے:۔

بل بے کمر کہ زلف مسلسل کے پیچ میں ... کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

(۲) نیرنگِ خیال: ان خیالی و تمثیلی مضامین لکھنے کی تحریک پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیمات کرنل ہالرائڈ نے علامہ آزاد کے سامنے پیش کی تھی۔ انگریزی میں سوئفٹ اور جان بنین وغیرہ نے اس قسم کی مستقل کتابیں اور متفرق مضامین لکھے ہیں۔ قدیم یونانی ادبیات اور یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی رمزیہ (ایلی گریکل) تصانیف موجود ہیں۔ اُن لوگوں کا مقصد مذہب، اخلاق یا حکومت کی اصلاح ہے۔ عقائد رائجہ یا سیاسیات

حاضرہ پر در پردہ نقد و تبصرہ کیا ہے۔ علامہ آزاد کا جدت طراز و خیال آفریں دماغ اس موضوع کے لیے نہایت موزوں تھا۔ کرنل ہالرائڈ نے ان تحریروں کے لیے خاکہ سا بتا دیا تھا۔ لیکن وہ اسلوب بیان یا موضوعات کے متعلق کچھ اشارے ہوں گے۔ مضامین اصل میں آزاد ہی کی اختراع بدیع ہیں۔ اور باوجود انگریزی نہ جاننے کے آزاد نے ان مضامین میں ادبیات انگریزی کی جیسی شان پیدا کر دی ہے۔ وہ تنہا آزاد کا کمال ہے۔

سیاست کا موضوع تو آزاد کے زمانے میں خارج از بحث تھا۔ اس پر تنقید و تبصرہ آزاد سے متوقع نہ تھا۔ مذہب، اخلاق، علم وفن اور شعر و ادب پر آزاد نے بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے، لطیف نکتے بیان کیے ہیں۔ اور عجیب عجیب پیرائے اختیار کیے ہیں۔ صرف اتنی کمی نظر آتی ہے کہ آزاد نے رمز و تمثیل کی صرف ایک شکل پسند کی ہے، اور ہر جگہ اسی سے کام لیا ہے۔ یعنی اشیا سے ہیجان اور قوا و اخلاق انسانی کو مجسم کر کے اپنے فسانوں کے اشخاص و کردار پیدا کیے ہیں۔ ہر جگہ ایمان، دل، عقل، نفس، انصاف، ظلم وغیرہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کو بار بار دیکھ کر جی اکتا جاتا ہے۔ تاہم آزاد نے اپنی ذہانت سے واقعات اور ان کی صورتیں نئی نئی پیدا کی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ 'نیرنگِ خیال' ان کی فکر و خیال کی نیرنگیوں کا نادر نمونہ ہے۔

'نیرنگِ خیال' کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں تمہید کے طور پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اُردو اور انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات، اس میں مائتھالوجی (اساطیر یا علم الاصنام) کا ذکر کیا ہے، جس میں مضامین نیرنگ خیال کی بنیاد ہے۔ لکھتے ہیں:-

فارسی اور اُردو میں تم نے وقت کے باب میں دیکھا ہوگا کہ زمانہ یا زندگی کو عمر رواں یا آبِ گذراں کہتے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ زمانہ عمر کی کھیتی کو یا رسنِ عمر کو کاٹ رہا ہے، اور یہ بھی۔

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اسی طرح غصے کے باب میں دیکھا ہوگا کہ اسے آتشِ غضب کہہ کر آگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ ''ہچو مار سیاہ برخود بپیچید'' اور ''ہچو سپند از جا برجست۔'' پس انگریزی میں میتھالوجی ایک خاص علم ہے کہ اس میں ان سب قوتوں یا جذبوں کو ایک ایک مجسم دیبی یا دیوتا مقرر کیا ہے، اور انہی سامانوں

سے سجایا ہے جوان کے لئے لازم اور شایانِ شان ہیں۔ مثلاً

غصہ۔ ایک عورت ہے، کالا رنگ، ڈراؤنی صورت، تمام بدن پر بال کھڑے ہیں جیسے لوہے کی سلاخیں۔ سر پر اور بازوؤں پر ہزاروں سانپ پھن اٹھائے لہرا رہے ہیں اور آنکھوں سے خون برستا ہے۔

عشق۔ ایک موقع پر اسے نوجوان خوبصورت لڑکا فرض کیا ہے کہ خوش ہے، اور اپنے عالم میں اچھلتا کودتا ہے، مگر آنکھوں سے اندھا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ بھلائی برائی کو نہیں سوچتا، کبھی ایک جوان آدمی بنایا ہے اور ہاتھ میں چڑھی ہوئی کمان میں تیر جوڑا ہوا ہے کہ جدھر چاہتا ہے مار بیٹھتا ہے۔ اس کی پناہ نہیں۔

افواہ یا شہرت۔ اس کی تصویر ایک بڑھیا عورت ہے کہ اس کے تمام بدن پر زبانیں ہی زبانیں ہیں۔ پہلے اس کے منہ میں زبان ہلتی ہے۔ ساتھ ہی ساری زبانیں سانپوں کی طرح لہرانے لگتی ہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ جو بات اس کی زبان سے نکلتی ہے وہی عالم میں ایک ایک زبان پر آتی ہے۔

انگریزی میں انھیں 'گاڈز' کہتے ہیں۔ اور ہر ایک جذبہ انسانی بلکہ خزاں اور بہار اور موسیقی وغیرہ وغیرہ کے لیے مختلف گاڈز تیار کیے ہیں۔ زمانے کی گردشوں نے ہمارے علوم کو مٹا دیا، اس لئے آج یہ باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں، ورنہ سنسکرت میں بھی اکثر اشیاء کے لئے ایک ایک دیبی یا دیوتا ہیں۔

مسلمانوں کے دماغ بھی اس خیال سے خالی نہیں تھے۔ ان کی تصنیفات میں فلاسفہ کا قول منقول ہے کہ اگر ایک مور کے پر کو دیکھیں اور اس کے صنائع بدائع پر نظر کریں تو عقل حیران ہوتی ہے کہ کونسا صانع ہوگا جو ایسی دستکاری کر سکے۔ پھر مور کے تمام جسم کو دیکھو اور اسی نسبت سے تمام عالم موجودات اور اس کے جزئیات کو دیکھو۔ پھر جب دیکھتے ہیں کہ اَلْوَاحِدُ لَا یَصْدُرُ عَنْہُ اِلَّا الْوَاحِدُ، یعنی ایک فاعل سے ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے تو ضرور ہے کہ کائنات کے مختلف کارخانوں کے لیے ایک ایک ربّ النوع فرض کیا جائے جو اپنے اپنے کارخانے کا سربراہ ہو، اور سب کا مالک ربُّ الارباب جامع جمیع، صفات کمال، اہلِ شریعت نے اسی کو ہر ایک سلسلہ کا ایک ایک فرشتہ مؤکل مانا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فقط زبان کا فرق ہے، ورنہ وہی دیبی

یا دیوتا، وہی گاڈز، وہی ربّ النوع، وہی فرشتہ موٴکل۔

غالباً یہی باتیں ہوں گی جو انگریزی علم اساطیر کے متعلق کرنل ہالرائڈ نے علامہ آزاد کے لیے بصورت خاکہ تیار کی ہوں گی۔

ایک مضمون 'سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ' ہے، اس میں لکھتے ہیں:-

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں۔ جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی ملا کر کھلاتے ہیں، اسی طرح انواع اقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں، تا کہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔ واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی، جو کہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا تو اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا، تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی۔ عزتِ دوام کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اولادِ آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالم سفلی میں دروغ دیو زاد ایک سفلہ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی، مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے، تو ان کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا، اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت مل گیا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا، چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا، اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔

اس قسم کے مضامین میں واقعات و کیفیات کی رنگینی اور رنگارنگی تو بہت ہے اور خوب ہے، بے شمار واقعات بیان کیے ہیں اور تقریباً تمام فضائل و رذائل کو متشکل کر کے عبرت و بصیرت کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ لیکن پیرایہ تمثیل یہی ہے جو اوپر دکھایا گیا۔

لیکن بعض مضامین میں زیادہ جدت و ندرت سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک مضمون لکھا ہے:- 'انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا'۔ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں:-

سقراط حکیم نے خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لاکر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ آپ اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہل عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چنانچہ اس مطلب کے لئے ایک میدان کہ میدان خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہوا۔ اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ میں کھڑا تھا، اور ان کے تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے، لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔ (پھر اس انبار مصائب کی تفصیل لکھتے ہوئے کہتے ہیں)

اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرا میرا دل بہلایا۔ صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص پرانے سے چکن کے چغہ میں ایک بھاری سی گٹھری لئے آتا ہے۔ جب وہ گٹھری انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑتا آتا تھا، بدن سے پسینہ بہتا تھا اور مارے بوجھ کے ہانپا جاتا تھا۔ اس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بری تھی۔ اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

اس کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سروں پر دود آہ کی گٹھریاں تھیں کہ انہی میں آہوں کے تیر خیالی اور نالوں کے نیزۂ ہوائی دبے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے ان کے پھٹ جائیں گے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہو سکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں۔ کچھ جد و جہد سے سر ہلایا۔ مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے اُسی طرح چلے گئے۔

دیکھئے آزاد نے عاشقوں کی کیا خوب لاج رکھی ہے۔ آگے لکھتے ہیں (درمیان سے عبارتیں حذف کردی گئی ہیں)

بہت بڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جھریاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت، کچھ موٹے ہونٹ، اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے کہ جنھیں دیکھ کر شرم آتی تھی...... اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے بے پروا چلا آتا ہے۔ اس نے ایک گٹھری پھینک دی، مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شہدے آئے میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے، مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم و حیا کو پھینک گئے......

ہم اس انبوہ پُر آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے، اور اس عالم ہیولانی کی ایک ایک بات کو تاک کر دیکھ رہے تھے، جو سلطان الافلاک کی بارگاہ سے حکم پہونچا کہ اب سب کو اختیار ہے جس طرح چاہیں اپنے رنج و تکلیف کو بدل لیں، اور اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں.......... چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا درد قولنج سے جاں بلب تھا، اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال و املاک کے لئے ایک وارث چاہتا تھا۔ اس نے درد مذکورہ کو پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا، مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہیں جھٹ بڈھے کی ڈاڑھی پکڑ لی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ درد قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ بڈھے نے اس سے کہا کہ برائے خدا میرا درد قولنج مجھے پھیر دیجئے اور اپنا لڑکا لیجئے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجے بہتر ہے، مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ اب پھر نہ سکتا تھا..........

عورتیں بچاری اپنے ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے ہائے کرتی چلی جاتی تھی...... کسی نے چہرے کی خوبصورتی لی تھی مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکا بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہو رہا ہو۔ اس سب کی حالتوں کو دیکھ

کہ یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں، وہ حقیقت میں ہمارے سہارے کے بموجب ہوتی ہیں۔ یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے.........

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا، مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا۔ یعنی جان سے بیزار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری، نالہ وفریاد، آہ وافسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان الافلاک کو بکس آدم زاد کے حال دردناک پر پھر رحم آیا اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اتار کر پھینک دیں۔ پہلے ہی بوجھ انھیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی ان وبالوں کو سروگردن سے اتار کر پھینک دیا۔

ایک اور مضمون میں بھی پُر لطف جدّت پیدا کی ہے۔ یعنی شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار قائم کیا ہے، جس میں تاریخ عالم کے اکثر مشاہیر کو لا کر بٹھایا ہے۔ چنانچہ کالی داس، محمود، فردوسی، نظامی، چنگیز خاں، امیر تیمور، بوعلی سینا، اکبر، جہانگیر، شیوا جی، مرزا سودا، ناسخ، آتش، ذوق، غالب کو قرینے سے دربار میں کرسیاں دی ہیں۔ شروع میں لکھتے ہیں:-

بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس کی روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اس کے لئے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالم یادگار کی بقا، جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں، اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے کام اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے، یا تو ثواب آخرت کے لئے یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لئے ہوئے۔ لیکن میں اس دربار میں انہی لوگوں کو لاؤں گا جنھوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی ناموری اور شہرت کو سمجھا۔ اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے، ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں۔

دربار کے حال سے مختلف حصے اقتباس کر کے لکھے جاتے ہیں:-

جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا ایک پنڈت آیا، دونوں ہاتھ اٹھا کر اشیرباد کہی اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا۔ جس میں ہیرے اور پنے کے نو دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ راجہ بھوج تھے اور ۳۲ پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب 'سنگھاسن بتیسی' جو ان کے عہد میں تصنیف ہوئی، اور

جس نے سر پر تاج رکھا وہ کالی داس شاعر تھا، جس نے ان کے عہد میں نو کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے۔

......دفعتاً سکندر نے آواز دی۔ ''انھیں لاؤ'' جو شخص داخل ہوا وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا، کہ مقیش داڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا، جس وقت وہ آیا سکندر خود اٹھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا، اپنے برابر کرسی پر بٹھایا، اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا۔ معلوم ہوا کہ یہ نظامی گنجوی ہیں اور اس سہرے میں 'خمسہ' کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک کر کہا۔ یہ اب کبھی نہ کملائیں گے۔

......اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا، جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا، وہ نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ کہتا تھا اس کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کا غذوں کا تھا، اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے، مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا۔ اس لئے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی۔

......تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا کوئی گلدستہ ہاتھ میں لئے تھا۔ انھیں دیکھ دیکھ آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں سے ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا اس کے منھ سے رنگارنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹ جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ مرزا رفیع سوداؔ تھے۔

مرزا رفیع سوداؔ دہلوی کی ہجو گوئی کو پھولوں کے کانٹوں سے تشبیہ دے کر کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

(۳) 'سخندانِ فارس' کے دو حصے یکجا ہیں۔ پہلے میں فارسی زبان کی اصلیت اور ساخت کو بیان کیا ہے اور دوسرے حصے میں ایک درجن سے زاید لکچر ہیں، جو کالج کے

طلبا کے سامنے پڑھنے کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ پہلا لکچر ۹ رفروری ۱۸۷۲ء کو دیا گیا ہے اور کئی سال میں یہ سلسلہ پورا ہوا ہے۔ اس حصے میں ایران کی قدیم زبان، اسلام کے بعد کی زبان، اس کے تغیرات، ایران کی معاشرت وتمدن اور ان کا زبان پر اثر، انقلابات ملکی اور ان کا علم وادب پر اثر، مصنفوں اور شاعروں اور ان کی تصانیف کا حال، ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی کیفیت وغیرہ مختلف مضامین پر مفید و دلچسپ معلومات فراہم کیے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی اس موضوع کی کوئی تصنیف اُردو کیا، فارسی میں بھی نہ تھی۔ علامہ آزاد کی رنگینیِ تحریر اس میں بھی قائم ہے۔ بعض اقتباسات یہ ہیں:-

حصہ اول میں الفاظ کی ولادت ونسل اور نوعیت وساخت بیان کرتے ہیں:-

میرے دوستو، تم حیران ہو گے کہ لفظ کی ولادت اور نسل کیا؟ ہاں لفظ کی بھی ولادت اور نسل ہوتی ہے، اور وہ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ فلسفی لفظ کے جُز جُز کو الگ کرتا ہے، اور دیکھتا ہے کہ وقت بوقت ان کی اصل کس کس قوم میں پہنچتی آئی ہے۔ ان میں کیا رشتے ہیں؟ اور کیونکر وہ رشتے پیدا ہوئے ہیں؟ اور ملک بملک ان کے معنوں یا حرفوں میں کیا تغیر پیدا ہوئے ہیں؟ پھر اور زبانوں کے لحاظ سے اپنی باتوں پر غور کرتا ہے، ان کے نتائج کو بھی جانچتا ہے، اور مطابقت اور مقابلہ کرتا ہے، یعنی ایک زبان کے لفظ دوسری زبان سے کن کن باتوں میں متفق ہیں، اور کونسی باتیں ہیں کہ ایک ہی کے لئے خاص ہیں۔ پھر ان سبھوں کی جستجو کرتا ہے جو زبان میں تبدیلی کا عمل کر رہے ہیں، اور یہ غیر منقطع کام ہے۔ کبھی ترقی کے رنگ میں ہوتا ہے، کبھی تنزل میں۔ مگر جاری ہمیشہ رہتا ہے، اور اسی کو زبان کی اصل نسل کہتے ہیں۔ اب چند مثالیں توضیح مطلب کے لئے لکھتا ہوں۔

گریباں کو فلسفی زبان نے دیکھا۔ بان پر جوڑ معلوم ہوا، اس نے گریے کو دیکھا تو فارسی قدیم میں بمعنی گلو پایا۔ سمجھ گیا کہ اس جز ولباس کا گلے پر قبضہ ہے، اس لئے اس کا نام گریباں رکھا ہوگا کہ مالک گلو ہے۔ سنسکرت میں دیکھا تو وہاں گریوا انہی معنوں میں آیا ہے، اور بان سنسکرت میں وان ہے۔ ثابت ہو گیا کہ ایک گھرانے کی نسل ہے۔ ملک اور مدت کے انقلاب سے آواز بدل گئی۔ یہاں مر گیا، وہاں جیتا ہے۔

کلابتوں کو سب پہنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ فلسفی زبان اس کا بل کھولتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ

کلابہ کلاوہ (سوت کا لچھا)۔ آلتوں تُرکی میں سونے کو کہتے ہیں۔ وہی سنہرا لچھا (سخندانِ فارس حصہ اول صفحہ ۱۵-۱۶

ایران میں ساتویں صدی ہجری سے بارھویں صدی ہجری تک پانچ چھ سو برس جو بان وادب کا رنگ رہا اس پر ریویو کرتے ہیں:۔

۶۶۹ھ میں عبداللہ وصاف بن فضل اللہ نے غازاں خاں شاہزادہ چنگیزی کے لئے 'تاریخِ وصاف' لکھنی شروع کی۔ حقیقت میں بڑا زور مارا ہے، اور فارسی عربی زباندانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر فقط لفاظی اور لغت بازی ہے۔ عربی، فارسی، تُرکی لفظوں کا حشر برپا ہے۔ استعارہ اور تشبیہ نظم میں سو برس پہلے رنگ دینے لگے تھے، نثر میں بہت کم تھے۔ انھوں نے اس قدر بھتات کی کہ مطلب گم ہو گیا۔ عبارت کو مقفیٰ کیا اور ہر فقرے پر اس کا ہم معنی فقرہ اور سوار کیا، ہر صفحہ میں دو دو تین تین عربی شعر اور عربی عبارتیں، کہیں کہیں سطریں، آدھا صفحہ اور زیادہ بھی لکھ جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ غازاں خاں کی حکومت کنارہ ایران سے سرحد مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ خاک عرب کا اثر ضرور ظاہر ہوتا تھا۔ تُرکی الفاظ کیوں نہ آتے، تُرک بچوں میں بیٹھ کر لکھتے تھے، اور تُرک بادشاہ کے دربار میں کھڑے ہو کر سناتے تھے، اور چونکہ فاضل تھے، صاحب زبان تھے آمد طبع کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اس لئے کہیں چھوٹے کہیں بڑے بڑے فقرے لکھ کر لمبے لمبے ہاتھ مارتے تھے......

میرے دوستو، یہ انشا پرداز منھ زور گھوڑوں کے شہسوار تھے کہ بے مطلبی کے میدانوں میں بے ارادہ کسی منزل کے خواہ مخواہ گھوڑے مارتے چلے جاتے تھے اور حق پوچھو تو یہ بھی کمال ہے۔ ذرا سی بات کو بلکہ بے بنیاد معاملے کو، مثلاً بادشاہ کی مدح کہ وہ بہت اچھا ہے، یا باغ کا حال کہ خوب شاداب ہے، یا بازاری دکانداروں کی تعریف کو اس قدر لمبا اور چوڑا بغیر دودھ کے ابال اٹھاتا ہے، اور یہ اُنھی کا کام تھا، مگر بے حاصل۔

ایک تیز قلم مصور نے نظر کے زور سے اور ہاتھ کی مشق سے ایک گلاب کی پتی پر فورٹ ولیم کی تصویر کھینچی اور اس میں کوئی جزو اس عمارت کا باقی نہ چھوڑا۔ یا کسی نازک دستکار نے چنے کی دال کا جنگی جہاز تراشا، اس طرح کہ چھوٹے سے چھوٹا پرزہ بھی اصل جہاز کا دیکھو تو موجود پاؤ۔ بے شک دونوں نے بڑا کمال کیا۔ مگر اس قلعہ کے ایوان میں کونسا بادشاہ ملک رانی کرے اور جہاز میں کونسا

لشکر سمندر پار اترے۔

(۴) 'دربارِ اکبری' میں بادشاہ کے ذاتی، درباری اور آئینی حالات اور سلطنت کے خاص خاص ارکان، وزراء، علماء، امراء کے سوانح بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف تاریخوں سے جمع کیے ہیں، جن میں ملاّ عبدالقادر بدایونی کی 'منتخب التواریخ' کا عنصر غالب ہے۔ صفحے کے صفحے اسی تاریخ سے ترجمہ کر دیے ہیں۔ بعض مقامات کے مختصر نمونے یہ ہیں:-

محبت کے ناز و نیاز۔ اکبر بادشاہ قوم کا ترک، مذہب کا مسلمان تھا۔ راجہ یہاں کے ہندی وطن اور ہندو مذہب تھے۔ اتفاق اور اختلاف کے مقدمے تو ہزاروں تھے، مگر ان میں سے ایک نکتہ لکھتا ہوں۔ ذرا آپس کے برتاؤ دیکھو اور ان سے دلوں کے حال کا پتہ لگاؤ۔ اسی ہنگامے میں (یعنی تیسری یلغار گجرات پر) راجہ جے مل (راجہ روپسی کا بیٹا تھا) اکبر کے برابر نکلا اور اس کا بکتر بہت بھاری تھا۔ اکبر نے سبب پوچھا۔ اس نے کہا اس وقت یہی ہے۔ زرہ وہیں رہ گئی۔ دردخواہ بادشاہ نے اسی وقت بکتر اتروایا اور اپنے خاصہ کی زرہ پہنوادی۔ وہ سلام کر کے خوش ہوتا ہوا اپنے رفیقوں میں گیا۔ اتنے میں راجہ کرن (مالدیو راجہ جودھپور کے پوتے) کو دیکھا کہ اس کے پاس زرہ بکتر کچھ نہ تھا۔ بادشاہ نے وہی بکتر اسے دے دیا۔ جے مل اپنے باپ (روپسی) کے سامنے گیا۔ اس نے پوچھا بکتر کہاں ہے؟ جے مل نے سارا ماجرا سنایا۔ روپسی کی جودھپوریوں سے خاندانی عداوت چلی آتی تھی۔ اسی وقت بادشاہ کے پاس آدمی بھیجا کہ حضور میرا بکتر مرحمت ہو۔ وہ میرے بزرگوں سے چلا آتا ہے، اور بڑا مبارک اور فتح نصیب ہے۔ اس وقت بادشاہ کو یاد آیا کہ ان کی کھٹک ہے۔ فرمایا کہ خیر ہم نے اسی واسطے خاصے کی زرہ تمھیں دے دی ہے کہ فتح کا تعویذ اور اقبال کا گنڈا ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ روپسی کے دل نے نہ مانا۔ اور کچھ تو نہ ہو سکا، اسلحۂ جنگ اتار کر پھینک دیے۔ اور کہا خیر میں میدان جنگ میں یونہی جاؤں گا۔ اس نازک موقع پر اکبر کو بھی اور کچھ نہ بن آیا۔ کہا خیر ہمارے جاں نثار ننگے لڑیں تو ہم سے بھی نہیں ہوسکتا کہ زرہ بکتر میں چھپ کر میدان میں لڑیں۔ ہم بھی برہنہ تیر و تلوار کے منہ پر جائیں گے۔ راجہ بھگوانداس اسی وقت گھوڑا اڑا کر جے مل کے پاس گئے، اسے بہت سمجھایا، بہت لعنت ملامت کی اور سمجھا بجھا کر دنیا کے رستے کا نشیب و فراز دکھایا۔ یہ بڈھا خاندان کا ستون تھا۔ اس کا سب لحاظ کرتے تھے۔ اس نے شرمندہ ہو کر پھر ہتھیار سجے۔ راجہ بھگوانداس نے آکر عرض کی، حضور روپسی نے بھنگ پی تھی، اس کی

لہروں نے ترنگ دکھائی تھی، اور کچھ بات نہ تھی۔ اکبر سن کر ہنسنے لگا اور ایسا نازک جھگڑا لطیفہ ہو کر اُڑ گیا۔

تمام 'دربارِ اکبری' آزاد کی انشا پردازی کا عجیب دلکش نمونہ ہے۔ بعض حصے اور بعض واقعات خاص طور پر مؤثر ہیں۔ ان میں سے ایک خان زماں علی خاں شیبانی کا حال ہے اس میں سے کچھ اقتباس کیا جاتا ہے:-

غرض رات نے صبح کی کروٹ لی۔ ستارہ نے آنکھ ماری اور شفق خونی پیالہ بھر کر مشرق سے نمودار ہوئی۔ نور کے تڑکے بادشاہی فوج کا ایک آدمی ان کے خیمے کے پیچھے جا کر باآوازِ بلند چلایا کہ مستو، بے خبرو، کچھ خبر بھی ہے؟ بادشاہ خود لشکر سمیت آن پہونچے اور دریا بھی اتر لیے۔ اس وقت خان زماں کے کان کھڑے ہوئے، مگر جانا کہ آصف خاں کی چالاکی ہے۔ مجنوں خاں قاقشال کو پھونس پتا بھی نہ سمجھتا تھا، کچھ پرواہ نہ کی.......... غرض نور کا تڑکا تھا کہ بادشاہی نقارہ پر چوٹ پڑی۔ یہ آواز سن کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور لشکر کا بندوبست کرنے لگے۔

۹۷۴ھ نو بجے، پیر کا دن۔ عید قرباں کی پہلی تاریخ تھی۔ منکروال (سنگروال) علاقہ الٰہ آباد پر مقام تھا کہ میدان جنگ میں تلوار میان سے نکلی۔ دونوں بھائی شیر ببر کی طرح آئے اور اپنے اپنے پرے جما کر پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے۔ قلب میں خان زماں قائم ہوا، ادھر سے اکبر نے ہاتھیوں کی صف باندھ کر فوج کے پرے باندھے.......... بادشاہ "بال سندر" ہاتھی پر سوار تھے، اور مرزا عزیز کو کہ خواصی میں بیٹھے تھے۔ ان کا خاندان گرد و پیش جما ہوا تھا۔ اکبر نے دیکھا کہ میدان کا رنگ بدلا۔ بنظر احتیاط ہاتھی سے کود کر گھوڑے پر سوار ہوا اور بہادروں کو للکارا۔ اب دونوں بھائیوں (خان زماں اور بہادر خاں) نے پہچانا کہ ضرور بادشاہ اس لشکر میں ہے.......... اب انھوں نے مرنا دل میں ٹھان لیا اور جہاں جہاں تھے وہیں قائم ہو گئے۔ مگر نمک کی مار کا حربہ کچھ اور ہی ضرب رکھتا ہے۔ بہادر خاں کے گھوڑے کے سینے میں ایک تیر لگا کہ چراغ پا ہو کر گر پڑا، اور وہ پیادہ ہو گیا۔ بادشاہ کو ابھی تک اس حال کی خبر نہ ہوئی تھی۔ سب کو بدحواس دیکھ کر خود آگے بڑھا اور فوجداروں کو آواز دی کہ ہاتھیوں کی صف کو علی قلی خاں کی فوج پر ریل دو کہ بہادر خاں کو ادھر متوجہ ہونا پڑے۔ دونو لشکر تہ و بالا ہو رہے تھے علی قلی خاں اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ بار بار بہادر خاں کا حال پوچھتا تھا اور مدد بھیجتا تھا۔ ابھی کچھ خبر نہ تھی کہ دونوں بھائیوں پر کیا گزری کہ اکبری بہادروں کو فتح کی رگ پھڑکتی معلوم ہوئی اور کامیابی کے

آثار ظاہر ہونے لگے۔

بات یہ ہوئی کہ ادھر سے 'ہیرانند' ہاتھی علی قلی خان کی فوج پر جھکا۔ اُدھر سے مقابلے میں 'رودیانہ' ہاتھی تھا۔ ہیرانند نے قدم کاٹ کر اس طرح کلّہ کی ٹکر ماری کہ رودیانہ سینہ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اتفاقاً ایک تیر قضا کے تیر کی طرح علی قلی خاں کے لگا۔ دلاور بڑی بے پروائی سے نکال رہا تھا کہ دوسرا تیر گھوڑے کے لگا، اور ایسا بے ڈھب لگا کہ ہرگز نہ سنبھل سکا، گرا اور سوار کو بھی لے کر گرا۔ ہمراہیوں نے دوسرا گھوڑا سامنے کیا۔ اتنے عرصے میں کہ وہ سوار ہو، ایک بادشاہی ہاتھی باغیوں کو پامال کرتا ہوا، بلا کی طرح اس پر پہونچا۔ خاں زماں نے آواز دی، فوجدار ہاتھی کو روکنا، میں سپہ سالار ہوں، زندہ حضور میں لے جا، بہت انعام پائے گا۔ اس کمبخت نے نہ سنا۔ ہاتھی کو ہول ہی دیا۔ افسوس وہ خان زماں جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے فوجوں کے دھوئیں اڑتے تھے اسے ہاتھی روند کر ہوا کی طرح اور طرف نکل گیا، اور وہ خاک پر سسکتا رہ گیا۔ اللہ، اللہ! جس بہادر کو فتح و اقبال ہوا کے گھوڑوں پر چڑھاتے تھے، جس عیش کے بندے کو ناز و نعمت مخملوں کے فرش پر لٹاتے تھے، وہ خاک پر پڑا دم توڑتا تھا، جوانی سرہانے کھڑی سر ملتی تھی، اور دلاوری زار زار روتی تھی۔ سارے ارادے اور حوصلے خواب و خیال ہو گئے تھے۔ ہاں، خان زماں، یہ یہاں کا معمولی قانون ہے، تم نے ہزاروں کو خاک و خون میں لٹایا، آؤ بھائی، اب تمھاری باری ہے۔ اسی خاک پر تمھیں سونا ہوگا۔

سرِ لشکر کے مرتے ہی لشکر پریشان ہو گیا۔ فوج شاہی میں فتح کا نقارہ بج گیا۔ اکبر ادھر اُدھر کمک دوڑا رہا تھا کہ اتنے میں نظر بہادر، بہادر خاں کو اپنے آگے گھوڑے پر سوار کر کے لایا اور حضور میں پیش کیا۔ اکبر نے پوچھا، ''بہادر، چونی؟'' کچھ جواب نہ دیا۔ اکبر نے پھر کہا، اس نے کہا ''الحمدللہ علیٰ کل حال'' بادشاہ کا دل بھر آیا۔ بچپن کا عالم اور ساتھ کا کھیلنا یاد آیا۔ پھر کہا ''بہادر، ماشما چہ بدی کردہ بودیم کہ شمشیر برروئے ما کشیدید۔'' وہ شرمندہ شرمسار سر جھکائے کھڑا تھا۔ مارے خجالت کے کچھ جواب نہ دے سکا۔ کہا تو یہ کہا۔ ''الحمدُللہ علیٰ کلِ حال کہ در آخر عمر دیدار حضرت بادشاہ کہ ماحی گناہان است، نصیب شد۔'' آفریں ہے اکبر کے حوصلے کو! گنہ بخش کا لفظ سنتے ہی آنکھیں نیچی کر لیں اور کہا ''بحفاظت نگہدارید۔'' اس نے پانی مانگا، اپنی چھاگل میں سے پانی دیا.......... کوئی کہتا ہے بے اطلاع، کوئی کہتا ہے اکبر کے اشارے سے شہباز خاں کمبو نے بے نظیر بہادر کا نقش صفحۂ ہستی سے مٹا دیا، مگر مُلّا صاحب

کہتے ہیں کہ شہنشاہ اس کے قتل پر راضی نہ تھے۔

بادشاہ میدان میں کھڑے تھے۔نمک حرام پکڑے آتے تھے،اور مارے جاتے تھے۔بادشاہ کو بڑا خیال خان زماں کا تھا، جو آتا تھا اس سے پوچھتے تھے.......... حکم دیا کہ جو نمک حراموں کے سر کاٹ کر لائے، انعام پائے۔ ولایتی کے سر کے لئے اشرفی، ہندوستانی کے سر کے لئے روپیہ۔ہائے کم بخت ہندوستانیوں! تمھارے سر کٹ کر بھی سستے ہی رہے! لشکر کے لوگ بے سرو پا اٹھ دوڑے۔گودیں بھر بھر کر سر لاتے تھے۔اور مٹھیاں بھر بھر کر روپے اشرفیاں لیتے تھے۔ہر سر کو دیکھتے تھے، دکھاتے تھے،اور پہچانتے تھے۔افسوس انہی سروں میں خان زماں کا سر بھی ملا کہ ادبار کا سر ہوگیا۔سبحان اللہ! جس سر سے فتح کا نشان جدا نہ ہوتا تھا، جس سے اقبال کا خود نہ اترتا تھا، جس چہرے کو کامیابیوں کی سرخی شگفتہ رکھتی تھی، اس پر خون نے سیاہ دھاریاں کھینچی تھیں، نحوست نے خاک ڈالی تھی، کون پہچانے؟ سب کو تردد تھا۔ارزانی مل اس کا حامی اور معتمد دیوان بھی قیدیوں میں حاضر تھا، بلایا اور دکھا کر پوچھا۔اس نے سر کو اٹھالیا، اپنے سر پر دے مارا،اور ڈھاڑیں مار کر رونے لگا۔خواجہ دولت کہ پہلے اس کے حرم سرا کا خواجہ سرا تھا، وہاں سے آکر حضور میں ملازم اور پھر دولت خاں ہوگیا تھا، اس نے دیکھا اور کہا، مرنے والے کو عادت تھی کہ ہمیشہ پان دائیں طرف سے کھایا کرتا تھا۔اس لئے ادھر کے دانت رنگین ہوگئے تھے، دیکھا تو ایسا ہی تھا..........

جب اکبر کو یقین ہوگیا کہ خاں زماں کا بھی کام تمام ہوا، تو گھوڑے سے اتر کر خاک پر پیشانی کو رکھ دیا اور سجدۂ شکر بجالایا...... خان زماں! ہل بے تیری ہیبت اور واہ رے تیرا دبدبہ! مرد ہو تو ایسا ہو! آزاد کو تیرے مرنے کا افسوس نہیں، مرنا تو ایک دن سب کو ہے۔تیری لاش اس سے بھی سوا خراب وخوار ہوتی مگر آقا کی جاں نثاری میں ہوتی تو آب زر سے لکھی جاتی۔خدا حاسدوں کا منھ کالا کرے، جنھوں نے دونو بھائیوں کی سنہری سرخروئی کو روسیاہی کردیا، آزاد بھی ایسے ہی بے لیاقت بداصالت حاسدوں کے ہاتھ سے داغ داغ بیٹھا ہے، پھر بھی شکر ہے کہ روسیاہی سے محفوظ ہے۔یہ نااہل خود تو کچھ نہیں کر سکتے، اوروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں، اور مورچے باندھتے ہیں۔موقع پاتے ہیں تو افسروں سے لڑاتے ہیں۔خیر آزاد بھی پروا نہیں کرتا۔اپنے تئیں خدا کے اور انھیں زمانے کے حوالے کر دیتا ہے۔ان کے اعمال ہی ان کو سمجھ سمجھا لیتے ہیں۔

تو بد کنندۂ خود را بروز گار گذار ۔۔۔ کہ روزگار ترا چاکریست کینہ گذار

(۵) مکتوباتِ آزاد، علّامہ آزاد کی اور چھوٹی تصانیف، 'قصصِ ہند'، 'نصیحت کا کرن پھول' وغیرہ میں ان کا وہی اسلوب نگارش موجود ہے، بعض کتابیں مثلاً 'تذکرۂ علماء' اس قدر سادہ اور طرزِ آزاد سے علیحدہ ہے کہ ان کی تصنیف ہی نہیں معلوم ہوتی۔ ایک ایک دو دو صفحے کے نہایت مختصر و ناکافی حالات ہیں، جیسے کسی بڑی کتاب کی تیاری کے لیے نوٹس اور اشارے لکھے گئے ہوں۔ اس لیے باقی تصانیف کے نمونے ترک کیے جاتے ہیں۔ مکتوباتِ آزاد البتہ دلچسپ چیز ہے۔

علّامہ آزاد کے یہ سب خطوط صرف ایک شخص میجر ڈاکٹر سیّد حسن بلگرامی (برادر عزیز نواب عماد الملک سیّد حسین بلگرامی) کے نام ہیں جو انڈین میڈیکل سروس میں فوجی ڈاکٹر تھے، اور ایک زمانے میں بسلسلۂ ملازمت امرتسر میں رہے تھے۔ یہ مکتوبات اول ۱۹۰۶ء میں رسالہ 'مخزن' لاہور میں بالاقساط اور پھر ۱۹۰۷ء میں بصورت کتاب شائع ہوئے تھے۔ اس مجموعہ کا دیباچہ سیّد جالب دہلوی نے لکھا تھا، جو اس زمانے میں 'پیسہ' اخبار لاہور کے دفترِ ادارت میں تھے، اور پھر آخر میں روزنامہ 'ہمدم' لکھنؤ نکالتے رہے۔

خطوط آزاد کی اہمیت کے متعلق سیّد جالب صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

''ان مکتوبات کے ذریعے سے رسالہ 'مخزن' نے نہ صرف مولانا کی بے تکلفانہ تحریر کا ایک دلآویز نمونہ شائقین اردو کو دکھایا ہے، بلکہ بالواسطہ ان کی پُر حوادث مگر قیمتی زندگی کے حالات کا وہ دلچسپ حصہ بہم پہونچایا ہے، جس کا مہیا ہونا خود حضرت آزاد سے بھی نظر بحالات موجودہ سخت دشوار تھا۔''

ان مکتوبات میں سے کچھ خطوط کتابوں کی طباعت و اشاعت سے متعلق ہیں۔ بعض میں ذاتی حالات ہیں۔ چند کالج اور یونیورسٹی کے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے اکثر سادہ رسمی زبان میں لکھے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں آزاد کا مخصوص اسلوب نگارش بھی ملتا ہے۔ القاب و آداب اکثر خطوں میں ''جناب من تسلیم'' ہیں۔ کہیں ''عالیجناب'' کا لفظ ہے۔ بعض خطوط میں چھوٹے یا بڑے دعائیہ جملے بھی ہیں۔ مثلاً ''ادام اللہ اقبالکم و ضاعف اجلالکم'' اپنا نام اکثر صرف آزاد لکھتے ہیں، کہیں پورا نام مع تخلص۔

نمونے کے لئے 'مکتوباتِ آزادؔ' کا سب سے پہلا خط بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے۔ یہ اس زمانے میں لکھا گیا ہے جب علاّمہ آزادؔ 'دربارِ اکبری' مرتب کر رہے تھے۔ اس کتاب کو سر سالار جنگ اول کے نام سے مُعنوَن کرنا چاہتے ہیں۔ خط میں اسی انتساب کی دو صورتوں کا ذکر ہے۔ پورا خط یہ ہے:-

''عالیجناب محسن دام اجلالکم، تسلیم، عنایت نامہ باعث اعزاز ہوا۔ رات کو دس بجے میں گھر پہونچا۔ اس وقت خطوط اور کارڈوں کا انبوہ سامنے ہے، دل ''دربار'' میں ہے اور دو دو حرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں۔ آپ کی تحریر کا جواب فرصت چاہتا ہے، مجھے کہاں؟ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ 'ماثر الامراء' اور 'سوانح اکبری' کسی زمانے میں دیکھی تھیں۔ یہاں تلاش تھی اور نہیں ملتی تھیں۔ چند مقاموں میں پرانی کتابوں کا پتہ لگا تھا۔ ٦ دن میں بھاگ گیا، اور دوڑا دوڑا آیا، جو کچھ ہاتھ لگا، اسے دیکھتا گیا، اور یادداشتیں لیتا گیا۔ 'ماثر الامراء' بھی مل گئی۔ شکر کا مقام ہے کہ جو کچھ میں نے دانہ دانہ اور قطرہ قطرہ کر کے جمع کیا ہے، وہ 'ماثر الامراء' سے بہت زیادہ نکلا۔ پھر بھی حق سے گذرنا کفر ہے۔ ہر شخص کے حال میں تین تین چار چار نکتے مل گئے، اور اچھے مل گئے۔ سب سے زیادہ یہ ہے کہ اب جو 'دربارِ اکبری' کا مشاہدہ کرے گا، یہ نہ کہہ سکے گا کہ آزادؔ کو 'ماثر' ہاتھ نہیں آئی۔

دونوں صورتوں کی تفصیل اب آپ پوچھتے ہیں۔ افسوس دیباچہ لکھنے کی نوبت ابھی کہاں آئی۔ خدا وہ دن کرے۔ دو صورتیں یہ ہیں کہ اول تو وہی معمولی طریقہ کہ ایک نسخہ پہلے ممدوح کو بھیجا، اور استمزاج کیا، ممدوح نے منظور فرمایا، مصنف نے شکریہ ادا کیا۔ دوسری صورت کا مضمون آئینۂ خیال میں ایک تصویرِ موہوم ہے، اور اس وقت فرصت مفقود۔ اچھا میں خلاصہ خلاصہ قلم بند تو کرتا ہوں، دیکھوں کچھ رنگ دیتا ہے یا نہیں۔

اس کا مضمون یوں تصور فرمایئے کہ جب اس موقع پر آب و رنگ اپنی دستکاری خرچ کر چکے تو عالمِ بالا کے پاک نہاد زمین پر اتر آئے۔ دسوں عقلیں، پانچوں حواس، غور، فکر، وہم، خیال وغیرہ وغیرہ سے انجمن منعقد ہوئی۔ مانی و بہزاد کی روحوں نے اس کے سامنے ادب سے سر جھکایا۔ پہلا امر یہ پیش ہوا کہ یہ دربار کہاں سجایا جائے۔ سب نے وہ بیتیں اٹھائیں اور شش جہت میں نگاہیں دوڑائیں۔ کہیں موقع کی جگہ نظر نہ آئی۔ گروہ ایوان عالیشان وغیرہ وغیرہ۔ وہم نے اعتراض کیا کہ جب تک ممدوح

سے اجازت نہ حاصل ہو، ایسی جسارت زیبا نہیں۔ آزاد نے کہا، سحر کا نور، شفق کی سرخی، صبح کا عالم جب نظر آتا ہے، اہلِ دل کہتے ہیں سبحان اللہ! صبا و نسیم پھولوں کی شمیم لاتی ہیں، دل کہتا ہے صلِ علیٰ، اس میں آفتاب سے اجازت، اور اس میں خسرو گل سے استمزاج کون کرتا ہے۔ میں نے ایسا ممدوح پایا، اسی کے دامنِ اقبال سے وابستہ کیا وغیرہ وغیرہ۔ اسے سب نے تسلیم کیا اب غائبانہ عرض کرتا ہوں کہ، وغیرہ وغیرہ۔

میری دانست میں یہ بھی ایک نیا مضمون ہے، اور اس میں کچھ ہرج نہیں۔

۲۶ر ستمبر ۱۸۸۲ء

محمد حسین عفی عنہ آزاد

لاہور مستی دروازہ

جس زمانے کے یہ خطوط ہیں، اسی زمانہ (۱۸۸۲ء) میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی تھی، اور نظام تعلیمات میں ردّ و بدل ہو رہا تھا۔ علامہ آزاد کو اپنے کالج کے ٹوٹنے اور نوکری جاتے رہنے کا اندیشہ تھا۔ اس کے متعلق چند خطوں میں میجر سیّد حسن صاحب کو لکھتے ہیں۔ بعض فقرے مختلف خطوط سے نقل کیے جاتے ہیں۔

جناب من، تسلیم۔ آپ دیکھتے ہیں یہ علم کی چڑیل (یونیورسٹی پنجاب) تعلیم پنجاب کو ہضم کیے جاتی ہے۔ کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی۔ چند مہینے میں سن لیجیے گا کہ نگل گئی۔ باوجود اس کے کورس بنانے کے لئے ہم پکڑے جاتے ہیں۔

کالج کے باب میں بھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا۔ میرا فیصلہ بھی اس پر منحصر ہے۔ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرکار مجھے کوئی نہ کوئی عہدہ دے گی، خواہ سررشتہ تعلیم میں، خواہ سول لائن میں۔ اخیر درجہ پنشن کا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جس گھر میں ۱۵۰ روپے مہینہ آتا ہے، اس میں ۵۰ روپے آئیں گے، تو صورت حال کیا ہوگی، لیکن دل کی آزادی یہی کہتی ہے کہ قناعت کو رفاقت میں لو، تھوڑا کھاؤ، اور اپنی کتابوں کو پورا کرو۔ خدا کریم کارساز ہے۔ وہ دینا چاہے گا تو اس کے ہزاروں ہاتھ ہیں۔ عہدے کے لئے کوشش نہ کرو۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

(مرقومہ ۳ر فروری ۱۸۸۳ء)

میرے بارے میں جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے، دل کو نہایت تسلی اور استقلال حاصل ہوا ہے۔
اپنے جد کے خانہ زادوں کی دستگیری آپ صاحب نہ فرمائیں گے تو اور کون ہے۔ پروردگار عالم اس
خاندان کو اقتدار روز افزوں عطا فرمائے۔ میں نے اپنے دل دے یہ قرار دے لیا ہے اگر اکسٹرا
اسسٹنٹی دی تو اختیار کرلوں گا، ورنہ پنشن لوں گا۔ تھوڑے پر قناعت کروں گا، اپنی کتابوں کو پوری کوشش
سے تیار کر کے پیشکش کرتا رہوں گا، اور دعائے دولت میں مصروف رہوں گا۔ ہاں جو خدمت فرمائیں
گے، وہ بھی بجالاؤں گا۔ کالج کا تغیر نہیں بھی ہوتا، تو یہ سمجھ لیجئے کہ میں تو آپ صاحبوں کا ہو چکا ہوں۔

تم سنو یا نہ سنو، نالہ کئے جاؤں گا ۔۔۔ دردِ دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہ ہو
حشر پر وعدۂ دیدار ہے، میں ڈرتا ہوں ۔۔۔ بھیڑ ہووے گی، رُخِ یار ادھر ہو کہ نہ ہو

(مرقومہ ۱۰ ار فروری ۱۸۸۳ء)

.....نوکری کے باب میں دیکھتا ہوں کہ وہی مایوسی کے کلمے ہیں۔ یونیورسٹی پر آپ مجھے کیوں ڈالتے
ہیں۔ یہ ہے کیا قحبہ! آپ کے جد کی سرکار تو ہے۔ حضرت! اس غلام زاد کو آزاد کر کے وہ دست بردار نہیں
ہوگی، انشاء اللہ آپ دیکھیں گے اس سے بہتر صورت ہوگی، اور بدر جہا بہتر ہوگی..... خوشا بحال آزاد کہ
۵۰ روپے پنشن بھی ہو جائے تو ہزار ہزار شکر خدا کا بجالائے گا، اور بغلیں بجا بجا کر رقص کرے گا۔

حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ اسبابِ جہاں
آنچہ ما در کار داریم، اکثرے در کار نیست

آہا، پھر انشاء اللہ کیا خاطر جمع اور شگفتگی طبع کے ساتھ تصنیفات کو درست کروں۔

(مرقومہ ۲۰/ اپریل ۱۸۸۴ء)

میرا حال یہ ہے کہ ڈائرکٹر صاحب نے گورنمنٹ کے حکم بموجب لکھ بھیجا ہے کہ یکم اکتوبر سے میری
تنخواہ یونیورسٹی سے ملا کرے گی۔ گویا اس تاریخ سے میں ان کے ماتحت سمجھا جاؤں گا۔ یا قسمت!
یا نصیب!

(مرقومہ ۲۷/ جولائی ۱۸۸۴ء)

سر سالار جنگ جن کے نام سے آزاد اپنی 'دربارِ اکبری' کا انتساب کرنا چاہتے
تھے، ان کا فروری ۱۸۸۳ء میں یکا یک انتقال ہوگیا۔ اور آزاد کی وہ تجویز پوری نہ ہو سکی۔

اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

............مگر مشورت طلب یہ نکتہ ہے کہ آیا وہی ڈ ڈیکشن کا مقرری خاکہ رنگ بھر کر سجادوں یا اسے موقوف رکھ کر یہ لکھوں کہ ایسے شخص کے حادثۂ جانکاہ پر عالم نے نالہ وزاری کے معمولی حق ادا کیے اور یادگار کے لئے تاریخیں اور نظمیں لکھیں۔ فقیر آزاد سے اور کچھ نہ ہوسکا۔ یہ کتاب ان کے نام پر لکھتا ہے کہ ان دنوں زیرِ قلم تھی۔

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

مزا تو اس کا جب تھا کہ خود لے کر جاتا اور بعض مقامات اس کے اپنی زبان سے ان کے سامنے پڑھتا، اور دیکھتا کہ کس کس مقام پر وہ کیا فرماتے ہیں۔ ہائے سر سالار جنگ! سارے ارماں دل کے دل میں رہے۔ ہائے سر سالار جنگ!

مولیٰ اسد اللہ الغالب حاضر و ناظر ہیں کہ پھر آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ آپ سے اپنا کیا حال کہوں۔ میرا دل کچھ اور دل ہے۔

(مرقومہ ۲۰ر مارچ ۱۸۸۳ء)

آپ انھیں پھر لکھ دیجئے گا کہ آپ سمجھ لیں میری کل تصنیفات مرحوم مغفور کی ہوچکیں، خدا گواہ ہے مجھے ان سے غائبانہ عشق تھا۔ پہلے کہتا تو خوشامد تھی۔ اب تو خاص ان کے اور میرے درمیان میں معاملہ ہے۔ دیکھئے آج لوحِ روحانی پر ان کا خیال کروں گا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ اس کی باتیں قابل یقین ہرگز نہیں، لیکن اسے میں نے ایک بہلاوا اپنے دل کا کر رکھا ہے، رات کو ایک بجے دو بجے بیٹھ کر باتیں کیا کرتا ہوں۔ اور یقین آپ کریں کہ ابنائے زماں اخوان الشیاطین جو زندہ ہیں، ان سے تو اس کی باتیں بہر حال بہتر ہیں۔

بسکہ از برخورد عالم عکس مطلب دیدہ ام

میرم از آب و از آئینہ پنہاں می شوم

(مرقومہ ۱۸ر مئی ۱۸۸۳ء)

علاّمہ آزاد کو عمر بھر پنجاب میں رہنے اور پنجابیوں سے گفتگو کرتے رہنے کے سبب سے پنجابی بول چال کی عادت ہوگئی تھی، کبھی کبھی اپنی تحریر میں بھی لکھ دیتے تھے۔ انھیں

خطوط میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-"کیا میں نے پنجاب سے نکاح کیا ہوا ہے۔" دہلی میں کہیں گے "کرلیا ہے"۔ 'دربارِ اکبری' میں بھی یہ بات نظر آتی ہے۔ 'آبِ حیات' میں نہیں ہے۔

(۶) فلسفۂ الٰہیات۔ یعنی علامہ آزاد کے "وہ حکیمانہ جذبات جو عربی، فارسی، سنسکرت سے اخذ کیے اور حالتِ بیخودی میں الہامی اُردو کے انداز میں تحریر فرمائے۔"

شاید ساری دنیا کے مصنفوں میں تنہا آزاد کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انھوں نے عالم جنون میں بھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کے اس دماغی اثر کا ذکر ان کے حالات میں آچکا ہے۔ فلسفۂ الٰہیات میں علامہ آزاد کے پوتے آغا محمد طاہر صاحب نے آزاد کے ان حالات کے متعلق ایک دیباچہ شامل کیا ہے۔ اس کا اقتباس یہ ہے:-

جب مشاغل سے فارغ ہوتے تو جس طرح زبانوں کے کھوج نکالتے ہیں اس روحانی فلسفہ کے درپے ہوتے، اور مختلف ممالک کے فلسفوں کو بڑی خوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے پیوست کرتے۔ چنانچہ اس بات کا کچھ ثبوت ناظرین کو اسی کتاب میں ملے گا۔ مگر یہ باتیں اکثر اکیلے میں ہوتیں اور خاص اپنی ذات کے لئے مخصوص تھیں، اوروں سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔

ایک دفعہ ایک تختی لائے جو شاید اب بھی ملتی ہو۔ وہ روحوں کو بلاتی تھی۔ روحیں سوالات کا جواب پنسل سے لکھ دیتی تھیں۔ مگر یہ بہت ابتدائی باتیں ہیں۔ کچھ دنوں بعد اسے پھینک دیا، اور بغیر کسی خارجی مدد کے خود فرماتے تھے کہ فلاں کی یا فلاں جگہ کی روح آئی ہے۔ پہلے خود سوال کرتے پھر تھوڑی دیر خاموش رہتے، بعد ازاں تعجب کے لہجے میں اس بات کا جواب دیتے اور کہتے "اچھا، تو یوں ہے؟" معلوم ہوتا کہ کوئی غیر شخص بہت ہی آہستگی کے ساتھ ان سے کچھ کہہ رہا ہے۔ یا دل و دماغ میں ان باتوں کا جواب اتر رہا ہے۔ جس کو یہ اپنے دل و دماغ کا نتیجہ نہیں سمجھتے، بلکہ کسی اور قوت کا اثر سمجھتے ہیں۔ مگر یہ سب باتیں اس وقت کی ہیں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں لکچرار تھے۔ احباب و آشنا سے ملتے تھے، سارے کام حسب معمول کرتے تھے۔ بایں ہمہ طبیعت میں ایک لٹک سی پیدا ہو چلی تھی، اور اکثر اوقات تنہائی میں آپ ہی آپ باتیں کیا کرتے تھے۔ اسی حال میں ۱۸۸۵ء کے آخر میں ایران کا سفر کیا۔ جہاں سے واپس آکر 'سخندان فارس' مکمل کیا۔ سفرنامہ اور لغت کا مسودہ بنا کر لائے۔ یہ سب چیزیں تو دنیا والوں اور اہلِ ملک کے لئے تھیں۔ اپنے لئے جو کچھ لائے وہ دماغ میں محفوظ تھا۔ پھر کالج

میں آکر لیکچر دینے لگے...... ظاہر میں یہ سب کچھ تھا، لیکن باطن میں دوسرا رنگ غالب آتا جاتا تھا۔ دریں آواں مولانا کی ایک چہیتی اور لاڈوں کی پالی فاضلہ بیٹی کا انتقال ہو گیا، جو بقول مولانا ان کے علمی مشاغل میں ان کی مشیر اور دست راست تھی۔ اس واقعہ نے قلب پر بہت اثر کیا، اور اس دنیا سے جی بالکل اچاٹ ہو گیا......

آخر کار وہ دن آ گیا جب کہ ساغر دل مختلف قسم کی شرابوں سے سراتا پا معمور ہو گیا۔ "پیمانہ بھر چکا تھا، چھلکنے کی دیر تھی" سو اس کے لئے ایک بہانہ مل گیا۔ قدرت نے وہ سامان بھی پیدا کر دیا۔ ۱۸۸۷ء کے لگ بھگ لاہور میں ایک درویش سیّد دھیان شاہ چشتی تشریف لائے، جو کبھی سالک تھے اور کبھی مجذوب...... مولانا کو بھی تقدیر ادھر لے گئی۔ بعد چندے راز و نیاز کی مجلسیں گرم ہونے لگیں۔ تخلیہ کی ان صحبتوں کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا بہت جلد ظہور میں آ گیا کہ مولانا بایں ہمہ علم و فضل دیوانگی و وارفتگی کے ہمدوش ہو کر محبت کے کوچہ و بازار میں رسوائی کا تمغہ لگائے، پریشانی کا پٹکا باندھے، جذب کامل کا علم ہاتھ میں لئے بآواز بلند یہ شعر پڑھتے ہوئے مارے مارے پھریں:-

رنگ لایا ہے دوپٹا ترا میلا ہو کر | اگرئی کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا

ایک دن مولانا کالج سے پڑھا کر نکلے تو بجائے گھر آنے کے نویں کوٹ (سیّد صاحب کی جائے قیام) چلے گئے۔ ابھی چند قدم کا فاصلہ تھا کہ سیّد صاحب (سیّد دھیان شاہ چشتی) نے نظر اٹھا کر دیکھا، مسکرائے اور فرمایا "جا محمد حسین جا، تیرے لئے دلّی کا حکم آیا ہے۔ دلّی چلا جا۔" خدا جانے اس ایک نگہ ناز میں کیا جادو تھا، اور اس ایک فقرے میں کیا تاثیر تھی، جس نے آزاد کو اپنا اسیر بنا لیا۔

.... الغرض "بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید" والی بات ہو گئی۔ حضرت آزاد اسی وقت پیدل دلّی کی طرف روانہ ہو گئے...... دلّی پہونچے مگر عجیب شان سے پہونچے، سر سے پگڑی غائب، پیر میں جوتا ندارد، حال حیران پریشان۔ ایک آنا فانا میں تمام دلّی میں شور مچ گیا۔ رشتہ دار منت سماجت کرتے کہ برائے خدا گھر چلئے، مگر یہاں کون سنتا تھا، کبھی قدم شریف، کبھی استاد ذوق کی قبر، کبھی شہر کبھی جنگل، جہاں مستوں کا من کہتا وہیں جاتے اور دن گذارتے......... آخر دلّی سے خبر آئی تو والد ماجد مرحوم دہلی گئے۔ ڈھونڈا، بہت کچھ سمجھایا مگر ایک نہ مانی......... اس عرصہ میں وہ جذبہ سکون کی طرف مائل ہو چلا تھا۔ ان کے بچپن کے دوست شمس العلماء ذکاء اللہ صاحب مرحوم منا پر جا کر اپنے دولت

خانے پر لے آئے۔ تقریباً ایک سال تک مہمان رکھا، اور وہ وہ ناز برداریاں کیں کہ اس زمانے کی دوستی اور محبت ان پر قربان ہے۔ خود اور سارا گھر گویا ان کے حکم کے پابند تھے۔ اس عرصہ میں طبیعت نے بہت کچھ قرار پکڑ لیا تھا، اور سیّد دھیان شاہ والی کیفیت ہوگئی تھی، کبھی سالک تھے، کبھی مجذوب، چنانچہ والد صاحب دہلی گئے اور اپنے ساتھ لے آئے۔ اب مولانا اپنے علیحدہ مکان میں رہنے لگے۔ آس پاس الماریوں میں کتب خانہ سجا دیا۔ درمیان میں پلنگ۔ ایک گوشہ میں چھوٹا سا بوریا۔ اس پر فرش۔ کاغذ، قلم، دوات سب کچھ پاس رکھ کر بیٹھتے۔ چار پانچ میل سیر کو جنگل یا بیابانوں میں جاتے، جہاں ہر پتہ ان کا مخاطب تھا، ہر درخت ان سے بات کرتا تھا۔ نسیم کا ہر جھونکا ان کے لئے نئی خبریں لاتا تھا۔ پھولوں کی خوشبو خدا جانے کس کا پتہ دیتی تھی۔ غرض کہ صبح و شام کی تفریح ان کی زندگی تھی۔ راہ میں کوئی ملتا اور سلام کرتا تو جواب دیتے اور کھڑے ہو کر اس کے لئے دعا کرتے اور روانہ ہو جاتے۔ دونوں وقت گھر پر کھانا کھاتے۔ آم اور تربوز سے بہت رغبت تھی...... یہ تمام کیفیات گویا مولانا کی ذہنیت کے ابتدائی مراحل سے لے کر انتہائی معراج تک کی ایک مجمل مگر سبق آموز تاریخ ہے۔

سیّد جالبؔ دہلوی نے بھی "مکتوباتِ آزادؔ" کے دیباچہ میں حضرت آزادؔ کے قلبی و دماغی میلان و رجحان کی طرف اشارے کیے ہیں۔ جن کا آخری نتیجہ مستقل بیخودی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جالبؔ صاحب لکھتے ہیں:۔

مولانائے موصوف نے سن رشد و تمیز کو پہونچتے ہی علمی فوائد پر خیالی دلچسپیوں کو ترجیح دینی شروع کر دی تھی، اور اوائلِ شباب ہی میں اپنی طبیعت کا یہ نرالا رنگ معاصرین و احباب پر ظاہر فرما دیا تھا اور بیس بائیس سال کی عمر میں قدامت پرستی کو کھلم کھلا اپنا شعار خاص قرار دے لیا تھا۔ نیز صوفیائے کرام کے معتقدات میں جن دو عالموں جسمانی و روحانی، یا سفلی و علوی کا الگ الگ آباد ہونا مذکور ہے، ان کی دیکھ بھال اپنے لئے ضروری ٹھہرائی تھی، اور اپنے اوقاتِ گرامی کا ایک حصہ روحانیات پر غور کرنے اور دونوں عالموں کے ظاہری و باطنی تعلقات کا پتہ لگانے کے لئے مختص کر رکھا تھا، اور ویدانت اور تصوف میں جو ریاضتیں تزکیہ نفس و تصفیہ باطن کے لئے مقرر ہیں، وہ مہنتوں اور درویشوں کی صحبت میں رہ کر سیکھی تھیں۔ متعدد اشغال و اذکار کو اپنا لازمۂ زندگی بنایا تھا۔ اور ذکر خفی و جلی اور ورد تاؤعلی میں وہ مشق بہم پہونچائی تھی کہ آپ کی سانس کی حرکات بعض اوقات پاس بیٹھنے والوں کو چونکا دیتی تھیں...... ایک

طرف تو یہ خیالات تھے جنھوں نے سالہا سال کی پختگی سے عقائد کا درجہ حاصل کرلیا تھا، اور دوسری جانب وجہ معاش میں بھی آپ کو تعلیم و تحقیق السنہ ہی سے واسطہ پڑا تھا۔ اور اس کام میں جو تین زبانیں فارسی، اُردو اور ہندی آپ کا سرمایۂ امتیاز تھیں، ان کے لٹریچر کا دارومدار صرف شاعری پر آکر ٹھہرا تھا۔ اس لئے آپ کی بود و باش زیادہ تر تخئیل کی دنیا میں رہتی تھی، اور شعرائے ہند و فارس کے نتائج افکار ہر وقت آپ کے انیس خلوت ہوا کرتے تھے۔ اس لئے کوئی محل تعجب نہیں کہ جب ارباب زمانہ کی ناقدری و بیوفائی اور دنیائے دنی کے مصائب و آلام کا ساکنانِ عالم خیال کی دلجوئی و مدارات سے مقابلہ پیش آیا، تو آخرالذکر طمانیت و یکسوئی کا گلزار سراپا بہار دکھا کر، اور سالہا سال بے غل و غش اس میں سیر کرنے کی امید دلا کر حضرت آزاد کی طبیعت کو اپنے طرف کھینچ لینے میں کامیاب ہو گئے، اور مولانائے موصوف جملہ تعلقات دنیاوی سے منھ موڑ کر اور عقل و خرد کے ساتھ ملکی لٹریچر کو روتا چھوڑ کر یہ شعر پڑھتے ہوئے دیار تصور کے گلشن بے خزاں میں پہونچے۔

ز ہشیارانِ عالم ہر کرا دیدم غمے دارد

دلا، دیوانہ شو، دیوانگی ہم عالمے دارد

'خمخانہ جاوید' (تذکرۂ شعراء) میں علاّمہ آزاد کی اس کیفیت کے ذکر میں لکھا ہے:-

رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب فرماتے ہیں کہ جنون کے شروع میں ایک دن آزاد مجھ سے ملنے آئے، اور تقریباً دو ڈھائی گھنٹے باتیں کرتے رہے، مگر ان الفاظ کے بجز اور کچھ زبان پر نہیں لائے کہ رائے صاحب آپ اس شعر کو پڑھا کیجئے، اور اس کے معنی آپ جو چاہیں، سمجھ لیں۔

پردہ درِ کعبہ سے اٹھا دینا ہے آساں　　پر پردۂ رخسارِ صنم اٹھ نہیں سکتا

یہ تفصیل اس لیے لکھی گئی ہے کہ علاّمہ آزاد کی یہ حالتِ جذب و بیخودی صرف مصائب و آلام کا نتیجہ نہ تھی بلکہ یہ مادّہ ان کے آب و گل میں خمیر تھا، اور بقول سیّد جالب کے ''آپ کی بود و باش زیادہ تر تخئیل کی دنیا میں رہتی تھی۔'' یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت و رحمت تھی کہ جب آخر کار ان کی یہ حالت ہونے والی تھی تو پہلے ہی سے ان کے دل و دماغ میں الٰہیات و تصوف کا شوق پیدا کر دیا تھا کہ اس عالم میں بھی بے کیف و بے فیض نہ رہیں۔

قاعدہ ہے کہ اس حالت سے پہلے جیسے خیالات دل ودماغ پر چھائے ہوتے ہیں، وہی اس عالم میں جم جاتے ہیں اور زبان سے نکلتے ہیں۔ آزاد کو ہندوؤں کے فلسفہ والٰہیات سے خاص شغف تھا۔ چنانچہ ان کی اس عالم کی تصنیف 'سپاک ونماک' میں بھی اس کا اثر ہے، اور یہ 'فلسفۂ الٰہیات' تو اول سے آخر تک اسی رنگ میں ہے۔

'فلسفۂ الٰہیات' کو غور سے پڑھ کر دیکھا جائے تو آزاد کی بے ربطی اجزائے حواس میں بھی ایک قسم کی شیرازہ بندی نظر آتی ہے۔ زبان وانداز بیان سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو مضمون وموضوع کی صحیح ترتیب ہوش وحواس کا پتہ دیتی ہے۔ ابتدا میں تمہید ہے، اس کے بعد سات باب ہیں، جن کا نام ملاپ رکھا ہے۔ ہر ''ملاپ'' کا ایک عنوان ہے۔ کہیں عنوان کے نیچے موضوع باب کی تفصیل بھی لکھ دی ہے۔ پہلا ملاپ اس طرح شروع کرتے ہیں:-

پہلا ملاپ (اس میں ان چیزوں کا بیان ہے جنھیں ہم دیکھتے ہیں، اور وہ ہیں۔ اور سوچتے ہیں اور پاتے ہیں کہ ہیں)۔

پہلے ان میں مادّہ ہے۔ وہ ہے، اور وہ معدوم نہیں ہوتا۔ اسے کیسا ہی رگڑو یا کاٹ کر چاہو کہ وہ ایسا ہو کہ سمجھو اب نہیں رہا، یہ نہ ہوگا۔ وہ ایسا رَوہ رَوہ مہین ہو کر عالم اور آفاق میں پھیلا ہوا اُڑ رہا ہے کہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا، اور وہ ہے! وہ کیا ہے؟ وہ ہیولیٰ۔ اس کے رَوے ایسے ننھے ننھے مہین ہیں کہ کسی قوۃ حسّی سے معلوم نہیں ہوتے۔ ان کو بھی چاہیں تو ایک کو دو اور دو کو چار کر ڈالیں، تو وہ رہیں گے۔ یہ نہ ہوگا کہ کہیں اب معدوم ہوگئے۔ اسی کو ہم نے عرب میں کہا ہے کہ ہر جز و مُجزّی ہے، جز و نا مُجزّی محال ہے، اچھا تم ایک جز و نا مُجزّی لاؤ، ہم دوسرا ویسا ہی اور لیں گے۔ ان دو کی درز جہاں ملی ہوئی ہے، اوپر والے کی کسی جگہ پر ہوگی۔ وہیں سے کٹا اور دونوں ٹکڑے موجود۔ انھیں پھر چاہو تو پھر اسی طرح کاٹ لو، اور کاٹتے چلے جاؤ، معدوم نہ ہوں گے۔ اچھا قرعمبیق میں ڈال کر تحلیل کرو۔ وہ نہ رہے گا، اور صورۃ میں ظاہر ہوگا، معدوم نہ ہوگا۔ دھواں ہو جائے گا، ہوا ہوگا، نظر نہ آئے گا، پر ہوگا!

اس طویل عبارت میں کہیں بدحواسی نہیں محسوس ہوتی۔ اسی طرح اسی باب اول کا ایک دوسرا مسئلہ دیکھئے۔ کافی لمبا مضمون ہے اور بالکل مربوط۔ فرماتے ہیں:-

حرکتہ اسے نہیں کہتے کہ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے، مسافتہ طے ہوئی، یا پرندہ اڑا، اور بلند ہوا، یا درخت اگا اور بڑھتا چلا گیا، اوراسی طرح برعکس۔ حرکتہ ایک امر ہے معنوی کے اندر ہے۔ وہ ظہور میں آتا ہے تو حرکتہ اس کی معلوم ہوتی ہے۔ ارسطو نے اسے اور طرح بیان کیا ہے اور عرب نے لیا ہے، اور کہا ہے، هُوَ الخُرُوْجُ مِنَ القُوَّةِ اِلَى الفِعْلِ۔ یہ ہے حرکتہ۔ حرکتہ کو جب ہم سوچتے ہیں تو وہ ایک محرک کی محتاج ہے۔ ہر وقت اسی واسطے ہم اپنے میں حرکتہ کے لئے ارادہ کو ضروری جانتے ہیں اور یہ ان باتوں میں ہے جو اپنے اختیار میں ہیں۔ جو اپنے اختیار میں نہیں اور اپنے میں نہیں، ان میں جو حرکتہ ہو حرکتہ بالغیر کہیں گے۔ محرک جب غیر ہو اور محسوس ہو تو قاسر ہے اور نہیں تو قدرۃ الٰہی ہے اور اگر عادۃ میں نہیں ہے تو الٰہی ہے، اور نہیں تو طبیعی ہے ہم طبیعی کو نہیں لیتے۔ اور قسری کو بھی نہیں لیتے، ارادی کو لیتے ہیں۔

ارادی حرکتہ ہماری دنیا کے کاموں میں ہمیشہ غیروں کی معاونہ کو دیکھتی ہے، کچھ بھی نہیں تو روپیہ اور پانی اور ہوا، سردی میں گرمی، گرمی میں سردی، یہ ضرورت تو بہت محتاج الیہ ہیں کہ بے ان کے گذارہ نہیں۔ ہم اپنی ارادی حرکتہ میں ایسے ایسے غیروں کے محتاج ہیں۔ اگر ہم ایشور کی طرف متوجہ ہوں تو ہمارے کام ہمارے اختیار میں ہوں، اور پھر جب ہم ایک طرف ہوں تو ایشور کی طرف ہوں، اس وقت جانو کہ ہماری ارادی حرکتہ کدھر کو ہونی چاہئے۔ بس وہ ارادہ ایشور کی طرف ہو۔ اس وقت ہم کو اپنی طرف نہ دیکھنا چاہئے۔

یہاں تک بالکل ہوش وحواس میں لکھنے کے بعد یکا یک بہکنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد یہ انداز پیدا ہو جاتا ہے:-

اس وقت ہم کو اپنی طرف نہ دیکھنا چاہئے۔ ہم ہوں ادھر، اور ادھر، اور ادھر، وہ مقام نہیں معلوم ہوتا کہ ایشور کسی وجہ سے دیا فرماتے ہیں۔ ہم کو اُدھر کا دھیان، اور اُن کا دھیان، اُدھر کا دھیان، اور اُن کا دھیان، اُدھر کا دھیان، اور اُن کا دھیان باندھنا چاہئے۔ اُدھر اور اُدھر، وہ مقام پھر معلوم نہیں کہ کس نقطہ سے سری نارائن کی دیا شروع ہوتی ہے۔ مگر ہوتی ہے، اور اعتقاد رکھنا چاہئے کہ ہوتی ہے۔ وہ ہوگا تو ہوگی۔ اور ہوگی اور ہوگی۔

پوری کتاب میں ویدانت کی اصطلاحات فلسفہ اور تصوف کی تشریح ہے۔ جہاں جہاں خدا سے خطاب کرتے ہیں، ہر جگہ ایشور لکھتے ہیں۔ مسئلہ حلول وتناسخ کی طرف جا بجا اشارے

کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ایشور کا اوتار تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ تمہید ہی میں لکھتے ہیں:۔

ہم ہیں اپنے کام میں۔ تم ہوئے ناکام۔ دیکھو یہ ہے ہمارا کام۔ ہم ہیں کہ کرتے ہیں پورا فلسفۂ الٰہی کو اور دیتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں۔ تھے ہم سری مہاراجہ جے چند ہوئے ہم پروفسر آزاد۔

کتاب کا خاتمہ عجیب لکھا ہے۔ بیخودی میں خودی شامل ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ہم نے پتا کا جامیا (اس کے معنی خود آزاد نے "راہِ آگاہی" بتائے ہیں) کو یہاں ختم کیا۔ دیکھ سری جے چند تو ہے راجوں کا راجہ۔ مہاراجہ۔ یہ ہم نے کیا ہے تجکو۔ آج ہے تو ایسا، جو حکم ہم دیتے ہیں، تو جاری کرتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ آج کے چار ہزار برس بعد تو ہوگا پروفسر آزاد اسی کتاب کو تو لکھے گا۔ اپنی زبان میں اسے اُردو کہیں گے۔ اُردو تیرا لشکر ہے۔ زبان کا نام یہ ہوگا۔ ہم نے جو کچھ بتایا ہے وہی تو نے لکھا ہے۔ ہم اس وقت ان سب کو ظہور دیں گے۔ پھر بھی کافر ایسے ہوں گے کہ ہماری قدرۃ کو نہ مانیں گے.......... اب ہم تجھے کہتے ہیں، تو ہے پروفسر آزاد لکھ تو اپنی طرف سے سری مہاراج میں کیا عرض کروں، جو حضور سے ارشاد ہو وہی ہو۔ اچھا ہم کہتے ہیں اے میرے ایشور تو نے کہا، تو نے لکھوایا، مجھ میں کیا طاقت ہے۔ تو نے کہا بس میں نے کہا بس یہی خاتمہ ہو گیا۔ (ہاں پروفسر آزاد) لکھ آج ہے ۲۲/ ماگھ بدی۔ سمت ۱۸۵۳، جنوری کی پہلی ۱۸۹۶ عیسوی۔ ربیع الثانی کی ۱۳۱۶/۲۶ ہجری۔ دن ہے بدھ کا۔ سنہ مہینے۔ مہینوں کی تاریخیں۔ دن کسی میں فرق نہیں۔ یہ ہے ہماری حکمۃ۔ جب ہم اپنا فلسفہ کام میں لائیں گے۔ ٹھیک وہی وقت ہوگا جو ہم وعدہ کر چکے ہیں۔ یہی ہے! یہی ہے! یہی ہے! بس!

مولوی ذکاء اللہ: والد کا نام ثناء اللہ ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں مولوی محمد حسین صاحب آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ساتھ ہو گیا۔ اور ان تینوں میں بڑے تعلقاتِ اتحاد پیدا ہو گئے۔ مولوی ذکاء اللہ کو ریاضی سے خاص مناسبت تھی۔ ماسٹر رام چندر (جن کا ذکر اور نمونۂ تصنیف پہلے آچکا ہے) ریاضی کے استاد تھے اور اپنے اس لائق شاگرد پر خاص عنایت فرماتے تھے۔ ذکاء اللہ صاحب اکثر اول نمبر پر کامیاب ہوتے تھے اور قابلیت کے وظیفے حاصل کرتے

تھے۔ دو تمغے بھی اپنی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر حاصل کئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اسی کالج میں معلّم ریاضی مقرر ہو گئے۔ پھر آگرہ کالج میں سات سال تک معلّم فارسی و اُردو رہے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ گیارہ سال یہ فرائض انجام دے کر ۱۸۶۶ء میں نارمل اسکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ تین سال بعد اورینٹل کالج کی لکچراری کے لیے پروانہ تقرر آیا۔ لیکن اتفاق سے اس کے ساتھ ہی میور سینٹرل کالج الٰہ آباد کی پروفیسری بھی آپ کو پیش کی گئی۔ آپ نے الٰہ آباد کو ترجیح دی اور ۱۵ سال اس کالج میں پروفیسر فارسی رہ کر ۱۸۸۵ء میں پنشن حاصل کی اور پھر عمر کے باقی ۲۴ سال خانہ نشین رہ کر تصنیف و تالیف میں گذار دیے، اور ۷ار نومبر ۱۹۱۰ء ﴿شوال ۱۳۲۸ھ﴾ کو دہلی میں انتقال کیا۔

مؤلف احقر نے آیۂ کریمہ سے تاریخ نکالی۔ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۱۳۲۸ھ) سورۂ بقرہ، رکوع ۱۶۔

ان کی وفات کے بعد ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ایک مضمون ان کے متعلق رسالہ 'تمدّن' دہلی (بابت اگست ۱۹۱۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولوی ذکاء اللہ صاحب کے بعض حالات لکھے ہیں۔ اس لیے 'سیر المصنفین' سے اس مضمون کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

بعض مسلمان یہ بھی پوچھ بیٹھتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کس قسم کے عالم پیدا کرے گی جو پانچ یونیورسٹیاں آج تک پیدا نہ کر سکیں۔ آج کو مولوی ذکاء اللہ زندہ ہوتے تو میں انھیں کو پیش کر دیتا کہ مسلم یونیورسٹی درجۂ تکمیل کو پہونچ کر وما ذلک علی اللہ بعزیز ان جیسے عالم پیدا کر سکے گی، کریم النفس، وسیع الاخلاق، منکسر المزاج، روشن دماغ، متنوع المعلومات، کثیر التصانیف، خیر خواہ عامۂ خلق، فیاض طبع، برٹش گورنمنٹ کے قدر شناس، ارادت مند، راسخ الاعتقاد، صلح کل، مرنجان مرنج۔

مولوی ذکاء اللہ کے ساتھ میرا ربط و ضبط بچپن سے شروع ہوا، جبکہ وہ دہلی کالج، یادش بخیر، کی فارسی جماعت میں تھے اور میں عربی میں، باایں ہمہ ریاضیات میں ہم سبق تھے۔ ماسٹر رام چندر کے شاگرد۔ مولوی ذکاء اللہ کی طبیعت کو ریاضیات کے ساتھ خداداد مناسبت تھی، اور وہ جماعت میں سب سے پیش پیش رہتے تھے، اور اسی وجہ سے وہ ماسٹر صاحب کے منظور نظر بھی تھے۔ اور چونکہ ماسٹر صاحب نے

بڑے بڑے مباحثوں کے بعد عیسوی مذہب اختیار کر لیا تھا، ماسٹر صاحب کی ہمہ وقت کی ہم نشینی کے شبہ سے لوگ مولوی ذکاء اللہ کو مذہب کی طرف سے متہم بھی کرتے تھے۔ لیکن میں مولوی ذکاء اللہ کا سب سے پرانا ملاقاتی ہوں۔ ان کے معاصر جہاں تک مجھ کو معلوم ہے اکثر مر چکے ہیں۔ ایک میں گراں جاں کسی مصلحت سے ارذل العمر کی سختیاں جھیلنے کو بچا ہوں، لیکن تابکے، میں اب بھی گواہی دیتا ہوں، اور مر کر بھی خدا کے حضور میں گواہی دوں گا کہ جہاں تک آدمی کو آدمی کے بطون کا علم ہو سکتا ہے، میرے علم میں مولوی ذکاء اللہ پکے موحد تھے ایک صرف ایک خدا کے بجمیع صفاتہ الکمالیہ قائل، خیر یہ معاملہ تو بینہ و بین اللہ، میں مولوی ذکاء اللہ کی جس ادا کو ہمیشہ نظر استحسان سے دیکھتا رہا، وہ یہ تھی کہ حسد ان کو چھو تک نہیں گیا تھا۔ وہ علم ہی کو بڑی دولت اور بڑی حشمت سمجھتے تھے۔ انھوں نے ساری عمر جو عمر طبعی سے متجاوز ہوئی طالب علمی میں صرف کی، اور پھر بھی نفس واپسیں تک ان کو علم سے سیری نہیں ہوئی۔ وہ علم کو علم ہی کے لئے حاصل کرتے، یعنی علم ہی ان کا مقصود بالذات تھا، نہ ان فائدوں کی طمع سے جو علم پر متفرع ہوتے ہیں۔ انھوں نے مدرسے سے نکل کر نوکری کی حالت میں اور نوکری بھی سر رشتہ تعلیم کی نوکری، از خود انگریزی کا شوق کیا، اور اپنے مطالعہ سے بے مدد استاد اس کو اس درجہ تک پہونچایا کہ گو وہ انگریزی بولنے میں بے مشقی کی وجہ سے ہچکچاتے تھے، مگر ان کی ہر طرح کی معلومات، جو انھوں نے انگریزی کی بدولت جمع کی تھی، اتنی وسیع تھی کہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کو نصیب نہیں ہوتی۔ مولوی ذکاء اللہ نے بعض ایسی مبسوط کتابیں لکھی ہیں کہ ان کے حجم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص ایسی بڑی کتاب لکھنے کے لئے کیسے فرصت پاتا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ کی ایک اور ادا جس میں وہ منفرد تھے، ان کی مستقل مزاجی تھی۔ کہ انھوں نے انگریزی کے اتنے تبحر پر بال برابر اپنی وضع کو نہیں بدلا۔ اور وہ باوجودیکہ سیّد احمد خاں کے گویا پٹھو تھے، مگر انھوں نے ساری عمر ترکی ٹوپی تک نہیں اوڑھی، انگریزی جوتی تک نہیں پہنی۔ میں جاڑوں میں ان کو بوڑھے بنئے کی طرح کا روئی دار پائجامہ پہنے دیکھتا اور ہنسا کرتا۔

غرض مولوی ذکاء اللہ کی وضع ظاہر یا طرز ماندہ بود یا گفتگو سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی ان کو چھو بھی گئی ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو مذہباً وہ بھی یقیناً مسلمان تھے، مگر ان کا دامنِ عقیدت لوث تعصب سے بالکل پاک تھا۔ وہ باہمی میل جول میں مذہب کو دخل ہی نہیں دیتے تھے۔ سب سے خلوص کے ساتھ ملتے، اور حاضر و غائب سب کے ساتھ ایک طرح کا سلوک کرتے۔ یہ ان کے اس خلوص ہی کا نتیجہ تھا کہ مرتو

رہے تھے مولوی ذکاء اللہ، سکرات کی سی بیقراری پادری صاحب کو تھی (یعنی ریورنڈ سی۔ ایف۔ اینڈ روز کو) بظاہر دونوں میں کسی ایک کی کوئی غرض دنیاوی دوسرے سے متعلق نہ تھی، مگر دونوں نے مذہب کی اصلیت کو سمجھا تھا، اور ان کی باہمی محبت الحُبُّ لِلّٰہ کی قسم سے تھی۔ ''مودۃ اہل صفا، دررود چہ در قفا۔''

تصانیف اور ان کی قدردانی: مولوی ذکاء اللہ کو ابتدا سے تعلیم و تعلم اور خدمت علم و فن کا شوق تھا۔ اتفاق سے آپ کو ملازمتیں بھی اسی شغل اور اسی صیغہ کی ملیں۔ ریاضی سے سب سے زیادہ مناسبت تھی تو سب سے زیادہ اسی فن کی کتابیں لکھیں۔ چونکہ ان کے زمانے میں تعلیم اُردو زبان میں تھی، اس لیے ذکاء اللہ صاحب کی ریاضیات و طبیعات کی کتابیں سرکاری نصاب تعلیم میں داخل ہوئیں، اور اس خدمت کے صلے میں گورنمنٹ سے پندرہ سو روپیہ کا انعام ملا۔ اور شمس العلماء اور خان بہادر کے خطابات عطا ہوئے۔ ڈپٹی انسپکٹری کے زمانے میں تعلیمِ نسواں کی وسعت و اشاعت کے صلے میں گورنمنٹ نے خلعت بھی دیا تھا۔ ان کی اقسام تصانیف کی فہرست 'سیرالمصنفین' میں درج کی گئی ہے، اس سے نقل کی جاتی ہے۔

مضمون	تعداد تصانیف مطبوعہ	غیر مطبوعہ	جملہ
ریاضیات	۸۱	۶	۸۷
تاریخ و جغرافیہ	۱۷	۱	۱۸
علم و ادب	۱۶	۰	۱۶
علم اخلاق	۶	۰	۶
طبیعات و ہیئت	۷	۲	۹
سیاست و مدن	۲	۵	۷
میزان	۱۲۹	۱۴	۱۴۳

ان میں سے 'تاریخ ہندوستان' کے ۱۸ حصے ہیں جن کے مجموعی صفحات ۶۱۶۷ ہیں۔ اس کے علاوہ 'سوانح عمری ملکہ وکٹوریہ'، 'کرزن نامہ'، 'سوانح عمری مولوی سمیع اللہ'، 'تاریخ عہدِ انگلشیہ'، 'آئینِ قیصری' بہت سی کتابیں ایسی تصنیف کیں کہ ان سے پہلے ان

موضوعات پر کسی نے نہ لکھی تھیں۔

مستقل ضخیم کتابوں کے علاوہ مولوی ذکاء اللہ نے مختلف رسالوں اور اخباروں میں بے شمار مضامین لکھے، 'تہذیب الاخلاق'، 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ'، 'مخزن' لاہور، 'زمانہ' کانپور، 'رسالہ حسن' حیدرآباد وغیرہ مشہور پرچوں میں بھی لکھتے رہتے تھے، اور 'دشمس' کلکتہ، 'صبح بہار' میسور وغیرہ غیر مشہور رسالوں کو بھی بے تامل لکھ کر بھیج دیتے تھے۔ کسی سے انکار نہ تھا۔

کثرت مطالعہ اور اس کام میں ضبط و استقلال کا یہ عالم تھا کہ اپنے دولت خانہ کوچہ چیلان میں ایک مخصوص جگہ پر دیوار سے تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے، اور اتنی مدت اس جگہ بیٹھے کہ دیوار میں گڑھا ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں میں نے بھی اس ''تکیہ گاہِ علم و فضل' کی زیارت کی تھی۔

مولوی ذکاء اللہ صاحب کے ہم عصروں میں کسی ایک مصنف نے اس قدر کثیر و ضخیم کتابیں نہیں لکھیں۔ لیکن یہ بخت و تقدیر کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ اب ان کی تصانیف کی طباعت، اشاعت، قدردانی اور فیض رسانی کم سے کم ہے۔ ان کی تصانیف ریاضی اور سائنس ان کے زمانے میں شاملِ درسیات رہیں۔ پھر جب تمام اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم و امتحانات انگریزی میں ہونے لگے تو اب ان کی ضرورت نہ رہی۔ تاریخوں اور جغرافیوں کا بھی یہی حال ہوا۔ سوانح عمریاں ملکہ وکٹوریہ، لارڈ کرزن وغیرہ ایسے اشخاص کی تھیں جن سے عام دلچسپی بھی نہ تھی اور انگریزی میں ان سے بہتر موجود تھیں۔ ان کی تاریخ ہندوستان بے شک اپنی ضخامت و تفصیل و تحقیق کے سبب سے قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ تھی۔ لیکن ان کی طوالت و گرانی قیمت کے سبب سے عام لوگ اس سے مستفیض نہ ہو سکے۔ پھر ایک یہ بات بھی تھی کہ مولوی ذکاء اللہ صاحب کی اکثر کتابیں، خصوصاً یہ تاریخ، نہایت معمولی کاغذ اور کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوئیں اور حسن ظاہری میں دلکش و بصارت نواز نہ رہیں۔ اب صرف ان کے مضامین کہیں کہیں درسی کتابوں میں داخل نظر آتے ہیں اور بس۔

مولوی ذکاءاللہ کا طرزِ تحریر: مولوی ذکاءاللہ صاحب کی طبیعت میں اختراع و ایجاد کا مادّہ بہت کم تھا۔ اس لیے ان کی تحریر میں بجز صفائی و روانی اور تفصیل و تجزیہ کے زبان وطرز بیان کا کوئی لطف نہیں، بلکہ ان کی زبان میں محاورہ دہلی کا بھی مزہ نہیں ہے۔ ان کو غور وفکر اور تحقیق و تدقیق کی عادت تھی، اس لیے علمی، تاریخی، سیاسی، اخلاقی ہر قسم کے مضامین کو پوری وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، لیکن مسرت والم، غصہ ونفرت، شوخی وظرافت کے کسی موقع پر ان کے الفاظ سے ان کا جوشِ طبیعت بہت کم مترشح ہوتا ہے۔

ان کی اکثر تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسری زبان سے ترجمہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ مضامین ان کی ذاتی فکر اور آزادانہ تحریر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں محاورہ اردو کے خلاف فارسی محاوروں کا لفظی ترجمہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً تاریخ ہندوستان میں رانا اودے پور کے ذکر کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''سپاہ کشتہ واسیر ہوئی، خویشوں نے مع متعلقوں کے اپنا سر پکڑا۔''

فارسی محاورہ ہے، سر خویشتن گرفتند۔ یعنی اپنا اپنا راستہ لیا، ساتھ چھوڑ گئے۔ کبھی عوام کی زبان کے الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً ''عزت و ناموری'' کے مضمون میں کہتے ہیں:-

''اشرافوں کا ممتاز کرنے والا کمال ہے۔''

ایک جگہ لکھتے ہیں:- ''حضرت اکبر بادشاہ نے پنجاہ سال سلطنت کی۔'' یہاں ''پچاس'' کا لفظ زیادہ فصیح تھا۔ اسی مضمون میں شہر اودے پور کے حال میں لکھتے ہیں:- ''بڑی پرفضا اور خوش جا ہے۔'' یعنی خوش وضع جگہ ہے۔ کبھی غیر متعارف یا کم مشہور الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً اسی بیان میں فرماتے ہیں:-

''اس حسن خدمات کے جلدو میں رائے سندر داس کو رائے رایاں کا خطاب ملا۔''

''جلدو'' کی جگہ انعام وصلہ اچھے لفظ تھے۔ ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ذکاءاللہ صاحب کو الفاظ وعبارت کی طرف کوئی خاص توجہ نہ تھی۔ جو قلم سے نکل گیا، نکل گیا۔

تاریخی کتابیں بڑی کاوش و تحقیق کے ساتھ لکھتے ہیں، چنانچہ خود اپنا طریق نگارش بیان کرتے ہیں:-

''میرا قاعدہ ہے کہ میں سلاطین ہند کی تاریخ نویسی کے لئے وہ تواریخ لیتا ہوں جن کے مؤلف عہد نویس ہوں، اور وہ سب سے زیادہ معتبر و مستند سمجھی جاتی ہوں۔ ان سے تاریخی حالات اخذ کر کے لکھتا ہوں، اور پھر انگریزی تاریخوں سے جن کا ایک انبار میرے پاس موجود ہے، بعض مضامین التقاط کر کے لکھتا ہوں۔''

(تاریخِ ہندوستان، جلد ہفتم، احوال شاہجہاں)

یورپ کے مؤرخوں نے اپنی تواریخ ہند میں غلط بیانیاں کی ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ نے بقول اپنے ان تاریخوں کا کہیں کہیں ذکر کیا ہے۔ اور ان کی غلطیوں کو بیان کیا ہے۔ لیکن یہ تصحیح اغلاط زوردار الفاظ میں نہیں کرتے۔ انگریزوں کی خامیاں بیان کرنے میں جرأت سے کام نہیں لیتے۔

تصانیف کے نمونے: (۱) تاریخِ ہندوستان۔ جلد ہفتم ظفر نامہ شاہجہاں میں رانا اودے پور سے محاربات شاہی کا حال لکھتے ہیں۔ ایک مقام کا مختصر اقتباس یہ ہے:۔

''رانا کا حال ایسا تنگ کیا کہ وہ کسی ایک لحظہ کسی مقام پر آرام نہیں کر سکتا تھا۔ سورج مل، اس کے بیٹے کے ساتھ، اہل و عیال اس کے جابجا پڑے پھرتے تھے، خود تھوڑے آدمیوں کے ساتھ سرگرداں تھا۔ اور برسات کے موسم کا انتظار کرتا تھا کہ وہ راہوں اور گزرگاہوں کو پانی سے گھیر لے، اور مجھے دشمنوں کی آگ سے بچا دے۔

سلطان خرم نے کوہستان کی تنگناؤں میں تھانے بٹھا دیے تھے کہ جہاں رانا کی خبر پائیں، وہاں فوراً اس کے پکڑنے کو لشکر روانہ ہو۔ محمد شاہ کو کلنگ کے بتخانوں کی تخریب اور راجپوتوں کی تادیب کے لئے روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی تاراج شروع کی، اور بہت آدمیوں کو مارا اور قید کیا۔ رائے سندر داس سروہی کی طرف گیا، وہاں رانا کے اہل و عیال کا نشان اس کو بتایا تھا، مگر اس کے پہونچنے سے قبل چتر مان رانا اہل و عیال کو دوسری جگہ لے گیا تھا۔ اس سرزمین میں رائے سندر داس نے قتل و غارت اور اسیر کرنے اور منازل ہنود کے خراب کرنے میں کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی۔ بُت خانوں پر راجپوت بڑے دلیرانہ لڑے۔ اور آخر کو جوہر کر کے مع اہل و عیال مرے۔ اس رائے نے بادشاہ کے حقوق کا پاس کیا اور اپنے آئین و کیش کا کچھ خیال نہیں کیا۔ بتوں کو جلایا اور بت خانوں کو ڈھایا۔

بدل ہا چناں مہر او خانہ ساخت — کہ ہندو بہ تخریب بت خانہ تاخت

اس حسن خدمات کے جلدُ دمیں رائے سندرداس کو رائے رایاں کا خطاب ملا، اور رفتہ رفتہ اس کا درجہ ایسا بڑھا کہ راجہ بکرماجیت کا خطاب مرحمت ہوا۔ جس سے بڑھ کر راجاؤں کے واسطے کوئی خطاب نہیں۔"

شاہجہاں کے حال میں لکھتے ہیں:۔

جب شاہجہاں نے تخت شاہی پر جلوس کیا تو مراسم ملّت مصطفوی و شریعت محمدی کا جس میں کچھ خلل پڑ گیا تھا، ایسا پاس ولحاظ تھا کہ اول حکم اس نے یہ دیا کہ سجدہ کرنے کی تعظیم کا، معبود حقیقی سزاوار ہے۔ اب آئندہ کوئی دوسرے کے لئے اپنی پیشانی کو خاک مذلّت پر نہ رکھے، یعنی عہد اکبری میں بادشاہ کو جو سجدہ کرنے کا دستور تھا وہ موقوف کیا۔ مہابت خان خانخاناں نے معروض کیا کہ جہاں آفریں نے نظام عالم کے لئے اپنے بندوں کو مرتبہ نوازش و بزرگ داشت میں متفاوت پیدا کیا ہے۔ ایک کو اوج، عزت و رفعت عنایت کیا، اور مرتبہ والا خداوندگاری اور پایہ بلند فرماں گذاری پر پہونچایا، اور مسند کامگاری و بختیاری پر متمکن کیا، اور دوسرے کو حکم پذیری اور فرماں برداری کے لئے پیدا کیا۔ اور ہر ایک کو استعداد کار کے اندازہ اور حالت روزگار کے موافق اس کے امور ضروریہ کے اہتمام میں مدد و معاون بنایا۔ ایسے ہی مراتب تعظیم و تفاوت کو لوازم انتظام اور مراسم قوام عالم بنایا، اگر حضرت کو پرہیزگاری اور احکام الٰہی کی اطاعت کے سبب سے سجدہ ناپسند ہے تو اس کی جگہ زمیں بوس مقرر کیا جائے، جس سے مخدوم خادم ہیں اور رئیس مرؤس ہیں، اور سلطان و رعیت ہیں، استقامت امور جمہور کے لئے امتیاز نہ ہو۔ بادشاہ دیں پناہ نے اس کی ملتمس کو منظور کیا، اور یہ قرار دیا کہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کے پشت دست پر بوسہ دیں۔ اس کا نام "زمیں بوس" رکھا گیا۔ مگر اس میں بھی سجدہ کے ساتھ مشابہت ہوتی تھی، اس کو بھی موقوف کر کے تسلیم چہارم مقرر کی۔ جس کا نام آگے آئے گا۔ اور سادات کو کہ تکریم و تعظیم کے مستحق ہیں، اور فضلاء، صلاح آثار اور درویشان پرہیزگار، اور زاویہ نشینان عبادت گذار کو اس زمیں بوس سے معاف کیا، اور یہ مقرر کیا کہ جس وقت بادشاہ سے ملاقات ہو تو "سلام علیکم" کریں اور جب رخصت ہوں تو فاتحہ پڑھیں۔

(۴) تاریخ عہد انگلشیہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے اخلاق و عادات بیان کرتے ہیں:۔

اس نے اپنی سرکار کی خیر خواہی اور خیر اندیشی میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر اس میں اس نے اخلاق کی نیکی پر خیال نہیں کیا۔ جس وقت سرکار نے روپیہ مانگا، تو اس کے سرانجام کرنے میں کسی بات کا آگا پیچھا نہیں سوچا۔ از راہِ ظلم و تعدی جو دولت کا سامان کیا، اہل انگلستان نے اس کو بے سروسامانی سمجھا۔ اس کی طبیعت کا خمیر ایسا تھا کہ وہ عدالت اور صداقت کو ضرورت کے وقت کچھ چیز نہیں سمجھتا تھا۔ اور مروت و فتوت کو انسانیت میں داخل نہیں جانتا تھا۔ "گر ضرورت بود روا باشد" پر عمل تھا۔ وہ خودرائی کے سبب سے بر خود غلط اتنا تھا کہ اپنے سامنے افلاطون کی بھی حقیقت نہیں جانتا تھا۔ ہر کام اس کا ایک رازِ سربستہ اور سرِّ پوشیدہ تھا۔ کسی کام کی اصل و حقیقت کھلنے ہی نہیں دیتا تھا۔ گو اس کے ظاہر ہو جانے سے نقصان نہ ہو۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ہر کام کو بڑے پیچ پاچ سے کرتا تھا۔ غرض اس میں جو خوبیاں تھیں وہ تحسین کے قابل تھیں، اور جو برائیاں تھیں وہ نفریں کے لائق، یوں سمجھنا چاہئے کہ رعایا پروری، سپاہ کی دلداری، لوگوں کو اپنا کر لینا، رفاہیت عباد اور معموری بلاد کا خیال، یہ سب خوبیاں اس میں ایسی تھیں کہ وہ ایک طوطی خوش رنگ کی طرح خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اپنی سرکار کی نمک شناسی کے سبب سے اس کی گنجینہ آمائی، دولت افزائی ایک ایسی بلی اس میں تھی کہ وہ اس طوطی خوش رنگ کو نوچے کھاتی تھی۔ مگر اس بلی کے بھنبوڑنے کے لئے اس کے پاس ایک کتا بھی موجود تھا، جو اس کی خود پرستی اور خودرائی تھی۔ غرض یہ فضائل اور رذائل اس میں کام کر رہے تھے، جو ایک بڑے بند مکان میں طوطی اور بلی اور کتا کام کریں۔

یہ تشبیہ نہایت درست اور موزوں پیدا کی ہے۔

(۳) مضامین ذکاء اللہ: یہ ادبی خدمت دوسری مستقل ضخیم تصانیف سے کچھ کم وقیع و گراں قدر نہیں ہے۔ سرسیّد کی طرح مولوی ذکاء اللہ نے بھی مختلف ضروری موضوعوں پر بے شمار مضامین لکھے ہیں اور ہر مضمون اس قدر صحتِ فکر، قوت استدلال اور تفصیل و تشریح کے ساتھ لکھا ہے کہ حقیقت میں حق ادا کر دیا ہے۔ بعض مضامین انگریزی سے تقریباً لفظی ترجمہ ہیں، بعض انگریزی مضامین سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اکثر ان کی اپنی فکر کا نتیجہ ہیں۔ ان کے بیان کی متانت و سلاست جو اور تصانیف میں ہے، یہاں بھی ہے، بعض مضامین میں جدّتِ تخئیل اور لطف بیان ایسا ہے جو ان کی تاریخوں میں نہیں ملتا۔ چند مضامین سے مختصر

اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:-

(الف) ادب۔ ادب کے معنی اس ریاضت محمودہ اور کوشش وسعی کے ہیں جس سے کسب فضیلت ہو۔ ہر چیز کی حد کی نگہداشت کو اور ہر فعل محمودہ کی تعظیم کو بھی ادب کہتے ہیں۔

تو اپنے نفس کو وہ ادب سکھا کہ بے ادب اسے دیکھ کر باادب ہو جائیں۔ جو ادب سکھانے کا شوق رکھتا ہے وہ بے ادبوں کو اپنا ہی سا بنا لیتا ہے۔ جیسے آہوئے وحشی جو گھر میں دانا کھاتا ہے، وہ اور آہوں کو پکڑ لاتا ہے۔ جو اپنے اخلاق کی بنیاد ادب پر رکھتا ہے، اس کا فکر استاد ہو جاتا ہے۔ بزرگی کی جڑ ادب سے مستحکم ہوتی ہے۔ تو لالہ وگل کی طرح تھوڑا سا خندہ کر کہ سب کو مطبوع ہو، نہ یہ کہ ایسے قہقہے لگائے کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں۔ بے خرد جس کو مزاح کہتے ہیں، وہ خردمندوں کے نزدیک نبرد صلاح ہے۔ اگر تمھاری داڑھی کوؤں کے پروں کی سی سیاہ ہو، تو بڈھوں کی بگلا کی سی سفید داڑھی کی ہنسی نہ اڑاؤ۔ اگر تم سمن عارض اور گل عذار ہو تو زنگی کے سامنے آئینہ رکھ کر اسے نہ چڑاؤ، کیونکہ کوئی بدصورت دنیا میں بے مصلحت نہیں ہوتا، ایک چینی جس کا رنگ سرخ وسفید تھا، ایک زنگی پر ہنسا، تو زنگی نے جواب دیا کہ "میرا ایک نقطہ تیرے چہرے کے لئے زیب ہے، اور تیرا ایک نقطہ میرے لئے ایک عیب ہے۔"

یہ عبارت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے اخلاق کی کسی فارسی کتاب کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہو۔

(ب) ذیل کا مضمون انگریزی کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے جو مشہور مصنف بیکن نے لکھا ہے، بلکہ جابجا اس کا لفظی ترجمہ ہے:-

کتب کا مطالعہ۔ مطالعہ تنہائی اور عزلت میں خوشی بخشتا ہے، گفتگو وتقریر میں حسن پیدا کرتا ہے، معاملات کے فیصلے اور مقدمات میں رائے دینے کی قابلیت بڑھاتا ہے۔ بس مطالعہ سے حسن بیان اور قابلیت بڑھتی ہے۔ گو معاملات مقدمات کے تیز وچالاک آدمی بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ مگر مقدمات و منصوبوں کی ترتیب اور عام اصلاح کی تدابیر جیسی چاہیے، عالم وفاضل ہی کرتے ہیں۔

تم اس واسطے نہ پڑھو کہ لوگوں کے خلاف باتیں کہیں گے اور ان کی باتوں کی تردید کریں گے یا سب باتوں کو یقین وتسلیم کریں گے، یا ہم خود بہت سی باتیں بنائیں گے۔ بلکہ پڑھنے سے مقصود اعظم یہ ہو کہ ہم لوگوں کی باتوں کو تولیں گے اور سوچیں گے، پھر جو عمل کے قابل ہوں گی ان پر عمل کریں گے۔

بعض کتابوں کا صرف مزہ چکھا جاتا ہے، یعنی ان میں سے کچھ کچھ پڑھا جاتا ہے۔ بعض بالکل نگل

جاتی ہیں۔ یعنی کُل پڑھی جاتی ہیں مگر بے توجہی اور بے غوری سے۔ بہت تھوڑی کتابیں ہیں جو چبا چبا کے ہضم کی جاتی ہیں، یعنی اول سے آخر تک بڑی توجہ اور غور و خوض سے پڑھی جاتی ہیں۔ کتابوں کے انتخاب سے جو کتابیں بنتی ہیں، ان کا حال آبِ مقطر کا سا ہے۔

(ج) مولوی ذکاء اللہ کی انشا پردازی، قوت تخیل اور جدت آفرینی کا ایک دلچسپ نمونہ ذیل کا مضمون ہے۔ بعض حصے حذف کر کے شروع سے آخر تک نقل کیا جاتا ہے:۔

آگ۔ اللہ جل شانہٗ نے اپنی مخلوق میں اپنی صفات کی نشانیاں عجب حیرت انگیز ادا سے دکھائی ہیں کہ انسان ان نشانیوں کو ذی نشان سمجھ کر اپنا معبود بناتا ہے، حقیقت تک عدم رسائی کی وجہ سے مجاز میں بالکل محو ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں کی ازلی الٰہی کتاب میں آگ (اگنی) کا بیان دیکھو تو تم کو معلوم ہوگا کہ وہ نشان کبریائی دکھا رہی ہے، معبود بنی بیٹھی ہے، آدمیوں کو اپنا بندہ بنا کر پوجا کرا رہی ہے۔ ہمہ دانی کی صفت سے اس کی ذات موصوف ہو رہی ہے (یہ وہ صفت ہے کہ اللہ ہی کی ذات سے مخصوص ہے) اس کی ذات کی نسبت وہ نکتے بیان ہو رہے ہیں کہ ان کے سمجھنے کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی ذہانت کی ضرورت ہے۔

یہ مثل کہ ''آگ میں مُوتو یا مسلمان ہو'' ایسے محل پر بولی جاتی ہے، جہاں ہر طرح سے کام کرنے میں برائی ہی برائی ہو۔ آگ ہندوؤں کی معبود ہے، اگر اس میں مُوتے تو نرک میں پڑے، مسلمان ہو تو جہنم میں جائے۔ دونوں طرح سے خرابی ہی خرابی ہے۔ آگ ہندوؤں کی ایسی معبود ہے۔

زردشتیوں کی کتابوں میں آگ نورِ الٰہی کا ظہور دکھا رہی ہے۔ آدمیوں کے سر کو اپنے آگے سجدے میں جھکا رہی ہے، اپنی پرستش کے لئے آتش کدے بنوا رہی ہے، جن میں بجنسہٖ درخشاں و تاباں رہتی ہے...... ارسطاطالیس نے استقراء سے اربعہ بسائط عنصریہ، خاک، باد، آب، آتش، قرار دئے مگر عناصر کو بسیط حالت میں کوئی نہیں دیکھ سکا۔ آتش حالتِ بسیط میں زمین پر معدوم اور کرۂ نار میں موجود، انسان کرۂ نار میں پہونچ کر کیوں کر دیکھ سکتا ہے۔ خاک حالتِ بسیط میں زمین کے طبقۂ اولیٰ اور طبقۂ طینیہ کے نیچے بیٹھی ہے۔ تحت الثریٰ میں جا کر اس کی زیارت ہو سکتی ہے، جو انسان کے لئے ناممکن ہے۔ ہوا بسیط حالت میں کرۂ ہوا کے طبقۂ سیوم میں موجود ہے۔ انسان اگر پر لگا کے جائے تو اس کی قدم بوسی کر سکتا ہے، مگر یہ بھی ممکن نہیں، پانی تو کہیں حالتِ بسیط میں مل ہی نہیں سکتا۔

ارسطو کے نزدیک ان چاروں عنصروں کا مولد ایک ہی ہے۔ مگر محققین زمانۂ حال آگ کو ہیولیٰ سے خالی جانتے ہیں، اور اس کو مادّی نہیں مانتے۔ حرکت سے کہتے ہیں کہ حرارت پیدا ہوتی ہے۔ آگ بھی حرارت کی ایک کیفیت ہے۔ ان مباحث میں ہنگامۂ سخن گرم کرنے سے مجھے اندیشہ ہے کہ قلم دیا سلائی بن کر میرے ہاتھ کو نہ جلائے۔

آگ عجیب نا مبارک اولاد ہے۔ پیدا ہوتے ہی ماں باپوں کو کھا جاتی ہے۔ جن لکڑیوں کی زنا شوئی سے پیدا ہوتی ہے، انھیں کو جلا کر خاک کر دیتی ہے، اور آپ ماں باپ کو مار کر زندہ رہتی ہے ...... آگ ہماری دشمن جانسوز بھی ہے اور دوست دل افروز بھی۔ وہ گھر گھر مبارک مہمان ہے۔ مہربان دوست ایسی کہ ہماری راحت کے لئے ہماری رنج و تکلیف کو دور کرنے کے لئے، آرام و آسائش کے واسطے، صدہا ضروریات زندگی کے رفع کرنے کے واسطے وہ سامان مہیا کرتی ہے۔ ہمارے چولھے پر ماما گری کرتی ہے، اُپلے، کنڈے جلا کر روٹی اور کھانا پکاتی ہے۔ آگ ہی نے انسان کو پکانا سکھایا ہے جس کے سبب سے وہ حیوانوں میں ممتاز ہو گیا ہے۔ جیسا انسان حیوانِ ناطق کہلاتا ہے، ایسا ہی پرندہ حیوان۔ کیونکہ حیوان اپنی ہنڈیا پکانے کے لئے آگ پر نہیں چڑھاتا۔ یہ تو حضرت انسان ہی عقل کے پورے ہیں کہ پھو پھو کر کے آگ روشن کرتے ہیں، اور اپنی خوراک پکاتے ہیں، اور اس کی دھونی سے آنکھوں کو اذیت پہونچاتے ہیں۔

جن ملکوں میں سردی کی شدت ہے اور برف کثرت سے پڑتی ہے، وہاں بغیر آگ اور ایندھن کے آدمی کا جینا مشکل ہو جاتا ہے.......... انگلستان ایک سرد ملک ہے۔ اس کے اندر ہر گھر میں ایک آتشدان ہوتا ہے جس کے گرد گھر والے آگ تاپنے بیٹھتے ہیں۔ بڑے چھوٹوں کو طرح طرح کے سبق سکھاتے ہیں۔ وہ بچپنے کی اون کے ساتھ ایسے بنے جاتے ہیں کہ بڑھاپے تک ان کے تار و پود ٹوٹتے نہیں، دلوں پر وہ نقش جماتے ہیں کہ عمر کی درازی ان کو مٹا نہیں سکتی، وہ پتھر کی لکیر ہوتے ہیں۔ امتداد زمانہ ان پر زنگ نہیں چڑھا سکتا۔ یونیورسٹی کے "آنر" پانے والے بہت تھوڑے آدمی ہوتے ہیں مگر آتشدانوں کے گریجویٹ سب ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی میں جو تحصیل علم ہوتا ہے وہ ایک مدت کے بعد حافظہ میں پژمردہ و مُردہ ہو جاتا ہے، مگر ان آتشدانوں کے گرد کا سبق پڑھا ہوا ہمیشہ زندہ و تازہ رہتا ہے۔

جاڑے کے موسم میں ہندوستان میں دیہات میں صبح شام رات کو دیکھو کہ ایک الاؤ جلتا ہے۔جس کے گرد گنوار حلقہ باندھ کر خشک زمین پر اکڑوں بیٹھتے ہیں اور چلم میں بہت سی آگ بھر کر ایک حقہ پر رکھتے ہیں، اور اس کا دور لگاتے ہیں۔ ایک ایک دو دو گھونٹ پی کر حقہ کی نے دوسرے منہ کی طرف کر دیتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنی اولاد کے بیاہ شادی کرنے کی، گائے بھینس کے بیاہنے کی، بھیڑ بکری کے پالنے کی، اور کھیتی کے بگڑنے سنورنے کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ عجیب دلچسپ اور دل ربا ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ان کو سنے تو اس کو وہ علم حاصل ہو جو کبھی کتابوں سے نہیں حاصل ہو سکتا۔

اب تک ہم نے آگ کی دوستی کا بیان کیا۔ اب اس کی دشمنی کا ذکر سنو کہ جب یہ مادرِ مہربان ہم سے خفا ہوتی ہے تو خدا کی پناہ! اس کے آتش ناک غصہ کے سامنے ساری مخلوق بھاگتی ہے، مگر وہ بھلا کب اس کو چھوڑتی ہے، اس طرح پکڑ لیتی ہے جیسے بھاگتے ہوئے لشکر کو دشمن پکڑ لیتا ہے، اور فنا کر دیتا ہے۔ جس چیز کو چھوتی ہے چاٹ کر سیاہ کر دیتی ہے۔ کھیتوں کو اس طرح کاٹتی ہے جیسے کہ نائی قینچی سے داڑھیوں کو تراشتا ہے۔ جب درختوں کی رگڑ سے وہ پیدا ہوتی ہے تو جنگل کے جنگل جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے۔ جب وہ بھڑکتی ہے اور اپنے شعلے ہوا میں اڑاتی ہے تو سمندر کی لہروں کی کیفیت دکھاتی ہے۔ سمندر میں بھی وہ فاسفورس کی روشنی کے جلوے خوب دکھاتی ہے۔ جہاں آگ ہو کر گذر جاتی ہے، وہ جگہ دھوں دھار ہو کر تاریک ہو جاتی ہے۔ وہ دھویں کا تاج سر پر لگا کے اور شعلوں کے بال بنا کے تاریکی کو دور کر دیتی ہے۔

غرض آگ بھی عجیب چیز ہے کہ زمین پر نار ہے، آفتاب میں نور ہے، آسمان پر بجلی ہے، لوہے اور چقماق میں شعلہ ہے۔ گرم ملک والوں نے جو جہنم بنایا ہے، اس میں وہ گنہگاروں کی تعزیر کے لئے ایک سخت عذاب ہے۔ سرد ملک والوں نے جو جنت بنائی ہے اس میں نکوکاروں کے تاپنے اور آرام کرنے کے لئے جاں فزا ہے۔

خدانخواستہ اگر آتش دنیا سے معدوم ہو جائے تو بہت سے کام دنیا کے ٹھنڈے ہو جائیں۔ نہ چونا پکے کہ اینٹ پتھر کو جوڑے، نہ ریت سے منہ دیکھنے کا شیشہ بنے۔ غرض عالم کے حسن کے بڑے حصہ میں گرما گرمی اور دلفریبی نہ رہے، اس کا جوبن خاک میں مل جائے، اس کی بہار پر خزاں آجائے۔

آگ اپنے تئیں کھاتی ہے۔ اگر اس کو کوئی چیز کھانے کو نہ ملے۔ اَلنَّارُ تَاکُلُ نَفْسَهَا اِنْ لَمْ تَجِدْ مَا تَاکُلُهٗ ۔ آگ خاکستر ہو کر بہت آدمیوں کو کھلاتی ہے اَلنَّارُ کَثِیْرُ الرَّمَادِ لِاَنَّهَا تُطْعِمُ الْعِبَادَ۔

''آب و آتش را چہ آشنائی۔'' آگ پانی کو بخار بنا کر اڑاتی ہے، اس طرح اپنے دل کا بخار نکالتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے، اس لئے کہ یہ عنصر انسان کے کاموں میں ہمیشہ زیادہ آئے، ہوا کو اس کا خدمت گار مقرر کر دیا ہے کہ اس پر پنکھا جھلا کرے۔

مولوی نذیر احمد: والد کا نام مولوی سعادت علی ہے۔ ۶؍ دسمبر ۱۸۳۶ء ﴿۲۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۲ھ﴾ کو پیدا ہوئے۔ وطن اصلی موضع ریہڑ تحصیل نگینہ، ضلع بجنور ہے۔ شاہ عبدالغفور اعظم پوری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں۔ اعظم پور ضلع بجنور میں ہے۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے مشاہیر اولیاء اللہ میں تھے۔ مولوی نذیر احمد کی ننھیال بھی علماء کے خاندان میں تھی، جو شاہی زمانے میں قاضی رہ چکے تھے۔ چار برس کی عمر میں والد صاحب کے ساتھ بجنور آ گئے۔

ابتدائی تعلیم: ابتدائی تعلیم کچھ مکتب میں اور کچھ والد صاحب سے حاصل کی۔ والد خود بڑے عالم تھے۔ ۹ برس کی عمر تک انھوں نے فارسی عربی پڑھائی۔ پھر مولوی نصر اللہ خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر بجنور سے پانچ سال تک عربی نحو، منطق، فلسفہ پڑھا۔ ۱۴ برس کی عمر تھی کہ والد ان کو لے کر دہلی آئے، اور مدرسہ مسجد اورنگ آبادی کے فاضل مدرس مولوی عبدالخالق کے سپرد کر گئے۔ یہاں مولوی نذیر احمد نے بالکل طالبانہ زندگی بسر کی، جس کا حال مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد صاحب کی زبانی اس طرح لکھا ہے:-

''پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھبری ہاتھ میں لے، گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دے دی، کسی نے قیمے کی لگدی ہی رکھ دی، کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں پر ہی ٹرخایا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبد الخالق صاحب کا مکان تھا۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی ہیں، ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ اِدھر میں

نے قدم رکھا، اُدھران کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوالیتی، نہ گھر سے نکلنے دیتی، نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلے بھر کا مصالحہ اٹھالاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا۔ بخدا جان سی نکل جاتی تھی...... بہر حال مارا دھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی۔'' (از مضمون مطبوعہ رسالہ اُردو)

دہلی کالج کی تعلیم: اس طالب علمی اور ٹکڑ گدائی سے مولوی نذیر احمد خوش اور مطمئن نہ تھے، لیکن طلب علم کی خاطر گوارا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن دہلی کالج میں تقسیم انعام کا جلسہ تھا۔ یہ بھی اتفاق سے اُدھر جا نکلے۔ تماشائیوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ یہ گر پڑے اور چوٹ لگ گئی۔ حسن اتفاق سے کالج کے پرنسپل نے دیکھ لیا، ان کو اُٹھا کر بڑی ہمدردی اور شفقت کی اور پوچھا، کیا پڑھتے ہو؟ انھوں نے کہا شرح مُلاّ اور ابوالفضل پڑھتا ہوں۔ جلسے کے بعد پرنسپل کے کہنے سے مفتی صدرالدین خاں صاحب نے شرح ملاّ میں مولوی نذیر احمد کا امتحان لیا، انھوں نے نہایت عمدہ جواب دیے۔ پرنسپل نے کالج میں داخل (۱) کرلیا اور چار روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جو بڑھتے بڑھتے چوبیس

---

(۱) نذیر احمد صاحب کے کالج میں داخل ہونے کا سال ۱۸۴۵ء ان کی سوانح عمری ''حیات النذیر'' میں اور اس سے ''سیر المصنفین'' وغیرہ تذکروں میں درج کیا گیا ہے، اور بہت تذکروں نے ان کا سالِ ولادت بھی ۱۸۳۶ء لکھا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ ۹ برس کی عمر تک والد صاحب سے اور اس کے بعد ۵ سال مولوی نصر اللہ خاں سے تعلیم پا کر بجنور سے دہلی آئے۔ اس حساب سے دہلی آنے کے وقت ان کی عمر ۱۴ سال کی ہوتی ہے۔ تو ولادت کے سال مذکورہ کے حساب سے ۱۸۵۰ء میں دہلی آئے۔ پھر ۱۸۴۵ء کالج میں داخل ہونے کا سال کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اس سال ان کی عمر ۹ سال کی ہوتی ہے۔ ان سنوں کی تاویل و تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ مولانا کا سالِ ولادت ۱۸۳۶ء ان کی بڑی عمر میں اور ملازمت کی حالت میں کسی پنڈت نے ان کا جنم پتر بنا کر بتایا تھا۔ خود ان کو اپنا سالِ ولادت ۱۸۳۳ء یاد تھا، اور یہی سال انھوں نے ڈپٹی کلکٹری کی درخواست میں لکھا تھا۔ قرائن و حالات سے یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ سنہ ۱۲۴۸ھ اور ۱۲۴۹ھ کے مطابق ہوتا ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

روپیہ ماہوار ہوگیا۔ اس وظیفے کے متعلق وہ خود بیان کرتے ہیں:۔

''مجھ کو مرحوم دہلی کالج میں اپنا وظیفہ پانا یاد آتا ہے۔ جس دن سے وظیفہ شروع ہوا میں نے اور نہ صرف میں نے بلکہ ہمارے سارے خاندان نے اس کو سلسلہ ملازمت کا آغاز سمجھا۔''

دہلی کالج میں مولوی ذکاء اللہ ان کے ہم جماعت تھے۔ مولانا نذیر احمد کو ریاضی اور تاریخ سے دلچسپی نہ تھی، لیکن وظیفہ کی خاطر پڑھتے تھے۔ کالج میں داخل ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا تھا کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد مولانا اور محنت سے پڑھنے لگے۔ آخر ۱۸۵۴ء میں آٹھ سال کی تعلیم کے بعد کالج چھوڑا۔ کالج کی تعلیم کے متعلق خود لکھتے ہیں:۔

''معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن (درگذر)، گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہاد علی البصیرۃ، یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں، اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں، ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا، مولوی ہوتا تنگ خیال، متعصب، اکل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا۔''

جس زمانے میں نذیر احمد صاحب مولوی عبد الخالق صاحب سے پڑھتے اور ان کے گھر کا کام کیا کرتے، ان کی خورد سال پوتی کو گود میں لیے پھرنا اور اس کی ٹہل کرنا بھی ان کے ذمے تھا۔ خوبیِ تقدیر سے آخر بڑے ہوکر اسی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی۔ مفتی صدر الدین صاحب نے نکاح پڑھایا اور گیارہ ہزار کا مہر باندھا گیا۔ پھر مولانا نے ایک اور نکاح اپنے کنبے میں والدہ کے اصرار سے کیا۔ لیکن اس سے نباہ نہ ہوسکا، اور طلاق پر معاملہ کو ختم کرنا پڑا۔

ملازمت: ۱۸۵۴ء میں کنجاہ ضلع گجرات (پنجاب) میں چالیس روپے ماہوار

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اس زمانے میں مسلمان عموماً ہجری سال سے واقعات کا حساب لگایا کرتے تھے۔ اس حساب سے مولانا جب ۱۴ سال کی عمر میں دہلی آئے تو ۱۲۶۱ھ یا ۱۲۶۲ھ ہوگا اور یہ ۱۸۴۴ء کے مطابق ہے۔ اس طرح کالج میں داخل ہونے کا سال ۱۸۴۵ء ہوسکتا ہے۔

کے مدرس ہوئے۔ دو برس بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور آگئے۔ یہاں انگریز انسپکٹر سے نہ بنی، اس لیے استعفادے کر دہلی چلے گئے۔ ابھی دہلی پہونچے نہ تھے کہ ۱۸۵۷ء کا غدر برپا ہو گیا۔ یہ بھی غدر کے مصائب میں مبتلا رہے۔ اتفاق سے اس ہنگامے میں نذیر احمد صاحب نے ایک میم کی جان بچائی۔ غدر کے بعد اس خدمت کے صلے میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس الٰہ آباد مقرر ہوئے۔

الٰہ آباد میں نذیر احمد صاحب منشی عبداللہ خاں صاحب امین عدالت کے مکان پر مقیم ہوئے۔ منشی صاحب انگریزی جانتے تھے۔ ان کی ترغیب سے انھوں نے بھی انگریزی پڑھنی شروع کی اور کافی قابلیت پیدا کر لی۔ مولانا نے ایک لکچر میں انگریزی پڑھنے کے سلسلے میں کہا تھا:۔

"میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں۔ والد صاحب مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے، مگر اپنے وقت کے بڑے دیندار، صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مر جانا منظور، اس کا بھیک مانگنا قبول، مگر انگریزی پڑھنا گوارہ نہیں۔"

اسی زمانے میں گورنمنٹ نے ان کو قانون انکم ٹیکس کے ترجمہ کی خدمت سپرد کی۔ یہ ترجمہ بڑی قابلیت سے کیا۔ اس کے بعد تعزیراتِ ہند کے ترجمہ کا کام ملا۔ اور اس کے صلے میں کانپور کی تحصیل داری ملی۔ دو برس تحصیل دار رہے۔ ترجمہ ختم ہونے پر ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے۔ پھر ایک انگریزی علمِ ہیئت کی کتاب کا ترجمہ 'سمٰوات' کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ تنقید و نظر ثانی کی غرض سے ریزیڈنٹ حیدر آباد کے ذریعہ سے امیر کبیر مدار المہام ریاست کے پاس بھیجا گیا۔ امیر کبیر علم ہیئت و ریاضی کے بڑے ماہر تھے (اس داستان تاریخ اُردو کے صفحہ ۳۰۲ پر ان کا ذکر آ چکا ہے) مولوی نذیر احمد کا ترجمہ بہت پسند کیا گیا، اور ان کی غیر معمولی ذہانت و قابلیت نے ایسا تاثر پیدا کیا کہ سر سالار جنگ نے ان کو حیدر آباد بلا لیا۔

نواب عماد الملک مولوی سیّد حسن بلگرامی اور نواب محسن الملک کے خطوط مولوی نذیر احمد کے پاس آئے کہ سر سالار جنگ آپ کی خدمات حیدر آباد کے لیے منتقل کرانا

چاہتے ہیں۔ پھر سر سیّد احمد خاں کے ذریعہ سے سرکار نظام کی طرف سے تحریر موصول ہوئی کہ بالفعل ۸۵۰ روپیہ اور پھر ایک ہزار بیس روپے ماہوار بحساب سکہ انگریزی ملیں گے۔ مولانا اس وقت اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ رخصت لے کر دہلی ہوتے ہوئے حیدر آباد چلے گئے۔ ۲۷ر اپریل ۱۸۷۷ء کو وہاں پہنچ کر نواب محسن الملک کے پاس قیام کیا۔

حیدر آباد میں ترقی کرتے کرتے ''بورڈ آف ریونیو'' کے ممبر ہو گئے۔ سترہ سو روپے ماہوار تنخواہ ہوگئی۔ سر سالار جنگ بیحد قدر و عزت کرتے تھے۔ اس زمانے میں میر محبوب علی خاں بہادر نظام دکن نابالغ تھے۔ ان کی تعلیم کے لیے سر سالار جنگ نے مولوی نذیر احمد صاحب سے خاص طور پر نصاب تعلیم مرتب کرایا۔ لیکن یہ کتابیں شائع نہ کی گئیں۔

قیام حیدر آباد کے زمانے میں نذیر احمد صاحب کو قرآن مجید حفظ کرنے کا خیال ہوا، اور اپنے بے نظیر حافظہ کی مدد سے چھ مہینے میں پورا قرآن یاد کرلیا۔

سر سالار جنگ نے اپنے فرزند لائق علی خاں کو مولوی نذیر احمد خاں کی شاگردی میں دے دیا۔ وہ اور مہاراجہ کشن پرشاد دونوں ان کے مکان پر پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد لائق علی خاں سالار جنگ ثانی ہوئے۔ چونکہ مولوی نذیر احمد ان کے استاد رہ چکے تھے، بعض لوگوں کو اندیشہ پیدا ہوا کہ مولوی صاحب شاگرد پر اپنا اثر نہ ڈالیں، اس لیے ان لوگوں نے استاد کی طرف سے شاگرد کے کان بھرنا شروع کیے۔ ان کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی، موقع دیکھ کر پنشن لے کر دہلی چلے آئے۔ حیدر آباد میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ چھوٹ جانے کا بہت قلق تھا، اب یکسو ہو کر علمی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔

انعامات و خطابات: ''مرأۃ العروس'' اور ''توبۃ النصوح'' پر ایک ایک ہزار روپیہ انعام گورنمنٹ کی طرف سے ملا۔ پہلی کتاب پر ایک گھڑی بھی ملی۔ ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ قرآن مجید کا ترجمہ چھپنے پر اس کی ایک جلد مولانا نے سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر کو انگلستان بھیجی۔ اس عظیم الشان علمی خدمت کے اعتراف میں ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل۔ ایل۔ ڈی۔ کی ڈگری پیش کی۔ پھر ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی

نے ڈی۔او۔ایل۔کی ڈگری دی۔

شغل سود و تجارت: مولوی نذیر احمد کی ابتدائی زندگی عسرت میں گزری تھی، اس لیے ان کی طبیعت میں کفایت شعاری کا مادّہ اور دولت کی قدر پیدا ہو گئی تھی۔ تجارت سے بھی لگاؤ تھا۔ اس لیے خود بھی تجارت میں روپیہ لگاتے تھے، اور دوسروں کو بھی یہی نصیحت کرتے تھے۔ بلکہ دوسروں کو محض اعتبار پر روپیہ دے دیتے تھے۔ خود انھوں نے ایک بار کہا تھا کہ "اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپیہ کھو بیٹھا ہوں۔" اپنے روپیہ پر کھلم کھلا سود لیتے تھے۔ ایک روپیہ سیکڑہ شرح سود مقرر تھی۔ اپنی تصنیف 'الحقوق والفرائض' میں مسئلہ سود پر بحث کی ہے۔ اور اس کو جائز بتایا ہے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ ایک طرف تو وہ نہایت جز رس و کفایت شعار تھے، یہاں تک کہ بخیل مشہور ہو گئے تھے اور دوسری طرف اس قدر سادہ مزاج اور صاحب مروّت تھے کہ نہ جائداد کی نگرانی کرتے تھے نہ تجارت کی دیکھ بھال، اور روپیہ بے تکلف قرض دیتے رہتے تھے۔ اس ترکیب سے بڑی دولت لوگوں نے اڑا لی۔ چنانچہ وفات کے بعد امید سے بہت کم روپیہ نکلا۔ حالانکہ صرف پنشن کا روپیہ ڈھائی لاکھ ہوتا ہے۔ بینک میں نقد روپیہ پچاس ہزار تھا۔ جائداد ملا کر ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ کی مالیت نہ تھی۔

شوخی و ظرافت: بچپن سے نہایت ذہین اور شوخ طبع تھے۔ یہی کیفیت آخر عمر تک رہی۔ بچپن میں چلبلی طبیعت کے سبب سے ایک وقت میں ایک جگہ بیٹھ کر حجامت نہ بنوا سکتے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھے اور بھاگ گئے۔ پھر پکڑے آئے اور حجامت بنی۔ لڑکپن میں مولوی عبدالخالق کے گھر کا مسالہ پیسنے میں دق کیا کرتے تھے۔ پھر بڑے ہو کر نوکر ہوئے اور قانون انکم ٹیکس کا ترجمہ سپرد ہوا تو اس میں بابو شیو پرشاد انسپکٹر مدارس شریک ہو گئے۔ مولانا خود ہی ترجمہ کرنا چاہتے تھے، لیکن بابو صاحب کے ماتحت تھے۔ اور کچھ نہ کر سکے تو ان کو پریشان کرنا شروع کیا۔ بابو جی ترجمہ بولتے تھے۔ یہ لکھتے۔ درمیان میں انھوں نے پوچھا، "لکھ چکے؟" مولانا نے یہ لفظ بھی لکھ دیا۔ انھوں نے پڑھوا کر سنا تو یہ لفظ بھی پڑھ دیا۔ وہ خفا ہوئے اور کہا، "یہ داخلِ گستاخی ہے۔" انھوں نے یہ فقرہ بھی درج کر دیا۔ آخر

انسپکٹر صاحب عاجز آ گئے۔

مولانا کے بعض لطیفے قابلِ ذکر ہیں:-(۱) ایک مرتبہ سر سالار جنگ ثانی نواب لائق علی خاں بہادر شملہ سے علی گڑھ جاتے تھے۔ مولانا غازی آباد کے اسٹیشن پر جا کر ملے۔ انھوں نے باتوں میں یہ بھی کہا کہ آپ ناحق حیدر آباد سے چلے آئے اب بھی وہیں چلیے۔ مولانا نے فرمایا: ''نمک خوار سرکار ہوں، مگر معافی کا خواستگار ہوں۔ اب جس حال میں ہوں وہی میرے لیے مناسب ہے۔ ایک مرتبہ حیدر آباد جا کر تو پنشن پر نکالا گیا۔ اب دوسری مرتبہ جاؤں گا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ پنشن بھی کھو آؤں۔'' سر سالار جنگ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

(۲) حیدر آباد سے آ کر دہلی میں قیام کیا تو انگریزی حکام ان کی خدمات اور کارناموں سے واقف نہ تھے۔ ایک مرتبہ دہلی میں کوئی جلسہ ہوا۔ ڈپٹی کمشنر نے اہلِ دہلی کو بلانے کے لیے ایک معمولی فہرست گشت کرائی۔ اس میں ان کا نام بھی تھا۔ انھوں نے فہرست کے حاشیہ پر یہ لکھ دیا:-

> ''اگر یہ سرکاری طلبی ہے تو سمن یا وارنٹ آنا چاہیے۔ دوستانہ بلاوا ہے تو چٹھی آنی چاہیے، اور یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں اور آنا نہ آنا میری مرضی پر منحصر ہے، تو میں نہیں آ سکتا۔''

ڈپٹی کمشنر اس تحریر کو دیکھ کر چونکا اور تحصیل دار سے پوچھا۔ جب ان کا حال معلوم ہوا تو تحصیلدار سے کہا کہ تم نے مجھے پہلے کیوں نہ کہا کہ میں چٹھی لکھتا۔ چنانچہ اس نے ایک الگ خط لکھ کر بلایا۔ اور زبانی معذرت کی۔

(۳) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں ہو رہا تھا، اور مولوی نذیر احمد تقریر کر رہے تھے۔ اسی درمیان میں لارڈ کچنر کمانڈر انچیف افواج ہند جلسہ میں آئے، تھوڑی دیر بیٹھے، کچھ تقریر کی اور رخصت ہو گئے، اُن کے اُٹھتے ہی مولانا پھر تقریر کرنے کھڑے ہو گئے، اور ابھی لارڈ صاحب اسٹیج سے اترے ہی تھے کہ انھوں نے فرمایا: جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقاً (حق آیا اور باطل دور ہوا۔ ہاں باطل جانے ہی والا تھا) یہ سن کر سارا مجمع ہنس پڑا۔ لارڈ کچنر مصر میں رہ چکے تھے۔ عربی خوب جانتے تھے۔ دل ہی دل میں اس پھبتی کا مزہ لیا ہوگا۔

(۴) اس کانفرنس کی صدارت ہز ہائی نس سر آغا خاں نے قبول کر لی تھی۔ لیکن آنے میں دیر ہو گئی تھی اور جلسہ شروع ہو گیا تھا۔ مولوی نذیر احمد کا لکچر ہو رہا تھا کہ سر آغا خاں آ گئے۔ وہ ایسے خوبصورت اور شاندار جوان تھے کہ اپنے جمال و وجاہت سے سارے جلسے پر چھا گئے۔ نواب محسن الملک نے مولانا کا سر آغا خاں سے تعارف کرایا۔ ان کے ہاتھ میں لکچر تھا۔ تعارف ہوتے ہی لکچر میز پر رکھ دیا، اور بڑی متانت کے ساتھ آغا خاں سے خطاب کر کے فرمایا:

آفاق ہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

تمام جلسہ یہ شعر سن کر پھڑک گیا۔ سر آغا خاں بھی منھ پر رومال رکھ کر ہنستے رہے۔ حاضرین نے مولانا سے بار بار پڑھوا کر سنا۔

(۵) ہز میجسٹی امیر حبیب اللہ خاں بادشاہ کابل ۱۹۰۶ء میں ہندوستان آئے۔ عید الفطر ۱۳۲۴ کی نماز دہلی میں پڑھی، جمعہ کا روز تھا۔ نماز کے بعد دربار کیا۔ اور مخصوص مشاہیر دہلی و ہند کو ملنے کے لئے بلایا۔ ان میں مولوی نذیر احمد بھی تھے۔ یہ جب امیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کو دیکھتے ہی عرب شاعر متنبی کا یہ شعر پڑھا۔(۱)

عِیدٌ وَ عِیدٌ وَ عِیدٌ صِرْنَ مُجْتَمِعَه
وَجْهُ الْحَبِیْبِ وَ یَوْمُ الْعِیدِ وَالْجُمُعَه

(۶) حیدر آباد میں ایک ریونیو بورڈ قائم ہوا تھا۔ اس کے تین ممبر تھے مولوی دلیل الدین خاں، منشی اکرام اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد۔ ان میں سے مولوی دلیل الدین خاں بسیار خور مشہور تھے۔ منشی اکرام اللہ خاں شوقین مزاج آدمی تھے، اور مولوی نذیر احمد کی کفایت شعاری بُخل کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ سر سالار جنگ نے مولوی نذیر احمد سے بورڈ کے ممبروں کا حال دریافت کیا۔ انھوں نے کہا: ہم ارکان ثلثہ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کے مصداق ہیں۔" (۲)

---

(۱) تین عیدیں ساتھ جمع ہو گئی ہیں، روئے حبیب، یوم عید اور جمعہ (۲) یعنی کھاؤ پیو اور بیجا صرف نہ کرو۔

(۷) نواب محسن الملک عربی کے بڑے عالم نہ تھے۔ اور مولوی نذیر احمد اور نواب صاحب میں بڑی بے تکلفی تھی۔ ایک روز حیدر آباد میں ''مولویت'' کا ذکر آ گیا۔ کسی نے نواب صاحب کو ''مولوی مہدی علی'' کہا۔ مولوی نذیر احمد بولے کہ ''اگر مہدی علی مولوی ہیں، تو یہ جو سامنے کھڑا ہے یہ بھی مولوی چاند خاں ہے۔'' چاند خاں ان کا قدیم ملازم تھا۔ لمبی داڑھی تھی اور صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا۔

قوتِ تقریر: حیدر آباد سے آ کر مولوی نذیر احمد صاحب نے تصنیف و تالیف کے علاوہ قومی کاموں میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ قدرت نے ان کو غیر معمولی قوتِ بیان عطا کی ہے۔ چنانچہ پہلی ہی تقریر نے وہ اثر پیدا کیا اور مقبولیت حاصل کی کہ پھر ان کے بغیر کوئی مجلس گرم نہ ہوتی تھی۔ آواز، لہجہ، اندازِ بیان سب ایسے پائے تھے کہ ان کے جادو سے تمام جلسہ مسحور ہو جاتا تھا۔ اہلِ مجلس کو ہنسانا، رُلانا ان کے اختیار میں تھا۔ چندے کی اپیل اس طرح کرتے تھے کہ حاضرین کی جیبیں جھاڑ لیتے تھے۔ کتنا ہی بڑا مجمع ہو ان کو چیخنے چلانے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف بلند آواز سے تقریر کرتے اور دور تک پہنچ جاتی۔ اکثر اپنی تقریر پہلے سے چھپوا لیتے اور اس کی مطبوعہ کاپی ان کے ہاتھ میں ہوتی، لیکن تقریر میں تحریر کے پابند نہ رہتے۔ کہتے چلے جاتے اور سامعین کو بھی اپنی رو میں بہا لے جاتے۔ سننے والے نفس مضمون سے زیادہ ان کے لب ولہجہ، فصاحت بیان اور طاقت لسان کے گرویدہ ہوتے تھے۔ اور ان کے لطائف وظرائف کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ نہ مولانا اپنی رو میں اصل مضمون کی طرف لوٹ کر آتے نہ سامعین اس کے منتظر رہتے۔ وقت ختم ہو جاتا، مولانا بیٹھ جاتے اور حاضرین کو حسرت رہتی کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

یہ بات ان کے ہم عصروں میں سے کسی میں نہ تھی۔ سر سیّد اور نواب محسن الملک اصول تقریر اور فنِ خطابت کے اعتبار سے مولوی نذیر احمدؔ سے بہتر تھے، لیکن مجمع عام کے لیے ان کی تقریر اُن سے زیادہ شاندار اور دلکش ہوتی تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ سر سیّد اور محسن الملک دونوں سے زیادہ، بلکہ تمام مقرروں سے زیادہ مولوی نذیر احمد اپنی تقریر میں عربی کے موٹے

موٹے الفاظ اور محاورے، عربی کے فقرے، اشعار اور آیتیں جا بجا استعمال کرتے تھے۔ پھر بھی ان کے طرزِ ادا، جوشِ بیان اور فصاحتِ زبان کے سبب سے تقریر کی دلکشی میں فرق نہ آتا تھا۔ اس طرح انھوں نے اپنی اس خداداد قابلیت سے بھی ملک وقوم کی بڑی خدمت کی۔ مولانا طبعاً بے باک اور عادتاً دریدہ دہن واقع ہوئے تھے۔ صاف گوئی میں کبھی حد سے گذر جاتے تھے، اور تلخ گوئی پر اُتر آتے تھے۔ لیکن سامعین ان کی خاطر سے اس کو بھی گوارا کر لیتے تھے۔

وفات: مرنے سے چند مہینے پہلے علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ کمزوری بڑھتی گئی، باہر آنا جانا، ملنا جلنا چھوڑ دیا، اور علاج کی بھی توجہ نہ کی۔ سمجھتے تھے کہ وقت آگیا ہے۔ آخر فالج ہوا، اور چار پانچ روز بعد ۳ رمئی ۱۹۱۲ء کو جمعہ کے روز رحلت کی۔ خاکسار مولف نے قرانِ مجید سے تاریخ وفات نکالی:-

لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُقِيمٌ (۱) خَالِدِيْنَ فِيهَا اَبَدًا

۱۳۳۰ھ (سورۂ توبہ، رکوع ۳)

ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف: ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے مولوی ذکاء اللہ صاحب کی کثرت تصانیف پر تعجب ظاہر کیا ہے۔ وہ خود بھی بسیار نویسی اور زود نویسی میں کسی سے کم نہ تھے۔ مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں، جن میں بعض ان کی اولیات میں شامل ہیں کہ ان سے پہلے اس طرز اس موضوع پر کسی نے قلم نہ اٹھایا تھا۔ مثلاً زنانہ لٹریچر اور اس میں ناول کا طرز۔ ترجمۂ قران مجید کی سلاست اور تسلسل۔ 'الحقوق والفرائض' میں مضامین قرآن مجید کی ترتیب۔ قانونی کتابوں کے ترجمے۔ یہ سب ان کی بے نظیر جودت طبع اور جدّت فکر کے شاہد ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی تصانیف کا سلسلہ بڑے دلچسپ طریقے سے شروع ہوا

---

(۱) قرآن مجید کا املا خٰلِدِیْنَ بغیر الف ہے میں نے ایک عدد کا اضافہ کرنے کے لیے الف سے خالدین لکھ دیا ہے۔

ہے اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:۔

''میں اپنے بچوں کے لئے ایسی کتابیں لکھنا چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں......ڈھونڈھا، تلاش کیا۔ کہیں پتا نہ لگا۔ میں نے ہر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لئے 'مرأۃ العروس'، چھوٹی کے لئے 'منتخب الحکایات'، بشیر کے لئے 'چند پند'۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں، تب پڑھانی شروع کیں۔ نہیں، بلکہ ہر کتاب کے چار چار پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کردئے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لئے اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی، وہ ورق کے لئے مستعجل تھا۔ جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ میں اسی وقت قلم برداشت لکھ دیا کرتا۔ یوں کتابوں کا پہلا گھان تیار ہوا۔'' (درباری لکچر ڈپٹی نذیر احمد)

اس کے بعد نذیر احمد صاحب ان کتابوں کی شہرت و اشاعت کا قصہ بیان کرتے ہیں، وہ بھی عجیب اتفاق اور پر لطف واقعہ ہے۔ یعنی ڈپٹی صاحب کے چھوٹے صاحبزادے بشیر الدین کی ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم سے کہیں ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے لڑکے سے پوچھا تم کیا پڑھتے ہو۔ بشیر الدین نے مذکورہ بالا کتابوں کا نام بتایا۔ ڈائرکٹر صاحب نے تعجب سے کہا کہ اُردو میں ان ناموں کی تو کوئی کتابیں نہیں ہیں۔ لڑکے نے کہا کہ یہ کتابیں ابّا نے میرے اور آپا کے لیے لکھی ہیں۔ صاحب نے کہا، اچھا دوڑ کر انھیں لے آؤ۔ بشیر دوڑا ہوا گھر گیا اور 'مرأۃ العروس'، 'منتخب الحکایات' اور 'چند پند' کے قلمی نسخے لے آیا۔ ڈائرکٹر صاحب نے ان کتابوں کو دیکھا اور 'مرأۃ العروس' کو بہت پسند کیا۔ اور گورنمنٹ سے اس پر انعام دئے جانے کی سفارش کی۔ چنانچہ اس پر ایک ہزار روپیہ نقد اور ایک قیمتی گھڑی انعام میں ملی۔ اس کے بعد تصانیف کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ڈپٹی صاحب کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ناول (زنانہ لٹریچر)

(۱) مرأۃ العروس، مطبوعہ ۱۸۶۹ء

(۲) بنات النعش (مرأۃ العروس کا دوسرا حصہ) جس میں لڑکیوں کو دستکاری

اور عملی زندگی کی ترغیب دی ہے۔ مطبوعہ ۱۸۷۳ء

(۳) توبۃ النصوح۔ جس میں سچی اسلامی زندگی کی تعلیم ہے۔ اس پر بھی ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔ مطبوعہ ۱۸۷۷ء

(۴) محصنات یا فسانۂ مبتلا۔ مطبوعہ ۱۸۸۵ء

(۵) ابن الوقت۔ مطبوعہ ۱۸۸۸ء۔ غدر کے زمانے کا قصہ۔ انگریزی اور ہندوستانی و اسلامی معاشرت کا مقابلہ۔

(۶) رویائے صادقہ۔ دہلی کے قدیم شریف خاندان کی زندگی۔

(۷) ایامیٰ، جس میں بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی ضرورت و فوائد بیان کیے ہیں۔

(۲) اخلاق

(۱) منتخب الحکایات (۲) چند پند (۳) موعظہ حسنہ

(۳) مذہب

(۱) ترجمۂ قرآن مجید

(۲) الحقوق والفرائض۔ ۳ حصے ۱۹۰۶ء میں لکھی۔

(۳) الاجتہاد۔ عقائد اسلامی کا عقلی ثبوت ۱۹۰۸ء ﴿۱۳۲۴ھ﴾ میں لکھی۔

(۴) اُمہات الامۃ۔ ازواج مطہرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات۔

(۵) ادعیۃ القرآن۔ اس میں قرآن مجید کی تمام دعائیں ایک جا کر دی ہیں اور ان پر مفید حاشیے لکھے ہیں۔

(۴) منطق

(۱) مبادی الحکمت۔ اس رسالے میں علم منطق کی تعلیم کا جدید و دلچسپ طریقہ اختیار کیا ہے، جو منطق کی مروجہ کتابوں سے مختلف ہے۔ مثالیں بھی نئی نئی تلاش کی ہیں۔ جن سے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ مصنفہ ۱۸۷۱ء ﴿۱۲۸۸ھ﴾

(۵) علم ہیئت

(۱) سمٰوات۔اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔گورنمنٹ نے اس پر ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔۱۸۷۶ء ﴿۱۲۹۳ھ﴾ میں ترجمہ کی۔

(۶) قواعد

(۱) ما یغنیک فی الصرف۔(۲) صرف صغیر۔عربی قواعد کے متعلق لکھیں

(۷) متفرق

(۱) رسم الخط (۲) نصاب خسرو (۳) فسانۂ غدر (۴) مجموعہ لکچر

(۵) نظم بے نظیر نذیر (ان کی نظموں کا مجموعہ)

قانونی کتابوں کے ترجمے ان کے علاوہ ہیں۔آخر عمر میں مطالب القرآن کے نام سے ایک ضخیم تصنیف کا آغاز کیا لیکن تمام نہ کر سکے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا طرزِ تحریر: علامہ آزاد کی طرح مولانا نذیر احمد بھی صاحبِ طرزِ خاص ہیں، اور ان کا طرزِ تحریر بھی سب سے الگ اور نرالا ہے کہ چند سطروں سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ ڈپٹی صاحب کی تحریر ہے۔خالص دہلی کی زبان ومحاورے استعمال کرتے ہیں۔زنانہ ناولوں میں شریف مستورات کی بہترین زبان اور انداز اختیار کیا ہے۔طرزِ بیان نہایت صاف، واضح اور زور دار ہوتا ہے۔روانی اور بے ساختگی ہر جگہ نمایاں ہے۔بات کو سمجھانے کے نئے نئے طریقے پیدا کرتے ہیں۔اگرچہ آزاد کی سی رنگین عبارت نہیں لکھتے، لیکن حسب موقع کبھی استعارہ وتشبیہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ان کے اسلوب میں ایک اجتماع اضداد عجیب ہے کہ ایک ہی تحریر میں کہیں نہایت مغلق وگراں عربی کے الفاظ وتراکیب ومحاورات لکھتے ہیں، اور دوسری جگہ ٹھیٹ ہندی کے الفاظ لکھ دیتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی خاص کر لکچروں میں انگریزی کے الفاظ ومحاورے بھی جابجا لے آتے ہیں، اگرچہ یہ اکثر بے جا ہوتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کی ایک نمایاں خصوصیت جس میں ان کا کوئی ہم عصر شریک نہیں ہے، ان کی ظرافت ہے۔ظریفانہ رنگ کا ناولوں میں اور تقریروں میں زیادہ موقع تھا وہیں ہے اور بہت دلچسپ وخوشگوار ہے۔ظرافت کو حدِ اعتدال سے بڑھنے نہیں دیتے، اور صحیح موقع

پر صرف کرتے ہیں۔

طرزِ نذیر احمد کی بے اعتدالی: ڈپٹی نذیر احمد بڑے ذہین اور طبّاع تھے۔ بچپن سے طالب علمی شروع کردی تھی۔ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ اخذ کرنے اور محفوظ رکھنے کی عادت تھی، زبان و محاورہ اور ادب وانشا سے فطری مناسبت و دلچسپی تھی، اس کے ساتھ ہی چونکہ اصلی دہلوی نہ تھے اور دہلی کو وطن بنانا تھا، اس لیے دہلی کی زبان کو اہلِ زبان کی طرح حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لڑکپن اور آغازِ شباب ہی میں پہلے طالب علمی اور پھر شادی کے سبب سے دہلی کے شریف خاندانوں میں آمد و رفت اور ارتباط پیدا ہو گیا۔ ان کی ہمہ گیر طبیعت نے زبان دہلی کے تمام لوازم و محاسن بہت جلد حاصل کر لیے۔ پھر تصانیف کے سلسلے میں اتفاق سے سب سے پہلے اپنی لڑکیوں کے لیے زنانہ فسانے لکھے، اور ان میں ہو بہو زنانہ زبان لکھی۔ یہ زنانہ لٹریچر عرصے تک پے در پے تیار کرتے رہے۔ ہندی کی چندی اور بال کی کھال نکالنے کا طبعاً شوق تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ہر کتاب میں ایک ایک بات کو نہایت تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت تھی۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈپٹی صاحب کی طبیعت و تحریر دونوں میں صاف بیانی، گھریلو روزمرہ، زنانہ اندازِ بیان اور ٹھیٹ زبان راسخ ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ یہ احساس جاتا رہا کہ یہ طرزِ تحریر ہر تصنیف کے لیے موزوں نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جب انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا، مذہبی کتابیں سیرت و سوانح مرتب کیے، تو ان میں بھی عامیانہ بول چال، محاورے، کہاوتیں لکھ دیں۔ اور ایسا اسلوبِ بیان اختیار کیا جو کہیں اس موضوع و فن کے مناسب نہ رہا اور کہیں بزرگانِ دین، نبی کریمؐ، اصحاب کرام، اہلِ بیت اطہار (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کی شان کے خلاف ہو گیا۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

(۱) 'الحقوق والفرائض' میں سب سے پہلا فقرہ یہ لکھتے ہیں:۔

"کسی نے کیا اچھی، تُلی ہوئی، باون تولے پاؤ رتی بات کہی ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ (جس نے اپنے آپ کو پہچانا تو اس نے اپنے پروردگار کو پہچانا) یعنی اپنے نفس کی معرفت خدا کی معرفت کی دلیل ہے۔"

اس اقتباس کا پہلا جملہ حقوق وفرائض جیسے سنجیدہ موضوع کے لیے بظاہر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، لیکن ہمارے لیے زیادہ قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ اس کی یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اس تمام کتاب میں عقائد واعمال، حقوق اللہ وحقوق العباد اپنے اسی بے تکلف اسلوب اور زبان ومحاورہ میں لکھے ہیں، جس میں اس طرح کے مضامین زنانہ ناولوں میں فسانہ کے بڑے بوڑھے مردوں اور عورتوں کی زبانی لڑکوں لڑکیوں کے لیے بیان کیے ہیں۔ یہ اندازِ متانتِ موضوع کے لحاظ سے درست نہ سہی، لیکن اگر کوئی شخص ساری کتاب اسی رنگ میں لکھے تو اعتراض ہلکا ہو جاتا ہے۔ بہر حال فقرۂ مندرجہ میں کوئی سوءِ ادب نہیں۔ لیکن ڈپٹی صاحب کو یہ طرزِ بے محل اختیار کرنے میں بھی باک نہ تھا۔ مثلاً

(۲) الاجتہاد میں تذکرۂ ہجرت میں لکھتے ہیں:-

''خدا کا کرنا، پیغمبر صاحب کو عین وقت پر معلوم ہوگیا۔ اندھیرے میں چپکے سے سٹک گئے۔''

(۳) اسی کتاب میں پھر لکھتے ہیں:-

''اب تم ان حالات صحیحہ کو حاضر فی الذہن رکھ کر ٹھنڈے دل سے انصاف سے تجویز کرو کہ پیغمبر صاحب جھوٹا دعویٰ رسالت کر کے کسی مفاد کو توقع کر سکتے تھے۔ اسی دعویٰ نے تو ان کی یہ گت بنوائی تھی کہ۔

جھڑکی تو مدتوں سے مساوات ہو گئی — گالی کبھو نہ دی تھی سو اب بات ہو گئی
باقی ہے مار کھانی تو سن لوگے ایک دن — اس کی گلی میں اپنی یہ اوقات ہو گئی

اسی دعویٰ نے ان کو شہر بدر کرایا۔'' (الاجتہاد صفحہ ۸۳)

(۴) اُمّہات الاُمّۃ میں اخلاقِ نبی کریمؐ اور اسبابِ نکاح کے سلسلے میں ہجرت کے متعلق یہ فقرہ لکھتے ہیں:-

''...... تقویت اور حمایت اور حفاظت نہ ہوتی تو رسالت کی بیل ایک گھڑی بھی منڈھے چڑھنے والی نہ تھی۔ مگر صداقت کے بھروسے پر پیغمبر صاحب تیرہ برس دشمنوں کے نرغے میں چھاتی پر پڑے مونگ دلوایا کیے۔ یہاں تک کہ آخر کو پائے ثبات جگہ سے اکھڑ گئے اور بھاگ کر مدینے جا پناہ لی۔''

اس بے ادبی اور گستاخی کی کوئی تاویل نہیں ہوسکتی۔ ''سٹک گئے''، ''گت بنوائی

تھی''، ''چھاتی پر پڑے مونگ دلوایا کئے''۔ جیسے محاوروں کا اور اس قطعے کے چسپاں کرنے کا محل نہ تھا۔ لیکن ڈپٹی نذیر احمد کے ذہن سے فرقِ مراتب اُٹھ گیا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ ان کو ادب ملحوظ نہ تھا یا قصداً بے حرمتی کی، بلکہ اپنے طرزِ تحریر کی عادت کے سبب سے ان محاوروں کو ایسے موقعوں پر بھی وہ ادب و احترام کے منافی نہ سمجھتے تھے۔ اور یہی ان کے نفس و عقل کا دھوکا تھا۔ ان رکیک اور سوقیانہ الفاظ سے اس ذات گرامی کو ارفع و اعلیٰ، اقدس و اطہر سمجھنا چاہیے۔

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

اس طرح کے الفاظ، محاورے اور امثال جب ڈپٹی صاحب نے ناولوں کے فرضی اشخاص کے یا اپنے متعلق لکھے ہیں تو ناموزوں اور ناگوار نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً ایک لکچر کے آغاز میں اپنا حال بیان کرتے ہیں:۔

''نہ مجھ کو شعر گوئی کا شوق ہے اور نہ سلیقہ، مگر وہ جو کہتے ہیں کہ رانڈ تو بہتیرا بیٹھنا چاہتی ہے مگر رنڈوے نہیں بیٹھنے دیتے۔ جب جب کوئی صاحب مجھے لکچر دینے بلاتے ہیں، اور بلانے والے تو بہت ہیں، اس لئے کہ انجمنوں اور سالانہ جلسوں اور لکچروں کا تو ڈربہ کھل پڑا ہے، مگر میں اپنے لکچروں کی ہوا نہیں اکھڑنے دیتا کہ گلیوں گلیوں کام بڑھئی کام پکارتا پڑا پھروں۔''

(لکچر ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۰ء، بمقام ریاست رامپور)

یا مثلاً الاجتہاد میں اپنے آپ کو خطاب کر کے لکھتے ہیں:۔

''تم اپنی ہستی کو کیوں بھولتے ہو، تو گدھی کمہار کی، تجھے رام سے کو تھ۔ کہاں راجہ بھوج، کہاں بھجوا تیلی۔

لیکن جب ایسی باتیں خدا اور رسول کی زبان سے نکلواتے ہیں تو نہایت نازیبا ہو جاتی ہیں۔ جیسے 'توبۃ النصوح' میں اللہ تعالیٰ کا قول نصوح کے لیے لکھا ہے:۔

''نہ خرنا مشخص کہ ہم تو دیں نون، وہ کہے میری آنکھیں پھوٹیں۔''

اسی طرح کی بے اعتدالیاں قرآن مجید کے ترجمہ میں کی ہیں۔ اس طرزِ تحریر میں ایک ذرا سی بات تھی جس کو ملحوظ رکھنے سے یہ تمام تصنیفات بے عیب ہو جاتیں، اور جس کا خیال نہ کرنے سے یہ اعتراضات واقع ہوئے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد اپنی ہر نوع و موضوع کی

کتاب اپنے مخصوص بے تکلف اسلوب میں لکھنا چاہتے تھے۔ اس اصول پر اعتراض سہی، لیکن بے اصولی کے علاوہ کوئی اعتراض نہ ہوسکتا اگر احترام وادب کے موقع پر صرف سادگی وصفائی کو قائم رکھتے، ابتذال وسوقیت نہ برتتے۔ اور خدا اور رسولؐ اور بزرگانِ دین کے متعلق رکیک محاورے نہ لکھتے۔ انھوں نے ہر جگہ اور ہر موقع پر ایسے الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں۔ فقرے کے فقرے، صفحے کے صفحے بزرگوں کے تذکرے میں ایسے بھی لکھے ہیں جن میں قابلِ اعتراض زبان نہیں ہے تو ممکن وسہل تھا کہ وہاں بھی نہ ہوتی جہاں ہے۔ اس سے ان کے اسلوبِ خصوصی میں کوئی فرق نہ آتا۔ لیکن بات وہی ہے کہ ڈپٹی صاحب کو اس کا احساس ہی نہ رہا تھا۔

دوسرا پہلو بے اعتدالی کا یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد انگریزی کے الفاظ بڑی کثرت سے اور بالکل بے ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات لکچروں میں زیادہ ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ بھی انھوں نے سامعین کی دلچسپی اور دل لگی کے لیے اختیار کیا تھا۔ اگرچہ ان کی تقریر اس کے بغیر بھی ہمیشہ دلکش ہوتی تھی۔ انگریزی الفاظ کا استعمال سب سے پہلے سرسیّد نے شروع کیا تھا، لیکن ان کے ہاں ناگوار کثرت نہ تھی۔ مولانا حالؔی نے بہت زیادہ استعمال کیے، اور مولانا نذیر احمد نے تو انتہا کردی۔ سرسیّد کچھ شُد بُد انگریزی جانتے تھے۔ حالی اتنی بھی نہیں۔ نذیر احمد اچھے خاصے ماہر تھے۔ ان کو اس نئی زبان سے نئی دلچسپی پیدا ہوئی تھی، اس کی اشاعت وترغیب ان کے کانفرنسی لکچروں کا مقصود تھا۔ انگریزوں اور انگریزی دانوں کو خوش کرنے کا بھی شوق تھا۔ غرض انھوں نے اپنے ابتدائی لکچروں ہی سے انگریزی الفاظ کا استعمال شروع کردیا۔ اور پھر اس کو اتنا بڑھایا کہ مفرد الفاظ کے علاوہ، مرکبات، محاورے، جملے، ضرب الامثال بھی بے تکلف لکھنے بولنے لگے۔

یہ ذکر بے ضرورت، بلاوجہ اور غیر اہم مشہور الفاظ کا ہے۔ مثلاً

ا۔ محمڈن کالج کو انٹیٹی (۱) یا کوالیٹی (۲) کسی اعتبار سے بھی مسلمانوں کے دردکی

---

(۱) کمیت (۲) کیفیت

کافی دوا نہیں۔

۲۔ یہ ایسا زبردست ثبوت ان کی فیور (۱) میں ہے۔

۳۔ جن صفتوں کے مجموعہ کا نام اسلام ہے نیچرلی (۲) اس بات کے مقتضی ہیں۔

۴۔ اس امام کے ہاتھ پر فارملی (۳) بیعت کرو۔

۵۔ انگریزوں کی طرح کی ہائی لائف (۴) نہ رکھیں۔

۶۔ انگلش پیٹس (۵) کا منہ چرانے لگے ہیں۔

۷۔ ...... مقلّد ہیں، غیر مقلّد ہیں، اور دی لاسٹ دو ناٹ دی لیسٹ (۶) بڑے غل غپاڑے بڑے جوش وخروش کے ساتھ نئی قسم کے مسلمان نیچری ہیں۔

(جملہ اقتباسات از لکچر ایجوکیشنل کانگریس منعقدہ دسمبر ۱۸۸۹ء، بمقام علی گڑھ)

۹۔ اپنے تئیں خیر الاخلاف بعد الاسلاف وردی آف وئیر فورفادرز (۷) بنانے کی کوشش کریں۔

۱۰۔ آڈینس (۸) قران سے اوورڈوسڈ (۹) ہو گیا ہے۔ (لکچر ۱۹۰۰ء، بمقام رامپور)

---

(۱) حمایت

(۲) طبعًا یا فطری طور پر

(۳) حسبِ آئین

(۴) اونچی شاندار زندگی

(۵) انگریزی طریقے اور عادتیں

(۶) سب سے آخری اگرچہ سب سے کم وقعت نہیں۔

(۷) یہ انگریزی پہلی عربی کی مترادف ہے۔ یعنی اپنے اسلاف کی شان کے لائق۔

(۸) مجمع حاضرین

(۹) وہ مریض جس کو مقدار سے زیادہ دوا پلا دی گئی ہو۔ یعنی حاضرینِ جلسہ کو ضرورت سے زیادہ قرآن سنایا گیا ہے۔

اسی طرح عربی کے الفاظ و مرکبات بالکل بے ضرورت، صرف اپنے شوق و عادت کے سبب سے بے تکلف لکھتے ہیں۔ آیاتِ قرآنی یا عربی امثال واشعار کا ذکر نہیں۔ وہ تو ڈپٹی صاحب کی تحریر کا خاص جوہر ہیں۔ بلکہ وہ عربی کے الفاظ و محاورات اجزائے جملہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں کہ بغیر ان کے جملہ پورا نہیں ہوتا۔ مثلاً

۱۔ جس کے افراد کے دلوں میں وللاکثر حکم الکلّ (۱) منافست کی ذرا سی گدگدی بھی نہ ہو، میں نہیں سمجھتا کہ ایسی قوم کا کوئی شخص بھی کسی بات پر فخر کر سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم مسلمانوں میں بالنسبۃِ اِلیٰ اقوامِ اُخر (۲) شخصی عزتیں بہت کم ہیں، مگر ہیں۔

۲۔ کچھ اس طرح کا ٹیڑھا وقت آ گیا ہے کہ اس زمانے کے اسلام اور خوشدلی میں مانعۃ الجمع کی سی نسبت قائم ہو گئی ہے بعض وقلیلٌ ماھم (۳) جن کو خوش ہونے کا موقع ہے، خدا کا فرمودہ اِنَّمَا الْمُؤمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ ان کو بھی چین سے نہیں رہنے دیتا۔

۳۔ یا ایک چھوٹا سا ضلع کَیْفَ مَا اتَّفَقَ (۴) اختیار کر و اور تحقیقات کر کے ایسے لوگوں کی فہرست بناؤ جو صاحب زکوٰۃ ہیں۔ (جملہ اقتباسات از لکچر ۱۸۸۹ء)

تیسری بات یہ کہ ڈپٹی صاحب مضمون کی تکرار بہت کرتے ہیں، اور بات کو پیچ دے کر فقرے کو بہت طویل کر دیتے ہیں۔ یہ انداز خطیبانہ ہے۔ خطبوں اور لکچروں کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ لیکن ڈپٹی صاحب اپنی ہر تصنیف میں یہ طرز برتتے ہیں۔

چوتھے ہر قسم کی تصانیف میں محاورات و امثال کی کثرت کے سبب سے متانت و وقار قائم نہیں رہتا۔ یہ چیزیں جہاں شوخی و بے ادبی کی حد تک نہیں پہنچتیں وہاں بھی عبارت و اسلوب کا وقار کھو دیتی ہیں۔ یہ انداز روزمرہ کی بے تکلف گفتگو کا ہے۔ اس لیے ناولوں کے

---

(۱) اور اکثر کے لئے کُل کا حکم ہے۔

(۲) دوسری اقوام کے مقابلے میں۔

(۳) بعض لوگ اور وہ تھوڑے ہیں۔

(۴) جو کوئی ہو، یعنی کوئی ضلع ہو۔

علاوہ کسی کتاب میں اختیار کرنے کا نہ تھا۔ حد یہ ہے کہ ترجمہ قرآن مجید میں بھی کہیں کہیں پایۂ متانت سے گر گیا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس طرزِ عبارت پر ایک دوسرے پہلو سے بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے، اور وہی اس کی تاویل ہے۔ وہ یہ کہ نذیر احمد صاحب نے اپنی کتابیں مؤرخ و سیرت نگار اور مفتی و مفسّر کی حیثیت سے نہیں لکھیں، بلکہ ادیب و انشا پرداز کی حیثیت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس لئے ان کے ناول و قصص اور فقہ و سیرت سب کا ایک رنگِ بیان ہے۔ یہی توجیہ و معذرت مولوی محمد حسین آزاد کے طرزِ تحریر کے لیے پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس صورت میں دونوں صاحبوں کا مرتبہ صرف زباندانوں اور انشا پرداز کا رہ جاتا ہے۔ مؤرخ و محقق کی شان باقی نہیں رہتی۔

ڈپٹی نذیر احمد کی اوّلیات اور مرتبہ: (۱) ڈپٹی صاحب سے پہلے کا تمام اُردو لٹریچر ہمارے سامنے ہے۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت کی کتابیں مفقود ہیں۔ نذیر احمد پہلے مصنف ہیں جنھوں نے زنانہ لٹریچر اس اہتمام و کثرت کے ساتھ مُہیا کیا۔ یہ کتابیں اپنی جامعیت اور حسن ترتیب میں اُردو زبان اور نذیر احمد کی اوّلیات میں داخل ہیں۔ اور نصف صدی سے زیادہ گزرنے کے بعد بھی آج تک بے مثال و ناگزیر ہیں۔ نذیر احمد کے بعد صرف راشد الخیری نے قدیم تہذیب و معاشرت کو اپنی زنانہ تصانیف میں زندہ رکھا۔ اب عورتوں کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔

(۲) اُردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی صاحب ہیں۔ بعید از قیاس داستانوں کی جگہ اصلی واقعات اور صحیح معاشرت کو قصہ کی صورت میں پیش کرنے کا انہی کے سر سہرا ہے۔ اُردو کے دوسرے ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں۔ ان کا 'فسانۂ آزاد' دسمبر ۱۸۷۸ء سے اودھ اخبار میں بالاقساط شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اور ۱۸۸۰ میں بصورت کتاب چھپا ہے۔ لیکن نذیر احمد صاحب کا پہلا ناول 'مراۃ العروس' 'فسانۂ آزاد' سے دس برس پہلے ۱۸۶۹ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اور دوسرا ناول 'بنات النعش' بھی سرشار کے فسانے سے پہلے ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔

(۳) ترجمۂ قرآن مجید ایسی سلاست، شگفتگی اور تسلسل کے ساتھ نذیر احمد کی ایجاد ہے اور ترجمہ کو مقابل کے صفحے پر چھاپنا دلچسپ جدت۔ اب صرف ترجمے کے صفحے کے صفحے بے تکلف پڑھتے چلے جایئے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلسل اور مربوط کتاب پڑھ رہے ہیں۔ یہ بات کسی قدیم ترجمے میں نہ تھی۔ بعد کے ہر ترجمے میں ہے۔ اور یہ نذیر احمد صاحب کا فیضان ہے۔

(۴) عقائد و مسائلِ اسلامی کا استنباط و ترتیب قرآن و حدیث سے جس طرح نذیر احمد صاحب نے 'الحقوق' وغیرہ میں کیا ہے، یہ بھی انھیں کی اختراع ہے۔ بعد کو اس کی بھی تقلید ہوئی اور ہو رہی ہے۔

(۵) زبان و انشا پردازی کا جو لطف ان کی تمام تصنیفات میں ہے وہ ڈپٹی صاحب کا انفرادی و امتیازی رنگ ہے۔ اور شوخی و ظرافت کے وہ تنہا مالک ہیں۔

اس لیے ڈپٹی نذیر احمد بھی موجد و صاحبِ طرز کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اور ان کے احسانات اُردو زبان و ادب پر نہایت گراں بہا ہیں۔

نمونۂ تصانیف: (۱) 'مراۃ العروس'، نذیر احمد کا پہلا مکمل زنانہ ناول ہے۔ دہلی کے شریف خاندان کی معاشرت کا ہو بہو نقشہ کھینچا ہے۔ یہ فسانہ اس قدر مشہور و مقبول ہوا کہ اس کے افرادِ قصہ 'اصغری'، 'اکبری' اور ماما 'عظمت' آج تک زبان زد ہیں اور مثال میں پیش کیے جاتے ہیں۔

'مراۃ العروس' کی مقبولیت کا ذکر ڈپٹی صاحب نے 'بنات النعش' کے دیباچے میں کیا ہے:۔

''مراۃ العروس کو پہلے پہل چھپے ہوئے اب تیسرا برس ہے، اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہوا ہے، اسی دو سوا دو برس میں اس کی کوئی آٹھ، نو بلکہ دس ہزار جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، اور ہر سمت سے طلب اور ہر طرف سے مانگ چلی آ رہی ہے۔ ایک بابو صاحب اپنی بنگالی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ ایک پنڈت جی مہاراج بھاکا میں۔ اور نہ میری استدعا اور فرمائش سے، بلکہ اپنی آرزو اور خواہش سے۔ پسند و قبول کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی۔''

ان فسانوں میں مکالمہ کا طرزِ تحریر قدیم داستانوں سے جداگانہ ہے اور نذیر احمد صاحب نے اس کو پہلی مرتبہ اُردو میں پیدا کیا ہے۔ یہ اسلوب انگریزی میں ناول کا نہیں، بلکہ ڈرامے کا ہے کہ کسی فرد قصہ کا نام آغازِ سطر میں لکھ کر اس کے آگے اس کی گفتگو لکھی جائے۔ انگریزی ناول کا طرزِ مکالمہ نذیر احمد صاحب کے زمانے میں انگریزی زبان و ادب سے نا آشنا لوگوں میں مقبول ہونا دشوار تھا۔ اس لیے ڈرامے کا انداز اختیار کرنا مناسب تھا۔ یہ چیز ایسی مقبول ہوئی کہ شرؔر و سرشاؔر سے لے کر اب تک اسی کی تقلید ہو رہی ہے۔ بیسویں صدی کے ادب جدید میں مختصر فسانے اور بعض ناول انگریزی مکالمے کے طرز میں البتہ لکھے گئے ہیں۔ اور اب عادت کے سبب سے نامانوس نہیں رہا۔

نذیر احمد صاحب کی ایک وضع خاص یہ بھی ہے کہ ناولوں میں طویل اخلاقی وعظ و تقریر ضرور داخل کرتے ہیں۔ 'مرأۃ العروس' بھی اس سے خالی نہیں۔ اس کا مختصر نمونہ یہ ہے:-

> لڑکوں اور لڑکیوں کو ضرور سوچنا چاہئے کہ ماں باپ سے الگ ہوئے پیچھے ان کی زندگی کیوں کر گذرے گی۔ دنیا میں بہت بھاری بوجھ مردوں کے سر پر ہے۔ دنیا میں کھانا کپڑا اور روزمرہ کے خرچ کی سب چیزیں روپیہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور یہ سب کھڑاگ روپیہ کا ہے۔ عورتوں کو بڑی خوشی کی بات ہے کہ اکثر کمانے اور روپیہ پیدا کرنے کی محنت سے محفوظ رہتی ہیں۔ دیکھو مرد کیسی کیسی سخت محنت کرتے ہیں۔ کوئی بھاری بوجھ سر پر اٹھاتا ہے، کوئی لکڑی ڈھوتا ہے۔ سنار، لہار، ٹھٹھیرا، کسیرا، کندلہ گر، زرکوب، دبکیہ، تارکش، ملمع ساز، جڑیا، سلمہ ستارے والا، ہٹیہ، بدرساز، میناساز، قلعی گر، سادہ کار، چھتل گر آئینہ ساز، زردوز، منھیار، نعل بند، نگینہ ساز، کامدانی والا، سان گر، نیاریا، ڈھلیا، بڑھئی، خرادی، ناریل والا، کنگھی ساز، بنس پھوڑ، کاغذی، جلاہا، رفوگر، رنگریز، چھیپی، درزی، دستار بند، علاقہ بند، پچہ بند، موچی، مہرکن، سنگتراش، حکاک، معمار دیگر، کمہار، حلوائی، تیلی، تنبولی، رنگساز، گندھی وغیرہ جتنے پیشے والے ہیں سب کے کاموں میں برابر درجہ کی تکلیف ہے۔ اور یہ تمام تکلیف روپیہ کمانے کے واسطے مرد سہتے اور اٹھاتے ہیں۔ لیکن اس بات سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ عورتوں سے سوائے کھانے اور سو رہنے کے کوئی کام دنیا کا متعلق نہیں ہے۔ بلکہ خانہ داری کے تمام کام عورتیں کرتی ہیں۔ مرد اپنی کمائی عورتوں

کے آگے لاکر رکھ دیتے ہیں اور عورتیں اپنی عقل سے اس کو ایسے بندوبست اور سلیقے کے ساتھ اٹھاتی ہیں کہ آرام کے سوائے عزت اور نام پر حرف نہیں آنے پاتا۔ بس اگر غور سے دیکھو تو دنیا کی گاڑی جب تک ایک پہیہ مرد کا اور دوسرا عورت کا نہ ہو چل نہیں سکتی۔ مردوں کو روپیہ کمانے کے بعد اتنا وقت نہیں بچتا کہ اس کو گھر کے چھوٹے کاموں میں صرف کریں۔ اے لڑکو وہ بات سیکھو کہ مرد ہو کر تمھارے کام آئے۔ اور اے لڑکیو وہ ہنر حاصل کرو کہ عورت ہونے پر تم کو اس سے خوشی اور فائدہ ہو۔ بیشک عورت کو خدا نے مرد کی نسبت کسی قدر کمزور پیدا کیا ہے، لیکن ہاتھ پاؤں، کان، آنکھ، عقل، سمجھ، یاد، سب مرد کے برابر عورت کو دیے ہیں۔ لڑکے انھیں چیزوں سے کام لے کر عالم، حافظ، حکیم، کاریگر، دستکار ہر فن میں طاق اور ہر ہنر میں مشاق ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں اپنا وقت گڑیاں کھیلنے اور کہانیاں سننے میں کھوتی ہیں۔ بے ہنر رہتی ہیں اور جن عورتوں نے وقت کی قدر پہچانی اور اس کو کام کی باتوں میں لگایا وہ مردوں کی طرح دنیا میں نامور اور مشہور ہوئی ہیں۔ جیسے نور جہاں بیگم، زیب النساء بیگم یا ان دنوں نواب سکندر بیگم یا ملکۂ وکٹوریہ۔ یہ وہ عورتیں ہیں جنھوں نے ایک چھوٹے سے گھر اور کنبے کا نہیں بلکہ ملک اور جہاں کا بندوبست کیا۔

(۲) بنات النعش، اس کا موضوع خود مصنف اس کے دیباچے میں بتاتے ہیں:-

"یہ کتاب اسی 'مرأۃ العروس' کا گویا دوسرا حصہ ہے۔ وہی بولی ہے، وہی طرز ہے، مرأۃ العروس سے تعلیم اخلاق و خانہ داری مقصود تھی۔ اس سے وہ بھی ہے مگر ضمناً۔ اور معلوماتِ علمی خاصۃً۔"

چنانچہ بنات النعش میں حساب کی دلچسپ باتیں، تاریخ، جغرافیہ، علمِ ہیئت، جسمانی ریاضت، حفظانِ صحت وغیرہ مختلف معلومات فراہم کی ہیں اور افسانے کے اندر اشخاص کے دوران گفتگو میں سمجھائی ہیں۔ مثلاً

(الف) حسن آرا۔ خیر اب زمین کا گول ہونا ثابت کیجیے۔ کیا آپ اس بات کو ٹالنا چاہتی ہیں؟

محمودہ۔ ہاں تو یہ انگنائی پچاس گز لمبی ہے۔ اس سرے سے اُس سرے تک پینتیس یعنی پانچ کم دو بیسی پھیرے کرو تو ایک میل ہو۔ اور دو میل کا ایک کوس ہوتا ہے۔

حسن آرا۔ اوفو اتنا بڑا میل اور اتنا بڑا کوس ہوتا ہے۔

محمودہ۔ اب قطب صاحب کی لاٹ کو فرمائیے کہ گے گز لمبی ہے۔

حسن آرا۔ میں تو جانتی ہوں کہ اس حساب سے پوری میل بھی لمبی نہ ہوگی۔

محمودہ۔ میلوں کے حساب سے کتنی بڑی ہے۔ چوبیس ہزار میل اس کا دور ہے۔ مردوں میں بارہ کوس کی منزل مقرر ہے یعنی مرد لوگ جو سفر کرتے ہیں تو بارہ کوس روز چلے جاتے ہیں، اور واقع میں آرام کے ساتھ سفر کیا جائے تو بارہ کوس دن بھر چلنے کو بہت ہے۔ اس حساب سے اگر کوئی آدمی ناک کی سیدھ چلنا شروع کرے تو پانچ برس میں جہاں سے چلا تھا وہیں آکر کھڑا ہوگا اور اس کا صرف ایک پھیرا پورا ہوگا۔

حسن آرا۔ اللہ اکبر اب جو میں خیال کرتی ہوں تو زمین بہت ہی بڑی ہے۔ بھلا تم نے کیوں کر جانا کہ چوبیس ہزار میل دور ہے۔

محمودہ۔ کتابوں سے جانا۔ ہمت والے لوگوں نے محنت اٹھا کر برسوں سفر کیا اور تمام دور ناپ ڈالا۔ خشکی کی راہ تو سیدھا چلنا مشکل ہے کہیں کہیں بڑے بڑے دو دو تین تین کوس کے اونچے مہینوں کی چڑھائی کے دشوار گزار پہاڑ ہیں، کہیں سیکڑوں کوس کے جنگل ہیں جن میں نہ کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانہ ہے نہ پانی کا آسرا، نہ راہ نہ سڑک۔ مگر سمندر سمندر جہازوں پر لوگوں نے سفر کیا ہے اور قطب نما کے سہارے سے سیدھ لگائے چلے گئے اور آخر کو وہیں آموجود ہوئے جہاں سے چلے تھے کیا اب بھی زمین کے گول ہونے میں شک وشبہ ہے۔

(ب) 'بنات النعش' کے اصل قصے کے آخری حصے کا اقتباس یہ ہے:۔

''جب اس کے بیاہ کی تاریخ قریب پہونچی تو ہر چند گھر والوں نے اس کو مکتب جانے سے روکا مگر اس کو مکتب سے ایسا کچھ اُنس ہو گیا تھا کہ ایک لحہ مکتب سے جدا رہنا اس کو شاق تھا۔ حسب دستور مکتب میں آتی رہی یہاں تک کہ مائیوں بیٹھنے میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے تب ناچار سلطانہ بیگم خود استانی اصغری خانم کے پاس گئیں۔ سلام دعا اور مزاج پرسی کے بعد سلطانہ بیگم بولیں استانی جی تم میں ایسا جی پڑا تھا کہ ہر روز کہتی تھی کہ آج جاؤں کل جاؤں لیکن تمھاری اس لونڈی کے بیاہ برات کی فکر میں ایک دم کی چھٹی نہیں ملتی۔ سِیتی میں نہیں پروتی میں نہیں مگر کام ہے کہ سمٹنے ہی میں نہیں آتا۔ آخر آج میں زبردستی نکل کھڑی ہوئی۔ سو کام کاج کا حرج کیا اور میں نے کہا کہ چلوں ذرا کھڑے کھڑے استانی جی سے تو

مل آؤں۔

استانی جی — درست ہے۔ یہی تو کام کا وقت ہے آپ نے ناحق تکلیف کی مجھی کو بلا بھیجا ہوتا میں بھی دن رات آپ ہی کے کام میں لگی لپٹی رہتی ہوں۔ جوڑے جو میں نے سینے اور مصالح ٹانکنے کو آپ سے منگوائے تھے سب تیار ہیں۔ پہلے تو میرا جی ڈرتا تھا کہ جوڑے ماشاء اللہ بہت بھاری ہیں اور خدا کے فضل سے امیر گھر جانے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ لڑکیاں کہیں بگاڑ دیں، مگر نہیں حسن آرا بیگم کی محبت سے لڑکیوں نے خوب ہی جی لگا کر سیا اور مصالح بھی بہت صفائی سے ٹانکا۔ اس جوڑی گلبدن کے پائجامے میں جو میں نے پرسوں سلوا کر بھیجا ہے ذرا کلیوں کا گوکھرو کھنچ زیادہ گیا ہے۔ بہتیرا شہر بانو کہتی رہی کہ استانی جی لاؤ اُدھیڑ کر پھر ٹانک دوں۔ میں نے کہا خیر رہنے بھی دو اُدھیڑنے سے گوکھرو خراب ہو جائے گا آیندہ اس کا خیال رکھنا۔

سلطانہ بیگم۔ — وہ جوڑا میں نے اپنے یہاں کی مغلانیوں کو دکھایا تھا۔ پھڑک گئیں اور کہنے لگیں پھر کہاں مَردوں کی چٹکی اور کہاں عورتوں کی۔

میں۔ — اری مردوں کا یہاں کیا مذکور۔

مغلانیاں۔ — اے حضور۔ یہ جوڑا میاں علی جان کے کارخانے کا ٹنکا ہوا معلوم ہوتا ہے اسی سے ٹانکا ایسا درست بیٹھتا چلا گیا ہے۔ تو لونڈیوں کے عرض کرنے کا مطلب ہے کہ عورتوں کا کام کیسا ہی اجلی کیوں نہ ہو مَردوں کے کام کو نہیں پا سکتا۔

میں۔ — کہاں کے علی جان اور کیسے مَرد۔ یہ جوڑا تو میری استانی جی کے مکتب کی لڑکیوں نے سیا اور انھیں نے اس میں مصالح ٹانکا ہے۔ یہ سن کر مغلانیاں بار بار جوڑے کو کھول کھول کر بغور دیکھتی تھیں اور کہتی تھیں حضور فرماتی ہیں تو ہم کو یقین ہے لیکن عورتوں کے ہاتھ میں یہ صفائی اور ستھرا پن ہم نے تو نہیں دیکھا۔

استانی جی۔ — خیر اور جوڑوں کی سلائی مجھ کو بھی پسند ہے۔ پھر آپ نے حسن آرا بیگم کے جوڑے یہیں بھیج دئے ہوتے تو لڑکیاں تو خوشی سے سی دیتیں۔

سلطانہ بیگم۔ اور یہ سارا جہیز کس نے سیا اور کس نے ٹانکا۔ مغلانیوں سے تو میں نے صرف موٹا کام لیا۔ چاندنیاں ہوئیں، گٹھریاں ہوئیں، دسترخوان ہوئے، سوزنیاں ہوئیں، موباف، کنٹے، غلاف، تکیے، توشک، لحاف اس طرح کی چیزیں البتہ مغلانیوں نے سی ہیں یا ہاں شب خوابی کے کپڑے۔ باقی پہننے کے کپڑے تو مکتب میں اور کچھ تھوڑے باجی کے یہاں سے پروئے گئے۔

استانی جی۔ الٰہی خیر سے حسن آرا بیگم کو ایک یہ ہزاروں اور گھس پس کر پُرانے ہوں۔

سلطانہ بیگم۔ (ٹھنڈا سانس بھر کر) ہاں استانی جی دعا کیجئے۔ اللہ نصیب کرے بیٹیوں کا بھی کچھ عجیب نازک معاملہ ہے۔ کن کن مصیبتوں سے پالو، پرورش کرو اور پھر دھن پرایا کا پرایا۔ کیا کروں کچھ بن نہیں پڑتی ورنہ میں حُسنا کو اپنی نظروں سے دور نہ ہونے دیتی۔ شہر میں ایک سمدھیانہ کر کے وہ وہ آفتیں اٹھائیں کہ میں نے آگے کو توبہ کی اور کان اینٹھا۔ ورنہ حکیم صاحب بیچارے کا کچھ قصور نہیں۔ کیسی کیسی باتیں حُسنا کے واسطے منگوائیں۔ ایک سے ایک بڑی چڑھی میں نے کہا حاشا اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں شہر میں اب بیٹی نہ دوں گی۔ کالا منھ ایسے شہر کا جس میں یہ کچھ رسوائی اور فضیحت ہے۔ سو استانی جی اب دیہات والوں سے معاملہ کیا ہے۔ خدا کے ہاتھ شرم ہے۔

استانی جی۔ حُسن آرا بیگم سے آپ مطمئن رہیے۔ اول تو جھجھر والے خود بڑے رئیس ہیں، دوسرے خاک چاٹ کر کہتی ہوں آپ انشاء اللہ دیکھ لیجئے گا کہ بیاہ کے دوسرے تیسرے ہی مہینے حُسن آرا بیگم تمام ریاست کے سیاہ و سفید کی مالک نہ بن بیٹھیں تو مجھ کو الٹا اُلاہنا دیجئے گا۔ کیا آپ کو حُسن آرا بیگم کے مزاج میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا۔

سلطانہ بیگم فرق آپ کی عنایت سے زمین آسمان کا ہے۔ آپ کے فیضان تعلیم نے خاک کو اکسیر، تانبے کو کندن، ذرے کو خورشید، پوتھ کو لعل، سفید حیوان کو آدم اور حُسنا کو ماشاء اللہ حُسن آرا بیگم بنادیا۔ اس کی خوبیٔ تقدیر کی یہی ایک بڑی نشانی ہے کہ وہ شاگرد اور آپ جیسی اس کی استانی ہے۔ یہ ایسا احسان آپ نے ہم سب گھر والوں پر کیا ہے کہ جب تک جئیں گے آپ کے مرہونِ منت رہیں گے۔ مگر جب سے حسنا نے بیاہ کی طیاری ہوتے دیکھی ہے، کچھ سہم سی گئی ہے۔ یونہی گھر میں اس کا جی نہیں لگتا تھا اور بھی دل اُچاٹ ہوگیا ہے۔ نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے نہ کسی سے بولتی اور بات کرتی ہے۔ ارادہ تھا کہ پورے مہینے بھر مائیوں بٹھاؤں گی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے کہا کہ مائیوں سے بدتر تو یہ خود ہوتی جاتی ہے۔ رنگت زرد ہوگئی ہے، آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں۔ چہرہ دیکھو اداس، صورت دیکھو غمگین۔ میں کہتی ہوں اس کو اتنی عمر میں فکر کیوں ہے۔ اس عمر میں تو لڑکیوں کو دلہن بننے کی بڑی خوشی ہوتی ہے۔

استانی جی حسن آرا بیگم اور لڑکیوں کی طرح نادان نہیں ہیں۔ ماشاء اللہ بڑی فہمیدہ اور زیرک لڑکی ہے۔ یہی کچھ گھر کے چھوٹنے کا خیال ہوگا۔

سلطانہ بیگم گھر کی تو اس کو مطلق پرواہ نہیں البتہ کتب اس کی جان ہے۔ دیکھئے کیوں کر بچی کا دل بہلے گا۔

استانی جی میں سمجھا دوں گی اور یوں آدمی اپنے پیاروں سے جدا ہوتا ہے تو رنج ہوتا ہی ہے۔

(۳) توبۃ النصوح: ان فسانوں میں بہترین کتاب ہے۔ اس کا موضوع و مقصود تعلیم دینداری ہے۔ اس کا قصہ، واقعات کا تسلسل، کردار، اشخاص کی موزونیت، مکالمات کا تناسب اور برجستگی، سب کچھ نہایت خوبصورت اور دلکش ہے۔ یہ کتاب سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کے اقتباسات مدارس کے نصاب میں ہمیشہ شائع ہوتے ہیں۔ اس کے بعض حصے خاص طور پر مؤثر و دلچسپ ہیں۔ ایک 'نصوح کا خواب' دوسرے 'کلیم اور مرزا ظاہردار بیگ کا معاملہ' دونوں بہت طویل ہیں۔ اس لیے صرف دوسرے کو

یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ نصوح کا بڑا لڑکا کلیم ماں باپ سے روٹھ کر گھر سے نکلتا ہے، اور اپنے ایک دوست کے گھر جاتا ہے۔

کلیم اور مرزا ظاہر دار بیگ

کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہونچا۔ ہر چند ابھی کچھ ایسی رات نہیں گئی تھی، لیکن مرزا جیسے نکتے بے فکرے کبھی کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اس کا نانا وہ بھی حقیقی نہیں ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب رزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو عالی جاہ سرکار، دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار تیسرے اُن دنوں کی بے عنوانی اس پر خود اس کی رشوت ستانی، بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا اعتداد دہلی کے روداروں میں ہوگیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہوگئی تھی۔ جمعدار نے باوجودیکہ دور کی قرابت تھی حسبۃً للہ اس کا تکفل اپنے ذمے لے لیا۔ جمعدار اپنی عین حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی۔ لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے پوتے نواسے کثرت سے تھے۔ انھوں نے بے اعتنائی کی۔ اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر کے مرے تھے مگر ان کے ورثاء نے بہ ہزار دقت محل سرائے کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا سا قطعہ ان کے رہنے کو دیا۔ اور سات روپیہ مہینے کی کرایہ کی دکانیں ان مرزا کے نام کر دیں۔

یہ تو حال تھا کہ مرزا۔ مرزا کی ماں مرزا کی بیوی تین تین آدمی اور سات روپیہ کی کُل کائنات۔ اس پر مرزا کی شیخی اور نمود۔ یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے۔ جن کو صدہا روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اس کو منھ نہیں لگاتے تھے مگر یہ بے غیرت زبردستی ان میں گھستا تھا۔ یہ کسی کو بھائی جان، کسی کو ماموں جان کسی کو خالہ جان بناتا اور وہ لوگ اس کے ادعائی رشتوں ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا ان کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیر زادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں۔ مگر امیر زادگی نبھتی تو کیسے نبھتی۔ دکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بیچاری بہتیرا بکتی مگر کون سنتا تھا۔

مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے کی جوتی۔ سر پر دوہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی۔ بدن پر ایک چھوڑ دو دو انگرکھے اوپر شبنم یا ہلکی سی تنزیب۔ نیچے کوئی طرحدار کا ساڈھاکے کا بُنٹو۔ جاڑا ہوتا تو بانات مگر سات روپے گز سے کم کی نہیں۔ خیر یہ تو صبح شام اور تیسرے پہر کا شانی مخمل کی آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل لگی ہوئی سُرخ نیفہ کا پائجامہ۔ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا۔ ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اور اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھو تو مرزا صاحب اس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جاتے ہیں۔

کلیم سے اور مرزا سے محفل مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا تھا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے۔ یہاں تک کہ چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو تو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی بھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی صبح کو بلا ناغہ آتے اور تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا اور وہ جمعدار کی محل سرا کو مرزا کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا تو سیدھا جمعدار کی محل سرائے کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں اور ان میں سے ایک نے پوچھا کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے۔

کلیم۔ جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی۔ کون مرزا۔

کلیم۔ مرزا ظاہر دار بیگ جن کا مکان ہے اور کون مرزا۔

لونڈی۔ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کر لے کہ جلدی سے کلیم نے کہا کیوں جی کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں ہے؟

لونڈی۔ ہے کیوں نہیں۔

کلیم۔ پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی مرزا ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے۔ موا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے۔

دوسری لونڈی ارے کمبخت یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں وہی ظاہر دار بیگ ناجن کی رنگت زردزرد ہے، آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دبلا ڈیل۔ اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم۔ ہاں ہاں وہی ظاہر دار بیگ۔

لونڈی۔ تو میاں اس مکان کے پچھواڑے اپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے وہ اس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگھیا پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے اہا آپ ہیں۔ معاف کیجئے گا میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندے کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہمرکاب چلوں۔

کلیم۔ چلئے گا کہاں میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا۔

مرزا۔ پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرا دوں۔

کلیم۔ میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا۔ بسم اللہ۔ تو چلئے اسی مسجد میں تشریف رکھئے۔ بڑی پُر فضا جگہ ہے۔ میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پُرانی چھوٹی سی مسجد ہے۔ وہ بھی مسجد ضرار(۱) کی طرح ویران وحشت ناک۔ نہ کوئی حافظ ہے نہ مُلّا نہ طالب علم

---

(۱) پیغمبر صاحب کے وقت میں بعض لوگوں نے ضد میں آکر دوسری مسجد کو اُجاڑنے کے لیے ایک مسجد بنائی تھی۔ پیغمبر صاحب نے اسے ڈھوا دیا۔

نہ مسافر۔ ہزار ہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار نا چار اسی مسجد میں ٹھیرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے مرزا صاحب بطور دفع دخل مقدر فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے۔ خفقان کا عارضہ اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو اُن کو غشی میں پایا اس وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے تو یہ فرمائیے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے۔ کلیم نے باپ کی طلب اپنا انکار بھائی کی التجائیں کا اصرار تمام ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا۔ پھر اب ارادہ کیا ہے؟

کلیم۔ سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ جانے کا ارادہ تو نہیں ہے۔ اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا۔ خیر نیت شب حرام صبح تو ہو۔ آپ بے تکلف استراحت فرمائیے۔ میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج ان کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم۔ یہ ماجرا کیا ہے تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محل سرائیں معہ دیوان خانے۔ کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دکانیں اور سرائیں۔ میں تو جانتا ہوں کہ عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی مِلک نہ بتایا ہو یا یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لئے تم کو جگہ میسر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جمعدار کے تمام تر کے پر تم قابض اور متصرف ہو۔ لیکن میں اس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدت مجھ سے اور آپ سے صحبت رہی مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلاف حالت جو آپ دیکھتے ہیں اس کی ایک وجہ ہے۔ بندے کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنیٰ کیا تھا اور اپنا جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کُل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے۔ صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ بندوبست کا حوصلہ نہیں۔ اُسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منا لے جائیں۔

کلیم۔ لیکن کبھی آپ نے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔

مرزا۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت اور حمیت سے بے نصیب ٹھیرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں جا کر بچھونا بچھوا دوں اور مریضہ کی تیمارداری کروں۔

کلیم۔ خیر مقام مجبوری ہے۔ لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجئے۔ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا۔ چراغ کیا میں نے تو لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن گرمی کے دن ہیں پروانے بہت جمع ہو جاویں گے اور آپ زیادہ پریشان ہو جئے گا۔ اور اس مکان میں آبابیلوں کی بہت کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔ تھوڑی دیر صبر کیجئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تھا تو کھانا تیار تھا لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پرواہ نہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود ہی پوچھیں گے تو کہہ دوں گا، مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا کیوں کہ اول تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی دوسرے یہ کہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجے کی تھی لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض ہی نہ ہوا اور کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے ہی اس کی انتڑیوں نے قل ھواللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بیچارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ سنو یار میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا۔ سچ کہو، نہیں جھوٹ بہکاتے ہو۔

کلیم۔ تمھارے سر کی قسم۔ میں بھوکا ہوں۔

مرزا۔ مرد خدا تو آتے ہی کیوں نہیں کہا۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ دکانیں سب بند ہو گئیں اور جو دو ایک دکان کھلی بھی ہیں تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر۔ گھر میں تو آج آگ تک نہیں سلگی۔ مگر ظاہراً تم سے بھوک کی سہار ہوتی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دیو اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑ بھونجے کے یہاں سے گرما گرم خستہ چنے کی دال بنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجھ کو اور تم کو دونوں کو کافی ہو گی۔ رات کا وقت ہے۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اُٹھ کر باہر گئے اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے۔ مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے اس واسطے کہ کلیم کے روبرو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا۔ یار ہو بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ دیکھو تو کیسے جُھلس رہے ہیں۔ اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجیب ہی دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو کمال بھی کیا چیز ہے۔ دیکھئے تو اتنی رات گئی ہے مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے بتحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے اور واقعہ میں ذرا آپ غور سے دیکھئے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمھیں میرے سر کی قسم سچ کہنا، ایسے خوبصورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے۔ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانہ پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹے پھوٹے کا کیا مذکور اور دانوں کی رنگت دیکھئے، کوئی بسنتی ہے کوئی پستئی۔ غرض دونوں رنگ خوشنما۔ یوں صدہا قسم کے غلے اور پھل زمین سے اگتے ہیں لیکن چنے کی لذت کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سنی ہے؟

کلیم۔ فرمایئے۔

مرزا۔ چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو ارزاق عباد کا اہتمام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جیوں جیوں مَیں نے زمین سے سر باہر نکالا تیر ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی پر نہیں ہوتے۔ نشوونما کے ساتھ تو میری قطع برید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں۔ جب بار آور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے آدمی بکرے بن کر لاکھوں من بوٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی تو ہولے کرنے شروع کئے پکا تو شاخ و برگ بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ اس کو چکی میں دلیں گھوڑوں کو کھلائیں بھاڑ میں بھونیں بیسن بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں گھونگھنیاں پکائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیل کی دربار میں اس طرح پر بیباکانہ چٹر پٹر بولنا سن کر حاضرین دربار میں اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اس کے کھانے کو دوڑا۔ چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظار حکم اخیر رخصت ہوا۔ سو حضرت یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندان آز بھی ان پر تیز ہیں۔ افسوس کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہونچ سکتا ورنہ میر منڈو کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں۔

غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔

کلیم بھوکا تو تھا ہی اس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے۔

مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے۔ یا تو خلوت خانے اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آ کر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا حال ہم نے تھوڑا سا اوپر بیان کیا۔

گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی نہ بہن نہ بھائی نہ مونس نہ غمخوار نہ نوکر نہ خدمت گار مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہگار یا قفس میں مرغ نو گرفتار اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے متنبہ پکڑتا اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجردم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوچنے کو تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔

صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلے کا کوئی اور عیار ٹوپی جوتی رومال چھڑی تکیہ دری یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا تھی لے کر چمپت ہوا۔

یوں بھی کلیم بہت دیر کو سو کر اُٹھتا تھا اور آج تو ایک خاص وجہ تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرشِ مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلب ماہیت ہو کر میں کہیں بھتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا کہیں پتہ نہیں۔

مسجد تھی ویران اس میں پانی کہاں۔ صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ اِدھر کو آ نکلے تو اُس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں۔ یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔

اس میں دوپہر ہونے کو آئی بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا۔ جوں ہی زینے پر چڑھا تو کلیم اس سے عرض مطلب کرنے کے لئے لپکا۔ وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ ڈر کر بھاگا۔ خدا جانے اس نے اس کو بھوت سمجھا یا سڑی خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا اُس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے بہ ہزار مصیبت دوسرے فاقہ سے شام پکڑی اور جب اندھیرا ہوا تو اُلو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا سید حا مرزا کے مکان پر گیا۔ آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو منھ دھونے کو پانی مانگے اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی تا کہ کسی طرح گلی کے کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے۔

یہ سوچ کر اس نے کہا کہ کیوں حضرت آپ مجھ سے واقف ہیں۔

اندر سے آواز آئی ہم تمھاری آواز تو نہیں پہچانتے اپنا نام ونشان بتاؤ تو معلوم ہو۔

کلیم۔ میرا نام کلیم ہے اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے۔ بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔

گھر والے۔ وہ دری اور تکیہ کہاں ہے جو رات تمھارے سونے کے واسطے بھیجا گیا تھا؟

تکیہ دری کا نام سن کر کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں تامل تھا کہ اندر سے آواز آئی مرزا زبردست بیگ دیکھنا یہ مردوا کہیں چل نہ دے۔ دوڑ کر دری تکیہ تو اس سے لے لو۔

کلیم یہ بات سن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہونچا تھا کہ زبردست نے چور چور کر کے جا لیا۔

ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کئے مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔

(۴) رویائے صادقہ۔ یہ ناول واقعات کے اعتبار سے بالکل سادہ ہے۔ کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ لیکن نوعیت میں عجیب ہے۔ ''اس کتاب میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ سچا اسلام بالکل عقل کے مطابق ہے، اور اس میں شکوک واشتباہات دخل نہیں ہو سکتا۔'' قصہ صرف اتنا ہے کہ ایک لڑکی سچے خواب دیکھا کرتی ہے۔ جو دیکھتی ہے وہی پیش آتا ہے۔ اس لیے گھر اور باہر کے سب لوگ اس سے ڈرتے ہیں اور اس پر کوئی غیبی اثر سمجھتے ہیں۔ بالآخر اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ شوہر کے گھر جا کر وہ ایک طویل مذہبی خواب دیکھتی ہے (جو کتاب کے ۱۰۰ صفحوں میں سمایا ہے) کتاب کا مقصد یہی خواب ہے جو سوال و جواب کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ لیکن قصے کے دلچسپی خواب سے اوپر تک رہتی ہے۔ آگے تو بس مذہبی کتاب رہ جاتی ہے۔

رویائے صادقہ کی پہلی فصل بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے:-

پہلی فصل تمہید کے طور پر صادقہ کی تقریب اور اس کی خواب دیکھنے کی عادت

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کیا دھوکا ہوا ہے۔ ہم مدت تک اسی خیال میں رہے کہ صادقہ اور یوسفی دو سگی بہنیں تھیں۔ اب تحقیق ہوا کہ ایک ہی عورت کے دو نام ہیں اور اصلی ایک بھی نہیں۔ اس کو میکے ہی میں لوگ صادقہ کہنے لگے تھے اس واسطے کہ اس نے ساری عمر نہ کبھی جھوٹا خواب دیکھا اور نہ اپنے جی سے بنا کر کوئی خواب بیان کیا۔ بیاہی گئی تو سسرال کی طرف سے یوسفی بیگم کا خطاب ملا۔ اس لئے کہ کثرت سے خواب دیکھتے دیکھتے اس کو تعبیر میں ایسا ملکہ ہو گیا تھا کہ اس کی رائے تیر بہدف ہوتی تھی۔ یوں تو کوئی ایسا بندہ بشر نہیں جو سوتے میں خواب نہ دیکھتا ہو، بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ آدمی کا دماغ ایک لمحہ بھی بیکار نہیں رہ سکتا۔ وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ سوچا ہی کرتا ہے۔ جیسا جاگتے میں ویسا سوتے میں۔ اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں کو خواب یاد نہیں رہتا، مگر تو بھی وہ جتنی دیر سوتے ہیں، خواب ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ جانوروں میں سے اور جانوروں کا حال تو معلوم نہیں مگر گھوڑے کو جس کا جی چاہے آزمالے کہ

تھان پر کھڑا سو رہا ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ خراٹوں کی آواز چلی آتی ہے اور یکا یک خاص طور پر
ہنہنایا۔ ایسے موقع پر سائیس یا جو کوئی آدمی موجود ہوتا ہے۔ تھان ہے تھان ہے کہہ دیا کرتا ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ گھوڑا بھی کسی نہ کسی طرح کے خواب دیکھتا ہے۔ لوگوں نے بہت کچھ عقلیں
دوڑائیں۔ مگر کسی کو ٹھیک پتہ نہیں ملا کہ خواب ہے کیا چیز۔ اس کی تعبیر کے اصول کیا ہیں۔ ہم بھی
مدتوں اس خبط میں گرفتار رہے۔ جب سے صادقہ کا حال سنا۔ یہ خیال ہی چھوڑ دیا اور سمجھ لیا کہ
خواب بھی اسرارِ الٰہی میں سے ہے۔

خدا کی باتیں خدا ہی جانیں

اس عورت کا دماغ بھی خدا نے عجیب ہی طرح کا بنایا تھا۔ وہ پرلے درجے کی ذہین تھی۔ یوں بھی
لڑکیاں بولنے اور بات چیت کرنے پر جلد قادر ہو جاتی ہیں۔ اور صادقہ تو پورے ڈھائی برس کی
بھی نہ ہوگی کہ ہم نے اپنے کانوں اس کو مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر مسلسل گفتگو کرتے
سنا۔ نہ لغزش نہ لکنت نہ رکاوٹ۔ اس کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ اس کو اپنے بچپن کے اُن وقتوں کی
باتیں جب کہ اس کو اچھی طرح گفتگو بھی کرنی نہیں آتی تھی ایسے صاف طور پر یاد تھیں کہ گویا کل
کی بات ہے۔ ایک دفعہ کا اس نے مذکور کیا کہ میں جھولے میں لیٹی ہوئی تھی کہ اوپر سے گری
چھپکلی۔ اور اتفاق سے اس وقت کوئی میرے پاس نہ تھا۔ میرے جی میں آیا کہ آواز دوں مگر بولنا
نہیں آتا تھا۔ ناچار رونے لگی۔ ددا نے مجکو آ کر اٹھا لیا۔ میں چپکی تو ہو گئی مگر جب پھر اس نے
جھولے میں لٹانا چاہا تو میں اکڑ گئی۔ ددا سمجھ تو گئی کہ جھولے میں لیٹنا نہیں چاہتی۔ مگر اس کو سبب
کون سمجھائے۔ آخر اماں جان کا ذہن منتقل ہوا۔ اور لگیں کہنے ارے ذرا نہالچے کو تو دیکھو۔ جوں
نہالچہ اٹھایا چھپکلی کود یہ جا وہ جا۔ اماں جان نے مجھے گود میں لے کر پیار کیا۔ اور اسی وقت چھت
گیری بندھوا دی۔ وہ ایسی باتوں کے ٹھیک پتے دیتی تھی کہ تسلیم اور تصدیق کے سوائے کوئی چارہ
ہی نہ تھا۔ غالباً اس نے خواب بھی اسی زمانے سے دیکھنے شروع کئے ہوں گے۔ مگر اس کا چرچا
گھر میں اس وقت سے ہونے لگا جب سے اس کو بولنا آیا۔ جیسی اس کی عمر تھی جیسے اس کے
خیالات تھے ویسے ہی اس کے ان دنوں کے خواب بھی ہوتے تھے۔ مثلاً ایک دن اس کا بھائی کہ
وہ بھی بچہ ہی تھا۔ اس سے کوئی دو سوا دو برس بڑا سویرے اُٹھ کھانے کے لئے ضد کرنے لگا۔ ماں

نے کہا باسی کھچڑی تو میں تم کو دینے کی نہیں، رہیں پکوریاں، سو اول تو ابھی دکانیں نہیں کھلیں۔ اور دوسرے وہی ایسی کون سی خوبی بھری ہیں۔ گھی کا نام اور آدھے سے زیادہ تیل اور پھر ماش کی دال۔ نہیں صاحب ذرا دم لو۔ ابھی میں تم کو روغنی ٹکیا ڈلوائے دیتی ہوں۔ پھر چاہنا کھانڈ سے کھانا، یا مربے کی پھانک سے۔ مگر خدا کے لئے اوپر سے پانی نہ پی لینا۔ ایسا نہ ہو کہ پھر رات کو آپ بھی کھانسی کے مارے بے چین رہو اور ہم سب کی نیند بھی حیران کرو۔ یہ سن کر صادقہ بولی۔ اماں جان مربے کا مرتبان تو گر کر ٹوٹ گیا۔

ماں۔ یہ کب اور کیوں کر۔

صادقہ۔ کب اور کیوں کر تو میں نہیں جانتی مگر میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ خواب کا نام سن کر سب لوگ ہنس پڑے۔ بات گئی گزری ہو گئی۔ ماما نے جلدی جلدی کر کے توا چڑھایا، ٹکیا پکائی۔ جوں مربے کے لئے کوٹھری کھولی ایک چھوڑ دو دو بلیاں نکل کر بھاگیں۔ اندر جا کر دیکھا تو واقع میں مرتبان زمین پر ٹوٹا پڑا ہے۔ دو چار بار تو لوگ خبر نہ ہوئے۔ لیکن جب دیکھا کہ یہ ہر روز خواب دیکھتی اور جو دیکھتی ویسا ہی ظہور میں آتا تو گھر والوں کو اچھا مشغلہ ہاتھ آیا۔ صبح ہوئی اور سب نے پوچھنا شروع کیا کیوں بی آج کیا خواب دیکھا۔ نہ کبھی ایسا ہوا کہ صادقہ نے کوئی خواب نہ دیکھا ہو۔ اور نہ ایسا ہوا کہ دیکھا ہو اور سچا نہ اترا ہو۔ رفتہ رفتہ پہلے گھر میں پھر محلے میں، پھر تو سارے شہر میں ایک غل سا مچ گیا۔ اِدھر تو صادقہ کی شہرت بڑھتی جاتی تھی، اُدھر عمر کے ساتھ وہ خوابوں میں ترقی کر رہی تھی۔ صادقہ کے خوابوں کے سلسلے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح کسی علم کے مبتدی کو پہلے آسان آسان باتیں سکھائی جاتی ہیں اور پھر بتدریج وہ مشکل مشکل کتابوں پر عبور کرتا ہے اسی طرح صادقہ کو پہلے صاف صاف خواب دکھائی دیتے تھے۔ یعنی جو بات ہوئی۔ جیسی کی تیسی خواب میں اس کو دکھائی دے گئی۔ وہی خواب وہی تعبیر۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کے خواب پیچدار ہوتے چلے جو بدون تعبیر کے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ جیسے پہیلی یا معمہ یا چیستاں۔ مثلاً گھر میں کسی کو تپ آنے کو ہوتی تو اس نے خواب میں دیکھا۔ بخار چڑھا ہوا ہے اور پڑے ہیں۔ پھر یوں دیکھنے لگی کہ دھوپ میں بیٹھے ہیں یا آگ سے تاپ رہے ہیں۔ اور آخر

آخر کو ایسا معلوم ہوا کہ آگے دیگچی (۱) رکھی ہے اس میں چار رنگ کے چاول ہیں مگر بُسے ہوئے۔ اکثر تو ایسا ہوتا تھا کہ صادقہ کو خواب ہی میں اس کی تعبیر بھی معلوم ہو جاتی تھی۔ گویا تعبیر بھی جزو خواب تھی۔ اور کبھی خواب میں تعبیر معلوم نہ ہوئی تو اس نے بیداری میں آپ ہی تعبیر دے لی۔ ایک عجب بات اور تھی کہ صادقہ کبھی فرمائشی خواب بھی دیکھتی تھی۔ یعنی مثلاً ہم کو ایک بات کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے اور ہم نے اس سے درخواست کی۔ جیسا کچھ ہونے والا ہوا، صادقہ نے خواب میں دیکھ لیا۔ مگر یہ بات اس کے اختیار کی نہ تھی۔ بہتیری مرتبہ ایسا ہوا کہ صادقہ نے خواب دیکھنا چاہا، اور بھلا یا بُرا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ صادقہ نے سب تو نہیں مگر اپنے ضروری اور معرکے کے خواب تعبیر سمیت روزنامچے کے طور پر ایک کتاب میں جمع کر لئے تھے اور اتفاق سے وہ اصل روزنامچہ ہمارے ہاتھ آ گیا ہے اور ہم عنقریب اس کو چھپوانے والے ہیں۔ جب وہ روزنامچہ مشتہر ہوگا تو قابلِ دید ہوگا۔ نہایت دلچسپ۔ اس روزنامچے میں ایک بڑی خوبی تو یہ ہے کہ کودن سے کودن اور غبی سے غبی اس کو پڑھ لے اور اُلجھی ہوئی باتوں کو آسانی کے ساتھ سلجھانے لگے۔ اور اس میں تو ذرا بھی تامل نہیں کہ صادقہ کا روزنامچہ دیکھنے کے بعد اتنی بات تو چار و ناچار تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس جہان کے علاوہ ایک عالمِ ارواح بھی ہے اور سوتے میں ہم کو اس کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اور اگر ہم اس میں مشق و مہارت پیدا کریں تو بہت سے اسرارِ قدرت منکشف ہوں۔ اور یہی معمولی خواب جو ہم اکثر دیکھا کرتے ہیں اور کبھی ان کی پرواہ نہیں کرتے ان میں سے ہر ایک میں بڑے بڑے مطالب پوشیدہ ہوتے ہیں۔ مگر ہم کو ان کے دریافت کرنے کا سلیقہ نہیں۔

(۵) **ابن الوقت**۔ نذیر احمد صاحب کے دوسرے ناول 'محصنات' دو شادیاں کرنے کی خرابیاں، اور 'ایامیٰ' (بیواؤں کی دکھ بھری کہانی) بھی نہایت دلچسپ اور ان کی

---

(۱) دیگچی = معدہ، چار رنگ کے چاول = خون، بلغم، سودا، چار خلطیں۔ چاولوں کا بُسنا = خلطوں کا فساد جس سے تپ آتی ہے۔

مخصوص زبان و بیان کے عمدہ نمونے ہیں۔ لیکن 'ابن الوقت' بالکل نئی وضع کا ناول ہے۔ اس میں انگریزی معاشرت کی کورانہ تقلید کے نتائج دکھائے ہیں کہ "ازیں سو راندہ وزاں سو درماندہ۔" نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے۔ "ابن الوقت" قصہ کا ہیرو ہے جو ایک انگریز "مسٹر نوبل" کے زیرِ اثر آ کر اپنی ہندوستانی و اسلامی معاشرت کو چھوڑ کر انگریزی وضع اختیار کرتا ہے۔ اگرچہ ڈپٹی صاحب نے 'الحقوق والفرائض' میں لکھ دیا ہے کہ 'ابن الوقت' سے مراد خود ڈپٹی صاحب ہیں اور یہ ان کا اپنا افسانہ ہے۔ لیکن حقیقت میں نذیر احمد صاحب نے اپنی وضع اس حد تک نہ بدلی تھی کہ ان کو ابن الوقت سمجھا جا سکے۔ اس لیے لوگوں نے اس کو سرسیّد پر ڈھال لیا تھا۔ چنانچہ سیّد محمود نے ڈپٹی صاحب سے شکایت بھی کی کہ آپ نے یہ کتاب لکھ کر میرے والد کو بدنام کیا ہے۔ لیکن انھوں نے کہا کہ میں نے تو انگریزی وضع اختیار کرنے والوں کو گالیاں دی ہیں۔ اب جو چاہے اپنے اوپر لے لے۔ ابن الوقت کا مختصر اقتباس یہ ہے:۔

> ہم نے تحقیق سے سنا ہے کہ ابن الوقت نے بارہا اپنے راز داروں سے کہا کہ میرے یہاں کے کھانے کی ساری چھاؤنی میں تعریف ہے۔ مگر میرا یہ حال ہے کہ انگریزی کھانا کھاتے ہوئے اتنی مدت ہوئی، سچ تو یہ ہے کہ ایک دن سیری نہیں ہوئی۔ اور میں اکثر خواب میں اپنے تئیں ہندوستانی کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ابن الوقت کے خاص خدمت گار کی زبانی معتبر روایت ہے کہ ایک بار اس کو سخت تپ لاحق ہوئی اور عادت کے موافق لگا بکنے۔ تو وہ ہندوستانی کھانوں کے نام لے لے کر روتا تھا اور کھانے بھی پلاؤ، زردہ، تنجن، بریانی نہیں بلکہ مونگ کی دال کا بھرتا، دھوئی ماش کی پھریری دال، امرودوں کی کچالو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چٹپٹی چیزوں کو ترس گیا تھا۔
>
> معلوم ہے کہ ابن الوقت، ابتدائے تبدیلِ وضع سے گھر بار چھوڑ کر باہر چھاؤنی میں جا رہا تھا۔ اس کے پاس اتنے نوکر چاکر تھے کہ اس کی کوٹھی کا احاطہ بجائے خود ایک چھوٹا سا محلّہ تھا۔ لیکن اس کی زندگی ویسی ہی اداس تھی جیسی ایک بیچلر (۱) کی ہوتی ہے اور ہونی چاہیے۔ وہ نوکروں کے حق

---

(۱) کنوارا۔ غیر شادی شدہ

میں بڑا سیر چشم تھا۔ اس کے یہاں نوکروں کی ایسی بھاری تنخواہیں تھیں کہ دتی کی اتنی بڑی چھاؤنی میں بس دو چار ہی جگہ اور ہوں گی۔ اس لئے کہ اس کے تمام نوکر سلیقہ مند اور مستعد تھے۔ اور حقیقت امر ہے کہ انہی نوکروں نے انگریزی سوسائٹی میں اس کی اتنی بات بھی بنا رکھی تھی۔ مگر نوکر کتنے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں پھر بھی مالک کی تائید کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ انگریزی زندگی ایسی بکھیڑے کی زندگی تھی کہ ابن الوقت کو جتنا وقت کچہری اور ملاقات سے بچتا تھا، صفائی کی نگرانی اور ہر چیز کی خبر گیری کے لئے بہ مشکل وفا کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے نوکر انگریزی مذاق سے خوب واقف تھے مگر ابن الوقت سے خود صبر نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اپنی طرف سے ایسی تراش خراش ایجاد کرنے لگا کہ خواہی نہ خواہی اس کو دیکھنا پڑتا تھا۔ دعوت ایسی مزے کی چیز ہے کہ کھلانے والا اور کھانے والا دونوں ہی خوش ہوتے ہیں، مگر ابن الوقت کے یہاں کی دعوت اس کے حق میں مصیبت ہوتی تھی۔ کھانا تو کہیں جا کر رات کے نو دس بجے نصیب ہوتا اور اہتمام کی آندھی صبح سویرے سے چلنی شروع ہو جاتی تھی۔ ہم کو تو کوئی ایسی دعوت یاد نہیں کہ ابن الوقت تکان کی وجہ سے اس کے بعد علیل نہ ہوا ہو۔ پھر چھٹے چھ ماہے دعوت ہو تو خیر! یہاں ہر مہینے کچھ نہ ہو تو بڑے کھانے دو تین بلکہ بعض اوقات تو ابن الوقت گھبرا کر بول بھی اٹھتا تھا کہ میں نے کہاں کا کھٹراگ اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ ابن الوقت بیچارے مصیبت کے مارے کو ایک سے ایک سخت مشکل درپیش تھی کہ وہ تو وہی ہٹ کا پورا تھا کہ ان آفتوں کو بری طرح یا بھلی طرح جھیلتا رہا۔ دوسرا تو کبھی کا بھاگ کھڑا ہوتا اور پھر اس کا نام نہ لیتا۔ "ہاتھیوں کے ساتھ گنے کھانا کچھ لڑکوں کا کھیل ہے۔"

ابن الوقت غدر سے پہلے بھی اچھا خاصا خوش حال تھا۔ قلعے کی تنخواہیں تو تھوڑی تھیں مگر اوپر سے انعام واکرام وغیرہ ملا کر بہت کچھ پڑ رہتا تھا۔ ہمارے اندازے سے ابن الوقت کی آمدنی پچاس روپیہ ماہوار سے ہرگز کم نہ تھی اور غدر کے بعد سے تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ نہ سو نہ سوا سو۔ ماشاء اللہ ایک دم سے پانسو۔ اس آمدنی پر اچھے سے اچھا کھانا۔ اچھے سے اچھا پہننا، غرض امیرانہ خرچ رکھتا۔ مگر ہندوستانیوں کا سا ہوتا تو چند سال کے عرصہ میں اس کے پاس معتد بہ سرمایہ ہو جاتا۔ لیکن اس نے کرنی چاہی انگریزوں کی ریس۔ پورا برس خیریت سے گزرنے نہیں پایا کہ لگا ادھار کھانے۔ جس

وقت اس کو جاں نثار نے نہلا دھلا کر پہلے پہل انگریزی کپڑے پہنائے تو کوٹھی کا ساز و سامان اور اپنی شان کو دیکھ کر اس کو اس قدر خوشی ہوئی کہ اپنے آپے میں نہیں سماتا تھا اور ابھی اس خوشی کا اثر طبیعت پر باقی تھا کہ ایک چپراسی بڑا لمبا چوڑا لفافہ لئے ہوئے برآمدے تک آیا۔ قاعدے کے مطابق بیرا (بیرر) نے لفافہ کشتی میں رکھ کر صاحب کے حضور میں پیش کیا۔ کھولا تو جنرل سپلائر کا بل تھا۔ کتنے کا؟ کچھ اوپر پانچ ہزار کا۔ پانچ ہزار کی رقم دیکھ کر قریب تھا کہ حواس مختل ہو جائیں مگر ''سنگ آمد و سخت آمد'' چون و چرا کرنے کا موقع نہیں۔ ''قہر درویش بر جان درویش'' دینا ہی پڑا۔ مگر کیونکر؟ ہزار کا توڑا نوبل (۱) صاحب کا دیا ہوا سربند رکھا ہوا تھا وہ لیا اور یہ ہزار مشکل دو ہزار گھر میں سے فراہم کئے پھر بھی سوا دو ہزار اور ہوں تو پنڈ چھوٹے بارے غدر سے پہلے نواب معشوق محل بیگم کی سرکار میں ابن الوقت کی معرفت گڑ والوں (۲) کا لین دین تھا۔ ڈرتے ڈرتے ان کو رقعہ لکھا اسامی تھی کھری اور جان دار، انھوں نے بے تامل روپیہ حوالے کیا۔ یوں جنرل سپلائر کا پوت پورا ہوا۔ لیکن ابن الوقت نے خرچ کا ڈربا کھول دیا تھا۔ جس نسبت سے اس کی آمد بڑھی اگر اسی نسبت سے خرچ بھی بڑھتا تو چنداں حرج کی بات نہ تھی۔ پر اس نے لیٹنے کے ساتھ چادر کے باہر پاؤں پھیلائے۔ اول سرے گھر کے تہرے چوہرے مکان ہوتے ساتے چالیس روپیہ کا بنگلہ، پھر فٹن، ٹمٹم (ٹینڈم)، بروم، پالکی گاڑی، چار قسم کی بگھیاں اور چار کے چار گھوڑے اور ایک زین سواری کا، پانچ۔ دھوبی، سقہ، چوکیدار، فراش، مشعلچی، باورچی، سائیس، گراس کٹ، مہتر، مالی، بیرا، دو ڈھائی درجن کے قریب شاگرد پیشہ، ان کی تنخواہیں اور تنخواہوں کے علاوہ وردی، ان کی مناسبت سے دوسرے مصارف، باستثناء میز کرسی کہ اس کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ مہینے میں اچھے جید دو کھانے بھی ہو گئے تو ساری تنخواہ پر پانی کا پھر جانا کچھ بات نہیں۔

---

(۱) ایک انگریز جن کو ایام غدر میں ابن الوقت نے پناہ دی تھی اور ان سے خلا ملا ہونے کے بعد ابن الوقت نے ہندوستانی تمدن کو چھوڑ کر یورپ کا تمدن اختیار کیا تھا۔ نوبل صاحب موصوف مسٹر ابن الوقت کے معاون و مددگار تھے۔

(۲) دہلی کے مشہور ساہوکار تھے۔

ابن الوقت نے شروع میں شاید دو تین یا چار تنخواہیں وقت پر لی ہوں گی۔ اس کے بعد سے تو خزانچی کے ساتھ معاملہ ہو گیا۔ ایک چھوڑ دو دو مہاجن دینے والے۔ جب ضرورت ہوئی جتنا چاہا منگوالیا۔ تنخواہ تو اوپر سے اوپر خزانچی لے لیا کرتا تھا اور زمینداری کا محاصل گڑ والوں کی کوٹھی میں چلا جاتا تھا۔ ان بچا کو صاحب بننے کی دھن میں اتنی بھی خبر نہ تھی کہ کتنا قرضہ لدتا چلا جارہا ہے۔ غرض جس طرح ایک آدمی کو کسی کی رٹ نہیں لگ جاتی بس ابن الوقت کو صاحب بننے کی رٹ تھی۔ شروع شروع میں تو اس کو مسلمانوں کے حال پر بھی ایک طرح کی نظر تھی لیکن چند روز کے بعد اس کی ساری رفارم اسی پر منحصر ہو گئی تھی کہ یورپ کے اوضاع و اطوار میں سے کوئی وضع اور کوئی طرز چھوٹنے نہ پائے۔ بھلا کوئی پوچھے کہ تیرے پاس اتنا پیسہ بھی ہے؟ جتنا ان کے پاس ہے۔ کم بخت آپ بھی برباد ہو رہا تھا اور ان کی دیکھا دیکھی کچھ ایسی ہوا چلی کہ مسلمانوں کے نوجوان لڑکے خصوصاً جنھوں نے ذرا سی انگریزی پڑھ لی تھی یا جو گھر سے کسی قدر آسودہ تھے، تباہی کے لچھن سیکھتے چلے جاتے تھے۔ اس کے اندرونی حالات کی تو کسی کو خبر نہ تھی۔ ظاہر میں دیکھتے تھے کہ انگریزوں سے ملتا جلتا ہے۔ جو بات کسی ہندوستانی عہدے دار کو نصیب نہیں، اس کو حاصل ہے اور لوگوں کی نظر میں انگریزی وضع خدا کے فضل سے جو کسی ایک کو پھلی ہو، بھی نے تو اپنی اپنی جگہ تھوڑا بہت نقصان اٹھایا اور شاید نقصان نہ بھی اٹھایا تو کسی کو کسی قسم کا فائدہ تو ہوا نہیں۔ اور ہوتا کیسے؟ کوئی مفلس آدمی مالداروں کے سے کام کرنے لگے تو وہ کیونکر پنپ سکتا ہے۔؟

(۲) ترجمۂ قرآن مجید، ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی سب سے بڑی مذہبی خدمت اور زنانہ ناولوں کے بعد اردو زبان و ادب کا عظیم الشان کارنامہ قرآن کریم کا ترجمہ ہے۔ اس سے پہلے صرف دونوں ''شاہ بھائیوں'' (شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبد القادر صاحب) کے اردو ترجمے تھے۔ ان کی زبان سو برس کی پرانی ہو چکی تھی۔ ڈپٹی صاحب نے اپنے ترجمے میں نہایت ضروری اور مفید اضافے کیے:۔

(۱) صرف زبان کو با محاورہ نہیں کیا، بلکہ خطوط ہلالی میں تشریحی الفاظ لکھ کر عبارت کو مسلسل و مربوط کر دیا۔

(۲) حاشیے پر فائدے لکھے۔ ان میں شاہ عبد القادر صاحب کی تفسیر 'موضح القرآن'

سے مدد لی ہے، بلکہ جا بجا ان کی عبارتیں نقل کر دی ہیں۔

(۳) لُغاتِ عربی کی تشریح الگ لکھی۔ یہ عربی داں قاریوں کو خاص کر مفید ہے۔

(۴) مضامینِ قرآن مجید کی فہرست حوالۂ آیات کے ساتھ ایسی تفصیل و تجزیہ کے ساتھ مرتب کی کہ مطالبِ قرآنی کے اندازے کے ساتھ تنزیلِ الٰہی کی ضرورت و عظمت بھی بہ یک نظر معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ چیز بھی اُردو میں عجیب و جدید تھی۔

نذیر احمد صاحب نے ترجمۂ قرآن بھی اپنی بے تکلف زبان و محاورہ میں کیا ہے۔ مثلاً:-

(۱) ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ	پھر عرش پر جا براجا
(۲) قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (اعراف پارہ ۸)	(اس پر) شیطان بولا کہ جیسی تو نے میری راہ ماری ہے، میں بھی تیرے سیدھے راستے پر بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں تو سہی ۔
(۳) وَ نَادٰهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ (اعراف)	اور ان کے پروردگار نے ان کو ڈانٹا کہ کیا ہم نے تم کو اس درخت (کے کھانے) کی مناہی نہیں کی تھی۔
(۴) قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (یوسف، پارہ ۱۳)	ان کے باپ (یعقوب) نے کہنا شروع کیا کہ اگر مجھ کو سترا بہترا نہ بناؤ تو (ایک بات کہوں کہ) مجھ کو تو یوسف کی مہک آ رہی ہے۔
(۵) فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (فجر پارہ ۳۰)	تو (اے پیغمبر) تمھارے پروردگار نے ان (سب) پر عذاب کا کوڑا اچھکارا، بے شک تمھارا پروردگار نافرمانوں کی تاک میں (لگا رہتا) ہے۔

(۶) فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا۔ (شمس، پارہ ۳۰)
تو ان کے پروردگار نے ان کے گناہ کے بدلے ان پر ہلاکت لا نازل کی اور سب کو (مار کے) بپڑا کر دیا۔

(۷) اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (بنی اسرائیل، پارہ ۱۵)
کیونکہ نماز صبح کا وقت نور ظہور کا وقت ہے۔

اس آخری ترجمہ (نور ظہور کا وقت) پر نذیر احمد صاحب نے حاشیہ پر یہ فائدہ لکھا ہے:-

''مفسرین نے لفظ مشہود کے بہت سے معنی لکھے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ انتظام دنیا کے لئے جو فرشتے آتے ہیں، دن کے فرشتے الگ ہیں، اور رات کے الگ ہیں، اس وقت ان کی بدلی ہوتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ صبح کی نماز میں نمازی کثرت سے جمع ہوتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ صبح کا وقت حضور قلب کا وقت ہے کہ نماز میں جی خوب لگتا ہے۔ اور اس کے سوا اور بہت سے اقوال ہیں۔ ان سب تفسیروں پر نظر کر کے ہم نے ایک لگتا ہوا سا ترجمہ اختیار کر لیا ہے۔ اور قران الفجر کے معنی تو ظاہر ہیں ''صبح کا قرآن'' مگر اس سے مراد نماز صبح ہے۔

ترجمہ کے نمونے میں انھیں آیتوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جن کا شاہ صاحبان کے ترجمے سے اقتباس ہو چکا ہے۔ اور اس کتاب کے صفحہ ۹۰ پر درج ہے، تاکہ اسلوب و زبان کا باہم مقابلہ آسان ہو۔

(الف) ''اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہم کو (اس کے وبال میں) نہ پکڑ اور اے ہمارے پروردگار جو لوگ ہم سے پہلے ہو کر گزرے ہیں، جس طرح ان پر تو نے (ان کے گناہوں کی پاداش میں) احکام سخت کا بار ڈالا تھا، ویسا بار ہم پر نہ ڈال۔ اور اے ہمارے پروردگار اتنا بوجھ جس (کے اٹھانے) کی ہم کو طاقت نہیں ہم سے نہ اٹھوا اور ہمارے قصوروں سے در گذر اور ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا (حامی و) مددگار ہے۔ تو ان لوگوں کے مقابلے میں جو کافر ہیں ہماری مدد کر۔''

(سورہ بقرہ کی آخری آیات)

(ب)''(پھر ہم جنات اور بنی آدم دونوں سے مخاطب ہو کر پوچھیں گے) کہ اے گروہ جن وانس کیا تمھارے پاس تمھیں میں کے پیغمبر نہیں آئے کہ تم سے ہمارے احکام بیان کریں اور تمھارے اس روز (قیامت) کے پیش آنے سے تم کو ڈرائیں۔ وہ عرض کریں گے کہ ہم اپنے اوپر آپ ہی گواہی دیتے ہیں (یعنی اپنے گناہ کا اقرار کرتے ہیں) اور (واقع میں) دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں رکھا اور (اب) انھوں نے آپ ہی اپنے اوپر گواہی دی (یعنی اقرار کیا) کہ بے شک وہ کافر تھے۔''

ڈپٹی صاحب کے ترجمہ کی جدّتوں اور خوبیوں سے بعد کے مترجمین نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ خطوط ہلالی کے تشریحی الفاظ بلا استثنا تمام مترجمین نے اپنے اپنے ترجموں میں بڑھائے۔ تفسیری حاشیے بھی اکثر نے لکھے۔ چند مشہور مترجم یہ ہیں: -۱۔ مولوی فتح محمد جالندھری، ۲۔ مولوی عاشق الٰہی، ۳۔ مولوی احمد رضا خاں بریلوی، ۴۔ مولوی اشرف علی تھانوی، ۵۔ مولوی محمود حسن دیوبندی۔ ان سب کے ترجمے اپنے اپنے دائروں میں مقبول ہیں، لیکن یہ سب مولوی نذیر احمد دہلوی سے مستفیض ہیں۔ اگر چہ سب نہیں تو ان میں سے اکثر وہ ہیں جنھوں نے نذیر احمد پر ترجمہ کی خامیوں اور زبان ومحاورہ کی آزادیوں کے سبب سے کفر تک کے فتوے لگا دئے تھے۔ اس ہنگامہ آرائی کی حقیقت یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد باوجود وضع قدیم کے بہت کچھ آزاد خیال تھے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے آپ کو مجتہد سمجھتے تھے۔ اس لیے عقائد واعمال میں بعض وہ باتیں بھی شامل تھیں جو مذہب جمہور کے خلاف ہیں۔ یہ بنائے فساد تھی۔ اور اس بنا پر علماء کا ڈپٹی صاحب سے اختلاف بیجا نہ تھا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ جن مترجموں کے نام اوپر لکھے گئے، ان میں سے بھی بعض بزرگ عقیدہ ومسلک کے اعتبار سے باہم تخالف وتضاد رکھتے ہیں۔ اور ایک کا ترجمہ دوسرے کے نزدیک نامعتبر ہے۔ اس قسم کا اختلاف ازل سے ہے اور اُبد تک رہے گا۔ ہم کو اس وقت ترجمہ کی جدتوں اور خوبیوں سے بحث ہے، اصل میں ڈپٹی صاحب کا فضل تقدّم مسلّم ہے۔

(۷) الحقوق والفرائض، ترجمہ قرآن شریف کی مفصل فہرست مضامین بناتے وقت ڈپٹی نذیر احمد صاحب کو خیال آیا ہوگا کہ یہ مضامین الگ کتاب کی صورت میں مرتب کردئے جائیں جن میں قرآن مجید کے علاوہ حدیث شریف کے حوالے بھی ہوں اور اپنی

طرف سے ان کے مطالب کی تفسیر بھی۔ چنانچہ ایک ہزار صفحوں کے تین حصے تیار کردئے۔ پہلا حصہ حقوق اللہ، دوسرا حقوق العباد، تیسرا اخلاق۔ تیسرے کے آخر میں ''خاتمہ الطبع'' شامل ہے جو ڈپٹی صاحب نے یکم ستمبر ۱۹۰۶ء کو لکھا ہے۔ یعنی اس تاریخ تالیف ختم کی ہے۔ اس کے آغاز میں صورت تالیف یہ بیان کرتے ہیں:۔

''جس چاؤ سے ہم نے اس کتاب کے جمع کرنے کا منصوبہ باندھا۔ اسی نے آخر کار ختم کی خوشی میں کھنڈت کی۔ ہم نے اس کو خدا کی خاص عنایت سمجھا کہ ہم نے ایسی کتاب کی ضرورت کا احساس کیا۔ ہر چند جستجو کی عربی، فارسی، اُردو میں اس طرح کی کتاب کا کہیں پتہ نہ چلا۔ مجبوراً اپنے بوتے سے بڑھ کر آپ اس کا بیڑا اٹھایا۔ شوق متقاضی کہ جو کام برسوں میں ہونے کا ہے مہینوں میں سرانجام پائے، مہینوں کا دنوں میں اور دنوں کا گھڑیوں میں، گھڑیوں کا پلوں میں۔ اور ایسا ہی ہوا کہ مسودے کی سیاہی سوکھنے نہیں پاتی تھی کہ چھپنے کے لئے دے دیا جاتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ چھاپے خانے والوں کے تقاضے سے مسودہ لکھا گیا ہے۔ ناظرین انصاف کریں کہ کہیں ایسی مہتم بالشان تصنیفیں اس عجلت سے بھی ہوئی ہیں۔ ہم نے بھی اپنی عمر کا معتد بہ حصہ اسی شغل میں گذارا ہے تو اطمینان سے برسوں میں مسودے کیے ہیں۔ برسوں مسودے زیرِ نظر رہے ہیں، اور اس پر بھی آخری پروف تک اصلاح وترمیم ہوتی رہی ہے۔ تب کہیں جاکر کتاب کو صلۂ قبول حاصل ہوا ہے۔ (۱)

---

(۱) ڈپٹی صاحب کا یہ مضمون دیکھ کر اس نوٹ کے لکھنے کا خیال آیا۔ یہ میری خامی وکوتاہی کا اظہار واقرار تو ہے، لیکن ''تصنیفی لطیفہ'' بھی ہے کہ میری یہ تالیف 'داستان تاریخ اُردو' بھی اسی طرح لکھی اور چھاپی جارہی ہے کہ کبھی مسودے کے چند اوراق لکھتے ہی مطبع کو دے دئے گئے اور کبھی اہل مطبع کے تقاضے سے مسودہ لکھا گیا۔ لیکن مجھ میں اور ڈپٹی صاحب میں یہ فرق ہے کہ انھوں نے کتاب کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے دم لیا۔ اور مجھے لکھتے ہوئے چوتھا برس ہے۔ نہ لکھنا ختم ہوا نہ چھپنا۔ ۱۹۳۸ء میں لکھنی شروع کی اور کتاب کا تاریخی نام بھی اسی سال نکال لیا۔ اسی سال کتاب چھپنی شروع ہوئی، لیکن ۱۹۳۹ء کے شروع میں تالیف وطباعت دونوں بند ہوگئیں۔ پھر آخر سال میں دونوں کام شروع ہوئے اور رُک گئے۔ پھر ۱۹۴۰ء میں کتاب کے ۴۹۶ صفحات چھپنے کے بعد مسودہ ختم ہوگیا اور کام بند رہا۔ اب ۱۹۴۱ء کے وسط میں پھر لکھنا اور چھپنا شروع ہوا ہے اور ساتھ ہی فہرست مضامین بھی چھپتی جاتی ہے۔ اسی سال ختم کرنے کے ارادے سے اختتام تالیف کی تاریخ بھی سرورق پر لکھوادی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔ یہ مضمون دیباچے میں لکھنے کا تھا، لیکن یہیں سہی۔ حامد حسن قادری

'الحقوق والفرائض' کی ترتیب اس طرح ہے کہ ہر عنوان کے نیچے قرآن وحدیث کے متعلقہ اقتباسات لکھے ہیں اور بالمقابل ان کا ترجمہ کیا ہے۔ اور نیچے ضروری حاشیے دیے ہیں۔ پھر من المترجم لکھ کر اپنی تفسیر وتشریح لکھی ہے جو کہیں چند سطریں ہیں کہیں طویل مضمون اور کہیں رسالہ کا رسالہ، حقوق اور اخلاق وآداب کا ایسا احاطہ کیا ہے کہ اپنے نزدیک ادنیٰ سی بات بھی نہیں چھوڑی۔ نمونے کے طور پر ایک چھوٹی سی فصل پوری نقل کی جاتی ہے:-

حقے پان کے آداب

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُ مَا لَا یُعْنِیْهِ (ترمذی)	ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آدمی کا بہترین اسلام ان چیزوں کے چھوڑ دینے میں ہے جو اس کے کار آمد نہیں۔

من المترجم۔ ہم اپنی جگہ اسی خیال میں ہیں کہ یہ کتاب احکام شریعۃ اسلامی کے فتاوے کا کام دے۔ بڑی چھوٹی کوئی بات اس سے رہ نہ جائے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں پر ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ بڑی بھول ہوئی کہ حقے پان تما کو کی نسبت کچھ نہیں لکھا، حالانکہ یہ چیزیں ہم مسلمانوں میں اس کثرت سے چل پڑی ہیں کہ اب ان ہی کی تواضع ومدارات رہ گئی ہے۔ اور غالباً دو تہائی سے زیادہ ہی زیادہ مرد وزن اس بلا میں مبتلا ہیں۔ حقیقت میں تو حقہ پان تما کو ماکولات اور مشروبات کی قسم کے ہیں نہیں، اور اسی وجہ سے ہم نے کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں کے بیان میں ان کے حال سے تعرض نہیں کیا۔ مگر بولنے میں حقے پان تما کو کو کھانے پینے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کثرت استعمال اور تعبیر کے لحاظ سے ہم نے ان کا جداگانہ باب قائم کیا۔ فرضی حکایتوں میں سے ایک حکایت ہے کہ ایک چوہے کو کہیں سے ہلدی کی ایک گرہ مل گئی۔ وہ برخود غلط اس گرہ کے برتے پر اپنے تئیں پنساری سمجھنے لگا۔ یہی حال آدمی کا ہے خصوصاً ان وقتوں کے متزلزل العقیدہ مسلمانوں کا کہ تا وقتیکہ عقل اجازت نہ دے، معاذ اللہ خدا اور رسول کسی کے کہنے کا یقین نہیں کرتے، تو یہ گویا وہی برخود غلط

چوہے ہیں اور عقل ان کی ہلدی کی گرہ۔ بے شک ہم کو عقل اسی لئے دی گئی ہے کہ ہم اس سے دنیا اور دین دونوں میں مدد لیں۔ اس کی ہدایت پر کاربند ہوں، اور عقل ہی کی وجہ سے ہم مکلف بالشرائع بھی ٹھہرائے گئے ہیں۔ مگر غلطی کیا ہوتی ہے کہ ہم (ہر کس را عقل خود بکمال و فرزند خود بجمال) اپنی عقل کو عقل کامل سمجھ کر اس کو معصوم عن الخطاء مانے ہوئے ہیں۔ اور عقل سے فوق طاقت کام لیتے ہیں۔ جیسے کوئی شخص چشم سر سے پسِ دیوار یا مسافت بعیدہ پر دیکھنے کا قصد کرے۔ پس یہ ہے منشا گمراہی کا، اور اسی سے کہا گیا کہ اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَرْ۔ یہی معاملہ کھانے پینے کی حرام حلال چیزوں کا ہے۔ ہم نے سوچ کر حرمت کی دو وجہیں پیدا کیں۔ مَا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ کے لئے ممانعتِ شرک اور باقی محرمات کے لئے ان کا از روئے طب انسان کی جسمانی، دماغی، اخلاقی صحت کے حق میں ادیر سو یر مضر ہونا۔ اس پر بھی اگر کسی خاص چیز کی حرمت کی وجہ شافی سمجھ میں آئے تو قصور فہم کا اعتراف کر کے ہم کو چاہئے کہ حکم شارع کو بے چون و چرا تسلیم کریں۔ ہاں ایسا بھی ہے کہ بعض چیزوں میں شارع نے بنظر مزید اہتمام و احتیاط تضییق بھی کی ہے، تو وہ بھی مبنی بر مصلحت ہے۔ جیسے شراب کہ حدِ سُکر کو نہ بھی پہنچے تو بھی حرام ہے۔ تِلْکَ (۱) حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۔ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُوْلٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ حقے پان تماکو میں حقے کا تو کوئی قصور نہیں کہ وہ ایک آلہ ہے، اور نہ پان کہ وہ بیتا ہے۔ قصور جو کچھ ہے تماکو کا ہے، تو مولویوں کے جھگڑے میں کون پڑے، کوئی اس کو حرام بتاتا ہے، کوئی مکروہ تحریمی، کوئی مکروہ تنزیہی اور بعض اس کی حلّت کے بھی قائل ہیں۔ ہم تو اتنا ہی کہتے ہیں کہ اپنے پیچھے ایک لت لگا لینے کی تو بات ہی اور ہے تماکو کھایا جائے یا پیا جائے یا سونگھا جائے۔ عادت سے پہلے لایعنی تو

---

(۱) یہ اللہ کی (باندھی ہوئی) حدیں ہیں تو ان کے پاس بھی نہ پھٹکنا۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام لوگوں سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ (خلاف حکم کرنے سے) بچیں۔ (۲)

---

(۲) الحقوق کے اس حاشیہ میں جو ترجمہ درج ہے، اس میں اوپر کی دوسری آیت کا ترجمہ نہیں ہے۔ غلطی سے کسی اور آیت کا ترجمہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس آیت (ومن یتعد) کا ترجمہ یہ ہے:-

"اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔"

ضرور ہے۔ اور مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُ مَا لَا یَعْنِیْهِ کی رو سے تماکو کا استعمال کسی طرح بھی ہو پرہیزگاری کی شان سے بعید۔ جتنے کا تماکو ملک میں خرچ ہوتا ہے، صوبے صوبے میں یونیورسٹی (دارالعلوم) بنا دینے کا تو میں ٹھیکہ لیتا ہوں۔ لیکن اگر خدا کسی قوم کی عقلیں گدی میں لگا دے تو وہ کیا فلاح پا سکتی ہے۔ مولوی بچارے حرمت نہیں کفر وارتداد کے فتوے بھی دیں تو تماکو کا رواج رُک نہیں سکتا کہ اب شرطِ زندگی ہو گیا ہے۔

نذیر احمد صاحب نے من المترجم میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کا طولِ کلام کا شوق ظاہر ہے۔ اسی طرح ہر جگہ بات کو بڑھا کر کہتے ہیں۔ لیکن کمال یہی ہے کہ ان کا ''دراز تر'' کہنا بھی ''لذیذ'' ہوتا ہے۔

(۸) الاجتہاد، یہ ڈپٹی نذیر احمد کے آخری زمانے کی کتاب ہے۔ ۱۹۰۸ء (۱۳۲۴ھ) میں تصنیف کی ہے اور ان کے اُسی خصوصی رنگ کی کتاب ہے۔ صرف وجہ تالیف کی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:-

''ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے یہ خیال آیا کہ ''میں کیوں مسلمان ہوں؟'' یہ خیال کچھ ایسا پیچھے پڑا کہ ہر چند میں اس کو ٹالنا چاہتا تھا۔ ٹلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ یہاں تک کہ کئی سال میں متواتر اسی خیال میں غلطاں پیچاں رہا۔ خیال نے ایسی وسعت پکڑی کہ تھا تو میں ایک، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک سے دو ہو گیا ہوں۔ ایک حیثیت سے سائل اور دوسری حیثیت سے مُجیب۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا خیال کبھی دوسرے مسلمانوں کو بھی آتا ہے یا نہیں، مگر آنا چاہئے۔ بلکہ مسلمانوں کی خصوصیت نہیں، میں تو کہتا ہوں کہ ہر ایک شخص کو جو مذہب کی ضرورت کو سمجھ کر کسی خاص مذہب کا معتقد ہو، کبھی نہ کبھی اپنے نفس سے پوچھنا چاہئے کہ وہ کیوں مثلاً ہندو، یا عیسائی یا یہودی یا پارسی یا کیا یا کیا ہے۔ ایسا خیال کرنے سے قوی امید ہے کہ وہ حق کو دریافت کر لے گا۔

چنانچہ الاجتہاد میں سوال و جواب کی صورت میں تمام عقائد مذہبی و اسلامی سے بحث کی ہے۔ اور اسلام کو عقل کے مطابق ثابت کیا ہے۔

(۹) مبادی الحکمۃ، علم منطق کا رسالہ ہے اور نذیر احمد صاحب کی قدیم تصانیف میں ہے۔ ۱۸۷۱ء (۱۲۸۸ھ) میں لکھا گیا۔ اس کا سبب تالیف یہ بیان کرتے

ہیں:-

اب وہ وقت پہنچا اور وہ زمانہ آ گیا کہ مشکل سے مشکل مضمون اور پیچیدہ مطلب پر بھی ہم اپنی ہی زبان میں مباحثہ و مناظرہ کرتے رہیں۔ پس کیا ایسی حالت میں زبانِ اُردو منطق کی حاجت مند نہیں؟ سخت حاجت مند ہے۔ دعوے کا اثبات، حق کا مطالبہ استحقاق کی حفاظت، دلیل کی استواری، مطلب کی تائید، اعتراض کی تردید، الزام کا دفیعہ، فریب کی پردہ دری، مغالطے کا افشا، حتیٰ کہ احقاق حق، وابطالِ باطل، منطق نہیں تو کچھ نہیں۔ یہی حاجت دیکھ کر میں نے اس رسالہ اُردو میں ضروری مسائل علم منطق جمع کیے۔ باتیں وہی قطعی اور اس سے فروتر کتابوں کی ہیں۔ طرز ادا میرا ہے اور ایک انگریزی رسالہ منطق جناب افضل الحکما، ایم کیمسن صاحب بہادر دام اقبالہم نے عنایت فرمایا تھا۔ کچھ اس سے اخذ کیا ہے۔ یوں عربی اور انگریزی مل کر ایک خاص شان پیدا ہوگئی ہے۔

اُردو میں اس سے پہلے بھی منطق کی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں سے بعض کے نمونے پہلے آ چکے ہیں۔ مولوی عبدالحق منطقی خیر آبادی نے اپنا رسالہ 'منطق بالکل قدیم اصول و طرز پر لکھا ہے، اور لوگوں نے کوئی جدت پیدا کی تو اختصار مضمون اور قدامتِ زبان کے سبب سے اس میں لطف پیدا نہ ہوا۔ مولوی نذیر احمد نے اپنی جدت طرازی سے کام لیا۔ اور اُردو میں بالکل نئی چیز پیدا کر دی۔ لیکن علماء و مدرسین کی قدامت پرستی نے نذیر احمد صاحب کی 'مبادی الحکمۃ' سے فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی منطق کی تعلیم جاری، لیکن وہ انگریزی زبان میں ہے۔ اس لئے ڈپٹی صاحب کی یہ کتاب آگے نہ چل سکی۔ ان کے بعد مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی مرحوم نے ایک منطق کی کتاب 'الاستدلال' کے نام سے لکھی اور اچھی لکھی۔ اس میں عربی و انگریزی دونوں اصطلاحیں لکھی ہیں اور طرزِ بیان شگفتہ و دلچسپ ہے۔ 'مبادی الحکمۃ' کا مختصر نمونہ یہ ہے:-

حدِ اوسط۔ قیاس کے دو مقدموں میں حدِ اوسط کا مکرر ہونا انتاج (نتیجہ دینا) کے لئے شرط اعظم ہے۔ اس میں کبھی کبھی مغالطہ بھی واقع ہوتا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بادی النظر میں تو حدِ اوسط مکرر معلوم ہوتی ہے جو لفظ صغریٰ میں ہے وہی کبریٰ میں ہے۔ مگر ایک میں اس لفظ کے حقیقی معنی مراد ہوتے ہیں، دوسرے میں مجازی۔ یا ایک میں لغوی دوسرے میں منقول۔ یا یہ کہ وہ لفظ مشترک ہے۔ ایک میں

کچھ دوسرے میں کچھ۔ مقولات شعراء تمام تر اسی طرح کے مغالطات سے بھرے ہوتے ہیں۔ مثلاً

مکن در خانہ سازی طول۔ اندک عرض من بشنو

کہ ایں را قصری نا نہد۔ باید مختصر کردن

شاعر اپنے مخاطب کو قلیل عمارت کی رائے دیتا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ بیان کرتا ہے کہ یہ قصر ہے اور جتنے قصر ہیں ان کو اختصار لازم ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس عمارت کو اختصار لازم ہے۔ یہاں لفظ قصر منشائے مغالطہ ہے۔ کہ اس کے معنی لغوی بے شک کم کرنے کے ہیں، مسافر کا قصر، صلوٰۃ کا قصر، بالوں کا قصر بلکہ قصور بمعنی خطا، سب اسی مادّے سے ہیں۔ لیکن قصر کے دوسرے معنی حویلی اور محل کے بھی ہیں۔ پس لفظ قصر مشترک ہوا۔ صغریٰ میں ایک معنی مراد لئے اور کبریٰ میں دوسرے۔ مثلاً

گر آپ کے پھرے شیخ جی کعبہ کے سفر سے

تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

پھرنا مراجعت اور واپس آنا ایک معنی تو یہ ہیں، اور ایک چیز سے بدعقیدہ ہو جانا، دوسرے معنی یہ ہیں۔ اور اللہ کے گھر سے پھرنا مہلکے سے نجات پاکر سلامت نکل آنا۔ تیسرے معنی یہ ہیں۔ یا مثلاً

ہوس میں کعبہ کی کیوں شیخ بت خانہ سے گمرہ ہے

یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں اللہ ہی اللہ ہے

''اللہ ہی اللہ ہے'' اور معنوں میں مستعمل ہوتا ہے یا یہ کہ سوائے خدا کے اور کچھ نہیں، دوسرا یہ کہ کچھ بھی نہیں۔

(۱۰) اُمّہاتُ الاُمّہ (یعنی امت کی مائیں) اس کے دو ایک فقرے مولوی نذیر احمد صاحب کی بے اعتدالیوں کی مثال میں پہلے درج کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں اُمہاتُ المؤمنین ازواجِ نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کے حالات اور تعدد ازواج کے دواعی و اسباب بیان کیے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ اس ضمن میں معترضین اسلام کو جواب دیا جائے۔ یہ مقصد صحیح و درست تھا۔ سرسیّد نے بھی کسی عیسائی کی کتاب ''اُمہات المؤمنین'' کا جواب لکھا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے نذیر احمد صاحب نے اپنی حسب عادت اس کتاب میں بھی وہی بے تکلف زبان و اسلوب اختیار کیا، اور ازواجِ مطہرات اور اہلِ بیت کے تذکرے

میں ''تریا چرتر''، ''سوکنوں کی باہمی کٹا چھنی''، ''کہیں یہاں پانی نہ مرتا ہو'' وغیرہ عامیانہ و مبتذل محاورے استعمال کئے۔ اس سے پہلے ڈپٹی صاحب کی تحریروں میں بے ادبی کی ایسی صریح مثالیں نہ تھیں۔ 'اُمہات الاُمۃ' کے شائع ہوتے ہی عام پبلک کی طرف سے اور خاص کر علماء کی جانب سے اعتراض واحتجاج کا ہنگامہ برپا ہوگیا اور کفر و بے دینی کے فتوے صادر ہونے لگے۔ اول تو مولانا ہنس ہنس کر ٹالتے رہے، لیکن جب مولویوں نے حملہ کردیا اور کتاب کی تمام جلدیں حوالے کرنے اور جلانے کا مطالبہ کیا تو بہت حیلے بہانے تاویلیں کیں۔ سیکڑوں ہزاروں روپیوں کا نقصان ہوا جاتا تھا۔ مگر آخر کو ماں ہی لینے میں رفع شر نظر آیا۔ گھر پر اور مطبع میں جتنی کتابیں تھیں سب علماء نے قبضہ میں کرلیں۔ اور کانپور کے جلسۂ علماء میں پیش کیں۔ اس کا حال نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے لکھا ہے کہ ایک رات کو دو بجے تک اس کتاب پر مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر بکثرت رائے سوختنی قرار پائی۔ چنانچہ سب جلدیں ایک جگہ ڈھیر کی گئیں۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب خود اٹھ کر مٹی کے تیل کی بوتل لائے، کتابوں پر چھڑکا اور دیا سلائی لگادی۔ یہ واقعہ ہندوستان کی تاریخِ ادب میں شاید پہلا ہے۔ اس کے بعد کسی کتاب کا یہ حشر سننے میں نہیں آیا۔(۱)

بعد کو ایک عرصہ تک اس واقعہ پر موافق و مخالف رائے زنی اور داد و فریاد ہوتی رہی۔ ان میں اکثر نئی تہذیب کے آزاد خیال نوجوان تھے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ سب سے زیادہ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو برہم و برافروختہ ہوئے۔ ہم نے یہ کتاب شائع ہوتے ہی ہنگامہ آرائی سے پہلے دیکھ لی تھی۔ ۴۵ برس سے زیادہ ہوگئے۔ جب سے اب تک یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک مسلمان زبان و ادب کی محبت

---

(۱) اس کے بعد زمانۂ حال میں تقریباً ۱۵ سال ہوئے ایک کتاب البتہ جلائی گئی۔ چند نوجوان ترقی پسند ادیبوں نے افسانوں کا ایک مجموعہ 'انگارے' کے نام سے شائع کیا تھا۔ ان میں تخریب اخلاق اور توہینِ مذہب اس حد تک تھی کہ حکومت نے کتاب کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا۔ اور لکھنؤ میں اس کے نسخے جلادیے گئے۔

میں رسولؐ و آلِ رسول کی محبت پر کیونکر مقدم رکھ سکتا ہے۔

ایک عرصہ بعد ڈپٹی صاحب کے صاحبزادہ مولوی بشیر الدین صاحب نے اُمہات الامۃ' کو دوبارہ شائع کیا اور بعض قابلِ اعتراض الفاظ نکال دیے۔ مختصر نمونہ یہ ہے:۔

''لوگ بیبیاں کرنے میں جو اعتراض مدِّ نظر رکھتے ہوں، ہمارا دل تو گواہی دیتا ہے، اور ہمارا دل کیا گواہی دیتا ہے، ہر ایک منصف کا دل گواہی دے گا کہ پیغمبر صاحب نے جو بی بی کی، اسلام کا مفاد مدِّ نظر رکھ کر۔ کیسی نفسانی خواہش اور کیسا حسن و جمال اور کیسی دولت۔ ان کو اسلام کے آگے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ ہم اس کی ضرورت تو سمجھتے نہیں کہ مناکحت کو خلاف شانِ پیغمبری سمجھ کر پیغمبر صاحب میں فقدانِ قوت کے قائل ہوں۔ ایسا سمجھنا ان کے کمالِ انسانیت کو بٹہ لگانا ہے۔ پس سچی اور سیدھی بات یہ ہے کہ پیغمبر صاحب کی مناکحت میں اس قوت کو بھی دخل ضرور تھا۔ مگر اسلام کی دُھن کے آگے پیغمبر صاحب کی تمام بشری خواہشیں، بشری اغراض مغلوب تھیں۔ ہر نکاح میں اول اور اقدام اسلام، اور اسلام کی رودھن میں دوسری اغراض اور یہی وجہ تکثیر ازواج بھی ہوئی کہ دامادی کے دباؤ سے سارے سرالی قبیلے کو جھکنا پڑتا ہے، اور اسی کی اسلام کی اشاعت کے لئے بڑی ضرورت تھی۔ یہاں تک کہ جب اسلام کو خدا نے غلبہ دیا اور اعوان و انصار کے بہم پہونچانے کی ضرورت نہ رہی تو لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ (۱) سے تکثیر کو روک دیا۔

(۱۱) ڈپٹی نذیر احمد کے لکچر، ان کی قوت تقریر اور کمالِ خطابت کا پہلے ذکر کیا گیا۔ لکچروں کا بڑا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر دو لکچروں میں سے اقتباس کیا جاتا ہے:۔

(الف) آغازِ اسلام کے بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں:۔

ان کے زمانے میں اور ان کی کوششوں سے اسلام کا ترقی پانا، یہ زبردست ثبوت ان کی فیور (۲) میں ہے کہ کسی احتمالِ مخالفت کو جمنے ہی نہیں دیتا۔ جس طرح انسان اشرف المخلوقات ہے، اسی طرح مسلمان کامل افضل الناس ہے۔ صرف دین کے اعتبار سے نہیں، بلکہ میرا نہایت مستحکم عقیدہ ہے کہ جن صفتوں

---

(۱) (اے پیغمبر اس وقت کے) بعد سے دوسری عورتیں تم کو درست نہیں۔ (۲) حمایت، طرفداری

کے مجموعے کا نام اسلام ہے نیچرلی (۱) اس بات کے مقتضی ہیں کہ دنیا میں بھی مسلمانوں ہی کو فضیلت اور برتری ہو، بلکہ میں تو دنیاوی ترقی و تنزل کو اسلام یعنی دینِ اسلام کے کامل و ناقص ہونے کا معیار قرار دیتا ہوں۔ وہ مسلمان بڑی غلطی پر ہیں، اور افسوس ہے کہ ایسے بہت ہیں خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر صاحب کی رسالت کا مقصود یہ تھا کہ ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں یا عیسائی راہبوں کی قسم کا ایک گروہ تیار کیا جائے، نرے خداپرست، دنیا سے بے نصیب محض، اگر پیغمبر صاحب کا یہ مقصد رہا ہو، اور میں کہتا ہوں کہ نہیں رہا، وَالَّذِی نَفْسِیْ بِیَدِہٖ نہیں رہا، ہرگز نہیں رہا، تو معاذ اللہ پیغمبر صاحب کی رسالت کی فیلیور، ٹوٹل فیلیور (۲) کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ پیغمبر صاحب نہیں چھوڑ کر مرے خداپرست جوگی، خداپرست سنیاسی، خداپرست راہب، خداپرست آج کل کے ٹکڑگدے، بھک منگے، علماء اور مشائخ۔ بلکہ خداپرست امپررز (شاہنشاہ)، خداپرست کنگز (بادشاہ) خداپرست منسٹرز (وزیر) خداپرست ایڈمنسٹریٹر (مدبّران ملک)، خداپرست کمانڈرز (سپہ سالار)، خداپرست ججز، خداپرست آرٹسٹز (فصحاء)، خداپرست مرچنٹز (سوداگر)، خداپرست دنیادار آف اوری کالنگ اینڈ پروفیشن (ہر ایک پیشے اور ہر ایک شغلے کے) اُولٰئِکَ ھُمُ الْمُؤمِنُوْنَ حَقًّا لَھُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَ مَغْفِرَۃٌ وَ رِزْقٌ کَرِیْمٌ۔

(لکچر ایجوکیشنل کانگریس اجلاس چہارم، منعقدہ دسمبر ۱۸۸۹ء، بمقام علی گڑھ)

ان چند سطروں میں انگریزی بولنے کا شوق قابلِ دید ہے۔ یہ تقریر نذیر احمد صاحب کے ابتدائی لکچروں میں اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زمانۂ آغاز کی تقریروں میں ہے۔ جب کہ اس کے نام میں کانفرنس کی جگہ کانگریس کا لفظ ہندوؤں کی انڈین نیشنل کانگریس کی تقلید میں تھا۔ اسی لکچر کا دوسرا اقتباس یہ ہے:-

(ب) ''ہم یہ کہنے کو تو موجود ہیں کہ ''مسکین ایں ندارد آں ندارد'' مگر کرنے کے نام پر میرے دیکھنے میں تو اتنا ہوا ہے کہ سیّد احمد خاں کے غل شور مچانے سے قومی مرثیہ خوانوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے۔ جب تک لکھنؤ میں نوابی رہی مرثیہ خوانی کا بڑا زور و شور تھا۔ اور اسی طرز خاص کو انیسؔ اور دبیرؔ نے حقیقت میں معجز بیانی کی حد تک پہونچا دیا۔ نہ کسی نے ان جیسا کہا اور نہ کوئی ان جیسا کہہ سکے گا۔ اب جو نئی قسم کے

---

(۱) قدرتی طور پر (۲) ناکامی، پوری ناکامی

مرثیہ خواں چلے تو اس کے موجد ہوئے ہمارے مولوی الطاف حسین صاحب حالی انھوں نے ایک بڑی
دھوم کا مسدس لکھ کر کچھ ایسا بگل پھونکا کہ جہاں جہاں موزوں طبع تھے سب لگے ان کی لے میں گانے
اور گنگنانے۔ گنگنانے والوں میں یہ آپ کا نیازمند بھی ہے کہ شعر تو نہیں کہہ سکتا مگر تک سے تک ملا لیا
کرتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مولوی الطاف حسین نے مسدس اس غرض سے کہا تھا کہ ایشیائی شاعری میں
ایک طرزِ جدید داخل کریں، بلکہ ان کی غرض اصلی یہ تھی کہ سوتی ہوئی قوم جاگے اور دیکھے کہ تباہی کا
سیلاب ان کے سروں پر آپہونچا۔ مگر قوم نے جاگنا تو درکنار کروٹ تک بھی تو نہ لی۔ اور ان کے مسدس
کا ایک کھیل بنا کھڑا کیا۔ کوئی اس کو اس لئے نہیں پڑھتا کہ سمجھے اور عمل کرے۔ نظر پڑتی ہے تو وہی محاسن
شاعری پر۔ اور سید احمد خاں صاحب برا مانیں تو مانیں، قریب قریب یہی حال اس کانگریس کا۔ اکثر تو
تماشائی ہوں گے۔ بعض اس کو ایک طرح کی محفلِ مشاعرہ سمجھ کر شریک ہوئے ہوں گے کہ سر سید لکچر
دیں گے، مولوی الطاف حسین، مولوی شبلی، منشی احمد علی شوق اپنے اپنے افکار تازہ پڑھیں گے۔ ذرا چل
کر سنیں تو سہی کیا کہتے ہیں۔ بعض صرف سر سید احمد خاں کے 'دلبکی' ہوں گے اور بعض شہدا ہوں گے،
لڑنے بھڑنے کے لئے نہیں، لہو لگا لینے کے لئے۔ جو چاہتے ہیں کہ محض کانفرنس میں شریک ہونے کی
وجہ سے ان کا نام دردمندانِ قوم کی فہرست میں چڑھ جائے۔ جتنے صاحب شریک محفل ہیں سب سے
بدتر میں ہوں۔ کمبخت کو آندھی کرنے کو خاک جب آدمی خود ایک بات کا عامل نہیں دوسرے پر اس کا اثر کیا
ہو۔ غرض کیا مستمع کیا لکچرار، ہیں سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے، پھر بھلا ایسے مجمعوں سے کیا فلاح
ہونی ہے۔ رونے آئے مرتے کی خبر لے کر چلے۔ قوم کا تو یہ حال ہے کہ ایک ایک منٹ اور ایک ایک
سیکنڈ کی دیر میں برسوں نہیں، عمروں کا نقصان ہو رہا ہے، اور یہاں ہنوز روزِ اول ہے۔''

(ج) یہ ڈپٹی صاحب کا اکتالیسواں لکچر ہے جو ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۰۰ء بمقام ریاست رامپور میں پڑھا گیا۔ یہ لکچر نذیر احمد صاحب کی زبان سے سننے کا شرف ہم کو بھی حاصل ہے۔ شروع میں ایک طویل نظم اور اس کی ''بین الاشعار'' تشریح ہے۔ نظم کا مطلع یہ ہے:۔

الٰہی دے مسلمانوں کو توفیقِ مسلمانی — کہ پھر آجائے کشتِ مردۂ اسلام میں پانی

اور مقطع یہ ہے:۔

تم اپنی نثر لو اور نظم کو چھوڑو نذیر احمد   کہ اس کے واسطے موضوع ہیں حالی ونعمانی
یعنی شبلی

نظم کے بعد فرماتے ہیں:-

عِبَادَ اللہِ رَحِمَکُمُ اللہ ، میں نے نظم میں آپ کا بہت سا وقت لے لیا ہے کہ آڈینس (۱) قرآن سے اوورڈوسڈ ہو گیا ہے، یعنی عادت سے زیادہ قرآن سنایا گیا ہے۔ اس لئے کہ مجکو تمام آیتوں کا ترجمہ بھی کرنا پڑا۔ اب اس کی تلافی سوائے اس کے کچھ میرے اختیار میں نہیں کہ نثر میں کمی کروں۔ کہنا تو بہت ہے مگر میں تعلیم کے متعلق صرف چند باتیں کہہ کر بس کروں گا۔ سب سے پہلے یہ بات دیکھنے کی ہے کہ تعلیم کی غرض وغایت کیا ہے.......... پس تعلیم کے مفید ونامفید ہونے کا معیار ٹھہرا انسان کی آسائش، انسان کی عافیت، تو تعلیم کی دو شاخیں ہو گئیں۔ جو تعلیم انسان کے قوائے عقلی کو ڈولپ (۲) کرے اس کو ہم دنیاوی تعلیم کہیں گے، اور جو تعلیم انسان کی تمدنی حالت کی اصلاح کرے۔ اس کو دینی۔ یہ امر داخل بداہت ہے کہ اہلِ یورپ کے قوائے عقلی بڑے زوروں پر ہیں اور ریل اور اسٹیمر اور تار برقی اور انواع و اقسام کی مشینیں ان ہی زوروں کے آثار ہیں۔ دو چار سیدھی سادی کلیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خدا علیم ہے کہ ان کا کانسٹرکشن (۳) سمجھ میں نہیں آتا۔ کیسے ذہن ہوں گے جنھوں نے ان کو ایجاد کیا ہوگا، اچھا تو یہ زور ان کے قوائے عقلی ہیں۔ یہ انتقال ان کے ذہنوں میں کہاں سے آیا۔ آب وہوا تو وہی ہے جو پہلے تھی۔ لیکن تاریخ بتا رہی ہے کہ اب سے زیادہ چار ساڑھے چار سو برس پہلے ہمارے ملک کے گونڈوں اور بھیلوں کی طرح اہلِ یورپ بھی وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے، یا اور بہت سے ملک ہیں جن کی آب وہوا یورپ کی آب وہوا سے ملتی جلتی ہے، اور وہاں کے باشندے کندۂ ناتراش ہیں۔ ہو نہ ہو یہ ترقی یہ عروج جو اہلِ یورپ کو ہے، سائنس کی تعلیم کا نتیجہ ہے، جو یورپ میں تکمیل کے ساتھ دی جارہی ہے۔ اور گورنمنٹ نے کمال فیاضی سے اس کی ابجد نیٹوز (۴) کو پڑھانی شروع کی ہے۔ فَمِنْھُمْ مَنْ (۵)

---

(۱) مجمع حاضرین   (۲) ترقی دے، بڑھائے

(۳) ترکیب وساخت   (۴) دیسی ہندوستانی لوگ

(۵) لوگوں میں کوئی اس (کتاب) پر ایمان لایا اور کوئی اس سے ٹھٹک رہا۔

امَنَ بِہٖ وَ مِنھُمْ مَنْ صَدَّ عَنہُ صدّ عنہ میں کم نصیب بدقسمت بدبخت مسلمان ہیں، جواب تک اس جدید تعلیم کی طرف سے پس و پیش میں پڑے ہیں۔ پس اس کو تو خدا کی طرف سے فیصل شدہ سمجھو کہ دنیاوی بہبود و فلاح تو بدون سائنس کی تعلیم کے ہوتی نہیں۔ ان شخصیا شخصی و ان قومیا فقومی ۔ مگر سائنس کے خزانے انگریزی کے صندوقوں میں بند ہیں۔ پہلے ان صندوقوں کو کھولنا سیکھو تب خزانے کو ہاتھ لگاؤ۔ اور نہیں سیکھتے تو سلطنتیں کھو کر رعیت بنے رہو، آگے اپنے ابنائے جنس کی غلامی کرو، جھڑکیاں سنو، جوتیاں کھاؤ، اگلوں کا ڈھکا سینتا ہو چکے تو بھیک مانگو۔ مگر میری صلاح مانو تو سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر ڈوب مرو

قسمت میں قوم کے ہی لکھی صبح و شام موت

بے حرمتی کے جینے سے بہتر حرام موت

نذیر احمد صاحب کی ایک صنف تحریر ان کے خطوط بھی ہیں، لیکن ان میں کوئی خاص ''مکتوباتی جدت'' نہیں ہے۔ ان کا ایک مجموعہ ''موعظہ حسنہ'' ہے جو انھوں نے اپنے صاحبزادے مولوی بشیر الدین کو ان کی تعلیم کے زمانے میں لکھے ہیں۔ ان خطوط میں تعلیمی ناصحانہ رنگ غالب ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی: اُردو میں مشاہیر و مصنفین کے خودنوشت حالات شاذ و نادر ملیں گے۔ سب سے زیادہ مرزا غالبؔ نے اپنے رقعات میں اپنے حالات لکھے ہیں۔ مگر ایک جا نہیں، جا بجا منتشر ہیں۔ تاہم ایسے ہیں کہ جمع و مرتب کرنے سے غالبؔ کی خودنوشت سوانح عمری بن سکتی ہے۔ ان کے بعد کسی کی ایسی تحریریں نہیں پائی جاتیں۔ اتفاق سے مولانا حالؔی کے حالات ان کے قلم کے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ نواب عماد الملک سیّد حسین بلگرامی نے ۱۹۰۱ء میں خواجہ صاحب سے فرمایش کی تھی۔ اس کی تعمیل میں لکھے گئے تھے۔ ہم اس تحریر کو ذیل میں نقل کرتے ہیں:-

میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبۂ پانی پت جو شاہجہاں آباد سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے واقع

ہوئی۔ اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دلّی پر متمکن تھا۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ ''پیر ہرات'' کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے۔ ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے جن کا سلسلۂ نسب ۲۸ واسطے سے حضرت ابوایوب انصاری تک اور ۱۸ واسطہ سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطہ سے ملک محمود شاہ انجو ملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراق و عجم کا فرمانروا تھا پہنچتا ہے۔

چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندان کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد علماء و شعراء و دیگر اہلِ کمال کا حد سے زیادہ قدردان تھا، اس لئے اہلِ علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔

چنانچہ سلطان غیاث الدین نے انھیں عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ اراضی سواد قصبۂ پانی پت میں بطور مدد معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبۂ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت و تشخیص نرخ بازار اور تولیت مزارات ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت عیدین ان سے متعلق کردی۔ پانی پت میں جواب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھیں بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔ میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں۔ اور میری ماں سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہے بیٹی تھیں۔

اگرچہ خواجہ ملک علی کی اولاد میں بہت سے لوگوں نے اول سلطنت مغلیہ کے عہد میں اور پھر شاہانِ اودھ کے دربار میں نہایت درجہ کا امتیاز حاصل کیا تھا۔ مگر زیادہ تر یہ لوگ اسی ملک و مدد معاش پر قانع رہے، جو سلاطین اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً ان کو عطا ہوتی رہی۔ میرے آبا و اجداد نے جہاں تک معلوم ہے ظاہرا کوئی خدمت دلّی یا لکھنؤ میں اختیار نہیں کی۔ سب سے پہلے میرے باپ نے (۱) سرکار انگریزی کی نوکری سررشتہ پرمٹ میں اختیار کی تھی۔

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا۔ اور میرے والد نے سن کہولت میں انتقال کیا جب کہ میں نو برس کا تھا۔ اس لئے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ انھوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا۔ مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقعہ نہ ملا۔ ایک بزرگ سیّد جعفر علی مرحوم جو میر ممنونؔ دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے۔ بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے۔ اور فارسی لٹریچر اور تاریخ اور طب میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق ہو گیا۔ انھیں دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے۔ اُن سے صرف ونحو پڑھی۔ مگر چند روز بعد بہن اور بھائی نے جن کو میں بمنزلۂ والدین کے سمجھتا تھا تأہل پر مجبور کیا اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی۔ اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا کہ یہ جو میرے کندھے پر رکھا گیا۔ اب

---

(۱) والد کا نام خواجہ ایزد بخش ہے۔ محکمہ نمک میں ملازم تھے۔

تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود تھے، سب کی خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا۔ اور بیوی کا میکہ آسودہ حال تھا۔

میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلّی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف ونحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں۔ اگرچہ اس وقت قدیم دلّی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشوونما پائی تھی وہاں علم صرف عربی وفارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہ آتا تھا اور اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے، نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے، بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء مجہلے (۱) کہتے تھے۔ دلّی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھے شب وروز رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلباء کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گذرا تھا۔ ڈیڑھ برس دلّی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں۔ اور نہ کبھی ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاءاللہ، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ۔

میں نے دلّی میں شرح سُلّم ملا حسین اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چاروناچار مجھ کو دلّی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلّی سے آ کر ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں

---

(۱) مدرسہ کے مقابلے میں مجہلہ یعنی جہالت خانہ۔

کا مطالعہ کرتا تھا۔

۱۸۵۶ء میں مجھے حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی، صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گزارے۔ اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محبّ اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور ان میں سے جب کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ اور خاص کر علم ادب کی کتابیں۔ شرح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم اور نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے۔ جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

جس زمانے میں میرا دلّی جانا ہوا تھا مرزا اسداللہ غالبؔ مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور اکثر ان کے اُردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے، ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا۔ اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی لکھ کر اُن کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگر چہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلّی میں شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

محض اجنبیت تھی اس لئے ترجمہ اور اصل دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔
لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لئے قصے کے پیرائے میں موسوم بہ 'مجالس النساء' لکھی تھی جس پر کرنل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا۔ اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔ پھر دلّی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام 'حیاتِ سعدی' ہے جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ پھر شاعری پر ایک مبسوط ''ایسے'' (مضمون) بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد مرزا غالبؔ مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اُردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے۔ اور اب سر سیّد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ 'حیاتِ جاوید' جو تقریباً ہزار صفحے کی کتاب ہے جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی۔ اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گریمر وغیرہ میں لکھی ہیں۔ جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے ہیں جو تہذیب الاخلاق، علی گڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ نیز اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہیں۔ جو ہنوز شائع نہیں ہوئی۔ جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔ میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سر سیّد کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا اور اُردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے۔ اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

۱۳۰۵ھ میں جب کہ اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا نواب
سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی
گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظہ کے لئے سر سیّد احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی
گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب
صاحب ممدوح نے بصیغۂ امداد مصنفین ایک وظیفہ پچھتر روپے ماہوار کا
میرے لئے مقرر فرمایا اور ۱۳۰۹ھ میں جب کہ سر سیّد مرحوم کے ہمراہ بشمول
دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ، حیدر آباد گیا تھا اس وظیفہ
میں پچیس روپے ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپیہ سکّہ حالی کا وظیفہ میرے لئے
مقرر کر دیا جواب تک مجھ کو ماہ بماہ سرکارِ عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے
میں نے اینگلو عربک اسکول کا تعلق قطع کر دیا ہے۔

مولانا حالیؔ کے باقی حالات و اخلاق ہم ڈاکٹر مولوی عبدالحق دہلوی کے مضمون
مطبوعہ ''چند ہم عصر'' سے مختصر کر کے نقل کرتے ہیں:-

ایک واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور جس کا ذکر میں
نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب کہ غفران مآب
اعلیٰ حضرت کی جوبلی بلدۂ حیدر آباد اور تمام ریاست میں بڑے جوش اور
شوق سے منائی جا رہی تھی۔ مولانا حالیؔ بھی اس جوبلی میں سرکار کی طرف
سے مدعو کیے گئے تھے اور نظام کلب کے ایک حصہ میں ٹھہرائے گئے تھے۔
زمانۂ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک ان سے ملنے کے لئے آتے رہتے
تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی کالج کے گریجویٹ اور حیدر
آباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار
تھے۔ زینے کے قریب اترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس
نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت ذرا سی چوک پر آپے سے
باہر ہو گئے اور سازٹ سازٹ کئی ہنٹر اس غریب کے رسید کر دئے۔ مولانا یہ نظارہ

اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا سے ملے، مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے ''ہائے ظالم نے کیا کیا۔'' اُس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے۔ کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے'' یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔'' اس کیفیت سے جو کرب و درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بد نصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہو گا۔

مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری دردِ دل۔ اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ اُن کی سیرت اور اُن کا کلام ایک ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے جھک کر اور خلوص سے ملتے تھے۔ جو کوئی ان سے ملنے آتا خوش ہو کر جاتا اور عمر بھر ان کے حسنِ اخلاق کا مدّاح رہتا تھا۔ اُن کا رتبہ بہت بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔

ہندی اُردو کا جھگڑا ان کے زمانے میں پیدا ہو چکا تھا اور اس نے ناگوار صورت اختیار کر لی تھی، لیکن باوجود اس کے انھوں نے عمر بھر اُردو کی خدمت کی اور اپنی تحریروں سے اُردو کا رتبہ بہت بلند کر دیا۔ وہ انصاف کی بات کہنے سے کبھی نہ چوکے۔ چنانچہ 'خم خانۂ جاوید' کے تبصرے میں لکھتے ہیں:-

''کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار برس سے

ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طویل مدّت میں انھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ جس سنسکرت کو یورپ کے محقق لاطینی اور یونانی سے زیادہ فصیح زیادہ وسیع اور زیادہ باقاعدہ بتاتے ہیں اور جس کی تحقیقات میں عمریں بسر کر دیتے ہیں، مسلمانوں نے عام طور پر کبھی اس کو قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو بمقابلہ سنسکرت کے نہایت سہل الوصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف، شگفتہ اور فصاحت بلاغت سے لبریز ہے اس کو بھی عموماً بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے۔ حالانکہ اُردو زبان اُن کو اس قدر عزیز ہے اس کی گریمر کا دار و مدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر پر ہے۔ عربی فارسی سے اس کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں کے اسماء اس میں کثرت سے شامل ہو گئے ہیں۔ باقی تمام اجزائے کلام جن کے بغیر کسی زبان کی نظم و نثر مفید معنی نہیں ہو سکتی، برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثل کا مصداق بنانا ہے کہ ”دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر۔“

یہ بات بعض لوگوں کو بہت ناگوار گزری اور بعض اُردو اخباروں نے اس کی تردید بھی چھاپی، لیکن جو سچی بات تھی وہ کہہ گزرے۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے کہ جو شخص اُردو کا ادیب اور محقق ہونا چاہتا ہے اسے سنسکرت یا کم سے کم ہندی بھاشا کا جاننا ضروری ہے۔

ایک بار جب اُردو لغت کی ترتیب کا ذکر ان سے آیا تو فرمانے لگے کہ لغاتِ اُردو میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلاتکلف کثرت سے داخل کرنے

چاہئیں۔ خود اپنی نظم و نثر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوبصورتی سے لکھ جاتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اس موقع کے لئے وضع ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اُردو ادب میں داخل کئے جو ہماری نظر سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کبھی کسی اُردو ادیب یا شاعر نے تو کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی حالؔی سے سیکھے۔ دلوں میں گھر کر لینے کے جو گُر ادب میں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

اُن کا ذوق شعر اعلیٰ درجہ کا تھا جیسا کہ 'حیات سعدی'، 'یادگارِ غالبؔ' اور 'مقدمہ شعر و شاعری' سے ظاہر ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صحیح ذوق پیدا کرنے میں انھوں نے بڑا کام کیا ہے۔ لیکن وہ خواہ مخواہ اس کی نمائش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہاں جب کوئی پوچھتا یا اتفاق سے بات آپڑتی تو وہ کھل کر اس کے نکات بیان کرتے تھے۔

سر سیّد تو خیر اس زمانے میں موردِ لعن و طعن تھے ہی اور ہر کس و ناکس ان پر منھ آتا تھا، لیکن اس کے بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھار پڑی وہ حالؔی تھے۔ ایک تو وہ ہر شخص جس کا تعلق سیّد احمد خاں سے تھا، یوں ہی مردود سمجھا جاتا تھا، اُس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے جدا تھی اور نشانہ ملامت بن گئی تھی۔ اور مقدمہ شعر و شاعری نے تو خاصی آگ لگا دی۔ اہلِ لکھنؤ اس معاملے میں چھوئی موئی سے کم نہیں، وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ انھیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ یہ ساری کارروائی انھیں کی مخالفت میں کی گئی ہے۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن و تعریض کی صدا آنے لگی۔ اودھ پنچ میں ایک طویل سلسلۂ مضامین ''مقدمہ'' کے خلاف مدت تک نکلتا رہا جو ادبی تنقید کا عجیب و غریب نمونہ تھا۔ وہ صرف بے

تکے اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ جن مضامین کے عنوان ایسے ہوں جیسے:۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالیؔ کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

تو اس سے سمجھ لیجئے کہ اس عنوان کے تحت کیا کچھ خرافات نہ بکی گئی ہوگی۔ مولانا سب کچھ سہتے رہے لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا۔

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چُپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہوگئیں اور وہی لوگ جو انھیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے ان کی تقلید کرنے لگے۔

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مولانا نے دنیاوی جاہ وجلال کی کبھی ہوس نہیں کی۔ جس حالت میں تھے اس پر قانع تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے تھے اور اس میں اوروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ ان کی قناعت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ انھیں عربک اسکول میں ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جب حیدرآباد میں ان کے وظیفے کی کارروائی ہوئی تو انھوں نے ساٹھ سے زیادہ طلب نہ کیے جس کے تقریباً پچھتر حالی ہوتے ہیں۔ ایک مدت تک پچھتر ہی ملتے رہے بعد میں پچیس کا اضافہ ہوا۔ ریاست حیدرآباد سے معمولی معمولی آدمیوں کو بیش قرار وظیفے ملتے ہیں۔ وہ چاہتے تو کچھ مشکل نہ تھا، مگر انھوں نے کبھی زیادہ کی ہوس نہ کی اور جو ملتا تھا اس کے وہ بہت شکرگزار تھے۔

غالباً سوائے ایک آدھ کے انھوں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی جس نے چاہا چھاپ لی۔ ان کی تصانیف مالِ یغما تھیں۔ مسدس تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو۔ یہ کیسی سیر چشمی اور اعلیٰ

ظرفی کی بات ہے۔ خصوصاً ایسے شخص کے لئے جس کی آمدنی محدود اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے کم ہو۔

اسی طرح طبیعت میں حیا بھی تھی۔ جس سال حیدر آباد تشریف لائے سر سیّد کی برسی کا جلسہ بھی انھیں کی موجودگی میں ہوا۔ ان سے خاص طور سے درخواست کی گئی کہ اس جلسے کے لئے سر سیّد کی زندگی پر کوئی مضمون پڑھیں۔ نواب عماد الملک بہادر صدر تھے۔ مولانا نے اس موقعہ کے لئے بہت اچھا مضمون لکھا تھا۔ مضمون ذرا طویل تھا پڑھتے پڑھتے شام ہوگئی، اس لئے آخری حصہ چھوڑ دیا۔ قیام گاہ پر واپس آکر فرمانے لگے کہ میرا گلا بالکل خشک ہوگیا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ اچھا ہوا اندھیرا ہوگیا۔ ورنہ اس سے آگے ایک لفظ نہ پڑھا جاتا۔ میں نے کہا وہاں پانی شربت وغیرہ کا سب انتظام تھا، آپ نے کیوں نہ فرمایا، اُسی وقت پانی یا شربت حاضر کر دیا جاتا۔ کہنے لگے اتنے بڑے مجمع میں پانی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوئی۔

جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے، قدر دانی (۱) کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو اس کی فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے تھے۔ 'پیسہ اخبار' جب روزانہ ہوا تو سب سے پہلے مولانا نے مبارکباد

---

(۱) ۱۹۰۲ء میں جب شیخ عبدالقادر صاحب نے لاہور سے رسالہ 'مخزن' جاری کرنے کا اعلان کیا تو مولانا حالی پہلے شخص تھے جنھوں نے خبر سنتے ہی اپنا سالانہ چندہ دفتر مخزن کو بھیج دیا۔ شیخ صاحب نے لکھا تھا مولانا پر یہ شعر صادق آتا ہے:-

اوّل آں کس کہ خریدار شدش من بودم
باعثِ گرمی بازار شدش من بودم

(مؤلف)

کا تار دیا۔ مولوی ظفر علی خاں کی کارگزاریوں سے خوش ہوکر ان کی تعریف میں نظم لکھی۔ ہمدرد اور مولانا محمد علی کی مدح سرائی کی۔ اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو قابلِ اعتراض ہوتی تو بڑی ہمدردی اور شفقت سے سمجھاتے اور اس کا دوسرا پہلو بجھاتے۔ اُن کے خطوں میں ایسے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعض ہم عصر اس بات سے بہت ناراض ہوتے تھے کہ مولانا داد دینے اور تعریف کرنے میں بہت فیاضی برتتے ہیں جس سے لوگوں کا دماغ پھر جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تو ہے۔ ان کی ذراسی داد سے دل کتنا بڑھ جاتا تھا اور آئندہ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔

ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت پُرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ جہاں تک مجھے ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور بعض اوقات چھیڑ چھیڑ کر اور کُرید کُرید کر دیکھا اور اُن کی تحریروں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا، مولانا اس عیب سے بری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزاد، مولانا شبلی کی کتابوں پر کیسے اچھے تبصرے لکھے ہیں اور جو باتیں قابلِ تعریف تھیں ان کی دل کھول کر داد دی ہے۔ مگر ان بزرگوں میں سے کسی نے مولانا کی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آزاد مرحوم تو ان کا نام تک سننے کے روادار نہ تھے۔ اس معاملے میں ان کی طبیعت کا رنگ بعینہٖ ایسا تھا جیسے کسی سوت کا ہوتا ہے۔ لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی زیرِ ہدایت جو جدید رنگ کے مشاعرے ہوئے، اُن میں دونوں نے طبع آزمائی کی۔ برکھارُت، حُبِ وطن، نشاطِ امید اُسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ مولانا کی ان نظموں کی جو تعریف ہوئی تو یہ امر حضرت آزاد کی طبع نازک پر گراں گزرا۔ اُس وقت سے اُن کا رُخ ایسا پھرا کہ آخر دم تک یہ پھانس نہ نکلی۔ آزاد اپنے رنگ کے بے مثل نثار ہیں مگر شعر کے کوچے میں ان کا قدم نہیں اٹھتا۔ لیکن مولانا کی انصاف پسندی ملاحظہ

کیجئے، کیسے صاف لفظوں میں اس نئی تحریک کا سہرا آزاد کے سر باندھتے ہیں:-

''۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔''

بات میں بات نکل آتی ہے۔ جب 'حیاتِ جاوید' شایع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے۔ ایک میرے لئے، ایک مولوی عزیز مرزا کے لئے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب کے لئے جو اس وقت اتفاق سے حیدر آباد میں وارد تھے۔ میں نے لے جا کر یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ شکر یہ تو رہا ایک طرف، دیکھتے ہی فرمایا ''یہ کذب وافترا کا آئینہ ہے۔'' وہاں اور بھی کئی صاحب موجود تھے۔ میں یہ سن کر دم بخود رہ گیا۔ یوں بھی کچھ کہنا سوءادب تھا، لیکن جہاں پڑھنے سے پہلے ایسی رائے کا اظہار کر دیا گیا ہو وہاں زبان سے کچھ نکالنا بے کار تھا۔

اب اس کے مقابلے میں ایک واقعہ سنئے۔ قیام حیدر آباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا سے ملنے آئے۔ اُس زمانے میں وہ ''دکن ریویو'' نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے، آنکھیں نیچی کئے چُپ چاپ سنا کئے (۱)۔ مولانا نے یہ بھی

---

(۱) اس پر اضافہ یہ ہے کہ مولانا حالی اپنے ایک خط میں ایک صاحب کو جو رسالہ 'افسر' کے ایڈیٹر رہ چکے تھے، لکھتے ہیں:-

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے، اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیونکر ہوگی، لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصبِ تنقید کے خلاف ہے۔

مولانا انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا لیکن نہ ہوسکا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے منشا کو جیسا وہ سمجھتے تھے اُس وقت بہت سے انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا کلام اور ان کی تصانیف اس کی شاہد ہیں۔ اور جو سمجھتے تھے وہ کر کے دکھا دیا۔ آج سیکڑوں تعلیم یافتہ موجود ہیں لیکن ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اس کا عشرِ عشیر بھی کیا ہو۔ پھر یہی نہیں کہ ہمارے شاعروں اور مصنفوں کی طرح وہ بالکل خیالی شخص تھے بلکہ جو کہتے اور سمجھتے تھے اُس پر عامل بھی تھے۔ آدمی مفکر بھی ہو اور عملی بھی، ایسا شاذ ہوتا ہے۔ تاہم مولانا نے اپنی بساط کے موافق عملی میدان میں بھی اپنی دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک تو انھوں نے اپنے وطن پانی پت میں مدرسہ قائم کیا جو اب حالی مسلم ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہے۔ اور ایک پبلک اور ینٹل لائبریری قائم کی جو پانی پت میں سب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ''جن لوگوں کو آپ نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ ان کے کلام پر' کرٹکل ایسے' (تنقیدی مضامین) لکھے جائیں ان میں ایک شخص کا نام ہونے سے اور ایک کا نہ ہونے سے نہایت تعجب ہوا۔ (جس شخص کا نام ہے اس کے متعلق اپنی رائے لکھنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں) اور اس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی کا نام چھوڑ دینے پر ہے۔ اس فروگذاشت کو سوا اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو میں اور کسی بات پر محمول نہیں کرسکتا۔''

یہ مثال مولانا حالی کی انصاف پسندی کے علاوہ اُن کے حسنِ ظن کی بھی ہے۔ یہ قرینِ قیاس نہیں کہ ایڈیٹر افسر انتخاب کے وقت مولانا شبلی کو بھول گئے ہوں۔ لیکن مولانا حالی گمانِ نیک سے کام لے کر بڑی خوبصورتی سے اپنے مکتوب الیہ کو مولانا شبلی کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ (مؤلف)

سے بلند اور پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ اس میں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے
جس سے پانی پت والے مستفید ہوتے ہیں۔

جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے شاید وہ سمجھتے ہوں گے
کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا
دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اٹھتا تھا، مگر ویسے وہ بڑے
شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے۔ خصوصاً ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت
اور شوخی کی باتیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور
زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

اُن کی بڑی خواہش تھی کہ اُردو زبان میں اعلیٰ درجے کے ناول
خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین
زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تا کہ
وہ نمونہ کا کام دیں۔ یہ گفتگو انھوں نے کچھ اس ڈھنگ سے کی جس سے
مترشح ہوتا تھا کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ خود کوئی ڈراما لکھیں لیکن اسٹیج سے
واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ نمونہ سامنے نہ ہونے سے مجبور ہیں۔"

(اقتباس از: 'چند ہم عصر')

مولانا حالی کو ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ جس کے وہ سالہا سال سے
مستحق تھے۔ یہ تاخیر اس لیے ہوئی کہ وہ طبعاً جاہ پسندی اور نمود و نمائش سے بے نیاز تھے۔
۳۱ ردسمبر ۱۹۱۴ء ﴿۱۳۳۳ھ﴾ کو اپنے وطن پانی پت میں انتقال فرمایا۔ مؤلف احقر حامد
حسن قادری نے یہ تاریخ وفات کہی:-

"تاریخ از کلام پاک" فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ (سورہ یسین)

۱۳۳۳ھ ۱۹۱۴ء

دوسری تاریخ سنِ ہجری میں نکالی:- حُسْنُ الْعَاقِبَةِ عِنْدَ رَبِّکَ لِلْمُتَّقِیْنَ

۱۳۳۳ھ

مولانا حالیؔ کی تصانیفِ نثر : مولانا حالیؔ اُردو کے عناصر خمسہ (۱) میں وہ ضروری عنصر تھے جس کے بغیر مزاجِ اُردو صحیح و معتدل نہیں رہتا بلکہ جو علم و ادب کے نفس حیات کا جز و لاینفک ہے۔ حالیؔ اور ان کے ہم عصروں نے ۳۰-۴۰ برس کے اندر وہ لٹریچر پیدا کر دیا جس کے بغیر کسی زبان کی تکمیل نہیں ہو سکتی، اور جس کا کوئی نمونہ پہلے سے موجود نہ تھا۔ حالیؔ کی تصانیف سے پہلے سرسیّد مذہبی و اصلاحی مقالات، آزادؔ تذکرہ و تاریخ، نذیر احمد ناول شروع کر چکے تھے۔ سیرت و سوانح اب تک کسی نے نہ لکھے تھے۔ حالیؔ پہلے سیرت نگار ہیں۔ تنقید شعر و ادب بھی اب تک اُردو میں نہ آئی تھی۔ حالیؔ پہلے تنقیدی مصنف بھی ہیں۔ شبلی نے سیرت و تنقید دونوں میں بڑا کام کیا، لیکن حالیؔ کے بعد شروع کیا۔ 'حیاتِ سعدی' پہلی با اصول سیرت ہے۔

مولانا حالیؔ نے اپنے حالات میں بعض تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تصانیف نثر بہ ترتیب تصنیف یہ ہیں:-

(۱) 'تریاق مسموم' حالی کی سب سے پہلی تصنیف، کسی عیسائی کے جواب میں (۱۸۶۷ء ﴿۱۲۸۴ھ﴾) اب ناپید ہے۔

(۲) 'طبقات الارض' فرنچ زبان کی تصنیف علم الارض (جیالوجی) کا عربی زبان سے اُردو ترجمہ۔ پنجاب یونیورسٹی نے ۱۸۶۸ء میں چھاپا۔ لیکن اب نہیں ملتا۔

(۳) 'اصول فارسی' فارسی زبان کے قواعد (۱۸۶۸ء)

(۴) 'مولود شریف' طرزِ قدیم کی کتاب محفل میلاد میں پڑھنے کے لیے۔ غالباً ۱۸۷۰ء سے کچھ پہلے کی لکھی۔ اور بعد وفات شائع ہوئی۔

(۵) 'تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے' اسی عیسائی کی کتاب کی تنقید۔ (۱۸۷۲ء ﴿۱۲۸۹ھ﴾) اب نایاب ہے۔

(۶) 'شواہد الالہام'۔

---

(۱) ۱۔ سرسیّد ۲۔ آزادؔ ۳۔ نذیر احمد ۴۔ حالیؔ ۵۔ شبلی

(۷) 'مجالس النساء' (دو حصے)، لاہور میں ۱۲۷۴ھ میں عورتوں کے لیے اخلاقی قصہ لکھا۔ گورنمنٹ سے چار سو روپیہ انعام ملا۔

(۸) 'سوانح عمری حکیم ناصر خسرو' ۱۸۸۲ء ﴿۱۲۹۹ھ﴾ اب نایاب ہے۔

(۹) 'حیاتِ سعدی' (۱۸۸۲ء ﴿۱۳۰۱ھ﴾)

(۱۰) 'مقدمہ شعر و شاعری' ۱۸۹۳ء ﴿۱۳۱۰ھ﴾ میں اپنے دیوان کے ساتھ یہ مقدمہ شامل کیا۔ لیکن یہ خود ایک مستقل تصنیف تھی۔ اس لیے ۱۹۲۰ء میں علیحدہ کتابی صورت میں شایع کیا گیا۔

(۱۱) 'یادگارِ غالب' (۱۸۹۷ء ﴿۱۳۱۵ھ﴾)

(۱۲) 'حیاتِ جاوید' سر سیّد کی مفصل سوانح عمری ۱۹۰۱ء ﴿۱۳۱۸ھ﴾ میں شائع ہوئی۔

(۱۳) سوانح عمری مولانا عبدالرحمٰن، یہ مولانا حالی کے استاد تھے۔

(۱۴) 'مضامین حالی' ۱۸۷۵ء ﴿۱۲۹۲ھ﴾ سے ۱۹۰۱ء ﴿۱۳۱۸ھ﴾ تک کے مضامین تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، کالج میگزین، معارف (۱) روئداد ندوۃ العلماء وغیرہ سے جمع کر کے مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی نے مرتب کیے اور پنجاب نیشنل ایجنسی پانی پت نے ۱۹۰۲ء میں شایع کیے۔

(۱۵) 'مقالات حالی' مضامینِ حالی کے بعد دو حصوں میں انجمن ترقی اُردو نے شایع کیے۔

(۱۶) 'مکتوبات حالی' خطوطِ حالی میں مولانا کے صاحب زادے سجاد حسین صاحب نے ۱۹۲۵ء میں شائع کیے۔ مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ شامل ہے۔

تصانیف نظم: مولانا حالی کی شاعری اس تاریخ نثر کے مبحث میں داخل نہیں ہے، لیکن مولانا کے تذکرۂ کمالات کے سلسلے میں مختصر طور پر اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

---

(۱) یہ "معارف" مولوی سید سلیمان ندوی کے رسالہ معارف اعظم گڑھ سے بہت پہلے کا ہے۔ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی نے علی گڑھ سے جاری کیا تھا۔

مولانا فنِ شاعری اور نقد شعر میں اعلیٰ پایہ کے صاحب نظر و کمال تھے۔ ان کے دیوانِ غزلیات میں مومنؔ و غالبؔ کی نزاکت و لطافت کا اثر بھی ہے، اور دردؔ و مصحفیؔ کی سادگی و جاذبیت بھی۔

جدید شاعری کا آغاز اگرچہ آزادؔ کی کوشش و کاوش سے ہوا، لیکن ان کے رفیق کار بلکہ شریک غالب حالیؔ تھے۔ لاہور کے مشاعرے میں حالیؔ نے چار نظمیں پڑھیں، اور غالباً اتنی ہی آزادؔ نے لیکن حالیؔ کی صرف دو نظمیں 'برکھا رُت' اور 'حبِ وطن' آزادؔ کی سب نظموں پر بھاری تھیں۔ اس کے بعد حالیؔ نے جو نظمیں لکھیں انھوں نے شاعری میں انقلاب پیدا کر دیا۔

'مسدسِ حالیؔ' (مصنفہ ۱۸۷۹ء) کی عظمت، قبولیت، تاثیر اور اشاعت کو انیسویں صدی کی کوئی دوسری نظم نہیں پہنچتی۔ 'مناجاتِ بیوہ' (۱۸۸۷ء) خاص کر ہندوستان کی معاشرت و مذاق کی چیز ہے۔ اور مولانا حالیؔ کی عظمت شاعرانہ تسلیم کرانے کے لیے یہ نظم تنہا کافی ہے۔ 'نشاطِ امید' (۱۸۷۴ء)، 'رحم و انصاف' (۱۸۷۵ء)، 'شکوۂ ہند' (۱۸۸۲ء)، 'چپ کی داد' (۱۹۰۵ء) بھی اپنے اپنے رنگ کی پہلی نظمیں ہیں۔ باقی چھوٹی بڑی نظمیں جو ایک ضخیم مجموعہ کی قدر ہیں اور چند بار علیٰحدہ و یکجا شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا کا عظیم الشان کارنامہ ہیں۔ رباعیاتِ حالیؔ اُردو میں ایجاد جدید ہیں۔

مولانا حالیؔ باوجود ماہرِ فن ہونے کے قواعدِ شاعری یا ضوابطِ استادی کے کچھ بہت پابند نہ تھے۔ شاعری کا سب سے مکروہ عیب تعقید لفظی ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ آزادؔ و حالیؔ دونوں اس کو قابلِ احتراز نہیں سمجھتے تھے۔ اگر آزادؔ کے استاد (ذوقؔ) اس عیب سے اجتناب نہ کرتے تھے، تو حالیؔ کے استاد (غالبؔ و شیفتہؔ) کے ہاں تو شاذ و نادر بھی نہ ملے گا۔

حالیؔ کا شاعرانہ کمال زبان و محاورہ کی صحت، طرزِ بیان کی جدّت و موزونیت، لب و لہجہ کا لوچ اور لطافت ہے۔ الفاظ کا انتخاب اس قدر صحیح و برمحل ہوتا ہے کہ ایک ایک لفظ شعر میں جان ڈال دیتا ہے۔

مولانا حالیؔ کی قدردانی اپنے ہم عصروں کی طرح مولانا حالیؔ نے بھی اپنی تصانیف کی کامیابی وقدردانی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ خاص کران کی نظموں اور نظموں میں بھی ایک مسدس کو جو قبول عام حاصل ہوا، وہ تمام اُردو شاعری میں کسی دوسری نظم کو میسر نہیں آیا۔ لیکن اس خاص قدرشناسی میں مولانا واحد ومنفرد ہیں کہ ان کا جشن صد سالہ عظیم الشان پیمانے پر منایا گیا۔ سن ہجری کے حساب سے ۱۳۵۳ھ میں مولانا کی ولادت کو پورے سو برس ہو گئے۔ ۲۷؍رجب ۱۳۵۴ھ (۲۶؍اکتوبر ۱۹۳۵ء) کو مولانا کے وطن پانی پت میں جشن ہوا۔ جس کی صدارت نواب صاحب بہادر بھوپال نے کی، اور حالیؔ میموریل اسکول پانی پت کو بیس ہزار روپیہ عطا فرمائے۔ دوسرے قدرشناس اصحاب کے علاوہ گورنمنٹ پنجاب نے بھی ایک ہزار روپیہ دیے۔

ڈاکٹر اقبالؔ نے اس جشن کے موقع پر اس قطعہ میں خراجِ تحسین ادا کیا تھا:-

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد سیّد دگر اورا نمے از اشک سحر داد
حالیؔ ز نوا ہائے جگر سوز نیا سود تالالۂ شبنم زدہ را داغ جگر داد

نیاز مند مؤلف نے ایک قطعۂ فارسی میں چند تاریخیں مرتب کیں۔ ایک تاریخ عربی میں کہی:- وَلِلّٰہِ ذٰلِکَ فَوْزٌ عَظِیْم۔ دوسری تاریخیں یہ ہیں:-
۱۹۳۵ء

پیشِ کشِ اخلاص

۱۳۵۴ھ

سالِ میلادیِ(۱) جشنِ حالی ست ''منظر ملک عقیدت آئیں''
۱۹۳۵ء

سالِ ہجری چو بخواہند ، بگو کہ ''از احباب خراجِ تحسیں''
۱۳۵۴ھ

اس جشن صد سالہ کی یادگار میں رسالہ 'زمانہ' کانپور وغیرہ نے حالیؔ نمبر شائع کیے۔

---

(۱) فارسی جدید میں سنہ عیسوی کو سنہ میلادی کہتے ہیں۔

مولانا حالؔی کا طرزِ تحریر مولانا کی سب سے پہلی تصانیف ''تریاق مسموم'' وغیرہ مفقود ہیں کہ ان کے اسلوبِ تحریر کا اندازہ ہو سکے۔ سب سے قدیم کتابیں 'مولود شریف' اور 'مجالس النساء' (۱۸۷۴ء) موجود ہیں۔ ان میں 'مجالس النساء' خاص چیز ہے، یعنی عورتوں کے لئے اخلاقی و تعلیمی مسائل فسانہ کے پیرایہ میں لکھے ہیں۔ اس سے پہلے مولانا نذیر احمد کی 'مراۃ العروس' (۱۸۶۹ء) وغیرہ شائع و عام ہو چکی تھی۔ اس لیے ان کو دیکھ کر مولانا حالؔی کو لکھنے کا خیال آیا ہوگا۔ چنانچہ وہی اندازِ بیان اور دہلی کے شریف گھرانوں کی زبان لکھی ہے۔ لیکن نہ مولانا نذیر احمد کے مغلق الفاظ ہیں نہ عامیانہ محاورات و امثال۔

اس سے دس برس بعد 'حیاتِ سعدی' (۱۸۸۴ء) اور اس کے دس برس بعد 'مقدمۂ شعر و شاعری' لکھا۔ ان میں مولانا کی اصلی شانِ تحریر نظر آتی ہے۔ زبان و محاورہ کی صحت، طرزِ بیان کی بے تکلفی اور لب و لہجہ کی نرمی اور لوچ نمایاں ہے۔ ان کے ہاں سرسیّد کا جوش، آزاد کی رنگینی، نذیر احمد کا زور و شور اور ظرافت نہیں ہے، لیکن قوتِ بیان اور فصاحت و روانی بہتر سے بہتر ہے۔ حالؔی کا طرز سرسیّد سے زیادہ مشابہ ہے۔ حالؔی نے سرسیّد کے اسلوب و زبان کی قدامت کو زبانِ حال کے مطابق کر دیا ہے لیکن سرسیّد کے جوشِ بیان، تیزیِ طبع، ملکہ ایجاد اور تنوع اسالیب کی حالی میں کمی ہے۔ مولانا حالؔی واقعی مولانا تھے، صاحبدل، درویش مزاج، خاموش، متین۔ ان کے علم و فضل میں وسعت اور ذہن و فکر میں روشنی تھی لیکن دل اور مزاج میں گرمی اور تیزی نہ تھی۔ انھوں نے غور و فکر کے ساتھ اُردو زبان و ادب کا جائزہ لے کر، اس کی خامیوں کو دیکھ کر، ضرورتوں کو سمجھ کر، دوسری زبانوں سے مقابلہ کر کے جدید موضوعات کی کتابیں لکھ دیں، لیکن اپنی تحریر و اسلوب کے لیے کوئی خاص روش پیدا نہ کر سکے۔ صاحب طرز بننے کے معنی ہیں تقلید کو چھوڑ کر موجد بننا، موجودہ روش سے بغاوت کرنا، اور اپنی راہ الگ نکالنا۔ یہ اُسی وقت ہوتا ہے جب کسی ادیب و مصنف کے اندر فطری اُپج ہو، اور اس کی ایک دھن، شوق، جوش ہو۔ انشاءؔ اللہ خاں، مرزا غالبؔ، سرسیّد، آزادؔ، نذیر احمد، شبلؔی کی ایجادیں اور اختراعیں اسی صفت کے مظاہر و آثار ہیں۔ اور اسی صفت کے نہ ہونے سے مولوی ذکاء اللہ اور مولانا حالؔی ''صاحب طرز'' نہیں

ہیں۔ لیکن اس طرح کا صاحبِ طرز ہونا ادیب کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ جیسا غالبؔ، آزادؔ اور نذیر احمد کے ساتھ ہوا۔ نہ ان طرزوں کی بعد کو تقلید ہو سکی، نہ ضرورت تھی۔

مولانا حالیؔ کی تحریروں میں موضوع و مضمون کی جدت و بیان کی صداقت، زبان کی صحت، اسلوب کی صفائی، دلائل کی قوت، تمثیلات کی برجستگی، سب کچھ ہے اور اکثر بے عیب ہے، بلکہ بعض جگہ نادر و جدید بھی ہے۔ لیکن ان کی عبارت پڑھنے سے ادبی مسرت حاصل نہیں ہوتی، انشاء پردازی کا نشاط و اہتزاز پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم ان کی جچی تلی تحریر کا اثر ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعد کو رواج پانے کے لیے حالیؔ اور شبلیؔ ہی کا ملا جلا طرز تھا۔

اسلوب حالیؔ کی ایک لطیف خصوصیت انتخابِ الفاظ ہے، خصوصاً ہندی الفاظ کا استعمال اور ان کی بے ساختگی اور برجستگی۔ مثلاً

(۱) ''جس زمانے میں کہ پہلی بار راقم کا دہلی جانا ہوا، اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ دہلی سے باہر چلے گئے تھے، اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔'' (یادگارِ غالبؔ)

یہاں لکھ سکتے تھے کہ ''اس باغ میں خزاں شروع ہو گئی تھی'' اور مفہوم وہی رہتا، لیکن پت جھڑ کا لفظ اپنے لفظی مفہوم (پتوں کا جھڑ کر منتشر ہونا) کے اعتبار سے آئندہ فقرے کے کس قدر مناسب ہے کہ ''کچھ لوگ دہلی سے باہر چلے گئے تھے۔ اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔''

(۲) ''قدیم اسلوب جو کانوں میں رچ گئے ہیں، ان کو بدستور قائم رکھا جائے۔''

(مقدمہ شعر و شاعری)

(۳) ''اس طلسم کو جو قدما باندھ گئے ہیں ہرگز نہ ٹوٹنے دے، ورنہ وہ بہت جلد دیکھے گا کہ اس نے اپنے منتر میں وہی اچھر بھلا دیے ہیں جو دلوں کو تسخیر کرتے تھے۔'' (مقدمہ شعر و شاعری)

یہ ہندی کے الفاظ و محاورے حالیؔ کی نظموں میں نثر سے بھی زیادہ تاثیر پیدا کرتے ہیں۔

لیکن ایک بے اعتدالی سے حالیؔ بھی نہ بچ سکے۔ یعنی انگریزی الفاظ کا غیر ضروری استعمال حالیؔ بھی نذیر احمد سے کم نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ انگریزی زبان سے محض نا آشنا تھے۔ چند مثالیں یہ ہیں:-

(۱) ''اس کے ایک بند میں ایک پوائنٹ (۱) عمدگی سے بیان ہوسکتا ہے، لیکن ہر پوائنٹ کی وسعت یکساں نہیں ہوتی۔'' (مقدمہ شعروشاعری)

(۲)''ان کے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل (۲) قابلیت میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں پائی جاتی تھی۔'' (حیاتِ جاوید)

(۳) ''جس کو پالیٹکس (۳) کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور (۴) سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راستباز لبرل (۵) جانا ہے۔'' (حیاتِ جاوید)

(۴)''اپنی جنرل انفورمیشن (۶) کو وسعت دے۔'' (مضامین حالیؔ)

اسی طرح میٹیریل (مواد رسالہ)، امیجینیشن (تخئیل)، ورکس (تصانیف)، ججمنٹ (فیصلہ) وغیرہ بکثرت و بے تکلف لکھتے ہیں۔ یہ روش سب سے پہلے سرسیّد نے نکالی تھی۔ پھر حالیؔ اور نذیر احمد زیادہ اور عبدالحلیم شررؔ لکھنوی (۷) کم، اسی راہ پر چل نکلے۔ ان بزرگوں میں سرسیّد تو ''انگریز و انگریز پرستی'' کی دھن میں کسی بات کی اچھائی برائی پر نظر نہیں کرتے تھے۔ مذہب، معاشرت، زبان، تعلیم سب کو اسی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔ نذیر احمد کوئی بااصول آدمی نہ تھے۔ انھوں نے مولوی ذکاءاللہ کے لیے لکھا ہے کہ ''وہ سیّد احمد خاں کے پٹھو تھے۔'' لیکن یہی لقب خود ڈپٹی نذیر احمد پر بھی صادق آتا ہے۔ پھر نذیر احمد ظریف طبع بلکہ ''مسخرے'' تھے۔ اور انگریزی کی بھرمار بھی ان کے مسخراپن کی ایک

---

(۱) نکتہ۔ خاص بات (۲) جسمانی (۳) سیاست

(۴) زمانہ ساز (۵) آزاد خیال (۶) عام معلومات

(۷) شررؔ لکھنوی کے فقرے یہ ہیں:-

(۱) اس کے حالات فی الحال ایک قسم کی مسٹری (راز) معلوم ہوتے ہیں۔ (مضامینِ شاعرانہ صفحہ ۱۵۳)

(۲) فردوسی و نظامیؔ نے بزمِ عالم کی غزل خوانی کا چارج (منصب) اپنے ذمہ لے لیا۔ (مضامین شاعرانہ صفحہ ۲۰۰)

ادا تھی۔ حالؔی جیسے متین و با اصول ادیب کے لیے اس طرز کو اختیار کرنے کا بجز تقلید سر سیّد کوئی سبب نہ تھا۔ لیکن اسی جذبہ نے ان کو نہ سوچنے دیا کہ وہ اور ان کا زمانہ ادبیات جدید کے لیے پیشوا اور رہنما ہیں۔ ان کو وہ اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو باقی و جاری رہنے کے قابل ہو۔

علامہ آزادؔ اور مولوی ذکاء اللہ تو قدامت پرست تھے ان کا انگریزی الفاظ استعمال نہ کرنا کسی غور و فکر اور پیش بینی کی بنا پر نہ تھا۔ البتہ علامہ شبلی کے ذوق صحیح اور نباضی ادب و انشاء کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے اس کج روی کو سمجھ لیا اور اس سے بچ کر چلے۔

مولانا حالی پر اعتراضات سر سیّد کے رفقاء محض جرم رفاقت و ہمنوائی کے سبب سے موردِ طعن و اعتراض گردانے گئے۔ ان میں مولانا حالؔی بھی تھے۔ ان کے مسدس کو اسلام سے بغاوت اور مسلمانوں کی توہین سمجھا گیا۔ اور ان پر بھی کفر و گمراہی کے فتوے لگائے گئے۔ ہم کو اس قسم کے اعتراضات سے بحث نہیں۔ یہ فوری جوش تھا۔ جس غلغلے کے ساتھ اٹھا تھا ایسا ہی بیٹھتا چلا گیا۔ ۱۸۷۹ء میں مسدس لکھا گیا، ۱۸۸۰ء میں تمام ملک میں پھیل گیا۔ اور اس پر غدر برپا ہونے لگا۔ لیکن ۱۸۸۶ء میں جب مولانا نے مسدس پر دوسرا دیباچہ لکھا ہے تو اس میں لکھتے ہیں:-

> ''بعض قومی مدرسوں میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ مولود شریف کی مجلسوں میں اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری ہیں۔''

ہمارا مبحث مولانا کے موضوعات تصنیف اور اسالیب نظم و نثر کی نکتہ چینیاں ہیں۔ ان کی حقیقت یہ ہے کہ مولانا حالؔی کے بڑے کارنامے دو ہیں۔ (۱) سیرت، اور (۲) تنقید۔ ان دونوں موضوع پر اُردو میں کوئی با اصول تصنیف موجود نہ تھی۔ سوانح سعدی و غالبؔ و سر سیّد اور مقدمہ شعر و شاعری، اُردو اور حالؔی دونوں کی اولیات ہیں۔ ان دونوں کی فنی خصوصیات اور مراتب تکمیل سے ''اُردو نویس'' اور ''اُردو خواں'' دونوں نا آشنا تھے۔ انگریزی زبان میں یہ علوم، بالکل مکمل نہیں تو اعلیٰ پایہ پر موجود و مدوّن تھے۔ لیکن حالؔی انگریزی نہ جانتے

کے سبب سے بلاواسطہ ان علوم کو حاصل نہ کر سکتے تھے۔ ترجموں کے ذریعہ سے انھوں نے یورپ کے اصول تنقید دریافت کیے۔ اور ان کو اپنے موضوع "مقدمہ" اور ہندوستان و اُردو زبان کے مناسب حال مرتب کیا۔ اس لیے حالی کی کوتاہیاں ان کے لیے عیب نہیں، بلکہ محض "مقدمہ" کا لکھ دینا ہی اُن کا ہنر ہے۔ پھر کسی نوجوان انگریزی تعلیم یافتہ کا یہ لکھ دینا:-

> "خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر نا کافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط، یہ ہے حالی کی کائنات۔ سارے خیالات جن پر یہاں بحث کی گئی ہے، وہ سب مغرب سے لئے گئے ہیں۔ دوسرے خیالات مشرقی ہیں، اور مقدمۂ شعر و شاعری میں مشرقی و مغربی خیالات ایک جگہ مضحک طور پر جمع ہو گئے ہیں۔"

نقادیٔ ادب اور ادب نقادی دونوں کے لیے زیبا نہ تھا۔ مقدمۂ حالی تنقید کی فنی کتاب نہیں ہے، بلکہ تنقید کا نمونہ اور مذاق پیدا کرنے کی پہلی کوشش ہے، جس کی نظیر اُردو کیا، فارسی اور عربی میں بھی نہ تھی۔ اس میں خامیاں ضرور ہیں، اور وہ بعد کی بہتر تنقیدوں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں۔ لیکن اتنی وسعت اور جامعیت کی بھی کوئی کتاب ان پچاس برس میں پیدا نہ ہو سکی۔

حالی کی تصنیفات سیرت (حیات سعدی، یادگار غالب، حیات جاوید) پر یہ اعتراض ہے کہ مولانا نے ان کی سیرت نہیں لکھی بلکہ ہیرو مان کر ان کے کارنامے بیان کیے ہیں۔ مولانا شبلی نے "حیات جاوید" کی صورت دیکھ کر کھولنے اور پڑھنے سے پہلے تو فرما دیا تھا کہ "یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے۔" اور پڑھ کر فرمایا کہ "سرسیّد کی مدلل مداحی ہے۔" پھر اور لوگوں نے کہا کہ:-

> "یہ کتاب شروع سے اخیر تک ایک اعتذار (اپالوجی) کا پہلو لیے ہوئے ہے۔"

یعنی مولانا حالی نے سرسیّد کی طرف سے گویا صفائی پیش کی ہے۔ مولانا نے کسی دعویٔ علم و فن کے ساتھ یہ کتابیں نہیں لکھیں۔ یہ "ناموران اسلام" یا "مشاہیر ہند و عجم" کے سلسلے میں شامل نہیں ہیں بلکہ ان تینوں ہستیوں کے جوشِ محبت میں لکھی گئی

ہیں۔ سعدؔی کے حالات سعدؔی کی مقبولیت اور ان کے عجیب و گوناگوں سوانح کے سبب سے لکھے، غالبؔ کا تذکرہ صرف اپنے استاد کی یادگار قائم کرنے کے لیے لکھا، سرسیّد کی سیرت ان کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے مہتم بالشان کارناموں کو پیش کرنے کے لیے مرتب کی، لیکن یہ تینوں چیزیں ایسی لکھ دیں کہ ایران میں بھی ایسی سیرت سعدی موجود نہ تھی۔ وہاں حالؔی کی حیات سعدؔی کا فارسی جدید میں ترجمہ کیا گیا۔ غالبؔ کے سوانح نگار آج بھی ''یادگارِ غالبؔ'' کے استفاضہ سے بے نیاز نہیں ہیں۔ ''حیاتِ جاوید'' سرسیّد کے موافق و مخالف دونوں گروہوں کے لیے معلومات کا واحد ذریعہ ہے۔ ان تصانیف کی اہمیت اور مولانا کا کمال سب سے بڑھ کر یہی ہے۔

''حیات سعدؔی'' پر ایک عجیب اعتراض یہ بھی ہے کہ مولانا نے شیخ سعدؔی کے لیے صیغہ واحد غائب لکھا ہے: ''شیخ کہتا تھا۔''، ''شیخ لکھتا ہے۔'' اور اس کو سوءِ ادب سمجھا گیا ہے۔ یہ اعتراض اول تو مؤرخ پر نہیں ہوسکتا۔ تاریخ میں تاریخی ہستیوں کے لیے یہ طرز جائز رکھا گیا ہے۔ دوسرے شیخ سعدؔی کے شیخ طریقت اور ولی اللہ ہونے کی حیثیت اس قدر مشہور نہیں ہے، جتنا ان کا مصنف، شاعر، انشا پرداز اور ظریف ہونا۔ اور ان میں سے ہر حیثیت کو پیشِ نظر رکھ کر ان کو اس طرح لکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ علامہ آزاد نے بھی ''سخندانِ فارس'' میں شیخ سعدؔی کے لیے ضمیر واحد استعمال کی ہے۔ ''اس کے ننھے ننھے فقرے''، ''اس کی نثر''، ''اس کی قدرتی فصاحت'' (اس داستانِ اُردو کا صفحہ ۵۳۲ دیکھیے)۔ تیسرے شیخ سعدؔی اس امر میں خاص طور پر قابلِ استثنا ہیں۔ ان کی مقبولیت اور شہرت نے ان کے اندر ایک شانِ محبوبیت پیدا کردی ہے، اور وہ بے تکلفی کا سبب ہوسکتی ہے۔ یہ بات خسرؔو، حافظؔ، جامؔی کسی میں سعدؔی کے برابر نہیں۔

علامہ شبلؔی کا کارنامہ سیرت و تنقید میں مولانا حالؔی سے افضل و وسیع تر ہے، لیکن ہیرو پرستی و رجحان پسندی اور اپنے ناپسندیدہ شخص کی ہنر پوشی اور عیب کوشی بھی مولانا شبلؔی کی

طبیعت میں ہے۔ (۱) جس کا ذکر ان کے حالات میں آئے گا۔ علامہ آزاد بھی اس سے بَری نہیں ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ پر بھی انگریز پرستی کا الزام ہے۔ مولوی عبدالحلیم شرر بھی جانب داری سے خالی نہیں ہیں۔ یعنی ہندوستان کے سیرت نگاروں کو تحقیق و تدقیق اور تجزیہ و تنقیح کا سلیقہ تو آ گیا ہے، لیکن بے لاگ اظہار رائے کی اخلاقی جرأت پیدا نہیں ہوئی۔ مولانا حالیؔ تو بالطبع نہایت بامروت، صلح پسند، ''ہنر پاش وعیب پوش'' تھے۔ انھوں نے اگر غالبؔ و سرسیدؔ کی عیب جوئی نہیں کی تو علامہ آزادؔ اور علامہ شبلیؔ کی کوتاہیوں پر بھی پردہ ڈالا ہے اور ان کی تاویلیں کی ہیں، جیسا کہ 'مضامینِ حالیؔ' کے ذکر میں آتا ہے۔

تصانیفِ حالیؔ کے نمونے (۱) مجالس النساء، یہ کتاب مولانا حالیؔ کی تصانیف میں ایک ہی ہے، اور ان کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ صرف ان کی قدرتِ زبان اور لطف محاورہ کے نمونے کے لیے مختصر اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے:-

''آتو جی'' ہے ہے لوگو، اشراف زادیوں نے کیسا لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا، کیسی ان گھروں پر جہالت چھا گئی، کیسا الٹا زمانہ آ گیا۔ محمود بیگم ذرا سوچنے کی بات ہے۔ ہمارے ملک کے ہندو مسلمان جو اشراف کہلاتے ہیں، سب کے ہاں قدیم سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ بیٹی کو کچھ پڑھائیں یا نہ پڑھائیں، پر بیٹے کو ضرور پڑھواتے ہیں۔ کیا غریب اور کیا امیر، ہر شخص اپنی بساط کے موافق بیٹے کی تعلیم میں ضرور کوشش کرتا ہے۔ پر میں یہ نہیں جانتی اس ملک کی برکت کہاں اُڑ گئی۔ جب دیکھا یہی دیکھا کہ سو میں سے دو چار بچے جو ایسے ہی صاحب نصیب اور ہونہار ہوئے، وہ تو لکھ پڑھ کر کسی قابل ہو گئے، اور باقی وہی کودن کے کودن رہے۔ ہاں اب اب کر کے سرکاری مدرسوں میں پڑھنا لکھنا بے شک زیادہ ہو گیا ہے، پر آدمیت سی چیز وہاں بھی جمی جم آتی ہے۔'' ....

''تم اپنے جی میں کہوگی تو سہی کہ بڑھاپے میں عورت کی عقل جاتی رہی ہے، پر مجھ سے جو پوچھو تو

---

(۱) تنقیدات شعر العجم جو مختلف نقادوں نے لکھی ہے، دیکھنی چاہییں۔ ہم نے اپنی تالیف (تاریخ مرثیہ گوئی) (مطبوعہ ۱۹۳۴ء) میں مفصل لکھ دیا ہے کہ مولانا شبلی نے میر انیس کو ہیرو مان کر ان کے مقابل پہلوان مرزا دبیر کی خوبیوں سے کس طرح چشم پوشی کی ہے۔ مؤلف

ہے یوں کہ خدا بیٹیؔ ...ابدلہ لیتا ہے۔ ماں باپ نے تو یہ سمجھا تھا کہ بیٹوں کی کمائی میں تو ہمارا ساجھا ہے،
اور بیٹیوں سے ہم کو کچھ لینا نہیں۔ آؤ جہاں تک ہوسکے بیٹوں کو پڑھائیں جو کل کو ہمارے بھی کام آئے۔
خدا کو یہ بات ناپسند آئی، اس نے بیٹوں کو بیٹیوں سے بھی بدتر کر دیا۔ وہ تو عورت ہو کے اَن پڑھ
رہیں تھیں، یہ مرد ہو کے جاہل رہے۔"

(۲) حیاتِ سعدی: یہ سیرت تحقیق، جامعیت، حسنِ ترتیب کے لحاظ سے اُردو میں پہلی تصنیف ہے۔ مولانا حاؔلی نے ہر ممکن ذریعہ سے حالات جمع کیے ہیں۔ سعدؔی کی تصانیف سے حالات لیے ہیں۔ ابتدا میں سعدؔی کے وطن شیراز کا مختصر ذکر کیا ہے۔ پھر سعدؔی کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ ان کے لیے ہر جگہ صرف شیخ کا لفظ لکھتے ہیں۔ حالات کے بعد سعدؔی کی تصانیف پر نظر ڈالی ہے۔ دوسروں سے مقابلہ کیا ہے۔ گلستاں اور بوستاں کا ان کی جوابی تصانیف کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ چند مقامات سے مختصر انتخابات لکھے جاتے ہیں:-

(الف) شیراز کے حال میں لکھتے ہیں:-

"بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے انسان کے قویٰ میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارس کے اکثر شہر مردم خیز سمجھے گئے ہیں، جیسے یزد، بیند، گازرون، فیروز آباد، بیضا، شیراز وغیرہ۔ ان شہروں میں کثرت سے علماء و فضلاء اور ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ جن کی تصانیف مسلمانوں میں اب تک موجود ہیں۔ خصوصاً شیراز جو کہ صدہا سال ایران کا پایہ تخت رہا ہے۔ مسلمان ایرانیوں نے جس طرح قم کو "دار المومنین" اور یزد کو "دار العُبّاد" کا خطاب دیا ہے، اسی طرح شیراز کو "دار العلم" کے لقب سے ملقب کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شہر کا قدرتی موقع اور آب و ہوا کی خوبی اور عمارات کی لطافت و خوش اسلوبی، باشندوں کے خیالات اور قویٰ پر عجیب اثر رکھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شیراز کے اکثر مشائخ اور علماء و شعراء پاکیزہ طبع اور لطیف و ظریف ہوئے ہیں۔ شیخ (یعنی شیخ سعدی) نے بھی بوستاں کے دیباچے میں اہلِ شیراز کو ان تمام اشخاص پر ترجیح دی ہے، جن سے وہ حالتِ سفر میں ملا تھا۔ شیراز سے جس قدر علماء و مشائخ و شعراء و مصنفین ابتدا سے آخر تک اٹھے ہیں، اور جن کا حال مسلمانوں کے تذکروں میں جا بجا

مذکور ہے، اُن کی تعداد سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس شہر کی خاک علم و ہنر کے ساتھ کس قدر مناسبت رکھتی ہے، اور شیخ کے کلام کی بے نظیر شہرت اور مقبولیت سے ثابت ہے کہ شیخ کا وجود بھی شیراز کے لئے کچھ کم باعث افتخار نہ تھا۔''

(ب) جس زمانے میں شیخ نظامیہ بغداد میں پڑھتا تھا، اگر چہ اس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر ظاہری شان و شوکت ہارون اور مامون کے عہد کو یاد دلاتی تھی۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستعصم باللہ سریر سلطنت پر متمکن تھا اور اس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لئے سنبھالا لیا تھا۔ اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور ہر علم و فن کے ماہر اور ارباب حرفت و صنعت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے۔ عیش و عشرت کے سامان حد سے زیادہ ہر طرف مہیا نظر آتے تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب داب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے اور بڑے بڑے امرا اور فرمانروا بارگاہِ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ قصر خلافت کے آستانہ پر ایک پتھر بمنزلہ حجر الاسود کے پڑا ہوا تھا۔ جس کو امراء اور اعیانِ سلطنت قصر خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسہ دیتے تھے۔ تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی، وہاں ایک مدت پہلے سے رستہ کے تمام منظر اور بالا خانے کرایہ داروں سے رک جاتے تھے۔ الغرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور پھر اسی آنکھ سے اس دارالخلافہ کا بے چراغ ہونا جو چھ سو برس بوسہ گاہِ ملوک و سلاطین رہا تھا اور اس خاندان کی بربادی جس کا سایہ اقتدار یورپ اور افریقہ پر برابر پڑتا تھا، اور خلیفہ اور اس کی اولاد اور ہزار ہا بنی عباس اور کئی لاکھ اہلِ لشکر اور اہلِ بغداد کا تاتاریوں کی تیغ بیدریغ سے قتل ہونا اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لئے صفحۂ روزگار سے مٹ جانا مشاہدہ کیا تھا۔ شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم باللہ کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور وہ ظلم و ستم بھی اس کی آنکھوں کے روبرو گذرے تھے جو ہلاکو خاں کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کئے۔ ان حوادث و واقعات کا تماشہ شیخ کے لئے ایک عمدہ سبق تھا جس نے اس کے دل میں قوم کی دلسوزی، بادشاہوں کی اصلاح، رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقہ کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اسی خیال کی بدولت اس نے اپنی تمام عمر ابنائے جنس کی نصیحت اور خیر اندیشی میں صرف کی۔ مستعصم باللہ کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ نے اس وقت لکھا ہے جب کوئی شخص اس کا رونے والا اور خود اسلام کے سوا کوئی اس کا ماتم دار

اور سوگوار دنیا میں باقی نہ تھا۔ اس مرثیہ کی چند ابیات اس موقع پر نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ابیات	ترجمہ
(۱) آسماں را حق بود گر خوں بیارد بر زمیں بر زوالِ ملک مستعصم امیر المومنیں	(۱) آسمان کا فرض ہے کہ مستعصم کی تباہی پر خون کے آنسو بہائے
(۲) اے محمدؐ گر قیامت می براری سر بخاک سر برآور، دیں قیامت درمیانِ خلق بیں	(۲) اے محمد صلعم اگر آپ قیامت ہی کو مرقد سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکل کر قیامت دنیا میں دیکھ لیجئے۔
(۳) نازنینانِ حرم را، خونِ ناحق نازنیں ز آستاں بگذشت و مارا خونِ دل از آستیں	(۳) محل کے ناز پروردوں کے حلق کا خون ڈیوڑی سے بہہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپک گیا۔

شیخ پر بعض امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مستعصم باللہ جیسے نالائق اور ناشدنی خلیفہ کا مرثیہ لکھنا شیخ کی شان سے نہایت بعید تھا۔ اگر چہ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مستعصم باللہ میں دانائی، نیکی اور انصاف بالکل نہ تھا، تکبر اور غرور نے اس کے دماغ کو مختل کر دیا تھا۔ غفلت اور بے پروائی کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بار اس کے بیٹے ابوبکر نے اہلِ سنت کی حمایت کی اور طرفداری میں کرخ کے بنی ہاشم پر نہایت سخت ظلم اور تعدی کی جس کے بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، مگر اس نالائق خلیفہ نے اس کا کچھ تدارک نہ کیا۔ لیکن اس سے شیخ کے مرثیہ لکھنے پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مستعصم باللہ کو کیسا ہی نالائق اور قابلِ نفریں سمجھو۔ مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس کے بگڑنے سے نہ صرف بنی عباس کی حکومت دنیا سے اٹھ گئی بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جمے ہوئے تھے یکبارگی ان میں تزلزل آگیا اور چند روز میں ان کا اقتدار صفحۂ ہستی سے یک قلم محو ہو گیا۔ پس جس شخص کے رگ و پے میں عرب کے خون کا ایک قطرہ بھی ملا ہوا تھا، یا جس کے دل میں ایک ذرہ برابر اسلام کی حمیت تھی اس کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی عم کا خون تاتاری وحشیوں کے ہاتھ سے آبِ باراں کی طرح بہایا گیا اور جس عمارت کی بنیاد خلفائے راشدین کے ہنرمند ہاتھوں نے ڈالی تھی وہ چشم زدن میں ایک خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ شیخ نے

حقیقت میں مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے اور اگر اس موقع پر حسان بن ثابت موجود ہوتے تو ان کو ایسا ہی مرثیہ لکھنا پڑتا۔ مستعصم کے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہلِ وفا

کہ اپنے مٹنے سے مہر و وفا کا نام مٹا

(ج) یہ واقعہ بوستاں سے لے کر لکھا ہے۔ شیخ سعدی نے اپنے سفر ہندوستان کی ایک حکایت لکھی ہے۔ اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

بُتے دیدم از عاج در سومنات مرصّع چو در جاہلیت منات

مولانا حالیؔ اس کا خلاصہ شیخ کی زبانی لکھتے ہیں:۔

"جب میں سومنات پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بُت کی پرستش کے لئے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھ کو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بیجان چیز کی کس لئے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لئے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک روز اس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اس قدر فریفتہ ہیں؟ اور اس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں کو خبر کر دی۔ سب نے مجھ کو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً اس کے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بداعتقادی سے نہیں کی۔ میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں لیکن چونکہ نو وارد ہوں اور اسرار نہانی سے واقف نہیں ہوں اس لئے اس کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں تا کہ سمجھ بوجھ کر اس کی پوجا کروں۔ اس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات مندر میں رہ کر تجھ کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ میں رات بھر وہاں رہا۔ صبح کے قریب تمام بستی کے مرد عورت وہاں جمع ہو گئے اور اس مورت نے ہاتھ اٹھایا جیسے کوئی دعا مانگتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا کیوں اب تو کوئی شبہ باقی نہیں رہا؟ میں ظاہرداری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مورت کے سامنے لے گئے۔ میں نے مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اور بظاہر چند روز کے لئے برہمن بن گیا۔"

(۳) مقدمہ شعر و شاعری مولانا حالی نے ۱۸۹۳ء میں یہ "مقدمہ" اپنے

دیوان میں شامل کرنے کے لئے لکھا تھا، اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں شاعری کی تعریف اور شعر و شاعر کے لوازم و خصائص سے بحث کی ہے دوسرے حصے میں اُردو شاعری اور شاعروں پر تنقید کی ہے۔ نمونے یہ ہیں:-

(۱) کمالِ شاعری کے لئے ضروری شرائط۔

سب سے مقدم اور ضروری چیز جو شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے قوت متخیلہ یا تخیل ہے جس کو انگریزی میں امیجنیشن کہتے ہیں۔ یہ قوت جس شاعر میں اعلیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔ یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر اپنے ساتھ ماں کے پیٹ سے لے کر نکلتا ہے۔ اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اگر شاعر کی ذات میں یہ ملکہ موجود ہے اور باقی شرطوں میں جو کہ کمال شاعری کے لئے ضروری ہیں، کچھ کمی ہے تو اس کمی کا تدارک اس ملکے سے کرسکتا ہے۔ لیکن اگر یہ ملکۂ فطرتی کسی میں موجود نہیں تو اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اس کے قبضہ میں ہو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ ماضی و استقبال کو اس کے لئے زمانہ حال میں کھینچ لاتی ہے۔ وہ آدم اور جنت کی سرگذشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے گویا اس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ اور ہر شخص اس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہئے۔ اس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ جن اور پری عنقا اور آب حیواں جیسی فرضی اور معدوم چیزوں کو ایسے معقول اوصاف کے ساتھ متصف کرسکتا ہے گو وہ منطق کے قاعدوں پر منطبق نہیں ہوتے لیکن جب اپنی معمولی حالت سے کسی قدر بلند ہو جاتا ہے تو وہ بالکل ٹھیک معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً فیضی کہتا ہے۔

لختے ز شب است کوکب من | سخت است سیاہی شب من

اس پر منطقی قاعدے سے یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ رات کی تاریکی سب کے لئے یکساں ہوتی ہے پھر ایک خاص شخص کی رات سب سے زیادہ تاریک کیونکر ہوسکتی ہے۔ اور تمام کواکب ایسے اجرام ہیں جن کا وجود بغیر روشنی کے تصور میں نہیں آسکتا پھر ایک خاص کوکب ایسا مظلم اور سیاہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ اس کو کالی رات کا ایک ٹکڑا کہا جاسکے؟ مگر جس عالم میں شاعر اپنے تئیں دکھانا چاہتا ہے وہاں یہ سب ناممکن باتیں ممکن بلکہ موجود نظر آتی ہیں۔ یہی وہ ملکہ ہے جس سے بعض اوقات شاعر کا ایک لفظ جادو کی فوج سامنے کھڑی

کردیتا ہے۔اور کبھی وہ ایسے خیال کو جو کئی جلدوں میں بیان ہو سکے ایک لفظ میں ادا کردیتا ہے۔

(ب) زبان کی درستگی اور اس کا تحفظ جولوگ اپنے تئیں اُردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں، یعنی اہلِ دہلی یا اہلِ لکھنؤ ان کو اس بات پر فخر نہیں کرنا چاہئے کہ ہماری زبان کا لوگ اتباع کرتے ہیں اور ہماری روزمرّہ کی پیروی کی جاتی ہے۔ان کو یادرکھنا چاہئے کہ اگر وہ اپنی زبان کی خبر نہ لیں گے ان کے محفوظ رکھنے کے وسائل بہم نہ پہنچائیں گے،اس کے الفاظ ومحاورات کو نہایت احتیاط کے ساتھ فراہم اور مرتب نہ کریں گے،اور اس کی نظم ونثر کو زمانہ کے مذاق کے ساتھ ترقی نہ دیں گے تو ان کی زبان کا وہ حصہ جس پر ان کو فخر ہے، جو اُن کی اور تمام ہندوستان کی اُردو میں مابہ الامتیاز ہے، وہ حرفِ غلط کی طرح صفحہ روزگار سے محو ہو جائے گا۔اور یہی بُری بھلی اُردو، جو عام اخبارات اور جدید تصنیفات کے ذریعہ ملک میں پھیل رہی ہے اور جس کو وہ اب تک حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں، زیادہ سے زیادہ نصف صدی میں یہی ملک کی ٹکسالی اور فصیح زبان قرار پا جائے گی۔کیا ان کو معلوم نہیں کہ عرب میں جب سے انشا کی سردبازاری ہوئی ،اور عربی نظم ونثر کے مالک غیر ملکوں کے باشندے ہو گئے رفتہ رفتہ وہ کلیسکل (۱) عربی جس پر عربوں کو ناز تھا لٹریری دنیا سے رخصت ہوگئی۔اور وہی بگھڑی زبان جس کو عرب (۲) عُر باحقارت کی نظر سے دیکھتے تھے تمام عربی لٹریچر پر غالب ہوگئی اور شام۔روم۔مصر وبربر اور سوڈان وغیرہ میں عموماً پھیل گئی ۔یہاں تک کہ آج وہی زبان ٹکسالی اور فصیح عربی سمجھی جاتی ہے۔ایسا ہی انجام دلّی اور لکھنؤ کی زبان کا، اگر اس کی خبر نہ لی گئی ہوتا نظر آتا ہے۔دلّی جس کو اُردوئے معلّی کا مسقط الراس اور جنم بُھم کہنا چاہئے ،وہاں مصنف اور ناظم وناثر پیدا ہونے موقوف ہوگئے ہیں۔پرانے لوگوں میں سے چند نفوس جس کو چراغِ سحری سمجھنا چاہئے، باقی رہ گئے ہیں۔ان کے بعد بالکل سناٹا نظر آتا ہے۔لکھنؤ کا حال اگرچہ بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا وہاں شاعری کا چرچا دلّی سے زیادہ سننے میں آتا ہے۔وہاں سے نوول (۳) اور ڈراما برابر ملک میں شائع ہوتے ہیں۔مگر افسوس ہے کہ ان کا قدم زمانے کی رفتار کے متوازی نہیں اٹھتا۔جس قدر وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔اُسی قدر ترقی کے رستے سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

---

(۱) انگریزی کا لفظ ہے یعنی مستند عربی۔ (۲) خالص عرب

(۳) یہ پنجاب کا تلفظ ہے۔یہاں ''ناول'' رائج ہے۔

اُردو پر قدرت حاصل کرنے کے لئے صرف دتی یا لکھنو کی زبان کا سیکھ ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی یا فارسی میں کم سے کم متوسط درجہ کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اُردو کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے۔ اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اس کا ہندی سے ماخوذ ہے۔ اور اُردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر، جو عربی شاعری سے مستفاد ہے، قائم ہوئی ہے، نیز اُردو زبان میں بہت بڑا حصہ اسماء کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ پس اُردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا مطلق نہیں جانتا اور محض عربی فارسی کی تان پر گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیّوں کے منزلِ مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے۔ اور جو عربی فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا اور محض مادری زبان کے بھروسے اس کا متحمل ہوتا ہے وہ ایک ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بَیل نہیں جوتے گئے۔

اس اقتباس میں مولانا حالؔی کا آخری مشورہ آج کل اُردو ہندی کے قضیہ میں قابلِ توجہ ہے۔ مولانا اُردو شاعری کے لیے عربی فارسی اور ہندی دونوں کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور خود اسی پر عامل ہیں۔ ان کے کلام میں ہندی کے وہ الفاظ اور محاورے پائے جاتے ہیں جو دوسروں نے استعمال نہیں کیے، اور ان سے مولانا کے کلام میں عجب لطف واثر پیدا ہو گیا ہے۔

(۴) **یادگارِ غالبؔ** مولانا حالؔی نے یہ کتاب سوچ کر لکھی ہے کہ اس عجیب و بے نظیر ہستی کی یادگار باقی رہنی چاہیے۔ غالبؔ کے حالات اس سے پہلے 'آبِ حیات' میں مختصر طور پر تھے۔ نواب شیفتہؔ کے 'گلشنِ بیخار' میں اتنے بھی نہ تھے۔ رقعاتِ غالبؔ کے سوا اور کہیں ان کے حالات اتنے بھی نہ مل سکتے، پھر مولانا حالؔی سے بہتر کون لکھ سکتا تھا۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ غالبؔ بہ حیثیت انسان، دوست، استاد، شاعر، انشا پرداز، ظریف کے عجیب و غریب شخص تھے۔ اس لئے کسی نوجوان نقاد کا یہ اعتراض:-

"کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مرزا غالبؔ کی زندگی ہندوستان کے نوجوانوں کے لئے کوئی سبق رکھتی ہے۔ یا مرزا کے خانگی حالات اور احباب کے خانگی حالات اور احباب کے تعلقات کا ذکر حیاتِ انسانی میں کسی نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔" .... "مرزا کے حالاتِ زندگی، اخلاق و عادات، لطائف و

امثال پر تصنیف کا بیشتر حصہ وقف کیا گیا ہے۔"

صرف جوشِ مخالفت کی تراوش ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی کوئی سبق رکھتی ہے، تو غالبؔ کی زندگی بھی رکھتی ہے۔ بلکہ غالبؔ کی زندگی وہ بابِ اخلاق وا کرتی ہے، جو ہندوستان کے نوجوانوں کی مادّی اور "تجارت رنگ" زندگی پر ہے۔ غالباً اسی وجہ سے معترض کو مرزا کی وضعداری، سیر چشمی اور زندہ دلی میں کوئی سبق نظر نہیں آیا۔ اسی معترض کی یہ خواہش بیشک درست ہے:-

"یادگارِ غالبؔ کے مصنف کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ مرزا کی شاعری کے مختلف دور اور ان کے معاصرین میں ان کا درجہ، شاعر کے مختلف اصناف میں ان کے کمالات پیش کیے جاتے۔"

لیکن مولانا حالیؔ کو مرزا غالبؔ کی ذات سے بحث تھی، اور ان کے کمالاتِ سخن سے صرف اس قدر کہ ان کی عظمت فی الجملہ واضح ہو جائے۔ مولانا اس مسلک کے آدمی نہ تھے کہ مومنؔ و ذوقؔ اور رندؔ و صباؔ پر یا فارسی میں قتیلؔ و شہیدؔ اور شیفتہؔ و بیخبرؔ پر ردّ و قدح کرتے۔ بہر حال ایسا نہ ہونے سے موجودہ 'یادگارِ غالبؔ' مولانا کے یا اُردو کے لیے باعثِ ننگ و عار تو نہیں ٹھہرتی۔ لیکن معترض نے کچھ اسی رنگ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

'یادگارِ غالبؔ' کے مختصر نمونے یہ ہیں:-

(۱) ناقدردانی کی شکایت وہ اس خیال سے کہ ان کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے اکثر تنگ دل رہتے تھے۔ چنانچہ اس بات کی انھوں نے فارسی اور اُردو نظم و نثر میں جا بجا شکایت کی ہے۔ ایک روز قلعہ سے سیدھے نواب مصطفےٰ خاں کے مکان پر آئے اور کہنے لگے کہ "آج حضور نے بڑی قدردانی فرمائی۔ عید کی مبارکباد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا۔ جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ "مرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو۔" اس کے بعد نواب صاحب اور مرزا زمانے کی ناقدری پر دیر تک افسوس کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب حسنِ اتفاق سے ان کو کوئی سخن سنج اور سخن فہم میسر آ جاتا تھا تو اس کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔

منشی نبی بخش حقیر تخلص جو ایک زمانہ میں کول میں سررشتہ دار تھے، اور جن کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سنی گئی ہے، کہیں وہ دلّی میں آئے ہیں اور مرزا کے مکان پر ٹھہرے ہیں۔ ان کی

نسبت منشی ہر گوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ ''خدا نے میری بے کسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانہ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجہ کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے؟ حالانکہ میں شعر کہنا جانتا ہوں۔ مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کیے آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوق معنی کے بھی دو حصے کیے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں اور نعمت پر دنیا سے قانع۔''

اپنے عجز کا اقرار: مرزا سے جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمائش کی جاتی تھی جو ان سے بآسانی سرانجام نہ ہو سکتی تھی تو وہ اس بات کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ میری شاعری کی شہرت اور ناموری پر حرف آئے گا، بلکہ صاف لکھ بھیجتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے۔ ایک بار غالباً مجتہد العصر سیّد محمد صاحب مرحوم و مغفور نے مرزا سے اس بات کی خواہش کی کہ اُردو میں جناب سیّد الشہداء کا مرثیہ لکھیں۔ چونکہ مرزا ان کی بہت تعظیم کرتے تھے اور ان کے سوال کو رد کرنا نہیں چاہتے تھے ان کے حکم کی تعمیل کے لئے مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ چونکہ اس کوچے میں کبھی قدم نہ رکھا تھا، اور فرمائش ایسی چیز کی ہوئی تھی جس کو اور لوگ حدِ کمال تک پہنچا چکے تھے اور قویٰ میں انحطاط شروع ہو گیا تھا، مشکل سے مسدس کے تین بند لکھے جن میں سے پہلا بند ہم کو یاد ہے اور یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

ہاں! اے نفسِ بادِ سحر! شعلہ فشاں ہو　　اے دجلۂ خوں! چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم! لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو　　اے ماتمیانِ شہِ مظلوم! کہاں ہو
بگڑی ہے، بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

ایک یہ اور دو بند اور لکھ کر مجتہد العصر کی خدمت میں بھیج دئے۔ اور صاف لکھ بھیجا کہ ''یہ تین بند صرف

انتثال امر کے لئے لکھے ہیں ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں، یہ اُن لوگوں کا حصّہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عُمریں بسر کی ہیں۔ مجھ کو اُن کے درجے تک پہنچنے کے لئے ایک دوسری عمر درکار ہے۔ پس مجھے اس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے۔'' ان کا قول تھا کہ ''ہندوستان میں انیسؔ و دبیرؔ جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔''

(۲) مرزا نے بعض اُردو خطوں میں اور خاص کر اُردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلف بارده میں شمار کیا جاتا ہے۔ خصوصاً اُردو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے نہایت محدود زبان ہے۔ وہ اس قسم کے تصنع اور ساختگی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی۔ مگر مرزا نے جس قسم کی مسجع عبارت اُردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے، اس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبانوں کے سوا اور زبانوں کی مسجع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو اس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس لئے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بہ سبب لزوم مالا یلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے۔ مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں۔ اور یہ بات اس شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجہ کا کمال رکھتا ہو۔ اور وزن اور قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اس کی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں، مرزا کے اُردو رقعات میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ مگر یہ معلوم رہے کہ مقفیٰ عبارت مرزا خاص کر ان خطوط میں لکھتے تھے جن سے ہنسی، ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے۔ مثلاً سیّد یوسف مرزا کو ان کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں:-

''یوسف مرزا کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔ اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے، اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا؟ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کسے

کہتے ہیں تو میں کہوں گا کہ یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جواں مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی نہ قیدِ فرنگ۔"

(۵) **حیاتِ جاوید** (سر سیّد کی سوانح عمری) مطبوعہ ۱۹۰۱ء۔ اس کے دیباچے میں مولانا حالی لکھتے ہیں:-

"اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے، ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کرٹکل طریقہ سے لکھی جائے اس کی خوبیوں کے ساتھ کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اس سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اول تو ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے۔ جنھوں نے اس موج خیز اور پُر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے ان کو سب نے بھلا جانا۔ کیونکہ ان کو کسی کی بھلائی یا بُرائی سے کچھ سروکار نہ تھا وہ کہیں رستہ نہیں بھولے۔ کیونکہ انھوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اُس شخص کا حال لکھنا ہے۔ جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے۔ بڑے علماء و مفسرین کو للکارا ہے۔ اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے۔ قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے۔ اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں۔ جس کو مذہب کے لحاظ سے کسی ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے۔ اور جس کو پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے راست باز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا اپن ٹھوک بجا کر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے۔ جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سر سیّد کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم

چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسیّد کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا۔ اور اس لئے ضرور ہے کہ ان کے ہر کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ کیونکہ سچ میں اور صرف سچ میں ہی یہ کرامت ہے کہ جس قدر اس میں زیادہ کرید کی جاتی ہے اسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی نے سرسیّد کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا ہوگا۔ لیکن ان کی نکتہ چینی اس طرح کی ہے۔ (ایک مضمون کے درمیان سے کچھ حذف کر کے مولانا کے الفاظ میں مسلسل کر کے نقل کیا جاتا ہے:-

سرسیّد کی ترقی کے اسباب اصل یہ ہے کہ ایشیائی طرزِ حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے زیادہ بڑھانے والی، اور اس کے تمام طاقتوں کو مضمحل کرنے والی ہے، اور جو ہندوستان میں بھی تمام ایشیائی ملکوں کی طرح آفرینش سے ایک عنوان پر چلی آتی تھی، اور اس نے ایشیا کی کسی قوم، بلکہ کسی متنفس میں قومیت کی روح باقی نہیں چھوڑی.......... جان اسٹوارٹ مل لکھتے ہیں کہ "اگر رعیت کو ایسا بنا دو کہ وہ ملک کے لئے کچھ نہ کر سکے تو اس کو ملک کی کچھ پرواہ نہ رہے گی.......... البتہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو ہر ملک میں اور خاص کر ایشیائی ملکوں میں مذہبی آدمیوں کو نہایت استقلال کے ساتھ تمام عمر اپنے ارادوں پر ثابت قدم رکھ سکتا ہے.......... مگر یہ بھی کیسا ہی سچا اور خدا کا بھیجا ہوا ہو، طرزِ حکومت کا تابع ہوتا ہے۔ اس میں جتنی باتیں طرزِ حکومت کے مقتضا کے موافق ہوتی ہیں، وہ رواج پاتی ہیں، اور باقی حصہ ناقابل عمل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً خود مختار سلطنت جس میں کوئی بات شخصیت سے خالی نہیں ہوتی، اس میں مذہب بھی ذاتی اور شخصی بھلائیوں کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا وہ صرف ایسی نیکیاں سکھاتا ہے جن سے نفع یا تو نیکی کرنے والے کی ذات پر ختم ہو جاتا ہے، یا صرف خاص خاص شخصوں کو پہونچتا ہے۔ وہ کبھی ایسی نیکیوں کو ترغیب نہیں دیتا جن سے بلا واسطہ تمام ملک یا بنی نوع کو فائدہ پہونچے۔ مذہب کی یہ حالت ایسی پائدار اور مستحکم ہو جاتی ہے کہ خود مختار سلطنت کا دورہ ختم ہو جانے کے بعد بھی صدیوں تک وہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے۔ پچھلے جس شاہراہ پر اگلوں کو چلتا دیکھتے ہیں، آپ بھی آنکھیں بند کر کے اسی شاہراہ پر ہو لیتے ہیں۔ دائیں بائیں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ مگر بعض اوقات زمانے کی ضرورتیں خود مذہبی فرقہ میں کوئی ایسا شخص پیدا کر دیتی ہیں جس کو مذہب کی چھان بین کرنا

پڑتی ہے، اور مذہب کا وہ متروک حصہ جو موجودہ زمانہ کے موافق ہوتا ہے، اس پر عمل کرنا اور اس کو رواج دینا پڑتا ہے۔ زمانہ کی ضرورتیں اس کی آنکھیں کھولتی ہیں اور بانی مذہب کی محبت اور عقیدت اس کو مذہب کی حقیقت کھولنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور خود مذہب اس میں استقلال پیدا کرتا ہے، جس کی بدولت وہ قوم کی شاہراہ کے خلاف اپنی کٹھن منزل طے کرتا ہے۔

یہیں سے اس چیز کا سراغ چلتا ہے جس سے سرسیّد سے تمام ملکی اور قومی خدمتیں سرانجام کرائی ہیں۔ ہمارے نزدیک جہاں تک ان کی لائف شہادت دیتی ہے اور جس قدر کہ ان کے حالات، افعال اور اقوال سے ظاہر ہوتا ہے ان کی تمام ترقیات کا منبع ان کے کُل مقاصد عالیہ کا محرک اور ان کی ہر منزل کا رہبر مذہب کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی۔

اسلام کی حقیت کا یقین اور بانی اسلام کی محبت اور عقیدت گویا سرسیّد کی گھٹی میں پڑی تھی...... مگر جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ ان پر غالب رہا، مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا۔ وہ انھیں سنّت و بدعت و تقلید و عدم تقلید کے جھگڑوں میں الجھے رہے اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقاصد کو صرف انھیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے، جن کا نفع یا تو خود کام کرنے والے کی ذات کو، اور یا خاص شخص کو پہونچتا ہے۔ مگر آخر کار زمانہ کی ضرورتوں نے ان کی آنکھیں کھولیں، اور خود اس یقین نے جو اسلام کی حقیقت کی نسبت ان کی گھٹی میں پڑا تھا، ان کو اسلام کی حقیقت اور اس کے اصلی مقاصد تک پہونچا دیا۔ جو باتیں دینِ حق کی پاکیزگی اور تقدس کے خلاف معلوم ہوئیں، ان کو چھوڑا اور جو اس کے مطابق پائیں، ان کو پکڑا۔ اور زید و عمرو کی مخالفت کا خوف یک قلم دل سے اٹھا دیا۔ ہر ایک معاملے میں خود مذہب کو نہ کہ زید و عمرو کو اپنا رہبر بنایا۔ جو سوال پیش آیا اس کو بلا واسطہ مذہب ہی سے پوچھا۔ اور جو کچھ وہاں سے جواب ملا، اس کو سر پر رکھا۔''

'حیاتِ جاوید' کے ایسے ہی مقامات ہیں جن کو لوگوں نے ''سرسیّد کی مدلّل مداحی'' سے تعبیر کیا ہے۔ ہم نے یہ حصہ اسی لئے انتخاب کیا ہے کہ تصنیف و مصنف اور سیرت و صاحب سیرت کا کمزور پہلو سامنے آجائے۔ مولانا حالؔی نے جو کچھ لکھا ہے، یہی ان کا اعتقاد تھا۔ انھوں نے سرسیّد کا محرک عمل متعین کرنے میں اپنے نزدیک بالکل صداقت سے کام لیا ہے۔

مولانا کی رائے میں سرسیّد کی تمام ملکی و قومی خدمتوں کا محرک مذہب کے سوا اور کوئی

چیز قرار نہیں پا سکتی''، لیکن اصل میں سرسیّد کی ملکی و قومی خدمتوں کا محرک اسلام نہیں بلکہ مسلمان تھے۔ بظاہر ان دو باتوں میں کچھ ایسا فرق نہیں ہے۔ لیکن غور کیجئے تو بڑا فرق ہے۔ سرسیّد غدر کے بعد مسلمانوں کی تباہی سے نہایت متاثر تھے۔ ان کو زیادہ تباہ ہونے سے بچانا چاہتے تھے۔ گورنمنٹ کے دل سے مسلمانوں کی طرف سے بدگمانی دور کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کو انگریزی زبان و علوم، انگریزی تہذیب و معاشرت، انگریزی اخلاق و آداب سکھا کر ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ غرض مسلمانوں کی دنیا سرسیّد کے پیشِ نظر اور مقصودِ عمل تھی۔ لیکن ان اصلاحوں اور ترقیوں کی راہ میں مسلمانوں کے قدیم و راسخ عقائد و اعمال و علمائے اسلام کا اثر حائل تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ ہر اصلاح، ہر تحریک، ہر ترقی کے لیے اسلام کا حکم یا اجازت ثابت کی جائے۔ سرسیّد نے یہی کیا۔ یہ کام صرف ایک حد تک بجا اور درست تھا۔ لیکن سرسیّد حد کے اندر رہنے والے آدمی نہ تھے۔ ایک آندھی اور طوفان کی کیفیت تھی۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں مکمل انقلاب پیدا کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

اس میں کلام نہیں کہ ''اسلام و بانیٔ اسلام کی محبت سرسیّد کی گھٹی میں پڑی تھی'' انھوں نے بہت سے کام خالص اسلام کی محبت سے کیے۔ سر ولیم میور کی ''سیرت محمدی'' کا جواب ''خطباتِ احمدیہ'' کے اکثر مضامین، کسی پادری کی ''امہات المؤمنین'' کا رد، وغیرہ محض اسلام کے اعلانِ صداقت و احقاق حق کے لیے تھا۔ جس میں ''دنیا'' شامل نہ تھی۔ لیکن اور بہت سی باتوں میں ان کی لغزش کا سبب بقول مولانا حالی کے یہ تھا کہ ''آخر میں سرسیّد کی خودرائی یا جو وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا، وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا''

'حیاتِ جاوید' کے پہلے حصے میں سرسیّد کے حالات اور دوسرے میں ان کے قومی و ملکی کارنامے ہیں۔ سرسیّد کی راست بازی و اخلاقی جرأت کے چند واقعات لکھے ہیں۔ ایک واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ سرسیّد نے کسی دیہاتی مدرسہ کا معائنہ کیا۔ وہاں گائے بندھی ہوئی دیکھی اور مدرس و طلبا کو غیر حاضر پایا۔ رپورٹ میں یہ واقعہ لکھ دیا اور نتیجہ نکالا کہ ہندوستان کے عام دیہاتی مدرسوں کی یہی حالت ہے۔ سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر نے سرسیّد

کی رپورٹ پڑھ کر ان کی رائے سے اختلاف کیا۔ سرسیّد کو یہ بات ناگوار ہوئی اور مسٹر بریملی سشن جج علی گڑھ سے شکایت کی۔ جج صاحب نے لفٹنٹ گورنر کو لکھ بھیجا۔ انھوں نے جج صاحب کو جواب لکھا کہ ان کو سرسیّد کے معائنہ کی صداقت سے انکار نہیں، بلکہ ان کے نتیجہ نکالنے سے اختلاف ہے۔ اس کے بعد سرسیّد اپریل ۱۸۶۹ء میں ولایت چلے گئے اور چونکہ لیفٹنٹ گورنر کی طرف سے دل صاف نہ تھا اس لیے ان سے مل کر نہ گئے۔ جب اکتوبر ۱۸۷۰ء میں لندن سے واپس آئے اس وقت بھی سر ولیم سے جا کر نہ ملے۔ کچھ عرصہ بعد ان کے پرائیویٹ سکریٹری کا خط سرسیّد کے پاس آیا کہ ''نواب لیفٹنٹ گورنر آپ کے مع الخیر ہندوستان میں پہونچنے سے خوش ہوئے اور آپ کی خیریت اور سیّد محمود کی تعلیم کا حال معلوم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اور اب تک انتظار کر رہے ہیں۔'' باقی حال مولانا حالؔی کی زبانی سنیے:-

سرسیّد نے اس کے جواب میں نہایت صفائی سے تمام وجہ اپنے خط نہ بھیجنے اور مل کر نہ آنے کی، اور سیّد محمود کی تعلیم کی کیفیت مفصل لکھ بھیجی۔ یہ چٹھی ۷ رنومبر کی تھی۔ سر ولیم نے نویں نومبر کو اس کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھا، جس کا ترجمہ یہ ہے:-

مائی ڈیر سیّد احمد، آپ کی ساتویں نومبر کی چٹھی نے مجھ کو اس قدر حیران اور رنجیدہ کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے خواب میں بھی آپ پر کسی خلاف واقعہ بات کہنے کا الزام لگانے کا خیال نہ کیا ہوگا۔ میں ان نتائج سے جو آپ نے نکالے ہیں اب بھی اختلاف رکھتا ہوں۔ مگر اس سے آپ پر کوئی الزام لگانا ظاہر نہیں ہوتا۔

مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ آپ نے فوراً مجھ کو براہِ راست کیوں نہ لکھا۔ آپ کے ایسا کرنے سے مجھ کو اور بھی رنج ہوتا ہے، گویا آپ نے اس قدر اعتبار اور بھروسہ نہ کیا جس کی میں آپ سے امید کرتا تھا۔ اور شاید امید کرنے کا حق بھی رکھتا تھا۔

مسٹر بریملی نے اُردو الفاظ کا مطلب مجھ پر ظاہر کیا تھا اور میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جس میں ظاہر کر دیا تھا کہ میں نے ایک لحہ بھی کسی ایسے مطلب کا خیال نہیں کیا تھا اور میں نے اپنی تحریر کو جس طرح پر ضرورت ہو استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ چونکہ اس معاملے کا اس سے زیادہ کوئی تذکرہ نہیں

ہوا ہیں نے خیال کیا کہ وہ اظہار کافی تھا اور گزٹ سرکاری میں اس کے شایع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

کیپٹن ملنکسٹن آپ کو اس مضمون کے متعلق مندرجہ بالا خط و کتابت کے حوالے سے آیندہ لکھیں گے۔ اس وقت میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں آپ کے بیٹے کے ایسے عمدہ حالات سننے سے نہایت خوش ہوا ہوں اور آپ کو اس طرف یا جب کبھی میرا کیمپ بنارس میں پہونچے تو وہاں دیکھ کر خوش ہوں گا۔"

سرسید نے اس چٹھی کا فوراً شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ "آپ کے عنایت نامہ سے تمام بوجھ میرے دل پر سے اٹھ گیا۔"

کرنل گریہم یہ تمام واقعہ اپنی کتاب میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "سر ولیم نے سید احمد خاں کو اجازت دے دی تھی کہ میری چٹھی کو جس طرح چاہیں شائع کر دیں۔ اگر کوئی اور دیسی جنٹلمین ہوتا تو فوراً ایسا کرتا مگر سید نے اس کو پڑھ کر ڈال دیا اور مجھ کو بڑی تلاش سے وہ چٹھی ملی۔"

کرنل موصوف کا یہ خیال ہندوستانیوں کے کیریکٹر کی ناواقفیت پر مبنی ہے۔ بے شک ایسی طبیعت اور رتبے کے ہندوستانی جیسے کہ سرسیّد تھے بہت کم نکلیں گے کہ ایک موہوم شبہ پر صوبہ کے گورنر سے ناراضی کا اظہار کر بیٹھے اور گورنر کی طرف سے ایسی مہربانی کے ساتھ ان کی دل جوئی کی گئی مگر ہندوستانی شرفاء میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض اپنی نمود کے لیے حکام کی ایسی تحریروں کا شائع کرنا جیسی کہ سر ولیم کی تحریر سرسیّد کے نام تھی نہایت سبک اور حقیر بلکہ کمینہ حرکت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک معاملہ ولیم صاحب کمشنر میرٹھ کے ساتھ گذرا۔ جب سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کا مکان بن کر تیار ہوا تو صاحب ممدوح کو اس کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ ان کے دل میں عنایت اللہ خاں مرحوم رئیس بھیکن پور ضلع علی گڑھ کی طرف سے ایام غدر کے متعلق شبہات تھے اس لیے وہ افتتاح کی رسم میں ان کا شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے سرسیّد سے کہا کہ "اس جلسہ میں اگر عنایت اللہ شریک ہوئے تو ہم نہیں آنے کے۔" سرسیّد نے کہا "یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہایت فیاضی سے سوسائٹی کی امداد کی ہے اور جو اس کا پریسیڈنٹ بھی ہے اس کو شریک نہ کیا جائے۔" انھوں نے ہرگز اس بات کو گوارا نہ کیا کہ عنایت اللہ خاں مرحوم کی عدم موجودگی میں افتتاح کی رسم ادا کی جائے۔ آخر مسٹر بریلی نے جو علی گڑھ میں سشن جج تھے اور سوسائٹی کے بڑے معاون

اور سر سیّد کے دوست تھے۔ بڑی مشکل سے صاحب کمشنر کو راضی کیا۔ اور ان کو عنایت اللہ خاں کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرنی پڑی۔ سر سیّد کا اس باب میں اصرار کرنا زیادہ تر اس وجہ سے تھا کہ ان کے نزدیک صاحب کمشنر کے شبہات محض بے اصل تھے اور وہ خود عنایت اللہ خاں کو ہر ایک الزام سے پاک وصاف جانتے تھے۔"

(۶) **مضامینِ حالیؔ** مولانا کی مقالہ نگاری کا سلسلہ سر سیّد کے رسالہ تہذیب الاخلاق (۱۸۷۰ء) کے ساتھ جاری ہوا۔ غالباً ان کا پہلا مضمون وہ ہے جو "مولوی سیّد احمد خاں بہادر سی، ایس، آئی" کے عنوان سے "اخبار علی گڑھ انسٹیٹیوٹ" میں ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد سر سیّد کے رسالہ و اخبار میں اور ہندوستان کے مختلف پرچوں میں آخر عمر تک لکھتے رہے۔ مولانا کے مجموعہ مقالات میں ہر نوع کے خیالی، اخلاقی، اصلاحی، مذہبی تنقیدی مضامین موجود ہیں۔ ان کی روشِ تحریر یہاں بھی "موجِ نرم خیز" کی طرح جاری ہے۔ ہر مسئلے کی تحقیق اور ہر مطلب کی تشریح نہایت وسعتِ نظر کے ساتھ کرتے ہیں۔ بہت سی کتابوں پر ریویو کیے ہیں۔ مولانا ذکاء اللہ کی "تاریخ ہندوستان"، مولانا آزاد کی "آبِ حیات" اور "نیرنگِ خیال" مولانا شبلی کی "سیرۃ النعمان" مولوی سیّد احمد کی "فرہنگِ آصفیہ" وغیرہ سب کتابوں پر کشادہ دلی کے ساتھ تنقیدیں لکھتے ہیں۔ ان کے عیوب کو قابلِ گرفت اور اپنے خیالات کو لائقِ ذکر نہیں سمجھتے۔ مثلاً 'نیرنگِ خیال' میں کچھ خامیاں دیکھتے ہیں، لیکن ۵ صفحے اس کی تعریف میں لکھ کر اتنا لکھ دیتے ہیں:-

"اگر چہ اس عام قاعدے کے موافق کہ الصفو والکدر توأمان، انسان کا کوئی کام خوبی اور عیب سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً تصنیف و تالیف کا دشوار کام، جس کا بے عیب ہونا محال ہے، لیکن ایسے ملک میں جہاں ترقی ابتدائی حالت میں ہو نئے اسلوب کی کتابوں کا کم عیب ہونا بھی بے عیب ہونے کے برابر ہے......... اس وقت ایسی کتابوں میں خوردہ گیری کی نظر سے خوض کرنا، کیا باعتبار ترقی کی حالت کے اور کیا باعتبار خیالات اہلِ وطن کے اور کیا باعتبار مصنفوں کی امیدوں کے، اور کیا باعتبار خوردہ گیروں کی نیت کے، ایک ایسا کام ہے جس کا شاید ابھی وقت نہیں آیا۔"

(ریویو نیرنگ خیال' مطبوعہ اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ۱۸۸۰ء)

معلوم ہوتا ہے 'آبِ حیات' شائع ہونے کے بعد علامہ آزاد نے اس کی کوئی جلد مولانا حالی کو نہیں بھیجی، اور انھوں نے بطور خود کہیں سے لے کر اس کو پڑھا۔ ریویو میں لکھتے ہیں:-

''ہم کو اس بے مثل کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہونے کا موقع اس وقت ملا جب کہ بہت سے اُردو اخباروں میں اس پر ریویو لکھے جا چکے تھے۔''

اس کے بعد بہت طویل مضمون میں آبِ حیات اور اس کے مصنف کی بے حد مدح کرتے ہیں، اور اپنی فراخ حوصلگی سے علامہ آزاد کی ایک بہت بڑی فرو گذاشت کی اس طرح تاویل کرتے ہیں:-

''اگر چہ بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا حال قلم انداز کیا گیا ہے جو اپنے طبقہ میں مستند سمجھا جاتا تھا، جیسے طبقہ پنجم میں مومن خاں مومنؔ، یا میر نظام الدین ممنونؔ، لیکن اس کا یہ عذر ہو سکتا ہے کہ مصنف نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کسی دور کا مستند شاعر فرو گذاشت نہیں کیا جائے گا بلکہ اس نے ہر دورہ میں سے چند شاعر بطور نمونہ کے انتخاب کر لیے ہیں، اور اس سے ان تغیرات کا دکھانا منظور ہے جو ہر ایک دورہ میں زبانِ اُردو پر واقع ہوئے ہیں۔ البتہ اگر مصنف تمام شعرائے اُردو کا حال بالاستیعاب لکھتا تو چند نامی شاعروں کا ذکر نہ کرنا محل اعتراض ہوتا۔''

(ریویو آبِ حیات' مطبوعہ اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ۱۸۸۱ء)

اسی طرح علامہ شبلی کی 'سیرۃ النعمان' کی تعریف ایسے شرح صدر اور وسعتِ قلب کے ساتھ کرتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ اور اگر کوئی محلِ اعتراض پاتے ہیں تو یہ کہہ کر گذر جاتے ہیں:-

''جب ہم کسی کتاب پر ریویو لکھ رہے ہیں، ہم کو یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ مصنف کی رائے جزئیات مسائل میں فی نفسہ کیسی ہے، کیونکہ اس کا فیصلہ کرنا پبلک کا کام ہے، نہ ریویو لکھنے والے کا، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کتاب کا عنوان بیان کیسا ہے؟ ترتیب کیسی ہے؟ طریقہ استدلال مذاق وقت کے موافق ہے یا نہیں؟ اور کتاب لکھنے کی جو غایت مقتضائے وقت کے موافق ہونی چاہیے، یا جو مصنف نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھی ہے، وہ اس سے حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں؟''

یعنی مولانا حالیؔ بعض مسائل میں علامہ شبلیؔ کی رائے کو درست نہیں سمجھتے، لیکن اس کا ذکر کرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی وغیرہ نے 'سیرۃ النعمان' پر بڑے اعتراضات کیے۔ مولانا 'سیرۃ النعمان' میں کچھ کمی بھی پاتے ہیں، لیکن اس کی طرف صرف ایک اشارہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ کر دیتے ہیں:۔

''بایں ہمہ جس طرح دریائے نیل کا اصل منبع ایک ہی سفر میں دریافت نہیں ہوا، اسی طرح ممکن ہے کہ اس باب (ترجیح فقہ حنفی) کی تکمیل کے لیے مصنف کو اپنی پوری توجہ سے ایک آدھ بار پھر ہمت مصروف کرنی پڑے۔''

مضامینِ حالیؔ میں سے مختلف موضوعوں کے چند نمونے درج کیے جاتے ہیں:۔

(۱) یہ مضمون تمثیلی رنگ کا لکھا ہے، اور اس طرح کا یہ ایک ہی مضمون ہے۔

زبان گویا۔ اے میری بلبلِ ہزار داستاں! اے میری طوطی شیریں بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رونہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیر کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا جی دکھاتی تھی تو وہی زبان ہے جو جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کو شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے دلوں کو فگار.........

اے زبان تو دیکھنے میں ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ بھی نہیں مگر تیری طاقت نمونہ قدرتِ الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کھو۔ اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔ اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم ایک خزانہ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اُٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح

مشفق تیری صفت ہے اور مرشد برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ منصب عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط وہی ایک گوشت کا چھچھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے۔ تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے۔ تو فریب بھی دے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے؟ نہیں! ہرگز نہیں! اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبون ہے، بلکہ سراسر زیان ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور اوروں کے دلوں میں جگہ پائے گی، ورنہ گدی سے کھینچ کر نکال لی جائے گی.......... الٰہی اگر ہم کو رخصت گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے۔ اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں، اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔

(۲) ذیل کا مضمون بھی مولانا کے قدیم مقالات میں ہے، اور خوب لکھا ہے۔ اپنے موضوع کو مختلف تاریخی، مذہبی، معاشرتی مثالوں سے واضح کیا ہے۔ ہم مختلف مقامات کو مسلسل کر کے مختصر کر کے درج کرتے ہیں:-

''جب زمانہ بدلے تم بھی بدل جاؤ'' زمانے کی نیرنگیاں مشہور ہیں اور اس کی تلون مزاجیاں ضرب المثل ہیں۔ وہ سدا ایک حال پر نہیں رہتا، وہ ہمیشہ ایک چال نہیں چلتا۔ وہ گرگٹ کی طرح برابر رنگ بدلتا رہتا ہے، وہ اس پتھر کی طرح جو چوٹی سے لڑھکایا جائے ہزاروں پلٹے کھاتا چلا جاتا ہے۔ وہ جو روپ بھرتا ہے اس کے چہرے پر کھل جاتا ہے۔ وہ جو ٹھاٹھ بدلتا ہے اس کا رنگ ساری مجلس پر چھا جاتا ہے.......... مبارک باد وہ ہیں جنھوں نے اس کے تیور پہچانے، اور اس کی چال ڈھال کو نگاہ میں رکھا۔ جدھر کو وہ چلا اس کے ساتھ ہو لیے۔ اور جدھر سے اس نے رُخ پھیرا، اس کے ساتھ پھر گئے۔ گرمی میں گرمی کا سامان کیا، اور جاڑے میں جاڑے کی تیاری کی۔ دن کو دن کی طرح بسر کیا اور رات کو رات کی طرح کاٹا۔ اور بدنصیب وہ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی سے جی چرایا، اور اس کی ہمراہی سے ناک چڑھائی۔ گرمی چمکی پر انھوں نے جاڑے کے کپڑے نہ اتارے، اور ہلکے پھلکے نہ بنے۔ دن نکلا، پر انھوں نے کروٹ نہ بدلی، اور خواب شبینہ سے بیدار نہ ہوئے۔ اب وہ بہت جلد دیکھیں گے کہ پیچھے کون رہا، اور منزل تک کون پہنچا۔

جو لوگ زمانے کی پیروی نہیں کرتے، وہ گویا زمانے کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ ان کی سخت خام خیالی ہے۔ چند مچھلیاں دریا کے بہاؤ کو نہیں روک سکتیں، اور چند جھاڑیاں ہوا کا رُخ نہیں پھیر سکتیں۔ اسی لیے ایک پختہ کار شاعر نے کہا ہے کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" اور عرب کے ایک حکیم کا قول ہے دُرْ مَعَ الدَّهْرِ كَيْفَ مَادَارَ ۔یعنی زمانہ جدھر کو پھرے اس کے ساتھ پھر جا۔

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ صِرْ هَيُوْ لٰى لِكُلِّ صُوْرَةٍ ،یعنی اپنی ذات میں ایسی قابلیت پیدا کر کہ جس رنگ کو چاہے فوراً قبول کر لے۔ یہ اس لئے فرمایا کہ زمانہ کبھی انقلاب سے خالی نہیں رہتا۔ اور اس کا مقابلہ انسان ضعیف البُنیان سے نہیں ہو سکتا۔ پس انسان میں ایسی قابلیت ہونی ضرور ہے کہ جیسی ضرورت دیکھے ویسا بن جائے۔ تا کہ زمانے کا کوئی انقلاب اس کو سخت نقصان نہ پہونچائے............

اے مسلمانو! تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ جو شے تم کو ابھرنے نہیں دیتی، وہ کیا ہے؟ اور جس کے سبب تم جنبش نہیں کر سکتے، وہ کون سی بندش ہے؟ یاد رکھو وہ تمھاری بیہودہ تقلید ہے.......... تم صرف انھی لوگوں کی تقلید نہیں کرتے جن کے ساتھ تم کو حسنِ عقیدت ہے، بلکہ طب میں جالینوس کی، منطق میں ارسطو کی، ہندوستان کی رسموں میں ہندوؤں کی تقلید کو بھی اسی قدر ضروری جانتے ہو، جس قدر مذہب میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید تمھارے نزدیک واجب و لازم ہے۔ اگر کسی کو اس بات میں تامل ہو تو نکاح بیوگان کے معاملے میں غور کرے اور دیکھے کہ اس کا مجوز کون ہے؟ اور مانع کون ہے؟ اور ہندوستان کے عام مسلمانوں نے مجوز کے حکم کی تعمیل کی ہے، یا مانع کا کہنا مانا ہے(۱) اسی تقلید کی بدولت تم میں ایک اور مرض پیدا ہو گیا ہے۔ جس نے تمھاری رہی سہی ہمت خاک میں ملا دی اور تم کو بالکل اپاہج کر دیا۔ پوچھو وہ کیا ہے؟ وہ خانہ خراب وضع داری ہے۔ جس کی ہدایت سے تم ترقی کرنے والوں کو متلون المزاج سمجھتے ہو اور ڈھور ڈنگروں کی طرح سدا ایک حالت پر رہنے والوں کو کمالِ نفس انسانی قرار دیتے ہو۔

ہندوستان کے وضع داروں کی یہ رائے ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں جو طریقہ یا جو حالت اختیار کرے اس کو آخر عمر تک ترک کرنا نہیں چاہیے۔ جوانی میں اگر داڑھی چڑھانے کی عادت ہو جائے تو

---

(۱) یعنی اسلام نے بیوہ عورتوں کے نکاح کی اجازت دی ہے، لیکن ہندوؤں کے مذہب میں جائز نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اسلام کی اطاعت چھوڑ کر ہندوؤں کی پیروی کی۔

سنِ شیخوخت تک اس وضع کو نباہنا ضروری ہے، اور بچپن میں اگر کامدار ٹوپی پہننے کا لپکا پڑ جائے تو بُوھاپے کے جھرّ یائے چہرے کو بھی اس سے محروم رکھنا نہیں چاہئے۔ چنانچہ معتبر راویوں سے سنا گیا ہے کہ دو بزرگوار نجف خانی جن کا سن شریف ساٹھ پینسٹھ سے متجاوز ہو گیا تھا اور نہایت متقی اور متورّع آدمی تھے۔ جو ہر جمعہ کو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے درس میں حاضر ہوا کرتے تھے، شاہ صاحب بھی ان کی کمال تعظیم کرتے تھے۔ بایں ہمہ تقدس دونوں حضرات داڑھی گھٹواتے تھے۔ بعضے منھ پھٹ آدمیوں نے جو ان پر اعتراض کیا تو فرمایا کہ ہم خود اس حرکت سے منفعل ہیں، مگر کیا کریں جو وضع قدیم سے چلی آتی ہے اس کے خلاف کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اسی طرح ایک شریفوں کی بستی میں ایک صاحب سن رسیدہ بڑے نمازی اور پرہیز گار تھے، مگر عشاء کی نماز کبھی نہ پڑھتے تھے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو یہ فرمایا کہ بچپن میں تو اس سبب سے نہ پڑھی کہ کھانا کھاتے ہی شام سے سو رہتے تھے جوانی میں لہولعب میں مانع رہا۔ اب بڑھاپے میں نئی بات کرتے ہوئے جی ہچکچاتا ہے.........

(مطبوعہ تہذیب الاخلاق ۱۸۷۵ء ﴿۱۲۹۲ھ﴾

(۳) مولانا کی تحریر میں کہیں کہیں لطیف ظرافت بھی ہے۔ اوپر کا مضمون (زمانہ) بھی اس سے خالی نہیں۔ ایک اور مضمون اخبار نویسی اور اس کے فرائض میں لکھتے ہیں:-

ایک شخص نے گدھوں کے سوداگر سے جا کر کہا کہ ''مجھ کو ایک ایسا گدھا مطلوب ہے جو نہ زیادہ چھوٹے قد کا ہو نہ بہت بڑے قد کا۔ جب رستہ صاف ہو تو اچھلتا کودتا چلے، اور جب رستے میں بھیڑ ہو تو آہستہ قدم اٹھائے۔ نہ دیوار و در سے اَڑتا چلے، نہ گنجان درختوں میں سوار کو لے کر گھس جائے۔ اگر چارہ کم دیا جائے تو صبر کرے اور پیٹ بھرا ؤ دیا جائے تو شکر کرے۔ جب اس پر سوار ہوں تو چالاک بن جائے، اور جب تھان پر باندھ دیں تو کان نہ ہلائے۔'' سوداگر نے کہا ''چند روز صبر کر۔ اگر خدا تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے قاضی شہر کو گدھا بنا دیا، تو تیرا سوال پورا کر سکوں گا۔''

اگر آج کل کوئی کسی سے ایسا سوال کرے تو اس کو قاضی کی جگہ اخبار نویس کا نام لینا چاہئے۔ کیونکہ قاضی میں دو صفتیں ہونی ضرور ہیں۔ ایک قانون کی واقفیت جس کی رو سے وہ فیصلے کرتا ہے، دوسرے انصاف۔ بخلاف اخبار نویس کے کہ اس میں اپنے کام کے فرائض ادا کرنے کے لئے بیشمار لیاقتوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک کسی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ اخبار نویسی کی پوری لیاقت رکھتا ہے گویا اس

بات کا تسلیم کر لینا ہے کہ اس کی ذات میں ہر قسم کی لیاقت اور فضیلت موجود ہے۔...........

(مطبوعہ اخبار رفیق ہند ۱۵/اکتوبر ۱۸۹۲ء)

مولانا نے چند مذہبی مضامین سر سیّد کی حمایت میں لکھے ہیں۔ چونکہ مولانا کی تحریر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے اس لیے ہم نے بھی لکھ دی ورنہ حمایت سے قطع نظر کر کے بھی وہ مضامین خود نہایت ضروری مسائل پر بہترین اسلوب کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ ان میں ایک مضمون اَلدِّینُ یُسْرٌ (مذہب اسلام میں آسانی ہی آسانی ہے) کے عنوان سے بہت طویل لکھا ہے۔ اس کو الگ کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا تھا۔ ایک اور طویل مضمون کا عنوان ہے:۔ ''قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں۔'' یہ پہلے مضمون سے بھی زیادہ کاوش و تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ ان مضامین کے نمونے بخوفِ طوالت ترک کیے جاتے ہیں۔

(۴) ذیل کا مضمون ایک کتاب پر ریویو ہے۔ مولانا نے تنقید بھی خوب کی ہے، اور اصل کتاب تو ایسی عجیب ہے کہ اُردو لٹریچر میں ایک ہی ہوگی۔ اسی ندرت و جدّت کے سبب سے اس کے مختلف اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:۔

کلیات دلگیر پر ریویو۔ کلیات دلگیر ایک نئی قسم کا دیوان ہے، جس سے غالباً خاص خاص شخصوں کے سوا بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ صاحب دیوان ایک بزرگ منور خاں نام دلگیر تخلص، رئیس میرٹھ ہیں۔ ۱۸۵۰ء میں انھوں نے کچھ نظمیں گنواری زبان میں جو درمیان دوآب و ہریانہ کے دیہات میں عموماً بولی لکھی جاتی ہے، لکھ کر مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے حضور پیش کی تھیں۔ وہاں ان نظموں کی بہت داد ملی۔ اور بادشاہ نے انعام اور خلعت عنایت کیا۔ اس قدر دانی نے دلگیر کے خیالات پر وہی اثر کیا، جو سلطان سنجر کے ملک الشعراء کا تزک و احتشام دیکھ کر اوحد الدین انوری کے دل پر ہوا تھا۔ انھوں نے اسی گنواری زبان پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی، اور رفتہ رفتہ ایک نئی قسم کا دیوان مرتب کر لیا، جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔

جس زبان میں یہ دیوان مرتب ہوا ہے، وہ درحقیقت ایک قسم کی بگڑی ہوئی اُردو ہے، جیسا کہ ہر ملک میں دیہاتوں اور گنواروں کی زبان شہر والوں کی بگڑی ہوئی زبان ہوتی ہے۔ پس اس دیوان میں زیادہ تر

وہی الفاظ، جو فصیح اُردو میں صحیح طور پر استعمال ہوتے ہیں، کسی قدر تغیر کے ساتھ گنواری بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے خالق اور کھالک، باپ اور باپو، ہمارے اور مھارے، پچھے چپے اور چپّاں چپّاں، تو نے اور تیں نے، کیا اور کینا، دیا اور دینا وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ایک موزوں طبع آدمی کو جس کی مادری زبان شہری فصیح اُردو ہو، بگڑی ہوئی اُردو کا سیکھ لینا اور اس میں اشعار موزوں کرنا زیادہ دشوار نہیں۔ مگر جو بات دشوار اور سخت دشوار ہے، اور جس پر سوا اس شخص کے جو ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوا ہو، کوئی قادر نہیں ہو سکتا، وہ یہ، کہ جو مضمون ایک گنواری زبان میں بیان کیا جائے، اس کا پیرایہ بیان بھی گنواروں کے محدود خیالات کی حد سے متجاوز نہ ہو............ اس دیوان میں یہی وہ چیز ہے، جو دلگیر کے اصلی اور قدرتی شاعر ہونے پر بآواز بلند گواہی دیتی ہے۔ جس طرح اس کی زبان گنواری ہے، اسی طرح اس میں ہر ایک مضمون گنواروں کے خیالات کے موافق ادا کیا گیا ہے۔ وہ خدا کی تعریف اس طرح شروع کرتا ہے:

ہے مرے کھالک، ہے مرے مالک　　تو باپو، ہم تیرے بالک

(ہے حرفِ ندا یعنی اے کھالک = خالق۔ باپو = باپ) خدا کی عظمت کا بیان گنواروں کے خیالات کے موافق اس سے بہتر کسی پیرایہ میں نہیں ہو سکتا کہ اس کو باپ اور اپنے تئیں اس کے بچے قرار دیں۔

مھارے حاکم، مھارے سوائی　　چپّاں چپّاں تیری دہائی
ہمارے　　سردار

تیں پانی سوں مانس کینا　　سوجھ بوجھ مت سدھ بدھ دینا
تونے　　سے　　آدمی بنایا　　دیا

تیرے سانچے انیک نرالے　　جن سانچوں لکھ کایا ڈھالے
بے شمار　　لاکھ جسم

خدا تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کو جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے کہ قد خلقکم اطوارا اس طرح بیان کرتا ہے کہ تیرے سانچے بے شمار اور ان گنت ہیں کہ ایک سانچے کی ڈھلت دوسرے سانچے کی ڈھلت سے نہیں ملتی۔

انبر ۔ دھرتی ۔ سورج ۔ چندر　　دئی ۔ دیوتا ۔ پیر پگمبر
آسمان　　اوتار　　پیغمبر

سب تری ڈوڈھی سیس نوادیں تجھے نے پوجیں تجھے نے گاویں
ڈیوڑھی سر جھکائیں تجھی کو تیرا ہی نام لیں

جے تو اپنا چھوہ دکھاوے انبر دھرتی چھوٗ ہو جاوے
اگر غصہ

توں ہی مارے توں ہی نواجے تیرا دھونسا انبر باجے
نوازے نقارہ آسمان پر بجتا ہے

چونکہ بادشاہوں اور امیروں کے نقار خانے بہت بلندی پر بنائے جاتے ہیں تا کہ نوبت کی آواز دور دور پہونچے اور سننے والوں کو ان کی زیادہ شان وشوکت معلوم ہو، اس لئے عوام کے خیال کے موافق عظمت وجلالتِ الٰہی کو اس پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ کہ تیرا نقارہ آسمان پر بجتا ہے..........

(حمد ونعت کے بعد) اس مطلب کو کہ آپؐ کے چاروں یاروں نے دنیا میں اسلام کو پھیلایا اس طرح بیان کرتا ہے۔

نبیؐ صاحب کے چار سپائی جنھاں نے ملکوں دھوس ٹھائی
سپاہی جنھوں نے دھوم مچائی

کر دیے لکھوں نیم کے بندے نرمل ہوگئے مانس گندے
ایمان پاک آدمی

پھر اس مطلب کو کہ جس نے آنحضرت صلعم کی پیروی نہ کی وہ تباہ ہوا، اس طرح ادا کرتا ہے:

جو کوئی وا کی گیل نہ چالا واہ کا دو جگ مہرا کالا
اس کے ہمراہ دونوں جہاں میں منھ

ڈوب گیوا وہ کرموں ہینا جن حجرت کا سنگ نہ دینا
وہ نصیبوں کا ہیٹا جس نے حضرت ساتھ

ایک شخص اپنے وطن اور اہل وعیال سے دور پڑا ہے، گویا وہ خدا کی طرف مخاطب ہو کر اپنی مصیبت بیان کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

ہے مرے صاحب یو کے کینا مجھ نے دیس نکالا دینا

اے میرے مالک یہ کیا کیا | مجھے دیس نکالا یعنی جلاوطنی دیدی
میں کے تیری بھوری کھیدیں | جے مرے کاڑ جے برچھی چھیدی
کیا میں نے تیری بھوری بھینس نکال لی ہے | کر تو نے میرے کلیجے میں برچھی چبھودی ہے

اپنے صاحب یعنی خدا سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری بھینس چھین لی ہے جو تو نے مجھ پر مصیبت ڈالی ہے، چونکہ گنوار لوگ بھوری بھینس کو بہت عزیز رکھتے ہیں، اس لئے انھیں کے خیالات کے موافق خدا تعالیٰ سے کہتا ہے کہ کیا میں نے تیری بھوری بھینس چھین لی ہے جس کا تو نے مجھ سے یہ بدلہ لیا ہے۔ (اس کے بعد) کہیں جستی حقہ اور چوپاڑ کے ساتھیوں کو یاد کرتا ہے، کہیں بھابڑ کے بانوں سے بُنی ہوئی کھاٹ کھٹولی، گوبر کی ڈھیریوں، سانی کی ناندوں، دودھ دہی کی کوری مٹکیوں، سرسوں کا ساگ اور مکا کی روٹی اور اسی قسم کی اور چیزوں کا جو دہاتی زندگی کے مناسب ہیں حسرت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

سب سے زیادہ لحاظ کے قابل اس دیوان میں یہ بات ہے کہ ظاہرا دلگیرؔ سے پہلے کسی نے گنواری زبان میں دیوان مدون نہیں کیا، اور نہ اتنے مختلف مضامین جتنے کہ اس دیوان میں ہیں، کبھی اس زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں حمد، نعت، منقبت، اخلاق، ہزل، عشق، ہجر، وصل، رشک۔ غرضکہ وہ تمام بیانات جو اُردو کے عام دیوانوں میں پائے جاتے ہیں، موجود ہیں۔ پس اُردوئے معلیٰ کے شعرا جو کئی سو برس سے اسی ایک ہڈی کو چچوڑتے چلے آتے ہیں ان میں اور دلگیرؔ میں وہی فرق ہے جو مقلد اور موجد میں ہوتا ہے۔ وہ لوگ جب مضامین مذکورہ بالا میں سے کسی مضمون کو باندھنا چاہتے ہیں تو اس کے ادا کرنے کے لئے سیکڑوں اسلوب بیان اور الفاظ و محاورات اور تراکیب اُردو لٹریچر میں مہیا پاتے۔ ان کے سامنے مختلف مقدار کے بندھے ہوئے موتیوں کا انبار موجود ہے جیسے موتی کی ضرورت ہوتی ہے، بے تکلف لڑی میں پرو لیتے ہیں۔ بر خلاف اس شخص کے کہ جس کو اول غوطہ لگا کر دریا میں سے سیپیاں بہم پہونچانی، پھر ان میں سے موتی نکالنے ہیں۔ پھر ان کو جلا کرنا ہے۔ پھر بیندھنا ہے۔ پھر لڑی میں پرونا ہے۔

اس سے زیادہ مشکل یہ بات ہے کہ گنواری زبان ایک جاہل قوم کی زبان ہے، جس کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہے۔ باوجود اس کے دلگیرؔ نے اس میں بہت سے ایسے مضامین بیان کیے ہیں جن کا ایک گنواری زبان میں سمانا سخت مشکل ہے۔ مثلاً انگریزی عملداری کی تعریف میں نوایجاد توپوں اور

بندوقوں کا بیان، ریل، تار برقی، سڑکوں اور نہروں کا بیان، برف کی کل، واٹرورکس کا بیان، دیا سلائی، گیس اور برقی روشنی کا بیان وغیرہ وغیرہ۔ مذکورہ بالا بیان میں سے چند اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں:۔

جُگ جُگ رہے پھرنگی راج یو راجے راجوں سر تاج
ہمیشہ فرنگی یہ بادشاہ بادشاہوں کے سر تاج ہیں

راجا راجی سُکھی کسان یو راجا پرجا کی شان
راضی خوشی

بڑے بادچھا بڑے نسا پھ بڑے اَکل ور، بڑے سراپھ
بادشاہ انصاف عقل ور اشراف

انگریجاں کا ملکوں راج راجا بڑے گریب نواج
غریب نواز

انگریجاں کی بانکی پھوج جا بد چڑھے سمندر موج
جس طرح

پڑے سمندروں گھنے جہاج جا میں راکھیں بھر بھر ناج
جن میں

کھاوے پھوج ۔ انگھاوے بھوج بیٹھی باجے بجاوے پھوج
سیر ہو

توپاں چلیں گھنا گھنگھور کاسوں ہو سرکار کی ہور
کس سے برابری

تورا لگے نہ دارو موکھ، آپو آپو چلیں بندوکھ
توڑا بارود بندوق

ہند بندوکھاں لمبی نال داگی دگیں نہ دو دو سال
ہندوستانی بندوقیں داغنے سے نہیں دغتیں

ہند راج کھوٹی تروار گاجر کٹے نہ سو سو مار
تلوار

راج پھرنگی رہے آنند جد لگ انبر، سورج ، چند
جب تک

ریل نگاڑی کاڈھے تار دن میں چالے میل ہجار
نکالی

تار کھبر سوں راتوں رات لاکھ لوکس سوں کرلو بات

اچرج بڑی بڑپھ کی کل وائے گھومادے کونسا مل
اچنبھا برف اسکو پہلوان

کاگج دام چلاوے کون؟ ایسا ٹھاڈا آوے کون؟
کاغذ کے دام یعنی نوٹ

سڑک بناویں کھودیں نہر کھیت کھیت پانی کی لہر

جاسے ہو لکھوں من ناج کدھیں رہیں نا ٹھالی چھاج
جس سے کبھی بیکار

بیہے دیے دھرتی ماں گال تلے تلے پانی کی چال
پانی کے نل زمین میں گلادیے

نگڑ نگڑ ماں لائے نل جا میں آوے نرل جل
گاؤں گاؤں میں

یا ہی بدسوں جلیں چراگ نا باتی۔ نا تیل۔ نا آگ

نا کوئی دیوا بالن واڑا آپو آپو ہو اجیارا
اجالا

آپو تڑکے جاویں بجھ اچرج مانیں مجھ اور تجھ

بڑے بڑے پرجا نوں سکھ ناہیں رہے اب دھرتی دکھ
بڑے بڑے رعایا کو آرام ہیں

(مطبوعہ رسالہ معارف ۱۹۰۱ء)

مولانا حاؔلی کے مضامین میں مسدس کا دیباچہ بھی ان کے ادب و انشا کا نادر نمونہ

ہے۔ مولانا کتابوں کی طرح مضامین میں بھی انگریزی کے الفاظ لکھنے لگے تھے۔ مثلاً:-

"جو اسٹائل (۱) انھوں نے ابتدا سے اختیار کیا ہے اس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ رائٹر (۲) اور ریڈر (۳) دونوں کے لئے روز بروز زیادہ صاف اور زیادہ ہموار ہونا چاہیے۔"

(ریویو سیرۃ النعمان ۱۸۹۳ء)

'حیاتِ جاوید' اور اس کے بعد کے مضامین میں مولانا حالیؔ کا اسلوبِ تحریر اور پیرایۂ بیان بہت رواں اور پختہ ہوگیا تھا۔

(۷) مکتوباتِ حالی۔ مولانا کے خطوط ۱۹۲۵ء میں دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں، ان کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہو سکتی جو مولوی عبدالحق صاحب نے مقدمہ 'مکتوبات' میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے، اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ نہیں، بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔ اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو، جس میں ہمدردیٔ بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو، تو بتاؤ کہ اس دل کی تراوش کیسی ہوگی؟ اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنی چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔"

ایسے پاک دل کی طراوش کا ایک ذرا سا نمونہ یہ ہے:-

ا۔ مولانا اپنی پوتی (اہلیہ غلام الثقلین) کو خط لکھتے ہیں۔

تمھارا خط عین انتظار میں پہنچا۔ اس کو پڑھ کر سب کا جی بے انتہا خوش ہوا اور تمھاری پھپھی کی آنکھوں سے خوشی اور محبت کے جوش میں بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ تم نے اتنی دور جا کر اپنی محبت سب کے دل

---

(۱) اسٹائل = طرزِ تحریر

(۲) رائٹر = لکھنے والا یعنی مصنف

(۳) ریڈر = پڑھنے والا یعنی کتاب کا مطالعہ کرنے والا۔

میں بہت بڑھادی ہے۔ تمھاری دادی ہر وقت تمھاری صحت وسلامتی کی دعا کرتی رہتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہاں رہنے سے تمھاری صحت اچھی ہوجائے گی۔ کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کے آؤ کہ یہاں تمھیں کوئی پہچان نہ سکے، اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین دلاؤ کہ میں وہی...... ہوں۔

ایک خط بھائی فیاض حسین کے مکان کے پتے سے دادی بہو کے نام بھی بھیجنا اور اس میں یہ لکھنا کہ مجھے چلتے وقت آپ سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہے۔ روانگی کے دن میرا ارادہ آپ کے پاس آنے کا تھا، مگر مجھے اتنی فرصت کسی نے نہ لینے دی۔

پہلے پیراگراف کا آخری جملہ محبت، لطافت، ظرافت کا عجیب دلکش و موثر نمونہ ہے، دوسرے پیراگراف میں ازراہِ شفقت تعلیمِ اخلاق فرماتے ہیں۔ پوتی ایک بزرگ خاندان سے مل کر نہیں آئیں۔ ان کو شکایت ہوسکتی ہے اور ممکن ہے ان کو اس کا خیال بھی نہ آئے۔ مولانا رفع شکایت کی صورت بتاتے ہیں۔

ب۔ بعض خطوں میں علمی و ادبی مسائل بھی ہیں۔ ان کا نمونہ یہ مختصر خط ہے جو مولانا نے مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ) کو لکھا ہے:-

جنابِ من۔ لفظ "ہاتھ" میں بلاشبہ ہائے مخلوط ہے، لیکن رات اور بات کا قافیہ بھی شعرا نے باندھا ہے۔ قافیے کی ضرورت ایسی ایسی خفیف فروگذاشتوں کو جائز کردیتی ہے۔ مرزا غالب کبھی اور کسی کی جگہ کبھو اور کسو کو غیر فصیح سمجھتے تھے، لیکن ان کے اُردو دیوان میں قافیے کی جگہ کسو اور کبھو بندھا ہوا ہے۔ میں بھی ہمیشہ ہاتھ کو ہائے مخلوط کے ساتھ لکھتا ہوں، مگر قافیے میں ہات باندھنا جائز سمجھتا ہوں۔ زیادہ نیاز۔

خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت محلہ انصاریاں

۶ر فروری ۱۸۹۰ء

ڈاکٹر مولوی سیّد علی بلگرامی مولوی(۱) سیّد علی صاحب ۱۰ر نومبر ۱۸۵۱ء کو بلگرام کے ایک شریف و معزز خاندان میں تولد ہوئے۔ ان کے بزرگ چھٹی صدی ہجری

---

(۱) یہ حالات ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مضمون مطبوعہ "چند ہم عصر" سے لیے گئے ہیں۔

(بارھویں صدی عیسوی) میں شہر واسطہ سے جو عراق عرب میں واقع ہے ہندوستان آئے۔ اور اودھ میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے جد امجد مولوی سیّد کرم حسین (۱) گورنر جنرل کے دربار میں شاہ اودھ کے سفیر تھے۔ والد اور چچا بھی انگریزوں کی ملازمت میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے۔

ان کے والد سیّد زین الدین حسین خاں اور چچا سیّد اعظم الدین حسین خاں دونوں علومِ مشرقی کے فاضل و ماہر تھے۔ اور یہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے باقاعدہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم پائی۔ دراصل یہ خاندان مسلمانوں کے ان چند خاندانوں میں سے ہے جنھوں نے سب سے پہلے زمانے کی بدلتی ہوئی فضا کو پہچانا اور ضرورت زمانہ پر عمل کر کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا شوق پیدا کیا۔

مولوی سیّد علی صاحب اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ میجر سیّد حسین بلگرامی اور نواب عماد الملک سیّد حسین بلگرامی ان کے بڑے بھائی تھے۔ مولوی صاحب بڑے ذہین اور ہونہار تھے۔ حافظہ نہایت عمدہ تھا۔ جو بات ایک دفعہ پڑھتے یا سنتے پھر کبھی نہ بھولتے۔ پندرہ برس کی عمر تک علوم عربیہ و فارسی کی تعلیم مکمل کر لی۔ ۱۸۶۶ء میں انگریزی تعلیم شروع کی دو سال بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے اور ۱۸۷۴ء میں پٹنہ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ بی۔ اے میں آپ کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ بعد ازاں تین سال تک وہ قانون ملکی کا مطالعہ کرتے رہے اور ایک سال بعد امتحان نیٹو سول سروس میں تمام صوبے میں اول آئے۔ اس کے بعد طامسن اسکالرشپ پا کر وہ رُڑکی کے انجینئرنگ کالج میں داخل ہوئے۔ لیکن چھ مہینے بعد ہی حیدر آباد کے مشہور وزیر نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اول نے وہاں سے بلا کر اپنے پرسنل اسٹاف میں شامل کر لیا، اور جب ولایت گئے تو انھیں بھی ساتھ لیتے گئے۔ وہاں وہ شاہی مدرسہ معدنیات میں داخل ہوئے

---

(۱) سیّد کرم حسین صاحب غالبؔ کے دوست تھے۔ "چکنی ڈلی" والے قطعہ میں "صاحب" سے مراد یہی مولوی کرم حسین ہیں۔

اور دو ہی سال میں ایسوشی ایٹ کا امتحان پاس کیا اور علم طبقات الارض میں تمغہ حاصل کیا۔ اس سے قبل وہ لندن یونیورسٹی کا امتحان میٹریکولیشن بدرجہ اعلیٰ پاس کر چکے تھے۔ اس امتحان میں ان کی اختیاری زبانیں جرمن اور فرانسیسی تھیں۔

انگلینڈ سے واپسی پر انھوں نے فرانس۔ اسپین۔ جرمنی اور اٹلی کی سیاحت کی۔ اطالوی زبان اور علوم سیکھنے کے لیے کچھ عرصہ اٹلی میں قیام بھی کیا۔ حیدر آباد واپسی پر ریاست نے انھیں انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر کیا۔ کچھ عرصہ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اور ہوم سکرٹری بھی رہے۔

مولوی سیّد علی عجیب قابلیت کے آدمی تھے۔ لاطینی۔ انگریزی۔ جرمنی۔ فرانسیسی۔ عربی۔ فارسی۔ اُردو۔ سنسکرت۔ بنگالی۔ ہندی۔ تلنگی۔ مرہٹی اور گجراتی زبانوں کے ماہر تھے۔ سنسکرت نہایت عمدہ اور فصیح بولتے تھے۔ مدراس یونیورسٹی کے ایم۔ اے سنسکرت کے امتحان کے ممتحن کئی سال تک رہے۔

مولوی صاحب آخر زمانے تک معتمد تعمیرات و ریلوے و معدنیات رہے۔ ۱۸۹۱ء میں سر آسمان جاہ بہادر کے زمانہ وزارت میں بعض انقلابات سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے امتحان وکالت کی تیاری شروع کی اور باوجودیکہ امتحان میں صرف چار مہینے باقی تھے، کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان بی۔ اے میں اول نمبر پر پاس ہوئے۔ اس سے ان کی خداداد قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۸۹۳ء میں سرکار نے آپ کو ''شمس العلما'' کا خطاب عنایت کیا۔

۱۹۰۱ء میں حیدر آباد سے پنشن لے کر انگلستان چلے گئے۔ وہاں ۱۹۰۳ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے ریڈر مقرر ہوئے۔ اسی سال انڈیا آفس کے عربی، فارسی قلمی کتابوں کی فہرست مرتب کرنے پر مامور ہوئے۔ یہ نہایت مشکل کام خیال کیا جاتا تھا۔

مولوی سیّد علی صاحب مختلف علوم مشرقی و مغربی کے ماہر تھے لیکن وہ طبعاً محنت کے کاموں سے جی چراتے تھے۔ چنانچہ علمی میدان میں ان کے کارنامے بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ تقریباً سب ترجمہ ہی تک محدود ہیں۔ گو اس زمانے میں دوسری زبانوں سے ترجمہ

کرنا ہی علم وادب کی کافی خدمت تھی۔ ان کے تراجم کی فہرست حسب ذیل ہے:-

(۱) میڈیکل جورس پروڈنس یعنی اصول قانون طب (ڈاکٹر ہیر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ) سرکار نے اس پر چھ ہزار روپیہ انعام دیا۔ اس میں انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ خوب کیا ہے۔

(۲) رسالہ در تحقیق تالیف کتاب کلیلہ و دمنہ۔ اس میں مرحوم نے بڑی تحقیق سے اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ یہ کتاب اصل میں کس نے اور کہاں لکھی، اور پھر کہاں کہاں پہنچی اور ترجمے ہوئے۔ اور اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ یہ رسالہ مرحوم نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا تھا۔

(۳) فارسی کی تعلیمی قدر و قیمت بمقابلہ سنسکرت پر ایک نوٹ۔

(۴) غارہائے الورا کا گائڈ۔

(۵) حیدر آباد کے اقتصادی وطبقات ارضی معدنیات۔

(۶) تمدن عرب۔ ڈاکٹر گستاولی بان کی فرانسیسی کتاب کا اُردو ترجمہ جو ہندوستان میں بہت مقبول ہوا۔

(۷) تمدن ہند۔ یہ کتاب بھی اسی مصنف موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۸) انھوں نے موسیو سدیو کی کتاب تمدن عرب کا ترجمہ بھی فرانسیسی سے اُردو میں کیا تھا۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ اس کا ترجمہ عربی میں ہوگیا ہے تو اس کو طبع نہیں کرایا۔

مولوی سیّد علی صاحب نے 'الحقائق' نامی ایک سہ ماہی رسالہ عربی میں نکالا۔ اس رسالے میں ملک کے نامور عالموں اور ادیبوں نے اچھے اچھے مضمون لکھے۔ دوسرا قابلِ قدر کام جو مرحوم نے کیا وہ نواب سر وقار الامرا بہادر کے عہد میں ایک سررشتہ علوم وفنون کا قیام تھا۔ مرحوم خود اس کے نگران مقرر ہوئے۔ اس کا مقصد اُردو میں کتابیں تصنیف و تالیف و ترجمہ کرنا تھا۔ مولانا شبلی اس سررشتہ کے ناظم مقرر ہوئے۔ ان کی اور کئی کتابیں اسی

سلسلہ میں شائع ہوئیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ سررشتہ قائم نہ رہ سکا، گوضرورت اس کی ہنوز باقی ہے۔

مرحوم کو کتابوں کا بہت شوق تھا۔ تقریباً ہر علم وفن کی کتابیں آپ کے کتب خانے میں تھیں۔ لیکن اسلامی علوم وعلمِ ادب سے خاص شغف تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق جتنا لٹریچر ولایت میں چھپا سب انھوں نے اپنے کتب خانے کے لئے فراہم کیا۔ مولوی صاحب کو بیش قیمت اور نایاب کتابوں کے جمع کرنے کا نہایت شوق تھا۔ چنانچہ بعض نادرالوجود کتابیں بڑی کوشش سے حاصل کیں۔ الوصایا لابی حاتم السجستانی کا صرف ایک قلمی نسخہ جس پر شہاب الدین خفاجی مصنف ریحانۃ الادب وامام عبدالقادر بغدادی مصنف خزینۃ الادب کے دستخط تھے کیمبرج میں تھا۔ کتاب بوسیدہ تھی اس لیے فوٹو لیا گیا اور دس کاپیاں تیار کی گئیں۔ اور سب تقسیم ہوگئیں۔ مولوی سیّد علی نے یونیورسٹی کے پروفیسر سے جس نے اس کا عکس لیا تھا بڑی کوشش سے اس کی ذاتی لائبریری کا نسخہ حاصل کیا۔ انھوں نے جُمہرۃ اللغہ لابن دُرید جو لغت کی ایک نایاب کتاب ہے پانسو روپیہ میں خریدی۔ ایک مرتبہ حیدرآباد کے ایک معزز رئیس یہ کتاب ان سے مانگ کر لے گئے اور کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ڈیڑھ ہزار روپیہ کو فروخت کردی۔۔ سیّدعلی صاحب اس بات کو بھول گئے تھے۔ کئی سال کے بعد ایک روز معلوم ہوا کہ اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ میں ہے۔ منگا کر دیکھا تو ان کا اپنا نسخہ تھا۔ جب اس کی فروخت کا حال سنا تو نہایت رنج ہوا۔ آخر اس کی نقل اپنے لیے لے لی۔ اس کے بعد جب برلن (جرمنی) گئے تو ایک پروفیسر کو دکھائی۔ اس کو بہت پسند آئی۔ ان کو روپیہ کی ضرورت تھی۔ پندرہ ہزار روپیہ میں اس کے ہاتھ فروخت کردی۔ 'تزک بابری' کا ترکی زبان کا نسخہ انھوں نے سرسالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں دیکھا اس کو اپنے ساتھ ولایت لے گئے۔ وہاں لوگوں نے بہت پسند کیا اور گِب میموریل فنڈ کی طرف سے اس کے عکسی نسخے شائع کئے گئے۔ انھوں نے اصل کتاب مع عکسی نسخہ کے واپس کردی۔

اُن کو مطالعہ میں آسانی پیدا کرنے کی وجہ سے حاجی خلیفہ کی کتاب 'کشف الظنون' کی ترتیب بدلنے کا خیال پیدا ہوا۔ 'کشف الظنون' کی ترتیب یہ ہے کہ کل کتابوں کو حروفِ تہجی پر تقسیم کیا ہے۔ یہ چاہتے تھے کہ مصنفوں کے ناموں کو حروف تہجی پر تقسیم کیا جائے اور ہر مصنف کے ذیل میں اس کی تمام تصنیفات درج کی جائیں۔ تا کہ جس مصنف کا مطالعہ مقصود ہو اس کا تمام کارنامہ سامنے آجائے۔ اس کام کے لئے انھوں نے ایک آدمی ملازم رکھا جسے تقریباً دس برس تک پندرہ روپیہ ماہوار دیتے رہے لیکن افسوس یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

اسی طرح وہ آگسٹس فلوجل کے مرتب انڈکس قرآن میں ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ آگسٹس نے ہر سورت کے لیے ہندسوں کا نشان رکھا ہے۔ سیّد علی صاحب سورتوں کے نام لکھنا چاہتے تھے۔ یہ کام پورا ہو گیا تھا لیکن طبع کی نوبت نہیں آئی۔

مولوی سیّد علی صاحب عالموں کی بڑی قدر کرتے تھے اوران سے ملنے میں کبھی عذر نہ کرتے بلکہ اس کے درمیان میں کسی بڑے آدمی سے بھی ملنا پسند نہ کرتے۔ وہ اہل علم کے کاموں کی بھی بڑی وقعت کرتے اور کبھی تعریف و توصیف میں بخل نہ کرتے۔ مولانا حالؔی کی بڑی قدر کرتے تھے۔ جب 'حیاتِ جاوید' چھپی تو فوراً منگائی اور ختم کر کے چھوڑی۔ تمدنِ ہند کا ترجمہ کرنے سے پہلے چند صفحے 'حیاتِ جاوید' کے پڑھ لیتے پھر ترجمہ شروع کرتے۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ قرآن کو بہت پسند کرتے اور وہی ترجمہ اپنے حوالوں میں لکھتے۔

شملہ میں مولوی سیّد احمد مؤلف 'فرہنگِ آصفیہ' نے اپنی کتاب 'ارمغانِ دہلی' کے بعض حصے پیش کیے۔ مرحوم نے بہت پسند کیے اور سفارش کر کے پچاس روپیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ مولوی سیّد احمد موصوف پر ایک دفعہ کئی ہزار روپیہ کی ڈگری ہوئی۔ آپ نے فوراً روپیہ ان کے پاس بھجوا دیا۔

مولوی صاحب بڑے بامروت آدمی تھے۔ جب کبھی کسی دوست کا کام پڑتا مقدور بھر کوشش کرتے۔ اگر کوئی دوست کچھ مانگتا تو کبھی انکار نہ کرتے۔ بڑے مہمان نواز

تھے۔ عالموں کی مہماں نوازی سے ہمیشہ خوش ہوتے۔

مولوی صاحب اگرچہ شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور شیعہ تھے۔ لیکن تعصب سے بالکل بری تھے۔ وہ شیعہ سنّی جھگڑے کو پولیٹکل جھگڑا خیال کرتے تھے۔ ان کے نہایت وسیع کتب خانے میں شیعہ مذہب کی کوئی کتاب نہ تھی۔ شیعہ کتب کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ محض بیکار ہیں اور ہرگز قابلِ استدلال نہیں۔

ایک مرتبہ مولوی سیّد علی کی کیمبرج یونیورسٹی میں ایک شیعہ عالم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے پوچھا کہ ''تم حضرت عمرؓ سے کیوں عداوت رکھتے ہو۔'' ایرانی نے کہا ''ہم حضرت علیؓ کی پیروی کرتے ہیں۔'' اس پر مولوی صاحب نے کہا کہ ''حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ میں تو کوئی عداوت نہ تھی اگر ایسی عداوت ہوتی تو اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ سے کبھی نہ کرتے۔'' ایرانی نے تعجب سے پوچھا کہ ''اس واقعہ کی تصدیق کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟'' مرحوم نے اپنے کتب خانے سے تاریخ یعقوبی مصنفہ ابن واضح کاتب عباسی جو شیعہ عالم تھا لاکر دکھائی۔ ایرانی عالم اس واقعہ کو دیکھ کر تائب ہوا اور کہا اب کبھی میں حضرت عمرؓ کو برا نہ کہوں گا۔ اور تعجب کیا کہ ہمارے عالم اس واقعہ کو کیوں چھپاتے ہیں۔

جب آپ سے آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی صدارت قبول کرنے کو کہا گیا تو آپ نے انکار فرمایا اور کہا کہ میں ۱ھ ہجری کا شیعہ ہوں، اس قسم کی کانفرنس کو ہرگز پسند نہیں کرتا جب کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہے۔

مولوی صاحب صحیح بخاری اور ہدایہ کے بڑے مداح تھے اور کہتے تھے عربی سیکھنے کے لیے بہترین کتابیں ہیں۔

مولوی صاحب غیر متعصب اور وسیع المشرب تھے۔ لیکن غیرت و حمیت قومی ان میں بہت تھی۔ اور مولویوں کی جاہلانہ اور متعصب باتوں سے بڑے خفا ہوتے تھے۔ ہندوستان کے مروجہ پردے کو بھی پسند نہیں کرتے تھے اور تعدد زوجات کو بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے مزاج میں مزاح بھی بہت تھا۔ ایک مرتبہ مولوی محمد سورتی نے جو

عربی کے بڑے عالم اور قدیم کتابوں کے شوقین تھے، ان سے ایک کتاب نقل کرنے کے لیے مانگی۔ کتاب نادر تھی، دینا نہ چاہتے تھے۔ مگر مروت کے سبب سے انکار کرنا بھی مشکل تھا۔ کتاب نکال کر لائے اور مولوی سورتی صاحب کے ہاتھ میں دے دی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ مولوی صاحب یہ خیال رہے کہ کتاب تو بیشک نہایت عمدہ ہے مگر اس کی جلد سُور کے چمڑے کی ہے۔ مولوی صاحب نے یہ سنتے ہی لاحول ولاقوۃ کہہ کر کتاب وہیں میز پر پٹک دی۔

مولوی سیّد علی صاحب نے انگلستان میں ایک مدت گزاری تھی لیکن انگریزی تہذیب واخلاق کو برا سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے متعلق ان کی رائے تھی کہ انھیں روپیہ کمانا اور صرف کرنا آتا ہے۔ ان کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔

اخیر زمانے میں انھیں حیدرآباد چھوڑنا پڑا جس کا انھیں بڑا قلق تھا۔ انھوں نے ہردوئی میں سکونت اختیار کی، لیکن جب وہاں سے علی گڑھ آنے جانے لگے اور مسلم یونیورسٹی کے کاموں میں دلچسپیاں لینے لگے تو پھر ان کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ کام کا وقت اب آیا ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن مرتب کرنے میں انھوں نے بڑا حصہ لیا۔ آخر ہردوئی میں دفعتاً قلب کی حرکت بند ہوجانے سے ۳/مئی ۱۹۱۱ء (۱۳۲۹ھ) کو انتقال کیا۔ نیازمند راقم نے قرآن مجید کی آیت سے تاریخ نکالی:-

اِنَّ اَصۡحَابَ الۡجَنَّةِ الۡيَوۡمَ فِىۡ شُغُلٍ فَاكِهُوۡنَ (۱)

۱۹۱۱ء (سورہ یسین)

ادبی خدمات: مولوی سیّد علی صاحب کی قلمی خدمت صرف ترجمہ کی صورت میں ہے، اور وہ بھی صرف دو کتابوں کا شائع اور مشہور ہونا۔ 'تمدنِ عرب' اور 'تمدنِ ہند' لیکن صرف ایک تمدنِ عرب کے ترجمے نے ان کو امتیازی جگہ دلوادی۔ فرنچ مورخ وعالم لی بان کی کتاب اپنے زمانے میں بہترین مکمل و مستند تصنیف تھی۔ سیّد صاحب نے اس کا ترجمہ

---

(۱) اس آیۂ کریمہ میں قرآن کا املا اصحٰب فکھون ہے۔ میں نے دونوں جگہ الف لکھ کر اعداد نکالے ہیں۔

بھی بہت اچھا کیا، اور تمدنِ عرب کو جیسے حسنِ طباعت کے ساتھ باتصویر شائع کیا، وہ بھی "اُردو چھپائی" میں شاید پہلی چیز تھی۔ پہلی بار ۱۸۹۸ء میں طبع ہوئی۔ پچاس روپیہ فی جلد قیمت تھی۔ مصنف کی زندگی میں ہی پہلی اشاعت ختم ہوگئی، اور پھر ۲۵ برس تک دوبارہ طبع نہ ہوسکی۔ اب چند سال ہوئے سلطان العلوم نظام دکن کے "جشنِ سیمیں" (پچیس سالہ مسند نشینی) کے موقع پر شایع ہوئی ہے۔

سیّد صاحب کی جن کتابوں کا ذکر پہلے آچکا ہے، ان کے علاوہ بعض رسالوں میں انھوں نے مضامین بھی لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے ویدک لٹریچر اور فنِ طب وغیرہ کے متعلق سلسلۂ مضامین جاری رکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن طبیعت کے عدم استقلال کی وجہ سے ایک ایک دو دو مضمون لکھ کر رہ گئے۔

تصانیف مولوی سیّد علی کے نمونے ۱۔ 'تمدنِ عرب' کا مختصر نمونہ یہ ہے:۔

ہاروں رشید کے عہد میں عربوں کا تمدن جس زمانے کی تصویر ہمیں "الف لیلہ" میں نظر آتی ہے (۷۸۶ء و ۸۰۹ء) اور اس کے بیٹے ماموں کا وہ زمانہ (۸۱۳ء و ۸۳۳ء) جس میں بغداد نے اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی اور سرسبزی حاصل کی اور مشرق کے تمام شہروں میں سب سے نام آور بن گیا۔ اس وقت ہارون الرشید کا نام کُل ربع مسکون میں مشہور ہوگیا تھا۔ چین و تاتار و ہندوستان سے سفیر اس کے پاس آئے تھے اور شارل مین شہنشاہ فرانس نے بھی جو حقیقت میں تمام یورپ کا مالک تھا اور جس کا ملک بحر اٹلانٹک سے دریائے ایلپ تک وسیع تھا لیکن فی الواقع جس کی حکومت وحشیوں کی سی حکومت تھی ہارون الرشید کے پاس سفیر بھیجے اور نہایت ادب سے خواہش کی کہ زائرین بیت المقدس کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ خلیفہ نے اس درخواست کو قبول کیا اور سفیروں کو بیش بہا تحائف دے کر رخصت کیا۔ مجملہ ان تحائف کے ایک ہاتھی تھا جس کی جھول بہت ہی بیش قیمت تھی۔ اور یہ جانور اس سے پہلے کبھی یورپ میں نہیں آیا تھا۔ علاوہ اس کے موتی، جواہرات، ہاتھی دانت، لوبان اور ریشمی انواع واقسام کے کپڑے تھے اور ان سب پر مافوق ایک گھڑی تھی جو وقت بتاتی تھی اور گھنٹوں پر بجتی تھی۔ اس گھڑی نے شارل مین اور اس کے نیم وحشی مصاحبین کو جن کے ذریعے سے وہ بیچارہ بے فائدہ تمدنِ روم کی تجدید کی کوشش کر رہا تھا نہایت چکر میں ڈالا۔ اس کے دربار میں کوئی شخص بھی اس لائق نہ تھا جو

اس گھڑی کے کیل کانٹے کو سمجھ سکتا...........

ملک کا مالی انتظام نہایت ہی باقاعدہ تھا۔ آمدنی کے ذرائع حسب ذیل تھے۔ اول ذاتی اور شخصی محصول، دوم خفیف سا محصول مقبوضہ زمینوں پر، سوم چنگی کا محصول، چہارم غیر مزروعہ اراضی کا محصول، پنجم معدنیات کا محصول۔ مؤرخینِ عرب نے لکھا ہے کہ خلافت کی مجموعی سالانہ آمدنی تقریباً دس کرور روپیہ تھی جو اس زمانے کے لئے بہت ہی خطیر رقم ہے۔

اس مالگذاری کی نگرانی ایک مجلسِ وزرا کے سپرد تھی جسے دیوان کہتے تھے۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ "انتظام مال گزاری کا دیوان اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ آمدنی کی نگرانی اور بادشاہی حقوق کی حفاظت کرے اور مداخل ومخارج میں تناسب قائم رکھے اور فوج کی تعداد اور اس کی تنخواہ مقرر کرے۔ اس دیوان میں بہت ہی لائق محاسب رکھے جاتے ہیں، اور انھیں منشیانِ دیوان کہتے ہیں۔ دیوان کے لفظ کا اطلاق اس عمارت پر بھی ہے جس میں وزرا جمع ہوتے ہیں۔

ملک کا انتظام چار صیغوں میں منقسم تھا جو فی الواقع ہمارے موجودہ وزرایوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اول صیغۂ حرب، دوم صیغۂ مال گزاری جس کا کام محصولات کا قرار دینا تھا، سوم صیغۂ شخصی جو محصولات کے وصول کرنے والوں کو مقرر کیا کرتا تھا، چہارم صیغۂ انتظامی جس کا کام مداخل ومخارج کی نگرانی کرنا تھا۔ خلیفہ کے کُل احکام لکھے جاتے تھے اور اس غرض سے دفتر میں رکھے جاتے تھے کہ خلفائے مابعد ان کی طرف بآسانی رجوع کر سکیں۔ اس ساری کَل کی کنجی ایک وزیر کے ہاتھ میں رہتی تھی جو بطور مدار المہام ہوا کرتا تھا اور اکثر خلفا کُل امورات مُلکی کو اُسی کے اختیار میں چھوڑ دیا کرتے تھے۔

شہروں کی کوتوالی کا انتظام ویسی ہی عمدگی کے ساتھ تھا جیسا ڈاک اور مداخل ومخارج کا۔ تاجروں کی مجلسیں قائم کر دی گئی تھیں، جن کا فرض یہ تھا کہ معاملات تجارتی کی جانچ اور فریب و دغا کا انسداد کریں۔

خلفائے عباسیہ کے مداخل ومخارج کے انتظام نے انھیں بہت بڑے بڑے رفاہِ عام کے کام کرنے کا موقع دیا تھا۔ ملک میں سڑکیں بن گئی تھیں اور کاروان سرائیں، مساجد، شفاخانے اور مدارس ہر طرف علی الخصوص بغداد و بصرہ وموصل میں بکثرت قائم ہو گئے تھے۔

کاشتکاری اور حرفت نے بھی بڑی ترقی کی تھی۔ شیراز اور اصفہان کی شرابوں نے بڑی شہرت

حاصل کی تھی اور دور دور جاتی تھیں۔ باریک اور عمدہ کپڑوں کے کارخانے موصل اور حلب اور دمشق میں قائم تھے۔ نمک، گندھک، سنگ مرمر، لوہے اور سیسے کی کانیں بہت ہی باقاعدہ طور پر کھودی جاتی تھیں۔ اور ان کی پیداوار مصرف میں آتی تھی۔ تعلیم عام کا صیغہ بھی ایک بہت وسیع اصول پر قائم ہوا تھا۔ تمام حصۂ عالم سے مشہور فضلا اور اساتذہ بلائے گئے تھے۔ علم ہیئت کی اس درجہ ترقی ہوئی تھی کہ وہ کام جس کو یورپ کی اقوام نے بالکل زمانۂ حال میں کیا ہے اس وقت ہو چکا تھا۔ یعنی دائرۂ نصف النہار کے ایک قوس کی پیمائش کی جا چکی تھی۔ قدمائے یونان و روم کا کلام علی الخصوص وہ کلام جو فلسفہ اور ریاضیات سے متعلق تھا، ترجمہ ہو چکا تھا اور کل مدارس میں پڑھایا جاتا تھا۔ زمانۂ قدیم کی تحقیقات بھی جو یورپ میں کئی صدی بعد شروع ہوئی۔ عربوں میں عام طور سے جاری تھی۔

(۲) تمدُّنِ ہند:۔

یونانیوں کے تعلقات ہند سے ہند کے تعلقات یونانیوں کے ساتھ بلخ کی یونانی حکومتوں کے ذریعہ سے مدت تک باقی رہے۔ جیسا کہ میگستھینز کی سفارت سے ثابت ہوتا ہے۔ اس یونانی سفیر کو سلوکس نیکوٹار شام کے حاکم نے تقریباً تین سو سال قبل مسیح پاٹلی پتر کو بھیجا تھا اور یہ پہلا موقع تھا جب کہ یورپیوں نے ہند کے اندرونی حصے میں نفوذ کیا۔ اس زمانے کی تاریخ کے لئے صرف ہمارے پاس اسی یونانی سفیر کے بیانات رہ گئے ہیں، ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میگستھینز کی سفارت سے سیلوکس کی غرض یہ تھی کہ عربوں نے جو تجارت یورپ سے قائم کی ہے اس کا راستہ بدل کر پلمورہ اور انطاکیہ سے ہو کر مصر کو کر دیا جائے۔ یہ وہ تجارت تھی جس نے مصر کے خاندان بطلیموس کو دولت مند بنا دیا تھا اور آگے چل کر قاہرہ کے خلفائے اسلام نے بھی اسی تجارت کی بدولت بہت کچھ مال و دولت حاصل کیا۔ بلخ کی یونانی حکومت کے تعلقات ہندوستان کے ساتھ مدت تک قائم رہے۔ جیسا کہ ہمیں شمال و مشرق ہند کی عمارات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔

جہاز کا براہِ راست ہندوستان کو پہنچنا: ۳۰ قبلِ مسیح میں جس وقت مصر کی حکومت روما کا ایک صوبہ دار ہو گیا شہنشاہ آگسٹس نے اس خیال سے کہ عرب جو مصالح وغیرہ لاتے ہیں اور جس کو فی الواقع وہ ہند سے لایا کرتے تھے۔ خود ان کے ملک کی پیداوار ہے، ایک فوج کشی عربستان پر کی، لیکن کامیاب نہ ہوا۔ شہنشاہ کلاڈیس کے وقت میں حسب اتفاق مخالف ہواؤں نے ایک جہاز کو جزیرۂ

سیلون کے کنارے جا پھینکا اور اس وقت یہ بات معلوم ہوئی کہ بعوض کنارے کنارے جانے کے جہاز بخوبی براہِ راست ہند کو آسکتے ہیں۔ اس کے بعد رومی تجار مصر سے براہ راست گویا کیالیکٹ یا میا نگلور کو آنے لگے۔ اور پلینی لکھتا ہے کہ اس سفر میں صرف دو مہینے دس دن لگتے تھے۔ اس زمانے کے ایک تاجر نے اپنا سفرنامہ لکھا جس کا نام ایرتھرن سمندر کا پیر پلس تھا۔ یہ کتاب آرین کے پیر پلس کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور اس میں بہت سی جغرافی اطلاعات پائی جاتی ہیں۔

بطلیموس کا جغرافیہ: بطلیموس کے جغرافیہ سے ہمیں قدیم اقوام کی ان اطلاعات کا اندازہ ہوسکتا ہے جو انھوں نے ہند کے متعلق حاصل کی تھیں۔ یہ اطلاعات نہایت ہی ناقص اور زیادہ تر ساحل کے بیانات پر محدود ہیں۔

عرب اور چینی سیاح: سلطنت روما کے زمانہ انحطاط میں ہندوستان سے تعلقات اور بھی کم ہوگئے ہیں اور بالآخر جس وقت عربوں کے خلفائے راشدین کے زمانے میں سلطنت زنطیہ کو فتح کرلیا تو ان تعلقات کا خاتمہ ہوگیا۔ مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک اقوام نصاریٰ کا راستہ ہندوستان کی طرف بند رکھا۔ اور اس زمانے کے حالات ہمیں صرف عرب سیاحوں کے بیانات سے معلوم ہوتے ہیں۔ مسعودی دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا اور ابنِ بطوطہ تقریباً ۱۳۳۰ء میں لیکن ان عرب سیاحوں سے بہت پہلے بدھ مذہب کے چینی زُوّار اس ملک میں آچکے تھے اور ہوئن تسانگ کا سفرنامہ ہمارے لئے ایک بڑا ذخیرہ اس زمانے کی معلومات کا ہے۔

(۳) تاریخ عرب۔ اس کے ترجمے کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ جب سیّد صاحب کو علم ہوا کہ موسیو سدیو کی اس تاریخ کا ترجمہ عربی زبان میں ہوگیا ہے، تو انھوں نے اپنے اُردو ترجمہ کو چھپوانے کا خیال چھوڑ دیا۔ لیکن شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر اڈیٹر مخزن لاہور کی فرمائش سے رسالہ میں شائع کرنے کے لئے اپنا ترجمہ لندن سے بھیجنا شروع کیا تھا لیکن اس کی بھی تکمیل نہ ہوسکی۔

اگست ۱۹۰۷ء کے 'مخزن' سے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:-

عربوں نے اپنے آباواجداد کی قدیم رسوم ورواج کو قائم رکھا ہے۔ ان میں اوصاف اضداد جمع ہیں۔ وہ خوں خوار بھی ہیں اور غایت درجہ فرماں بردار بھی۔ وہمی ہیں اور مغرور بھی۔ اور انھیں پوچ اعتقادات

اور کہانیوں سے بے انتہا شوق ہے۔ وہ گویا سدا جوان ہیں اور جب کوئی نیا خیال ان کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے، تو ان میں بڑے بڑے کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، ایک طرف تو وہ آزاد اور فیاض ہیں، اور دوسری طرف مغلوب الغضب اور بیبا کی سے بھرے ہوئے۔ خاندان سیمیا طیقی کے گل اوصاف اور گل معائب اس ایک عرب میں موجود ہیں۔ اپنی گل مایحتاج کو مہیا کرنے کی ضرورت نے اسے پھرتیلا اور چالاک بنایا۔ ہر قسم کی تکالیف کو برداشت کرنے کی مجبوری نے اسے صبر دیا، آزادی کا وہ اس وجہ سے عاشق ہے کہ یہی ایک نعمت ہے جو اس کے حصے میں آئی ہے، اور چونکہ اسے ہر قسم کے تحکم سے نفرت ہے، اس لئے لڑ پڑنا اس کی فطرت کا جزو ہو گیا ہے۔ خود اپنے اوپر سختی کی عادت نے اسے دوسروں کے لئے بے رحم بنا دیا ہے، اور اس میں انتقام کی خواہش پیدا کر دی ہے۔

ملک اور خیالات کے متحد ہونے نے گل قوم میں ایک ہی معیار عزت و آبرو قائم کر دیا ہے۔ اس کی ساری نام آوری تلوار اور مہماں نوازی اور فصاحت ہے۔ تلوار تو اپنے حقوق حاصل کرنے کی ضمانت ہے اور مہماں نوازی ان کے لئے سارے قانونِ انسانیت کا لب لباب۔ اور تحریر اور کتاب کی جگہ پر فصاحت ان تمام باہمی نا اتفاقیوں کو ختم کرنے والی چیز ہے جس کا فیصلہ ہتھیار سے نہیں ہو سکا ہے۔

(۴) ویدک لٹریچر: سیّد صاحب کی یہ یادگار بھی شیخ عبدالقادر صاحب کی وساطت سے باقی ہے۔ یہ مضمون مولوی سیّد علی صاحب نے اڈیٹر مخزن کی استدعا پر لکھا تھا اور کیمبرج سے 'مخزن' کے لیے بھیجا تھا۔ ستمبر ۱۹۰۵ء کے پرچے سے تھوڑا سا نمونہ دیا جاتا ہے:۔

اگرچہ رگ وید کا بہت بڑا حصہ عبادت اور خدا کی ستائش سے بھرا ہوا ہے، لیکن بعض بھجن ایسے ہیں کہ جن سے تاریخی واقعات اور قدیم آریاؤں کی تمدنی حالت کا استنباط ہو سکتا ہے۔ مثلاً ندیوں کا جو بھجن ہے اس سے آریہ لوگوں کا وسط ایشیا سے بتدریج پنجاب میں آنا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح دسویں کتاب کے بھجن نمبر نوے (۹۰) میں جس کا نام پرش سوکت ہے چاروں ذاتوں کا یعنی برہمن، کھتری، ویش، شودر کا علیحدہ ہونا معلوم ہوتا ہے اسی طرح شادی اور موت کے متعلق بھجن ہیں۔ غرض جدید تحقیقات سے نتیجہ یہی پیدا ہوتا ہے کہ رگ وید نہ صرف ہندوؤں کی بلکہ طبقہ آریہ کی، جس میں ایران اور یورپ کی بہت سی اقوام شامل ہیں۔ سب سے قدیم کتاب ہے۔

رگ وید کی زبان کی نسبت ایک امر اور بھی نہایت تعجب انگیز ہے۔ یعنی یہ زبان اشد درجے میں زندوستا کی زبان سے مشابہ ہے۔ یہ اس درجے تک ہے کہ محض چند حروف کے تغیر و تبدل سے رگ وید کے بعض بھجوں کو زندوستا زبان میں اور زندوستا کے بھجوں کو قدیم سنسکرت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اور اس وقت جرمنی کے مدارس میں جہاں وید کی تعلیم اعلیٰ درجے پر ہے رگ وید اور زندوستا کا سبق ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

(۵) طلسم اعضائے انسانی: مولوی سیّد علی صاحب کا یہ مضمون پہلی مرتبہ رسالہ 'حسن' حیدر آباد میں ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر ۲۰ برس بعد ۱۹۰۷ء میں اڈیٹر 'مخزن' نے سیّد صاحب کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا۔ یہ مضمون ترجمہ نہیں بلکہ تالیف اور آزاد عبارت ہے۔ اس کا اسلوب اور زبان اس قدر خوبصورت اور دلکش ہے کہ 'تمدّن' اور 'تاریخ' کی عبارتیں اس کو نہیں پہنچتیں۔ وہاں باوجود ترجمے کی خوبی کے کہیں نہ کہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ "ترجمہ" ہے۔ لیکن یہاں ایسی اُردو ہے کہ اس سے بہتر مشکل سے لکھی جا سکتی ہے۔ سیّد صاحب فزیالوجی (خواص الاعضاء) کی پوری کتاب اسی انداز میں لکھ دیتے تو عجیب چیز نکلتی۔ نمونہ یہ ہے:-

اَلْعِلْمُ (۱) عِلْمَانِ عِلْمُ الْاَبْدَانِ وَ عِلْمُ الْاَدْیَانِ۔ اگر اس حدیث کے مضمون کو ایک لفظ میں بیان کیا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اَلْعِلْمُ عِلْمُ الْاِنْسَان کیونکہ جس طرح علم الابدان میں انسان کی صورت ظاہری اور محسوسات جسمانی سے بحث کی جاتی ہے اسی طرح علم الادیان میں انسان کے محسوسات و کیفیات روحانی سے بحث ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اولیت اور اولویّت دونوں میں علم الابدان کو علم الادیان پر فوقیت ہے، کیونکہ اول محسوسات جن کا ادراک انسان کو ہوا وہ محسوسات جسمانی ہی تھے۔ اور انھیں محسوسات کے ذریعہ سے انسان کو اس حکیم مطلق کا پتہ لگا۔ ہر ایک عضو اور ہر موبن ہمارا جس کی قدرت تامہ کا نمونہ ہے۔ اس کے بعد علم الادیان کی نیو پڑی۔ غرض علم الانسان عجیب جامع علم ہے۔ جس کے مطالعہ اور تحقیق میں تمام دنیوی و اخروی فوائد مجتمع ہو گئے ہیں۔

---

(۱) علم دو ہیں، علم طب اور علم دین (ابدان، بدن کی جمع۔ ادیان۔ دین کی جمع)

علم الانسان کے بے انتہا شعبے ہیں بلکہ ایسا کم کوئی علم ہوگا جس کو انسان سے تعلق نہ ہو، کیونکہ اکثر علوم کی بنا خود انسان کی ذاتی ضروریات کی وجہ سے پڑی ہے۔ اس تحریر میں صرف علم الحیات کے کچھ مسائل بیان کیے جائیں گے۔ جو علم الانسان کا ایک شعبہ ہے۔ علم الحیات وہ علم ہے جس میں اعضائے انسانی کے افعال سے بحث ہے اور چونکہ یہ افعال حد درجہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہیں۔ اس تحریر کا نام طلسم اعضائے انسانی رکھا گیا.........

جسم انسانی کی تشریح کرتے وقت پہلا جزو بدن جو چاقو کے نیچے آتا ہے جلد ہے۔ ظاہرا جلد ایک چیز ہے لیکن اس کی دو تہیں ہیں۔ اوپر والی تہہ سانپ کی کینچلی کی طرح ہمیشہ خشک ہو کر گرتی رہتی ہے۔ اس کو عربی میں بشرہ کہتے ہیں۔ نیچے والی تہہ جلد حقیقی ہے اور سارا حس اسی میں ہے اور اس میں سیکڑوں باریک عروق ہیں جن کو ادنیٰ سا صدمہ پہنچتے ہی خون نکل آتا ہے۔ جلد کی دونوں تہوں کی تفریق حجامت میں خوب معلوم ہوتی ہے۔ جب تک استرہ بشرہ کو چھیل رہا ہے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی، لیکن جہاں ہات ذرا بھی بہکا نیچے کی تہہ کو خبر ہو جاتی ہے، اور خون نکل آتا ہے۔ جب کبھی ہاتھ زور سے چھل جاتا ہے تو یہ دونوں تہیں الگ الگ دکھائی دینے لگتی ہیں اور حمام جانے والوں کے جسم سے جو بتیاں میل کی نکلتی ہیں وہ بھی اوپر کی کینچلی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی: ''غدر (۱) ہندی'' کے زمانے ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ علامہ محمد شبلی نعمانی کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڈھ میں وکیل تھے۔ خاندان عزت و جاہ اور علم و دینداری میں ممتاز تھا۔ علامہ نے ابتدائی تعلیم اعظم گڈھ میں مولوی شکر اللہ سے حاصل کی۔ پھر غازی پور جا کر مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی سے فیض تعلیم حاصل کیا۔ مولانا فاروق صاحب وہاں مدرسہ چشمۂ رحمت میں صدر مدرس تھے، اور علومِ عقلیہ و ادبیات عربی فارسی کے فاضل اجل تھے۔ استاد

---

(۱) یہ مادۂ تاریخ مرزا غالبؔ نے نکالا تھا۔ غدر کا سنہ ہجری ۱۲۷۳ھ نکلتا ہے۔ سنہ عیسوی کی یہ تاریخ ہے:۔

''غدر نا گاہ ہندوستان'' = ۱۸۵۷ء

کو اس شاگرد سے اس قدر انس ہوگیا کہ وہ اپنے آپ کو ''عرینِ دانش کا شیر اور شاگرد کو بچۂ شیر'' کہتے تھے اور سجع کہا تھا، اَنَا(۱) اَسَدٌ وَ اَنْتَ شِبْلِیْ۔

شوق تعلیم اور تبحر علمی: مولانا فاروق کے چشمۂ علم سے سیراب ہو کر علامہ شبلی نے تکمیل علوم کے لیے دور دراز سفر کرنے شروع کیے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ ''میں اس خصوصیت میں منفرد تھا کہ ہر فن مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصول فقہ کے لیے انہی علما کے پاس سفر کر کے گیا جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے۔'' چنانچہ غازی پور اور اعظم گڑھ میں مولانا فاروق سے منطق و فلسفہ کی تکمیل کے بعد رامپور گئے، اور مولانا ارشاد حسین صاحب مجدّدی رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں، علم فقہ میں ان کے فضل و کمال کے بڑے مداح تھے۔ رامپور سے لاہور پہنچے۔ وہاں مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری اورینٹل کالج میں ادبیات عربی کے پروفیسر تھے، اپنے زمانے کے بہترین فاضل و نقاد تھے اور عربی شاعری کے صحیح مذاق اور نکتہ سنجی میں یکتا تھے۔ علامہ شبلی نے چھ مہینے ان کی صحبت میں رہ کر ''حماسہ'' پڑھا۔ مولانا کو فرصت نہ ہوتی تو کالج کے راستے میں آتے جاتے پڑھا دیتے۔ لاہور سے سہارنپور کا سفر کیا اور مولانا احمد علی صاحب محدث سے حدیث پڑھی۔ ان کے اخلاق و سادگی طبع اور اتباع سلف کی بڑی تعریف کرتے تھے۔

علامہ شبلی نے عربی سے پہلے فارسی پڑھ لی تھی۔ اکثر فارسی میں خطوط لکھتے تھے۔ فکر رسا اور ذوق سلیم فطری رکھتے تھے۔ ابتدا سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ پھر مولانا محمد فاروق اور مولانا فیض الحسن جیسے ادیب و نقاد استاد ملے۔ ان کے اساتذہ میں یہ دونوں بزرگ شاعر بھی تھے۔ مولانا فیض الحسن بڑے صاحب ذوق، زندہ دل، بذلہ سنج، ظریف طبع تھے۔ سخن فہمی و نکتہ سنجی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اُردو تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔

---

(۱) ''میں شیر ہوں اور تو بچۂ شیر ہے۔'' شبل (بالکسر بچۂ شیر کو کہتے ہیں۔ مولانا فاروق صاحب کے فقرے میں شبلی کے معنی ہیں ''میرا بچہ۔'' اور حضرت شیخ ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے نام میں (جن کے نام پر مولانا شبلی کا نام رکھا گیا تھا) شبل ان کے وطن آبائی موضع شبلہ سے منسوب ہے۔

قصائد عربی شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو میں غزلوں اور نعتیہ قصائد(۱) کے علاوہ ایک مثنوی ''صبح عید''(۲) اپنے زمانۂ شباب میں لکھی تھی۔ ''شرح حماسہ''، ''تحفۂ صدیقیہ''، ''روضۃ الفیض'' ان کے علم و فضل کی یادگاریں ہیں۔ ۱۸۸۷ء (۱۳۰۴یا۵ھ) میں وفات پائی۔ لائق شاگرد شبلی نے مرثیہ کہا جس کے دو تین شعر یہ ہیں:-

---

(۱) مولانا فیض الحسن صاحب کے ایک قصیدۂ نعتیہ کے دو تین شعر مجھے زبانی یاد ہیں۔ وہی نمونے کے لیے لکھتا ہوں۔ پورا قصیدہ میرے پاس نہیں ہے۔ مولانا نے شہیدیؔ کے مشہور قصیدے کی زمین میں قافیہ بدل کر کہا ہے:-

تمنا ہے کہ اک اک بال کی سو سو بلائیں لوں جو نقشہ ہاتھ آجائے تری زلفِ معنبر کا

تمنا ہے کہ کانٹوں پر ترے صحرا کے جا لوٹوں رگِ مجنوں کو پھر سودا ہوا ہے نوکِ نشتر کا

یہ جوشِ بیقراری ہے کہ مرغِ نیم بسمل بھی یہ کہتا ہے چلو دیکھیں تماشا فیضِ مضطر کا

(۲) مثنوی ''صبح عید'' مولانا فیض الحسن صاحب کی وفات کے بعد ۱۸۹۲ء میں لاہور میں چھپی ہے۔ تقریباً ۲۰۰ شعر ہیں۔ ایک داستانِ عشق نظم کی ہے۔ قصہ کچھ نہیں، لیکن نظم کے اکثر حصے بہت لطیف ہیں۔ ایک بھولی ہوئی چیز کی یاد باقی رکھنے کے لیے چند شعر درج کیے جاتے ہیں:-

مثنوی کو ''تعریف عشق'' سے شروع کرتے ہیں۔

عشق کیا اک بلا ہے آفت ہے شور ہنگامۂ قیامت ہے

یہ کسی جی کو جیتے جی نہ لگے دوست کیا دشمنوں کو بھی نہ لگے

عشق عاشق ہے اپنی چالوں کا اس کو کیا درد پائمالوں کا

دیکھ کر عشق کے نئے دھندے جی چراتے ہیں چین کے بندے

اس کا مصداق ہے یہ افسانہ جس کا سامع ہو سن کے دیوانہ

کیوں نہ ہو یہ مری زبانی ہے گو یہ خود ہی غضب کہانی ہے

درد یاں اوڑھنا بچھونا ہے گریہ یاں قسمتوں کا رونا ہے

یاں زباں ہے زبانۂ آتش حرفِ رنگیں ہے شعلۂ سرکش

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

بہ تحسین صبوری چند بفریبی مرا ناصح، دمے بگذار، تا در ماتمِ فیض الحسن گریم
بمرگش علم وفن در نالہ بامن ہم نوا باشد ہنر برخویشتن گرید، چومن بےخویشتم گریم
دوتا غم دارم وہریک ز دیگر حسرت افزاتر بمرگش گریم و آنگاہ بر مرگ سخن گریم

اسی کم عمری اور نوجوانی کے زمانے میں ان بزرگوں کی صحبت نے علامہ شبلی کے اندر وہ ذوق

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ننگ و ناموس کو سیاہ کرے زہد و سالوس کو تباہ کرے
مختصر یہ کہ ہے یہ وہ چوکھٹ گھر کے گھر ہو گئے جہاں چوپٹ
درد ہے پر دوا ہے دردوں کی عشق ملت ہے شیر مردوں کی
عشق ہے اک بلائے شور انگیز خانماں سوزد خانہ برہم ریز
گرم ہوں شورشوں کے ہنگامے چاک ہوں جیب کی طرح جامے
میں ہوں اک سینہ ریش تفتہ دروں سر سبز جوش عشق و شور جنوں
دل یہاں درد کا ٹھکانہ ہے سینہ یاں نشتروں کا خانہ ہے
ہیں یہ سب درد کی کراماتیں ورنہ کس کو نصیب یہ باتیں

داستان کے چند شعر یہ ہیں:-

یہی دوچار رہ گئے باقی شیشہ و جام و مطرب و ساقی
ہو گیا حسن تازہ محو ظہور بام و در سے لگا برسنے نور
یاں تو بیٹھے نظارے دامن کھول واں گلوں کو دہش نہ مول نہ تول
ایک تو سب کے پھول سے بر دوش اس پہ پھولوں کی مار تا بُن گوش
کہ یکایک بتانِ گل رخسار آگئے سامنے سے مثلِ بہار
روشنی سے ہوئی نظر خیرہ نور سے ہوگیا مکاں تیرہ
گورے گورے وہ پھول سے چہرے پھول کانوں کے، پھول کے سہرے
بسکہ اپنی بہار پاتے تھے پھول پھولے نہیں سماتے تھے

اور وہ نظر پیدا کر دی جس نے ان کو اپنے زمانے کا بہترین نقاد و سخن سنج بنا دیا۔

سفرِ حجاز: علامہ شبلی کی ۱۹ برس کی عمر تھی کہ ۱۸۷۶ء میں انھوں نے اپنے بعض اعزہ کے ساتھ حرمین شریفین کا سفر کیا۔ حج کے بعد مدینۂ طیبہ میں حاضر ہوئے اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ نعتیہ قصیدہ کہا۔ مدینہ منورہ میں کتب خانوں کی سیر کی۔ فرماتے تھے کہ فنون حدیث کا جو سامان وہاں نظر آیا پھر کہیں نہ دیکھا۔

شوقِ شعر و ادب اور شغف مذہبی: مولانا کی طالبعلمی کا زمانہ سفرِ حجاز کے ساتھ ختم ہو گیا۔ وہاں سے آ کر کتب بینی اور شعر و ادب کا شغل شروع کر دیا۔ لکھنؤ کا مشہور ظریف اخبار 'اودھ پنچ' اور طرحی غزلوں کا ماہوار گلدستہ 'پیامِ یار' جاری تھا۔ مولانا بڑے شوق سے ان کا مطالعہ کرتے اور خود بھی غزلیں کہتے تھے۔ مشاعرے منعقد کرتے تھے۔

مولانا کا دوسرا محبوب شغل غیر مقلدوں کی تردید تھی۔ حقیقت کا رنگ غالب تھا۔ ان کا قول تھا کہ "آدمی عیسائی ہو سکتا ہے، لیکن غیر مقلد نہیں ہو سکتا۔" اس موضوع کے چند رسالے لکھے، جن میں سے عربی کا رسالہ "اسکات المعتدی" ہندوستان سے باہر بھی مقبول ہوا۔ جب مولانا سفر شام و عراق کے لیے گئے تو وہاں کے ایک عالم نے اسکات المعتدی کے مصنف کی مولانا شبلی کے سامنے تعریف کی۔ اس کو خبر نہ تھی کہ وہ مصنف یہی ہیں۔ مولانا کو اس تحسین سخن شناس سے بڑی مسرت ہوئی۔

اس زمانے میں علامہ شبلی مذہب کے نہایت پابند تھے۔ درس و تدریس کا شغل بھی جاری تھا۔ شاگردوں کو نماز کی سخت تاکید کرتے تھے۔ بعض اوقات شاگردوں کو نماز نہ پڑھنے پر اور پابندی کا وعدہ لینے کے لیے دو دو گھنٹے مارا ہے۔

وکالت اور ملازمت: علامہ شبلی کے والد اور استاد مولانا فاروق صاحب وکیل تھے۔ والد نے ان سے بھی امتحان وکالت پاس کرنے کا اصرار کیا۔ علامہ بالطبع ادھر متوجہ نہ تھے، کہنے سننے سے امتحان پاس کیا اور وکالت شروع کی۔ لیکن ابتدا ہی سے اس پیشے کے کذب و افترا سے بد دل ہو گئے۔ اس زمانے کا ایک لطیفہ ہے کہ علامہ کے والد کے پاس کوئی ٹھاکر موکل آیا اس نے اپنی لڑکی کی شادی کم سنی میں کر دی تھی۔ داماد جوان ہو کر خسر کو

پسند نہ آیا۔ اُدھر رخصتی کا تقاضا ہوا، اِدھر سے انکار کیا گیا۔ شوہر نے مقدمہ دائر کر دیا۔ ٹھاکر نے جواب دہی کے لیے علامہ شبلی کے والد کو وکیل کیا۔ انھوں نے ان سے کہا کہ اس کی جوابدہی لکھ دو۔ مولانا ٹھاکر سے قصہ سن کر بولے کہ جب تم اقرار کرتے ہو کہ لڑکی اس سے بیاہی جا چکی ہے تو اب کیا ہوسکتا ہے، جاؤ لڑکی کو رخصت کر دو۔ وہ ہنستا وکیل صاحب کے پاس آیا۔ انھوں نے صاحبزادے سے فرمایا کہ بس آپ وکیل بن چکے۔ آخر انھوں نے خود مقدمہ لڑایا اور جیتا۔

علامہ شبلی نے بالآخر وکالت ترک کر دی۔ اور ''امین دیوانی'' کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہ دورہ کا کام تھا۔ علامہ شدید گرمی میں روزہ کی حالت میں گھوڑے پر سوار گاؤں گاؤں پھرتے تھے۔ آخر یہ کام بھی مزاج کے موافق نہ نکلا۔ چھوڑ کر گھر بیٹھ رہے، اور مضمون نگاری اور شاعری پھر شروع کر دی۔

علی گڈھ کالج کی پروفیسری: علامہ کے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم علی گڈھ میں پڑھتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں یہ بھی وہاں گئے۔ سر سیّد سے ملے، باہم مبادلۂ خیال ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے۔ اتفاق سے وہاں پروفیسری خالی تھی۔ علامہ شبلی نے اپنے استاد مولانا فیض الحسن کی سفارش سے درخواست دے دی۔ سر سیّد نے فوراً چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ پر ان کو رکھ لیا۔ اس زمانے کا ذکر مولوی عبدالحلیم لکھنوی اپنے ایک مضمون (۱) میں لکھتے ہیں:۔

> علی گڈھ میں سیّد صاحب نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی، جو سب سے الگ بالکل باہمہ اور بے ہمہ تھا، اور ایک خاموش مقام تھا۔ ان میں جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھ

---

(۱) ''سیر المصنفین'' میں مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا نے علامہ شبلی کے حالات کے متعلق تین صاحبوں کی تحریریں نقل کی ہیں، مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی، خواجہ غلام الثقلین اور مولوی عبدالحلیم شرر کی۔ ہم سیرت مولانا کے مختلف عنوانوں میں ان تحریروں کے اقتباسات مختصر طور پر نقل کرتے ہیں۔ مولانا کے باقی حالات میں بھی ''سیر المصنفین'' سے مدد لی گئی ہے۔

کر سید صاحب نے ان سے ربط وضبط بڑھایا، اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلا ناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی۔ سید صاحب ہمیشہ اعتقادی وکلامی مسائل اور مورخانہ تحقیق کے غور وخوض میں رہتے اور تحقیق وتدقیق کے لیے انھیں اکثر حدیث وفقہ وتاریخ وسیر کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کو انھوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا اور مولانا شبلی نے اس کام کو ایسی خوبی وقابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعتِ نظر کے مولانا شبلی قائل ہوتے جاتے تھے، اس سے زیادہ سید صاحب ان کی تلاش اور جستجو اور جلب روایات کے معتقد ومعترف ہو گئے تھے۔

مولانا، سرسیّد صاحب کا کتب خانہ دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ مصر ویورپ کی تمام جدید وقدیم مطبوعات الماریوں میں بالترتیب جمی ہوئی تھیں۔ مولانا کئی کئی گھنٹے الماریوں کے پاس کھڑے رہتے اور کبھی تھک کر انھیں الماریوں کے پاس زمین پر بیٹھ جاتے۔ کالج کے زمانۂ قیام میں مولانا نے ایک مضمون ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' لکھا۔ یہ بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے قومی نظمیں لکھیں، اور 'المامون'، 'الجزیہ'، 'سیرۃ النعمان' تالیف کیں۔ پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور ان کو فارسی پڑھائی۔

مولانا کا سفر روم ومصر وشام: ۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے مسٹر آرنلڈ پروفیسر علی گڈھ کالج کے ساتھ قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ جدید اسلامی ہندوستان کا یہ پہلا علمی سفر تھا۔ چنانچہ خود ایک قصیدہ فارسی میں لکھتے ہیں:-

بہر تکمیل فن و ہم پے تحصیل عبر — روزگاریست کہ میداشتم آہنگ سفر
فارغ از حج وزیارت چو مرا کرد خدائے — خواشتم تا بسوے روم شوم راہ سپر
آرنلڈ آں کہ رفیق است وہم استاد مرا — ہم دریں عرصہ بہ انگلینڈ ہمی خواست سفر
گفتم ایں صحبت وایں واقعہ نادر افتد — پس بعزم سفر از جائے بجستم مضطر

چھ مہینے بلاد اسلامیہ کی سیاحت کی۔ علماء وفضلاء سے ملے۔ کتب خانے دیکھے۔ اپنی زیرِ تجویز تالیف 'الفاروق' کے لیے بھی مواد تلاش کیا، لیکن کچھ نہ ملا۔ واپس آکر سفرنامہ مرتب وشائع کیا۔

علی گڈھ کے بعد: سرسیّد کی وفات کے بعد علامہ شبلی نے استعفا دے دیا، اور ۱۸۹۸ء سے اعظم گڈھ میں قیام کیا۔ یہاں نیشنل اسکول قائم کیا، اس کی ترقی کی کوشش کی۔ 'الفاروق' مرتب کر رہے تھے کہ کشمیر جانا ہوا۔ وہاں علیل ہو گئے اور کئی مہینے علالت کا سلسلہ

رہا۔ سخت علالت کی حالت میں 'الفاروق' کی آخری سطریں لکھیں۔ اسی زمانے میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس کے بعد صحت ہوئی تو مولوی سیّد علی بلگرامی نے ان کو حیدر آباد بلالیا اور ''نظامت علوم وفنون'' کا عہدہ دلوایا۔ اس زمانے میں الغزالی، سوانح مولانا روم، علم الکلام، الکلام اور موازنۂ انیس و دبیر تالیف کر کے شائع کیں۔ سیّد علی صاحب نے ایک محکمہ تصنیف و تالیف قائم کیا تھا، اس کی کتابیں ''سلسلۂ آصفیہ'' کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ مولانا شبلی کی بعض کتابیں بھی اسی سلسلے میں چھپیں۔ حیدر آباد میں مولانا کا مشاہرہ ماہوار تین سو روپیہ تھا۔ چار سال وہاں رہے۔

ندوۃ العلما سے تعلق: بعض اہل الرائے ذی علم بزرگوں نے ۱۸۹۴ء ﴿۱۳۱۱ھ﴾ میں علماء کی ایک انجمن ''ندوۃ العلماء'' کے نام سے قائم کی تھی۔ اس جماعت کا مقصد یہ تھا کہ عربی مدارس کے نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی جائے، عام مسلمانوں کی صلاح کے لیے تدابیر اختیار کی جائیں، علمائے ہند کے باہمی اختلاف و نزاع کو رفع کیا جائے، اور ایک ایسا دارالعلوم قائم کیا جائے جس میں علوم قدیمہ کے علاوہ فنونِ جدیدہ اور صنعت و حرفت کی بھی تعلیم دی جائے۔ سب سے پہلے مولوی عبدالغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر نے (جو بعد کو مدارالمہام ریاست رامپور ہوگئے تھے) یہ تجویز پیش کی۔ اکثر علماء نے تائید کی اور مولانا سیّد محمد علی صاحب کانپوری (خلیفہ حضرت فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ) کے مبارک ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی گئی۔ مختلف شہروں میں ہر سال اس کے جلسے ہوتے تھے۔ مولانا عبدالحق صاحب دہلوی مولف 'تفسیر حقانی' اور مولانا شبلی نے اس کے قواعد مرتب کیے۔ ۱۸۹۸ء میں مولانا شبلی کی رائے کے مطابق ایک مدرسہ بھی جاری کر دیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی رہی۔ کتب خانہ بھی اس کے ساتھ قائم ہوگیا۔ اس کے ناظم اول مولوی سیّد محمد علی صاحب تھے۔

علامہ شبلی علی گڈھ سے قطع تعلق کرنے کے بعد ندوۃ العلماء سے خاص دلچسپی لینے اور اس کی خدمت کرنے لگے تھے۔ مولوی سیّد محمد علی صاحب کی وفات کے بعد حیدر آباد سے آکر اس کے ناظم ہوگئے۔ ندوہ کی حالت اس زمانے میں نہایت سقیم تھی۔ گورنمنٹ بد گمان تھی۔ ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو چلا۔ مولانا نے ایسی سخت محنت اور ایسی اعلیٰ خدمت کی

کہ ندوہ کو ازسرِ نو زندہ کر دیا۔ لیکن علماء مولانا کے مذہبی خیالات وعقائد سے مطمئن نہ تھے۔ ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔ آخر ان کو بددل ہو کر ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے دست کش ہونا پڑا۔ مولانا شرر لکھنوی اسی مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"میں نے بارہا ان کو اس خیال سے روکا، اور اسی زمانے میں ان سے کہہ دیا تھا کہ علماء بس میں آنے والے نہیں ہیں۔ ان مرحومینِ امت میں سے ہر ایک پریسیڈنٹ کی حیثیت رکھتا ہے، اور جس زمانے میں فقط پریسیڈنٹ ہی پریسیڈنٹ ہوں، اس پر آیہ کریمہ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۱) پوری پوری صادق آتی ہے۔ ان کے بہت سے دوستوں نے بھی روکا اور کہا کہ آپ کی ترقی کا میدان علی گڈھ کالج ہی ہے، مگر انھوں نے نہ مانا اور نتیجہ یہ ہوا کہ گو انھوں نے ندوہ کو بیحد فائدہ پہنچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا، مگر آخر میں ندوہ والے مرحومینِ امت ہی کے ہاتھ سے مار کھا گئے، جن کا ان کے دوستوں کو بیحد ملال ہوا۔ اور وہ بھی اپنی اس محنت کے اکارت جانے پر کفِ افسوس ملتے ہوئے مرے۔"

ایک الم ناک حادثہ: نظامتِ ندوہ کے زمانے میں اتفاقیہ بندوق چل جانے سے علامہ شبلی کا پاؤں زخمی ہو گیا۔ اور ڈاکٹروں کو ٹانگ کاٹنی پڑی۔ اس کے متعلق وہ خود 'شعر العجم' (حصہ اول) کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

جب موازنہ سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوا، اور فردوسی کے حال تک پہونچایا ۱۷رمئی ۱۹۰۷ء کو صدمۂ پا کا واقعہ پیش آیا۔ یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا۔ یہ بھی فردوسی کی کرامت تھی کہ واقعہ سے ذرا پہلے شاہنامہ کا یہ مصرع "دریدہ و بریدہ شکست و بہ بست۔" قلم کی زبان پر تھا۔

اس حادثہ پر تمام ملک میں افسوس کیا گیا۔ لیکن خود انھوں نے اس تکلیف کو بڑے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا۔ ۱۵رجولائی کو مولانا اپنے خط میں شیخ عبدالقادر صاحب اڈیٹر 'مخزن' لاہور کو لکھتے ہیں:۔"اب تک ہاتھ پر قابو نہیں۔ خط سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک غزل (۱) حاضر ہے، لیکن اپریل ۱۹۰۷ء کی ہے۔ ورنہ آج کل یہ خیالات کہاں۔" اس پر ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "ہم مولانا کی ہمت واستقلال کی داد دیتے ہیں کہ ایسے جراحی عمل کے بعد اتنی جلدی انھوں نے علمی مشاغل کی

---

(۱) اگر آسمان اور زمین میں ایک اللہ کے سوا دو خدا ہوتے تو دنیا تباہ ہو جاتی۔

طرف رجوع کیا، اور تمام زمانہ علالت میں ماتھے پر بل نہیں آنے دیا۔"

علامہ شبلی نے اس حادثہ کے متعلق ایک شعر عجیب دلگداز کہا تھا۔

شبلی نا مہ سیہ را بجزاے عملش

پا برید ند وندا خاست کہ سرمی بایست

مولف احقر نے مولانا روم کے مشہور شعر میں ترمیم وتعمیہ کے ساتھ اس واقعہ کی تاریخ کہی:-

یافتم در شعر رومی حال آں از سر الہام(۱) گفتم سال آں

پاے استدلالیاں چوبیں بود پاے(۲)چوبیں پاے بے تمکیں بود

۶۸۳ ۶۴۱ =۱۳۲۴+۱=۱۳۲۵ھ

دارالمصنفین: ترک ندوۃ العلماء کے بعد سے لکھنؤ سے اعظم گڈھ آگئے اور وہاں ایک ادارۂ علمی دارالمصنفین کے نام سے قائم کیا۔ اور اس کے لیے اپنا باغ، مکان کتب خانہ وقف کر دیا۔ افسوس کہ مولانا شبلی اس کی تکمیل وترقی نہ دیکھ سکے۔ ہندوستان میں تالیف واشاعت کے بہت بڑے بڑے ادارے جاری ہیں، اور اپنی اپنی جگہ سب نہایت اعلیٰ پیمانے پر علم وادب اور ملک وقوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ لیکن یہ خصوصیت صرف 'دارالمصنفین' کو حاصل ہے کہ وہ اسلام واسلامیات کا علم بردار ہے۔ "اسلامی کلچر" کا

---

(۱) یہ علامہ شبلی کی طبعی زندہ دلی تھی کہ اس کرب واذیت کی حالت میں جو غزل اشاعت کے لیے ارسال فرمائی وہ نہایت رنگین ہے۔ ۷ شعر کی غزل ہے۔ چار یہ ہیں:-

من کہ در سینہ دلے دارم وشیدا چکنم؟ میل با لالہ رخاں گر نکنم تا چکنم؟

ہست چل سال ۴۰ کہ بیہودہ نگہ داشتمش گر نہ بر سنگ زنم شیشۂ تقویٰ چکنم؟

مایۂ تقوی سی سالہ ۳۰ فراہم شدہ است ارمغانش بہ نگارے بدہم؟ یا چکنم؟

شاہد بادہ وطرب چمن و جوش بہار شبلیا خود تو بفرما کہ بایںہا چکنم؟

(از مخزن لاہور، بابت جولائی ۱۹۰۷ء)

(۲) اصل مصرع یہ ہے:-"پاے چوبیں سخت بے تمکیں بود"

اتنا عظیم الشان لٹریچر کوئی جماعت پیدا نہیں کر سکی۔ یہ بھی علامہ شبلی کی نیک نیتی کا ثمرہ ہے کہ ان کو علامہ سیّد سلیمان ندوی اور ان کے رفقاء جیسے جانشین مل گئے، جن کے قلب میں علامہ شبلی کو ایک زندگی کھو کر کئی زندگیاں مل گئیں۔

آخری تصنیف اور وفات: 'شعر العجم' کے بعد علامہ شبلی نے 'سیرۃ النبیؐ' کا عظیم الشان کام شروع کیا۔ یہ کام اتنا بڑا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اسی میں زندگی ختم ہونی ہے۔ چنانچہ خود فرمایا تھا:-

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی ۔۔۔ مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبرؐ خاتم ۔۔۔ خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ایک جلد مکمل اور دوسری نامکمل چھوڑ کر ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء ﴿۲۸ر ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ﴾ کو رہگزائے ملک بقا ہوئے۔ ۵۷ سال کی عمر پائی۔ راقم احقر نے قرآن مجید سے تاریخ نکالی:-

"تاریخ از کلام ایزد" لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ جَنَّةُ (۱) عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا
۱۳۳۲ھ ۔۔۔ ۱۹۱۴ء ۔۔۔ (سورہ نحل۔ رکوع ۴)

علامہ شبلی کے اخلاق و عادات: علامہ شبلی کے مزاج و عادت کے متعلق بہترین بیان مولوی عبد الرحمان خاں صاحب شروانی کا ہے۔ ہم اس کا اقتباس درج کرتے ہیں:-

> میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم سچے اور بااخلاق دوست تھے۔ اس زمانے کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریوں سے پاک اور صاف تھے۔ ان کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا۔ نظر میں بلندی تھی، مزاج میں استغناء، حوصلے میں عزم تھا، مزاج میں نفاست تھی۔ دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں۔ لیکن دوستوں کی مروّت کبھی ان کو رسمی تملق و چاپلوسی پر آمادہ نہیں کرتی تھی۔ عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے۔ مخالفین کی مخالفت سے روبرو نہیں رکتے تھے مگر ان کے پس پشت بیانِ اختلاف میں بھی ان کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی

---

(۱) قرآن مجید کا املا جنّتُ ہے۔ میں نے ۵ عدد لینے کے لیے ۃ لکھ دی ہے۔

پر دلالت کرتے۔ مخالف کی رائے کی تردید سختی کے ساتھ کرتے تھے، اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار کرتے۔ باوجود اس کے یہ کبھی نہ ہوتا تھا کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کر کے اس کو ذلیل ورسوا کرتے۔

صحبت نہایت پاکیزہ اور شگفتہ تھی۔ انسان خواہ کسی درجہ کا ہو ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ جس مسئلے پر گفتگو کرتے ان کے کمال کی خوبیاں نظر آتی تھیں۔ عقلی پیرایہ، مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی ان کے بیان کی رفیق و ہمدم تھی۔ جب کبھی کسی علمی مسئلے پر گفتگو ہوئی بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کیے۔ فضول باتیں میں نے ان سے کبھی نہیں سنیں۔

اعزہ کے ساتھ بہت الفت تھی۔ اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسوں دلگیری کے ساتھ کیا۔ دوسرے بھائی کی موت تو ان کی جان ہی لے گئی۔ احساس بہت شدید تھا۔ اس لیے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کے زمانے میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے۔ ایک روز ایک نیم مُردہ بھڑ نے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا۔ اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھ کو حیرت ہو گئی۔ اس قدر زمانہ گزرنے پر آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے۔ یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا۔ ہر ذوق میں شدت چاہتے تھے۔ نمک تیز کھاتے تھے۔ دستر خوان پر نمک رکھ لیتے اور کھانے میں ڈالتے جاتے۔ شیرینی بھی گلوسوز مرغوب تھی۔ یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھا ہوا ہے۔ باتیں کرتے جاتے ہیں اور قند کے دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں۔ وہ قند سے اور سامع ان کے کلام سے شیریں کام رہے۔

سخنہائے شیریں بہ از قند ہست

ایک مرتبہ جلسۂ ندوۃ العلماء کے سلسلے میں بریلی ان کا میرا ساتھ ہوا۔ اس زمانے میں تندرست تھے۔ قریباً ہر اسٹیشن پر شیرینی خریدی اور چکھی بلکہ کھائی۔ محض شیریں ہونا کافی تھا۔ اس کے حسن و قبح سے بحث نہ تھی۔ پانی تیز سرد پیتے تھے۔ جاڑوں میں بھی یہی ہوتا۔ اسی کے ساتھ سردی اور گرمی بہت محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے متعدد رضائیاں اوڑھیں تسلی نہ ہوئی۔ دوسرے روز خاص اہتمام سے لحاف خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا۔ گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے۔ اس سلسلے میں بمبئی کے سفر شعر و سخن کے لئے یادگار رہیں گے۔ چائے سادہ

اور کڑی پیتے تھے۔ صبح کو نماز کے اول وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے۔ عادت میں سادگی تھی، لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے۔ غذا بہت کم کھاتے تھے۔ آخر میں اس کی قلت سے حیرت ہوتی تھی۔

(اقتباس مضمون مولانا شروانی منقول از سیر المصنفین)

مولوی عبدالحلیم شرؔر علامہ شبلی کے خصائص طبع کے متعلق لکھتے ہیں:۔

''ان میں باوجود انتہا درجے کے اخلاق کے، خودداری کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا۔ سیّد صاحب کی صحبت، علی گڈھ کالج کی مرجعیت، اور ان کی ذاتی قابلیت نے انھیں ابتداً اس حیثیت سے پبلک میں متعارف کرایا کہ سیّد صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ خصوصاً جب وہ سیّد صاحب کے ہمراہ حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی ہوگئی۔ مگر خود مولانا شبلی کی خودداری (کو ٹھیس لگی) اس حیثیت کو اور اپنی تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا سکتے تھے، جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے، لیکن اب اس بات کو ناقابل برداشت دیکھ کے، علی گڈھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے، ندوہ میں شرکت کی، اور سمجھے کہ اس ذریعے سے علماء کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے، اس درجہ پر پہنچ جاؤں گا جو سیّد صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے۔''

خود علامہ شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''جب راجہ کشن پرشاد وزیر ہوئے اور حسب دستور نذر دینے گیا تو ان کے اے ڈی کانگ نے کہا کہ آپ نے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہوگا۔ میں نے کہا یہ اوروں کا پیشہ ہے۔ میں یہ کام نہیں کرتا۔ اس پر رد و بدل ہوئی۔ اور میں نے ناگواری کے ساتھ جواب دیا کہ میں کسی کی مدح نہیں کرتا۔''

(مورخہ ۲۳ر ستمبر ۱۹۱۲ء از سیر المصنفین)

علامہ شبلی کے مذہبی خیالات: پہلے لکھا گیا ہے کہ علامہ شبلی بڑے سخت حنفی، مقلد اور پابند شرع تھے۔ ان کے خیالات میں جو انقلاب جس طرح ہوا اس کو ہم مولوی عبد الحلیم شرؔر لکھنوی کی زبانی بیان کرتے ہیں:۔

''اس موقع پر ان کے خیالات کے متعلق ایک نازک انقلاب کا بیان کر دینا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا کہ سرسیّد دراصل غیر مقلد اور اہلِ حدیث کے گروہ میں تھے۔ لیکن مسائل کلامی اور انگریزی اثر نے غیر مقلد سے ایک بڑی حد تک انھیں معتزلی بنا دیا تھا۔ سیّد صاحب کی صحبت کا مولانا شبلی پر کوئی اثر نہ ہونا

غیر ممکن تھا، مگر اہل حدیث کی طرف سے ان کے دل میں جو بھڑک تھی وہ بھی ممکن نہ تھا کہ انھیں نعمانیت اور حنفیت کے دائرے سے باہر نکلنے دیتی۔ لہٰذا بغیر اس کے کہ غیر مقلدی کا کچھ بھی رنگ چڑھنے پائے، وہ بلا واسطہ نعمانی سے معتزلی بننے لگے، اور آخر میں اس بات کی کوشش شروع کی کہ خود حنفیت کو اصلی اعتزال ثابت کریں، اور بخلاف متاخرین حنفیہ کے حنفیت کو اشعری کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں، انھوں نے اپنی حنفیت کو اشعریت کا سخت دشمن اور فقہ کے پردے میں چھپی ہوئی معتزلیت ثابت کرنا چاہا، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی طلبہ ان کی باتوں سے خوش ہو ہو کر دینداری اور خوش اعتقادی کے دھوکے میں معتزلی ہونے لگے اور موجودہ علمائے حنفیہ سے ان کو سخت عناد ہو گیا.................. اسی جوش کا تقاضا یہ بھی تھا کہ امام صاحب کی سوانح عمری انھوں نے سیرۃ النعمان لکھی تو امام المحدثین محمد بن اسمٰعیل بخاری پر جا بجا حملے کیے، اور علی العموم گروہ محدثین کے اصول سے اختلاف کیا کرتے۔ یہاں تک کہ امام ابو الحسن اشعری بھی محض اتباع حدیث کے باعث ان کے مورد سہام بن گئے۔"(۱)

خواجہ غلام الثقلین صاحب اپنے مضمون میں علامہ شبلی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

انسانوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو مذہبی تخیلات رکھتے ہیں، دوسرے وہ جو مذہب سے بالکل بیگانہ و بے پروا رہتے ہیں، اور ایک آزاد دماغ رکھتے ہیں۔ تیسرے وہ جن کے دماغ میں مذہب و آزادی مرکب صورت میں پائی جاتی ہے۔ اس گروہ کی دو شاخیں ہیں۔ اول جن میں مذہب غالب ہے، دوم وہ جن میں آزادی، قومیت اور مدنیت کا خیال مذہب پر غالب ہے۔ میرے خیال میں مولانا شبلی کا شمار آخری گروہ میں ہے۔

سیاسی خیالات اور قومی خدمات: علامہ شبلی مذہب کی طرح سیاست میں بھی آزاد خیال اور دلیر طبع تھے۔ سر سیّد کے سیاسی خیالات کو دور اندیشی اور فلاح ملکی کے منافی سمجھتے تھے۔ خواجہ غلام الثقلین صاحب مندرجہ بالا فقروں کے بعد لکھتے ہیں:۔

لیکن وہ آزاد خیالی مذہب ہی کے دائرے میں محدود نہ رکھتے تھے، بلکہ اس کو پالیٹکس تک پہنچاتے تھے۔ چنانچہ آخر عمر میں انھوں نے اپنے پولیٹکل خیالات کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ سر سیّد احمد خاں مرحوم مذہب

---

(۱) اصل مضمون میں یہ دونوں عبارتیں مقدم و مؤخر ہیں۔ یہ ترتیب ہم نے قائم کر دی ہے۔

میں کچھ کم آزاد خیال نہ تھے، لیکن سیاسی معاملات میں وہ زیادہ تر قدامت پسند یا کنزرویٹو واقع ہوئے تھے۔اسی لئے کالج کی پروفیسری کے زمانے ہی میں مولانا شبلی کو سر سیّد کے سیاسی خیالات سے سخت کراہت تھی۔

ان کے خیالاتِ سیاسی کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلم لیگ سے بیزار تھے، اس کو بیکار سمجھتے تھے۔ اور کانگریس کے حامی تھے۔اس نوع کے مقالات شبلی الگ شائع ہو گئے ہیں۔ان خیالات کا اظہار نظموں میں بھی کیا ہے۔ایک نظم کو اس طرح شروع کرتے ہیں:-

معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانانِ قدیم — جُرم یہ ہے، میں نے کیوں چھوڑا وہ آئینِ کہن
میں نے کیوں لکھے مضامینِ سیاست پے بہ پے — کیوں نہ کی تقلیدِ طرزِ رہنمایانِ زمن
کانگریس سے مجھ کو اظہار برأت کیوں نہیں — کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن

مسلم لیگ کے متعلق بڑی دلچسپ نظمیں لکھی ہیں۔ایک نظم میں مسلم لیگ کے مسلک پر طنز کرتے ہیں:-

جن مہمات میں درکار ہے ایثارِ نفوس — ان میں طرزِ عملِ بوسہ و پیغام بھی ہے

اسی نظم میں مسلم لیگ کے دفتر کا ساز و سامان بیان کر کے آخر میں صدر مسلم لیگ سے کہتے ہیں:-

مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ — سال بھر حضرتِ والا کو کوئی کام بھی ہے؟

علامہ شبلی کی قومی خدمات بھی خواجہ صاحب موصوف بیان کرتے ہیں:-

مولانا شبلی نے تین اہم کام انجام دینے کی کوشش کی، اور ان میں ایک بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔ایک وقف علی الاولاد کا مسئلہ، جس کو پہلے بھی لوگوں نے مختلف طریقے سے چھیڑا تھا، انھیں کی کوشش سے سر سبز ہوا۔

دوم مولانا شبلی کی یہ کوشش تھی کہ حالاتِ زمانہ سے باخبر، روشن دماغ، اور مفید دینی عالم پیدا ہوں۔ اس کی بنیاد پڑ گئی ہے، اور کچھ لوگ جو مولانا کے نام لیوا ہیں، اور انھیں کے طرز کا تحریر میں اتباع کرتے ہیں، ان میں تاریخ نویسی اور قومی عصبیت کے ساتھ روحانیت کا بھی مساوی پہلو ملا، تو ہم کہیں گے کہ یہ دوسری کوشش بھی کامیاب ہوئی۔

سوم، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بادشاہوں پر سے تاریخی الزامات رفع کیے جائیں۔ مولانا کو اس معاملے میں بھی خاص کامیابی ہوئی۔ ایک شخص کی زندگی میں ایسے عظیم الشان کارنامے اس کو سیکڑوں برس تک زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

خطابات اوراعزازات: علامہ شبلی ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے تو سلطان عبد الحمید خاں شہنشاہِ ترکی نے ''تمغائے مجیدی'' عطا کیا۔ ۱۸۹۴ء میں حکومت ہند سے ''شمس العلماء'' کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۰ء میں امیر عبدالرحمٰن خاں بادشاہ کابل نے ''محکمہ ترجمہ'' قائم کیا۔ اس کے لیے علامہ کا انتخاب کیا۔ لیکن انھوں نے جانے سے انکار کردیا۔ ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ اورینٹل کانفرنس شملہ میں شریک ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں اٹلی کی اورینٹل کانفرنس کی شرکت کے لیے مدعو ہوئے لیکن بوجہ علالت شریک نہ ہوسکے۔ ۱۹۱۳ء میں سلطنت ترکی کی طرف سے مدینہ یونیورسٹی کا قیام تجویز ہوا تھا (جو بوجہ جنگ عظیم عمل میں نہ آسکا) اس کا نصاب تعلیم مرتب کرنے کے لیے علامہ شبلی کا بھی انتخاب ہوا تھا۔

تمام بلاد اسلامیہ مصر و روم و شام وغیرہ اور ممالک یورپ سے ان کے پاس علمی سوالات آتے تھے۔ مسٹر آرنلڈ (انگلستان) موسیوا (پیرس) ڈاکٹر محمود لبیب (برلن) بذریعہ مراسلت علمی استفادہ کرتے رہتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کا نصاب تعلیم تجویز کرنے کے لیے بھی علامہ شبلی منتخب ہوئے تھے۔

حمایت وترقی اُردو: علامہ شبلی کی یہ خدمات علیٰحدہ تذکرہ کے قابل ہیں کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک تجویز کے مطابق انجمن ترقی اُردو قائم ہوئی تو اس کے پہلے سکرٹری علامہ منتخب ہوئے۔ یہ اس وقت حیدرآباد میں تھے۔ وہیں انجمن کا دفتر کھولا گیا۔ ان کے زمانے میں بعض بے نظیر کتابیں انگریزی وعربی سے ترجمہ کرا کے شائع کی گئیں مثلاً ہربرٹ اسپنسر کی مشہور کتاب 'ایجوکیشن' کا ترجمہ 'فلسفۂ تعلیم' کے نام سے خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی نے کیا۔ اور علامہ ابن مسکویہؒ کے رسالہ فلسفۂ الٰہیات الفوز الاصغر کا مولانا الحکیم محمد محسن صاحب فاروقی بچھرایونی نے 'القول الاظہر' کے نام سے ترجمہ کیا۔

اُردو کی ایک اہم خدمت علامہ شبلی کے ہاتھ سے یہ سرانجام ہوئی کہ ۱۹۱۲ء میں

گورنمنٹ نے الٰہ آباد میں ایک ورنیکولر اسکیم کمیٹی اس غرض سے قائم کی کہ اسکولوں اور کالجوں کے لیے دیسی زبان کا نصاب تعلیم ایسی زبان میں مرتب کیا جائے کہ ایک ہی عبارت کے ساتھ اُردو ہندی دونوں زبانوں میں پڑھا جا سکے۔ اوراس کے علاوہ اُردو پڑھنے والوں کے لیے ہندی پڑھنا بھی لازم قرار دیا جائے، اور رامائین تلسی داس کو نصاب امتحان میں شامل کر دیا جائے۔

اس کمیٹی کے ممبر علامہ شبلی بھی تھے۔ انھوں نے اپنے بے نظیر دلائل سے یہ تمام تجویزیں مسترد کرادیں۔ کمیٹی کے بعد مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کو یہ خط لکھا:-

مکرمی تسلیم۔ میں اُردو ورنیکولر اسکیم کمیٹی کی شرکت کی غرض سے الٰہ آباد گیا تھا۔ مسٹر برن نے نہایت چند مضر تجویزیں اُردو کے حق میں پیش کی تھیں۔ ایک یہ بھی تھی کہ رامائن بھاشا انٹرنس کے امتحان میں لازمی کردی جائے، اور اُردو جو مدارس میں ہے وہ ایسی کردی جائے کہ ہندی بن جائے۔ عجب منطقی دلائل گھڑے تھے۔ پنڈت سندر لال وغیرہ کمیٹی کے ممبر تھے۔ تیسرے جلسے میں کامل فتح ہوئی۔ تمام تجویزیں اُڑ گئیں۔ اگرچہ افسوس ہے کہ مسلمان ممبروں نے کوئی مدد بجلو نہ دی، اور دیتے کیا، دینے کے قابل بھی نہ تھے۔ شبلی

اُردو زبان وادب کے جس بقا وتحفظ کی بعد کو کوشش ہوئی اس کا راستہ علامہ شبلی نے پہلے ہی کھول دیا تھا۔ ورنہ یہ دروازہ پہلے ہی بند ہو چکا ہوتا۔ ورنیکولر اسکیم کمیٹی کی یہ تجویز نامناسب نہ تھی کہ اُردو کے طالب علموں کو ہندی سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ چنانچہ بعد کو اسی پر عمل کیا گیا، اور آٹھویں درجہ تک اُردو والوں کے لیے ہندی اور ہندی والوں کے لیے اُردو پڑھنی ضروری ہوگئی۔ لیکن پہلی تجویز نہ جب قابلِ عمل تھی نہ اب ہے۔ جس کو علامہ شبلی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ''اُردو جو مدارس میں ہے وہ ایسی کردی جائے کہ ہندی بن جائے۔'' اس قدر البتہ ممکن تھا اور کیا گیا کہ عام بول چال کی آسان زبان میں کتابیں تیار کی گئیں اور ان کو ایک ہی عبارت والفاظ کے ساتھ اُردو، ہندی دونوں رسم الخط میں چھاپا گیا۔ لیکن یہ اُردو ہندی والوں کو ہندی، اُردو سکھانے کے لیے تھیں۔ اس سے آگے اسکولوں، کالجوں،

یونیورسٹیوں میں جو اُردو کی تعلیم ہے اس کو بجنسہٖ باقی و جاری رکھنا لازم ہے۔ ورنہ زبان، علم و ادب، قومیت، کلچر، کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

علامہ شبلی کی تصانیف: علامہ شبلی کے شغل تصنیف اور عادتِ تحریر کے متعلق خواجہ غلام الثقلین صاحب لکھتے ہیں:-

> باوجود نہایت ضخیم کتابیں تالیف کرنے کے، اور کثیر التصانیف ہونے کے وہ کسی دن بھی فلسکیپ کے دو یا تین صفحے سے زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ زیادہ وقت مطالعہ میں اور زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ لکھتے دیر میں اور سوچ کر، مگر اس میں کاٹ پانس بہت کم ہوتی تھی۔ ہمیشہ ایک دو سطر بیچ میں چھوڑ کر کھلا کھلا لکھتے تھے۔ خط نہایت صاف اور باقاعدہ ہوتا تھا۔ آخر عمر تک خوش نویسی کی شان اس قدر تھی کہ شاید ہی کوئی اتنا بڑا مصنف حروف کی خوبصورتی کی اس قدر پروا کرتا ہو۔

علامہ شبلی کی تصانیف ضخامت میں ان کے بعض ہم عصروں سے کچھ بہت زیادہ نہیں، لیکن عظمت اور اہمیت میں بہت گراں پایہ ہیں۔ انھوں نے پہلے یہ تجویز کی تھی جیسا کہ 'المامون' کے دیباچے میں لکھا ہے، کہ نامور فرماں روایانِ اسلام کی سوانح عمریاں مرتب کریں۔ اس سلسلے کا نام انھوں نے سرسیّد کے شوقِ انگریزی کی تقلید میں 'رائل ہیروز آف اسلام' رکھا تھا۔ دس خاندانِ حکومت کے دس بہترین فرماں روا منتخب کر لیے تھے، مثلاً

(۱) خلافتِ راشدہ	میں	حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
(۲) خلافت بنی اُمیہ	میں	ولید بن عبد الملک
(۳) خلافتِ بنی عباس	میں	مامون الرشید
(۴) بنو امیہ اندلس	میں	عبد الرحمن ناصر
(۵) سلجوقیہ ایران	میں	ملک شاہ

اسی طرح سلاطین ایوبی و سلاطین روم وغیرہ میں سے پانچ اور تھے۔ سلسلہ تصنیف کو نمبر اول سے شروع کرنا چاہتے تھے، لیکن حضرت عمر فاروقؓ کی سیرت کے لیے مسالہ جمع نہ ہوا، اس لیے پہلے خلیفہ مامون رشید عباسی بغداد کے حالات 'المامون' کے نام سے مرتب کیے۔ اس کے بعد 'الفاروق' شروع کی، لیکن یورپ سے بعض کتابوں کے چھپ کر آنے کا انتظار

تھا، اس لیے بقول خود، ''چند روز کے لیے خاندانِ حکومت کو چھوڑ کر علمی سلسلہ کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ فقہ، حدیث، ادب، منطق، فلسفہ، ریاضی، مختلف خاندان سامنے تھے۔ بعض وجوہ سے فقہ کو ترجیح دی، اور امام ابوؒحنیفہ کو جو فقہ کے بانی ہیں، اس کا ہیرو قرار دیا۔''(۱)

امام صاحب کے سوانح (سیرۃ النعمان) لکھنے میں علم کلام کی بحث اور امام ابو حنیفہ کا اس سے تعلق سامنے آ گیا، جس کا خود علامہ شبلی کو بھی اس سے پہلے اندازہ نہ تھا۔ علامہ بالطبع ''عقلیات'' (فلسفہ وکلام) کی طرف راغب تھے۔ علی گڈھ میں سرسیّد کی صحبت نے ''آزاد خیالی'' پیدا کر دی تھی۔ لیکن اس کے لیے تقلید چھوڑنے کی ضرورت تھی۔ سرسیّد غیر مقلد تھے۔ شبلی کے لیے یہ مسلک اختیار کرنا ممکن نہ تھا۔ اب انھوں نے دیکھا کہ امام صاحب خود بڑے آزاد خیال اور تاویل پسند تھے۔ یہ بڑا سہارا مل گیا۔ علامہ شبلی نے تمام ''کلام'' اور ''کلامیوں'' کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اس دلچسپی میں وہ سلسلۂ فرماں روایانِ اسلام ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ 'الفاروق' بہت سی لکھ چکے تھے۔ وہ تو پوری کر دی۔ پھر اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی۔ اور یہ بہت اچھا ہوا۔ ''ملک شاہ سلجوقی'' اور ''نورالدین'' ''زنگی'' وغیرہ کو بھی لکھ دیتے تو بجز ''تالیف شبلی'' کے اور کوئی قدر و قیمت نہ رکھتے۔ یہ بات اسی سے معلوم ہوتی ہے کہ علامہ کی تمام تصانیف میں 'المامون' سب سے کم پڑھی جاتی ہے۔

علامہ شبلی کی تصانیف علوم وفنون کے لحاظ سے اس طرح مرتب ہو سکتی ہے:۔

سیرت وسوانح - المامون، سیرۃ النعمانؒ، الفاروؓق، سیرۃ النبیؐ۔ ۲ جلد

فلسفہ وکلام - علم الکلام، الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم

ادبیات - موازنۂ انیس ودبیر، شعرالعجم ۵ حصہ

سفرنامہ - سفرنامہ مصر وروم وشام

تاریخ - تاریخ اسلام، مضامین عالمگیر

---

(۱) دیباچۂ سیرۃ النعمان

تعلیمات- مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم

تقریرات- ندوۃ العلماء اور ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریریں

خطوط- مکاتیبِ شبلی ۳ حصے

مقالات- مقالاتِ شبلی ۸ حصے جن میں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، تعلیمی، سوانحی مضامین الگ الگ مرتب کیے گئے ہیں۔

نظم اُردو- مثنوی صبح امید۔ قومی مسدس، مجموعہ کلام اُردو

عربی تصانیف- الانتقاد علی التمدن الاسلامی (مصر کے عیسائی مصنف جوجی زیدان کی کتاب ''التمدن الاسلامی'' کی تنقید) بدرالاسلام، اسکات المعتدی

فارسی نظم - دیوانِ شبلی (جن میں دستۂ گل، بوئے گل وغیرہ مختصر مجموعے شامل ہیں)۔

علامہ شبلی کا طرزِ تحریر علامہ شبلی اپنے زمانے کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلوبِ تحریر کی اہمیت کو سمجھا۔ علامہ آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کے طرزِ تحریر کی کوتاہیاں بیان ہو چکی ہیں۔ مولانا حالی اپنے اسلوب کی متانت اور ہمواری سے مختلف موضوعات کو نباہ لے گئے، لیکن علامہ شبلی کے مقابلے میں ان کا طرز بھی بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ موقع و مقام اور موضوع و بیان کے مطابق اسلوب اختیار کرنے کے لیے صرف وجدان و ذوق کی رہنمائی شرط ہے۔ قواعد صرف ونحو اور اصول معانی و بیان بھی بغیر ذوق سلیم اور ذہن متوازن کے کام نہیں دیتے۔ علامہ شبلی ایسا ہی مذاق صحیح اور طبع لطیف رکھتے تھے۔ ہر موقع و محل کے لیے اسی کے مناسب طرزِ تحریر اختیار کیا ہے۔ لطیف و نازک استعارہ وتشبیہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ لیکن اس کے بغیر بھی الفاظ کے انتخاب مرکبات اور جملوں کی ساخت میں اس قدر حسن تناسب ملحوظ رکھتے ہیں کہ ان کی عبارت میں نہایت دلکشی و دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ لطافتِ خیال، دقتِ نظر، وسعتِ تحقیق، قوتِ استدلال سے مضمون میں ندرت وجدّت اور تاثیر و دلفریبی پیدا کر دیتے ہیں۔ عظمت و اہتمام کے موقع پر شاندار الفاظ اور موزوں ترکیبوں سے شان وشوکت دکھاتے ہیں۔ دلائل اور مثالوں کے

انتخاب وترتیب میں ان کا حسن نظر اور ذوق سلیم نمایاں ہے۔ جس موقع پر دوسرے مصنف معمولی سامنے کی مثالوں پر قناعت کرتے ہیں، وہاں علامہ شبلی نادر و عجیب مثالیں تلاش کرتے ہیں۔

ان کی تحریر کے متعلق سرسیّد دیباچہ ’المامون‘ میں لکھتے ہیں:-

”ایسی صاف وشستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلّی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔“

علامہ شبلی کی اولیات اور ان کا مرتبہ مولانا حالی کے حال میں لکھا گیا ہے کہ اُردو میں سیرت اور تنقید دو چیزیں با اصول و مستند نہ لکھی گئی تھیں۔ حالی نے ان کا آغاز کیا۔ شبلی کی بھی اکثر تصانیف انہی دو موضوع کی ہیں۔ چھ سیرت وسوانح (مع غزالی و رومی کے) اور دو تنقیدیں (موازنہ و شعر العجم) ’شعر العجم‘ کی پانچ جلدوں میں تذکرہ شعراء بھی ہے اور تنقید شعر و سخن بھی۔

آزاد کی ’دربارِ اکبری‘ اور حالؔی کی ’حیاتِ سعدی‘ شبلی کی ’المامون‘ وغیرہ سیرتوں سے پہلی ہیں۔ اسی طرح آزاد کی ’آبِ حیات‘ اور ’سخندانِ پارس‘ اور حالؔی کا ’مقدمۂ شعر و شاعری‘ شبلی کے ’موازنہ‘ و ’شعر العجم‘ سے قدیم ہیں۔ اس لیے آزاد و حالؔی کی اولیت مسلّم ہے۔ با اصول تذکرۂ شعراء سب سے پہلے آزاد نے لکھا۔ جامع سیرت سب سے پہلے حالی نے مرتب کی، اصول تنقید و نمونۂ تنقید سب سے پہلے حالؔی نے پیش کیے۔ لیکن جب شبلی نے ان چیزوں پر قلم اٹھایا تو اس زمین کو آسمان کر دیا۔ اُردو میں پہلی مرتبہ یہ بات نظر آئی کہ ذوقِ سلیم ”سیرت“ اس طرح مرتب کرتا ہے، اور تنقید اس طرح لکھتا ہے۔

اس عیارِ کامل کے لحاظ سے سیرت و تنقید بھی گویا علامہ شبلی کی اولیات میں شامل ہیں۔ آزاد، حالؔی، شبلی کی کتابیں مقابل رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شبلی کو پہلے نمونوں سے کوئی مدد نہیں ملی۔ ”سیرۃ النبیؐ“ اور ”الفاروق“ کے لیے ”دربارِ اکبری“ اور ”حیاتِ سعدی“ نمونہ کا کام نہیں دے سکتیں۔ اسی طرح ”شعر العجم“ کے پہلے تین حصے (تذکرۂ شعراء) ”آبِ حیات“ کی تقلید سے بے نیاز ہیں، اور چوتھا، پانچواں حصہ (حقیقتِ شاعری اور اصناف شاعری کی تنقید) ”مقدمۂ شعر و شاعری“ کے اتباع سے بالاتر۔

علامہ شبلی کی ''علم الکلام''، ''الکلام'' اور اس فن سے متعلق ''الغزالی'' اور ''سوانح مولانا روم'' اُردو زبان کی وہ اولیات ہیں کہ ان ۴۵ برس میں ''آخریات'' بھی یہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ علم الکلام کی طرف توجہ اور اس کا شوق علامہ شبلی کے اندر سر سیّد کے اثر سے پیدا ہوا تھا۔ سب سے پہلے سر سیّد نے اور ان کی تقلید میں مولوی چراغ علی نے اسلام کے عقائد و اعمال اور احکام و شرائع کو عقل کے مطابق اور مصلحت زمانہ پر مبنی ثابت کرنے کے لیے علم الکلام کے اصول برتے تھے۔ لیکن اس فن کی تاریخ و اصول، اور اہلِ فن کا طریقۂ عمل سب سے پہلے علامہ شبلی نے پیش کیا۔

مثنوی مولانا روم سے علم کلام کے مسائل مرتب کرنا علامہ شبلی کی بے نظیر جودت طبع اور فکر رسا کا ثبوت ہے۔ مثنوی کا یہ وصف بالاجمال شارحین و شائقینِ مثنوی کی نگاہوں سے مخفی نہ تھا۔ عقاید و الٰہیات کے مباحث میں ''مثنوی مولوی'' کے اشعار پہلے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن مسائل کی یہ ترتیب جو سوانح مولانا روم میں ہے، علامہ شبلی کا کارنامہ ہے۔

تاریخ اسلام نے مختلف واقعات کی تحقیق اور ان کے متعلق غلط فہمیوں کی اصلاح جس کاوش و جامعیت کے ساتھ علامہ شبلی نے کی، اس کی نظیر پہلے موجود نہ تھی۔ ''جزیہ''، ''کتب خانہ اسکندریہ''، ''مضامینِ عالمگیر'' وغیرہ متعدد رسالے اور مضامین اپنی نوعیت کی پہلی چیزیں ہیں۔

ان تمام تصانیف میں ''بلاغتِ کلام'' جس حد تک ہے، اس میں کوئی ہم عصر علامہ شبلی کو نہیں پہنچتا۔ اس لیے وہ ادیب و نقاد اور مورخ و سیرت نگار ہر حیثیت سے رفعت و مرتبت میں بالکل منفرد ہیں۔

علامہ شبلی کی شاعری: علامہ فارسی و اُردو کے شاعر تھے۔ فارسی سے طبعاً مناسبت تھی، کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ فارسی زبان اور شاعری کے نکتوں اور لطافتوں پر عبور حاصل تھا۔ اس لیے ''فارسی گویانِ ہند'' میں کم سے کم اپنے معاصرین میں وہ کسی سے کم نہیں۔ خود ایک خط میں اپنے متعلق لکھتے ہیں:- فارسی شاعری میں زبان کو اصول پر

برتا۔'' یہ اصول پر برتنا غیر زبان والوں کو مشکل سے میسر آتا ہے۔ اہلِ ہند چھ سو، سات سو برس سے فارسی میں شاعری کرتے ہیں۔ امیر خسرو سے فیضی کے زمانے تک ہندوستان کے فارسی شاعروں کی بول چال بھی فارسی میں تھی۔ تصنیف وتالیف بھی، خط وکتابت بھی، اور ایرانی شاعروں کی آمد ورفت بھی جاری تھی۔ اس لیے اُس زمانے میں یہاں کا شعر و ادب بھی بڑی حد تک ایرانی اسلوب پر رہا۔ اس کے بعد جب سے اُردو بول چال، تصنیف وشاعری میں داخل ہوئی، ہندوستانی طرز وادا، اور فارسی الفاظ ومحاورات کا ہندوستانی استعمال فارسی شاعری میں آ گیا، جس کو اہلِ زبان ''سبک ہندی'' کہتے ہیں۔ پھر اہلِ ہند کے لیے اس طرزِ ہندی سے بچنا اور ''سبک ایرانی'' برتنا دشوار ہو گیا۔ اور اس کے لیے خاص ذوق سلیم اور نگاہ تنقید کی ضرورت ہونے لگی۔ اس ''ذوق ونظر'' کا متاخرین میں مرزا غالب پر خاتمہ ہو گیا۔ غالب کے بعد پھر کسی کو یہ بات کمال کے ساتھ نصیب نہ ہوئی۔ تاہم کثرت سے اچھا کہنے والوں نے بے عیب بھی کہا، اور ''اسلوبِ ایرانی'' میں بھی کہا۔ اسی وجہ سے اہلِ ذوق ایرانیوں نے پسند کیا۔

علامہ شبلی کا زمانہ علی گڈھ تک فارسی کلام سبک ہندی سے خالی نہیں، پھر بھی ان کی لطافتِ طبع اور حسنِ مذاق کا شاہد ہے۔ آخری زمانے کا کلام بہت منجھا ہوا، اور معیار سے نہایت قریب ہے۔ الفاظ ترشے ہوئے، اور مصرع ڈھلے ہوئے ہیں۔ خصوصاً بمبئی کی غزلوں میں بڑی دلآویزی ہے۔ اس زمانے میں ان سے زیادہ پُرگو اور بھی تھے، زیادہ شیریں کلام کوئی نہ تھا۔

فارسی شاعری سے مناسبت اور شوق رکھنے کے علاوہ علامہ شبلی ''دلِ زندہ'' اور ''شیوۂ اہلِ نظر'' بھی رکھتے تھے۔ اور پہلے کی زندگی اور دوسرے کی ''آبرو'' کی خاطر فارسی غزل کہنے سے بہتر کوئی شغل نہ تھا۔ (۱)

---

(۱) بقول مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی ''بمبئی کے سفر فارسی شاعری کے لیے یادگار ہیں'' اس یادگار کو باقی رکھنے کے لئے بمبئی کے متعلق علامہ شبلی کا کچھ کلام درج کیا جاتا ہے۔ یہ غزل بمبئی میں (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۱۹۰۶ء میں کہی تھی:-

غزل

نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را | طرازِ مسندِ جمشید دفترِ تاجِ خسرو را
بہر سو از ہجومِ دلبرانِ شوخِ بے پروا | گذشتن از سرِ رہ مشکل افتاد ست رہرو را
فغاں از گرمیِ ہنگامۂ خوبانِ زردشتی | بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضو را
"بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت" | کنارِ آب چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را

بیا شبلی بہ یادِ پنجۂ گیرائے مژگانش
دگر رہ پارہ سازم ایں قبائے زہد و صد نو را

تیسرے شعر کے (ظلمت وضو) پر علامہ نے فارسی میں اس مضمون کا نوٹ لکھا ہے کہ پارسی لوگ دو خدا مانتے ہیں، یزداں و اہرمن، اور ان کو نور و ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ چوتھا شعر خواجہ حافظ شیرازی کے اس شعر سے ماخوذ ہے:-

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت | کنارِ آب رکناباد و گلگشت مصلّٰے را

اسی ماہ ستمبر کی لکھی ہوئی چوتھی غزل تمام کلام میں سب سے زیادہ طویل ہے۔ چند شعر یہ ہیں:-

گردم از مدحت شیراز و صفاہاں زدہ ام | شرم بادم کہ نوا ہائے پریشاں زدہ ام
بمبئی بود مرا منزل مقصود و عبث | پیش ازیں گام طلب در رہ حرماں زدہ ام
آں نگارِ عجمی چہرہ بد انساں افروخت | کآتش آوردم و در خرمنِ ایماں زدہ ام
آں شد اے دوست کہ آراستے پیکر فن | نقش زیبا صنمے بر ورق جاں زدہ ام
آں شد اے دوست کہ در ندوہ بہ بینی بازم | کہ دم از صحبت آں دشمن ایماں زدہ ام
ہان وہاں، دست بدارید زمن اے احباب | کہ بہ زیبا صنمے دست بہ پیماں زدہ ام
جائے آنست کہ گلشن دمد از کنجِ لبم | بوسہ ہا بسکہ برآں عارض خنداں زدہ ام

اس مضمون کے دو ایک شعر اور بھی ہیں۔ ایسے ہی مضامین کے متعلق میر ممنونؔ دہلوی کہتے ہیں:-

اس ذوق سے کہتے ہیں حدیث لبِ شیریں | گویا ترے ہونٹوں ہی سے لیتے ہیں مزا ہم

شبلی کی اس غزل کے دو شعر یہ بھی ہیں:+ (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

تا دگر آں بت خود کام زیادم نہ بَرد　　　گرہے چند دراں زلف پریشاں زدہ ام

پےتواں بُرد کہ ایں زمزمہ بے چیزے نیست

شبلی ایں تازہ نوایانہ چومستاں زدہ ام

بمبئی سے واپسی میں ۲۷؍ستمبر ۱۹۰۶ء کو غزل کہی ہے۔ مطلع ومقطع یہ ہے۔ مقطع کیا خوب فرمایا ہے:-

دوش کاں دلدار با من ہم وثاق افتادہ بود　　　غلغلے در گنبدِ فیروزہ طاق افتادہ بود

از دلِ صد پارہ ات آگہ نیم شبلی، ولے　　　شیشۂ دیدم کہ از بالائے طاق افتادہ بود

۱۳؍اپریل ۱۹۰۷ء کو الہ آباد میں بیٹھے بمبئی کو یاد کر رہے ہیں:-

زہے جاں بخشیِ آب و ہوائے بمبئی شبلی　　　طراز و غلّغ و نوشاد و فرخارست، پنداری

دو چار شعر اور بھی قابلِ دید ہیں:-

دامن عیش زدستم نرود، تا شبلی　　　دامنِ بمبئی از کف ندہم تا باشم

شبلی عناں گسستہ مرو سوے بمبئی　　　مانیز با تو ہم سفریم، ایں شتاب چیست

ز ذوق طبع شبلی من در اول روز دانستم　　　کہ در آشوب گاہ بمبئی در باز ایماں را

بیا اینجا کہ ہر سو کارواں در کارواں بینی　　　بتانِ آذری را، دلبرانِ شام و ایراں را

یہ غزلیں شائع ہو جاتی تھیں، اور ان مضامین کے چرچے ہوتے تھے۔ اس لئے ایک غزل میں اپنے مخاطبِ غزل سے کہتے ہیں:-

چشم لطف از تو باندازۂ آں می دارم　　　کہ من از نام نکو بہر تو نقصاں کردم

اس غزل کا مقطع ہے:-

شبلی ایں فن نہ بہ ایں شیوہ وآئین بودہ است　　　پیش ازیں کالبدے بود کہ من جاں کردم

فنِ شعر یا فنِ گوی عشق بازی؟

اس مجموعہ "بوئے گل" کی آخری غزل کا مقطع کیا خوب کہا ہے:

شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی　　　حالیا شبلی، رند غزل خواں نیستم

ان کا اُردو کلام بہت مختصر ہے۔ ''مثنوی صبح امید'' اور'' قومی مسدس'' قیام علی گڈھ کی نظمیں ہیں۔ وقتی چیزیں تھیں۔ اس زمانے میں چند بار شائع ہوئیں۔ اب مجموعۂ کلام میں شامل ہیں۔ ان کے بعد سالہا کوئی اُردو نظم نہیں لکھی۔

۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگالہ کی منسوخی اور اس کے بعد جنگ بلقان کا ہیجان پیدا ہوا تو علامہ شبلی نے ''پولیٹکل کروٹ'' بدلی اور مضامین کے ساتھ سیاسی نظمیں بھی لکھیں، جن میں سے بعض ایسی تیز و سخت تھیں کہ ''قابلِ ضبطی'' سمجھی گئیں۔ ان کے علاوہ تاریخِ اسلام کے چند واقعات نظم کیے ہیں۔ اکبر و جہانگیر کے واقعات کی نظمیں نہایت مشہور و مقبول ہوئیں۔ یہ سب کلام شاعری کے کانٹے میں تلا ہوا، اور نہایت پُرلطف ہے۔ سیاسی نظموں میں تو وہ تنہا نہیں تو ایک دو کے ساتھ پیش رَو اور پیشوا کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس زمانے کے ''سیاسی شعراء'' میں مولوی ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار سے بہتر کوئی نہ تھا۔

علامہ شبلی پر اعتراضات: (۱) علامہ شبلی کے خیالات اور تالیفات پر ان کی زندگی میں اور بعد کو مختلف اعتراضات کیے گئے۔ تردید میں مضامین لکھے گئے، تصانیف کے جواب میں کتابیں چھاپی گئیں۔ تاریخی غلطیاں بتائی گئیں، تالیفی کمزوریاں دکھائی گئیں۔ لیکن باوجود اس کے ان کے مصنف اور انشاپرداز کے مرتبے سے کسی نے انکار نہیں کیا۔ اعتراضات کی بڑی بنیاد ان کے مذہبی خیالات و اجتہادات تھے۔ جہاں ان کے کمال کا یہ اعتراف کیا گیا:-

> ''آپ کی تصانیف کے مطالعے سے دنیائے اسلام کی وسعت و عظمت اور خوبیوں اور ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ غیر اقوام پر ان کے پڑھنے سے اسلام کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف ہوتی ہیں۔ یہ کتابیں سہل پسندی، عام فہمی اور دلآویزی میں اپنی آپ نظیر ہیں۔''

(مولوی ظفر الملک اڈیٹر الناظر از سیر المصنفین)

وہاں یہ بھی کہا گیا:-

> ''ہمارے مولانا پرستارانِ عقلیت کی رایوں کے مطابق اسلام کی تاریخ گذشتہ اور قرآنی تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں کہ خواہ مذہب کا منشا پورا نہو، لیکن متبعین یورپ کی تشفی ہوجائے۔''

''مولانا کی ایسی تمام تحریروں نے اگر ایک طرف حاملانِ شریعت اور علمائے مذہب کو برافروختہ اور کبیدہ خاطر کیا، تو دوسری طرف خود اسلام کی قوت کو نا قابلِ تلافی نقصان پہونچایا ہے۔''

(وہی مضمون)

اس اعتبار سے ان کی حیثیت تقریباً سر سیّد کی سی تھی۔ فرق یہ تھا کہ سر سیّد با قاعدہ عالم، محدث نہ تھے، اور علامہ شبلی سب کچھ تھے۔ سر سیّد کی رایوں کو تو ''دخل در معقولات'' سمجھا گیا، لیکن علامہ شبلی کے ''اجتہادِ نو'' کی حمایت میں ان کے جبہ و دستار تھے۔ علمائے ملت کی برہمی و برافروختگی کا یہی باعث تھا۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ 'سیرۃ النعمان' پر اعتراض کیے گئے۔ وجوہِ اعتراض کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ معترضین میں مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی رئیس بھیکن پور (نواب صدر یار جنگ بہادر) بھی تھے۔ اور علمائے معترضین میں شاید سب سے کم عمر، لیکن فہم وفراست اور مذہبی جوش و پاسداری میں کسی سے کم نہ تھے۔ علی گڈھ کالج سے قریب کا تعلق رکھتے تھے۔ علامہ شبلی نے تمام مخالفانہ مضامین میں سے مولوی صاحب موصوف ہی کے اعتراضات کا جواب لکھا۔ اس میں یہ شعر بھی لکھا تھا:-

رسی آنکہ بدردِ ما کہ چو ما　　خامہ گیری و حرف بنگاری

(۲) 'سیرۃ النعمان' کے بعد 'الفاروق' پر اعتراض ہوئے۔ یہ دوسری قسم کے تھے۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ''مصنف نے اسلام کی تاریخ کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ الفاروق پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کی شائستگی اور اُس زمانے کے تمدن میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ جو محکمے دفاتر موجودہ طرزِ حکومت کے لازمی عناصر ہیں، کم و بیش وہ سب دربارِ خلافت کے ارکان پائے جاتے ہیں، جن کو درایت کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔'' (ایڈیٹر الناظر) اور اس پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے:-

''جو درجۂ حزم واحتیاط تاریخ کی کسی مستند کتاب کا طرۂ امتیاز ہونا چاہئے 'الفاروق' اس سے محروم ہے۔'' (ایڈیٹر الناظر)

علامہ شبلی کی رجحان پسندی اور ہیرو پرستی سے ہمیں انکار نہیں۔ لیکن اس میں ان کا صرف

مبالغہ یا اہتمام ہم کو تسلیم ہے۔ ورنہ

تا نباشد چیزکے شبلی نگوید چیزہا

علامہ نے 'الفاروق' کی ترتیب میں اس قول پر عمل کیا ہے کہ اثبات فضائل میں حدیث کا بالکل صحیح ہونا شرط نہیں البتہ کسی صحیح قول کی تردید نہ ہو اور کسی دوسرے کی مضرت و منقصت نہ ہو۔ اس لیے انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے انتظام حکومت کے متعلق جو بات جس تاریخ میں پائی لکھ دی۔ وہ تحقیق و تنقیح نہیں کی جو بعد کو سیرۃ النبیؐ کے لیے کی۔ لیکن الفاروق میں بھی کثرت سے واقعات صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے اور قاضی ابو یوسف کی کتاب 'کتاب الخراج' سے اور اس طرح کی بعض اور مستند کتابوں سے لیے ہیں۔

معترضین نے کم سے کم یہ اعتراض سمجھ کر نہیں کیا کہ مصنف الفاروق نے موجودہ طرزِ حکومت اور دربارِ خلافت میں کچھ زیادہ فرق نہیں رکھا۔ جس چیز سے ان کو دھوکا ہوا، وہی علامہ شبلی کا کمال تالیف ہے۔ علامہ نے حصہ دوم میں جلی عنوانوں کی تفصیل کے لیے حاشیوں پر ذیلی سرخیاں قائم کر کے موجودہ طرزِ حکومت کے سب نہیں تو اکثر ضروری عناصر خلافتِ فاروقی میں دکھائے ہیں۔ فہرست مضامین پر نظر ڈالنے سے یہ عنوان نظر آتے ہیں:-

صوبوں کی تقسیم، محکمۂ بندوبست، قانون مالگذاری، محکمۂ آبپاشی، مختلف قسم کے رجسٹر، مردم شماری، محکمۂ جاسوسی، پولیٹکل تنخواہیں، پرچہ نویسی، فنِ جنگ، فوج کے خزانچی و محاسب، قلعہ شکن آلات، سفر مینا وغیرہ۔

لیکن ان سب کو پڑھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں بالکل ابتدائی حالت میں اور وقت و موقع کے مطابق تھیں۔ مثلاً فوجیں تھیں تو وہ کہیں رہتی بھی تھیں۔ اُن مکانوں کا نام فوجی بارکیں لکھ دیا۔ معترض بے پڑھے یہ کیوں تصور کر لے کہ انگریزی فوجوں کے سے قطار در قطار باقاعدہ یکساں کمرے، ہال، کلب گھر، اصطبل تھے۔ مردم شماری کے متعلق لکھا ہے:-

''زکوٰۃ اور جزیہ کی تشخیص کی ضرورت سے ہر مقام کی مردم شماری کرائی گئی تھی............خاص

صنعتوں کے لحاظ سے بھی نقشے تیار کرائے تھے۔ مثلاً سعد وقاص کو حکم بھیجا تھا کہ جس قدر آدمی قرآن پڑھ سکتے ہیں، ان کی فہرست تیار کی جائے۔ شاعروں کی بھی فہرست طلب کی تھی۔ (الفاروق صفحہ ۱۱۸)

ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ابھی آغاز ۱۹۴۱ء میں جیسی مردم شماری ہوئی ہے ایسی جب نہ تھی، نہ ایسی دکھائی گئی ہے۔

اس کے علاوہ معترضین نے یہ امر فراموش کر دیا ہے کہ خلافت فاروقی عراق، شام، مصر، ایران، دور دور تک تھی۔ مصر و ایران وغیرہ پہلے سے متمدن و شائستہ ملک تھے۔ وہاں یہ تمام اصول حکومت اور طرزِ سلطنت رائج تھے۔ فتح اسلام کے بعد بھی جاری رہے اور اب عہد فاروقی کے کارنامے اور الفاروق میں لکھنے کے واقعات ہو گئے۔

(۳) موازنہ انیسؔ و دبیرؔ پر بھی اعتراض ہوئے، اور اس کے جواب میں المیزان اور ردّ الموازنہ وغیرہ لکھی گئیں۔ اُردو کتابوں میں اضافے کے لحاظ سے تو بہت اچھا ہوا کہ یہ کتابیں لکھ دی گئیں۔ خصوصاً المیزان کہ وہ بڑی ضخیم کتاب ہے۔ ''موازنہ'' سے دُگنی اور مرزا دبیرؔ کے حالات، خصوصیات کلام، انتخاب مراثی کے اعتبار سے نہایت کار آمد۔ لیکن اس میں جواب موازنہ کی سعی لاحاصل ہے۔ ''موازنہ شبلی'' لاجواب تھا۔ علامہ شبلی کی طبیعت میں بعض باتیں مورخ و نقاد کی شان کے خلاف تھیں۔ ان کا ظہور ''موازنہ'' میں بھی ہے۔ صرف ان چند باتوں پر نظر ڈالنے کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لیے چند صفحے یا ایک دو جزو کافی تھے۔ ورنہ وہ شاعری میں اس قدر صحیح مذاق اور نظر انتقاد رکھتے تھے کہ ان کی تنقیدوں میں مشکل سے کلام ہو سکتا ہے۔ بعض قابلِ اعتراض باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) علامہ شبلی کی عادت تھی کہ جس مسئلے کو جتنا اہم سمجھتے تھے اتنی ہی اس کی تحقیق کیا کرتے تھے۔ معمولی قرین قیاس باتوں میں صرف شہرت و سماعت کو کافی سمجھتے تھے۔ انھوں نے ''موازنہ'' میں مرزا دبیرؔ کے بعض شعروں اور مصرعوں کو خلاف بلاغت بتایا ہے۔ ان میں یہ بھی ہیں:-

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مرزا دبیرؔ نے یہ مضمون ادا کیا ہے:-

محبوب ہوں خداے ذوی الاحترام کا نانا ہوں میں حسین علیہ السلام کا

آنحضرت کی زبان سے امام صاحب کے لیے ''علیہ السلام'' کا لفظ کس قدر ناموزوں ہے۔

ایک اور مشہور مصرع ہے:۔

''زیرِ قدمِ والدہ فردوسِ بریں ہے'' (دبیرؔ)

مصنف المیزان کہتے ہیں کہ یہ دونوں مرزا دبیر کے نہیں ہیں۔ان کے نام سے غلط مشہور کردیے گئے ہیں۔ یہاں علامہ پر اعتراض صرف عدم تحقیق کا ہوسکتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ اصل مسئلہ مرزا دبیرؔ کی عدم رعایت بلاغت ہے۔ وہ اور بہت سے مصرعوں سے ثابت ہے جو علامہ نے پیش کیے ہیں۔

(۲) علامہ نے صنعت ''تنسیق الصفات'' کی یہ تعریف بیان کی ہے:۔

''جب کسی موقع پر چند الفاظ ایک وزن یا ایک قسم کے پے در پے آتے ہیں تو ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔'' (موازنہ صفحہ ۲۵)

اور اس کی مثالوں میں یہ شعر بھی لکھا ہے:۔

کوفہ میں یہی معرکہ دن بھر نظر آیا شمر آیا، سنان آیا، حُر آیا، عمر آیا

یہ تعریف اور مثال دونوں غلط ہیں۔ اس کے نام میں ''صفات'' کا لفظ ہے۔ اسی سے تعریف نکلتی ہے کہ کسی شے کی صفتیں پے در پے لائی جائیں۔ اسماء، افعال یا جملے پے در پے آنے سے ''تنسیق الصفات'' نہیں بنتی۔ ''موازنہ'' میں یہ مثال صحیح لکھی ہے:۔

اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی، پانی بھی، ہوا بھی امرت بھی، ہلاہل بھی، مسیحا بھی، قضا بھی

(۳) علامہ شبلی پر سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کا نام تو ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' رکھا ہے، لیکن اس سے مقصد تحسینِ انیسؔ اور تنقیص دبیر ہے۔ موازنہ میں طرفین کے محاسن و معائب دکھانے ضروری ہیں۔ علامہ ممدوح نے برائے نام میر انیسؔ کی خامیاں بھی بتائی ہیں، لیکن اکثر جگہ ان کی یہ تاویل کی ہے کہ کاتب کی غلطی ہے اور مرزا دبیرؔ کے اغلاط میں کہیں یہ احتمال ظاہر نہیں کیا۔ ''المیزان'' میں بتایا گیا ہے کہ یہاں

یہاں کاتب کی غلطیاں، اس لیے علامہ شبلی کا اعتراض درست نہیں۔

علامہ موصوف میں یہ وصف بھی ہے کہ وہ ایک کو اعلیٰ اور دوسرے کو ادنیٰ سمجھ لیتے ہیں تو پھر یہ تلاش نہیں کرتے کہ ان کے ناپسندیدہ شخص میں کتنی خوبیاں ہیں۔ خواہ وہ پسندیدہ شخص کے مقابلے میں کتنی ہی کم ہوں۔ ترجیح کے لیے یہ ضروری نہیں کہ غیر مرجح شخص میں کوئی خوبی نہ ہو، یا اس کی خوبیوں سے چشم پوشی کی جائے۔ یا ان کو کم کر کے دکھایا جائے۔ انھوں نے مرزا دبیر کے متعلق لکھا ہے:-

''فصاحت ان کے کلام کو چھو نہیں گئی، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت یا کسی حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔''

اور اس کے بعد فرماتے ہیں:-

''ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ ان کے کلام میں سرے سے یہ باتیں پائی ہی نہیں جاتیں، لیکن گفتگو قلت اور کثرت میں ہے۔''

جب قلّت و کثرت میں گفتگو تھی تو یہی بات کہنی چاہیے تھی، یہ الفاظ ''چھو نہیں گئی، نام کو نہیں بالکل عاجز ہیں'' لکھنے ہی مناسب نہ تھے۔ اس لیے کہ خلاف واقع ہیں۔ علامہ شبلی نے صرف ایک واقعہ کے متعلق مرزا دبیر کے پانچ بند نقل کیے ہیں اور لکھا ہے:-

''مرزا دبیر صاحب نے اس واقعے کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہے، اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے۔ کسی سے آج تک نہ ہو سکا۔''

لیکن ہم نے اپنی تالیف ''تاریخِ مرثیہ گوئی'' میں مرزا دبیر کے مختلف مرثیوں سے طویل و مسلسل اقتباسات لکھ دیے ہیں، جن میں وہ ''فصاحت و بلاغت''، جس کو علامہ ممدوح کہتے ہیں کہ دبیر کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، ایسی اعلیٰ ہے کہ اگر ان بندوں کو میر انیس کے کلام میں ملا دیا جائے تو پہچان مشکل ہے۔ موازنہ کا حق یہ تھا کہ علامہ مرزا صاحب کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے بجائے ایک دو واقعات یا چند اشعار کے وہ تمام یا اکثر حصے پیش کرتے، جہاں دبیر انیس سے بڑھ کر یا برابر کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ ہوتا تو پھر ان سے کوئی شکایت نہ ہوتی، اور ''ترجیح انیس'' کے متعلق ان کی رائے پھر بھی درست ہی رہتی۔

(۴) 'شعر العجم' بھی مورِدِ اعتراض رہا۔ مختلف لوگوں نے مضامین اور رسالے لکھ کر اس کی تاریخی و تنقیدی غلطیاں دکھائیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی ''مورخ سے زیادہ نقاد'' تھے(۱) 'شعر العجم' کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ فارسی شاعری کی وسعت و جامعیت ثابت کی جائے اور تنقید و موازنہ کر کے شاعروں کے کمالات دکھائے جائیں۔ اس کام کے لیے فی الجملہ ملکی تاریخ اور شاعری کا ارتقا بھی بیان کرنے کی ضرورت تھی اور شاعروں کے حالات بھی۔ لیکن ذاتی حالات یا ملکی تاریخ مقصود بالذات نہ تھی۔ اور علامہ کی یہ عادت ہو چکی ہے کہ وہ صرف اپنے کام اور ضرورت کی قدر تحقیق کیا کرتے تھے۔ ان کی جن تصانیف اور مضامین کا موضوع تحقیق ضمنی چیز ہے، وہاں وہ ہر روایت اور ہر تحریر کو معتبر سمجھ لیتے ہیں۔ اس بنا پر 'شعر العجم' میں شعراء کے سالِ ولادت و وفات، ان کا وطن، حسب نسب، کتابوں کا سالِ تصنیف، ان کا انتساب، تاریخ ایران کے سنہ اور اس قسم کے مختلف معلومات کہیں کہیں غلط لکھ دی گئی ہیں۔ اس لیے کہ ان کو شاعر اور اس کے گرد و پیش سے اتنی بحث و تعلق نہیں جتنی شاعری اور اس کے ماحول سے ہے۔

'شعر العجم' میں ان باتوں کی تحقیق بھی جا بجا نظر آتی ہے، لیکن سرسری ہے۔ کسی بات کے متعلق چند کتابوں میں اختلاف نظر آیا، انھوں نے وہ اقوال نقل کر دیے۔ کبھی کسی قول کو ترجیح دے دی، کبھی بغیر فیصلے کے چھوڑ دیا، اس لیے علامہ شبلی پر مورخ و تذکرہ نویس کی حیثیت سے یہ اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو یورپ کے طرزِ تحقیق کی عادت ہے، ان کی نظر میں علامہ کی یہ کمزوری زیادہ کھٹکتی ہے۔

علامہ کی طبیعت میں یہ بات بھی عجیب تھی کہ وہ اپنے معاصرین کی تصانیف کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ خصوصاً جن لوگوں کو وہ اپنا حریف سمجھتے تھے اور جن کی

---

(۱) آگرہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے (فارسی) میں ساتواں پرچہ ''تنقید'' کا ہے۔ اس میں صرف 'شعر العجم' کے پانچوں حصے داخلِ نصاب ہیں۔ ایک سال اس پرچے میں یہ سوال بھی تھا۔ ''اس پر بحث کرو کہ شبلی مورخ سے زیادہ نقاد ہیں۔'' مقصود یہ تھا کہ ان کی تاریخ نویسی کی خامیاں اور تنقید و تبصرہ کی خوبیاں دکھائی جائیں۔

(۲) پروفیسر محمود شیرانی کا مضمون مطبوعہ رسالہ اُردو (۱۹۲۶ء) دیکھنا چاہیے۔

کتابیں ان کی تالیفات کے ہم موضوع ہوتی تھیں ان کی کھلے دل سے داد نہ دیتے تھے۔
'شعر العجم' کے دیباچے میں علامہ سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں:۔

عجب اتفاق کہ اس وقت اسی عنوان پر ہندوستان اور یورپ کے دو اور اکابرِ مصنفین بھی قلم اٹھا چکے تھے۔ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد لاہور میں اور پروفیسر براؤن انگلینڈ میں۔ ۱۹۰۷ء میں اِدھر لاہور سے سخندانِ پارس' نکلی، اور اُدھر انگلینڈ سے 'لٹریری ہسٹری آف پرشیا' شائع ہوئی۔ لیکن 'شعر العجم' کے مصنف کا معیارِ تخیل ان دونوں سے الگ رہا۔ ۶ مئی ۱۹۰۷ء کے خط میں مولانا لکھتے ہیں:۔

''آزاد کا سخندانِ پارس حصہ دوم نکلا۔ سبحان اللہ! لیکن الحمد للہ کہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا۔''

(مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۱۳۷)

اس کے بعد سیّد صاحب لکھتے ہیں:۔

اپریل ۱۹۰۷ء میں مولانا کو ایک دوست کے خط سے براؤن کی تصنیف کا حال معلوم ہوا۔ چنانچہ انھیں کے ذریعہ سے کتاب منگوائی اور پڑھوا کر سنی۔ اس کا جو اثر ہوا وہ حسب ذیل ہے:۔

''بلا مبالغہ اور بلا تصنع کہتا ہوں کہ براؤن کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا۔ نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہے۔ برادر اسحٰق سے پڑھوا کر سنی، خود بھی الٹ پلٹ کر دیکھی۔ فردوسی کی نسبت صرف دو تین صفحے لکھے ہیں، جس میں اس کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔ مذاق اتنا صحیح ہے کہ آپ فردوسی کا درجہ ''سبعہ معلقہ'' کے برابر بھی نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کہ کسی حیثیت سے یہ کتاب اور شعرائے فارسی کے کلام کے برابر نہیں۔ میں مع سود و ہرجہ کے آپ سے دام واپس لوں گا۔''

پروفیسر براؤن کی ''ادبی تاریخ ایران'' کو ''عامیانہ اور سوقیانہ'' کہنا علامہ شبلی کی ''سخن فہمی'' کی عجیب و غریب مثال ہے۔ براؤن کی تاریخ اس درجے کی کتاب ہے کہ علامہ شبلی اگر کوشش کرتے تو ایسی نہ لکھ سکتے۔ المامون اور الفاروق میں تحقیق و تلاش کی نوعیت اور تھی۔ کسی ملک و قوم کی تہذیب و تمدن اور اس کی روشنی میں زبان و ادب کی تاریخ جن اصول پر یورپ میں لکھی جاتی ہے، وہ علامہ موصوف کے فہم و دسترس سے بالاتر تھے۔ جس کا ایک ثبوت یہی ہے کہ وہ ''برادر اسحٰق سے پڑھوا کر'' اور ''خود الٹ پلٹ کر'' یہ نہ دیکھ سکے کہ اس میں کیا ہے۔ بلکہ یہ دیکھا کہ کیا نہیں ہے۔ علامہ شعر فہمی اور نکتہ سنجی کے مرد میدان تھے۔ اُس

وقت فردوسی زیرِ مطالعہ تھا (جس پر ۵۷ صفحے لکھے ہیں) اس لیے براؤن کے ہاں اسی کو دیکھا اور یہ دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ اس نے دو تین صفحے لکھے ہیں۔ ساری کتاب پر ریویو کرنے کے لیے گویا یہ نظر ہی کافی تھی۔ پروفیسر براؤن نے علامہ شبلی کی یہ رائے دیکھی ہوگی تو مزہ لیا ہوگا۔

اس کے مقابلے میں پروفیسر صاحب کی انصاف پسندی اور کشادہ دلی قابلِ دید ہے۔ تاریخِ براؤن اور تذکرۂ شبلی کی پہلی جلدیں ساتھ نکلیں۔ اس کے بعد دونوں اپنی اپنی کتابیں آگے لکھ رہے تھے۔ علامہ نے اپنی تصنیف پہلے ختم کردی۔ پروفیسر بعد تک لکھتے رہے۔ انھوں نے شعرالعجم دیکھی، اور اپنی بعد کی جلدوں میں اس کی بڑی تعریف لکھی۔ اور علامہ کی سخن سنجی کی بہت داد دی۔ تیسری جلدیں جہاں فیضؔی، عرفؔی، نظیرؔی، صائبؔ وغیرہ کا پروفیسر صاحب نے تذکرہ لکھا ہے، ہر شاعر کے بیان میں سب سے پہلے علامہ شبلی اور شعر العجم کا حوالہ دیا ہے۔ ایک جگہ مقابلۂ شعراء کے موقع پر لکھا کہ یہ کام شبلی نے نہایت عمدہ کیا ہے۔ چنانچہ بعض شاعروں کا موازنہ جو علامہ نے کیا تھا، اسی کو اعتراف و حوالہ کے ساتھ بجنسہٖ اپنی کتاب میں درج کر دیا۔

علامہ شبلی نے جو کام کیا، یعنی شعرا کا موازنہ خصوصیات کلام کا احاطہ، بہترین کلام کا انتخاب اور تنقید، یہ پروفیسر براؤن کے بس کا نہ تھا۔ "ہر کسے را بہر کارے ساختند" براؤن کیا، کوئی یورپین ہو فارسی شاعری کی لطافتوں اور نزاکتوں کو مشکل سے سمجھ سکتا ہے۔ یہ لوگ صرف شاعری کے موضوع، نظم کے مضمون، اسلوب کے ظاہری محاسن، صنایع و بدائع کو سمجھ سکتے ہیں اور ان پر بحث کر سکتے ہیں۔ علم معانی سے جو خوبیاں متعلق ہیں ان کا سمجھنا ان کے لیے بہت دشوار ہے۔ الفاظ کی موزونیت، لفظ و معنی کا تناسب، روزمرہ کی نزاکت، محاورہ کی لطافت، بلکہ خیال کی پاکیزگی اور طرزِ ادا کی ندرت کو بھی مستشرقین یورپ میں سب نہیں سمجھ سکتے۔

اس لیے اگر پروفیسر براؤن "شاہنامہ" کی شاعرانہ خوبیوں کی داد نہ دے سکے تو اس پر علامہ شبلی کو طعنہ دینے کا محل نہ تھا۔ باقی علامہ نے یہ بات غلط لکھی کہ براؤن نے

فردوسی پر دو تین صفحے لکھے ہیں۔ ان کی ہسٹری کی پہلی جلد میں شاہنامہ کے تاریخی مضامین اور ماخذ دس صفحے میں لکھے ہیں، اور شاہنامہ کا منظوم انگریزی ترجمہ لکھا ہے۔ اور پھر دوسری جلد میں فردوسی وشاہنامہ کا ذکر بارہ صفحوں میں کیا ہے۔ یہ ۲۲ صفحے وسعت میں شعرالعجم کے ۴۰ صفحوں سے کم نہیں ہیں۔

تصانیفِ شبلی کے نمونے: (۱) المامون، علامہ شبلی کی مستقل تصانیف میں سب سے پہلی ہے۔ اس کا سبب تالیف پہلے بیان ہو چکا ہے۔ رایل ہیروز آف اسلام (نامور فرماں روایانِ اسلام) کا سلسلہ اس کتاب سے شروع ہوا۔ علی گڈھ کالج کے زمانۂ ملازمت میں لکھی گئی اور ۱۸۸۹ء کے شروع میں کالج کی طرف سے چھاپ کر شائع کی گئی۔ اس قدر مقبول ہوئی کہ چند مہینے میں سب جلدیں فروخت ہو گئیں اور اسی سال اکتوبر میں دوبارہ چھاپی گئی۔ سرسیّد نے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ ۱۲/ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو لکھا ہے۔ اس کی زبان کے متعلق سرسیّد کی رائے پہلے لکھی جا چکی ہے۔ دیباچہ میں اس کے طرزِ بیان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

''اُردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے، مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لیے زبان کا طرزِ بیان جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناول میں تاریخانہ طرز کو کیسی ہی فصاحت وبلاغت سے برتا گیا ہو، دونوں کو برباد کرتا ہے۔

ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے، اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح ودلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔ جو خوبصورت، خوبصورت ہے، جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے۔ نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے، اور نہ بھونڈی کو زیادہ بھونڈا۔ اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔''

(سیّد احمد خاں، سکریٹری مدرسۃ العلوم)

'المامون' کے دو حصے یکجا ہیں۔ پہلے حصے میں خلافتِ عباسیہ کے قیام کا حال اور مامون الرشید خلیفۂ ششم کے زمانے تک کی خانہ جنگیاں بیان کی ہیں، اور وہ اسباب لکھے ہیں جن سے (بقول سرسیّد) ''امین اس کا بھائی محروم اور مقتول اور خود مامون تمام مملکت

اسلامی کا مالک الملک لاشریک لہٗ بن گیا۔" دوسرے حصے میں (بالفاظِ سرسیّد) "انتظام سلطنت اور اُس کی جزئیات کو جہاں جہاں سے ملیں، چُن چُن کر ایک جگہ جمع کیا ہے۔ اور المامون کی خصلت اور اس کی سوشل حالت اور اس کی پرائیوٹ زندگی، اس کے مشغلوں اور اس کی مجلسوں کا ذکر کیا ہے۔"

مولانا حالؔی کی 'حیاتِ سعدی' اس سے پہلے شائع ہوئی ہے اور تاریخ تحقیق اور سیرت کی خوبی ترتیب کے لحاظ سے بلاشبہ وہ اُردو میں پہلی تصنیف ہے۔ لیکن علامہ شبلی کا یہ پہلا کارنامہ تحقیق و ترتیب دونوں میں کچھ کم وقیع نہیں ہے۔ سرسیّد 'المامون' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

اس قدر جزئیات کو تلاش کرنا اور نظم اسلوب سے ایک جگہ جمع کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس کے حاشیوں پر جس قدر کتابوں کے حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کس قدر جانکاہی ہوئی ہوگی، اور مصنف کو کتنے ہزاروں ورق تاریخوں کے الٹنے پڑے ہوں گے۔ اور اسی کے ساتھ جب یہ خیال کیا جائے کہ مصنف نے ان جزئیات کو ایسی کتابوں سے تلاش کر کے نکالا ہے جن کی نسبت خیال بھی نہ ہوتا کہ ان میں مامون کے حالات ہوں گے، تو اس محنت کی وقعت وقدر اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

یہ کام حقیقت میں بہت زیادہ دشوار ہے، لیکن علامہ شبلی نے اپنے علم وفضل، وسعت مطالعہ سے اور اس سے زیادہ اپنے ذوق صحیح اور دقتِ نظر سے ایسی خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ اُردو میں اس سے بہتر نمونہ موجود نہ تھا۔ یہ اقلیم تحقیق 'المامون' سے شروع ہو کر پھر علامہ کے قلم رو سے نہ نکلی۔ اور اسی دشت کی سیاحی میں عمر گذر گئی۔ اس کے بعد جس کتاب کے لکھنے کو قلم اٹھایا وہ تحقیق ہی کا ایک نیا میدان تھا۔ 'سیرۃ النبیؐ' تک یہی جولانی جاری رہی۔

'المامون' کی زبان و بیان کے متعلق سرسیّد کی جو رائے لکھی گئی، وہ بالکل درست ہے۔ لیکن خود علامہ کی بعد کی تصانیف کے مقابلے میں اس کتاب کا اسلوب زیادہ پختہ اور منجھا ہوا نہیں ہے۔ 'الفاروق' اور اس کے بعد کی کتابوں میں، خصوصاً 'موازنہ'، 'شعر العجم' اور 'سیرۃ النبیؐ' میں اور اس زمانے کے مضامین میں ایسا زور، صفائی اور الفاظ و مضمون

کا باہمی تناسب (یعنی بلاغت) ہے کہ ان کے اسلوب میں ایک تڑپ اور چمک پیدا ہو گئی ہے، اور اسی وصف کے سبب سے وہ اپنے زمانے کے بہترین انشا پرداز ہیں۔

جس زمانے میں 'المامون' لکھی گئی، علامہ شبلی پر سرسیّد کا اثر نیا نیا تھا۔ اس لیے اس کتاب میں انگریزی کے الفاظ کہیں کہیں پائے جاتے ہیں، ورنہ جیسا ہم نے پہلے لکھا ہے، انھوں نے اس روش کی نازیبائی کو سمجھ لیا، اور شروع کے مضامین و تصانیف کے بعد بے ضرورت انگریزی الفاظ نہیں لکھے۔ 'المامون' سے دو ایک مثالیں لکھی جاتی ہیں:۔

(۱) ''یہی ایک چیز ہے جو قومی فیلنگ اور قومی خوشی کو زندہ رکھ سکتی ہے۔''

(دیباچہ مصنف)

(۲) ''مامون کی فیاض لائف پر اگر کچھ نکتہ چینی ہو سکتی ہے۔'' (المامون صفحہ ۱۱۳)

(۳) ''تاہم مامون نے وہی کیا جو سچے کانشنس کی رو سے اس کو کرنا چاہیے تھا۔'' (صفحہ ۱۷)

'المامون' کے نمونے یہ ہیں:۔

(الف) طاہر ذوالیمینین خلیفہ مامون الرشید کا معتمد علیہ تھا۔ اسی نے مامون کے بھائی امین سے جنگ کر کے اس کو گرفتار کیا تھا اور پھر قید خانہ میں قتل کیا تھا۔ اس طرح اسی شخص کے ذریعہ سے مامون کو سلطنت ہاتھ آئی تھی۔ اس کا ایک واقعہ علامہ شبلی لکھتے ہیں:۔

طاہر کا خراسان کی حکومت پر مقرر ہونا ۲۰۵ھ

اس سال کی ایک عجیب تقریب سے طاہر کو اپنے کارہائے نمایاں کا مناسب صلہ ملا، یعنی وہ کل مشرقی حکومت پر جس کی دارالخلافہ بغداد سے شروع ہو کر سندھ تک منتہی ہوتی ہے، نائب السلطنت مقرر ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک رات طاہر مامون کی بزم عیش میں حاضر ہوا۔ مامون بادہ نوشی کے مزے لے رہا تھا۔ بے تکلفی سے اس نے دو پیالے طاہر کو بھی مرحمت کئے، اور اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دی۔ طاہر نے باادب عرض کیا کہ ''میرا منصب اس عزت کا مستحق نہیں ہے۔'' مامون نے کہا ''یہ قیدیں دربار عام کے لئے مخصوص ہیں، بے تکلفی کے جلسوں میں اس قسم کی قواعد کی پابندی ضروری

نہیں۔" طاہر آداب بجالا کر بیٹھ گیا۔ مامون نے اس کی طرف نگاہ کی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ طاہر نے عرض کی کہ" اب کیا آرزو باقی رہی ہے جس کا حضور رنج کر سکتے ہیں۔" مامون نے کہا" کچھ ایسی بات ہے جس کے پوشیدہ رکھنے میں تکلیف اور ظاہر کرنے میں ذلّت ہے۔" طاہر اس وقت تو چُپ ہو رہا مگر دل میں خلش پیدا ہوئی کہ آخر بات کیا ہے۔ حسین جو مامون کا ساقی اور ندیم خاص تھا طاہر نے اسے دو لاکھ درہم نذر بھیجے اور درخواست کی کہ اس دن کے واقعے کا سبب دریافت کر دے۔ جس نے موقع پا کر پوچھا۔ مامون نے کہا" اگر یہ بات آگے بڑھی تو سر اُڑا دوں گا۔ سچ یہ ہے کہ جب طاہر میرے سامنے آتا ہے تو بھائی امین کا ذلّت و بیکسی سے مارا جانا یاد آتا ہے۔ میرے ہاتھ سے ضرور کسی دن طاہر کو گزند پہنچے گا۔" طاہر کو یہ بات معلوم ہوئی تو احمد بن ابی خالد الاحول کے پاس گیا (حسن بن سہل کے بعد وزیر مقرر ہوا تھا) اور کہا کہ تم جانتے ہو کہ میں احسان فراموش نہیں ہوں اور میرے ساتھ بھلائی کرنی فائدے سے خالی نہیں۔ میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مامون کی آنکھ سے دور رہوں۔ احمد بن ابی خالد نے اس کا ذمہ لیا۔ اور دوسرے دن صبح کے وقت مامون کے پاس حاضر ہوا۔ چونکہ چہرے سے تردد اور پریشانی نمایاں تھی۔ مامون نے پوچھا:- کیوں کوئی نئی بات ہے۔

احمد۔ حضور مجھے تو ساری رات نیند نہیں آئی۔

مامون۔ آخر کیوں۔

احمد۔ میں نے سنا ہے کہ حضور نے خراسان کی حکومت غسّان کو دی جس کے ساتھ مٹھی بھر سے زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ اگر ترکوں نے سرحد پر حملہ کیا تو کیا غسّان ان کو روک سکے گا۔

مامون۔ یہ خیال تو مجھ کو بھی تھا۔ اچھا تم کس کو تجویز کرتے ہو۔

احمد۔ طاہر ذوالیمینین سے بہتر کون شخص انتخاب ہو سکتا ہے۔

مامون۔ مگر اس کے خیالات تو باغیانہ ہیں۔ اور وہ نقض بیعت پر آمادہ ہے۔

احمد۔ اس کا ذمہ دار میں ہوں۔

طاہر طلب ہوا اور سند حکومت کے ساتھ ایک کروڑ درہم بھی جو عموماً خراسان کے گورنروں

کو ملتے تھے، عطا ہوئے۔ طاہر نے ایک مہینے میں ساز و سامانِ سفر درست کیا اور ۲۹ رذی قعدہ ۲۰۵ھ کو خراسان روانہ ہوا۔ طاہر کا بیٹا اس کے بعد صاحب الشرطہ مقرر ہوا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس کی ذاتی لیاقت نے مصر کی گورنری تک پہنچا دیا۔ تقرر کے بعد مامون نے اس کو اپنے سامنے بلایا اور کہا "یوں تو ہر شخص اپنی اولاد کی نسبت حسن ظن رکھتا ہے، لیکن طاہر نے جو کچھ تمھاری تعریف میں کہا اس سے کم کہا جس کے تم دراصل مستحق تھے۔" طاہر نے جب یہ مژدہ سنایا تو بیٹے کو ایک نہایت مفصل خط لکھا جو آئینِ حکومت، انتظام ملکی، رفاہِ رعایا کے متعلق ایک نہایت مدبرانہ دستور العمل تھا۔ یہ خط اس قدر مقبول ہوا کہ تمام لوگوں نے اس کی نقلیں لیں۔ خود مامون نے اس کی باضابطہ نقلیں عموماً حکام سلطنت کے پاس بھجوائیں۔ اور کہا کہ طاہر نے دنیا و دین و تدبیر و رائے و سیاست و اصلاح ملک و حفاظت سلطنت و قیام خلافت کے متعلق کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی۔

(ب) مامون کے عیش و طرب کے جلسوں میں گو عیاشانہ رنگینی پائی جاتی ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ یہ جلسے علمی مذاق سے بالکل خالی بھی نہ تھے۔ اس قسم کے جلسے جو شاعرانہ جذبات کو پورے جوش کے ساتھ ابھار دیتے ہیں۔ اگر متانت اور تہذیب کے ساتھ ہوں تو لٹریچر پر نہایت وسیع اور عمدہ اثر پیدا کرتے ہیں۔ مامون خود سخن سنج اور موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ یارانِ مجلس بھی عموماً نازک خیال اور نکتہ شناس تھے۔ بات بات پر شاعرانہ لطیفے ایجاد ہوتے، کبھی موسیقی کی بحث چھڑ جاتی۔ کسی وقت مامون کے فی البدیہہ مصرعوں یا شعروں پر شعرا کی طبع آزمائیوں کا امتحان ہوتا۔ ایک دن بزمِ عیش آراستہ تھی۔ بادہ و جام کا دور تھا۔ بیس عیسائی کنیزیں دیبائے رومی کے لباس پہنے، گردنوں میں سونے کی صلیبیں، کمر میں زرّیں زنار، ہاتھوں میں گلدستے لئے ہوئے، بزم میں جلوہ آرا تھیں۔ یہ سماں ایسا نہ تھا کہ مامون دل پر قابو رکھ سکتا۔ بیساختہ چند اشعار زبان سے نکلے۔ اور احمد بن صدقہ ایک مغنی کو بلا کر شعروں کے گانے کی فرمائش کی۔ احمد کی نغمہ سرائی کے ساتھ کنیزیں ناچنے کھڑی ہو گئیں۔ ان کی مخمور آنکھیں اور جامِ شراب مامون کو بدمست کرنے میں یکساں کام دے رہے تھے۔ وہ بالکل سرشار ہو گیا اور حکم دیا کہ ان نازنینوں کے قدم پر تین اشرفیاں نثار کی

جاویں۔ مامون کا چچا ابراہیم جس کے ادعائے خلافت کا حال پہلے حصہ میں گزر چکا ہے، اور جو موسیقی کا بڑا استاد اور اس فن میں اسحٰق موصلی کی ہمسری کا دعویٰ رکھتا تھا، اس دن بزمِ عیش میں حاضر تھا۔ مامون کے دائیں بائیں حور وش کنیزیں ایک سُر میں عود چھیڑ رہی تھیں۔ اسحٰق بھی حاضر ہوا اور آنے کے ساتھ ٹھٹک سا گیا۔

مامون۔ ''کیوں اسحٰق! کوئی بے اصول آواز کان میں آرہی ہے۔''

اسحٰق۔ ''حضور ہاں''

مامون۔ (ابراہیم کی طرف مخاطب ہوکر) ''تم اس سوال کا کیا جواب دیتے ہو۔''

ابراہیم۔ ''نہیں۔''

مامون نے اسحٰق کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔ ''اب میں بہ تعین بتا دیتا ہوں کہ اس صف میں کس تار پر غلط مضراب پڑ رہی ہے۔'' ابراہیم نے اس طرف کان لگا کر سنا، مگر پھر تمیز نہ ہوئی۔ اسحٰق نے ایک خاص کنیز کی طرف اشارہ کیا کہ وہ تنہا بجائے۔ اور سب ہاتھ روک لیں۔ اب ابراہیم سمجھ گیا اور اپنی ناواقفیت پر نادم ہوا۔

مامون نے کہا ''ابراہیم، اسی ۸۰ تاروں کی یکساں اور مشتبہ گونج میں ایک غلط صدا جس کے کان میں کھٹک جائے اور اس کو بہ تعین بتا دے تم اس کی ہمسری کا کیوں کر دعویٰ کر سکتے ہو۔''

شاید یہ پہلا دن تھا کہ ابراہیم نے صریح لفظوں میں اسحٰق کی فضیلت کو تسلیم کر لیا۔

(۲) سیرۃ النعمان، امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری ہے۔ ۱۵ ردسمبر ۱۸۹۳ء کو علامہ شبلی نے علی گڈھ میں اس کو ختم کیا۔ تقریبِ تصنیف پہلے بیان ہوئی ہے۔ اس کے بھی دو حصے یکجا ہیں۔ پہلے میں امام صاحب کے ذاتی حالات و فضائل ہیں۔ اور دوسرے میں ان کے اصول فقہ اور علم الکلام سے بحث کی ہے۔ یہی حصہ علامہ شبلی کا اصلی کارنامہ ہے۔ یہ مسائل اس ترتیب سے اُردو کیا فارسی و عربی میں بھی نہ تھے۔ ترتیب و تالیف میں علامہ کی جدت اور مسائل کے فیصلے اور محاکمے میں ان کا اجتہاد شامل ہے۔ یہی اجتہاد علامہ اور علماء کے درمیان اختلاف کا باعث ہوا۔

دونوں حصوں میں سے ایک ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:-

(الف) ذہانت وطبّاعی۔ امام صاحب کی ذہانت وطبّاعی عموماً ضرب المثل ہے، یہاں تک کہ ان کا اجمالی ذکر بھی کہیں آجاتا ہے تو ساتھ ہی یہ صفت بھی ضرور بیان کی جاتی ہے۔ علامہ ذہبی نے عبر فی اخبار من غبر میں ان کا ترجمہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے۔ تاہم اس فقرے کو نہ چھوڑ سکے کہ کَانَ مِنْ اَذْکیاء بنی ادم یعنی "اولاد آدم میں جو نہایت ذکی گزرے ہیں، امام ابو حنیفہ ان میں شمار کئے جاتے ہیں۔" مشکل سے مشکل مسئلوں میں ان کا ذہن اس تیزی سے لڑتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ اکثر موقعوں پر ان کے ہم عصر جو معلومات کے لحاظ سے ان کے ہم سر تھے موجود ہوتے تھے۔ ان کو اصل مسئلہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جو واقعہ در پیش ہوتا تھا اس سے مطابق کر کے فوراً جواب بتا دینا امام صاحب ہی کا کام تھا۔

ایک شخص کسی بات پر اپنی بیوی سے ناراض ہوا، اور قسم کھا کر کہا "جب تک تو مجھ سے نہ بولے گی میں بھی تجھ سے کبھی نہ بولوں گا۔" عورت تند مزاج تھی۔ اس نے بھی قسم کھالی اور وہی الفاظ دہرائے جو شوہر نے کہے تھے۔ اس وقت تو غصہ میں کچھ نہ سوجھا۔ مگر پھر خیال آیا تو دونوں کو بہت افسوس ہوا۔ شوہر امام سفیان ثوری کے پاس گیا اور صورت واقعہ بیان کی۔ سفیان نے کہا "قسم کا کفارہ دینا ہوگا۔ اس میں کوئی چارہ نہیں۔" مایوس ہو کر لوٹا اور امام ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ للہ آپ کوئی تدبیر بتایئے۔ امام صاحب نے فرمایا۔ جاؤ شوق سے باتیں کرو کسی پر کفارہ نہیں۔ امام سفیان ثوری کو معلوم ہوا تو نہایت برہم ہوئے اور امام ابو حنیفہ سے جا کر کہا کہ آپ لوگوں کو غلط مسئلے بتا دیا کرتے ہیں۔ امام صاحب نے اس شخص کو بلا بھیجا اور کہا تم دوبارہ واقعہ کی صورت بیان کر جاؤ۔ اس نے اعادہ کیا۔ امام صاحب سفیان کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا کہ میں نے جو پہلے کہا تھا اب بھی کہتا ہوں۔ سفیان نے کہا۔ کیوں؟ فرمایا "جب عورت نے شوہر کو مخاطب کر کے وہ الفاظ کہے تو عورت کی طرف سے بولنے کی ابتدا ہو چکی، پھر قسم کہاں باقی رہی۔" سفیان نے کہا حقیقت میں آپ کو جو بات وقت پر سوجھ جاتی ہے ہم لوگوں کا وہاں خیال تک نہیں پہنچتا۔

کوفہ میں ایک شخص نے بڑی دھوم دھام سے ایک ساتھ اپنے دو بیٹوں کی شادی کی۔ ولیمہ کی دعوت میں تمام اعیان و اکابر کو مدعو کیا۔ مسعر بن کدام، حسن بن صالح، سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ شریک دعوت تھے۔ لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ دفعتاً صاحب خانہ بدحواس گھر سے نکلا اور کہا غضب ہو گیا! لوگوں نے کہا "خیر ہے؟" بولا کہ زفاف کی رات عورتوں کی غلطی سے شوہر اور بی بیاں بدل گئیں۔ جو لڑکی جس کے پاس رہی وہ اس کا شوہر نہ تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ سفیان نے کہا امیر معاویہ کے زمانے میں بھی ایسا ہی اتفاق ہوا تھا۔ اس سے نکاح میں کچھ فرق نہیں آتا۔ البتہ دونوں کو مہر دینا لازم ہو گا۔ مسعر بن کدام حضرت امام ابو حنیفہ کی طرف مخاطب ہوئے کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ شوہر خود میرے سامنے آئیں تو جواب دوں۔ لوگ جا کر بلا لائے۔ امام صاحب نے دونوں سے الگ الگ پوچھا کہ رات کو جو عورت تمھارے ساتھ رہی، وہی تمھارے نکاح میں رہے تو تم کو پسند ہے۔ دونوں نے کہا ہاں۔ امام صاحب نے کہا کہ تم اپنی بی بیوں کو جن سے تمھارا نکاح بندھا تھا طلاق دے دو اور ہر شخص اس عورت سے نکاح پڑھا لے جو اس کے ساتھ ہم بستر رہ چکی۔ سفیان نے جو جواب دیا اگرچہ فقہ کی رو سے وہ بھی صحیح تھا۔ کیونکہ یہ صورت وطی بالشبہ کی ہے جس سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔ لیکن امام صاحب نے مصلحت کو پیشِ نظر رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ موجودہ صورت میں نکاح کا قائم رکھنا غیرت و حمیت کے خلاف ہو گا۔ کسی مجبوری سے زوجین نے تسلیم بھی کر لیا تو دونوں میں وہ خلوص و اتحاد نہ پیدا ہو گا جو تزویج کا اصلی مقصود ہے۔ اس کے مہر کی بھی تخفیف ہے۔ کیونکہ خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی جائے تو صرف آدھا مہر لازم آتا ہے۔

لیث بن سعد جو مصر کے مشہور امام تھے ان کا بیان ہے کہ میں ابو حنیفہ کا ذکر اکثر سنا کرتا تھا اور ان کے دیکھنے کا مشتاق تھا۔ حج کی تقریب سے مکہ معظمہ جانا ہوا۔ اتفاق سے ایک مجلس میں پہنچا۔ دیکھا تو بڑا ہجوم ہے۔ ایک شخص صدر کی جانب بیٹھا ہے اور لوگ اس سے مسئلے پوچھ رہے ہیں۔ ایک شخص نے بڑھ کر کہا "یا ابا حنیفہ" (یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کو پہچانا) امام ابو حنیفہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے کہا "میرا ایک بدمزاج بیٹا

ہے۔اس کی شادی کر دیتا ہوں تو بیوی کو طلاق دے دیتا ہے۔لونڈی خرید دیتا ہوں تو آزاد کر دیتا ہے۔فرمایئے کیا تدبیر کروں؟" امام ابو حنیفہ نے برجستہ کہا "تم اس کو ساتھ لے کر بازار میں جہاں لونڈیاں بکتی ہیں جاؤ۔ جو لونڈی پسند آئے خرید کر اس کا نکاح پڑھا دو۔اب اگر وہ اسے آزاد کرے گا تو نہیں کر سکتا۔کیونکہ لونڈی اس کی ملک نہیں۔طلاق دے گا تو تمھارا کچھ نقصان نہیں، تمھاری لونڈی کہیں نہیں گئی۔سعد کہتے ہیں کہ مجھ کو جواب پر تو کم مگر حاضر جوابی پر بہت تعجب ہوا۔

ربیع جو خلیفہ منصور کا عرض بیگی تھا۔امام ابو حنیفہ سے عداوت رکھتا تھا۔ایک دن امام صاحب حسب الطلب دربار میں گئے۔ربیع بھی حاضر تھا۔منصور سے کہا کہ حضور یہ شخص امیر المومنین کے جد بزرگوار (عبد اللہ بن عباس) کی مخالفت کرتا ہے۔اُن کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے اور دو ایک روز کے بعد انشاء اللہ کہہ لے تو وہ قسم میں داخل سمجھا جائے گا اور قسم کا پورا کرنا کچھ ضرور نہ ہوگا۔ابو حنیفہ اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ انشاء اللہ کا لفظ قسم کے ساتھ ہو تو البتہ جزو قسم سمجھا جائے گا ورنہ لغو اور بے اثر ہے۔امام صاحب نے کہا امیر المومنین! ربیع کا خیال ہے کہ لوگوں پر آپ کی بیعت کا کچھ اثر نہیں۔منصور نے کہا کیونکر؟ امام صاحب نے کہا "ان کا گمان ہے کہ جو لوگ دربار میں آپ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کرتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں گھر پر جا کر انشاء اللہ کہہ لیا کرتے ہیں۔جس سے قسم بے اثر ہو جاتی ہے اور ان پر شرعاً کچھ مواخذہ نہیں رہتا۔منصور ہنس پڑا اور ربیع سے کہا تم ابو حنیفہ کو نہ چھیڑا کرو، ان پر تمھارا داؤ نہیں چل سکتا۔" امام صاحب دربار سے نکلے تو ربیع نے کہا "آج تو آپ میری جان ہی لے چکے تھے۔" فرمایا۔"یہ تو تمھارا ارادہ تھا میں نے صرف مدافعت کی۔"

(ب) ان عام مباحث کے بعد اب ہم ان خصوصیتوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے حنفی فقہ کو اور فقہوں کے مقابلے میں ترجیح حاصل ہے۔

۱۔سب سے مقدم اور قابلِ قدر خصوصیت جو فقہ حنفی کو حاصل ہے وہ مسائل کا اسرار اور مصالح پر مبنی ہونا ہے۔احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم

ہو گئے۔ ایک گروہ کی یہ رائے کہ یہ احکام تعبّدی احکام ہیں، یعنی ان میں کوئی سِر اور مصلحت نہیں۔ مثلاً شراب خوری یا فسق و فجور صرف اس لئے ناپسندیدہ ہیں کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے اور خیرات و زکوٰۃ صرف اس لئے مستحسن ہیں کہ شارع نے ان کی تاکید کی ہے، ورنہ فی نفسہٖ یہ افعال بُرے یا بھلے نہیں ہیں۔ امام شافعی کا اسی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ اور شاید اسی کا اثر تھا کہ ابوالحسن اشعری نے جو شافعیوں میں علم کلام کے بانی ہیں۔ علم کلام کی بنیاد اسی مسئلے پر رکھی۔

دوسرے فرقے کا یہ مذہب ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں۔ البتہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کی مصلحت عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن درحقیقت وہ مصلحت سے خالی نہیں۔ یہ مسئلہ اگرچہ بوجہ اس کے کہ اس کے دونوں پہلو بڑے بڑے علما نے اختیار کئے ہیں ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بن گیا ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ اس قدر بحث و اختلاف کے قابل نہ تھا۔ تمام مہمات مسائل کی مصلحت اور غایت خود کلام الٰہی میں مذکور ہے۔ کفار کے مقابلے میں قرآن کا طرزِ استدلال عموماً اسی اصول کے مطابق ہے۔ نماز کی مصلحت خدا نے خود بتائی ہے کہ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ۔ روزہ کی فرضیت کے ساتھ ارشاد ہوا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ جہاد کی نسبت فرمایا حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔ اسی طرح اور احکام کے متعلق قرآن و حدیث میں جابجا تصریحیں اور اشارے موجود ہیں کہ ان کی غرض و غایت کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب تھا اور یہ اصول ان کے مسائل فقہ میں عموماً مرعی ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ حنفی فقہ جس قدر اصول عقلی کے مطابق ہے اور کوئی فقہ نہیں۔ امام طحاوی نے جو محدث اور مجتہد دونوں تھے، اس بحث میں ایک کتاب لکھی ہے جو شرح معانی الآثار کے نام سے مشہور ہے اور جس کا موضوع یہ ہے کہ مسائل فقہ کو نصوص و طریق نظر سے ثابت کیا جائے۔ محدث مذکور نے فقہ کے ہر باب کو لیا ہے۔ اور اگرچہ انصاف پرستی کے ساتھ بعض مسئلوں میں امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی ہے لیکن مسائل کی نسبت مجتہدانہ طرزِ استدلال سے ثابت کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب احادیث اور طریقِ نظر دونوں کے موافق ہے۔ امام محمد

نے بھی 'کتاب الحج' میں اکثر مسائل میں عقلی وجوہ سے استدلال کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں چھپ گئی ہیں اور ہر جگہ ملتی ہیں جس کو تفصیل مقصود ہوان کتابوں کی طرف رجوع کرے۔ اس دعویٰ سے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب عقل کے موافق ہے شافعیہ وغیرہ کو بھی انکار نہیں۔ اور وہ انکار کیوں کرتے۔ ان کے نزدیک احکام شرعیہ خصوصاً عبادات بھی جس قدر عقل سے بعید ہوں اسی قدر ان کی خوبی ہے۔

امام رازی نے زکوٰۃ کی بحث میں لکھا ہے کہ امام شافعی کا مذہب امام ابوحنیفہ سے زیادہ صحیح ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ امام شافعی کا مذہب عقل وقیاس سے بعید ہے اور یہی اس کی صحت کی دلیل ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کے مسائل زیادہ تر تعبّدی احکام میں جن میں عقل و رائے کو دخل نہیں۔

بخلاف اور ہم عصروں کے امام ابوحنیفہ کا اس اصول کی طرف مائل ہونا ایک خاص سبب تھا۔ دوسرے ائمہ جنھوں نے فقہ کی تدوین وترتیب کی ان کی علمی ابتدا فقہی مسائل سے ہوئی تھی۔ بخلاف اس کے امام ابوحنیفہ کی تحصیل علم کلام سے شروع ہوئی، جس کی ممارست نے ان کی قوت فکر اور حدت نظر کو نہایت قوی کر دیا تھا۔ معتزلہ وغیرہ جن سے ان کے معرکے رہے تھے، عقلی اصول کے پابند تھے۔ اس لئے امام صاحب کو بھی ان کے مقابلے میں انھیں اصول سے کام لینا پڑتا تھا۔ اور متنازعہ فیہ مسئلوں میں مصالح واسرار کی خصوصیتیں دکھانی پڑتی تھیں، اس قدر غور اور تدقیق، مشق ومہارت سے ان کو ثابت ہو گیا تھا کہ شریعت کا ہر مسئلہ اصول عقل کے مطابق ہے۔ علم الکلام کے بعد وہ فقہ کی طرف متوجہ ہوئے تو ان مسائل میں بھی وہی جستجو رہی، حنفی فقہ کے مسائل کا دوسری فقہوں کے مسائل سے مقابلہ کیا جائے تو یہ تفاوت صاف نظر آتا ہے۔ معاملات تو معاملات، عبادات میں بھی جس کی نسبت ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ اس میں عقل کو دخل نہیں۔ امام صاحب کے مسائل عموماً عقل کے موافق معلوم ہوتے ہیں۔

اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ شریعت میں کن مصلحتوں سے فرض کیے گئے ہیں اور ان مصالح کے لحاظ سے ان احکام کی بجا آوری کا کیا طریقہ ہونا

چاہئے تو وہی طریقہ موزوں ثابت ہوگا جو حنفی فقہ سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً نماز چند افعال کے مجموعے کا نام ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ نماز کی اصل غرض کیا ہے؟ (یعنی خضوع، اظہار تعبّد، اقرار عظمت الٰہی، دُعا) اور اس کے حاصل ہونے میں افعال کو کس نسبت سے دخل ہے۔ ان افعال کے مراتب مختلف ہیں بعض لازمی اور ضروری ہیں کیونکہ ان کے نہ ہونے سے نماز کی اصل غرض فوت ہوتی ہے۔ ان افعال کو شریعت کی زبان میں 'فرض' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض افعال ایسے ہیں جو طریقہ ادا میں ایک حسن وخوبی پیدا کردیتے ہیں لیکن ان کے فوت ہونے سے اصل غرض فوت نہیں ہوتی ان افعال کا رتبہ پہلی قسم سے کم ہے۔ اور ان کو 'سنت' 'مستحب' سے تعبیر کرتے ہیں۔

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرض وواجب وسنت کی تصریح نہیں فرمائی۔ لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ نماز کے تمام افعال یکساں درجہ نہیں رکھتے۔ اس لئے تمام مجتہدین نے ان کے امتیاز پر توجہ کی اور استنباط اجتہاد کی رو سے ان افعال کے مختلف مدارج قائم کئے۔ اور ان کے جدا جدا نام رکھے۔ امام ابوحنیفہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن اس باب میں ان کو اور ائمہ پر جو ترجیح ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے جن افعال کو جس رتبہ پر رکھا در حقیقت ان کا وہی رتبہ تھا۔ مثلاً سب سے ضروری امر یہ ہے کہ نماز کے ارکان یعنی وہ افعال جن کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی، کیا ہیں؟ نماز چونکہ اصل میں اقرارِ عبودیت اور اظہار خشوع کا نام ہے اس لئے اس قدر تو سب مجتہدوں کے نزدیک مسلّم رہا کہ نیت، تکبیر، قرأت، رکوع، سجود وغیرہ جن سے بڑھ کر اقرار عبودیت اور اظہار خشوع کا کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔ فرض اور لازمی ہیں اور خود شارع نے ان کے لازمی اور ضروری ہونے کی طرف اشارے کئے بلکہ بعض جگہ تشریح بھی کی۔ لیکن اور ائمہ نے یہ زیادتی کی کہ ان ارکان کی خصوصیتوں کو بھی فرض قرار دے دیا۔ حالانکہ وہ خصوصیتیں لازمی نہ تھیں۔ اس لئے امام ابوحنیفہ ان کی فرضیت کے قائل نہیں۔ مثلاً امام ابوحنیفہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کے سوا اور الفاظ میں بھی ادا ہوسکتی ہے۔ جو اس کے ہم معنی ہیں (مثلاً اللہ اعظم، اللہ اجل)۔ امام شافعی کے نزدیک نہیں ہوسکتی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تکبیر اگر فارسی زبان

میں کہی جائے تب بھی جائز ہے۔امام شافعی کے نزدیک اس سے نماز باطل ہوجاتی ہے۔
امام ابوحنیفہ کے نزدیک قرانِ مجید کی کسی آیت کے پڑھنے سے قرأت کا فرض ادا ہوجاتا ہے۔امام شافعی کے نزدیک بغیر سورہ فاتحہ کے نماز ہو ہی نہیں سکتی۔
امام ابوحنیفہ کے نزدیک جو شخص عربی زبان میں قرآن پڑھنے سے معذور ہے وہ مجبوراً ترجمہ پڑھ سکتا ہے(۱) امام شافعی کے نزدیک ترجمہ سے کسی حالت میں نماز نہیں ہوسکتی۔
اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ امام ابوحنیفہ یا کسی مجتہد نے صرف قیاس سے نماز کے ارکان متعین کئے ہیں۔ائمہ نے ان ارکان کے ثبوت کے لئے عموماً احادیث کی تصریحات واشارات سے استدلال کیا ہے۔چنانچہ ہر مجتہد کے نقلی دلائل کتب فقہ میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔ہمارا یہ مطلب ہے کہ امام ابوحنیفہ کے دعووں پر جس طرح نقلی دلائل یعنی احادیث کی تصریحیں اور اشارے موجود ہیں اسی طرح عقلی وجوہ بھی ان کی صحت کے شاہد ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب شریعت کے اسرار اور مصالح کو نہایت دقیق نگاہ سے دیکھتے تھے۔

(۳) الفاروق، فاروقِ اعظم حضرت عمر بن خطّاب خلیفۂ ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت ہے۔ ''ناموَر فرماں روایانِ اسلام'' کے سلسلے کی پہلی کتاب تھی، لیکن 'المامون' کے بعد لکھی گئی۔ ۱۸ر اگست ۱۸۹۴ء کو علامہ نے مستقل طور پر 'الفاروق' کی تالیف شروع کی، اور کشمیر میں ۱۵ر جولائی ۱۸۹۸ء کو (بقول علامہ) ''پورے چار برس کے بعد یہ منزل طے ہوئی اور قلم کے مسافر نے کچھ دنوں کے لئے آرام لیا۔'' اس زمانے میں مصنف سخت علیل تھے۔ بیماری اور ضعف کی حالت میں اس کی آخری سطریں لکھیں۔علامہ کی تمام سیرت

---

(۱) امام محمد نے 'جامع صغیر' میں جو روایت کی ہے اس میں مجبوری کی قید نہیں ہے اور اسی بنا پر مخالفین نے امام صاحب پر یہ سخت اعتراض کیا ہے کہ وہ قرآن کی حقیقت و مفہوم میں الفاظ کو دخل نہیں سمجھتے۔یعنی ان کے نزدیک صرف قرآن کے معانی پر قرآن کا اطلاق ہوسکتا ہے۔بے شبہ امام صاحب کی اس غلطی کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔لیکن فقہائے حنفیہ نے دعویٰ کیا ہے کہ امام صاحب نے بالآخر اس قول سے رجوع کیا۔

کی کتابوں کے دو دو حصے ہیں۔ ایک عام حالات کا دوسرا کمالاتِ خصوصی کا۔ اس میں بھی ایسا ہی ہے۔ پہلے حصے میں حضرت عمرؓ کی زندگی کے واقعات اور فتوحات ملکی کے حالات، دوسرے میں ملکی انتظامات اور ذاتی کمالات، علامہ لکھتے ہیں کہ ''یہی دوسرا حصہ مصنف کی سعی و محنت کا تماشا گاہ ہے۔'' اور حقیقت یہ ہے کہ باوجود اعتراضات کے، جن کا ذکر کیا گیا، الفارُوق ایسی جامع اور مکمل کتاب تالیف ہوئی ہے کہ کسی زبان میں اس کا جواب موجود نہ تھا۔ اس کے بعد اُردو میں حضرت عمرؓ فاروق کی تین چار ضخیم اور متعدد مختصر سوانح عمریاں لکھی گئیں اور وہ سب علامہ شبلی کی خوشہ چینیاں ہیں۔ ایک دو کتابیں علماء نے لکھیں، اور اچھی لکھیں، لیکن تحقیق کا گُر علامہ شبلی ہی کا سکھایا ہوا تھا۔ اسلوبِ بیان کی خوبی میں کسی کی تصنیف اس کو نہیں پہنچتی۔ خود علامہ کی ادبیت 'الفاروق' میں پہلی سب کتابوں سے بہتر ہے۔

'الفاروق' علی گڈھ کی ملازمت کے زمانے میں شروع ہوئی تھی، اور حیدر آباد کی ملازمت میں ختم ہوئی۔ اور ''سلسلۂ آصفیہ'' (قائم کردہ مولوی سیّد علی بلگرامی بسر پرستی سر دقار الامراء مدار المہام دولت آصفیہ) کی ایک کڑی قرار پائی۔ دونوں حصوں کے نمونے یہ ہیں:-

(الف) یہ حصہ خاص کر بیانِ رزم میں علامہ کا زورِ قلم دکھانے کے لیے انتخاب کیا گیا ہے۔ عراق عرب کے مشہور شہر قادسیہ پر مسلمانوں نے ایرانیوں سے چند بار جنگ کی اس کا ایک معرکہ یہ تھا:-

> تیسرا معرکہ یوم العماس کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں قعقاع نے یہ تدبیر کی کہ رات کے وقت چند رسالوں اور پیدل فوجوں کو حکم دیا کہ پڑاؤ سے دور شام کی طرف نکل جائیں۔ پو پھٹے۔ سو (۱۰۰) سو (۱۰۰) سوار میدانِ جنگ کی طرف سے گھوڑے اڑاتے ہوئے آئیں اور رسالے اسی طرح برابر آتے جائیں۔ چنانچہ صبح ہوتے ہوتے پہلا رسالہ پہنچا۔ تمام فوج نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور غُل پڑ گیا کہ نئی امدادی فوجیں آ گئیں۔ ساتھ ہی حملہ ہوا۔ حسن اتفاق یہ کہ ہشام جن کو ابو عبیدہ نے شام سے مدد کے لئے بھیجا تھا۔ عین

موقع پر سات سو (۷۰۰) سواروں کے ساتھ پہنچ گئے۔ یزدجرد کو دم دم کی خبریں پہنچتی تھیں اور برابر فوجیں بھیجتا تھا۔ ہشام نے فوج کی طرف خطاب کیا اور کہا "تمھارے بھائیوں نے شام کو فتح کر لیا۔ فارس کی فتح کا جو خدا کی طرف سے وعدہ ہوا ہے وہ تمھارے ہاتھ سے پورا ہوگا۔" معمول کے موافق جنگ کا آغاز یوں ہوا کہ ایرانیوں کی فوج سے ایک پہلوان شیر کی طرح ڈکارتا ہوا میدان میں آیا۔ اس کا ڈیل ڈول دیکھ کر لوگ اس کے مقابلے سے جی چراتے تھے۔ لیکن عجیب اتفاق سے وہ ایک کمزور سپاہی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ایرانیوں نے تجربہ اٹھا کر ہاتھیوں کے دائیں بائیں پیدل فوجیں قائم کر دی تھیں۔ عمرو معدیکرب نے رفیقوں سے کہا کہ میں مقابل کے ہاتھی پر حملہ کرتا ہوں تم ساتھ رہنا ورنہ عمرو معدیکرب مارا گیا تو پھر معدی کرب پیدا نہ ہوگا۔ یہ کہہ کر تلوار میان سے گھسیٹ لی اور ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ لیکن پیدل فوجیں جو دائیں بائیں تھیں دفعتہً ان پر ٹوٹ پڑیں اور اس قدر گرد اٹھی کہ یہ نظر سے چھپ گئے۔ یہ دیکھ کر ان کی رکاب کی فوج حملہ آور ہوئی اور بڑے معرکے کے بعد دشمن پیچھے ہٹے۔ عمرو معدی کرب کا یہ حال تھا کہ تمام جسم خاک سے اٹا ہوا تھا۔ بدن پر جا بجا برچھیوں کے زخم تھے۔ تاہم تلوار قبضے میں تھی اور چلتا جاتا تھا۔ اسی حالت میں ایک ایرانی سوار برابر سے نکلا انھوں نے اس کے گھوڑے کی دُم پکڑ لی۔ ایرانی نے بار بار مہمیز کیا لیکن گھوڑا جگہ سے نہ ہل سکا۔ آخر سوار اتر کر بھاگ نکلا اور یہ اچھل کر گھوڑے کی پیٹھ پر جا بیٹھے۔

سعد نے یہ دیکھ کر کہ ہاتھی جس طرف رُخ کرتے ہیں دَل کا دَل پھٹ جاتا ہے، ضخم و سلم وغیرہ کو جو پارسی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے بلا کر پوچھا کہ اس بلائے سیاہ کا کیا علاج ہے؟ انھوں نے کہا کہ ان کی سونڈ اور آنکھیں بیکار کر دی جائیں۔ تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور کوہ پیکر اور گویا کُل ہاتھیوں کے سردار تھے۔ ایک ابیض اور دوسرا اجرب کے نام سے مشہور تھا۔ سعد نے قعقاع، عاصم، حمال، ربیل کو بلا کر کہا کہ یہ مہم تمھارے ہاتھ ہے۔ قعقاع نے پہلے کچھ سوار اور پیادے بھیج دیے کہ ہاتھیوں کو نرغہ میں کر لیں۔ پھر خود برچھا ہاتھ میں لے کر پیل سفید کی طرف بڑھے۔ عاصم بھی ساتھ تھے۔ دونوں نے

ایک ساتھ برچھے مارے کہ آنکھوں میں پیوست ہو گئے۔ ہاتھی جھرجھری لے کر پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی قعقاع کی تلوار پڑی اور سونڈ مستک سے الگ ہو گئی۔ اِدھر ربیل و حمال نے اجرب پر حملہ کیا۔ وہ زخم کھا کر بھاگا تو تمام ہاتھی اس کے پیچھے ہو لئے اور دم کی دم میں یہ سیاہ بادل بالکل چھٹ گیا۔

اب بہادروں کو حوصلہ افزائی کا موقع ملا اور اس زور کا رن پڑا کہ نعروں کی گرج سے زمین دہل دہل پڑتی تھی۔ چنانچہ اسی مناسبت سے اس معرکے کو لیلۃ الہریر کہتے ہیں۔ ایرانیوں نے فوج نئے سرے سے ترتیب دی۔ قلب میں اور دائیں بائیں تیرہ تیرہ صفیں قائم کیں۔ مسلمانوں نے بھی تمام فوج کو سمیٹ کر یکجا کیا اور آگے پیچھے تین پرے جمائے۔ سب سے آگے سواروں کا رسالہ۔ ان کے بعد پیدل فوجیں اور سب سے پیچھے تیر انداز۔ سعد نے حکم دیا کہ تیسری تکبیر پر حملہ کیا جاوے۔ لیکن ایرانیوں نے جب تیر برسانے شروع کئے تو قعقاع سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور اپنے رکاب کی فوج لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ فوجی اصول کے لحاظ سے یہ حرکت نافرمانی میں داخل تھی۔ تاہم لڑائی کا ڈھنگ اور قعقاع کا جوش دیکھ کر سعد کے منہ سے بے اختیار نکلا کہ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَ انْصُرْهُ یعنی اے خدا قعقاع کو معاف کرنا اور اس کا مددگار رہنا۔ قعقاع کو دیکھ کر بنواسد اور بنواسد کی دیکھا دیکھی نسخع، بجیلہ، کندہ سب ٹوٹ پڑے۔ سعد ہر قبیلے کے حملے پر کہتے جاتے تھے کہ خدا اس کو معاف کرنا اور یاور رہنا۔ اول اول سواروں کے رسالے نے حملہ کیا۔ لیکن ایرانی فوجیں جو دیوار کی طرح جمی کھڑی تھیں، اس ثابت قدمی سے لڑیں کہ گھوڑے آگے نہ بڑھ سکے۔ یہ دیکھ کر سب گھوڑوں پر سے کود پڑے اور پیادہ حملہ آور ہوئے۔

ایرانیوں کا ایک رسالہ سرتاپا لوہے میں غرق تھا۔ قبیلہ رحمیفہ نے اس پر حملہ کیا۔ لیکن تلواریں زرہوں پر اچٹ اچٹ کر رہ گئیں۔ سردار قبیلہ نے للکارا۔ سب نے کہا زرہوں پر تلواریں کام نہیں دیتیں۔ اس نے غصے میں آ کر ایک ایرانی پر برچھے کا وار کیا کہ کمر کو توڑ کر نکل گیا۔ یہ دیکھ کر اوروں کو بھی ہمت ہوئی اور اس بہادری سے لڑے کہ رسالے کا رسالہ برباد ہو گیا۔

تمام رات ہنگامۂ کارزار گرم رہا۔ لوگ لڑتے لڑتے تھک کر چور ہو گئے تھے، اور نیند کے خمار میں ہاتھ پاؤں بیکار ہوئے جاتے تھے۔ اس پر بھی جب فتح اور شکست کا فیصلہ نہ ہوا تو قعقاع نے سردارانِ قبایل میں سے چند نامور بہادر انتخاب کیے اور سپہ سالار فوج (رستم) کی طرف رُخ کیا۔ ساتھ ہی قیس، اشعث عمرو معدی کرب، ابن ذی البروین نے جو اپنے اپنے قبیلے کے سردار تھے ساتھیوں کو للکارا کہ دیکھو! ''یہ لوگ خدا کی راہ میں تم سے آگے نکلنے نہ پائیں۔'' اور اور سرداروں نے بھی جو بہادری کے ساتھ زبان آور بھی تھے اپنے اپنے قبیلوں کے سامنے کھڑے ہو کر اس جوش سے تقریریں کیں کہ تمام لشکر میں ایک آگ لگ گئی۔ سوار گھوڑوں پر سے کود پڑے اور تیر وکمان پھینک کر تلواریں گھسیٹ لیں۔ اس جوش کے ساتھ تمام فوج سیلاب کی طرح بڑھی اور فیرزان وہرمزان کو دباتے ہوئے رستم کے قریب پہنچ گئی۔ رستم تخت پر بیٹھا فوج کو لڑا رہا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر تخت سے کود پڑا اور دیر تک مردانہ وار لڑتا رہا۔ جب زخموں سے بالکل چور ہو گیا تو بھاگ چلا۔ ہلال نامی ایک سپاہی نے تعاقب کیا۔ اتفاق سے ایک نہر سامنے آ گئی۔ رستم کود پڑا کہ تیر کر نکل جائے۔ ساتھ ہی ہلال بھی کود ے اور ٹانگیں پکڑ کر باہر کھینچ لائے پھر تلوار سے کام تمام کر دیا۔ ہلال نے لاش خچروں کے پاؤں میں ڈال دی اور تخت پر چڑھ کر پکارے کہ ''رستم کا میں نے خاتمہ کر دیا۔'' ایرانیوں نے دیکھا کہ سپہ سالار تخت پر نہیں ہے تو تمام فوج میں بھاگڑ مچ گئی۔ مسلمانوں نے دور تک تعاقب کیا اور ہزاروں لاشیں زمین میں بچھا دیں۔

افسوس کہ اس واقعے کو ہمارے ملک الشعرا نے قومی جوش کے اثر سے بالکل غلط لکھا ہے۔

برآمد خروشے بکر دار رعد　　　زیک سوئے رستم زیک سوئے سعد

چو دیدار رستم بخوں تیرہ گشت　　　جواں مرد تازی برو چیرہ گشت

ہمارے شاعر کو یہ بھی نہیں معلوم کہ سعد اس واقعے میں سرے سے شریک ہی نہ تھے۔

''ہمارے ملک الشعراء'' یعنی فردوسی پر قومی جوش کا نشہ کچھ یہیں نہیں چڑھا، بلکہ ہر ایسے موقع پر چڑھ جاتا ہے جہاں ایرانیوں اور عربوں کا مقابلہ ہو۔ شاہنامہ لکھتے میں فردوسی کو صرف یہ یاد رہتا ہے کہ وہ ایرانی الاصل ہے، یہ بھول جاتا ہے کہ مسلمان ہے۔

علامہ شبلی کے اس بیان معرکہ کے ساتھ علامہ آزاد کا وہ بیان جنگ پھر پڑھ کر دیکھا جائے جو صفحات ۵۵۹ تا ۵۶۲ پر ''دربار اکبری'' سے اقتباس کیا گیا ہے۔ آزاد نے بھی اپنے رنگ میں خوب لکھا ہے۔ ان کے استعارے ایک لطف پیدا کر رہے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آزاد ''داستان'' بیان کر رہے ہیں، اور شبلی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

(ب) حضرت عمرؓ کی حیثیت اجتہاد اور محدث وفقیہ ہونا

حدیث وفقہ کا فن درحقیقت تمام تر حضرت عمرؓ کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ صحابہ میں اور لوگ بھی محدث وفقیہ تھے، چنانچہ ان کی تعداد ۲۰ سے متجاوز بیان کی گئی ہے۔ لیکن فن کی ابتدا حضرت عمرؓ سے ہوئی اور فن کے اصول وقواعد اول انہی نے قائم کئے۔

حدیث کے متعلق پہلا کام جو حضرت عمرؓ نے کیا یہ تھا کہ روایتوں کی تفحص وتلاش پر توجہ کی۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں احادیث کے استقصاء کا خیال نہیں کیا گیا تھا۔ جس کو کوئی مسئلہ پیش آتا تھا، خود آنحضرتؐ سے دریافت کر لیتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ کسی ایک صحابی کو فقہ کے تمام ابواب کے متعلق حدیثیں محفوظ نہ تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں زیادہ ضرورتیں پیش آئیں۔ اس لئے مختلف صحابہ سے استفسار کرنے کی ضرورت پیش آئی، اور احادیث کے استقرار کا راستہ نکلا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں چونکہ زیادہ کثرت سے واقعات پیش آئے کیونکہ فتوحات کی وسعت اور نومسلموں کی کثرت نے سیکڑوں نئے مسائل پیدا کر دئے تھے۔ اس لحاظ سے انھوں نے احادیث کی زیادہ تفتیش کی تاکہ یہ مسائل آنحضرتؐ کے اقوال کے موافق طے کئے جائیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب کوئی نئی صورت پیش آتی تو حضرت عمرؓ مجمع عام میں جس میں اکثر صحابہ موجود ہوتے تھے، پکار کر کہتے کہ اس مسئلے کے متعلق کسی کو کوئی حدیث معلوم ہے؟ تکبیر جنازہ، غسل جنابت، جزیہ مجوس، اور اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں، جن کی نسبت کتب احادیث میں نہایت تفصیل سے مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجمع صحابہ سے استفسار کر کے حدیث نبوی کا پتہ لگایا.........

یہ تمام بحث تدوین مسائل کی حیثیت سے تھی۔ لیکن فن فقہ کے متعلق حضرت عمرؓ کا اصلی کارنامہ اور چیز ہے۔ انھوں نے صرف یہ نہیں کیا کہ جزئیات کی تدوین کی بلکہ مسائل کی

تفریح واستنباط کے اصول اور ضوابط قرار دئے جس کو آج کل اصول فقہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ آنحضرتؐ سے جو اقوال و افعال منقول ہیں، وہ کُلّیتہً مسائل کا ماخذ ہو سکتے ہیں یا ان میں کوئی تفریق ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس بحث پر ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں ایک نہایت مفید مضمون لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے جو منصب نبوت سے تعلق رکھتے ہیں ان کی نسبت خدا کا ارشاد ہے کہ مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ، یعنی پیغمبر جو چیز تم کو دے وہ لے لو، اور جس چیز سے روکے اس سے باز رہو۔ دوسری وہ جن کو منصب رسالت سے تعلق نہیں چنانچہ اس کے متعلق خود آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:-

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اذا امرتکم بشئی من دِینِکم فخذُ وا بہ و اذا امرتکم بشئی من رأیِ فاِنما انا بشرٌ

یعنی میں آدمی ہوں، اس لئے جب میں دین کی بابت کچھ حکم دوں تو اس کو لو، اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے طِب کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا، جو افعال آنحضرتؐ سے عادتاً صادر ہوئے نہ عبادۃً یا اتفاقاً واقع ہوئے نہ قصداً، جو باتیں آنحضرتؐ نے مزعومات عرب کے موافق بیان کیں۔ مثلاً اُم زرع کی حدیث اور خرافہ کی حدیث، جو باتیں کسی جزئی مصلحت کے موافق اختیار کیں۔ مثلاً لشکر کشی اور اس قسم کے اور بہت سے احکام، یہ سب دوسری قسم میں داخل ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے احادیث کے مراتب میں جو فرق بتایا اور جس سے کوئی صاحب نظر انکار نہیں کر سکتا۔ اس تفریق مراتب کے موجد دراصل حضرت عمرؓ ہیں۔ کتب سیر اور احادیث میں تم نے اکثر پڑھا ہوگا کہ بہت سے ایسے موقعے پیش آئے کہ جناب رسول اللہ صلعم نے کوئی کام کرنا چاہا، کوئی بات ارشاد فرمائی تو حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف رائے ظاہر کی، مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرتؐ نے عبداللہ بن اُبی کے جنازے کی نماز پڑھنی چاہی تو حضرت

عمرؓ نے کہا کہ آپ ُمنافق کے جنازے پر نماز پڑھتے ہیں۔ قیدیانِ بدر کے معاملے میں ان کی رائے بالکل آنحضرتؐ کی تجویز سے الگ تھی۔ صلح حدیبیہ میں انھوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس طرح دب کر کیوں صلح کی جائے۔ ان تمام مثالوں سے تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ حضرت عمرؓ ان باتوں کو منصب نبوت سے الگ سمجھتے تھے، ورنہ اگر باوجود اس امر کے علم کے کہ وہ باتیں منصب رسالت سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں دخل دیتے تو بزرگ ماننا درکنار، ہم ان کو اسلام کے دائرے سے بھی باہر سمجھتے۔

اسی فرقِ مراتب کے اصول پر بہت سی باتوں میں جو مذہب سے تعلق نہیں رکھتی تھیں اپنی رایوں پر عمل کیا مثلاً حضرت ابوبکرؓ کے زمانے تک اُمہاتِ اولاد یعنی وہ لونڈیاں جن سے اولاد پیدا ہو جائے برابر خریدی اور بیچی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اس کو بالکل روک دیا۔ آنحضرتؐ نے جنگ تبوک میں جزیہ کی تعداد فی کس ایک دینار مقرر کی تھی، حضرت عمرؓ نے مختلف ملکوں میں مختلف شرحیں مقرر کیں۔ آنحضرتؐ کے عہد میں شراب کی کوئی خاص حد مقرر نہ تھی۔ حضرت عمرؓ نے اسی (۸۰) کوڑے مقرر کئے۔

یہ ظاہر ہے کہ ان معاملات میں آنحضرتؐ کے اقوال و افعال اگر تشریعی حیثیت سے ہوتے تو حضرت عمرؓ کی کیا مجال تھی کہ ان میں کمی بیشی کر سکتے۔ اور خدانخواستہ وہ کرنا چاہتے تو صحابہ کا گروہ ایک لحظہ کے لئے بھی مسندِ خلافت پر ان کا بیٹھنا کب گوارہ کر سکتا تھا۔

حضرت عمرؓ کو اس امتیاز مراتب کی جرأت اس وجہ سے ہوئی کہ آنحضرتؐ کے متعدد احکام میں انھوں نے دخل دیا تو آنحضرتؐ نے اس پر ناپسندیدگی نہیں ظاہر کی۔ بلکہ متعدد معاملات میں حضرت عمرؓ کی رائے کو اختیار فرمایا اور بعض موقعوں پر تو خود، وحی الٰہی نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی۔ قیدیانِ بدر، حجاب ازواجِ مطہرات، نماز بر جنازہ منافق، ان تمام معاملات میں وحی جو آئی وہ حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق آئی۔

اس تفریق اور امتیاز کی وجہ سے فقہ کے مسائل پر بہت اثر پڑا۔ کیونکہ جن چیزوں میں آنحضرتؐ کے ارشادات منصب رسالت کی حیثیت سے نہ تھے ان میں اس بات کا موقع باقی رہا کہ زمانے اور حالاتِ موجودہ کے لحاظ سے نئے قوانین وضع کئے جائیں چنانچہ

معاملات میں حضرت عمرؓ نے زمانے اور حالات کی ضرورتوں سے بہت بہت نئے نئے قاعدے وضع کئے جو آج حنفی فقہ میں بکثرت موجود ہیں، برخلاف اس کے امام شافعی کو یہاں تک کد ہے کہ ترتیب فوج، تعیین شعار، محاصل وغیرہ کے متعلق بھی وہ آنحضرتؐ کے اقوال کو تشریعی قرار دیتے ہیں اور حضرت عمرؓ کے افعال کی نسبت لکھتے ہیں کہ رسول اللہ کے سامنے کسی کے قول و فعل کی کچھ اصل نہیں۔

(۴) سفرنامہ رُوم و مصر و شام ۔'الفاروق' کے بعد شائع ہوا۔ یہ کوئی علم و فن کی کتاب نہیں، اس لئے علامہ کی تصانیف میں خاص طور پر قابلِ ذکر نہیں ہے لیکن اس حیثیت سے کہ (بقول مصنف) ''ایک طالب العلمانہ سفر تھا۔'' اور اس نوع کا شاید پہلے ہندوستانی کا سفر تھا، یادگار چیز ہے۔ مصنف دیباچ میں لکھتے ہیں:۔

''علاوہ ان جزئی دلچسپ واقعات کے جو سلسلۂ بیان میں آگئے ہیں۔ قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس، قاہرہ وغیرہ کے متعلق واقعات ذیل یعنی شہر کی عام اجمالی حالت، قابلِ دید مقامات، مشہور عمارات، سررشتۂ تعلیم، دارالعلوم اور مدارس، بورڈنگ اور طلبا کی تربیت، تعلیم نسواں، مصنفین اور تصنیفات، کتب خانے، اخبارات اور رسالے، مشہور پاشاؤں اور اربابِ کمال کی ملاقات، ترکوں اور عربوں کے اخلاق و عادات کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔''

علامہ شبلی نے رمضان ۱۳۰۹ھ میں ۲۶ راپریل ۱۸۹۲ء کو سفر شروع کیا تھا۔ ۶ مہینے میں واپس آئے۔ راستے میں کچھ دور تک علی گڈھ کالج کے پروفیسر آرنلڈ رفیقِ سفر رہے۔ ہم نمونے کے طور پر بجائے کسی عمارت یا دارالعلوم یا کتب خانے کی سیر کے، تمام کتاب میں جگہ جگہ سے ڈھونڈ کر صرف وہ باتیں لکھتے ہیں جن کو مصنف نے ''جزئی دلچسپ واقعات'' قرار دیا ہے۔ اور جو ''سلسلۂ بیان میں آگئے ہیں۔''

چونکہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جہاز پر پرند جانور ذبح نہیں کئے جاتے، اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے اپنے سفرنامے میں تجربے سے اس کی تصدیق بھی کی ہے، میں نے دو تین روز تک پرندے کے گوشت کھانے سے پرہیز کیا۔ مسٹر آرنلڈ نے مجھ سے اس کا سبب دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ ہمارے مذہب میں منخنقہ حرام ہے۔ بولے کہ اس جہاز

پر پرند جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ گردن مروڑ کر مارے نہیں جاتے۔ چونکہ شرعاً ان کی تنہا شہادت کافی نہ تھی، میں خود گیا اور اس کی تصدیق کی۔ ذبح کرنے والا عیسائی تھا۔ وہ ذبح کرتے وقت کچھ پڑھتا نہ تھا۔ صرف گردن پر چھری پھیر دیتا تھا۔ اگر چہ حنفیوں کے ہاں یہ ذبیحہ حلال نہیں، لیکن اس مسئلے میں چند دنوں کے لئے میں شافعی بن گیا جن کے ہاں ہر طرح کا ذبیحہ جائز ہے۔

''عدن سے چونکہ دلچسپی کے نئے سامان پیدا ہو گئے تھے، اس لئے ہم بڑے لطف سے سفر کر رہے تھے۔ لیکن دوسرے ہی دن ایک پُر خطر واقعہ پیش آیا، جس نے تھوڑی دیر کے لئے مجھ کو سخت پریشان رکھا۔ ۱۰ رمئی کی صبح میں سوتے سے اٹھا تو ایک ہمسفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انجن بالکل بیکار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا۔ میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے! بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقع ہے؟ فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے، اور ایسے قابلِ قدر وقت کو رائگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے۔ ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو بھی اطمینان ہوا۔ آٹھ گھنٹے کے بعد انجن درست ہوا اور بدستور چلنے لگا۔''

''پورٹ سعید پر سفر کی حالت میں جو تجدد ہوا وہ یہ تھا کہ بمبئی سے پورٹ سعید تک جہاز پر کوئی مسلمان نہ تھا۔ یہاں پہنچ کر دو ایک مسلمان نظر آئے۔ اور بیروت میں تو سارا جہاز شامی عربوں سے بھر گیا...... میں بڑے شوق سے ان کے پاس گیا لیکن وہ مطلقاً متوجہ نہ ہوئے۔ جس شخص کے پاس کھڑا ہوا اس نے ایک بار آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن نیچی کر لی۔ مجھکو اس بداخلاقی پر سخت تعجب ہوا۔ دل میں کہتا تھا کہ عربوں کی مہمان

نوازی کی یہ کچھ تعریفیں سنی تھیں! ان کو تو بات چیت میں بھی مضائقہ ہے۔ ان میں مدرسہ حربیہ کے چند طلبا تھے جو رخصت لے کر وطن میں آئے تھے اور اب قسطنطنیہ جارہے تھے۔ وہ کبھی دل بہلانے کے لئے عربی دیوان پڑھا کرتے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ ہم فنی کے ذریعہ سے تعارف پیدا کروں۔ چنانچہ ان کے پاس گیا اور دخل در معقولات کے طور پر اپنی مولویت اور علمیت جتانی شروع کی۔ وہ اس پر بھی متوجہ نہ ہوئے۔ میں اپنا سا منہ لے کر چلا آیا لیکن مجھ کو یقین تھا کہ اس واقعے کا ضرور کوئی سبب ہے۔ اتفاقاً ایک موقع پر ایک شخص نے میرا مذہب پوچھا۔ میں نے کہا ''اسلام'' بولالا واللّٰہ ھذا طربوش المسلم، یعنی ہرگز نہیں کہیں مسلمان بھی ایسی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ بدقسمتی سے میرے سر پر ایرانی ٹوپی تھی، اور اس وجہ سے تمام عرب مجکو مجوسی سمجھتے تھے۔ جب یہ معما حل ہوا تو میں نے ان لوگوں کے دل سے اس بدگمانی کو رفع کر دیا، اور پھر وہ ایسے شیر وشکر ہوئے کہ ایک دم کو مجھ سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔''

''(قسطنطنیہ کا ذکر ہے) ایک دن شیخ علی ظبیان جن کے والد ایک مشہور صوفی ہیں۔ شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے۔ میں بھی اس وقت موجود تھا۔ اور اتفاق سے رسالہ 'اسکات المعتدی' جو میری قدیم تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے، سامنے رکھا ہوا تھا۔ انھوں نے اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ آہا، یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا، اور انھوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا شَکَرَ اللّٰہُ مَسَاعِیَہٗ ، شیخ علی ظبیان کو جب معلوم ہوا کہ وہ رسالہ میری ہی تصنیف ہے تو اُٹھ کر بڑی گرمجوشی سے ملے اور نہایت لطف ومہربانی سے پیش آئے۔ مجکو اس بات سے کہ میری ناچیز تصنیف یہاں تک پہونچی اور لوگوں نے اس کو نگاہِ قبول سے دیکھا، نہایت مسرت ہوئی۔ اور سفر کی کس مپرسی میں اتنا ذریعۂ تعارف بہت غنیمت معلوم ہوا۔''

''(قسطنطنیہ کے احباب کا ذکر کرتے ہیں) شام کو ہم تین چار آدمی ایک قہوہ خانے میں جو عین لب دریا ہے، ساتھ بیٹھا کرتے تھے، اور عجب لطف ومزے کی صحبت رہتی تھی۔ کبھی کبھی مغرب کے بعد کشتی کرایہ کرتے اور سمندر کی سیر کرتے پھرتے۔ فواد کو گانا آتا ہے

مزے میں آ کر عربی گیت گیا کرتے۔ ایک دن مجھ سے فرمائش کی کہ کوئی ہندی چیز سناؤ۔ میں نے بہتیرا کہا کہ بھائی میں مولوی آدمی ہوں مجکو گانے سے کیا واسطہ۔ لیکن وہ کب مانتے تھے۔ آخر مجبور ہو کر میں نے اُردو کے دو تین شعر آواز کو گھٹا بڑھا کر پڑھے اور کہا کہ ہندی میں یوں ہی گاتے ہیں۔''

غازی عثمان پاشا کی ملاقات اور تمغۂ (۱) مجیدی کا عطا ہونا

یہ وہی نامور جنرل ہے جس نے پلونا میں چوبیس ہزار روسی مجروح اور آٹھ ہزار تہ تیغ کئے تھے۔ جس کے مقابلے میں شہنشاہ روس نے اپنی کُل فوجی قوت صرف کر دی تھی، اور خود سپہ سالار بن کر گیا تھا۔ جس نے باوجود فوج کی کمی اور رسد کی قلت کے، روس کی مجموعی طاقت کا مدت تک مقابلہ کیا، اور میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا تو خود شہنشاہ روس نے اس کی کمر میں تلوار باندھی اور مہینوں تک اپنا مہمان رکھا............

میں ایک مترجم کو ساتھ لے کر ان کے مکان پر گیا۔ گھنٹی بجانے پر دروازہ کھلا۔ دربان نے اندر جانے کی اجازت دی...... تھوڑی دیر کے بعد پاشائے موصوف تشریف لائے۔ جن صاحب کو میں نے مترجمی کے لئے ساتھ لیا تھا سر رشتہ تعلیم کے ایک افسر تھے۔ انھوں نے حسب قاعدہ آگے بڑھ کر پاشائے موصوف کے دامن کا کنارہ چوما، اور مؤدبانہ طور سے پیچھے ہٹے۔ میں نے طریقہ سنت کے موافق سلام کیا۔ پاشائے موصوف نے سلام کا جواب دیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مزاج پرسی کے بعد نام اور مقام پوچھا۔ مترجم نے کہا کہ ہندوستان کے علماء میں سے ہیں اور تحقیقات علمی کی غرض سے آئے ہیں۔ یہ سن کر نہایت مہربانی اور توجہ ظاہر کی اور دیر تک مسلمانوں کے حالات پوچھتے رہے۔ رخصت ہو کر میں اٹھا تو خود بھی اٹھے اور کہا آپ دوبارہ تشریف لائیں تو مجکو خوشی ہوگی............

دوسری دفعہ ملاقات کو گیا تو پہلے سے کمرے میں آ بیٹھے۔ میں اندر داخل ہوا تو کرسی سے اٹھ کر دو ایک قدم بڑھے اور پہلے دن کی طرح ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد میں جب ان سے ملا

---

(۱) اس لفظ کا صحیح املا تمغا ہے۔ علامہ شبلی نے شاید سہواً تمغہ لکھ دیا ہے۔ ہم نے اسی طرح رہنے دیا ہے۔

تو اسی طریقے سے ملے۔ پاشائے موصوف مجھ پر نہایت مہربان ہو گئے تھے۔ جب میری روانگی کا زمانہ قریب آیا اور میں نے ان سے کہا کہ اب میں یہاں دو چار روز کا مہمان ہوں، تو فرمایا کہ ایک دو دن جانے سے پہلے مجھ سے مل لینا۔ اسی اثنا میں انھوں نے سلطان سے میرے لئے تمغۂ مجیدی عطا ہونے کی درخواست کی اور منظور ہو گئی، لیکن مجکو اس کی کچھ اطلاع نہ تھی۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے مکان میں سو رہا تھا کہ میرے ایک دوست دوڑے ہوئے آئے اور جگا کر کہا کہ **یا شبلی واللہ لقد طلع لک النیشان** ۔ مجکو ایک گونہ تعجب ہوا، اور میں نے کہا یوں ہی کہتے ہو۔ آخر تم کو معلوم کیوں کر ہوا؟ بولے تمام اخبارات میں چھپ گیا ہے۔ میں اسی وقت اٹھا اور ایک قرأت خانے میں جا کر اخبار دیکھے تو واقعی وہ خبر صحیح تھی۔ اسی وقت مجکو خیال پیدا ہوا کہ میں انگریزی رعیت ہوں۔ اس لحاظ سے انگلش سفیر کو اس کی اطلاع دینی ضرور ہے۔ دوسرے دن میں سفیر کے پاس گیا۔ اتفاق سے وہ مکان پر نہ تھے۔ میں اپنا کارڈ چھوڑ آیا۔ دوسرے دن تمام احباب مبارکباد کو آئے۔ میں نے ایک مختصر جلسۂ دعوت ترتیب دیا۔ شیخ علی ظبیان، عبد السلام آفندی، فواد، سامی، شریف اور دیگر احباب شریک جلسہ تھے۔ دعوت کی صبح کو عثمان پاشا کی وداعی ملاقات کو گیا۔ تمغہ کی خبر ایسی عام ہو گئی تھی کہ پاشائے موصوف کے مکان پر پہنچا تو سب سے پہلے دربان نے کہا ''تمغہ مجیدی مبارک'' مجکو تعجب ہوا کہ اس کو کیونکر خبر ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہاں کے امرا اور پاشاؤں کے نوکر چاکر عموماً پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ اور فرصت کے اوقات میں اخبارات پڑھا کرتے ہیں۔ پاشائے موصوف نے ملاقات کے ساتھ تمغہ کی مبارکباد دی۔ تمغہ سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ بکس سے نکال کر پہلے انھوں نے آنکھوں سے لگایا، پھر مجکو حوالے کیا۔ میں سروقد کھڑا ہو گیا اور سلطان کو دعا دی۔

تمغاے مجیدی

تمغا کے ساتھ ایک فرمان سلطانی بھی عطا ہوا تھا۔ ''شیر پلونا'' عثمان پاشا نے اپنا فوٹو بھی اپنے قلم سے تہدیہ لکھ کر علامہ کو دیا تھا۔ علامہ شبلی تمغاے مجیدی کو کبھی استعمال نہ کر سکے اس لیے کہ انگریزی قانون کی رو سے کسی غیر سلطنت کا تمغا قبول کرنا یا استعمال کرنا ممنوع تھا۔ سفرنامہ میں بعض دلچسپ واقعات اور بھی ہیں۔

(۵) **الغزالی** ۔ دسمبر ۱۹۰۱ء میں بمقام حیدر آباد لکھ کر ختم کی۔ اور ''سلسلۂ آصفیہ'' میں چھپی۔ اس کے بھی حسبِ معمول دو حصے ہیں۔ اس کی وجہ تالیف خود علامہ بیان کرتے ہیں:۔

علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتم بالشان علم اور ان کا سرمایۂ ناز ہے، میں آج کل اس کی نہایت مبسوط تاریخ لکھ رہا ہوں، اور اس کے چار حصے قرار دیے

ہیں:۔ا۔علم کلام کی ابتدا، اس کی مختلف شاخیں، عہد بہ عہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں۔۲۔علم کلام نے اثبات عقائد اور ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا، اور کس حد تک کامیابی حاصل کی۔ ۳۔ائمہ کلام کی سوانح عمریاں۔۴۔جدید علم کلام۔

پہلا حصہ بقدر معتد بہ لکھا جا چکا تھا کہ بوجوہ رُک گیا، اور تیسرا حصہ شروع ہو گیا۔اس حصہ میں امام غزالی کی سوانح عمری شروع ہوئی تو بڑھتے بڑھتے ایک مستقل کتاب بن گئی۔چونکہ پوری کتاب کی تیاری کو عرصہ درکار تھا۔مناسب معلوم ہوا کہ بلا انتظار باقی یہ حصہ الگ شائع کر دیا جائے۔امام صاحب کے حالات میں ان کے اصول عقائد اور طرزِ استدلال کی تفصیل بھی ہے، اس طرح علم کلام کے اکثر مہتم بالشان مسائل بھی اس کتاب میں آ گئے ہیں۔

امام غزالی کی ۷۸ تصانیف اور ان کے موضوع اور عظمت شان بیان کرنے کے بعد علامہ شبلی لکھتے ہیں:۔

امام صاحب نے یوں تو بہت سے علوم و فنون میں کتابیں لکھیں، لیکن تخصیص کے ساتھ جن علوم کو ترقی دی، وہ فقہ، اصول فقہ، کلام اور اخلاق ہیں..........اس لحاظ سے اگرچہ ہمارا فرض تھا کہ ہم امام صاحب کی ان ایجادات اور استنباطات کو بہ تفصیل لکھتے جو ان علوم میں ان سے یادگار ہیں۔لیکن ہمارے ناظرین کو شافعی فقہ اور اصول فقہ سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔اس لئے ہم امام صاحب کے ان علمی کارناموں کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو علم کلام اور علم اخلاق کے متعلق ان سے ظہور میں آئے۔ملک کا مذاق اور ملک کی حالت بھی اسی کی مقتضی ہے کہ فلسفہ آمیز علوم کے مسائل قوم کے سامنے پیش کئے جائیں۔

چنانچہ حصہ دوم میں سے اخلاق اور کلام کے متعلق دو اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:۔

(الف) احیاء العلوم کو جن خصوصیتوں نے تمام قدیم و جدید تصنیفات سے ممتاز کر دیا ہے ہم ان کو بہ ترتیب لکھتے ہیں:۔

(ا) بڑی خصوصیت جس نے عام و خاص، عارف و جاہل، سب میں اسے مقبول بنا دیا ہے، یہ ہے کہ حکمت و موعظت دونوں کو ساتھ ساتھ نباہا ہے۔تحریر و تقریر کا سب سے مشکل

پہلو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں مختلف طبیعتوں کے آدمیوں سے خطاب کرنا پڑتا ہے۔ واعظ اپنی جادو بیانی سے ایک جم غفیر کو وجد میں لاسکتا ہے، لیکن حکیمانہ طبیعت کا آدمی اس سے متاثر نہیں ہوسکتا۔ برخلاف اس کے ایک حکیم جب معارف وحقائق پر تقریر کرتا ہے تو عوام پر اس کا جادو نہیں چلتا۔ احیاء العلوم میں یہ خاص کرامت ہے کہ جس مضمون کو ادا کیا ہے، باوجود سہل پسندی، عام فہمی اور دلآویزی سے فلسفہ وحکمت کے معیار سے کہیں اترنے نہیں پایا۔ یہی وجہ ہے کہ امام رازی سے لے کر ہمارے زمانے کے سطحی واعظ تک اس سے یکساں لطف اٹھاتے ہیں۔

(۲) امام صاحب کے زمانے تک یہ دستور تھا کہ فلسفہ اور متعلقات فلسفہ پر جس قدر کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ عموماً پیچیدہ اور دقیق عبارت میں لکھی جاتی تھیں، اور بوعلی سینا نے تو فلسفہ کو گویا طلسم بنا دیا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ فلسفہ کے مسائل خود دقیق ہوتے تھے۔ کچھ یہ کہ یونانیوں کے زمانے سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ فلسفہ کو عام فہم نہ کرنا چاہیے، کچھ یہ کہ اکثر لوگ یہ قابلیت ہی نہ رکھتے تھے کہ پیچیدہ مطالب کو آسان عبارت میں ادا کرسکیں۔ فلسفہ کے اور اقسام کی بہ نسبت فلسفۂ اخلاق آسان اور سریع الفہم ہے۔ تاہم اخلاق پر جو بھی کتابیں لکھی گئی تھیں مثلاً کتاب الطہارت لابن مسکویہ اشکال سے خالی نہ تھیں۔ امام صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفۂ اخلاق کے مسائل اس طرح ادا کیے کہ دقیق سے دقیق نکتے افسانہ اور لطائف بن گئے۔ ایک ہی مضمون کو کتاب الطہارت اور احیاء العلوم دونوں میں دیکھو۔ کتاب الطہارۃ میں غور وفکر اور خوض سے کام لینا پڑے گا اور باوجود اس کے زیادہ سے زیادہ ہوگا کہ کتاب کا مطلب تمھاری سمجھ میں آجائے۔ احیاء العلوم میں یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ تم کوئی علمی کتاب پڑھ رہے ہو۔ تم قصہ کی طرح پڑھتے چلے جاؤ گے اور مضمون کی نسبت صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اس کو سمجھ جاؤ بلکہ دل پر اس کی کیفیت طاری ہوگی اور تم سراپا اثر میں ڈوب جاؤ گے۔

(۳) اخلاق کی تعلیم میں ایک بہت بڑی غلطی ہمیشہ یہ ہوتی آئی ہے کہ اختلاف طبائع و امزجہ کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ کسی بانی مذہب کے نزدیک اگر تجرد اور ترکِ اختلاط پسندیدہ ہے

تو وہ چاہے گا کہ تمام عالم تارک الدنیا ہو جائے۔ دوسرے کے نزدیک اگر حسن معاشرت اور فیض رسانی عام زیادہ مفید ہے تو اس کی خواہش ہوگی کہ سب اسی قالب میں ڈھل جائیں۔ لیکن چونکہ انسانی طبیعتیں مختلف ہیں اس لئے اس قسم کی یک طرفہ تعلیم کا اثر خاص طبائع تک محدود رہ کر باقی ہزاروں آدمیوں کے حق میں بیکار ہو جاتا ہے۔ اس نکتہ کو سب سے پہلے امام صاحب نے سمجھا۔ ان کے اصول کے مطابق اخلاق کی تعلیم، اختلاف طبائع کے لحاظ سے ہونی چاہئے۔ جس شخص کا مزاج قدرتی طور سے معاشرت پسند واقع ہوا ہے، اس کو ہرگز تجرد اور ترکِ تعلقات کی تعلیم نہیں کرنی چاہئے؛ بلکہ معاشرت کے وہ اصول اور قواعد بنانے چاہئیں جس کے ذریعہ سے اس سے وہ نیکیاں ظہور میں آئیں جو معاشرت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً صلۂ رحم، حاجت روائی خلق، ہدایت عام، اسی طرح جس کا مزاج تجرد پسند ہے اس کو ہرگز معاشرت کی ہدایت نہیں کرنی چاہئے، بلکہ گوشہ گیری اور ترکِ تعلقات کے ایسے اصول سکھلانے چاہئیں جن سے وہ اعتدال سے تجاوز نہ ہونے پائے۔

(۴) امام صاحب نے معاشرت اور اخلاق کی بنیاد اگرچہ تمام تر مذہب پر رکھی ہے اور اسی وجہ سے ہر عنوان کی ابتدا میں روایات شرعیہ سے استنباط کرتے ہیں لیکن اس نکتہ کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے کہ شارع کے کون سے افعال رسالت کی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اور کون سے معاشرت و عادت کی حیثیت سے۔ آداب طعام پر جو مستقل مضمون لکھا ہے اس میں جہاں کھانا کھانے کے قاعدے لکھے ہیں۔ ایک قاعدہ یہ لکھا ہے کہ کھانا دسترخوان پر چن کر کھانا چاہئے، میز یا صندلی پر رکھ کر کھانا نہ چاہئے۔ اس کی سند میں حضرت انسؓ کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی صندلی پر رکھ کر نہیں کھایا۔ پھر قدمائے سلف کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ دو چار چیزیں بدعت ہیں جو آنحضرتؐ کے بعد ایجاد ہوئیں۔ کھانے کی میز یا صندلیاں، اشنان، پیٹ بھر کھانا، ان اقوال کے بعد لکھتے ہیں گو دسترخوان پر کھانا اچھا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میز یا صندلی پر کھانا مکروہ یا حرام ہے۔ کیونکہ اس قسم کا کوئی حکم شریعت میں وارد نہیں۔ باقی یہ امر کہ یہ چیزیں آنحضرتؐ

کے بعد ایجاد ہوئیں تو یہ کوئی کُلّیہ نہیں ہے کہ ہر ایجاد بدعت ہے۔ بدعت ناجائز صرف وہ ہے جو کسی سنت کے مخالف ہو یا جس سے شریعت کا کوئی حکم باوجود بقائے علت کے باطل ہو جائے۔ ورنہ حالات کے اقتضا کے موافق بعض ایجادات مستحب وپسندیدہ ہیں۔ صندلی پر کھانے میں صرف یہ بات ہے کہ کھانا زمین سے ذرا اونچا ہو جاتا ہے اور کھانے میں آسانی ہوتی ہے، اور یہ کوئی ممنوع امر نہیں۔ جن چار چیزوں کو بدعت کہا گیا ہے، سب یکساں نہیں ہیں۔ اشنان (ایک گھانس کا نام ہے) سے جو صابن کے بجائے ہاتھ دھونے کے وقت استعمال کی جاتی تھی۔ ہاتھ دھونا تو اور اچھی بات ہے۔ کیونکہ اس میں صفائی اور نفاست ہے۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے میں تو اور صفائی ہے۔ اگلے زمانے میں اگر اس کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس زمانہ میں اس کا رواج نہ تھا، یا وہ میسر نہ آتی ہوگی۔ یا وہ لوگ ایسی مہمات میں مشغول تھے جو صفائی پر مقدم تھے۔ یہاں تک کہ وہ ہاتھ بھی نہیں دھوتے تھے اور تلووں میں ہاتھ پونچھ لیا کرتے تھے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہاتھ دھونا مستحب نہیں۔

یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ امام صاحب نے معاشرت کے جو آداب لکھے ہیں وہ ایشیائی طریقے کی بہ نسبت زیادہ تر مہذب ممالک کے طریقہ سے ملتے ہیں۔ مثلاً کھانے کے آداب میں لکھتے ہیں۔ کھانا کسی اونچی چیز پر (عربی میں اس کو خوان کہتے ہیں) کھانا چاہئے۔ کھانے باری باری سے آنے چاہئیں۔ کھانے کے بعد میوے یا کوئی شیرینی آنی چاہئے۔ اسی مضمون میں لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کے یہاں یہ طریقہ تھا کہ تمام کھانوں کے نام پرچہ پر لکھ کر مہمانوں کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کارڈ آف ٹیبل کا طریقہ یورپ نے ہمیں سے سیکھا ہے۔

(ب) امام صاحب کا خاص علم کلام (الٰہیات)

خدا کے اثبات پر امام صاحب نے کوئی نئی دلیل نہیں قائم کی۔ ان کے نزدیک یہ مسئلہ نہایت واضح اور صاف ہے۔ متکلمین جو استدلال کرتے آتے تھے کہ عالم حادث ہے اور

حادث خود بخود پیدا نہیں ہوسکتا اس لئے اس کی کچھ علت ہوگی اور وہی خدا ہے۔ امام صاحب اسی استدلال کو کافی سمجھتے ہیں۔

صفات باری تنزیہ تشبیہ

اس بحث کے متعلق جو نزاعیں تھیں اگرچہ درحقیقت لفظی تھیں۔ یعنی جو لوگ تشبیہ کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ مثلاً خدا عرش پر ہے، آسمان پر اتر کر آتا ہے، وہ بھی حقیقت میں تنزیہ کے قائل تھے۔ تاہم دونوں فرقے ایک دوسرے کے ہم وزن نہ ہوتے۔ اور اختلاف کا پردہ درمیان سے نہ اٹھتا تھا۔ امام صاحب نے اس بحث پر ایک مستقل رسالہ الجام العوام کے نام سے لکھا ہے۔ جس نے بہت کچھ اس اختلاف کو کم کردیا اور تقریباً دونوں ڈانڈے ملا دئے۔ اس کے بعض نکتے یہاں درج کرنے کے قابل ہیں۔ تنزیہ کے متعلق بڑی کھٹک یہ تھی کہ اگر اسلام کا مقصد محض تنزیہ اور تجرید تھا، تو قرآن مجید اور احادیث میں کثرت سے تشبیہ کے الفاظ کیوں آئے؟ قیامت کے دن خدا فرشتوں کے جھرمٹ میں آئے گا۔ آٹھ فرشتے اس کا تخت اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ دوزخ کی تسکین کے لئے خدا اپنی ران دوزخ میں ڈال دے گا۔ اس قسم کی بیسیوں باتیں ہیں جو قرآن مجید یا احادیثِ صحیحہ میں وارد ہیں۔ جن سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلامی خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ انسان نے اپنے خیال کے پیمانے کے موافق خدا کی ذات وصفات ٹھہرا لئے ہیں۔ امام صاحب نے اس عقدے کو اس طرح حل کیا کہ بے شبہ قرآن وحدیث میں اس قسم کے الفاظ موجود ہیں، لیکن یکجا نہیں ہیں بلکہ جستہ جستہ متفرق مقامات پر ہیں، اور چونکہ تنزیہ کے مسئلہ کو شارع نے نہایت کثرت سے بار بار بیان کرکے دلوں میں جانشین کر دیا تھا اس لئے تشبیہ کے الفاظ سے حقیقی تشبیہ کا خیال نہیں پیدا ہوسکتا تھا۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ کعبہ خدا کا گھر ہے۔ اس سے کسی شخص کو یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ خدا درحقیقت کعبہ میں سکونت رکھتا ہے۔ اسی طرح قرآن کی آیتوں سے بھی جن میں عرش کو خدا کا مستقر کہا ہے خدا کے استقراء علی العرش کا خیال نہیں آسکتا۔ کسی کو آئے تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس نے تنزیہ کی آیتوں کو نظر انداز کردیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ کو جب

استعمال فرماتے تھے تو ان ہی لوگوں کے سامنے فرماتے تھے جن کے ذہنوں میں تنزیہ تقدیس خوب جاگزیں ہو چکی تھی۔

اس جواب پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شارع نے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیا کہ خدا نہ متصل ہے نہ منفعل، نہ جوہر ہے نہ عرض، نہ عالم میں ہے نہ عالم سے باہر۔ اس قسم کی تصریحات موجود ہوتیں تو کسی کو سرے سے تشبیہ کا خیال ہی نہ آسکتا۔ امام صاحب نے اس شبہ کو یوں رفع کیا کہ اس قسم کی تقدیس عام لوگوں کے خیال میں نہیں آسکتی تھی۔ عام لوگوں کے نزدیک کسی چیز کی نسبت یہ کہنا کہ نہ وہ عالم میں ہے نہ عالم سے باہر، گویا یہ کہنا ہے کہ وہ چیز سرے سے موجود ہی نہیں۔ بے شبہ خواص کے ذہن میں یہ تقدیس آسکتی ہے۔ لیکن شارع کو تمام عالم کی اصلاح مقصود تھی، جن میں بڑا حصہ عوام ہی کا تھا۔

لطیفہ: علامہ ابن تیمیہ بظاہر تشبیہ کے قائل تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ اس عقیدے کی رو سے خدا کا ممکن الوجود ہونا لازم آتا ہے، حالانکہ خدا واجب الوجود ہے۔ انھوں نے کہا میرے عقیدے کے موافق خدا موجود تو ہوگا گو ممکن الوجود سہی، تمھارے اعتقاد کے موافق تو وہ ممکن بھی نہیں رہتا۔ بلکہ ناممکن اور محال بن جاتا ہے۔ کیونکہ ایسی شے جو ہر جگہ موجود ہو اور کہیں نہ ہو، عالم سے خارج بھی نہ ہو اور عالم میں بھی نہ ہو، نہ متصل ہو نہ منفعل، نہ ذو مکان ہو نہ ذو جہت، سرے سے ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ یہ ارتفاع النقیضین ہے اور ارتفاع النقیضین محال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اور جس قدر مذاہب ہیں سب میں خدا کو بالکل انسانی اوصاف کے ساتھ مانا گیا ہے۔ توراۃ میں یہاں تک ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک رات ایک پہلوان سے کشتی لڑے اور اس کو زیر کیا۔ چنانچہ پہلوان کی ران کو صدمہ بھی پہنچا۔ صبح کو معلوم ہوا کہ وہ پہلوان خود خدا تھا۔ اسلام چونکہ دنیا کے تمام مذاہب سے اعلیٰ و اکمل ہے اس کا خدا انسانی اوصاف سے بالکل بری ہے قرآن مجید میں ہے لیس کمثلہ شئی. لاتجعلوا للّٰہ انداداً جہاں کہیں اس کے خلاف تشبیہ کے الفاظ پائے جاتے ہیں وہ حقیقت میں مجازات اور استعارات ہیں۔

(۶) علم الکلام، جس ضخیم کتاب زیر تالیف کا اوپر ذکر آیا ہے، اس کا یہ "علم کلام" پہلا حصہ ہے۔ اس میں علامہ شبلی نے مختصر طور پر "علم کلام" کی تاریخ بیان کی ہے کہ یہ علم کیوں ایجاد ہوا، اس کا بانی اول کون تھا، پھر کیا کیا ایجادیں ہوئیں، علماءِ کلام کون کون تھے انھوں نے کیا کیا، اس علم سے کیا فائدہ ہوا۔

علامہ کی یہ کتاب بھی اُردو میں اپنی نوعیت کی "نئی اور پہلی" ہے لیکن اب اُردو داں طبقے کو اس علم کے ساتھ کم سے کم دلچسپی ہے۔ اس لیے مختصر اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

علم کلام کی یہ احسان ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس کی بدولت یونانیوں کی غلامی سے آزادی ملی۔ یونانی فلسفہ نے دنیا میں اس قدر رواج وقبول حاصل کیا تھا کہ ان کے مسائل وحی کی طرح تسلیم کیے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی ان کے فلسفے کو اسی نگاہ سے دیکھا۔ اور ارسطو وافلاطون کو علم کا دیوتا سمجھے۔ فارابی سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو ارسطو سے کیا نسبت ہے اس نے جواب دیا کہ میں اگر ارسطو کے زمانے میں ہوتا تو اس کا ایک لائق شاگرد ہوتا۔ بوعلی سینا نے "شفا" میں ایک ضمنی موقع پر لکھا ہے کہ اتنا مدید زمانہ گزر چکا لیکن ارسطو کی تحقیقات پر ایک ذرہ بھر اضافہ نہ ہوسکا۔

یونانیوں کی یہ حلقہ بگوشی اس وقت تک قائم رہی جب تک علمائے کلام نے فلسفہ کو نکتہ چینی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ سب سے پہلے نظام نے ارسطو کی "کتاب الطبائع" کا رد لکھا۔ پھر جبائی نے ارسطو کی کتاب "کون وفساد" کے رد میں ایک کتاب لکھی۔ اس مذاق کو برابر ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ امام غزالی نے "تہافتہ الفلاسفہ" لکھی، اور ابوالبرکات نے کتاب "المعتبر" میں فلسفہ کے بہت مسائل کی غلطی ثابت کی۔ امام رازی نے اس پر ایک دفتر کا دفتر تیار کر دیا۔ علامہ بن تیمیہ نے خاص فلسفہ کی رد میں چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ یہ تصنیفات اگر چہ جس غرض کے لیے لکھی گئی تھیں (یعنی علم کلام) اس سے تو ان کو کچھ علاقہ نہ تھا لیکن اس کی بدولت فلسفہ کا رعب دلوں سے اٹھ گیا۔ اہل نظر فلسفہ کی تنقید پر آمادہ ہو گئے اور سیکڑوں مسائل کی غلطیاں کھل گئیں۔

اکثر یورپین مصنفوں نے لکھا ہے کہ مسلمان عموماً ارسطو کی کورانہ تقلید کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک زبان دراز نے لکھا ہے کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے۔ ان کوتاہ نظروں کو چاہئے کہ وہ فارابی اور ابن سینا کے بجائے ابوالبرکات، امام غزالی، امام رازی، آمدی اور ابن تیمیہ کی تصنیفات پڑھیں، فلسفہ تو فلسفہ مسلمانوں نے تو یونانی منطق کی بھی غلطیاں ثابت کیں جن کی غلطی کا احتمال بھی کبھی کسی کو پیدا نہیں ہو سکتا تھا.........

علم کلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ عجیب و غریب چیز دولتِ عباسیہ کی آزادی اور آزاد پسندی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہی چیز ہے جس نے علم کلام کو اس رتبہ پر پہنچایا۔ ورنہ اگر ان بزرگوں کی ہدایت پر عمل کیا جاتا، جو ہر موقع پر اَلسّوال بِدْعَۃٌ سے کام لیتے تھے تو آج علم کلام کا سرے سے وجود ہی نہ ہوتا۔ یہ اسی آزادی کا اثر تھا کہ ایک ہی صدی کے اندر، گونا گوں خیالات کا سیلاب سا آ گیا، جو لحظہ لحظہ بڑھتا جاتا تھا، اور جس کی بدولت بیسیوں نئے نئے فرقے قائم ہوتے جاتے تھے۔ یہ فرقے اگرچہ اعتقادات میں باہم مختلف تھے، تاہم ہر فرقے کو عام آزادی حاصل تھی۔ ہر فرقہ جس طرح اور جس تدبیر سے اپنے اعتقادات اور خیالات کو پھیلانا چاہتا تھا، پھیلا سکتا تھا.........

عباسیہ کے دربار میں پارسی، مانوی، یہودی، عیسائی، ہر فرقہ اور ہر ملّت کے علماء موجود تھے۔ دربار ہی میں مناظرہ کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ اکثر اوقات خلیفۂ وقت خود مناظرہ کا ایک فریق ہوتا تھا۔ باوجود اس کے لوگ نہایت آزادی، بیباکی اور دلیری سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے، اور اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے کہ خلیفہ کا کیا مذہب اور کیا اعتقادات ہیں۔

علم کلام نے اگرچہ بارہ سو (۱۲۰۰) برس کی عمر پائی، لیکن کمال کے رتبہ تک نہ پہنچ سکا۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کو سخت مخالفت کا سامنا ہوا، تمام محدثین بلکہ ائمہ مجتہدین (بجز امام ابوحنیفہ کے) اس کے دشمن بن گئے۔ دولتِ عباسیہ کی حمایت کی بدولت وہ برباد ہونے سے بچ گیا، لیکن مقبول عام نہ ہو سکا۔ جو محدود فرقہ اس کا طرف دار تھا، اور اس کو ترقی دینا چاہتا تھا، وہ اعتزال کے نام سے بدنام تھا۔ اہل سنت و جماعت، مدت کے بعد اس کی

طرف متوجہ ہوئے، لیکن وہ فلسفہ وعقلیات سے آشنا نہ تھے۔ کیونکہ اس گروہ میں اب تک فلسفہ تو فلسفہ، منطق کا سیکھنا بھی ناجائز تھا۔ امام غزالی نے جرأت کر کے منطق کو مذہبی گروہ میں روشناس کیا۔ اتنے تعلق سے فلسفہ کو بھی بزم میں باریابی ہوئی۔ فلسفہ اور عقلیات کی آمیزش سے علم کلام نے ایک دوسرا قالب اختیار کرنا شروع کیا تھا اور امام رازی و آمدی جیسے لوگ پیدا ہونے شروع ہوئے تھے کہ دفعتاً تاتار کی طرف سے اس زور کی آندھی اٹھی کہ اسلام کا تمام دفتر پراگندہ ہو گیا۔ مشرق نے تو سنبھالا ہی نہیں لیا، شام و روم میں ملکی طاقت سنبھل گئی، لیکن وہاں کی خاک مشرق کے سے دل و دماغ کہاں پیدا کر سکتی تھی۔ اشاعرہ کی فرسودہ عمارت کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے۔ متاخرین اسی پر رَدّے رکھتے گئے۔ وہی عمارت آج پرستش گاہِ عالم بن گئی ہے۔ امام غزالی اور ابن رشد نے جو مینا کاریاں اور جواہر نگاریاں کی تھیں اس کی کسی کو خبر بھی نہیں۔

(۷) الکلام، یہ اُس مجوزہ کتاب کا چوتھا حصہ تھا، لیکن چونکہ وہ تصنیف تجویز کے مطابق مکمل نہ ہو سکی، اس لیے علم الکلام حصہ اول رہا، یہ 'الکلام' حصہ دوم ہوا۔ اس میں ''جدید علم کلام'' بیان کیا گیا ہے۔

اب سے بارہ سو برس پہلے اس فن کی ایجاد کا سبب یہ تھا کہ مسلمان فلسفۂ یونانی پڑھ کر عقائد اسلامی سے برگشتہ ہوتے جاتے تھے۔ ان کی حقیقت بیان کرنے اور حقانیت ثابت کرنے کے لیے یہ علم نکالا گیا۔ یہ ضرورت ہمارے زمانے میں پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ آج کل گمراہی کے دوگونہ اسباب پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ بیدینی وراثت بنتی جاتی ہے۔ اس زمانے کے اکثر نوجوان سائنس داں اور ماہر فلسفہ اس لیے مذہب سے بے تعلق ہیں کہ خود ان کے بزرگ، جن کی مثالیں ان کے سامنے ہیں، اسلامی عقائد میں راسخ اور اعمال کے پابند نہیں ہیں۔ آگے اپنی اولاد کے سامنے یہ خود نمونہ ہوں گے۔

دوسرے اپنے ملک اور بیرون ملک سے مادّیت اور انکارِ خدا اور بے سودیِ مذہب کی صدائیں ان کے کان میں آ رہی ہیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں کہ

(بالفاظ علامہ شبلی) ''روح (۱) مادّہ ہی کی ایک قوت کا نام ہے۔ جو اعصاب سے پیدا ہوتی ہے۔'' (ڈاکٹر شظر) ''روح ایک قسم کی میکانکل حرکت ہے۔'' (وریشو) ''انسان صرف مادّہ کا ایک نتیجہ ہے۔'' (بوشر) ''زندگی فطرت کا کوئی اصلی قاعدہ نہیں، بلکہ ایک اتفاقی استثنا ہے جو مادّہ کے عام اصولوں کے مخالف ہے۔'' (دوترشیہ) ایک فلاسفر کہتا ہے کہ خدا کا وجود ہی نہیں، دوسرا کہتا ہے کہ ہے تو سہی، لیکن ظالم ہے۔

یورپ و امریکہ کا تو یہ حال ہے، جاپان ان سے کچھ کم نہیں ہے۔ سر راس مسعود مرحوم (متوفی ۱۹۳۷ء) نے اپنی تالیف ''نظم و نسق جاپان'' میں لکھا ہے کہ انھوں نے جاپان کے وزیر اعظم سے جاپان کے مذہبی رجحانات کے متعلق سوال کیا۔ وزیر اعظم نے جواب دیا کہ ''ہم خدا کو اپنے ملک میں نہیں گھسنے دیتے۔'' ہندوستان میں جواہر لال نہرو فرماتے ہیں کہ ''سارا فساد خدا کا ہے، اس کو نکال دو۔'' منشی پریم چند معاد اور حیات ثانی کے قائل نہ تھے۔ کہتے تھے کہ مجھے مرنے کے بعد کچھ فکر نہیں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے ایک عرصہ ہوا کسی مسلمان پروفیسر کے متعلق لکھا تھا (مجھے نام یاد نہیں رہا) کہ وہ عمر بھر خدا کے منکر اور مذہب سے بے نیاز رہے۔ خواجہ صاحب سے خاص تعلق تھا۔ جب شملہ پر مرنے لگے تو خدا یاد آیا اور تار دے کر خواجہ صاحب کو دہلی سے بلایا (بقول اکبرالٰہ آبادی) ''خدائی بزور موت'' ماننی پڑی۔

قلب و روح کی یہ تباہیاں اور مذہب کی یہ بربادیاں دیکھ کر علامہ شبلی نے چاہا تھا کہ 'الکلام' لکھ کر نوجوانوں کے لیے موافقت فلسفہ و مذہب کی راہ نکالیں۔ کتاب کے شروع میں انھوں نے اس ''جنگ زرگری'' کی صلح کے اصول بتائے ہیں، اسی کے مختلف حصے نقل کیے جاتے ہیں:-

علوم جدیدہ اور مذہب

یونان میں فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا، جس میں طبیعیات، عنصریات، فلکیات، الٰہیات، مابعد

---

(۱) یہ سب اقتباسات 'الکلام' سے لیے گئے ہیں۔

الطبیعات، سب کچھ شامل تھا۔ لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصے کر دے، جو مسائل مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے، ان کو سائنس کا لقب دیا۔ جو مسائل تجربہ اور مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے، ان کا نام فلسفہ رکھا۔

مسائل جدیدہ کی نسبت یہ عام خیال جو پھیلا ہوا ہے کہ وہ قطعی اور یقینی ہیں اس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ جو چیزیں قطعی اور یقینی ہیں وہ صرف سائنس کے مسائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یورپ میں ان کی نسبت طبقۂ علما میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ لیکن فلسفہ کی یہ حالت نہیں ہے۔ یورپ میں آج فلسفہ کے بیسیوں اسکول ہیں، اور ان میں شدت سے اختلاف ہے اگر ان سب کو صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک ہی چیز سفید بھی ہو سکتی ہے اور سیاہ بھی۔

اب دیکھنا چاہئے کہ سائنس کو مذہب سے کیا تعلق ہے۔ سائنس جن چیزوں کا اثبات یا ابطال کرتا ہے، مذہب کو اس سے مطلق سروکار نہیں۔ عناصر کس قدر ہیں؟ پانی کن چیزوں سے مرکب ہے؟ ہوا کا کیا وزن ہے؟ نور کی کیا رفتار ہے؟ زمین کے کس قدر طبقات ہیں؟ یہ اور اس قسم کے مسائل، سائنس کے مسائل ہیں، مذہب کو ان سے کچھ سروکار نہیں۔ مذہب جن چیزوں سے بحث کرتا ہے وہ یہ ہیں۔ خدا موجود ہے یا نہیں؟ مرنے کے بعد اور کسی قسم کی زندگی ہے یا نہیں؟ خیر و شر یا نیکی و بدی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ ثواب و عقاب ہے یا نہیں؟ ان میں سے کون سی چیز ہے جس کو سائنس ہاتھ لگا سکتا ہے؟ سائنس کے اساتذہ نے جب کہا ہے تو یہ کہا ہے کہ ہم کو ان چیزوں کا علم نہیں، یا یہ کہ یہ چیزیں مشاہدہ اور تجربہ کے احاطے سے باہر ہیں، یا یہ کہ ہم ان باتوں کا یقین نہیں کرتے کیونکہ ہم صرف ان باتوں کا یقین کرتے ہیں جو تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہو سکتی ہیں۔ کوتاہ نظر عدم علم سے علم عدم سمجھ جاتے ہیں۔ سائنس والے کہتے ہیں کہ ہم کو یہ چیزیں معلوم نہیں، کوتاہ بیں اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ ہم کو ان چیزوں کا نہ ہونا معلوم ہے۔ حالانکہ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔..........

خلط مبحث اس وقت پیدا ہوتا ہے جب سائنس اور مذہب دونوں میں کوئی اپنی حد سے بڑھ کر دوسرے کی حد میں قدم رکھتا ہے اور یہی خلط مبحث تھا جس نے ملاحدہ اور منکرین

مذہب کے خیال کو قوت دی۔ بلکہ درحقیقت اسی خلط مبحث نے الحاد اور بے دینی کے خیالات پیدا کر دیے۔ یورپ میں پہلے مذہب کو اس قدر وسیع کر دیا گیا تھا کہ کسی قسم کا کوئی علمی مسئلہ مذہب کی دست اندازی سے بچ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ خاص اس مقصد کی غرض سے اسپین میں مجلس انکویزیشن (محکمہ احتساب عقائد) قائم ہوئی تھی جس کا کام یہ تھا کہ جو لوگ مذہب کے خلاف کچھ کہتے ہوں ان کی تحقیقات کرے اور ان پر کفر اور ارتداد کا الزام لگائے۔ چنانچہ اٹھارہ برس میں یعنی ۱۴۸۱ء سے لے کر ۱۴۹۹ء تک دس ہزار دو سو بائیس آدمی، ارتداد کے الزام میں زندہ آگ میں جلا دیے گئے۔ اس مجلس نے ابتدائے قیام سے اخیر زمانے تک تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو کافر اور ملحد قرار دیا جن میں سے کئی لاکھ آگ میں جلا دیے گئے۔

جس قسم کی باتوں پر کفر کا الزام لگایا جاتا تھا اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہوگا۔ کوپر نیکس نے نظام بطلیموس سے انکار کر کے یہ ثابت کیا کہ زمین اور چاند وغیرہ آفتاب کے گرد گھومتے ہیں۔ اس پر مجلس انکویزیشن نے فتوے نافذ کیے کہ یہ رائے کتاب مقدس کے خلاف ہے اور اس بنا پر کوپرنیکس مرتد اور کافر ہے۔

گلیلیو نے جو دوربین کا موجد گزرا ہے، ایک کتاب کوپرنیکس کی حمایت میں لکھی جس میں ثابت کیا کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے اس پر مجلس انکویزیشن نے فتویٰ دیا کہ وہ مستوجب سزا ہے۔ چنانچہ اس کو گھٹنوں کے بل کھڑا کر دیا گیا اور یہ حکم دیا کہ وہ اس مسئلے سے انکار کرے۔ لیکن جب وہ اپنے عقیدے پر ثابت قدم رہا تو قید خانہ بھیج دیا گیا اور دس سال محبوس رہا۔

کولمبس نے جب کسی نئے جزیرے کے دریافت کرنے کی امید پر سفر کرنا چاہا تو کلیسا نے فتویٰ دیا کہ اس قسم کا ارادہ مذہب کے خلاف ہے۔

زمین کے کروی ہونے کا خیال جب اول ظاہر کیا گیا تو پادریوں نے سخت مخالفت کی کہ یہ اعتقاد کتاب مقدس کے خلاف ہے۔

غرض ہر قسم کے علمی ایجادات اور اکتشافات پر پادریوں نے کفر و ارتداد کے الزام لگائے،

تاہم چونکہ علمی ترقی کا اٹھان تھا، ان کی کوششیں بیکار گئیں۔ اور علوم وفنون تکفیر ہی کے سائے میں پھلے اور پھولے۔

پادریوں کے تعصبات اور وہم پرستی اگرچہ علم کو دبا نہ سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمی گروہ نے پادریوں ہی کے خیالات اور اوہام کو مذہب سمجھا اور اس بنا پر نہایت مضبوطی سے ان کی رائے قائم ہوگئی کہ مذہب جس چیز کا نام ہے وہ علم اور حقیقت کے خلاف ہے۔ یہی ابتدائی خیال ہے جس کی آواز بازگشت آج تک یورپ میں گونج رہی ہے۔

بے شبہ اگر مذہب اسی چیز کا نام ہے تو سائنس کے مقابلے میں کسی طرح نہیں ٹھہر سکتا۔ لیکن اسلام نے پہلے دن کہہ دیا تھا کہ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔ یعنی تم لوگ دنیا کی باتیں خوب جانتے ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ سائنس اور تمام علوم جدیدہ اسی دنیا سے متعلق ہیں، معاد اور آخرت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں۔

اس موقع پر یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ اسلام میں سیکڑوں فرقے پیدا ہوئے اور ان میں اس قدر اختلاف رہا کہ ایک نے دوسرے کی تکفیر کی یہ تکفیر بڑے بڑے مسائل پر محدود نہ تھی بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو اسلام کے دائرے سے خارج کر دیتا تھا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن علمی تحقیقات اور اکتشافات کی بنا پر کبھی کسی شخص کی تکفیر نہیں کی گئی۔

قدمائے مفسرین کا خیال تھا کہ پانی آسمان سے آتا ہے یعنی آسمان پر ایک دریا ہے، بادل اس سے پانی لیتے ہیں اور برساتے ہیں، آفتاب پانی کے ایک چشمہ میں غروب ہوتا ہے، زمین مسطح ہے کُروی نہیں۔ ستارے جو ٹوٹتے ہیں شیاطین کے شعلہ ہائے آتشیں ہیں۔ مفسرین ان تمام باتوں کو قرآن کی نصوص سے ثابت سمجھتے تھے۔ چنانچہ امام رازی نے مفسرین قدیم کے یہ تمام اقوال تفسیر کبیر میں نقل کیے ہیں۔

لیکن جب عباسیوں کا علمی دور آیا اور فلسفہ اور طبیعات نے ترقی کی تو لوگوں نے ان خیالات کی مخالفت کی۔ باوجود اس کے کہ خود مفسرین کے گروہ میں سے ایک شخص نے بھی ان لوگوں کو کافر اور منکر قرآن نہیں کہا۔ معتزلہ کو محدثین اس بنا پر کافر کہتے ہیں کہ وہ قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں لیکن اس بنا پر کوئی ان کو کافر نہیں کہتا کہ وہ جادو کی حقیقت

سے منکر ہیں۔ غرض جس حد تک تحقیق وتفتیش کی جائے عموماً یہ ثابت ہوگا کہ مسلمانوں نے
علمی تحقیقات اور ایجادات کو کبھی مذہب کا حریف مقابل نہیں سمجھا۔ بلکہ محققین نے صاف
تشریح کردی کہ اسباب کائنات اور مسائلِ ہیئت نبوت کی سرحد سے بالکل الگ ہیں
اور انبیاء کو تہذیب اخلاق کے سوا اور کسی چیز سے غرض نہیں۔

(۸) سوانح مولانا روم، علامہ شبلی اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں:۔

سلسلہ کلامیہ کا یہ چوتھا نمبر ہے۔ تین حصے (علم الکلام، الکلام، الغزالی) پہلے شائع ہو چکے
ہیں۔ مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ فقر و تصوف ہے، اور اس لحاظ سے
متکلمین کے سلسلے میں ان کو داخل کرنا، اور اس حیثیت سے ان کی سوانح عمری لکھنا، لوگوں کو
موجب تعجب ہوگا۔ لیکن ہمارے نزدیک اصلی علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس
طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بخود
دلنشیں ہو جائیں۔ مولانا نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے، مشکل سے اس کی نظیر مل
سکتی ہے۔ اس لئے ان کو زمرۂ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے۔

یہ علامہ کی بڑی نادر جدت ہے اور وسعت فکر و نظر کا نتیجہ کہ مولانا روم کو 'اہلِ کلام' اور مثنوی
مولوی معنوی کو 'تصانیف علم کلام' میں شامل کیا ہے۔ 'مثنوی کے علم کلام' سے بحث کرتے
وقت علمائے علم کلام کی تصانیف کے متعلق لکھتے ہیں:۔

ان تمام تصنیفات کے پڑھنے سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین غلط کو
صحیح، دن کو رات، زمین کو آسمان ثابت کر سکتے ہیں، لیکن ایک مسئلہ میں بھی یقین اور تشفی کی
کیفیت نہیں پیدا کر سکتے، بخلاف اس کے مولانا روم جس طریقے سے استدلال کرتے ہیں
وہ دل میں اثر کر جاتا ہے، اور گو وہ شک و شبہات کے تیر باراں کو کلیۃً نہیں روک سکتا، تاہم
طالب حق کو اطمینان کا حصار ہاتھ آجاتا ہے، جس کی پناہ میں وہ اعتراضات کے تیر باراں
کی پروا نہیں کرتا۔ نمونے کے طور پر ایک ایسا ہی مختصر سا مقام پیش کیا جاتا ہے:۔

معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں اوپر گزر چکا کہ مولانا کے نزدیک نبوت کی تصدیق
کے لئے معجزہ شرط نہیں۔ جس کے دل میں ایمان کا مزہ ہوتا ہے، پیغمبر کی صورت اور اس کی

باتیں اس کے حق میں معجزہ کا کام دیتی ہیں۔

در دلِ ہر کس کہ از دانش مزہ است ‌ ‌ روے و آوازِ پیمبر معجزہ است

لیکن مولانا نے اسی پر قناعت نہیں کی، بلکہ صاف صاف تصریح کی کہ معجزہ ایمان کا سبب نہیں ہوتا اور اس سے ایمان پیدا بھی ہوتا ہے تو جبری ایمان پیدا ہوتا ہے، نہ ذوقی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

موجب ایماں نباشد معجزات
بوے جنسیت کند جذب صفات

معجزات ایمان کا سبب نہیں ہوتے جنسیت کی بو صفات کو جذب کرتی ہے

معجزات از بہر قہر دشمن است
بوئے جنسیت سوئے دل بُردن است

معجزات اس لئے ہوتے ہیں کہ دشمن دب جائیں لیکن جنسیت کی بو اس غرض کے لئے ہے کہ دل تک پہنچ جائے

قہر گردد دشمن امّا دوست نے
دوست کے گردد بہ بستہ گردنے

دشمن دب جاتا ہے لیکن دوست نہیں ہوتا وہ شخص بھلا کیا دوست ہوگا جو گردن پکڑ کر لایا گیا ہے

مولانا نے اس بحث میں ایک اور دقیق نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

معجزہ سے نبوت پر جو استدلال کیا جاتا ہے اس کی منطقی ترتیب یہ ہوتی ہے:۔

اس شخص سے یہ فعل (معجزہ) صادر ہوا ہے،

اور جس شخص سے یہ فعل صادر ہو وہ پیغمبر ہے،

اس لئے یہ شخص پیغمبر ہے،

اس صورت میں پیغمبر کا اثر بالذات خارجی چیز پر ہوتا ہے، مثلاً دریا کا پھٹ جانا، سنگریزوں کا بولنا وغیرہ وغیرہ۔ اس اثر سے پھر بواسطہ قلب پر اثر پڑتا ہے۔ یعنی آدمی اس بناء پر ایمان

لاتا ہے کہ جب اس شخص نے دریا کوشق کر دیا تو ضرور پیغمبر ہے۔

لیکن بجائے اس کے کہ معجزہ کسی پتھر یا دریا، یا جمادات پر اثر کرے، یہ زیادہ آسان ہے کہ پہلے پہل دل ہی پر اثر کرے۔ خدا جب یہ چاہتا ہے کہ پیغمبر پر لوگ ایمان لائیں تو یہ زیادہ آسان اور زیادہ دلنشیں طریقہ ہے کہ بجائے جمادات کے خود لوگوں کے دلوں کو متاثر کردے کہ وہ ایمان قبول کرلیں، اور یہی اصلی معجزہ کہا جا سکتا ہے۔ مولانا اس نکتے کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:۔

معجزہ کاں بر جمادے کرد اثر — یا عصا یا بحر یا شق القمر
گر اثر برجاں زند بے واسطہ — متصل گردد بہ پنہاں رابطہ
بر جمادات آں اثر عاریہ است — آں پے روح خوش متواریہ است
تا ازاں جامد اثر گیرد ضمیر — حبذاماں بے ہیولائے خمیر
بر زند از جانِ کامل معجزات — بر ضمیرِ جان طالب چوں حیات

آخر شعر میں معجزہ کی اصل حقیقت بتائی ہے، یعنی پیغمبر کا روحانی اثر خود طالب کی روح پر پڑتا ہے۔ کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اصل میں مولانا کی مثنوی علم کلام کی نہیں، بلکہ تصوف کی کتاب ہے۔ مولانا صوفی تھے اور صوفی بھی زاہد و مجاہد، مجذوب و مستغرق۔ انھوں نے ''علم ظاہر'' کی کتابوں کو آگ لگانے کے لئے مثنوی لکھی ہے۔ اس لئے ان کو مثنوی میں ''کلام'' کیا قران وحدیث کی تعلیم سے بھی بحث نہیں۔ صرف تصوف سے تعلق ہے۔ اسی کے مسائل، مسائل کی طرح نہیں، بلکہ واردات قلبی کے طور پر بیان کیے ہیں۔ اسی لیے مثنوی میں شاعری نہیں، بلکہ الہام ہے، اور اسی لیے نظامی نے یہ کہا ہے:۔

مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآں در زبانِ پہلوی
من چہ گویم وصف آں عالیجناب — نیست پیغمبر و لے دارد کتاب

لیکن اس میں شک نہیں کہ مثنوی شریف کے اندر ''علم کلام'' بھی ہے۔ ''متکلمین'' کے بیان میں نہیں، ''کتب کلامیہ'' کی زبان میں نہیں، بلکہ عارف حقائق کے طرز میں،

کاشف اسرار کے اسلوب میں، صاحب وجد و حال کے طور پر، قطب ارشاد کے انداز سے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مثنوی فتنہ تاتار کے زہر کا تریاق بن کر وجود میں آئی تھی۔ ۶۵۶ ہجری میں چنگیز کے پوتے ہلاکو نے خلیفہ معتصم باللہ کو ہلاک، خلافت عباسیہ کو تباہ، بغداد کو برباد کیا۔ اور ۶۷۲ھ میں مولانا روم نے وفات پائی۔ ان درمیانی سولہ سال میں مثنوی تصنیف ہوئی۔ تاتاریوں کے مظالم مولانا روم نے دیکھے تھے۔ ان کے نتائج و عواقب مولانا کے سامنے تھے۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال، فکر و نظر، قلب و روح کی جڑیں ہل گئی تھیں۔ اضطراب طاری تھا، اضطرار کی کیفیت تھی، دنیا نظروں میں تاریک تھی، سکون و قرار مفقود تھا۔ ایسے طوفان میں اگر کوئی کشتی وقار و اطمینان کے ساتھ تیرتی ہے تو وہ اولیاء اللہ کا قلب ہے۔ اگر کہیں روحانی تسکین ملتی ہے تو اولیاء اللہ کی صحبت میں۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس فتنۂ تاتار سے پہلے فتنۂ اعتزال ظہور میں آچکا تھا۔ متکلمین کا گروہ پیدا ہو چکا تھا اور اسلامی عقائد و اعمال کی عقلی توجیہات میں نزاع و جدال کا ہنگامہ برپا رہ چکا تھا۔ مولانا روم اس مرحلے سے بھی گزر چکے تھے۔ ان کے دل پر ان تمام حالات کا اثر تھا۔ اب جو انھوں نے مثنوی لکھنی شروع کی تو اس میں زخم تاتار کا بھی مرہم تھا، امراضِ روحانی کی بھی تشفی تھی اور اضطراب یقین و ایمان کی بھی تسلی۔ چنانچہ مثنوی کا یہ اثر فوراً ظاہر ہونے لگا۔ تصنیف ہوتے ہی مقبول ہوگئی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جب جب کوئی فتنہ پیدا ہوا مثنوی کی مقبولیت میں اضافہ ہوگیا۔ اور اس کی نئی نئی شرحیں وجود میں آگئیں۔ تیمور کے حملے، اکبر و جہانگیر کی بے دینی، نادر شاہ کی غارت گری نے مسلمانوں کے قلب و روح کو مضطر و مضطرب کیا اور مثنوی نے اپنے پیام سے تسکین بخشی۔

اسی وجہ سے مثنوی کی بے شمار شرحیں لکھی گئیں لیکن سب میں طریقت، حقیقت، معرفت کے نکات کی توضیح تھی، اس لیے کہ شارحین کے عہد میں اس کی ضرورت تھی۔ لیکن علامہ شبلی نے جس زمانے میں "سوانح مولانا روم" لکھے سر سیّد نے علم کلام کے مسائل چھیڑ

رکھے تھے اور اسلامی عقائد کی عقلی و ''کلامی'' توجیہ و تاویل شروع کر دی تھی۔ شبلی سرسیدؒ کی صحبت میں رہ چکے تھے اور ان کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ وہیں سے علم کلام کا ذوق لے کر آئے تھے۔ اس لیے 'الغزالی' کے بعد جب نظر دوڑائی تو ایک متکلم رومی بھی نظر آئے۔ چنانچہ مثنوی میں سے علم کلام کے مسائل اخذ کر کے دکھانے کی غرض سے ہی شبلی نے یہ کتاب لکھی۔ اسی لیے مثنوی کے تصوف سے زیادہ مثنوی کے کلام پر ہمت صرف کی۔ بہر حال یہ دریافت علامہ کی فضیلت پر دال ہے۔

(۹) **موازنۂ انیس و دبیر** یہ بھی حیدر آباد میں لکھی گئی اور ''سلسلۂ آصفیہ'' میں شامل ہوئی۔ علامہ شبلی نے جتنی کتابیں لکھیں عرب و ایران کی تاریخ، مشاہیر، اور علم و ادب کے متعلق لکھیں۔ صرف یہ ''موازنہ'' ہندوستان اور اُردو زبان سے متعلق ہے۔ بظاہر 'علمائے کلام' اور 'شعرائے عجم' کے درمیان میں 'انیسؔ و دبیرؔ' کے آ جانے کا کوئی قرینہ نہ تھا۔ لیکن حسن اتفاق سے اس زمانے میں علامہ شبلی حیدر آباد میں مقیم تھے۔ وہاں تعزیہ داری اور مرثیہ خوانی کا ہمیشہ سے بڑا اہتمام ہے۔ علامہ کے دورانِ قیام میں لکھنؤ کے مشاہیر مرثیہ، مرزا اوجؔ (خلف مرزا دبیر)، میر نفیسؔ، عارفؔ، رشیدؔ حیدر آباد آئے۔ بڑی دھوم کی مجلسیں ہوئیں۔ بڑے زور کے مرثیے پڑھے گئے۔ ان کو دیکھ کر اور سن کر علامہ شبلی کو بھی ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' کا خیال آیا۔ لیکن اس طرح کی تصنیف کی تجویز بہت پہلے سے ان کے ذہن میں تھی۔

'موازنہ' کے ساتھ ساتھ ایک اور کتاب لکھی گئی ہے جو بعد کو شائع ہوئی۔ یعنی مولوی امجد علی اشہری کی ''حیات انیسؔ''۔ اشہری صاحب اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

> ''۱۳۱۵ھ (۱۸۹۸ء) میں جس سال مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے مشہور بانی سر سیّد احمد خاں بہادر کا انتقال ہوا، راقم کو نواب محسن الملک بہادر کی خدمت میں علی گڈھ جانے کا اتفاق ہوا جو سر سیّد کی کوٹھی میں فروکش تھے۔ اس کوٹھی کے عالی شان کمرے میں سر سیّد کا کتب خانہ علامہ شبلی صاحب نعمانی کے سپرد تھا۔ میں اکثر جی بہلانے کو وہاں جا بیٹھتا۔

ایک روز علامہ شبلی نے مجھ سے کہا کہ اُردو میں میر انیسؔ کا درجہ ایسا ہے جیسے فارسی میں
فردوسیؔ کا درجہ...... مگر تعجب ہے کہ ان کے حالات زندگی پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی۔
اگر تم سے ہو سکے تو یہ کام کرنے کا ہے، میں بھی کچھ مدد دوں گا۔"

(دیباچہ حیات انیسؔ صفحہ ۲۰۱)

اشہری صاحب نے اپنی تالیف کے متعلق ایک طویل نظم لکھ کر رسالہ 'مخزن' لاہور میں چھپوائی تھی جس میں میر انیسؔ کے جاننے والوں سے کتاب کے لیے مواد مہیا کرنے کی درخواست کی تھی۔ اس نظم میں بھی علامہ شبلی کی فرمائش کا حوالہ دیا ہے۔

کہا یہ مجھ سے مکرر جناب شبلی نے — کہ میں انیسؔ کی لائف لکھوں بر سم کبار

اس کے بعد اشہری صاحب لکھتے ہیں:-

اس پر بھی بجز وعدۂ فرصت کسی صاحب نے کچھ نہ لکھا...... مولانا شبلی صاحب نے کچھ
مدد دینے کا وعدہ کیا تھا وہ خود "موازنہ انیسؔ و دبیرؔ" لکھنے پر آمادہ ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ شبلی علی گڑھ سے مستعفی ہو کر حیدر آباد آ گئے تھے۔ یہاں انھوں نے بجائے اشہری صاحب کو مدد دینے کے خود موازنہ لکھنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُردو اور مرثیہ دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ علامہ کو اس طرف توجہ ہوئی۔ ان کے ذہنِ رسا اور دقتِ نظر نے کلام انیسؔ کا جیسا تجزیہ اور تبصرہ کیا ہے جو نکتے نکالے ہیں، جو موازنے کیے ہیں، وہ دوسرے سے مشکل تھے۔ اشہری صاحب نے اپنی "حیاتِ انیسؔ" پہلے لکھنی شروع کر دی اور 'موازنہ' کے شائع ہونے سے پہلے تقریباً مکمل کر چکے تھے۔ لیکن 'حیات' سے پہلے 'موازنہ' چھپ گیا تو اشہری صاحب نے جہاں مولانا حالی، علامہ آزاد، مولوی امداد امام اثرؔ کی رائیں کلام انیسؔ کے متعلق لکھیں، علامہ شبلی کی رائے پیش کرنے کے لیے 'موازنہ' سے بھی بارہ صفحے نقل کیے۔ ان صفحات میں علامہ شبلی کے وہ فقرے بھی ہیں جن میں مرزا دبیرؔ کے متعلق لکھا ہے کہ فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، بلاغت نام کو نہیں۔ اس پر اشہری صاحب نے یہ نوٹ لکھا ہے:-

"میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مقابلے کی بحث ان چند سطروں پر تمام نہیں ہو سکتی۔ اس کے

لئے دونوں صاحبوں کے مجامیع تصنیفات پر نظر کرنا اور بات بات کو ایک دوسرے کے مقابل دیکھنا اور دکھلانا ہوگا۔"

یہ بحث اعتراضات کے سلسلے میں آچکی ہے۔ "موازنہ" کی خوبیوں کے مقابلے میں ان چند اعتراضات کی کوئی حقیقت نہیں۔ علامہ شبلی کی یہ تصنیف بھی اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی اور بہترین ہے۔ دو ایک نمونے یہ ہیں:-

(الف) فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکہ یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ، آسان، کثیر الاستعمال ہو، اس لیے لوگ مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے۔ میرزا دبیر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں، اکثر ان کے کلام میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں۔

مثلاً جہاں حضرت شہربانو نے حضرت عباس کی لاش پر نوحہ کیا ہے، شہربانو کی زبان سے فرماتے ہیں "ہے ہے مرے دیور، مرے دیور، مرے دیور"۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

"ناڑہ تو ان کی سالگرہ کا نکال لا"

ابتذال کی صاف اور بیّن مثال نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے۔ اگر یہ ممیّز نہ ہوتا تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی سے ٹکر کھاتا۔

ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں وہ مبتذل ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا۔ ابتذال کا معیار مذاق صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ مذاق صحیح خود بتا دیتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل، پست اور سوقیانہ ہے۔

میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہر قسم کے جُزئی جُزئی واقعات اور حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ ان کی انتہا درجے کی قادر الکلامی ہے کہ پھر بھی ان کی شاعری کے دامن پر ابتذال کا دھبہ نہیں آنے پاتا۔

کلام کی فصاحت یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی۔ لیکن کلام کی فصاحت میں

صرف الفاظ کا فصیح ہونا کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے۔ ان کی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو، ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ قرآن مجید میں ہے مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی۔ فواد اور قلب دو ہم معنی الفاظ ہیں اور دونوں فصیح ہیں۔ لیکن اگر اس آیت میں فواد کی جگہ قلب کا لفظ آئے تو خود یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ گو قلب کا لفظ بجائے خود فصیح ہے، لیکن ماقبل اور مابعد کے جو الفاظ ہیں، ان کی آواز کا تناسب قلب کے لفظ کے ساتھ نہیں ہے۔

میر انیس کا مصرعہ ہے ۔ ''فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور'' صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں، اور دونوں فصیح ہیں ۔ میر انیس نے جا بجا ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے، اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کیا ہے، لیکن اگر اس مصرع میں صحرا کی بجائے جنگل کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔ میر صاحب کا ایک شعر ہے:

جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں

یہاں جنگل کے بجائے صحرا لاؤ تو مصرع پھس پھسا ہو جاتا ہے۔

شبنم اور اوس ہم معنی ہیں اور برابر درجے کے فصیح ہیں لیکن میر صاحب کے اس شعر میں

تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

اگر اوس کی بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائے گی۔ (۱)

---

(۱) علامہ شبلی کا یہ نکتہ اصولاً صحیح ہے کہ متناسب آواز اور لے کے الفاظ کو ترتیب دینے سے لطافت اور روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن میر انیس کا یہ شعر اس کی درست مثال نہیں ہے۔ بلا شبہ (اوس) اور (اور) کی آوازیں متناسب ہیں، اس لئے اوس کا لفظ شبنم سے زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اصل میں اوس کا لفظ اس تناسب کی خاطر نہیں لایا گیا۔ بلکہ محاورے کی وجہ سے لایا گیا ہے۔ ''اوس کھانا'' محاورہ ہے ''شبنم کھانا'' نہیں ہے۔ ''کھا کھا کے'' لکھنا تھا تو لامحالہ ''اوس'' ہی لکھا جاتا۔ ''شبنم'' نہیں لکھا جا سکتا۔ یہ البتہ میر صاحب کا کمال ہے کہ الفاظ کو اس طرح مرتب کیا کہ محاورے کی صحت کے ساتھ آواز کا تناسب بھی پیدا ہو گیا اور مصرع میں لطافت اور شیرینی اور روانی آ گئی (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے، اس مصرع میں۔

"شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے"

شبنم کے بجائے لاؤ تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے، اس لئے یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کے سلسلے میں وہ ترکیب دیا جائے، ان آوازوں سے اس کو خاص تناسب بھی ہو، ورنہ گویا دو مخالف سروں کو ترکیب دینا ہوگا۔ نغمہ اور راگ مفرد آوازوں یا سُروں کا نام ہے۔ ہر سُر بجائے خود دلکش اور دلآویز ہے، لیکن اگر دو مخالف سُروں کا باہم ترکیب دیا جائے تو دونوں مکروہ ہو جائیں گے۔ راگ کے دلکش اور موثر ہونے کا گُر یہی ہے کہ جن سُروں سے اس کی ترکیب ہو ان میں نہایت تناسب اور توازن ہو۔

الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صوت اور سُر ہیں، اس لئے ان کی لطافت، شیرینی اور روانی اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب گرد و پیش کے الفاظ بھی لے میں ان کے مناسب ہوں۔

کتاب کے آخر میں انیسؔ و دبیرؔ کے متحد المضمون اشعار کا موازنہ کرتے ہیں، اس کی مثال یہ ہے:-

(ب) دبیرؔ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دوسری مثال میں شبنم کی جگہ اوس کا لفظ وزن میں نہیں سماتا۔ اس لیے اس کے لانے نہ لانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آ سکتا تب بھی کوئی عدم تناسب پیدا نہ ہوتا۔ اس مصرع کے الفاظ کو "شبنم" یا "اوس" سے کوئی خاص تناسب نہیں ہے۔ مثلاً اگر کہیں:-

"رکھ دے گی اوس بھر کے کٹورے گلاب کے"

تو اوس کا لفظ مطلقاً غیر متناسب نہیں معلوم ہوتا، ہاں اگر اس طرح کہیں:-

"بھر دے گی آج اوس کٹورے گلاب کے"

تو اگرچہ (شبنم) اور (اوس) دونوں اس مصرع میں موزوں رہتے ہیں، لیکن (اوس) فصیح تر معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی آواز (آج) کی آواز سے تناسب رکھتی ہے۔

دہشت سے جواں بھاگتے تھے تیر کے مانند　　تھا نیزوں کو رعشہ قدم پیر کے مانند

انیسؔ:-　　چلنے میں نیزے کانپتے تھے مثل پائے پیر

میر صاحب کا مصرع زیادہ فصیح اور صاف ہے۔ ان الفاظ سے ''کانپتے تھے'' جو تصویر خیال میں کھنچ جاتی ہے، وہ رعشہ کے لفظ سے پیدا نہیں ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک چلنے کی قید نہ مذکور ہو، پوری تشبیہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ بوڑھے آدمی کے پاؤں چلنے ہی میں کانپتے ہیں۔ اس کے ساتھ چونکہ ''چلنے'' کا اطلاق پاؤں اور نیزہ دونوں پر ہوتا ہے، اس لئے یہ لفظ اس موقع پر نہایت موزوں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نیزہ چلانے کی حالت میں نیزہ کو لچک ہوتی ہے، اس لئے اس کو کانپنے سے تعبیر کر سکتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کہنا کہ نیزہ چلنے کی حالت میں خوف سے کانپتا تھا نہایت لطیف حسن التعلیل ہے۔ بخلاف اس کے مرزا صاحب نے چونکہ نیزہ کی جنبش اور حرکت کا ذکر نہیں کیا، اس لئے رعشہ کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔

دبیرؔ:-　　چلائے ہات مل کے جلاجل کہ الاماں

انیسؔ:-　　ہو گیا جوڑ کے ہاتوں کو جلاجل خاموش

جلاجل کے دونوں حصے جو بجانے میں مل جاتے ہیں اس کی تعبیر دونوں بزرگوں نے دو طرح پر کی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ جلاجل چلا کر الامان کہتا تھا اور ہاتھ ملتا تھا۔ لیکن چلاّنے کو ہاتھ ملنے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے گو تشبیہ صحیح ہے، لیکن ہاتھ ملنے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ میر صاحب کہتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کا رعب اس قدر غالب ہوا کہ جلاجل ہاتھ جوڑ کے چُپ ہو گیا۔ رُعب اور خوف کی حالت میں ہاتھ جوڑنا اکثر ہوتا ہے، اور چونکہ جلاجل کے دونوں حصے جب مل جاتے ہیں تو پھر جب تک جدا نہوں آواز نہیں دے سکتے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وہ ہاتھ جوڑ کر چُپ ہو گیا۔

(۱۰) شعر العجم، فارسی شاعری اور شاعروں کا ضخیم تذکرہ ہے۔ ۵ جلدیں ہیں اور گیارہ سو سے زیادہ صفحے۔ آغازِ تصنیف کا مادّہ تاریخ ''تاریخ عجم'' (۱۳۲۴ھ) ہے، اور اختتامِ تصنیف کی تاریخ ''تذکرہ'' (۱۳۲۵ھ) ہے یعنی ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء میں لکھا گیا۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی حصہ پنجم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

''شعر العجم کا تخیل مولانا کے دل میں ایک مدت سے موجود تھا، ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں ان کو اس موضوع کا خیال آیا۔''

لیکن علامہ شبلی نے حصہ اول کا جو دیباچہ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال اس سے بھی بہت پہلے کا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

''شعراء کے تذکرے بہت ہیں، لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں، جن میں شعرا کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھ دئے ہیں۔ شعراء کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں۔ اور شاعری کے عہد بعہد کے انقلابات اور ان کے اسباب کا تو مطلق ذکر نہیں۔ میں اس کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا، اور اکثر اس اُدھیڑبُن میں رہتا تھا۔ مئی ۱۸۹۴ء میں میرے معزز دوست اور استاد مسٹر آرنلڈ نے مجھ کو اطلاع دی کہ جرمنی کے ایک پروفیسر جیمس ڈارمٹیٹر نے اس موضوع پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے۔ میں اس زمانے میں فرنچ زبان سیکھ رہا تھا۔ بڑے شوق سے کتاب منگوائی۔ لیکن وہ ۸۸ صفحوں کا ایک رسالہ تھا، جس میں شعراء کے نہایت معمولی حالات تھے۔ ایک مدت کے بعد اس مصنف کی ایک اور ضخیم کتاب شائع ہوئی، جو تحقیق اور تدقیق کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز تھی۔ لیکن وہ زبان کی تاریخ ہے، جس میں ژند، پہلوی وغیرہ زبانوں پر نہایت محققانہ بحث کی ہے، اور اسلام کے قبل کی تصنیفات کا سراغ لگایا ہے۔ شاعری کی تاریخ سے اس کو لگاؤ نہیں۔''

علامہ اس سے آگے 'شعر العجم' کے آغاز تصنیف کا ذکر کرتے ہیں:۔

۶ر مارچ ۱۹۰۶ء کو میں نے اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا، لیکن بیچ بیچ میں ''موازنہ انیس'' اور ''الندوہ'' سدِ راہ ہوتے رہے .... یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۰۷ء کی چھٹی تاریخ کو دورِ اول کا پہلا حصہ انجام پذیر ہوا۔

باقی حصوں کی تالیف و اشاعت کے متعلق سیّد سلیمان ندوی صاحب حصہ پنجم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ''۱۹۰۸ء میں شعر العجم کی پہلی جلد زیر طبع تھی، دوسری اور تیسری زیرِ تصنیف۔ ۱۹۰۹ء کے آخر میں دوسری، اور ۱۹۱۰ء میں تیسری جلد شائع ہوئی'' علامہ نے جنوری ۱۹۱۲ء کے ''الندوہ'' میں یہ نوٹ لکھا:۔

''شعر العجم کا چوتھا حصہ زیر تالیف ہے، لیکن وہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس کے دو حصے کر

دینے پڑے۔ ایک حصہ مطبع میں جاچکا ہے اور چھپ رہا ہے، لیکن دوسرے کو میں نے روک لیا کہ اب مجکو سب سے مقدم اور مہتم بالشان کام یعنی 'سیرۃ نبویؐ' کی تالیف میں مصروف ہو جانا چاہئے۔ اگر یہ کام انجام پا گیا تو شعر العجم ہوتی رہے گی، اس کی کیا جلدی ہے۔

سیّد سلیمان صاحب اس نوٹ کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:-

> اب یہی 'اوراقِ ممنوعہ' چھ برس کے بعد دسمبر ۱۹۱۸ء میں شائع ہو رہے ہیں۔ اور اس طرح سمجھنا چاہئے کہ شریعتِ حسن و عشق کے یہ پانچوں صحیفے تقریباً ۱۳ برس کے عرصے میں بتدریج تکمیل کو پہنچے .... پانچویں حصے کی تصنیف سے درحقیقت مولانائے مرحوم بتمامہ فارغ نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے مسودات ان کی نظرِ ثانی کے محتاج تھے .... تاہم یہی مناسب سمجھا گیا کہ ان موتیوں کی لڑی میں پوت نہ ملایا جائے۔ چنانچہ فصول و ابواب کی ترتیب کے علاوہ اصل متن میں کسی قسم کی مداخلت جائز نہیں رکھی گئی ہے۔ مولانا اپنی ہر تصنیف بار بار کی حک و اصلاح، تکرارِ نظر اور کاٹ چھانٹ کے بعد شائع کرتے تھے۔ اس کتاب سے معلوم ہوگا کہ بے ساختگی کے ساتھ اول دہلہ میں ان کے دماغ سے کیا خیالات اور ان کے قلم سے کیا الفاظ نکلتے تھے۔

اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ اختتامِ تصنیف کی تاریخ، تذکرہ (جس میں ۱۳۲۵ھ نکلتے ہیں) بطور تفاول و پیشین گوئی پہلے سے نکال لی ہوگی، ورنہ ۱۳۳۱ھ تک مرتب ہوتی رہی۔ اس لیے اختتام کا مادّہ "تاریخ ادب عجم" (۱۳۳۱ھ) ہوسکتا ہے۔

شعر العجم حصہ اول کے آغاز میں علامہ نے فارسی شاعری کے آغاز کا زمانہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور سب سے قدیم اشعار لکھے ہیں۔ علامہ اس حصہ تاریخ کو کچھ اہمیت نہ دیتے تھے۔ ان کا اصل مقصود تنقید شاعری تھا اور ضمناً تاریخ شاعری۔ اس لیے انھوں نے آغازِ شاعری کے متعلق ذاتی تحقیق نہیں کی، بلکہ مجمع الفصحاء و تذکرہ دولت شاہ وغیرہ کی مفروضہ و "سینہ بہ سینہ" روایات کو سرسری طور پر بیان کر دیا۔ لیکن اس میں علامہ شبلی تنہا قابلِ الزام نہیں ہیں۔ ان کا تو یہ مقصود اصلی ہی نہ تھا۔ پروفیسر براؤن وغیرہ مستشرقین یورپ جن کا کام ہی کرید اور چھان بین ہے، ان کی بھی وہاں تک رسائی نہ ہوسکی۔

ایران والوں نے ''کتاب الوزراء''، ''تاریخ سیستان'' وغیرہ کے حوالے سے اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ رضا زادہ شفق نے ''تاریخ ادبیات ایران'' میں ثابت کیا ہے کہ عہد اسلام میں فارسی شاعری کی بنیاد حکومت بنی امیہ کے ابتدائی زمانے میں پڑ گئی تھی۔ چنانچہ یزید بن معاویہؓ کے عہد حکومت (۶۰ھ ﴿۶۷۹ء﴾ تا ۶۴ھ ﴿۶۸۳ء﴾) میں یزید بن مُفرّغ نے زیاد کی ماں سُمیہ پر ان موزوں فقروں میں طعن کیا تھا:

آبست نبیذ است عصارات زیب است سُمیہ روسپیذ است

اس کے بعد دوسری صدی ہجری کے آغاز (یعنی ۱۰۸ھ ﴿۷۲۶ء﴾) میں جب اسد بن عبداللہ القصاری الختلانی نے خاقان کے ہاتھ سے شکست کھائی تو خراسان کے بچوں نے ان موزوں الفاظ میں اس کا مذاق اُڑایا:-

از ختلان آمدیہ برد تباہ آمدیہ
آباد باز آمدیہ خشک نزار آمدیہ

پھر ابوالینبغی عباس بن ترخان جو جعفر برمکی اور فضل برمکی (وزرائے خلیفہ ہارون رشید) کا درباری شاعر (۱۸۷ھ ﴿۸۸۲ء﴾) تھا، اس نے شہر سمرقند کے متعلق یہ شعر کہے تھے:-

سمر قند کند مند بزینت کے افگند
از شاش نہ بہی خشک نزار آمدیہ

'شعر العجم' کی پہلی تین جلدوں میں فارسی شاعری کی ابتدا یعنی شعرائے طاہریہ (تیسری صدی ہجری اور نویں صدی عیسوی) سے شعرائے شاہجہانی (گیارھویں صدی ہجری اور سترھویں صدی عیسوی) تک کا تذکرہ ہے۔ لیکن دوسرے تذکروں کی طرح تمام شاعروں کا احاطہ نہیں کیا، بلکہ صرف ۲۴ شاعر چن کر ان کے تذکرہ و تبصرہ کو تین جلدوں کے ۷۲۸ صفحوں پر پھیلایا ہے۔ بعض ممتاز شعراء پر ساٹھ ساٹھ ستر ستر صفحے لکھے ہیں۔ فردوسی پر پہلی جلد میں ۷۵ صفحے لکھے ہیں، اور پھر شاہنامہ پر چوتھی جلد میں ۷۰ صفحے۔ گویا پانچ جلدوں میں سے تقریباً ایک جلد اکیلے فردوسی پر ہے۔ حقیقت میں تذکرہ لکھنے کا یہی حق

تھا۔ اور تذکرے اس کے مقابلے میں (بقول علامہ) ''بیاض اشعار'' ہیں۔ علامہ کے حسن انتخاب اور خوبیِ نقد و نظر کو قدیم و جدید کوئی تذکرہ نہیں پہنچتا۔ چوتھی جلد میں شاعری کی حقیقت اور فارسی شاعری کے محاسن و معائب سے بحث کی ہے۔ آخری جلدیں جن میں مضامین شاعری کے مختلف اصناف عشق و حسن، اخلاق، فلسفہ، تصوف، مدح و ثنا پر ریویو کیا ہے، فنِ تنقید میں ایجادِ نو ہے۔ اس کی نظیر فارسی لٹریچر میں موجود نہ تھی۔ چنانچہ طہران میں آقائے محمد تقی فخر داعی گیلانی نے ''فارسی جدید'' میں ان کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

شعر العجم کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ جن شاعروں کا اس میں تذکرہ لکھا گیا ہے، ان سے بہتر کوئی شاعر باقی نہیں رہا۔ یہی جواب ہے اس اعتراض کا کہ علامہ شبلی نے خاقانیؔ، ظہیرؔ فاریابی اور جامیؔ کو مستقل تذکرہ کے قابل نہیں سمجھا۔ قصیدہ میں خاقانیؔ اور ظہیرؔ کی عظمت علامہ کو تسلیم ہے، جیسا کہ انھوں نے پانچویں جلد میں ریویو کیا ہے۔ لیکن خاقانی کا ذہن قصیدہ کے لیے صحیح طور پر متوازن نہ تھا۔ اس کے قصائد میں ''بھاری بھرکم'' ہونے کے سوا کوئی وصف نہیں۔ ظہیرؔ نے قصیدہ میں جو محاسن پیدا کیے ان کو سلمانؔ ساوجی نے بہت بڑھا دیا تھا۔ جب انتخاب ٹھہرا تو ظہیرؔ و سلمانؔ میں سے سلمانؔ بہتر تھا۔ نظامیؔ و خسروؔ کی مثنویوں کے سامنے جامیؔ کی مثنویوں کا یقیناً تیسرا درجہ ہے، اور غزل میں خسروؔ، حافظؔ، نظیریؔ وغیرہ کے مقابلے میں جامیؔ کا تیسرا درجہ بھی نہیں ہے۔

شعر العجم کے چند نمونے یہ ہیں:-

(الف) حضرت امیر خسرو دہلوی کا تذکرہ و تبصرہ ۲۷ صفحوں میں لکھا ہے، ان کی جامعیت اور کمالات بیان کرتے ہیں:-

> ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا۔ اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کیے ہوں گے۔ صرف ایک شاعری کو لو، تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسیؔ، سعدیؔ، انوریؔ، حافظؔ، عرفیؔ، نظیریؔ بے شبہ اقلیم سخن کے ''جم و کے'' ہیں لیکن ان کی حدودِ حکومت ایک ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے۔ فردوسی

مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سعدیؔ قصیدے کو ہات نہیں لگا سکتے، انوریؔ مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا۔ حافظؔ، عرفیؔ، نظیریؔ غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن خسروؔ کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے، اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد، اور صنائع بدائع کا تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ فردوسیؔ کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے۔ صائبؔ نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہا ہے۔ لیکن امیر خسروؔ کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں۔ اکثر تذکروں میں خود امیر خسروؔ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے۔ اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے۔ امیر نے ابیات کا لفظ لکھا ہے، اور قدما کے محاورے میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جا بجا نظر آتی ہیں کہ اس میں اس قدر بیتیں ہیں۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدیؔ نے تذکرہ 'عرفات' میں لکھا ہے کہ امیرؔ کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاکا میں ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں۔

مختلف زبانوں کی زباندانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے۔ عربی میں ادبائے عرب کے ہمسر ہیں۔ سنسکرت کے ماہر ہیں، چنانچہ مثنوی 'نُہ سپہر' میں تواضع کے لہجے میں اس کا ذکر کیا ہے۔

من قدرے بر سرایں کار شدم

شاعری کے بعد نثّاری کا نمبر ہے۔ اس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے۔ انھوں نے ایک مستقل کتاب 'اعجازِ خسروی' تین جلدوں میں لکھی، اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر بیکار گیا، لیکن ان کی طباعی اور ذہانت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کر سکا.............

ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر وتصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیائے فانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا..........

ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ ان کو ان کاموں میں مشغول ہونے کے لئے وقت کس قدر ملتا تھا تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے۔ اور درباروں میں تمام تمام دن حاضری دینی پڑتی۔ کام جو سپرد تھا وہ شاعری نہ تھی، بلکہ اور اور اشغال تھے..........

ان حالات کے ساتھ اگر صانع قدرت ان کے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا۔

امیر خسروؔ کی غزل پر تبصرہ کرتے ہیں:-

جدّت اسلوب غزل کی ترقی کا نوروز لطفِ ادا، اور جدت اسلوب ہے۔ جس کے موجد شیخ سعدیؔ ہیں۔ لیکن پھر وہ نقش اولیں تھا۔ امیر کی بوقلموں طبیعت نے جدت اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرایے پیدا کر دئے، جو اگلوں کے خواب وخیال میں بھی نہ آئے تھے۔ مثلاً یہ مضمون کہ معشوق ظلم وستم کرنے کے ساتھ بھی محبوب ہے، یوں ادا کرتے ہیں:-

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز   درد ہا دادی و درمانی ہنوز

یا مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرائے میں ادا کرتے ہیں:-

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ   نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود باندھتے ہیں۔ اس مضمون کو دیکھو، امیرؔ نے کس انداز سے کہا ہے:-

مے حاجت نیست مستیم را   در چشم تو تا خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج وغم سے بے خبر ہونا عام مضمون ہے۔ اس کو کس لطف سے ادا کیا ہے:-

گل چہ داند کہ درد بلبل چیست   او ہمیں کار رنگ و بو داند

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتا ہے۔ اس کو یوں باز رکھتے ہیں:۔

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد　　　مسلمانی میاموز آں دو چشم نا مسلماں را

لطف وقہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق:۔

گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کنی؟　　　از یک نگاہ کشت و نگاہ دگر نکرد

سعدیؔ کا شعر ہے:۔

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونے کی وجہ سے اس قدر اعلیٰ درجے کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن امیرؔ نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا:۔

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی　　　زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالبؔ نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کردیا ہے:۔

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو　　　یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی زیادتی لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں:۔

جاں زنظارہ خراب و نازِ او ز اندازہ بیش
ما بوے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را

وحشی یزدی نے اسی خیال سے ایک اور لطیف خیال پیدا کیا:۔

شراب لطف پُر در جام می ریزی و می ترسم　　　کہ زود آخر شود ایں بادہ و من در خمار افتم

(شعرالعجم، حصہ دوم)

شعرالعجم حصہ چہارم کے آغاز میں علامہ شبلی لکھتے ہیں:۔

"شعرالعجم کا یہ چوتھا یعنی آخری حصہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگلے تینوں حصے اسی حصے کے دیباچے اور تمہید تھے۔ اس حصہ میں ایران کی عام شاعری پر تنقید ہے۔"

چونکہ وہی مضامین جو تین حصوں میں تبصرہ شعراء کے ذیل میں لکھے تھے، اب اصنافِ سخن درخصائصِ شاعری کے تحت میں لکھتے ہیں، اس لیے اس مضمون کے مناسب و برمحل اپنا یہ

شعر عنوان پر درج کیا ہے:-

حدیثِ دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد
دگر از سر گرفتم قصہ زلفِ پریشاں را

اس چوتھے حصے کے طویل ہو جانے کے سبب سے دو حصے کر دیئے تھے، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ پانچواں حصہ اسی کا سلسلہ ہے۔ چوتھے میں مثنوی پر ریویو ہے، پانچویں میں قصیدہ، غزل وغیرہ پر۔ چوتھے حصے میں پہلے "نفس شاعری کی حقیقت" سے بحث کی ہے، پھر ایران کی شاعری کی تدریجی رفتار دکھائی ہے۔ پھر صنف وار تنقید کی ہے۔

شاعری کے یہ مباحث اور اس طرح کے تبصرے عربی، فارسی، اُردو، کسی زبان میں علامہ شبلی سے پہلے نہیں لکھے گئے۔

(ب) بطور نمونہ ایک مضمون محاکات کو درمیان میں سے کچھ حصے حذف کر کے نقل کیا جاتا ہے:-

محاکات محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں اگرچہ مادّی اشیاء کے علاوہ، حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جا سکتی ہے، چنانچہ اعلیٰ درجے کے مصور، انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرے سے جذبات انسانی مثلاً رنج، خوشی، تفکر حیرت، استعجاب، پریشانی اور بیتابی ظاہر ہو، جہانگیر کے سامنے ایک مصور نے ایک عورت کی تصویر پیش کی تھی جس کے تلوے سہلائے جا رہے ہیں۔ تلووں کے سہلاتے وقت چہرے پر گدگدی کا جو اثر طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرے سے نمایاں تھا۔ تاہم تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ سیکڑوں گونا گوں واقعات، حالات اور واردات ہیں جو تصویر کی دسترس سے باہر ہیں۔

خیالات، جذبات اور کیفیات کا ادا کرنا اور زیادہ مشکل ہے، تصویر اس سے کیوں کر عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ مثلاً اس شعر میں:-

نسب نامۂ دولت کے قباد   ورق بر ورق، ہر سوے بُرد باد

یہ خیال ادا کیا گیا ہے کہ دارا کے مرنے سے کیانی خاندان بالکل برباد ہوگیا۔ یہ خیال تصویر کے ذریعہ سے کیوں کر ادا ہوسکتا ہے۔

ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے، کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک ایک خال وخط دکھایا جائے ورنہ تصویر ناتمام اور غیر مطابق ہوگی، بخلاف اس کے شاعرانہ مصوری میں یہ التزام ضروری نہیں۔ شاعر اکثر صرف ان چیزوں کو لیتا ہے اور ان کو نمایاں کرتا ہے جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے، باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا ان کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں ان سے خلل نہ آئے۔ فرض کرو کہ ایک پھول کی تصویر کھینچنی ہو تو مصور کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک رگ وریشہ دکھائے، لیکن شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں، ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں صورت میں دکھائے تاہم مجموعے سے وہ اثر پیدا کردے جو اصلی پھول کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔

ایک اور بڑا فرق مصوری اور محاکات میں یہ ہے کہ مصور کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کرسکتا ہے جو خود اس کے چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔ لیکن شاعر باوجود اس کے کہ تصویر کا ہر جز و نمایاں کرکے نہیں دکھاتا، تاہم اس سے زیادہ اثر پیدا کرسکتا ہے، جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوسکتا ہے۔ سبزہ پر شبنم دیکھ کر وہ اثر نہیں پیدا ہوسکتا جو اس شعر سے ہوسکتا ہے:-

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا ‏ ‏ ‏ ‏ تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

تصویر کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصور اس امر میں کامیاب ہوگیا تو اس کو کاملِ فن کا خطاب مل سکتا ہے، لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے یعنی نہ اصل کی پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کرسکتی، نہ اصل سے زیادہ دور ہوسکتا ہے ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی، اس موقع پر اس کو تخئیل سے کام لینا پڑتا ہے، وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب وتاب اور حسن وجمال میں بڑھ جاتی ہے لیکن وہ قوت

تخئیل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے، لوگوں نے اس کو امعان نظر سے نہیں دیکھا تھا اس لئے اس کا حسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا۔

شاعر کے سامنے (قوت تخئیل کی بدولت) تمام بے حس اشیاء جاندار چیزیں بن جاتی ہیں، اس کے کانوں میں ہر طرف سے خوش آیند صدائیں آتی ہیں، زمین، آسمان، ستارے، بلکہ ذرہ ذرہ اس سے باتیں کرتا ہے۔

قوت تخئیل کے ذریعہ سے اکثر شاعر ایک نیا دعویٰ کرتا ہے، اور خیالی دلائل پیش کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک منطقی اس کی دلیل نہ تسلیم کرے لیکن جن لوگوں کو وہ قوت تخئیل کے ذریعہ سے معمول کر لیتا ہے وہ اس کے تسلیم کر لینے میں مطلق تامل نہیں کر سکتے۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے:۔

دوش از برم چو رفتی آ کہ نکشتم آرے　　　　عمری در فتن عمر آواز پا ندارد

یعنی معشوق جو گودی سے نکل کر چلا گیا تو مجکو خبر نہیں ہوئی، کیونکہ معشوق عاشق کی زندگی ہے اور زندگی کے جانے کے وقت جانے کی آہٹ نہیں معلوم ہوتی، اس دلیل کے دو مقدمے ہیں "معشوق عاشق کی زندگی ہے، زندگی کے جانے کی آہٹ معلوم ہوتی۔" ان دونوں میں سے تم کس کا انکار کر سکتے ہو؟

محاکات کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو۔ یعنی جس چیز کا بیان کیا جائے اس طرح کیا جائے کہ خود وہ شے مجسم ہو کر سامنے آجائے، شاعری کا اصلی مقصد طبیعت کا انبساط ہے، کسی چیز کی اصلی تصویر کھینچنا خود طبیعت میں انبساط پیدا کرتا ہے (وہ شے اچھی یا بُری ہے اس سے بحث نہیں) مثلاً چھپکلی ایک بدصورت جانور ہے جس کو دیکھ کر نفرت ہوتی ہے۔ لیکن اگر ایک استاد مصور چھپکلی کی ایسی تصویر کھینچ دے کہ بال برابر فرق نہ ہو تو اس کے دیکھنے سے خواہ مخواہ لطف آئے گا، اس کی یہی وجہ ہے کہ نقل کا اصل سے مطابق ہونا خود ایک موثر چیز ہے، اب اگر وہ چیزیں جن کی محاکات مقصود ہے، خود بھی دلآویز اور لطف انگیز ہوں تو محاکات کا اثر بہت بڑھ جائے گا۔

اب جب کسی چیز کی محاکات مقصود ہو تو ٹھیک وہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو ان

خصوصیات پر دلالت کرتے ہیں۔ ساودتی نے ایک نظم لکھی تھی جس کا شانِ نزول یہ ہے کہ اس سے اس کے کم سن بچے نے پوچھا کہ "سیلاب کیوں کر آتا ہے۔" ساودتی نے اس کے جواب میں یہ نظم لکھی اور دکھایا کہ سیلاب کس طرح آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے، اور کس طرح بڑھتا جاتا ہے، اس نظم میں تمام الفاظ اس قسم کے آئے ہیں کہ پانی کے گرنے، بہنے، پھیلنے، بڑھنے (وغیرہ وغیرہ) کے وقت جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں، الفاظ کے لہجے سے ان کا اظہار ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص خوش ادائی سے اس نظم کو پڑھے تو سننے والے کو معلوم ہوگا کہ زور شور سے سیلاب بڑھتا ہوا چلا آتا ہے۔

میرا طالبعلمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن کسی صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا:۔

سر بہ بستاں چو دہد جلوۂ یغمائی را
اول از سرو کند جامۂ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے۔ میں نے کہا کپڑا اتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں۔ اس لئے شاعر اگر کند کی بجائے "کشد" کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا۔ جامہ کندن گو صحیح ہے لیکن فصیح نہیں۔ سب چپ ہو گئے، والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا کہ "نہیں، یہی لفظ (کند) شعر کی جان ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارت گری کی شان دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا لباس اتار لیتا ہے، لباس اتارنے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اتار کر رکھ دے یا اس کا نوکر اتارے۔ دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروا لئے جائیں یا نچوائے جائیں۔ فارسی میں اُن کے لئے دو مختلف لفظ ہیں، جامہ کشیدن اور جامہ کندن۔ چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق ذلت کے طور پر سرو کا کپڑا اتار لیتا ہے اس لئے یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے۔" تمام حاضرین نے اس توجیہہ کی بے ساختہ تحسین کی۔

علی قلی کا شعر ہے:۔

بگذشت ز پیش من دغیرش بہ حکایت
پیچید کہ ہرگز نتواند بہ قفادید

شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق سامنے سے جا رہا تھا، رقیب بھی ساتھ تھا اس نے اس کو اس طرح باتوں میں لگا لیا کہ معشوق مڑ کر پیچھے نہ دیکھ سکا (ورنہ شاید میری طرف بھی اس کی نظر پڑتی) پیچید کے لفظ سے واقعہ کی صورت جس طرح ذہن میں آ جاتی ہے اور کسی لفظ سے نہیں آ سکتی۔

(ج) شاعری کی تدریجی رفتار۔ اس قدر ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ فارسی شاعری کے مختلف دور ہیں، اور ہر دور کا جدا انداز ہے۔ اب ایک نکتہ سنج کا یہ فرض ہے کہ ہر دور کی تمام خصوصیتوں کا پتہ لگائے، نہ صرف ان کا جو سطح پر نظر آتی ہیں، بلکہ ان کا بھی جو تہ میں ہیں، اور جن پر عام نگاہیں نہیں پڑ سکتیں۔ اس کے ساتھ ان خصوصیتوں کے وجود اور اسباب بتائے، یعنی کیوں کر پیدا ہوئیں، اور کس طرح ایک رنگ دوسرے رنگ سے بدلتا گیا۔

شاعری اگرچہ غیر مادّی چیز ہے، لیکن وہ مادّیت کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم ترقی کرتی ہے، تو ابتدا میں تمام چیزیں، خوراک، پوشاک، مکان، اسباب، آرائش۔ وضع قطع، بے تکلف اور سادہ ہوتی ہیں۔ رفتہ رفتہ نفاست، لطافت، اور تکلف پیدا ہوتا ہے، اور روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ حد سے بڑھ جاتا ہے ، اور اس وقت ترقی رک کر قوم برباد ہو جاتی ہے۔

شاعری کی یہی حالت ہے۔ ابتدا میں سیدھے سادے، صاف صاف اور بے تکلف خیالات ہوتے ہیں، تشبیہات اور استعارے کہیں کہیں آ جاتے ہیں، الفاظ میں تراش خراش نہیں ہوتی، جس مضمون کو بیان کرنا چاہتے ہیں، بغیر کسی اینچ پیچ کے بے تکلف ادا کرتے ہیں۔ اس سے آگے قدم بڑھتا ہے تو خیالات میں بلندی شروع ہوتی ہے۔ استعارے رنگین ہو جاتے ہیں، تشبیہوں میں نزاکت آ جاتی ہے۔ مبالغوں میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ الفاظ میں تراش خراش شروع ہوتی ہے۔ جس مضمون کو ادا کرتے ہیں استعاروں کے رنگ میں ادا کرتے ہیں، اس کے بعد دقت آفرینی اور باریک بینی شروع ہوتی ہے، مبالغے آسمان تک پہونچ جاتے ہیں۔ بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ استعارہ میں استعارہ پیدا کرتے ہیں۔ محسوسات سے گذر کر صرف خیالی چیزوں پر مدار رہ جاتا ہے۔ یہ ترقی کی

آخری منزل ہے۔ جو تنزل سے ہمدوش اور ہم آغوش ہے۔

اس اصول پر فارسی شاعری کے دورِ اول کی سب سے پہلی خصوصیت سادگی اور بے تکلفی ہے۔ ایران میں جب شاعری شروع ہوئی تو تمدن اور معاشرت کا اوجِ شباب تھا۔ شاعری کا جو نمونہ سامنے تھا وہ متنبیؔ، ابونواسؔ، ابن المعتزؔ، بحتریؔ، ابوتمامؔ کی رنگینی بیان اور طلسم کاریاں تھیں۔ باوجود اس کے فارسی شاعری میں ابتداً ایسے سادے، بے تکلف، اور سرسری خیالات نظر آتے ہیں کہ گویا قوم میں کسی طرح کا تمدن پیدا نہیں ہوا ہے۔ یہ وہی بات ہے کہ ہر چیز ابتدا میں نہایت سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے۔

ہماری زبان کو دیکھو۔ ولیؔ دکنی نے اُردو شاعری کی بنیاد ڈالی۔ وہ ناصر علیؔ اور بیدلؔ کا معاصر تھا، جو مضمون بندی اور خیال آفرینی میں بال کی کھال نکالتے تھے۔ ولیؔ ان لوگوں سے راہ و رسم رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ فارسی شاعری کا ماہر تھا۔ تاہم اُردو میں شاعری شروع کی تو اس کا یہ انداز ہے،

جسے عشق کا زخم کاری لگے ہے   تو پھر زندگی اس کو بھاری لگے ہے

سادگی کا یہ وصف قدماء کے اخیر دور تک قائم رہا، لیکن مدارج میں فرق آتا گیا۔ کیونکہ جس قدر زمانہ گذرتا تھا۔ سادگی کے بجائے آورد اور تکلف آتا جاتا تھا۔

اس مضمون کو کہ کمینہ آدمی تربیت سے شریف نہیں ہوسکتا، ابوشکور بلخی نے اس طرح ادا کیا تھا:-

درختے کہ تلخش بود گوہرا	جس درخت کی اصل تلخ ہے
اگر چرب و شیریں دہی مرورا	اگراس کو چرب و شیریں غذا دو
ہماں میوۂ تلخت آرد پدید	تب بھی وہی کڑوا پھل پیدا کرے گا
ازو چرب و شیریں نخواہی مزید	اس سے شیریں پھل نہیں پیدا ہوسکتا

اسی مضمون کو فردوسیؔ یوں ادا کرتا ہے:-

درختے کہ تلخست ویرا سرشت	گرش بر نشانی بہ باغ بہشت
ور از جوئے خلدش بہ ہنگام آب	بہ بیخش شکر ریزی و شہد ناب

ہماں میوۂ تلخ بار آورد	سرانجام ، گوہر بہ کار آورد

بات وہی ہے، لیکن بندش کی چستی اور نشست الفاظ نے مضمون کو کہاں سے کہاں پہونچادیا ہے۔
شعرا ''دل'' کو آگ سے مشابہت دیتے ہیں، اور یہ عام مضمون ہے۔ لیکن اول جب یہ خیال ادا کیا گیا تو اس کی صورت یہ تھی:-

احوال دلم مپرس کاں بیچارۂ	میرے دل کا حال نہ پوچھو
چوب است درد فتادہ آتش دل نیست	وہ ایک لکڑی ہے، جس میں آگ لگ گئی ہے

اسی خیال کو متاخرین نے یوں ادا کیا۔

یک پارہ آتشے ست، دلش نام کردہ اند

ایک ذرا سے تغیر سے مصرعہ چست ہوگیا۔ چوب کا لفظ جدا تھا، وہ نکل گیا، اس کے بجائے ''پارہ آتش'' نے لطافت پیدا کردی۔ ''نام کردہ اند'' نے لطافت کو اور بڑھا دیا۔
یہ مضمون کہ ''معشوق گونامہرباں اور دشمن ہو، تاہم اس کی محبت دل سے نہیں جاتی۔'' اول اول فرخی نے اس کو یوں ادا کیا تھا:-

ہمہ دشمنی از تو دیدم و لیکن	میں نے تجھ سے ہمیشہ دشمنی کا برتاؤ دیکھا
نگویم کہ تو دوستی را نشائی	تاہم میں نہیں کہتا کہ تو دوستی کے نا قابل ہے

اسی خیال کو سعدیؔ ادا کرتے ہیں:-

بلطف وخوبی او در جہاں ندیدم کس	میں نے معشوق کی لطافت اور خوبی کے برابر دنیا میں
کہ دشمنی کند و دوستی بیفزاید	کسی کو نہیں دیکھا کہ دشمنی کرتا ہے اور باوجود اس کے محبت اور بڑھتی ہے۔

شعرا معشوق کی کمر اور عاشق کے جسم کو لاغر کہتے ہیں۔ اسی طرح معشوق کے دہن اور عاشق کے دل کو تنگ باندھتے ہیں۔ یہ مضمون قدما کے ہاں ابتدائی حالت سے ادا ہوا تھا۔
متاخرین نے اس کو صرف بندش سے نہایت خوبصورت کردیا۔ فرخی کا شعر ہے:-

گفتم بتا، تن ودل من چیست مرترا	یعنی میں نے پوچھا کہ میرا جسم اور میرا دل کیا چیز ہے؟
گفتا، یکے میانِ من است و یکے دہن	معشوق نے کہا جس کو تم اپنا جسم سمجھتے ہو وہ میری کمر

| ہے، اور جس کو اپنا دل کہتے ہو، وہ میرا دہن ہے۔

اسی بات کو سعدیؔ یوں کہتے ہیں:۔

دہانِ تنگِ تو آموخت تنگی از دلِ من

وجودِ من زمیانِ تو لاغری آموخت

---

(۱۱) سیرۃ النبیؐ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) علامہ شبلی کی یہ آخری تصنیف ہے، اور ''قامت'' و ''قیمت'' دونوں میں بہتر ہے۔ صاحب سیرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان پاک میں کسی نے کہا ہے:۔

پیش از ہمہ شاہانِ غیور آمدۂ   ہر چند کہ آخر بظہور آمدۂ

''سیرۃ النبیؐ'' کے متعلق میں کہتا ہوں:۔

پیش از ہمہ جلوہ ہائے نور آمدہ است   ہر چند کہ آخر بظہور آمدہ است

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام (۱) پاک محمدؐ (ستودہ، سراہا ہوا، تعریف کیا گیا) جس قدر صادق اور موزوں ثابت ہوا ہے، کسی دوسرے انسان کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہے۔ قیامِ عالم اور وجودِ آدمؑ سے تا ایں دم، کسی زمانے، کسی ملک، کسی قوم، کسی مذہب کے کسی پیغمبر یا بڑے سے بڑے شخص کی اتنی کثرت سے اور ایسی اعلیٰ مدح وثنا نہیں کی گئی، اور چیزوں کو چھوڑ کر صرف اُردو اور فارسی کی نعتیہ شاعری پر نظر ڈالنے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ

---

(۱) دوسرا اسم مبارک احمد بھی ایسا ہی صادق آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں:۔ ''بہت حمد وثنا کرنے والا''، آں حضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم نے بذاتِ خود جس قدر عبادت الٰہی کی وہ عالم کے ہر فرد بشر سے زیادہ تھی۔ پھر اس کے ساتھ ان کی امت کی عبادت کو شامل کرنا چاہیے، جو گویا خود اسی ذات اقدس کی عبادت ہے۔ تمام پیروانِ مذاہب میں مسلمانوں کی کثرت عبادت مُسلّم ہے۔ دنیا میں اہل اسلام کی تعداد دوسرے مذاہب والوں سے زیادہ نہیں ہے۔ باوجود اس کے مسلمانوں کے اوقات واشغال عبادت کی تعداد ومقدار سب سے زیادہ ہے۔ پابندی عبادت میں مسلمان تمام اہلِ مذاہب سے بڑھ کر ہیں۔

اس قدر کثیر و عظیم سرمایۂ مدح وستائش دنیا کے کسی دوسرے انسان کے لیے موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تمام عالم کے کروڑوں مسلمان دن رات، اٹھتے بیٹھتے اور اوقات نماز و عبادت میں جس کثرت سے صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہیں وہ بجائے خود تاریخ عالم کا عظیم الشان واقعہ ہے۔

یہی حال سیرت پاک کی کتابوں کا ہے۔ قرآن مجید، تفاسیر، احادیث، سِیَر، مغازی، فضائل، شمائل کی کثرت تعداد اور عظمت، ضخامت، کاوش تالیف اور کوشش تحقیق کو تمام عالم کے کسی انسان کی لائف نہیں پہنچتی۔

اُردو میں بااصول، محقق اور مکمل ''سیرۃ النبیؐ'' لکھنے کی سعادت علامہ شبلی کے حصہ میں آئی۔ اور سچ یہ ہے کہ ایسی جامع سیرت دنیا کی کسی زبان میں موجود نہیں۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی نے حصہ اول میں جو دیباچہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف مرحوم کو ۱۳۲۳ھ ﴿۱۹۰۶ء﴾ میں سیرۃ نبویؐ لکھنے کا خیال پیدا ہو گیا تھا اور ''غزوہ احد'' تک لکھ بھی لیا تھا۔ اس کے بعد ۱۳۳۰ھ ﴿۱۹۱۲ء﴾ میں ''اس بارِ امانت کے اٹھانے کا آخری فیصلہ کر لیا۔'' اس کام کے لیے مالی سرمایہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال نے ''سوانح نگار نبوت کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر کے اس سرمایۂ سعادت کو اپنے خزانۂ عامرہ میں شامل کر لیا۔''

علامہ شبلی نے اس کے ۵ حصے تجویز کیے تھے:- (۱) عرب و کعبہ کی تاریخ، اور آں حضرت کے حالات، غزوات، اخلاق، اولاد اطہار اور ازواجِ مطہرات۔ (۲) منصب نبوت، فرائض و احکام۔ (۳) قرآن مجید کی تاریخ اور حقائق و اسرار۔ (۴) معجزات کی حقیقت و تحقیق۔ (۵) یورپین تصانیف سیرت پر تنقید۔

علامہ اپنی تجویز کا صرف پہلا حصہ لکھ سکے، جس کو اعتدال ضخامت کے خیال سے دو حصوں میں شائع کیا گیا۔ پہلے میں غزوات و فتح مکہ تک، اور دوسرے میں حجۃ الوداع، وفات، اخلاق، ازواج مطہرات، تاسیس خلافت ۱۱ھ تک۔ باقی تین حصے علامہ سیّد سلیمان ندوی نے معجزات، منصب نبوت، مفہوم عبادت کے متعلق لکھے۔

پہلا حصہ مصنف کی وفات کے بعد ۱۹۱۸ء ﴿۱۳۳۶ھ﴾ میں شائع ہوا۔
''سرنامہ'' کس قدر دلکش و موثر لکھا ہے:-

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا، شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی نذر لے کر آیا ہے۔

ز چشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

شبلی، شوال ۱۳۳۰ھ

سیرت کے چند نمونے یہ ہیں:-

(۱) ولادتِ باسعادت کا حال جس اسلوب کے ساتھ لکھا ہے، اس کا جواب نہیں۔

ظہورِ قدسی

چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے، سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیمؑ، جمالِ یوسفؑ، معجز طرازی موسیٰؑ، جاں نوازی مسیحؑ، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز، شاہنشاہِ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبح جاں نواز وہی ساعت ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے۔ اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیانِ زبان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے چودہ ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے سادہ خشک ہو گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ

ایوانِ کسریٰ نہیں، بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے۔
آتش فارس نہیں، بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے۔ صنم خانوں
میں خاک اُڑنے لگی، بُت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے
اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف
پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔

(۲) **غزوۂ احد ۳ھ** کے بیان میں سے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:۔
آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی۔ مصعب بن
عمیر کو علم عنایت ہوا، زبیر بن العوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے۔ حضرت حمزہ کو اس حصۂ
فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے۔ پشت کی طرف سے احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے آئیں،
اس لیے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ گو لڑائی فتح ہو جائے، تاہم
وہ جگہ سے نہ ہٹیں۔ عبداللہ بن جبیر ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے.........

سب سے پہلے طبل جنگ کے بجائے خاتونان قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں
جن میں کشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقام خون کے رجز تھے۔ ہند (ابوسفیان کی بیوی) آگے
آگے اور چودہ عورتیں ساتھ ساتھ تھیں؛

اشعار یہ تھے:۔

نَحْنُ بِنَاتُ طَارِقْ	ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں
نَمْشِیْ عَلَی النَّمَارِقْ	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں
اِنْ تُقْبِلُوْا نُعَانِقْ	اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گے
اَوْ تُدْبِرُوْا نُفَارِقْ	اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گے

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو مدینہ منورہ کا ایک مقبول عام شخص تھا اور مدینہ چھوڑ
کر مکہ میں آباد ہو گیا تھا، ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا، اسلام سے پہلے زہد
اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اس کی عزت کرتا تھا۔ چونکہ اس کو یہ خیال تھا کہ انصار جب

اس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ دیں گے، میدان میں آ کر پکارا، ''مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں ابو عامر ہوں!'' انصار نے کہا ''ہاں او بدکار ہم تجھ کو پہچانتے ہیں، خدا تیری آرزو بر نہ لائے۔''

قریش کا علم بردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا۔ ''کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے کہ مجھ کو جلد دوزخ میں پہونچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہونچ جائے (۱) علی مرتضیٰ نے صف سے نکل کر کہا، ''میں ہوں۔'' یہ کہہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی۔ طلحہ کے بعد اس کے بیٹے عثمان نے، جس کے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں، علم ہاتھ میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا۔

اِنَّ عَلٰی اَهْلِ اللِّوَاءِ حَقًّا — نیزہ بردار کا فرض ہے کہ وہ نیزہ کو خون

اَنْ تَخْضِبَ الصَّعْدَةَ اَوْ تَنْدَقَّا — میں رنگ دے یا وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے

حضرت حمزہ مقابلے کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی۔ ساتھ ہی ان کی زبان سے نکلا ''میں ساقیِ حُجاج کا بیٹا ہوں۔''

اب عام جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت حمزہ، حضرت علی، ابو دجانہ فوجوں کے دل میں گھسے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں۔ ابو دجانہ عرب کے مشہور پہلوان تھے۔ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دستِ مبارک میں تلوار لے کر فرمایا ہے۔ ''کون اس کا حق ادا کرتا ہے؟'' اس سعادت کے لئے دفعتاً بہت سے ہاتھ بڑھے۔ لیکن یہ فخر ابو دجانہ کے نصیب میں تھا۔ اس غیر متوقع عزت نے ان کو مغرور کر دیا۔ سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے۔ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ ''یہ چال خدا کو سخت نا پسند ہے، لیکن اس وقت پسند ہے۔'' ابو دجانہ فوجوں کو چیرتے، لاشوں پر لاشے گراتے، بڑھتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہند سامنے آ گئی۔ اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھالی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے۔

---

(۱) یہ اس بات پر طنز تھا کہ مسلمان ایسا سمجھتے ہیں۔ (حاشیہ سیرۃ النبیؐ)

حضرت حمزہ دو دستی تلوار مارتے جاتے تھے، اور جس طرف بڑھتے تھے، صفیں کی صفیں صاف ہو جاتی تھیں۔ اسی حالت میں سباغ غبشانی سامنے آ گیا۔ پکارے ''او ختانۃ النسا کے بچے! کہاں جاتا ہے؟'' کہ کہہ کر تلوار ماری وہ خاک پر ڈھیر تھا۔

وحشی، جو ایک حبشی غلام تھا، اور جس سے جبیر بن مطعم اس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کر دے گا تو آزاد کر دیا جائے گا، وہ حضرت حمزہ کی تاک میں تھا۔ حضرت حمزہ برابر آئے تو اس نے چھوٹا سا نیزہ، جس کو ''حربہ'' کہتے ہیں، اور جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے، پھینک کر مارا جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ حضرت حمزہ نے اس پر حملہ کرنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر گرے اور روح پرواز کر گئی.........

ابو عامر کفار کی طرف سے لڑ رہا تھا۔ لیکن اس کے صاحب زادے حضرت حنظلہ اسلام لا چکے تھے۔ انھوں نے ان حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے باپ کے مقابلہ میں لڑنے کی اجازت مانگی، لیکن رحمت عالم نے گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے۔ حنظلہ نے کفار کے سپہ سالار (ابو سفیان) پر حملہ کیا، اور قریب تھا کہ ان کی تلوار ابو سفیان کا فیصلہ کر دے۔ دفعتہً پہلو سے شداد بن الاسود نے جھپٹ کر ان کے وار کو روکا اور ان کو قتل کر دیا۔ تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف بھاری تھا۔ علم برداروں کے قتل اور حضرت علی اور ابو دجانہ کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بہادر نازنینیں جو رجز سے دلوں کو ابھار رہی تھیں، بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں، اور مطلع صاف ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر تیر انداز جو پشت پر مقرر کیے گئے تھے، وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے۔

عبداللہ بن جبیر نے بہت روکا لیکن وہ رک نہ سکے۔ تیر اندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا۔ عبداللہ بن جبیر چند جانبازوں کے ساتھ جم کر لڑے، لیکن سب کے سب شہید ہوئے۔ اب راستہ صاف تھا۔ خالد نے سواروں کے دستے کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا۔ لوگ لوٹنے میں مصروف تھے۔ مڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی تھیں۔ بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ

سے مارے گئے۔ مصعب بن عمیر جو آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صورت میں مشابہ اور علم بردار تھے، ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا، اور غل مچ گیا کہ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شہادت پائی۔ اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی۔ بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں، اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی۔ حضرت حذیفہ کے والد (یمان) اس کشمکش میں آگئے اور ان پر تلواریں برس پڑیں، اور حضرت حذیفہ چلاتے رہے کہ میرے باپ ہیں! لیکن کون سنتا تھا۔ غرض وہ شہید ہو گئے، اور حضرت حذیفہ نے ایثار کے لہجہ میں کہا۔ ''مسلمانو، خدا تم کو بخش دے۔'' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مُڑ کر دیکھا تو صرف گیارہ جاں نثار پہلو میں ہیں۔ جناب علی مرتضیٰ، حضرت ابوبکر، حضرت سعد وقاص، زبیر بن العوام، ابودجانہ، طلحہ کا نام بتخصیص معلوم ہے صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ صرف طلحہ اور سعد رہ گئے تھے.............

جاں نثارانِ خاص برابر لڑتے جاتے تھے، لیکن نگاہیں سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ڈھونڈھتی تھیں۔ سب سے پہلے کعب بن مالک کی نظر آپؐ پر پڑی۔ چہرہ مبارک پر مغفر تھا، لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں۔ کعب نے پہچان کر پکارا، ''مسلمانو، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہیں!'' یہ سن کر ہر طرف سے جاں نثار ٹوٹ پڑے۔ کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اسی رُخ پر زور دیا۔ دَل کا دَل ہجوم کر کے بڑھتا تھا، لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہجوم ہوا تو آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا۔ ''کون مجھ پر جان دیتا ہے؟'' زیاد بن سکن پانچ انصاری لے کر اس خدمت کے ادا کرنے کے لئے بڑھے، اور ایک ایک نے جاں بازی سے لڑ کر جانیں فدا کر دیں۔ زیاد کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ۔ لوگ اٹھا کر لائے۔ کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر منھ رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دے دی۔

بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیاز مندے　　　　کہ بوقتِ جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

علامہ نے ''سیرت'' میں واقعات کی تحقیق و تصحیح بھی کی ہے۔ جہاں بیان میں خلاف ہے یا غلط فہمی پیدا ہوئی ہے یا مخالفانِ اسلام کی حاشیہ آرائی ہے وہاں علامہ نے روایت و درایت (نقل و عقل) سے جانچ کر فیصلہ کر دیا ہے۔

---

(۱۲) رسائل و مقالات، علامہ نے سب سے پہلا مضمون ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' لکھا تھا۔ اس کے بعد تصانیف کے ساتھ چھوٹے بڑے مقالات بھی مختلف رسالوں میں لکھتے رہے۔ پھر ندوۃ العلماء کی طرف سے ماہوار رسالہ 'الندوہ' جاری کیا۔ اس میں کثرت سے ہر قسم کے مضامین لکھے۔ طویل مضامین ''رسائل شبلی'' کہلاتے ہیں۔ اسی نام سے شائع ہوئے تھے۔ اب دار المصنفین نے 'مقالات شبلی' آٹھ جلدوں میں اس ترتیب سے شائع کر دئے ہیں:-

جلد اول: مذہبی مضامین۔ جلد دوم: ادبی مضامین۔ جلد سوم: تعلیمی مضامین۔
جلد چہارم: تنقیدی مضامین۔ جلد پنجم: سوانحی مضامین۔ جلد ششم: تاریخی مضامین
جلد ہفتم: فلسفیانہ مضامین۔ جلد ہشتم: قومی مضامین۔

یہ تمام مضامین علامہ شبلی کے زورِ قلم، قوت استدلال، وسعتِ تحقیق اور دقتِ نظر کے شاہد ہیں۔ بعض جگہ ان کی رائے و نظریہ سے اختلاف ہو سکتا ہے، کہیں تحقیق میں جانبداری بھی پائی جاتی ہے، لیکن یہ جزئی باتیں ہیں، اس لیے لائق اعتنا نہیں۔ علامہ نے بعض ایسے مضامین (مثلاً تاریخی) پر قلم اٹھایا ہے جن کی طرف ان سے پہلے کسی کی توجہ نہ ہوئی تھی، اور جن کی اہمیت آج بھی مسلّم ہے۔ علامہ کے معاصرین میں سب سے بڑے ''مقالہ نگار'' مولوی عبد الحلیم شرر لکھنوی ہیں۔ ان کے مضامین کے مجموعے علامہ شبلی کے مقابلے میں نہایت کثیر و ضخیم ہیں۔ ''مقالات شبلی'' کے موضوعات میں سے چھ سات موضوع ''مضامینِ شرر'' میں بھی موجود ہیں۔ ان میں ''تاریخ'' میں دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شرر اپنے مضمون کو نادر و دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، تحقیق کی کدو کاوش زیادہ نہیں کرتے، اور شبلی تاریخ و تحقیق کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

خواجہ غلام الثقلین علامہ کے تاریخی مضامین کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"یہ عجیب بات ہے کہ مولانا شبلی کی حریتِ خیال جہاں مذہب اوراپنے زمانے کی پالیٹکس میں حاوی تھی ، وہاں تاریخی معاملات میں خاص کر مطلق العنان اور جابر بادشاہوں کی تائید میں وہ مفقود ہو جاتی تھی۔ انسانی دماغ اس قسم کے متباین رجحانات سے معمور ہے۔ ان کے اس میلان کی زیادہ تر یہ بھی وجہ تھی کہ یورپین اور عیسائی مورخوں اور آریہ مناظروں نے طریقۂ اعتدال کو چھوڑ کر ہر مسلمان حکمران پر اعتراضات کی ناواجب سختی روا رکھی تھی ، اوراس بات کو عمداً نظر انداز کر دیا تھا کہ قرن کے افعال کو بدنیتی کی طرف محمول کرنا ایک غیر عاقلانہ اور غیر فلسفیانہ فعل ہے۔ اس بے اعتدالی کے جواب میں مولانا شبلی بعض تاریخی مضامین و تصانیف میں اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ عموماً مسلمان بادشاہ (لہٰذا ان کے عام درباری اور اہلِ خانہ) نہایت مفید اور اچھے کام کرتے تھے۔ حالانکہ اگر کل تک یہ حالت تھی تو یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت آج اس قدر خراب نظر آتی ہے۔ لیکن یہ رائے کا اختلاف ہے۔ مولانا شبلی کا خیال تھا کہ عالمگیر، جہانگیر یا عبدالحمید خاں کی تائید سے اصل اسلام پر الزام تک کی نوبت نہیں پہنچے گی، ہمارا خیال اس کے خلاف ہے۔ ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

(مضمون مطبوع سیر المصنفین)

اس مضمون کا مرکزی خیال بالکل درست ہے کہ علامہ کبھی جانب داری میں اعتدال کو چھوڑ دیتے ہیں ، لیکن اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ شاہان جابر کے جن افعال سے انکار نہیں ہو سکتا، ان کی تاویل کیوں کرتے ہیں۔ ان کو ظالم و خاطی ہی کیوں نہیں رہنے دیتے۔ ورنہ علامہ ایسا کبھی نہیں کرتے کہ بادشاہوں، ان کے درباریوں یا اہلِ زمانہ کے ایسے کاموں کو جو منافیِ اسلام و مخالفِ شرع ہوں ، جائز و مستحسن قرار دیں۔ اس لیے ان کے افعال کی ذمہ داری خود انھیں بزرگوں پر رہتی ہے۔ اصل اسلام پر الزام کی نوبت نہیں آتی۔ علامہ کی تاویل صرف اس بات کے کہنے کی گنجائش نکال دیتی ہے کہ "ناکردہ گناہ در جہاں کیست ، بگو۔"

لیکن جہاں علامہ شبلی نے بے بنیاد الزامات کی تردید کی ہے، مشہور تاریخی مزخرفات کی بیخ کنی کی ہے، اور مخالفانِ اسلام کا تعصب ثابت کیا ہے، وہ ان کا غیر فانی کارنامہ ہے۔

ہر مصنف کی تصانیف میں مقالات و مضامین کا خاص مرتبہ ہوتا ہے۔ بعض مصنف اپنے مضامین ہی کی بدولت زندہ ہیں اور رہیں گے۔ علامہ شبلی کے مقالات بھی ان کی اکثر تصنیفات سے مقبول اور دیر پا ہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اب سے ۳۰ برس پہلے لکھا تھا کہ "مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لُونی لگنی شروع ہو گئی ہے۔" (مقدمہ خطوط شبلی، مطبوعہ ۱۹۲۶ء)۔ یہ زمانہ کا "عملِ جراحی" ہے، اور اس سے کسی کو مفر نہیں۔ اس حساب سے سر سیّد اور مولوی ذکاء اللہ کی دیواریں تو اس لُونی سے ڈھے چکیں، باقی "عناصرِ اربعہ" کے آب و گل میں ابھی جان باقی ہے۔ ان میں علامہ شبلی ابھی ایک مدت زمانہ کا ساتھ دیں گے۔ لیکن مضامین و مقالات ان سب مصنفوں کے بڑے جاندار ہیں۔ ان میں "بقائے اصلح" کا قانون جاری رہے گا، مگر فنا نہ ہوں گے۔

مقالات شبلی کی جلدوں میں سو سے زیادہ چھوٹے بڑے مضامین ہیں۔ بعض مضمون ۴۰-۵۰ صفحوں کے ہیں بعض مضامین عام دلچسپی کے نہیں ہیں، لیکن نہایت نادر و جدید ہیں۔ ہم ایک دو مقالوں کا اقتباس درج کرتے ہیں۔ ہر مقالے میں سے کچھ عبارتیں چھوڑ دی ہیں:-

(الف) **زیب النساء کی ولادت** زیب النساء اورنگ زیب کی سب سے پہلی اولاد تھی، اس کی ماں جس کا نام دلرس بانو بیگم تھا، شاہ نواز خاں صفوی کی بیٹی تھی، شاہ نواز کا اصلی نام بدیع الزماں ہے، جہانگیر کے زمانے میں معزز عہدوں پر ممتاز ہو کر شاہ نواز خاں کے خطاب سے ملقب ہوا، شاہ جہاں کے زمانے میں بھی کار ہائے نمایاں کئے، چونکہ لیاقتِ ذاتی کے ساتھ عالی خاندان بھی تھا، شاہ جہاں نے ۱۰۴۷ھ میں، کہ اس کی سلطنت کا دسواں سال تھا، اورنگ زیب کی شادی اس کی بیٹی سے کر دی، چار لاکھ کا مہر باندھا گیا، طالب کلیم نے مادۂ تاریخ کہا۔

دو گوہر بیک عقد دوراں کشیدہ

زیب النساء شادی کے دوسرے سال شوال ۱۰۴۸ھ پیدا ہوئی ۔ عالمگیری امراء میں عنایت اللہ خاں نہایت معزز عہدہ دار تھا، اس کی ماں حافظہ مریم قابل اور تعلیم یافتہ تھی، زیب النساء جب پڑھنے کے قابل ہوئی، تو اورنگ زیب نے اس کی تعلیم کے لئے حافظہ مریم کو مقرر کیا جس نے حسب دستور سب سے پہلے قرآن مجید کی تعلیم دی۔ زیب النساء نے قرآن مجید حفظ یاد کیا، جس کے صلے میں اورنگ زیب نے تیس ہزار اشرفی انعام میں دی۔

تمام تاریخیں اور تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ زیب النساء نے عربی و فارسی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجے کی حاصل کی تھی، اور بڑے بڑے علماء و فضلاء اس کی خدمت میں رہتے تھے، لیکن اس کے اساتذہ میں سب سے زیادہ مقرب اور باریاب ملا سعید اشرف ماژندرانی تھے، ملا سعید تقی مجلسی کے نواسے تھے، عالمگیر کے آغاز جلوس میں ایران سے آئے اور عالمگیر نے ان کو زیب النساء کی تعلیم کے لئے مقرر کیا۔ اس وقت زیب النساء کی عمر تقریباً اکیس برس کی تھی، اس سے قیاس ہوسکتا ہے کہ تیموریوں میں مستورات کی تعلیم کا سلسلہ کس قدر ممتد ہوتا تھا، زیب النساء نظم و نثر میں ملا سعید ہی سے اصلاح لیتی تھی۔

ملا اشرف شاعر بھی تھے، اور شاعری ہی کے وصف سے مشہور ہیں۔ تقریباً تیرہ چودہ برس وہ تعلیم کے تعلق سے زیب النساء کی خدمت میں رہے، ۱۰۸۳ھ میں وطن جانا ہوا، زیب النساء کی خدمت میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس میں رخصت کی درخواست کو اس طرح ادا کیا تھا:

یک بار از وطن نتواں بر گرفت دل ۔۔۔ در غربتم اگرچہ فزون ست اعتبار
پیش تو قرب و بعد تفاوت نمی کند ۔۔۔ گو خدمتِ حضور نباشد مرا شعار
نسبت چو باطنی است چہ دہلی چہ اصفہاں ۔۔۔ دل پیش تست من چہ بہ کابل چہ قندھار

زیب النساء نے جس قسم کی تعلیم پائی تھی اور خود اس کا مذاق طبیعت جس قسم کا واقع ہوا تھا، اس کے لحاظ سے وہ پالیٹکس سے بالکل نا آشنا تھی، تاہم عالمگیر کے پُر پیچ عہدِ حکومت میں

وہ بھی اس بدنامی سے نہ بچ سکی۔ ۱۰۹۱ھ میں راجپوتوں نے جب عام بغاوت کی، اور عالمگیر نے ان کے دبانے کے لئے شہزادہ اکبر کو فوج گراں دے کر جودھپور کی طرف روانہ کیا تو راجپوتوں کے بہکانے سے شہزادہ خود باغی ہو گیا، اور عالمگیر کے مقابلے کو بڑھا، زیب النساء اور شہزادہ اکبر حقیقی بہن بھائی تھے۔ دونوں میں خط و کتابت بھی تھی، یہ خطوط پکڑے گئے اور عالمگیر نے اس کے انتقام میں زیب النساء کی تنخواہ جو چار لاکھ سالانہ تھی، بند کر دی۔ اس کے ساتھ تمام مال و متاع ضبط کر لیا گیا، اور قلعہ سلیم گڑھ میں رہنے کا حکم ہوا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد اس کی بے گناہی ثابت ہوئی، اور عفو قصور کر دیا گیا۔

زیب النساء نے شادی نہیں کی، عام طور پر مشہور ہے کہ سلاطینِ تیموریہ لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے۔ اس غلط روایت کو یورپین مصنفوں نے بڑی شہرت دی ہے، اور اس سے ان کو شاہی بیگمات کی بدنامی پھیلانے میں بہت مدد ملی ہے۔ لیکن یہ قصہ ہی سرے سے بے بنیاد ہے۔ خود عالمگیر کی دو بیٹیاں زبدۃ النساء اور مہر النساء بیگم سپہر شکوہ اور ایزد بخش (پسر شہزادہ مراد) سے بیاہی تھیں، چنانچہ مآثر عالمگیری میں دونوں شادیوں کی تاریخیں اور مختصر حالات لکھے ہیں اور خاتمہ کتاب میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

عالمگیر زیب النساء کی نہایت عزت کرتا تھا، جب وہ کہیں باہر سے آتی تھی تو اس کے استقبال کے لئے شہزادوں کو بھیجتا تھا، سفر و حضر میں اس کو ساتھ رکھتا تھا، کشمیر کے دشوار سفر میں بھی وہ ساتھ تھی، لیکن جب عالمگیر دکن گیا تو اس نے غالباً اپنی علمی زندگی کی وجہ سے پائے تخت کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا، اس کی چھوٹی بہن زینت النساء عالمگیر کے ساتھ گئی۔ چنانچہ اس کا نام بار بار واقعات میں آتا ہے، زیب النساء نے دلی میں قیام کیا، اور وہیں پیوند زمین ہو گئی۔ زیب النساء(۱) نے ۱۱۱۳ھ میں جو عالمگیر کی حکومت کا اڑتالیسواں سال

---

(۱) اس فقرے میں یہ غلطیاں ہیں کہ (۱) ۱۱۱۳ھ عالمگیر کا اڑتالیسواں سال جلوس نہیں ہے، (۲) مادّہ تاریخ "ادخلی جنتی" میں ۱۱۱۳ھ نہیں نکلتا۔

تاریخوں کے بیانات اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ سنین واقعات کا تعین و (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مطابق کرنا دشوار ہو جاتا ہے، ایسی حالت میں تاریخی مادے بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں، اگرچہ علامہ شبلی جیسے بے پروا مورخ تاریخ مادے بھی غلط نقل کر کے دھوکے میں ڈال سکتے ہیں۔ مثلاً ''مقالات شبلی''، جلد سوم (تعلیمی) کے صفحہ ۹۶ پر ملا نظام الدین بانی مدرسہ نظامیہ کا سال وفات ۱۱۶۱ھ لکھا ہے اور تاریخ وفات کا یہ مصرع لکھا ہے ''ملک بود و بیک حرکت ملک گشت'' لیکن اس میں سنہ وفات سے کئی سو زائد نکلتے ہیں۔ اب اگر کسی کو ملا صاحب کا سنہ وفات یاد نہ ہو اور علامہ کا لکھا ہوا مصرع یاد ہو، اور وہ سنہ دریافت کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ مزید لطف یہ کہ اس مضمون سے دس برس بعد علامہ نے ایک اور مضمون ''درس نظامیہ'' لکھا ہے اس میں ملا صاحب کی اسی تاریخ وفات کا پورا قطعہ درج کیا ہے۔ اس میں مصرع تاریخ یہ لکھا ہے: ''ملک بود و بیک حرکت ملک شد''۔ یہ صحیح ہے لیکن اس میں ذرا سا تغیر ہو گیا ہے۔ مصرع یوں ہونا چاہئے ''ملک بودہ بیک حرکت ملک شد'' اب ۱۱۶۱ھ پورے ہو جائیں گے۔

بہر حال ہم سنین ''زیب النساء'' میں تاریخ گوئی کی سند اختیار کرتے ہیں۔ کسی قدیم تاریخ گو نے عالمگیر کے متعلق یہ تاریخیں نکالی ہیں:- تاریخ ولادت: آفتاب عالم تاب (۱۰۲۸ھ)۔ تاریخ جلوس: آفتاب عالم تاب (۱۰۶۸ھ)۔ تاریخ وفات: آفتاب عالم تاب من (۱۱۱۸ء)۔ اس حساب سے سال جلوس ۱۰۶۸ھ ہوتا ہے، تو اڑتالیسواں سال جلوس ۱۱۱۶ھ ہوا۔ تاریخوں سے یہی ثابت ہے اور خود علامہ شبلی کی ایک اور تحریر سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی ملا نظام الدین صاحب مذکور الصدر کے حالات میں صفحہ ۹۳ پر ملا صاحب کے بھائیوں کے نام عالمگیر کا فرمان نقل کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں: ''۳۸ جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ'' اس کے مطابق بھی اڑتالیسواں سال جلوس ۱۱۱۶ھ ہوتا ہے۔

زیب النساء کا انتقال ۲۹ ذی الحجہ ۱۱۱۳ھ کو ہوا ہے۔ لیکن مادہ تاریخ ''ادخلی جنتی'' میں ۱۱۰۸ھ نکلتا ہے۔ اگر یہ تاریخ اسی زمانے میں نکالی گئی ہے تو اتنا بڑا فرق نہیں ہو سکتا اس کی ایک ہی تاویل و تطبیق ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ ۲۹ ذی الحجہ کو انتقال ہوا ہے ۱۱۱۳ھ ختم ہونے میں ایک دن باقی تھا۔ ایسی صورت میں تاریخ گو سال آئندہ کا مادہ تاریخ کہہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس تاریخ گو نے بھی ۱۱۱۴ھ کا مادہ نکالا ہے، وہ اس طرح سے کہ اس آیت کے شروع میں (و) بھی ہے۔ اس نے واو سمیت تاریخ نکالی ہے، وادخلی جنتی میں ۱۱۱۴ھ نکلتے ہیں۔ تاریخوں میں نقل ہوتے ہوتے واو عطف چھوٹ گیا، ویسے ہی علامہ شبلی نے نقل کر دیا۔ ان کو اعداد نکالنے سے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ اپنی یہ عادت عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھ چکے ہیں۔ ان کی والدہ کی تاریخ وفات نکالنے سے معذرت کی تھی۔ مرثیہ کہہ دیا تھا۔

حامد حسن قادری ۲۵-۸-۳۱ء

تھا، دلّی میں انتقال کیا، اُدْخُلِیْ جَنَّتِیْ مادۂ تاریخ ہے

عالمگیر اس زمانے میں دکن کی فتوحات میں مصروف تھا۔ یہ خبر سن کر سخت غمزدہ ہوا، بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکلے، اور باوجود انتہا درجے کے استقلال مزاج کے صبر کی تاب نہ لاسکا، سیّد امجد خاں، شیخ عطاء اللہ اور حافظ خاں کے نام حکم صادر ہوا کہ اس کے ایصال ثواب کے لئے زکوٰۃ وخیرات دیں، اور مرحومہ کا مقبرہ تیار کرائیں۔

خافی خاں نسخہ مطبوعہ کلکتہ میں زیب النساء کا نام اور اس کے واقعات ۱۱۲۲ھ تک آتے ہیں، لیکن یہ صریح غلطی ہے کاتبوں نے غلطی سے زینت النساء کو زیب النساء سے بدل دیا ہے۔

کمالات علمی اور عام اخلاق و عادات تمام مورخین نے بہ تصریح لکھا ہے کہ زیب النساء علوم عربیہ اور فارسی زباندانی میں کمال رکھتی تھی، نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی، لیکن اس کی تصنیفات سے آج کوئی چیز موجود نہیں، عام طور پر مشہور ہے کہ وہ مخفی تخلص کرتی تھی، لیکن یہ صحیح نہیں۔ کسی تاریخ یا تذکرہ میں اس کے تخلص یا دیوان کا ذکر نہیں۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ شاعر تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام ضائع ہوگیا، اسی تذکرہ میں ملا سعید اشرف کے حال میں لکھا ہے کہ زیب النساء کی بیاض خاص ایک خواص کے ہاتھ سے جس کا نام ارادت فہم تھا، حوض میں گر پڑی، چنانچہ سعید اشرف نے اس پر ایک قطعہ لکھا، جو آگے آئے گا، غالباً یہ اشعار کی بیاض ہوگی، تذکروں میں یہ دو شعر زیب النساء کے نام سے منقول ہیں:-

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد   کور بہ چشمے کہ لذّت گیر دیدارے نشد

صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت   غنچۂ باغِ دلِ ما زیب دستارے نشد

زیب النساء کی تصنیفات وتالیفات سے زیب المنشات کا ذکر البتہ تذکروں میں آیا ہے، تذکرۃ الغرائب کے مصنف نے لکھا ہے کہ "میں نے اس کو دیکھا ہے۔" یہ زیب النساء کے خطوط اور رقعات کا مجموعہ ہے۔

علم پروری زیب النساء نے خود کوئی تصنیف کی ہو یا نہ کی ہو، لیکن اس نے اپنی نگرانی میں اہل فن سے بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کرائیں۔

زیب النساء کا دربار حقیقت میں ایک اکاڈمی (بیت العلم) تھی، ہر فن کے علماء اور فضلاء نوکر تھے۔ جو ہمیشہ تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ یہ کتابیں عموماً اس کے نام سے موسوم ہوتی تھیں، یعنی ان کتابوں کے نام کا پہلا جز "زیب" کا لفظ ہوتا تھا۔ اس سے اکثر تذکرہ نویسوں کو دھوکہ ہوا ہے، اور انھوں نے وہ کتابیں زیب النساء کی تصنیفات میں شمار کیں۔

زیب النساء نے جو کتابیں تصنیف کرائیں ان میں زیادہ قابل ذکر تفسیر کبیر کا ترجمہ ہے، یہ مسلّم ہے کہ تفسیروں میں امام رازی کی تفسیر سے زیادہ جامع کوئی تفسیر نہیں، اس لئے زیب النساء نے ملا صفی الدین اردبیلی کو جو کشمیر میں مقیم تھے، حکم دیا کہ اس کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ چنانچہ اس کا نام زیب التفاسیر رکھا گیا، بعض تذکرہ نویسوں نے غلط لکھ دیا ہے کہ وہ زیب النساء کی مستقل تصنیف ہے۔

زیب النساء نے تصنیف و تالیف کا جو محکمہ قائم کیا تھا، اس کے ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانہ کا ہونا بھی ضرور تھا، جس سے مصنفین فائدہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ بیگم موصوف نے ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا، مصنف مآثر عالمگیری کا بیان ہے کہ اس کتب خانہ کی نظیر کسی کی نظر سے نہ گذری ہوگی، مصنف مذکور کے اصلی الفاظ یہ ہیں:-

"درسرکار علیہ کتاب خانہ گرد آمدہ بود کہ بہ نظر ہیچ یکے در بنامدہ باشد" (صفحہ ۵۳۹)

زیب النساء کے حسن مذاق سے یہ بڑا نفع ہوا کہ عالمگیر کی خشک مزاجی نے جو نقصان پہنچایا تھا، اس کی تلافی ہوگئی، یاد ہوگا کہ دربار میں ملک الشعرائی کا خاص عہدہ ابتدائے سلطنت سے چلا آتا تھا، جس پر فیضی، طالب آملی، قدسی، کلیم مامور رہ چکے تھے، عالمگیر نے اس عہدے کو موقوف کر دیا، اور دفعتہً شعرا گویا بے خان و مان ہو گئے، لیکن زیب النساء کی قدر دانی نے پھر وہ دربار قائم کر دیا، مختلف تقریبوں پر شعرا قصیدے اور نظمیں لکھ کر پیش کرتے تھے، اور گراں بہا انعام پاتے تھے۔ زیب النساء کی شعر دوستی کا یہ اثر ہوا کہ اہلِ سخن معمولی

عرض و معروض بھی شعر ہی میں کرتے تھے۔

نعمت خاں عالی اس زمانے کا مشہور شاعر تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک مرصع کلغی، جو دستار پر لگاتے تھے زیب النساء کی خدمت میں فروخت کے لئے پیش کی۔ زیب النساء نے رکھ لی۔ لیکن جیسا کہ درباروں کا معمول ہے، قیمت کے ملنے میں دیر ہوئی۔ نعمت خاں نے یہ رباعی لکھ کر بھیجی:۔

اے بندگیت سعادت اخترِ من

در خدمتِ تو عیاں شدہ جوہر من

گر جیغہ خریدنی ست پس کو زرِ من　　　　ور نیست خریدنی، بزن بر سرِ من

اگر خریدنا ہے تو دام دلوایئے　　　　اور نہ خریدنا ہو تو میرے سر ماریے

بیگم نے پانچ ہزار روپے دلوائے اور کلغی واپس کردی۔

جہاں آرا بیگم (زیب النساء کی پھوپھی) ایک دفعہ باغ کی سیر کو نکلی، ہر طرف پردہ کرا دیا گیا۔ میر صیدی طہرانی ایک مشہور شاعر تھا۔ وہ کسی حجرہ میں چھپ کر سواری کا تماشہ دیکھ رہا تھا، بیگم کا ہاتھی پاس سے گذرا تو بے ساختہ صیدی نے یہ مطلع پڑھا:

برقع برخ افگندہ برد ناز بہ باغش　　　　تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش

باغ میں برقع پہن کر اس لئے جاتی ہے　　　　کہ پھول کی خوشبو چھن کر دماغ میں آئے

بیگم نے حکم دیا کہ شاعر کو کشاں کشاں سامنے لائیں، بیگم نے بار بار مطلع پڑھوا کر سنا اور پانچ ہزار روپے دلوائے لیکن ساتھ ہی حکم دیا کہ شہر سے نکال دیا جائے (یعنی یہ گستاخی کیوں کی) اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ بیگمات کے لئے کس قسم کے آداب مقرر تھے۔

اخلاق و عادات: زیب النساء اگرچہ درویشانہ اور منصفانہ مذاق رکھتی تھی، تاہم شاہجہاں کی پوتی تھی، اس لئے نفاست پسندی اور امارت کے سروسامان بھی لازمی تھے، عنایت اللہ خاں جو امرائے عالمگیری میں مقرب خاص تھا، زیب النساء کا میر خانساماں تھا۔ کشمیر میں جا بجا جو خوشگوار اور خوش منظر چشمے ہیں، ان میں سے ایک چشمہ جس کا نام احول تھا، زیب النساء کی جاگیر میں تھا۔ زیب النساء نے اس کے متصل ایک نہایت پر

تکلف باغ اور شاہانہ عمارتیں تیار کرائی تھیں، چنانچہ عالمگیر جب ۱۰۷۳ھ میں کشمیر کے سفر کو گیا ہے، تو اس مقام پر ایک دن قیام کیا۔ اور زیب النساء نے قاعدے کے مطابق نذر پیش کی اور روپے نچھاور کیے۔

۱۰۹۰ھ میں ابرک کا ایک بڑا خیمہ تیار کرایا تھا، جو تمام تر شیشہ معلوم ہوتا تھا، نعمت خاں عالی نے اس کی تعریف میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی۔

بھائیوں سے نہایت محبت رکھتی تھی، ۱۰۵ھ میں جب اعظم شاہ مرض استسقاء میں سخت بیمار ہوا تو زیب النساء نے اس کی تیمارداری اس محبت سے کی کہ تمام ایام مرض تک اس پرہیزی غذا کے سوا جو خود شہزادہ کھاتا تھا، کوئی اور غذا نہیں کھائی۔ محمد اکبر جس زمانے میں عالم گیر سے باغی ہو کر راجپوتوں سے مل گیا ہے، اس زمانے میں بھی زیب النساء نے اس سے برادرانہ راہ و رسم اور خط و کتابت ترک نہ کی، جس کے صلے میں اس کی تنخواہ اور جاگیر ضبط ہو گئی۔

زیب النساء کے متعلق جھوٹے قصے: زیب النساء کے متعلق متعدد جھوٹے قصے مشہور ہو گئے ہیں، جن کو یورپین مصنفوں نے اور زیادہ آب و رنگ دیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ زیب النساء اور عاقل خاں سے عاشقی اور معشوقی کا تعلق تھا، اور زیب النساء اس کو چوری چھپے محل میں بلایا کرتی تھی، ایک دن عالمگیر محل میں موجود تھا کہ اس کو پتہ لگا کہ عاقل خاں محل میں ہے اور حمام کی دیگ میں چھپا دیا گیا ہے۔ عالمگیر نے انجان بن کر اسی دیگ میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا، عاقل خاں نے اخفائے راز کے لحاظ سے دم نہ مارا اور جل کر رہ گیا۔ مرنے کے وقت یہ مطلع کہا تھا:-

بعد مردن ز جفائے تو اگر یاد کنم   از کفن دست بروں آرم و فریاد کنم

عاقل خاں کا مفصل تذکرہ مآثر الامرا میں موجود ہے، اور چونکہ شاعر تھا، تمام تذکروں میں اس کے حالات مذکور ہیں، لیکن اس واقعہ کا کہیں نام و نشان نہیں۔ جن کتابوں میں اس کا حال مل سکتا تھا اور جو مستند اور معتبر خیال کی جاتی ہیں حسب ذیل ہیں:-

عالمگیر نامہ، مآثر الامرا، مآثر عالمگیری، تذکرہ سرخوش، خزانہ عامرہ، سرو آزاد، ید بیضا ان

کتابوں میں ایک حرف بھی اس واقعہ کے متعلق نہیں حالانکہ اس کی وفات کا تذکرہ سب نے لکھا ہے جو ۱۱۰۷ھ میں واقع ہوئی۔

دوسرا واقعہ یہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ زیب النساء نے یہ مصرع کہا:

از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم

چاہتی تھی کہ مطلع ہو جائے، لیکن دوسرا مصرع اس کی جوڑ کا موزوں نہیں ہوتا تھا، ناصر علی کے پاس مصرع لکھ کر بھیجا، اس نے برجستہ کہا:

از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم
شاید رسید برلبِ زیب النساء لبم

لیکن جو شخص تیموریوں کے جاہ و جلال اور آداب و آئین سے واقف ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ بیچارے ناصر علی کو خواب میں بھی اس گستاخی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

(الندوہ جلد ۶، نمبر ۹، اکتوبر ۱۹۰۹ء)

(ب) تحفۃ الہند

مسلمانوں کی توجہ برج بھاشا پر۔ برج بھاشا کا فن معانی و بیان

تحفۃ الہند جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے، ایک کتاب کا نام ہے جو اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں تصنیف ہوئی۔ مصنف کا نام میرزا خان بن فخر الدین محمد ہے۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں شہزادہ اعظم شاہ کے مطالعہ کے لئے تصنیف کی۔ کتاب کا موضوع ہندوؤں کا فنِ بلاغت اور عروض و قافیہ وغیرہ ہے۔ اس میں سات باب ہیں:۔

۱۔ پنگل یعنی علم عروض　　۲۔ تک یعنی قافیہ
۳۔ النکار یعنی علم بدیع　　۴۔ سرنگار رس یعنی عشق و محبت
۵۔ سامدرک یعنی علم قیافہ　　۶۔ کوک یعنی علم النساء

۷۔ لغات ہندی، اس میں برج بھاشا کے ضروری کثیر الاستعمال الفاظ لکھے ہیں اور ان کے

معنی بتائے ہیں۔

یہ کتاب عالمگیر کے زمانے میں تصنیف ہوئی ہے اور اس کے سب سے چہیتے اور منظورِ نظر فرزند کے مطالعہ کے لئے تصنیف ہوئی ہے۔ عالمگیر کی نسبت اس کے مخالفوں کا دعویٰ ہے کہ وہ تعصب کا دیوتا تھا، اور اس نے ہندوؤں کی نہ صرف عمارات بلکہ ان کے لٹریچر کو بھی مٹا دینا چاہا تھا، اور اسی لئے ان کی تمام درس گاہیں اور پاٹھ شالے بند کرا دئے تھے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تاریخ کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ عالمگیر ملک کے ایک ایک جزئی واقعہ سے اس قدر واقفیت رکھتا تھا کہ کسی حصۂ ملک کا ادنیٰ سا واقعہ بھی اس کی نگاہِ تجسس سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔ باوجود اس کے برج بھاشا کو جس قدر اس کے زمانے میں ترقی ہوئی، مسلمانوں نے جس قدر اس کے زمانے میں ہندی کتابوں کے ترجمے کئے اور خود جس قدر برج بھاشا میں نظم و نثر لکھی، کسی زمانے میں اس قدر ہندی کی طرف التفات نہیں ظاہر کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کی تفصیل ہم ایک مستقل مضمون میں لکھ چکے ہیں، یہ کتاب (تحفۃ الہند) اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ عالمگیر جو اپنے بیٹوں کی ایک ایک حرکت سے خبر رکھتا تھا، اس کی نظر سے ایک ایسی کتاب جو اس کے محبوب ترین شہزادے کے لئے لکھی جائے مخفی رہ جائے۔ نعمت خاں عالی نے وقائع لکھی اور عالمگیر سے چھپانے کی بے انتہا کوشش کی، لیکن چھپ نہ سکی۔

اس کتاب میں سے ہم صرف صنائع و بدائع کے حصہ کا اقتباس درج کرتے ہیں، جس سے اندازہ ہوگا کہ ہندی زبان کے فنِ بدیع کو عربی سے کیا نسبت ہے؟ اس موقع پر یہ بات بھی اظہار کے قابل ہے کہ مصنف نے ہندی صنائع و بدائع کی تفصیل لکھ کر چند صنعتیں خود اضافہ کی ہیں، ان کے خود نام رکھے ہیں، اور ان صنعتوں میں خود ہندی اشعار کہہ کر درج کتاب کئے ہیں۔ جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنف کو خود اس زبان میں کہاں تک قدرت تھی۔ یہ صنائع اکثر بالکل قریباً کُل عربی سے لئے ہیں اور عربی ناموں کا ترجمہ بھاشا میں کر دیا ہے۔

بھاشا میں علم بدیع کو النکار کہتے ہیں۔ چونکہ بلاغت کا اصلی کام جذبات اور احساسات پر

اثر ڈالنا ہے، اس لئے النکار کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔

ا۔ نورس، اس میں تمام احساسات کا استقصاء کیا ہے، اور ان کی نو قسمیں قرار دی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

سرنگار رس: اس کی دو قسمیں ہیں: سنجوگ، بیوگ سنجوگ، یعنی وصال و فراق۔

ہاسیہ رس: مسرت و خوشی — کرونا رس: رحم و ہمدردی

ویر رس: شجاعت و بہادری — رَوْدر رس: غیظ و غضب

بھے رس: خوف و بیم — بی بھتس (۱) رس: نفرت و کراہت

شانت رس: سکون و اطمینان — ادبھت رس: استعجاب

عربی و فارسی زبان میں اس قسم کی سائنٹفک تقسیم نہیں ہے اور اس لحاظ سے ہندی کو فارسی اور عربی پر ترجیح ہے۔

۲۔ وے نیگ: (۲) کسی مضمون کا لطیف، نازک اور شوخ پیرایہ میں ادا کرنے کو کہتے ہیں۔ مثلاً عورت اپنے محبوب شوہر سے جو کسی اور عورت پر عاشق ہے کہتی ہے کہ پیارے! تیری پیشانی پر جو سرخی ہے، یہ تیری سرخ ٹوپی کا عکس ہے، یا رقیبہ کی حنا کا اثر ہے؟ سوال سے بظاہر صرف اس قدر مفہوم ہوتا ہے کہ عورت کو اپنے شوہر سے رقیبہ کے پاس جانے، اور اس سے ملنے کی شکایت ہے، لیکن در پردہ وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتی ہے کہ شوہر نے رقیبہ کے پاؤں پر پیشانی رگڑی ہے، جس سے پیشانی میں سرخی آگئی ہے، یہ وہ صنعت ہے، جس کو عربی میں تعریض کہتے ہیں۔

سنسکرت کا انشا پرداز اس صنعت کو اس قدر وسعت دیتا ہے کہ الفاظ اور عبارت کی ضرورت نہیں، صرف حالت کا دکھا دینا بھی اس صنعت میں داخل ہے۔ مثلاً محبوب رات بھر کا جاگا ہوا کسی صحبت سے آیا ہے، جس کی وجہ سے بال پریشان ہیں، آنکھیں مخمور ہیں،

---

(۱) یہ لفظ علامہ کے مضمون میں ''بی بھس'' لکھا ہے، لیکن اصل میں ''بی بھتس'' ہے۔

(۲) اس کو علامہ نے ''ے نیگ'' لکھا ہے۔ ''وے نیگ'' درست ہے۔

انگڑائیوں پر انگڑائیاں آرہی ہیں، عاشق زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ صرف آئینہ لاکر سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ سب کچھ کہہ دے گا۔ یہ بھی اسی صنعت میں شامل ہے۔

۳۔ اُپمان۔ اس کے معنی تشبیہ کے ہیں، تشبیہ ایک نہایت لطیف صنعت ہے، عربی میں اس کو نہایت وسعت دی ہے، اور اس کی بہت سی قسمیں ہیں، بھاشا میں بعض باتیں تو مشترک ہیں مثلاً مکہ اپمان، یعنی جب تشبیہ کے الفاظ مذکور ہوں، مثل چوں، مثل وغیرہ۔

لُپت اپمان۔ حرف تشبیہ مذکور نہیں لیکن مقدر ہے جیسے "قندِ لب" یعنی لب چوں قند، اس کو عربی میں استعارہ (۱) کہتے ہیں۔

ورڈ ہا بھاس النکار۔ یعنی عبارت کے معنی واقع میں صحیح ہوں، لیکن بظاہر غلط معلوم ہوں، جب ایک لفظ کے معنی مختلف ہوتے ہیں، تو اس صنعت سے کام لیتے ہیں، مثلاً بھاشا میں سیام، سیاہ کو بھی کہتے ہیں اور معشوق کو بھی، اسی طرح لال سرخ کو بھی کہتے ہیں اور محبوب کو بھی، اب اگر یہ کہا جائے کہ "سیام زرد ہے" تو بظاہر غلط معلوم ہوگا، کیونکہ سیاہ چیز زرد نہیں ہوسکتی، لیکن اگر سیام کے معنی محبوب کے لئے جائیں تو یہ جملہ صحیح ہوسکتا ہے۔

عربی میں اس صنعت کو نہایت وسعت دی ہے، مقامات حریری میں سو فقہی سوال اور جواب ہیں، جواب تمام تر غلط معلوم ہوتے ہیں، لیکن واقع میں صحیح ہیں۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص وضو کے بعد نعل کو چھوئے تو کیا حکم ہے؟ جواب دیا ہے کہ "وضو ٹوٹ جائے گا۔" نعل عربی میں جوتی کو کہتے ہیں اور یہ معنی زیادہ متداول ہیں، لیکن نعل عورت کو بھی کہتے ہیں اور شافعیوں کے نزدیک عورت کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

سکارن اُت پریچھا، حسن تعلیل کو کہتے ہیں، یہ صنعت عربی اور فارسی میں بہت مستعمل ہے،

---

(۱) "قندلب" کو استعارہ نہیں کہتے ہیں۔ بلکہ تشبیہ ہے۔ بغیر حرف تشبیہ کے۔ جیسے لُجَینُ الْمَاءِ (سیم آب، پانی کی چاندی) یعنی مَاءٌ کَاللُّجَیْنِ (آب چوں سیم، چاندی جیسا پانی) یا مثلاً "گل رخسار" تشبیہ ہے اور "رخسار گل" استعارہ۔ استعارہ میں مشبہ اور مشبہ بہ میں سے صرف ایک مذکور ہوتا ہے۔ اور تشبیہ میں دونوں ہوتے ہیں۔ "قند لب" میں دونوں ہیں، لب مشبہ، قند مشبہ بہ۔

بھاشا میں اس کے نہایت لطیف نئے نئے پیرایے ملتے ہیں، مثلاً چاند معشوق کا حسن چرا کر آسمان پر بھاگ گیا، اسی وجہ سے ہمیشہ چوروں کی طرح رات کو نکلتا ہے، فارسی کا شاعر کہتا ہے:-

از شرمِ ابروانِ بلندِ تو ماہِ نو　　خود را چناں نمود کہ کس دید و کس ندید

یعنی معشوق کی ابرو کی شرم سے ماہِ نو اس طرح چھپ کر نکلا کہ کسی نے دیکھا اور کسی نے نہیں دیکھا۔

اس موقع پر یہ نکتہ خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ ہمارے انشا پردازوں نے سنسکرت اور برج بھاشا کے علم و ادب کے نکتہ نکتہ کو سمجھا اور اس سے بہت فائدہ اٹھایا، لیکن اس کے فیض سے وہی محروم رہ گیا، جو سب سے زیادہ حق دار تھا، یہ ظاہر ہے کہ اُردو بھاشا سے نکلی اور اس کے دامن میں پلی لیکن بھاشا سے جو سرمایہ اس کو ملا، صرف الفاظ تھے۔ مضامین اور خیالات سے اس کا دامن خالی رہا، بخلاف اس کے عربی زبان، جس کو بھاشا سے کسی قسم کا تعارف نہ تھا، وہ سنسکرت اور بھاشا دونوں سے مستفید ہوئی۔

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آج سے ۵۰ برس پہلے مسلمان، اُردو کو کوئی علمی زبان نہیں سمجھتے تھے، خط و کتابت تک فارسی میں تھی۔ اُردو شعراء جس قدر گذرے ان میں سے ایک بھی عربی کا فاضل نہ تھا، یا یوں کہو کہ کوئی عالم اُردو کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ اس میں انشا پردازی یا شاعری کا کمال دکھائے۔ علمی زبان اس وقت صرف عربی تھی، اس لئے جہاں سے جو سرمایہ ملتا تھا اسی کے خزانے میں جمع کیا جاتا تھا، بہرحال ہندی شاعری کے مضامین عربی زبان میں بعینہٖ نقل ہوئے، یعنی علمائے ادب نے سنسکرت اور بھاشا کی نظموں کا بعینہٖ عربی میں ترجمہ کیا، ہم ذیل میں چند مثالیں لکھتے ہیں۔ یہ مثالیں سبحۃ المرجان' سے لی گئی ہیں، مولوی غلام علی آزاد نے ہر جگہ تشریح کر دی ہے کہ وہ ہندی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

لَقَدْ نَحَلَتْ فِیْ یَوْمِ رَاحَ حَبِیْبُھَا　　اِلیٰ اَنْ ھَویٰ مِنْ سَاعِدَیْھَا نضارُھَا
وَلَمَّا اَتَاھَا مُخْبِرٌ عَنْ قُدُوْمِھَا　　عَلیٰ سَاعِدِ الْمَلآنِ ضَاقَ سِوَارُھَا

(یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندی میں عاشق عورت ہے، اور مرد معشوق ہے)

یعنی جس دن معشوق نے سفر کیا، میں اس قدر دبلی ہوگئی کہ ہاتھ کے کڑے ڈھیلے ہوکر گر پڑے، لیکن جس دن قاصد نے آکر معشوق کے آنے کی خبر دی، اور میں نے کڑوں کو پہننا چاہا تو اب وہ تنگ ہو گئے اور چڑھتے نہ تھے۔

مَا لَاحَ فِیْ شَفَتَیْکَ کُحْلٌ دَائِقٌ　　　اِنِّی اُبَیِّنُهٗ بِحُسْنِ بَیَان

خَتَمَتْ عَلٰی شَفَتَیْکَ ذَاتُ تَدَلُّلٍ　　　کَیْلَا تُکَلِّمَنِیْ عَلَی الْاَحْیَان

واقعہ یہ ہے کہ شوہر، کسی اور محبوبہ سے مل کر آیا، اور چوں کہ اس نے اس کی سرگیں آنکھوں کو چوما، اس لئے اس کے ہونٹوں پر سیاہی لگ گئی ہے، اب عورت شوہر سے کہنے آئی ہے کہ تیرے ہونٹوں پر جو سیاہی لگی ہے میں بتاؤں کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے، کسی کافر ادا نے تیرے ہونٹوں پر مہر کردی ہے، کہ تو کبھی مجھ سے بات نہ کرے۔

(الندوہ فروری ۱۹۱۱ء)

(۱۳) مکاتیب و خطوط۔ علامہ کے خطوں کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ دو حصے 'مکاتیب شبلی' کے نام سے دار المصنفین نے شائع کیے ہیں۔ ایک میں علامہ کے عام مکتوبات ہیں، دوسرے میں خاص ان کے تلامذہ کے نام۔ یہ خطوط ایسے ہی ہیں جیسے دوسرے مشاہیر علم و ادب کے ہیں۔ لیکن ایک تیسرا نادر مجموعہ 'خطوطِ شبلی' کے نام سے مولوی محمد امین صاحب زبیری مارہروی نے ۱۹۲۶ء میں شائع کیا ہے۔ یہ دو مشہور خاتونوں کے نام لکھے گئے ہیں، یعنی عطیہ فیضی بیگم اور زہرا فیضی بیگم کے نام۔ یہ دونوں نواب بیگم نازلی فیضی اہلیہ محترمہ ہز ہائی نس نواب صاحب جنجیرہ (بمبئی) کی بہنیں ہیں۔ بمبئی کے مشہور خاندان فیضی سے تعلق رکھتی ہیں۔ بمبئی میں علامہ شبلی کا اس خاندان سے تعارف ہوا۔ زبیری صاحب 'خطوط' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

جس وقت بمبئی کے ممتاز خاندان فیضی سے ان کا تعارف ہوا، اس وقت عطیہ بیگم اپنی تعلیم کے لحاظ سے بہت کچھ شہرت رکھتی تھیں۔ انھوں نے آزادانہ تعلیم پائی تھی، اور پہلی مسلمان خاتون تھیں جو یورپ کو تعلیم کے لئے گئی تھیں۔ بمبئی کے تعلیم یافتہ مسلمان خاندانوں کی طرح آزادانہ معاشرت تھی۔ یہ خاندان عرصہ تک استنبول میں بھی مقیم رہا تھا۔ ان کے والد

تاجر تھے اور بسلسلۂ تجارت وہاں قیام تھا۔

عطیہ بیگم صاحبہ کی دوسری بہنوں زہرا بیگم صاحب اور نازلی رفیعہ بیگم صاحب نے اگرچہ عطیہ بیگم صاحب کی طرح باقاعدہ تعلیم نہیں پائی، بااین ہمہ، نہایت قابل ہیں۔ اُردو سے خاص دلچسپی رکھتی ہیں۔ صاحبِ تصنیف وتالیف ہیں۔ اہلِ کمال کی قدر شناس ہیں۔ ان کی مجلس میں علمی تذکرے رہتے ہیں۔ زہرا بیگم صاحبہ کو واقعہ نگاری میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ عطیہ بیگم صاحب سب سے چھوٹی ہیں لیکن سب سے زیادہ تیز اور ذہین ہیں۔ مولانا نے ان میں وہ سب جوہر دیکھے، جن سے ایک خاتون قابلِ رشک مرتبہ حاصل کرسکتی ہے۔ ان کے دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ ان جوہروں کو چلا دیں اور عطیہ بیگم کو ایک نمونہ بنادیں۔ رفتہ رفتہ اس خاندان سے ان کے عزیزانہ تعلقات ہوگئے۔ پھر ندوہ کی امداد اور اتحاد خیال نے ان میں اور مضبوطی پیدا کردی۔ راقم کو بارہا ان بیگمات سے ملنے کا موقع ملا ہے، مولانا کی نسبت محبت واحترام کا جوش جو ان میں نظر آیا، وہ قریب ترین احباب اور تلامذہ میں بہت کم پایا گیا۔

عطیہ بیگم کے متعلق ایک نوٹ میں لکھتے ہیں:۔

عطیہ بیگم صاحب کی شادی مسٹر رحمٰن سے ہوئی جو یہودی مذہب رکھتے تھے۔ انھوں نے شادی سے قبل اسلام قبول کرلیا تھا۔ وہ نہایت ممتاز ومشہور اور کامل الفن آرٹسٹ (مصوّر) ہیں جن کے آرٹ کی یورپ میں خاص شہرت ہے۔ انھوں نے مولانا مرحوم کی بھی ایک تصویر بنائی تھی جو گویا ان کے کمال مصوری کی تصویر ہے۔ فرانس کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۳ء میں وہ رکھی گئی تھی، اور اس کی بے انتہا قدر ہوئی۔ نہایت معقول قیمت لگی، لیکن عطیہ بیگم صاحب نے اس کو فروخت کرنا گوارا نہ کیا، اور ایوان رفعت (محل جناب نازلی بیگم صاحب واقع بمبئی) کی زینت ہے۔

عطیہ بیگم کی شادی کے متعلق علامہ شبلی نے ایک شعر اور قطعہ کہا تھا، جو عطیہ بیگم کی بیاض سے زبیری صاحب نے دیباچہ خطوط میں نقل کیے ہیں، وہ یہ ہیں:۔

شعر

بتانِ ہند کافر کرلیا کرتے تھے مسلم کو   عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

قطعہ

کھینچ سکتا جو نہ تھا مجھ کو کوئی اپنی طرف   اس لیے مجھ کو قرابت سے بہت دوری تھی
آرٹسٹ آپ ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں   آپ نے کھینچ لیا مجھ کو تو مجبوری تھی

علامہ نے یہ قطعہ عطیہ بیگم کو بھیجنے کے علاوہ اپنے احباب کو بھی سنایا ہوگا۔ اُسی زمانے میں مشہور ہو گیا تھا۔ جب علی گڈھ کالج میں پہنچا تو ایک ذہین وظریف طالب علم مولوی (۱) اقبال احمد صاحب سہیلؔ نے اس کے جواب میں یہ قطعہ کہا:

قطعہ

کب یہودی سے عطیہ عقد زیبا تھا تمھیں   بنت فیضی تم ہو، یہ رشتہ نہ کرنا تھا تمھیں
میں نے یہ مانا، وہ مانی ہے تو تم تصویرِ حسن   تم کو کھچنا تھا، مصور نے جو کھینچا تھا تمھیں

اور شوہر عطیہ کی زبانی یہ شعر کہا:-

صفحۂ دل پر جو کھنچی آپ کی تصویر حسن   مستحق تھا جس ''عطیہ'' کا وہ میں نے پالیا

یہ شبلی اور سہیلؔ کے قطعات اسی زمانے میں شاہ دلگیر اکبر آبادی مرحوم کے رسالہ 'نقاد' آگرہ میں شائع ہوئے تھے۔

''خطوطِ شبلی'' چھوٹا سا مجموعہ ہے۔ ۹۰ صفحوں میں ۸۲ خط ہیں، ۵۵ عطیہ بیگم کے نام اور ۲۷ زہرا بیگم کے نام۔ سب خطوط ساڑھے تین سال کے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ پہلا خط ۷ار فروری ۱۹۰۸ء کا ہے اور آخری ۲۸ر مئی ۱۹۱۱ء کا۔ اس مجموعہ کے ساتھ مولوی محمد امین صاحب زبیری، جامع خطوط کا مختصر دیباچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو کا مفصل مقدمہ شامل ہے۔

---

(۱) سہیلؔ صاحب علی گڈھ سے ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی کر کے اعظم گڈھ میں وکالت کرتے تھے۔ ۸ر نومبر ۱۹۵۵ء کو انتقال کیا۔ فارسی و اُردو کے نہایت پُرگو، زودگو، خوش گو شاعر تھے۔ ان کا یہ لطیفہ یادگار ہے کہ جب یوپی اسمبلی کے ممبر تھے تو ایک مرتبہ ان کو ایک ریزولیشن پیش کرنا تھا۔ کچھ خیال آیا تو وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے مضمون کو اُردو میں نظم کر لیا اور بجائے تقریر کے وہ نظم اسمبلی میں پڑھ دی۔

ان مکتوبات کی خصوصیت نہیں، جن جن بزرگوں کے خطوط شایع ہوئے ہیں، سر سیّد، آزاد، حالی، وغیرہ، کسی کو لکھتے وقت یہ تصور بھی نہ آیا ہوگا کہ ان پرائیویٹ اور خانگی خطوں کو ان کے مرنے کے بعد شائع کیا جائے گا۔ یہ بعد کے لوگوں کی ''ستم ظریفی'' ہے کہ مرے ہوؤں کے گھر کے بھید اور دل کی باتیں سرِ بازار تشہیر کردیتے ہیں۔ اور ''ستم ظریفی'' کا لفظ اگر کہیں صادق آسکتا ہے تو اس کا بہترین محل یہ ''خطوطِ شبلی'' ہیں۔

''خطوطِ شبلی'' کے دیباچۂ اشاعت ثانی (۱۹۳۵ء) میں زبیری صاحب لکھتے ہیں:-

> ''بعض لوگوں نے مؤلف 'سیرۃ النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان خطوط کی نسبت کو ناپسند کیا، بعض نے ان کی اشاعت کو عقیدت و نیازمندی کے خلاف جانا جو راقم کو مولانا مرحوم کی ذات گرامی کے ساتھ ہے، بعض نے مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمہ میں متعصبانہ جھلک دیکھی جو خود ان کے اپنے خیالات نے پیدا کردی۔''

ہمارے نزدیک ان تینوں قسم کے لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کے اظہار میں عُجلت سے کام لیا، اور (بقول زبیری صاحب کے) ''یہ سب توہمات اور اپنے نفوس کے قیاسات تھے اور اپنی طبیعت کا رنگ۔'' اس لیے کہ عطیہ بیگم اور زہرا بیگم نے خوشی کے ساتھ ان کی اشاعت کی اجازت دے دی۔ اور علامہ شبلی خود ان جذبات وتعلقات میں کوئی بات ناقابلِ اشاعت نہ سمجھتے تھے۔ ان کے جواب میں ان بہنوں کے جو خطوط آتے تھے ان کو علامہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو سناتے تھے، اپنی بیٹی کو دکھاتے تھے، ان کے اقتباسات الہ آباد اور حیدرآباد بھیجتے تھے۔ ان بہنوں کے لیے خاص خاص موقعوں پر جو فارسی واُردو کی غزلیں اور قطعے کہتے تھے، وہ خطوط میں لکھنے کے بعد سنایا بھی کرتے تھے اور مجموعہ کلام فارسی میں چھپوایا بھی کرتے تھے۔ علامہ کے یہ خطوط بمبئی و جنجیرہ کے سفر، فارسی کی غزلیں ''معلوم عوام'' تھیں۔ زبیری صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا حالی مرحوم نے فارسی غزلوں کا ایک مجموعہ ''دستۂ گل'' دیکھ کر تحریر کیا تھا:-

> ''کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے 'سیرۃ النعمان'، 'الفاروق' اور

'سوانح مولانا روم' جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کا ہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے، جس کے نشے میں خمارِ چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیاتِ حافظ کا جو حصہ محض رندی و بیبا کی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔"

اس لیے درحقیقت 'خطوطِ شبلی' کے چھاپنے میں "ستم" کچھ نہیں ہے "ظریفی" سہی۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے، وہ ان کے نوادر مقدمات میں ہے۔ ان خطوط کی اشاعت کی ضرورت بتاتے ہیں:-

"ایک تو ان کا طرزِ بیان نہایت سادہ، بے تکلف اور دلچسپ ہے، جو ان کی دوسری تصنیفات اور رقعات میں نہیں پایا جاتا، دوسرے ان میں مولانا کے بعض ایسے خیالات پائے جاتے ہیں جو ان کی تصانیف میں کہیں نظر نہیں آتے، اور شاید کبھی گفتگو میں ان کا ذکر انھوں نے فرمایا........ تیسرے ان خطوں سے محبت اور خلوص کی بُو آتی ہے، جو ان کے دوسرے رقعات میں نہیں ہے، اور یہ ایک بہت بڑی وجہ ان کی دلچسپی اور قدر کی ہے۔"

بعض لوگوں نے "مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمے میں متعصّبانہ جھلک دیکھی" لیکن "شوخی" ہم کو بھی نظر آتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

مولانا کے ارشد (۱) تلامذہ نے حال ہی میں شعر العجم کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ واقعات کی کھتونی نہیں، حسن و عشق کی داستان ہے۔ گویا واقعات شاعر کی زندگی اور اس کی شاعری پر کچھ اثر ہی نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے "شعر العجم" واقعات کی کھتونی بھی ہے اور حسن و عشق کی داستان بھی۔ لیکن اگر وہ ان خطوط کو دیکھتے (تو معلوم (۲) ہوتا) (اور اگر دیکھا ہے تو غور نہیں فرمایا) کہ جس داستان کا تصور ان کے ذہن میں تھا، وہ شعر العجم میں نہیں، ان خطوط میں ہے۔ اُس کتاب میں مولانا نے دوسروں کے جذبات سے ایک دستۂ گل تیار کیا ہے،

---

(۱) علامہ سیّد سلیمان ندوی

(۲) یہ بریکٹ ہم نے جملہ کو مربوط کرنے کے لئے بڑھادیا ہے۔ دوسرا بریکٹ مولوی صاحب کی تحریر میں ہے۔

اور یہاں اپنے دلی جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ نقل ہے اور یہ اصل ہے، وہ جگ بیتی ہے، یہ آپ بیتی، اور ظاہر ہے کہ آپ بیتی میں جو مزہ ہے، وہ جگ بیتی میں کہاں۔

ہم ان خطوط میں سے علامہ شبلی کے چند جذبات و خیالات کا اقتباس کرتے ہیں:۔

محبت و خلوص

"اب تو تمھارے خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر سناتا ہوں، اور لوگ سر دھنتے ہیں۔ پالیٹکس کے متعلق تمھارے پچھلے خط کے اقتباسات (کوٹیشن) میں نے الہ آباد و حیدر آباد بھیجے۔ ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو تم اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں(۱) وَ اَنَا اَوَّلُ الْعَابِدِیْن۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"میں خود نہ آسکا لیکن عنقریب اپنی ایک تصویر جو تیس برس کی عمر کی ہے، اتفاق سے ہاتھ آگئی ہے، بھیجتا ہوں۔ وہ میری قائم مقامی کرے گی۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"تمھارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بے اختیار میں نے آنکھوں سے لگا لیا، اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"عطیہ لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے، میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمھاری توصیف و تعریف کا ایک شعر ہے۔"

"خاتونوں کے نام سے بورڈنگ (۲) کے کمرے بنیں گے، اور بیگم صاحب سے کہہ دیجئے کہ کم از کم ایک ان کے نام کا بھی ہوگا، تمھارے نام کا کمرہ ہو سکا تو خود اپنے صرف سے بنواؤں گا، لیکن اس سے کتبہ پر اشارہ نہ ہوگا۔ صرف تمھارا نام ہوگا" (عطیہ بیگم کے نام)

"اگر آپ لکھنؤ آکر کسی اور کی مہمان ہوئیں تو میں اس زمانہ میں لکھنؤ چھوڑ کر

---

(۱) اور میں پہلا پوجنے والا ہوں گا۔

(۲) یعنی ندوۃ العلماء کے بورڈنگ ہاؤس کے۔

چلا جاؤں گا۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"میں چاہتا تھا کہ میرے کسی کام میں تمھارے نام کی شرکت ہو۔ اس کا اصلی طریقہ تو یہ تھا کہ کوئی تصنیف تمھارے نام ڈیڈیکیٹ کرتا، لیکن افسوس نہیں کرسکتا" (عطیہ بیگم کے نام)

"میں آپ کی طرح آزاد خیال ہوتا تو سال بھر جزیرہ (۱) ہی میں رہتا۔ لیکن "ندوہ" کی زنجیر غضب کی ہے، اب بھی تو "زنجیرہ" میں ہوں۔" (زہرا بیگم کے نام)

فارسی پڑھانے کا شوق:۔

"بار بار جی چاہتا ہے کہ تم کو اس طرح فارسی پڑھاؤں کہ فارسی شاعری اور فارسی زبان کا ایک ایک نکتہ ذہن میں آجائے .... لیکن یہ کیوں کر ممکن ہے۔ میں عرش (جزیرہ) تک نہیں پہنچ سکتا۔ تم عرش سے اُتر نہیں سکتیں۔ تاہم ناامیدی نہیں، کبھی تو ندوہ کے جھگڑوں سے فرصت ملے گی۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"اگر یہ موقع پھر ملا تو میں چاہوں گا کہ میں تمھاری کچھ علمی خدمت کرسکوں۔ تم کو فارسی پڑھاؤں اور اُردو کی انشا پردازی سکھاؤں۔ معلوم نہیں تم اس کو اپنی تحقیر تو نہ خیال کروگی۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"ولایت سے آجاؤ اور موقع ہو تو تم کو فارسی کا پورا استاد بنادوں، گو خود شاعری کے قابل نہیں۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"افسوس یہ ہے کہ اتنا موقع نہیں ملتا کہ میں دو چار جُز کسی دیوان یا اپنے ہی کلام کے آپ کو پڑھا سکتا۔ اس سے یہ ہوتا کہ تمام ضروری فارسی اصطلاحات اور محاورات پر آپ کی نظر پڑ جاتی، اور فارسی شاعری کی خوبیاں ذہن نشیں ہو جاتیں۔ پھر آپ خود پڑھ لیتیں اور لطف اٹھاتیں۔" (زہرا بیگم کے نام)

---

(۱) اصل میں یہی نام ہے۔ لیکن لوگوں نے بگاڑ کر "جنجیرہ" کرلیا ہے۔ علامہ یہ دونوں نام لکھتے ہیں۔ ایک اور جگہ شاعرانہ اسلوب میں "زنجیرہ" بھی کرلیا ہے۔ یہ بھی اُس کا ایک نام یا نام کی صورت ہے۔

موسیقی سکھانے کا شوق:۔

''گانے کے ذکر پر ایک بات یاد آئی جو مدتوں سے دل میں تھی، لیکن کہنے کی جرأت نہ تھی۔ میں نے تم سے ایک دفعہ خولجہ حافظ کے شعر سنے۔ تم کو خدا نے خوش آوازی عطا کی ہے، اور نہایت مؤثر آواز ہے۔ لیکن افسوس ہوا کہ تم کو ہندوستانی موسیقی سے واقفیت نہیں۔ اس لئے تم بالکل بے سُرا گا رہی تھیں۔ موسیقی کی معمولی معلومات ضرور ہیں، ورنہ بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے۔ بارہا تم سے گانا سننے کو جی چاہا، لیکن رُک گیا کہ تمھاری گٹکری اور تانیں بے قاعدہ تھیں۔ بمبئی میں اس فن کو لوگ مطلق نہیں جانتے، یہاں تک کہ جن کا پیشہ ہے، وہ بھی محض جاہل ہیں۔'' (عطیہ بیگم کے نام)

''گانا میں خود نہیں جانتا، لیکن سمجھ سکتا ہوں۔ یعنی جو گانا خلاف فن ہوگا، میں بتا سکوں گا کہ خلاف قاعدہ ہے۔ گراموفون میں پیارے صاحب کے جو گانے بند ہیں، ان کو سنو، پلیٹ پر گانوں کے نام بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً دادرا، جھنجوٹی وغیرہ۔ ان سے اندازہ ہو سکے گا کہ کس قسم کے سُر اور تان اور گٹکری ہیں۔ یوں بے قاعدہ گانے میں کتنی ہی عمدہ آواز ہو، بیکار ہو جاتی ہے۔ البتہ میں رواں طور پر مثنوی یا اشعار پڑھنے کا طرز بتا سکوں گا جو عام صحبتوں کے قابل ہے۔'' (عطیہ بیگم کے نام)

اگر بالفرض تم کبھی لکھنؤ آؤ تو موسیقی ایسے لوگوں سے سیکھ سکتی ہو جن سے سیکھنا عیب میں داخل نہ ہو۔ بے شک پیارے صاحب وغیرہ سے سیکھنا شرم کی بات ہے۔ وہ لوگ سوسائٹی سے خارج ہیں۔ (عطیہ بیگم کے نام)

عورتوں کے اوصاف علامہ کی نظر میں:۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرار بن جائیں جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں، لیکن اُردو میں تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں۔ آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے۔ صرف مشق کی ضرورت ہے۔ ہم پرانے لوگ آزادی سے بے پردہ مجامع عام میں عورتوں کا تقریر کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن آپ تو اس میدان میں آچکیں۔ اس لئے اب جو کچھ ہو کمال کے درجے پر ہو۔'' (عطیہ بیگم کے نام)

''نصاب تعلیم کے متعلق میں سرے سے اس کا مخالف ہوں کہ عورتوں کے

لئے الگ نصاب ہو۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے جس میں یورپ بھی مبتلا ہو رہا ہے۔ کوشش ہونی چاہئے کہ ان دونوں صنفوں میں جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے وہ کم ہوتا جائے نہ کہ بڑھتا جائے، اور بات چیت، رفتار گفتار، نشست برخاست، مذاق زبان سب الگ ہو جائیں۔ یوں ہی تفرقہ بڑھتا رہا تو دونوں دو مختلف نوع ہو جائیں گے۔'' (عطیہ بیگم کے نام)

''عورتوں کے متعلق تمھاری رائے ہے کہ وہ دنیوی اور معاشی علوم کم پڑھیں، اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں۔ لیکن یاد رکھو کہ مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے اس بل پر کئے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دیو پیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو۔ لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان، چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہئے۔ جمال اور حسن نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی، دلیری، دیو پیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے۔ مردنما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے، ہاں، یہ اعتراض صحیح ہے کہ موجودہ طرزِ تعلیم سے بچے خاندان سے اجنبی ہو جاتے ہیں، لیکن خاندان سے زیادہ تر چسپیدگی بھی کوئی مفید چیز نہیں۔ مہمات امور رک جاتے ہیں۔'' (عطیہ بیگم کے نام)

عورتوں کی دیو پیکری پر تم نے اس قدر طولانی تقریر لکھی، لیکن میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ تو مسلّم ہے کہ صحت کے لئے، تندرستی کے لئے، جسم کی موزونی کے لئے، جامہ زیبی کے لئے مردانہ ورزشیں مفید ہیں، جو کچھ بحث ہے یہ ہے کہ عورتوں کے زنانہ حسن میں فرق آتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے جمال اور دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ صرف میری رائے نہیں بڑے بڑے اہلِ نظر کا یہی فیصلہ ہے۔'' (عطیہ بیگم کے نام)

''مردانہ تعلیم میں میں ہارا اور تم جیتیں، لیکن یہ بھی مردانہ پن ہے، اور عطیہ، میں تو تم میں تمام خوبیاں مردانہ ہی پاتا ہوں، گو تم اس کو اپنی توہین سمجھو۔'' (عطیہ بیگم کے نام)

اپنی تصانیف اور شاعری کے متعلق:۔

''میرا چھوٹا سا فارسی دیوان، یعنی حال کی غزلیں چھپی ہیں، اور میں نے ''برعکس نہند نام زنگی کافور'' ان کانٹوں کا نام ''دستۂ گل'' رکھ دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بھیج

دوں۔ لیکن زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے ہیں۔ اس لئے ان کا پردہ ہی میں رہنا مناسب ہے۔" (زہرا بیگم کے نام)

"بوئے گل" بھی اگر تم سمجھ کر پڑھ لو تو فارسی لٹریچر کی ادائیں معلوم ہو جائیں۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"بوئے گل" کہیئے تو بھیج دوں۔ "دستۂ گل" کی نسبت مہذب ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"چند غزلوں کا مجموعہ چھپ رہا ہے، تیاری پر بھیج دوں گا۔ افسوس کہ فارسی لٹریچر کسی قدر غیر معتدل واقع ہوا ہے، اور میں بھی اس کو سنبھال نہیں سکتا۔ بہر حال مضامین کچھ ہوں، لیکن زبان ایران کی ہوگی۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"موازنہ انیس و دبیر" اگر دیکھ سکو تو دیکھا کرو۔ اس سے اُردو میں بصیرت ہو سکتی ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"شعر العجم کا دوسرا حصہ جو زیرِ تحریر ہے تمہارے دیکھنے کے قابل ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

"مجھ کو بے انتہا مسرت ہوئی کہ تم نے میری تشریح کو اور خود اشعار کو پسند کیا، ان اشعار کی داد دینے کا تم سے بڑھ کر کس کا حق ہو سکتا ہے۔" (عطیہ بیگم کے نام)

اس طویل تجزیہ اور کثیر اقتباسات کے بعد اور کسی نمونہ کی ضرورت نہ تھی۔ تاہم ایک پورا خط عطیہ بیگم کے نام درج کیا جاتا ہے۔ اس میں وہ اشعار اور ان کی تشریح ہے جس کا ذکر اوپر کے آخری اقتباس میں ہے۔

عزیزی!

آج جی چاہتا ہے کہ "بوئے گل" کے بعض اشعار لکھوں، اور تم کو اس کا مطلب سمجھاؤں، تاکہ رفتہ رفتہ فارسی اشعار کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔

ذوقِ نظر بہ لذتِ کاوش نمی رسد
دِغم ازیں کہ دل نہ تواں کرد دیدہ را

ذوقِ نظر، دیدار کا لطف، کاوش محبوب کے دیکھنے سے جو دل کو بیتابی اور تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ داغم، یعنی مجھ کو رنج ہے یا افسوس ہے، نہ می رسد، یعنی برابر نہیں یا اس کو نہیں پہنچتا۔

اب مطلب یہ ہوا کہ دیدار میں بھی ایک لطف ہے، اور دل کی بیتابی اور تڑپ میں بھی ایک لطف ہے۔ لیکن دیدار کا لطف دل کی تڑپ کے لطف کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مجھ کو افسوس ہے کہ آنکھوں کو دل نہیں بنایا جا سکتا، یعنی کاش اگر آنکھیں دل بن جاتیں تو دونوں لطف ساتھ حاصل ہو سکتے تھے۔

چشمش بہ سوئے ما نگہ ناتمام کرد
ساقی بجام ریخت مے نارسیدہ را

نارسیدہ شراب، جو خوب پختہ اور نشہ آور نہ ہو اس کو نارسیدہ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی آنکھوں نے میری طرف دیکھا لیکن خوب آنکھ بھر کر نہیں دیکھا۔ بلکہ یوں ہی سی اچٹتی نظر ڈال دی تو گویا ساقی نے جام میں شراب ڈالی لیکن شراب خام تھی۔ خوب تیار نہیں ہونے پائی تھی۔

با ما بہر معاملۂ بدگماں نبود
خوش بود آنکہ راز محبت عیاں نبود

صاف ہے۔

از لذت ادائے ستم می تواں شناخت
کیں جور از تو بودہ واز آسماں نبود

آسمان بھی ظلم کرتا ہے اور محبوب بھی کرتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ آسمان کے ظلم میں لطف نہیں آتا، اور محبوب کے ظلم میں لذت اور مزا ہوتا ہے۔ اس بنا پر شاعر کہتا ہے کہ جب ہم پر ظلم ہوتا ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس نے ظلم کیا تو ہم یوں پہچان لیتے ہیں کہ اگر ظلم میں لذت ملی تو محبوب کا ظلم ہے۔

صد حرف راز بود نہاں در نگاہ من
شادم کہ کار ہا صنمے نکتہ داں نبود

شادم، میں خوش ہوں، کار، یعنی معاملہ، صنم، یعنی محبوب، نکتہ داں، جو بات کی تہ کو پہنچ جائے۔ مطلب یہ کہ میری نگاہ میں سیکڑوں راز چھپے ہوئے ہیں۔ یعنی محبت، شوق، حسرت، آرزو، شکایت، گلہ وغیرہ۔ لیکن غنیمت ہوا کہ محبوب نکتہ داں نہ تھا کہ میری نگاہ ہی سے سمجھ جاتا کہ اس کے دل میں کیا کیا خیالات ہیں۔"

شبلی، ۲۲ر جون ۱۹۰۹ء، لکھنؤ

مولوی سیّد احمد دہلوی: مؤلف فرہنگِ آصفیہ۔ ۸ر جنوری ۱۸۴۶ء ﴿۱۲۶۲ھ﴾ دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ سیّد عبدالرحمٰن ہے۔ رسمی تعلیم مختلف مشہور اساتذہ سے اور پھر نارمل اسکول دہلی میں حاصل کی۔ ابتدا سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک طویل فارسی نظم "طفلی نامہ" لکھی تھی۔ پھر خط و کتابت کی تعلیم کے لیے انشائے تقویۃ الصبیان لکھی، جس میں اُردو تلازمہ و ضلع قائم رکھا گیا تھا۔ یہ رسالہ ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا۔ اسی زمانے میں ان کو اپنی عظیم الشان لغت 'فرہنگِ آصفیہ' کی تالیف کا خیال پیدا ہوا، اور اس کی تیاری شروع کی۔ ۱۸۶۹ء میں انھوں نے مناظرۂ تقدیر و تدبیر، "کنز الفوائد" کے نام سے شائع کی۔ اس پر سرکار نے ڈیڑھ سو روپے انعام دیا۔

اس زمانے میں مسٹر فیلن (انسپکٹر مدارس صوبہ بہار) اپنی مشہور "اُردو لغت" مرتب کر رہے تھے۔ انھوں نے اس کی تالیف کی اعانت کے لیے مولوی سیّد احمد کو بلا لیا۔ یہ سات برس دانا پور میں رہے، اور ان کی کتاب کو مکمل کیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنا کام بھی کرتے رہے۔ یعنی وہاں سے "انشائے ہادی النساء" شائع کی اور فرہنگِ آصفیہ کا کام بھی جاری رکھا۔ ۱۸۸۰ء میں فیلن صاحب کا کام تکمیل کو پہنچا، تو اسی وقت مہاراجہ الور نے اپنا "سفرنامہ" مرتب کرنے کے لیے طلب کر لیا۔ ۶ مہینے میں وہ کام پورا کیا اور معقول تنخواہ اور انعام لے کر واپس آئے۔ اس کے بعد گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب میں نائب مترجم ہو کر چلے گئے۔

مولوی سیّد احمد نے دہلی اور شملہ کے اسکولوں میں سرکاری ملازمت کی اور پنشن پائی۔ گورنمنٹ نے ''خان صاحب'' کا خطاب دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور ممتحن بھی رہے۔ ۱۹۰۵ء میں جب پرنس آف ویلز تشریف لائے تو مولوی صاحب نے ایک نظم خیر مقدم اور اپنی ایک تالیف ''رسوم دہلی'' پیش کی۔ ۱۹۱۱ء کے دربار تاجپوشی کے زمانے میں مولوی صاحب کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام دربار احمد رکھا، ایک باران کے مکان میں آگ لگی اور تمام کتب خانہ اور فرہنگ آصفیہ کی جلدیں نذر آتش ہو گئیں۔ دولتِ آصفیہ نے اس موقع پر دست فیض بڑھایا اور اسی شاہانہ امداد سے دوبارہ کتاب شائع ہوئی۔ مولوی صاحب نے ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا۔ قرآن مجید سے تاریخ وفات نکلی :- اِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ فَضْلٍ = ۱۹۱۹ء (نمل، رکوع ۶ پارہ ۲۰)

مولوی سیّد احمد کی تصانیف مولوی صاحب نے بڑی کثرت سے کتابیں تصنیف کیں۔ اگرچہ ضخیم کتابیں کم ہیں۔ لیکن بعض تالیفات موضوع کے لحاظ سے مفید و جدید ہیں۔ فہرست یہ ہے:-

۱۔ تقویۃ الصبیان، ۲۔ کنز الفوائد، (مناظرۂ تقدیر و تدبیر)، ۳۔ وقائع درّانیہ، (تاریخ)، ۴۔ انشاء ہادی النساء، ۵۔ قصہ راحت زمانی (عورتوں کے لیے اخلاقی فسانہ) ۶۔ تحریر النساء (لڑکیوں کی درسی کتاب)، ۷۔ اخلاق النساء، ۸۔ لغات النساء (عورتوں کے خاص الفاظ و محاورات)، ۹۔ طبعی تعلیم، ۱۰۔ قواعد اُردو، ۱۱۔ علم اللسان (اُردو زباں دانی اور اس کی ترقی)، ۱۲۔ رسوم دہلی، ۱۳۔ تکمیل الکلام (پیشہ وروں کی اصطلاحات)، ۱۴۔ تحقیق الکلام (اُردو زبان کی خوبیاں)، ۱۵۔ محاکمہ مرکز (دہلی کو مرکز اُردو قرار دینے کے دلائل)، ۱۶۔ رس کھان (ہندی زبان کے دوہے، گیت، پہیلیاں)، ۱۷۔ ریت بکھان (ہندوؤں کے رسم و رواج)، ۱۸۔ ناری کتھا (ہندو عورتوں کے محاورات)، ۱۹۔ سیر شملہ (مع تاریخ شملہ)، ۲۰۔ روزمرہ دہلی، ۲۱۔ رسوم اعلیٰ ہندوان دہلی، ۲۲۔ اُردو ضرب الامثال۔

۲۳۔ فرہنگِ آصفیہ۔ اس کا نام سب سے آخر میں لیا گیا ہے، لیکن اہتمام و عظمت میں سب پر مقدم ہے۔ مولوی صاحب اپنے نام سے زیادہ اس کتاب کے نام سے

"مؤلف فرہنگِ آصفیہ" مشہور ہیں۔ آغازِ تالیف میں بھی بہت قدیم ہے۔ ۱۸۶۸ء سے اس کی ترتیب شروع کی۔ ۱۸۷۸ء میں "ارمغانِ دہلی" کے نام سے بطور نمونہ شائع کی، لیکن تکمیل جاری رہی۔ ۲۴ سال کی محنت کے بعد ۱۸۹۲ء میں تکمیل کو پہنچائی۔ مولوی صاحب کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ اس قدر ضخیم کتاب کو شائع کر سکیں۔ اتفاق سے ۱۸۸۸ء میں جب وہ شملہ کے اسکول میں مدرس تھے، سر آسمان جاہ وزیر اعظم حیدر آباد شملہ آئے۔ مولوی صاحب نے حاضر ہو کر اپنی تالیف کا مسودہ پیش کیا۔ وہ اس کو ساتھ لے گئے۔ مولوی سیّد علی بلگرامی کو دکھایا۔ انھوں نے بہت پسند کیا اور منظوری کی سفارش کی۔ چنانچہ دربارِ دکن سے انعام کا وعدہ کیا گیا۔ ۱۸۹۲ء میں بعد تکمیل فرہنگِ آصفیہ نام رکھا گیا۔ دولتِ آصفیہ سے پانچ ہزار روپیہ انعام ملا اور پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ گورنمنٹ پنجاب نے پانچ سو روپے انعام دیئے اور ایک ہزار روپیہ کی کتابیں خریدیں۔

اُردو لغات کی مختصر تاریخ اس "داستانِ اُردو" میں صفحہ ۴۸۲ تا ۴۸۳ کے حاشیوں پر لکھی گئی ہے۔ لغات اُردو کے آغازِ تالیف سے تقریباً دو سو برس بعد فرہنگِ آصفیہ مرتب ہوئی ہے۔ لیکن اس سے پہلے اس سے زیادہ ضخیم، مکمل اور مستند فرہنگ اُردو میں موجود نہ تھی۔ مولوی سیّد احمد صاحب دہلوی نے چار جلدوں میں ۵۵ ہزار الفاظ و محاورات تحقیق و تشریح اور سند و حوالہ کے ساتھ درج کیے ہیں۔ اب اگر اس میں کچھ خامیاں اور غلطیاں بھی واقع ہو گئیں تو ایسی فروگذاشتوں سے اور کوئی لغت بھی خالی نہیں ہے۔ 'نور اللغات' 'فرہنگ' سے ۲۵ سال بعد شائع ہوئی۔ اس میں بھی صرفی و لسانی، تحقیقی و استنادی غلطیاں بہت ہیں۔ بہر حال تقدیم تکمیل کی فضیلت مولوی سیّد احمد صاحب کو حاصل ہے۔ افسوس کہ یہ کتاب اب نایاب ہے۔ صرف پہلی اور دوسری جلد ملتی ہے۔

فرہنگِ آصفیہ، امیر اللغات اور نور اللغات کا مقابلہ

مولوی سیّد احمد صاحب نے فرہنگ آصفیہ کے دیباچے میں لکھا ہے:۔

"جس طرح جامع امیر اللغات نے 'ارمغانِ دہلی' مطبوعہ ۱۸۷۸ء میں سے لفظ (آنکھ) لے کر اس کے مشتقات اور معانی کی ہو بہو نقل بطور نمونہ چھاپی تھی، اسی طرح مؤلف

'نور اللغات' نے بھی ان کی پیروی کر کے سنہ اشاعت سے پورے تین قرن بعد فرہنگِ آصفیہ سے لفظ 'بات' اور اس کے مشتقات کی ہو بہو نقل بطور نمونہ شائع فرمائی ہے۔

یہ بڑا سخت اعتراض ہے۔ حضرت امیر مینائی اور مولوی نور الحسن نیر کاکوروی ایسے آدمی نہ تھے کہ کسی کی کتاب ہو بہو نقل کر کے اپنے نام سے چھپوا دیں۔ ہمارے سامنے فرہنگِ آصفیہ، امیر اللغات اور نور اللغات تینوں موجود ہیں، اور ہم نے لفظ (آنکھ) اور (بات) کو ان میں پڑھا ہے۔ بات یہ ہے کہ الفاظ اور محاورات کسی خاص مصنف کی ملکیت نہیں ہوتے، ہر شخص ان کو تلاش کر سکتا ہے۔ البتہ پہلی مرتبہ جمع کر کے مرتب کر دینا، مؤلف کا کارنامہ ہوتا ہے۔ لیکن لغات کی تشریح اور سند کے اشعار بلاشبہ جامع و مؤلف کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ان کی ہو بہو نقل بے شک سرقہ اور قابل الزام ہے۔

مولوی سیّد احمد کی اس فضیلت میں شک نہیں کہ انھوں نے اُردو کی سب سے بڑی اور مکمل لغت سب سے پہلے مرتب کی اور ۱۸۷۸ء میں ''ارمغانِ دہلی'' میں شائع کی۔ منشی امیر مینائی کو 'امیر اللغات' کا خیال بعد کو آیا، اور انھوں نے ۱۸۸۴ء میں لفظ (آنکھ) کا نمونہ مرتب کیا۔ امیر مینائی کے سامنے فرہنگ کا نمونہ موجود تھا۔ یقیناً اس سے استفاضہ کیا، لیکن اس کی ہو بہو نقل نہیں کی۔ بلکہ سیّد صاحب کی لغات کو خود جانچا، غیر ضروری اندراجات کو ترک کیا، ضروری محاورے جو رہ گئے تھے، ان کا اضافہ کیا، سند کے اشعار الگ تلاش کر کے لکھے۔ چند مثالیں یہ ہیں:-

آنکھوں کی سوئیاں۔ اس کی مثال فرہنگ میں نہیں ہے۔ امیر نے سند میں داغ کا شعر لکھا ہے۔

آنکھوں میں پھرنا۔ فرہنگ میں سند کے ۱۶ شعر ہیں، جن میں سے دو چار بھی کافی تھے۔ اس لئے کہ اس محاورے کے صرف ایک معنی ہیں۔ امیر مینائی نے صرف ۴ شعر لکھے ہیں۔ جن میں سے صرف ناسخ کا شعر مشترک ہے، ظفر، آتش، رشک، کے اشعار امیر نے الگ لکھے ہیں۔

آنکھوں میں تنکے چبھونا۔ اس کی سند فرہنگ میں نہیں ہے۔ امیر نے داغ کا شعر لکھا ہے۔

آنکھوں میں تلنا، تولنا۔ یہ محاورے فرہنگ میں بالکل نہیں ہیں۔ امیرؔ نے مع اسناد لکھے ہیں۔

آنکھوں میں جہاں اندھیر ہونا، تاریک ہونا، سیاہ ہونا۔ ان سب کی مثالیں امیرؔ نے بالکل الگ لکھی ہیں۔

آنکھوں میں باتیں ہونا، آنکھوں میں بہار پھولنا، آنکھوں میں خاک لگانا۔ فرہنگ میں نہیں ہیں۔ امیرؔ نے مع مثال لکھے ہیں۔

آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا، آنکھوں میں ٹھہرنا، آنکھوں میں چڑھنا۔ امیر اللغات میں نہیں ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں ہیں۔ یہ سب محاورے ہیں ان کو شامل نہ کرنا امیر اللغات کی خامی ہے۔

آنکھوں میں آنسو بھر آنا۔ فرہنگ میں بطور محاورہ درج ہے، اور اس کی یہ مثال لکھی ہے:
''آنسو شہِ مظلوم کی آنکھوں میں بھر آئے۔'' (انیسؔ) اصل میں یہ کوئی محاورہ نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ حقیقی معنی مراد ہیں۔ اس کو محاورہ گردانا غلطی ہے۔

آنکھوں میں آنا۔ اس محاورے کے دو پہلو ہیں۔ دونوں لغت والوں کو دونوں مفہوم لکھنے ضروری تھے۔ لیکن سیّد صاحب اور امیرؔ صاحب نے ایک ایک پہلو لیا ہے۔ امیر اللغات میں اس کے معنی ہیں: نظروں میں سمانا، اور مثال یہ ہے:

مری آنکھوں میں تم آؤ اگر شمشاد قامت ہو
شجر رہتا ہے اکثر سبز دریا کی ترائی میں (امیرؔ لکھنوی)

یہاں انسان کا مجسم آنکھوں میں آنا مفہوم ہوتا ہے۔ یہ صرف شاعرانہ تخیل ہے۔ اسی لئے امیرؔ مینائی نے اس خصوصیت کی تصریح کر دی ہے۔

فرہنگِ آصفیہ میں اس محاورہ (آنکھوں میں آنا) کے یہ مفہوم بتائے ہیں: جچنا، سمانا، نظر پر چڑھنا، نگاہ پر چڑھنا، خیال میں آنا، دھیان میں آنا۔ اور سند میں یہ شعر لکھا ہے:۔

نہیں آتے کسو کی آنکھوں میں
ہو کے عاشق بہت حقیر ہوئے (میرؔ)

یہاں نگاہ میں جچنا مراد ہے۔

اسی طرح نور اللغات پر بھی یہ اعتراض غلط ہے۔ مولوی نورالحسن صاحب نیّر کے سامنے بھی فرہنگ تھی، اور انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، لیکن ہو بہو نقل نہیں کی۔ فرہنگ میں 'بات' کے ۶۴ معنی ہیں۔ نور اللغات میں ۶۸ ہیں۔ ان کی اسناد کے چند شعر سیّد صاحب سے لیے ہیں، باقی بطور خود تلاش کیے ہیں۔

فرہنگِ آصفیہ میں یہ کمی ہے کہ بات کے سو سے زیادہ محاورے لکھے ہیں، لیکن سند کے اشعار خال خال کہیں لکھے ہیں، کالم کے کالم اشعار سے خالی ہیں۔ فقروں کی مثالیں بھی کم ہیں۔ لفظ بات کے دس دس معنی نمبروار یکجا لکھ دیے ہیں، اور مثال کہیں نہیں لکھی۔ نور اللغات میں اکثر سندیں اشعار میں ہیں۔ کہیں فقرے لکھ دیے۔ دونوں پر مختصر تبصرہ کیا جاتا ہے:-

فرہنگ آصفیہ میں لفظ (بات) کے معنی بتانے کے بعد اس کے مشتقات و محاورات لکھے ہیں۔ ان میں (الف) سے شروع ہونے والے محاورات صرف تین ہیں، یعنی بات اٹھانا، بات الٹنا، بات آنا۔ ان کے بعد کا محاورہ (بات بات میں) لکھا ہے۔ لیکن نور اللغات میں ان تین محاورں کے علاوہ ۲۷ محاورے اور لکھے ہیں۔ مثلاً بات آن پڑنا، بات آگے آنا، بات آئی گئی ہونا، بات اٹکا رکھنا، بات اٹکنا، بات اُڑنا، بات اُڑانا وغیرہ۔ یہ سب محاورے ہیں۔ فرہنگ میں ان کا نہ ہونا ضعفِ تالیف ہے۔

نور اللغات میں بھی تالیف کی خامیاں بہت ہیں۔ لغات کی تحقیق و تشریح میں غلطیاں کی ہیں۔ مفہوم اور مثالوں میں سہو ہوا ہے۔ مثلاً بات کے متعلق ایک محاورہ لکھا ہے، بات آنکھوں سے سننا۔ اس محاورے کو بات سے کچھ تعلق نہیں، بلکہ آنکھوں کا محاورہ ہے۔ اس میں "بات سننا" اصلی معنوں میں ہے (آنکھوں سے) کا مفہوم ہے، خوشی سے، یا ادب سے۔ اسی طرح ایک محاورہ بتایا ہے، "بات کا اعادہ کرنا، بات کو دہرانا، بات کو پھر کہنا۔" یہ بھی محاورہ نہ ہوا۔ معمولی بات ہوئی۔

'ک' کے متعلق لکھا ہے کہ "آخر کلمات میں معنی مصدری کا فائدہ دیتا ہے، جیسے

بیٹھک، روک، ٹوک۔'' حالانکہ ان الفاظ میں 'ک' یکساں نہیں ہے۔ بیٹھک میں معنی مصدری کے لئے بڑھایا گیا ہے، لیکن روک اور ٹوک میں اصلی ہے، اضافہ نہیں ہے۔ 'پرداز اڑانا' (طرز سیکھنا) اس کی مثال میں قلق کا یہ شعر لکھا ہے:۔

سیکھ لے نالۂ جانکاہ سے طرزِ نالہ　　　　رنگِ رُخ سے مرے پرداز اڑائے بلبل

حالانکہ یہاں پرداز (دال سے) نہیں ہے، بلکہ پرواز اُڑنے کے معنی میں ہے، یعنی میرے رنگِ رُخ سے اُڑنا سیکھے۔ اگر پرداز (بمعنی طرز) ہوتو مضمون ناتمام رہتا ہے۔ کس چیز کی طرز؟

غرض امیر اللغات اور نور اللغات دونوں پر سیّد احمد صاحب کا یہ الزام غلط ہے کہ فرہنگِ آصفیہ کی ہو بہو نقل کی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیّد صاحب نے سالہا سال کی محنت سے فرہنگ تیار کی تھی، اور چاہتے تھے کہ

اقلیمِ لغت میری قلمرو سے نہ جائے (۱)

اس لیے انھوں نے حضرت امیر و نیر کے لغات کو اپنی مِلک پر دست درازی تصور کیا۔ شکر ہے سیّد صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے ریاض کو سرسبز دیکھ لیا اور اپنی ریاضت کا پھل پا لیا۔ اب یہ زمانے کی ''کارستانی'' رہی کہ امیر اللغات تمام نہ ہو سکی، فرہنگِ آصفیہ باوجود مکمل و شائع ہونے کے، اب نایاب ہے، اور نور اللغات بازار میں سب کی ملکیتوں پر قبضہ کیے ہوئے ہے۔

مولوی سیّد احمد کا طرزِ تحریر: مولوی صاحب نے دو درجن کتابیں مختلف عنوانوں اور موضوعوں پر لکھی ہیں۔ ان میں دو چیزیں نہایت نمایاں ہیں۔ ایک عورتوں کی تعلیم و تربیت، دوسرے زبان اُردو اور محاورۂ دہلی کی اشاعت۔ اہلِ دہلی کو ایک تو اپنی زبان و محاورہ سے فطری گرویدگی تھی، دوسرے ہر تصنیف میں اس کی اشاعت کا شوق، تیسرے اس کے تحفظ و حمایت کی ضرورت۔ لکھنؤ اور پنجاب کی طرف سے دہلی کی مرکزیت پر حملے

---

(۱) میر انیس کا مصرع ہے:۔ ''اقلیمِ سخن میری قلمرو سے نہ جائے

ہو رہے تھے، اور دہلی والے لکھنؤ کی بولی کو بھی ٹکسال باہر سمجھتے تھے۔ اس لیے دہلی کے ادبی مصنفین نے اپنی کتابوں اور مقالوں میں مقامی بول چال اور محاورے کثرت سے استعمال کیے۔ جن لوگوں نے علوم وفنون کی کتابیں لکھیں، انھوں نے موضوع و مضمون کے مطابق زبان اختیار کی۔

ڈپٹی نذیر احمد کی زبان و اسلوب کا ذکر آچکا ہے۔ ان کے ہم عصروں میں میر ناصر علی خاں نے کم، اور مولوی سیّد احمد اور میر ناصر نذیر فراق نے زیادہ دہلی کا روزمرہ لکھا۔ پھر آغا شاعر اور راشد الخیری نے اسی پر اپنی تحریر کی بنیاد رکھی، راشد الخیری نے ایک خاص اسلوب ایجاد کر کے اپنا انفرادی رنگ پیدا کرلیا۔ اب عصر حاضر کے ''قدیم دہلوی'' آغا حیدر حسن اور مرزا فرحت اللہ بیگ، اور ''جدید دہلوی'' خواجہ محمد شفیع وغیرہ اسی طرز میں لکھتے ہیں۔

یہ وصف اہل دہلی کے ساتھ خاص نہیں ہے، اہلِ لکھنؤ بھی ان کے ہم پلّہ ہیں۔ مولوی عبدالحلیم شرؔر، پنڈت سرشارؔ، مرزا ہادی رسواؔ، منشی سجاد حسین، مضمون نگاران ''اودھ اخبار'' و ''اودھ پنچ''، خواجہ عبدالرؤف عشرت وغیرہ نے لکھنؤ کا روزمرہ اور محاورہ برتا۔

یہ اسلوب بلاشبہ نہایت دلکش و دلآویز اور ضروری و ناگزیر ہے۔ زبان و محاورہ کی رفتار، ترقی، اشاعت اور استناد کے لیے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں۔ لیکن موجودہ ''لامرکزیت'' کے دور میں یہ نکتہ پیشِ نظر رکھنے کے لائق ہے کہ زبان و محاورہ تحریر و طباعت میں آکر جمہوری حیثیت اور افادی شان پیدا کرلیتا ہے۔ صرف ''مقامی'' نہیں رہتا، بلکہ ''بین الاقوامی'' بن جاتا ہے، اور اب اس کا مقصد حظِ نفس سے زیادہ نشاطِ عام ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ الفاظ، محاورات اور امثال جو مقامی طور پر بھی کم استعمال ہوتے ہیں، باہر بالکل نہیں سمجھے جاتے، اور پنجاب اور دکن کے لوگ ان سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ان میں باوجود صحت و فصاحت کے، ایک قسم کی ''غرابت'' پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی کثرت پسندیدہ نہیں رہتی۔

مولوی سیّد احمد دہلوی نے بھی دہلی کی زبان بہتر سے بہتر لکھی ہے۔ محاورے برمحل،

فقرے برجستہ، عبارت سلجھی ہوئی، مضمون واضح اور مدلل لکھتے ہیں۔ان کی تحریروں کے دو ایک نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

ا۔فرہنگِ آصفیہ کے مندرجہ لغات کے متعلق کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

''تذکیر وتانیث کی تمیز اہلِ دہلی ولکھنؤ کے موافق اس میں موجود ہے، زبانوں کا فرق اور ان کی اصلیت کا پتا اس سے لگتا ہے، عام محاورے اس میں درج ہیں، خاص خاص محاورے اس میں داخل ہیں، فقیروں کی صدائیں اس میں سن لو، سودے والے کی آوازیں اس میں دیکھ لو، دل لگی اس میں ہے، ظرافت اس میں ہے، بعض بعض موقعوں پر جواریوں، ٹھگوں، دلّالوں، چابک سواروں، بدمعاشوں، مختلف پیشہ وروں کے وہ ملتے جلتے روز مرّے جن کے نہ جاننے سے اکثر انسان دھوکا کھا جاتا ہے، بہ ترتیب حروف اس کتاب میں شامل ہیں، جو الفاظ جس درجے کے آدمیوں میں مروّج ہے، وہ انھیں کے نام سے لکھا گیا ہے۔عورتوں کی بولی اس میں نہیں چھوڑی، جاہلوں کی باتوں سے اس میں پرہیز نہیں کیا، ہاں اگر چھوڑا ہے تو مغلّظات اور فحش چھوڑا ہے..........

قصہ مختصر، ہم نے نہ عیب چینوں کا خوف کیا، نہ خردہ بینوں کی پروا، جیسی بُری یا بھلی اپنی پیاری مادری زبان کی خدمت بن پڑی وہ کردی۔آیندہ جو اس کام کے اہل اور سچے ہوا خواہ ہوں گے وہ ترقی دے لیں گے۔

قطعہ

اے اہلِ خیر کچھ تو اِدھر بھی کہ بیٹھے ہیں — کب سے دعائے خیر کے امیدوار ہم
جو کچھ بنا کسی سے وہی چھوڑا بہر یاد — اپنی لغات چھوڑ چلے یادگار ہم

۲۔محاکمہ مرکز اُردو: مولوی سیّد احمد صاحب نے یہ طویل مضمون ۱۲ر فروری ۱۹۱۱ء کو لکھا تھا۔جو کتابی صورت میں شائع ہوا۔وجہ تحریر یہ تھی کہ منشی وجاہت حسین جھنجانوی اڈیٹر رسالہ ''اصلاحِ سخن'' نے دہلی کے بعض محاوروں پر اعتراض کر کے اس کو مرکز تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔اس کے جواب میں مولوی صاحب نے یہ ''محاکمہ'' لکھا تھا۔نہایت دلچسپ تحریر ہے۔دہلی کی مرکزیت کے سلسلے میں دہلی ولکھنؤ کے محاوروں کا

فرق، اس کی مثالیں اور لطیفے، اُردو زبان کی مختصر تاریخ، دہلی، لکھنؤ، لاہور کے مصنفوں اور ان کی تصانیف کا ذکر، بہت سی دلچسپ باتیں دورانِ کلام میں آگئی ہیں۔ اگرچہ طولِ کلام اور تکرارِ بیان سے ذرا الجھن پیدا ہوتی ہے۔ نمونہ کے طور پر جوابِ اعتراض کا ایک حصہ درمیانی تفصیلات کو حذف کر کے درج کیا جاتا ہے:۔

''انھوں نے لکھا ہے کہ اہلِ دہلی زیادہ محبت کے واسطے ''جان چھڑکنا'' بولتے ہیں، اور آگ لگ جانے کے واسطے ''پھول پڑا'' استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی اصل عبارت یہ ہے کہ ''وہ زمانہ دور نہیں کہ دہلی و لکھنؤ کے ایجاد کردہ الفاظ لوکل بولی سے زیادہ وقعت نہیں رکھیں گے۔ مثال کے طور پر دہلی کے ایک آدھ محاورے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جب کسی کو کسی سے زیادہ محبت ہو تو دہلی والے کہا کرتے ہیں کہ فلاں آدمی اس آدمی پر جان چھڑکتا ہے۔ جان کیا ہوئی گویا گلاب یا کیوڑے کا عرق ہے۔ اب علمی دنیا کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے اتباع کی وجہ سے بے حد محبت کرنے کا مفہوم جان چھڑکنے سے ادا کرے۔ سیدھی بات کیوں نہ کہی جائے کہ ہم اس آدمی سے بے انتہا محبت کرتے ہیں..........

اس محاورے کا لطف اور اس کی عدم واقفیت تو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ لیکن پہلے انھیں کی عبارت میں سے دو ایک فقرے پیش کر کے الزامی جواب دیتے ہیں اور ان کی طرف سے یہ مصرع پڑھتے ہیں۔

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

''کانوں کا مزا نہیں دیتے'' کان نہ ہوئے کوئی زبان ہوئی جو ذائقے سے تعلق رکھے۔ ''صورتیں فسانہ ہو گئیں۔'' صورتیں نہ ہوئیں کوئی ذکر اذکار ہوئے جو فسانے سے نسبت دی گئی۔ ''دنیا کی ہر چیز انقلاب پسند ہے۔' لفظِ پسند کو ملاحظہ فرمایئے اور ہر چیز کو جو ذی روح بن کر انقلاب پسند فرماتی ہے۔

خیر ان باتوں کو جانے دیجئے۔ 'جان چھڑکنا' اول تو یہ فرمایئے کہ آپ نے اپنے کانوں سے سنا ہے؟ کہاں سنا ہے؟ اور کس سے سنا ہے؟ مردوں سے یا عورتوں سے

یا صرف کتب لغات میں دیکھا ہے یا کسی استاد کے کلام میں نظر پڑا ہے؟ بیشک جان چھڑکنا بولا جاتا ہے، مگر عورتوں میں اور وہ بھی اولاد یا مثل اولاد کسی نہایت قریبی رشتہ دار کی محبت میں۔ نہ کہ عام محاورہ ہے اور ہر جگہ فرطِ محبت کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ اگرچہ عورتیں اس کی اصلیت سے واقف نہیں مگر اس موقع کے واسطے اس سے بہتر اور پُر اثر لفظ ملنا مشکل ہے۔ جان کے لغوی معنی روح ہیں اور اطبا کی اصطلاح میں جوہرِ لطیف یا بخارِ لطیف۔ ان دونوں صورتوں میں جان کا سیال ہونا پایا جاتا ہے اور سیال چیز کا چھڑکنا ممکنات سے ہے اور اس جگہ فرطِ محبت سے جاں نثار کرنے کے معنی ہیں۔ اب ایک اور طرح سے سنئے۔ اُردو محاورے میں جان بمعنی خون بھی آجاتا ہے۔ جیسے خوف کے موقعے پر جہاں دم خشک ہونا بولتے ہیں وہاں جان سوکھنا بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ آپ نے کام سے جان چرانا بھی سنا ہوگا۔ بھلا اس جگہ جان نہ ہوئی کوئی گٹھری یا جوکھوں ہوئی کہ کوئی چرا کر لے جائے گا۔

حالانکہ صرف اسی کی ذات سے متعلق بولتے ہیں، جو جان بوجھ کر کام سے بچتا ہے۔ اب دیکھئے یہ گلاب کا عرق ہے یا کیوڑہ۔ اور لیجئے جانفشانی فارسی کا محاورہ ہے اور اسی کا یہ ترجمہ ہے۔ اہل فارس پر آپ کا اس موقع کے لئے فرمایئے کیا اعتراض ہے۔ اسی جگہ آپ فرماتے ہیں ''کہ اب علمی دنیا کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے اتباع کی وجہ سے بے حد محبت کرنے کا مفہوم جان چھڑکنے سے ادا کرے۔ سیدھی بات کیوں نہ کہی جائے کہ ہم اس آدمی سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔'' اگر آپ بے انتہا محبت یا صرف کسی کے ساتھ محبت کرنے کے دوسرے معنی پر توجہ فرماتے تو ہرگز ہرگز یہ لفظ زبان پر نہ لاتے۔ ایسی ہی باتیں آدمی کو پابندیٔ زبان سے آزادی حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ہمارے نزدیک علمی دنیا کو سب سے زیادہ زباندانی کی ضرورت ہے ورنہ مفہوم کچھ ہوگا اور سمجھا کچھ جائے گا۔

اب دوسرے محاورے اور لفظ کو بھی ملاحظہ فرمایئے! آپ ارشاد کرتے ہیں کہ ''اسی طرح کسی کے گھر میں آگ لگ جانے کا مفہوم اہلِ دہلی یوں ادا کرتے ہیں کہ فلاں

شخص کے گھر میں پھول پڑا کہ سارا گھر جل کر خاک ہو گیا اور یہاں خیر سے انگارے کو ابھی تک پھول ہی سمجھے بیٹھے ہیں۔ صاف بات کیوں نہ کہی جائے کہ فلاں آدمی کا گھر جل گیا۔" مہربانی فرما کر اول تو یہ ارشاد کیجئے کہ آپ کبھی دہلی میں آئے بھی ہیں یا نہیں؟ اگر آئے ہیں تو آپ کو بگوشِ دل اس محاورے کے سننے کا اتفاق ہوا ہے یا نہیں؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کسی کتاب یا کبھی کسی شعر میں دیکھ لیا ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس محاورے کو عورتیں بولتی ہوں گی یا مرد۔ اگرچہ آپ کا یہ فقرہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ اس کو وہ لوگ بدشگونی سمجھتے ہیں۔ یعنی یہ محاورہ ہو نہ ہو عورتوں کا ہے۔ کیونکہ یہی فرقہ اپنی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکالتا جس سے بدشگونی ہو۔ مثلاً "خیر سے۔" آپ نے ہی کئی جگہ برتا ہے۔ "خدا کی سنوار۔" بجائے خدا کی مار آپ نے سنا ہی ہوگا۔ "تمھیں خدا کی نیکی۔" بھی گوش زد فرمایا ہوگا۔ "وہ جُمی جَم گھر میں ہیں۔" یہ بھی کبھی نہ کبھی ضرور گوش آشنا ہوا ہوگا۔ اسی طرح پھول پڑنا بھی ظاہر کر رہا ہے کہ اس کو عورتیں ہی بولتی ہوں گی۔ مگر آپ نے اپنے ثبوت میں مرد و زن سب کو لے لیا۔ اور بہت بڑی ناواقفیت ظاہر فرمائی۔ اب ہم سے سنئے۔ دہلی میں کوئی بھی اس محاورے کو اب نہیں بولتا اور نہ پہلے یہ محاورہ شہر کے اندر بکثرت بولا جاتا تھا۔ البتہ قلعہ معلیٰ میں بیگماتوں نے اس کا کسی قدر استعمال کر رکھا تھا۔ لیکن عام آگ لگنے کے واسطے نہ تھا۔ اگرچہ رنگین کے ایک شعر میں یہ محاورہ موجود ہے۔ مگر اس میں جو لفظ 'گوئیاں' آ گیا ہے یہ اس امر میں شبہ ڈالتا ہے۔ کیونکہ گوئیاں خاص پوربی محاورہ ہے جو آج تک دہلی کیا اطراف دہلی میں بھی نہیں بولا جاتا۔ وہ شعر یہ ہے۔

بھول کر بھی جو کسی اور کے گھر پھول پڑے
تو الٰہی کرے گوئیاں مرے گھر پھول پڑے

عجب نہیں جو یہ شعر انشاء اللہ خاں کا ہو۔ اور اگر بالفرض رنگین کا مانا جائے تو اس زمانے کا ہوگا جس زمانے میں سعادت یار خاں رنگین لکھنؤ میں جا کر اپنے پگڑی بدل بھائی انشاء اللہ خاں کے ہاں ٹھیرا کرتے تھے۔ اور باہم دونوں کی ریختیوں کا موازنہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن رشک لکھنوی نے اس کو صاف کر دیا ہے۔ چنانچہ اس کا شعر ہے۔

اہلِ جنت کو ہو جنت پہ جہنم کا خیال
پھول اگر پڑ جائے میری آہِ آتش بار کا

اس سے ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ کسی شاعر نے بھی نہیں باندھا۔ جن لوگوں نے مردانہ زبان کا نام ریختہ اور بیگماتی بول چال کا نام ریختی رکھ چھوڑا ہے اُنھوں نے اس زمانے میں شاذ و نادر باندھا ہے۔ اہلِ لکھنؤ میں سے بحرؔ اور انشاءؔ نے صرف ایک ایک شعر میں استعمال کیا ہے۔ اور اہلِ دہلی میں سے نکہتؔ اور رنگینؔ نے۔ ان کے سوا ذوقؔ، ظفرؔ، مومنؔ، دردؔ، غالبؔ کسی نے بھی اس کا استعمال نہیں فرمایا۔ اگر یہ محاورہ مروّج خاص و عام ہوتا تو کوئی بھی اسے نہ چھوڑتا۔ اہلِ لغت کو چونکہ ہر زمانے کا محاورہ دکھانا منظور تھا انھوں نے بیشک داخلِ لغات کر دیا۔ محاورہ کی خوبی میں شبہ نہیں۔ لیکن آپ نے بے وقت مثال دی۔

پھول کے لفظ پر آپ نے طعنہ مارا تھا، یہاں وہ طعنہ بیکار ہوا بلکہ آپ نے جو لکھا ہے۔ ''یہاں خیر سے انگارے کو ابھی تک پھول ہی سمجھے بیٹھے ہیں۔'' سبحان اللہ! کیا اچھا خیال ہے۔ انگارے کی تعریف بھی جناب کو معلوم نہیں۔ کیا انگارا اُڑ کر جا سکتا ہے؟ یا انگارا اُڑ سکتا ہے؟ اگر آپ ان الفاظ کے محل و موقع سے واقف ہوتے تو اس جگہ چنگاری، شرارہ، یا آگ کا پتنگا تحریر فرماتے۔ دیکھئے اہلِ زبان اور مقلّدِ زبان میں کس قدر فرق ثابت ہوا۔ اب دوسری طرح سے اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ جب کوئلے جلتے وقت چٹختے ہیں تو ان کو آپ کیا فرمائیں گے۔ کیا ان کے روشن ذروں کو پھول یا چنگاری یا پتنگے سے تعبیر نہیں کریں گے؟ کبھی آپ نے چراغ کو بھڑکتے ہوئے دیکھا ہوگا تو اس وقت جو روشن پتنگا سا یا اس کی جلتی ہوئی ٹیم نیچے گرتی ہے تو اسے بھی پھول کہتے ہیں یا نہیں؟ کیا توا جس وقت جگمگ جگمگ کرتا ہے تو اسے تو اہنسا کسی وجہ سے کہتے ہیں یا نہیں۔ آتش بازی کے پھول تو آپ نے ضرور سنے ہوں گے۔ ان کو انگارا کیوں نہیں کہا۔ پھلجھڑی، ہتھ پھول، مہتابی، انار، جائی جوئی، بتاسے وغیرہ آتش بازی میں نظر اقدس سے گذرے ہوں گے۔ ان میں سے انگارے اچھلتے ہیں یا پھول نکلتے ہیں۔ تیسری مثال اور لیجئے۔ منہ سے پھول جھڑنا کیوں بولتے ہیں۔ منہ نہ ہوا کسی باغ کا بوٹا یا گلِ گلزار وجاہت ہوا۔

میر ناصر علی خاں دہلوی: ۱۸۴۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا ریاست بھوپال کی ریزیڈنسی میں میر منشی رہے۔ نانا فوج میں صوبہ دار تھے۔ والد مولوی سیّد ناصر الدین ابوالمنصور اعلیٰ پایہ کے ادیب تھے۔ بڑے بھائی میر نصرت علی، 'نصرت الاخبار' کے مالک اور اڈیٹر تھے۔ میر ناصر علی نے دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد ۱۸۶۷ء میں نان پارہ ضلع بہرائچ میں مدرس ہوگئے۔ وہاں سے آپ محکمہ 'نمک میں لے لئے گئے۔ اس محکمہ میں ۴۰ سال نیک نامی کے ساتھ خدمت کرکے پنشن لی۔ خدمت سرکاری سے سبکدوش ہونے کے بعد ریاست پاٹودی، ضلع گڑگاؤں میں دیوان ہوگئے۔ گورنمنٹ نے 'خان بہادر' کا خطاب دیا۔ ۱۹۱۱ء میں دربار تاجپوشی کے موقع پر جب دہلی کے قلعۂ معلیٰ میں عجائب خانہ مرتب کیا گیا تو اس کے اہتمام میں میر ناصر علی خاں بھی شریک تھے۔ پھر ملک معظم جارج پنجم کی خدمت میں بھی باریاب ہوئے۔ طویل عمر پاکر ۱۹۳۳ء ﴿ ۱۳۵۲ھ ﴾ میں رحلت فرمائی۔ اتفاق سے ان کا نام ہی ان کی تاریخِ وفات ہے:-

"میر ناصر علی خاں" (۱۳۵۲ھ)

ادبی خدمات: میر ناصر علی خاں ان ادیبوں میں ہیں جو صرف ایڈیٹری اور مضمون نگاری کے سبب سے نامور ہوئے۔ انھوں نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ لیکن زبان وادب کا فطری ذوق رکھتے تھے۔ آغازِ شباب سے مضمون نگاری شروع کردی تھی۔ اُردو اخبارات ورسائل میں مقالہ نگاری کا صحیح مذاق سرسیّد کے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' (جاری شدہ ۱۸۷۰ء) سے پہلے پیدا نہ ہوا تھا۔ سرسیّد کی تحریروں نے انشاپردازی میں نئی روح پھونکی۔ میر ناصر علی خاں نے اپنے لیے اخبار ورسائل کی ادارت کو اُردو کی خدمت کا ذریعہ تجویز کیا۔ چنانچہ "تیرھویں صدی"، "زمانہ" وغیرہ پرچے نکالے اور ان کے ذریعہ سے صحیح زبان، دلکش اسلوب اور پاکیزہ خیالات کے نمونے پیش کیے۔ آخر میں 'صلائے عام' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا، جو ان کی وفات تک جاری رہا۔ اسی پرچے سے اس کے مالک ومدیر کی ساری شہرت ہے۔ "صلائے عام" اور میر ناصر علی کے مقالات کی تمام ادبی دنیا میں دھوم تھی۔

میر ناصر علی خاں لکھنؤ میں بھی رہے تھے، اور وہاں کی زبان کا اپنی زبان سے مقابلہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ دونوں کا فرق ایک مضمون میں بتاتے ہیں:۔

"دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو فرق میرے ذہن میں آیا، یہ ہے کہ دہلی میں سقہ جوئل پر مشک بھر رہا ہے، دوسرے سقے سے جس زبان میں باتیں کر رہا ہے اسی زبان میں لال قلعہ تک باتیں سنتے چلے جائیے۔ اس لئے دہلی کی زبان میں بے تکلفی ہے۔ لکھنؤ میں خاص کی زبان اور ہے عوام کی زبان اور۔"

میر صاحب شاعر نہ تھے، لیکن نثر میں شاعری کرتے تھے۔ یہ "نثر کی شاعری" مولوی عبدالحلیم شرؔر نے ایسی کی کہ کمال کی حد ختم کردی، لیکن اس کی ایجاد و ابتدا کرنے والوں میں میر ناصر علی خاں بھی تھے۔ شرؔر کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نئے خیالات اور خیال آفرینی کے اسلوب، انگریزی انشا پردازوں سے لیے، اور ان کو اُردو زبان کے طرزِ ادا کے ساتھ، اور شعرائے ہند کے مذاق ادب کے مطابق مرتب کر کے پیش کیا۔ یہی کام ناصر علی خاں اور عبدالحلیم شرؔر سے پہلے علامہ محمد حسین آزادؔ نے "نیرنگِ خیال" میں کیا تھا۔ لیکن وہ "تمثیلی رنگ" نہ ہونے کے سبب سے ایک صنفِ خاص تھا۔ شرر اور میر صاحب صرف تمثیل کے پابند نہ تھے۔ نئی بات نئے انداز سے لکھنی چاہتے تھے پاکیزہ خیالات پیدا کرنے چاہتے تھے۔ میر ناصر علی خاں "صلائے عام" میں لکھتے ہیں:۔

"صلائے عام میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں خیال کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ زبان کے قائل تو ایسے لوگ بھی ہیں جو لیاقت علمی سے خالی ہوں، مگر خیال کی داد دینے کے لئے علم ولیاقت کی ضرورت ہے۔ اس لئے اہلِ علم وکمال میں خیال کی خوبی کو زبان کی خوبی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ زبان کے سمجھنے والے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ زبان کا سمجھنا آسان ہے۔ مضمون پیدا کرنے میں جو خونِ جگر کھانا پڑتا ہے اس کے سمجھنے کے لئے دل ودماغ چاہئے اور دل ودماغ بختِ عرفؔی (۱) کی طرح ہر وقت بازار میں نہیں ملتے۔"

---

(۱) اس فقرے کے حوالے میں میر صاحب نے حاشیہ پر عرفؔی کے قصیدے کا یہ مطلع درج کیا ہے:۔

جہاں بگشتم و دردا بہیچ شہر و دیار نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

میر صاحب کا طرزِ تحریر بھی یہی ہے کہ زبان شستہ وصاف، سادہ سلیس لکھتے ہیں۔ لفظوں اور ترکیبوں میں استعارے پیدا نہیں کرتے، بلکہ پوری بات یا سارے مضمون کو خیالی و مجازی بنا دیتے ہیں۔ دو چار نمونے یہ ہیں:۔

ا۔ ''عُرس و سالگرہ'' صلائے عام کا مضمون ہے۔ شروع میں تقریب تحریر بیان کردی ہے۔ مختلف حصہ نقل کیے جاتے ہیں۔

اخبار والے جن کو سخن گستری کا شوق ہے، سال کے انجام و آغاز کے دو مضمون ذرا زور سے لکھتے ہیں۔ اتفاق سے مجھے ان دنوں دو مضمون علیحدہ علیحدہ لکھنے کی فرصت نہیں۔ ایک مضمون کی بچت نکال کر سال کے انجام و آغاز کو میں عُرس و سالگرہ سے تشبیہ دیتا ہوں۔ ۳۱ دسمبر کو تو گویا پیر گردوں کا عُرس سمجھئے اور یکم جنوری کو گردشِ روزگار کی سالگرہ۔

ہر سال کا اخیر میری نگاہ میں زمانہ کا عُرس ہے کہ جس طرح اولیاء اللہ کو کہتے ہیں کہ فنا نہیں۔ ان کا ہماری نظر سے غائب ہونا ''وصال'' سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک سال کا غائب ہونا جزو کُل میں مل جانا ہے۔ اسے وصال نہیں تو اور کیا کہیے؟ ورنہ زمانہ تو وہی ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ گئے ہوئے زمانے کو آپ فاتحہ خیر سے یاد کریں کہ حاصل عُرس بزرگان یہی ہے اور گردشِ روزگار کی سالگرہ منائیں کہ دنیا کا مدار اسی پر ہے۔

لو ابتدا سے ہم کہیں اب داستانِ عشق
آخر شبِ فراق کو تو انتہا نہیں

اتفاقِ زمانہ سے پیر گردوں کی سال گرہ کا دن یہی تھا جو گردشِ روزگار کی سال گرہ کا دن ہے کہ آغازِ عالم میں تمام کائنات ایک ہی وقت کُنْ فَیَکُوْنُ سے پیدا ہوئی، پیر گردوں کی سال گرہ کی یادگار کہکشاں آسمان پر موجود ہے۔

دوستانِ رفتہ کی روداد کس سے پوچھئے
بات کے لائق کوئی شہرِ خموشاں میں نہ تھا

سال گرہ دراصل کوئی عقدۂ لاینحل نہیں۔ حسین وعدہ کی گرہیں خضر کے رشتۂ عمر سے زیادہ

لگاتے ہیں۔ گو قطرۂ اشک کی شکل گرہ سے زیادہ متشابہ ہے۔

غفلت شریکِ حال تھی پہلے بھی حسن کے

یوسف کنوئیں میں دیدۂ یوسف میں خواب تھا

پھر بے ثباتیِ عالم کی مثالیں بیان کر کے مضمون کو ان فقروں پر ختم کرتے ہیں:۔

انگریزی میں کسی شاعر کا مضمون ہے کہ حسن اس لئے دلفریب ہے کہ ہماری ہستی کی طرح بے ثبات ہے۔ اور علم کی قدر ہماری نگاہ میں اس لئے ہے کہ اس میں کمال مشکل ہے۔ مرنے کے بعد کسی چیز کو کمال حاصل ہو تو عالمِ اسباب میں کمال کی قدر نقص سے ہے اور ہنر کی قدر عیب سے۔ بیداری کی قدر غفلت سے اور زندگی کی قدر موت سے۔ بچے جن کھلونوں پر جان دیتے ہیں جوان انھیں پھینک دیتے ہیں۔ اور جوانوں کو جو باتیں عزیز ہیں بوڑھے انھیں فضول سمجھتے ہیں۔

لیکن مجھ سے پوچھیے تو اس عالم کی مختصر سے مختصر زندگی مرنے کے بعد قیامت تک زندہ رہنے سے کہیں اچھی ہے اور اس دارِ فانی کی انجمن عالمِ بقا کے وعدوں سے جن کے پورا ہونے کا حال معلوم نہیں (آگے کیا عرض کروں)۔

چھوٹی سے چھوٹی رات بھی اچھی ہے وصل کی

چھوٹے سے چھوٹا دن بھی ہے اچھا بہار کا

میر صاحب کے آخری خیال سے آج کل کے انقلاب پسندوں اور مادّہ پرست نوجوانوں کو سند ہاتھ آتی ہے۔

۲۔ "خیال بمقابلہ زبان" اس مضمون کے بعض فقرے زبان و خیال کے متعلق اوپر نقل کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد میر ناصر علی خاں انگریزی انشا پردازوں کے چند خیالات پیش کرتے ہیں:۔

اور ملکوں کی زبانوں میں خیال کی فکر زیادہ رہتی ہے کہ ہر بات میں نیا مضمون پیدا ہو۔ آئینہ کو ہم حیران باندھنے سے زیادہ نہ کہہ سکے۔ یونان کے کسی شاعر نے اس میں ایک نئی بات پیدا کی کہ کوئی حسین جس کی جوانی کا انحطاط قریب ہے زہرہ کے مندر پر آئینہ

چڑھانے گئی۔ چڑھاتے وقت کہتی ہے کہ آئینہ کی اب مجھے ضرورت نہیں۔ جیسی میں تھی وہ صورت تو اب آئینے میں کاہیکو نظر آئے گی۔ جو شکل ہونے والی ہے اس کو دیکھ کر کیا کروں گی؟ جوانی کے بعد جو میری صورت ہوگی وہ مجھ سے نہیں دیکھی جائے گی۔ جیسی تھی پھر دکھائی دے چکی۔ اب آئینے کو رکھ کر کیا ہوگا؟ یہی آئینہ جو حسینوں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا جوانی کے بعد اس کی شکل سے نفرت ہو جائے گی۔

ایک کم سن لڑکی جو اب تک گڑیوں سے کھیلتی رہی صغیر سنی کی شادی میں از روئے رسم مندر میں پوجا کے لئے گئی۔ اور لوگ جہاں چڑھاوے کی چیزیں لے گئے تو یہ اپنی گڑیاں ساتھ لیتی گئی کہ اب ان سے کھیل چکی، ان کو چڑھانے کے لئے لائی ہوں۔ دیکھی جی جن کو گھر کے جھگڑوں سے فرصت ہے گڑیوں سے کھیلیں گی۔ شادی کے بعد کھیلنا معلوم۔

عقل نے عشق سے کہا کہ اکیلے تو میں تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں کہ ایک کی لڑائی ایک سے برابر کی لڑائی ہے مگر تیرے ساتھ اگر دخترِ رز ہو گئی تو پھر تیرا مقابلہ مشکل ہے۔

شکاری بھاگتے ہوئے شکار کے پیچھے پیچھے کوہ و بیابان میں دوڑتے ہیں۔ مگر مارا ہوا جانور مل جائے تو اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔ یہ حال عاشق ہرجائی کا ہے جو گھر کی پارسا عورت کو چھوڑ کر بازار میں پھرتا ہے۔

ایک خونی کسی دیوار کے نیچے سو رہا تھا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ کوئی اس سے کہہ رہا ہے کہ یہاں سے بھاگ۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہاں سے اٹھ کر بھاگا اور اس کے بھاگتے ہی دیوار گری۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ خدا نے مجھ پر بڑا رحم کیا کہ گرتی دیوار سے بچالیا۔ ورنہ دب کر مر جاتا۔ آواز آئی کہ ہم نے اس موت سے اس وقت تجھے بچا لیا کہ یہ آسان تھی، تجھے اس تکلیف کی موت پہ سب کے سامنے مارنا منظور ہے جسے پھانسی کہتے ہیں۔ دیوار سے دب کر مرنا مرگِ ناگہاں میں سمجھا جاتا، تیرے اعمال کی سزا میں مارنے کے لئے تجھ کو چھوڑا ہے تاکہ جلاد کے ہاتھ سے مارا جائے۔

ایک بچے کی قبر پر کندہ ہے کہ میرے ماں باپ میرے لئے نہ روئیں کہ

اگر میں نے زندگی کا لطف نہیں دیکھا تو اُس کی مصیبتیں بھی نہیں اٹھائیں۔ ادھر کی کسر اُدھر نکل گئی۔

کسی کے غم میں موت سے کوئی کہہ رہا ہے کہ تو مرنے والے کے ساتھ تو زبردستی کر گئی۔ بھلا میرے ساتھ تو کر۔ کہ مرنے والے کی یاد چھین تو لے؟

یہ چند خیال میں نے اہلِ علم وکمال کی طبع آزمائی کے لئے جمع کر دیئے کہ ان پر مضمون لکھیں۔ یہ خیال نظم کی خوبیاں مانگتے ہیں۔ جن سے میں عاری ہوں۔ شعراء اُردو ان کو نظم میں ادا کریں تو ان کا لطف دوبالا ہو جائے۔ میں نے بُری بھلی اُردو میں ان کا مطلب ادا کر دیا۔ اب آپ جانیں اور آپ کی نازک خیالیاں۔

کیوں خاک میں ملاتے ہو رفتار ناز سے
مٹی میں لوٹتا ہے دوپٹہ اٹھایئے

خواجہ سیّد ناصر نذیر فراق دہلوی حضرت(۱) خواجہ میر دردؔ رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے ہیں۔ اگست ۱۸۶۵ء ﴿ربیع الاول ۱۲۸۲ھ﴾ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ خود ایک رباعی میں اپنا نسب بیان کرتے ہیں:-

حمدِ حق لکھوں گا یا نعتِ نبیؐ لکھوں گا
وصف سبطین کا ، تعریف علی لکھوں گا
زیدی النسل ہوں، سیّد ہوں، مجھے بھاٹ نہ جان
مدح غیروں کی نہ لکھی ، نہ کبھی لکھوں گا

ان کے دادا منصب دار تھے۔ والد میر محسن علی بڑے عالم، درویش صفت بزرگ تھے والدہ بھی علوم ظاہر و باطن میں کامل تھیں۔ میر ناصر نذیرؔ نے خواجہ میر دردؔ کی سوانح عمری 'میخانۂ دردؔ' کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

---

(۱) ان حالات میں دوسری کتابوں کے علاوہ حضرت فراقؔ کے فرزند ارجمند حکیم سیّد ناصر خلیق نگارؔ دہلوی کے مضمون مطبوعہ یادگار لاہور (بابت اپریل ۱۹۳۳ء) سے بھی مدد لی گئی ہے۔

"میں نے اپنے والدین ماجدین کی صحبت چوالیس سال اٹھائی، اور ان دونوں حضرات نے مجھے ان کمالاتِ ظاہری و باطنی سے، جو وراثۃً خواجہ میر دردؔ صاحب سے پہنچے تھے، مالا مال کر دیا۔"

اس فیضان کے علاوہ میر فراقؔ نے فارسی و عربی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور درسِ نظامیہ ختم کر کے سند لی۔ پھر فنِ طب کی طرف توجہ کی۔ پہلے حکیم بدرالدین خاں دہلوی سے اس فن کو حاصل کیا۔ پھر حکیم محمود خاں دہلوی اور ان کے فرزند اکبر حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں سے طب کی تکمیل کی اور سند حاصل کی۔

غدر کے بعد میر فراقؔ کے والد اور دادا کو رئیس دھرم پور (ضلع بلند شہر) نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ پھر فراقؔ صاحب کو رئیس نے اپنا طبیب خاص اور اپنے صاحب زادوں کا اتالیق مقرر کیا۔ ایک عرصے تک ان سے وابستگی رہی۔ اور علاج معالجہ میں خوب شہرت پائی۔ رئیس کے انتقال کے بعد فراقؔ صاحب علی گڈھ کالج کی طرف سے سفیر بن کر بمبئی، بڑودہ، احمد آباد تشریف لے گئے۔ اس تعلق کے ختم ہونے کے بعد اپنے وطن دہلی میں مستقل قیام اختیار کیا۔ اور کوچہ چیلان بارہ دری خواجہ میر دردؔ میں باقی عمر گزار دی۔

میر فراقؔ صاحب شاعری میں مولوی محمد حسین آزادؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ علامہ آزادؔ لاہور سے دہلی آئے اور خان بہادر مولوی ذکاء اللہ کے مکان پر قیام فرمایا۔ میر فراقؔ کی جوانی کا آغاز تھا اور شاعری کا شوق تھا۔ انھوں نے اپنے والد سے درخواست کی اور وہ ان کو ساتھ لے کر علامہ آزادؔ کی خدمت میں گئے۔ یہ غزل لے گئے تھے۔ آزادؔ کے ارشاد پر غزل سنائی۔ انھوں نے سن کر فرمایا: "ماشاء اللہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بھئی کیوں نہ ہو، آپ حضرت دردؔ کے خاندان سے ہیں، اور کلام میں پورا پورا رنگ حضرت دردؔ کا ہے۔ بھلا میں کیا اصلاح دے سکتا ہوں۔"

جب فراقؔ صاحب کے والد نے اصرار کیا تو علامہ آزادؔ نے فرمایا، "اچھا میر صاحب، میں بھی دلی میں ایک دوسرا آزادؔ بنائے دیتا ہوں، جاؤ میاں مٹھائی لے آؤ۔" چنانچہ فوراً مٹھائی آئی اور آزادؔ نے ان کی غزل میں اصلاح دی۔ پھر یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔

میر ناصر نذیر فراقؔ کے خاندان میں قدیم سے سلسلۂ نقشبندیہ جاری تھا۔ خواجہ میر دردؔ اسی سلسلے کے درویش کامل تھے۔ لیکن میر فراقؔ نے چشتیہ طریقہ میں حضرت شاہ سلیمان تونسوی قدس سرہٗ کے پوتے حضرت شاہ اللہ بخش تونسوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و اجازت حاصل کی۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ میرا سلوک پورا ہو گیا اور میں اپنے مقصد کو پہونچ گیا۔ مرض الموت میں بھی اپنے صاحب زادے سے فرمایا کہ "تم کو معلوم نہیں ہے میرا پاس انفاس ہر وقت جاری رہتا ہے۔" بعض رباعیوں میں اپنا مسلک بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

کچھ بھی نہیں یہ نمود اِلّا اللہ   سب ہیچ ہے تار و پود اِلّا اللہ

کہتے ہیں فراقؔ جن کے دل روشن ہیں   لَا فَاعِلَ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللہ

وفات سے ایک مہینہ قبل جنوری ۱۹۳۳ء میں فرمادیا تھا کہ "ہمارا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا ہے، اور وہ فقیر کیا جو اپنی مرگ سے آگاہی نہ رکھتا ہو۔" انہی دنوں میں ان کے ایک دوست مزاج پُرسی کے لئے آئے تو ان سے فرمایا: "بھائی اب رواداری ہے۔ میں نے یہ شعر اپنے حسب حال کہا ہے:

کرے گا اس عالم کی تو سیر کب تک   منائے گی بکرے کی ماں خیر کب تک

چنانچہ دوشنبہ شب میں ۱۸؍فروری ۱۹۳۳ء ﴿شوال ۱۳۵۱ھ﴾ کو رحلت فرمائی۔

قرآن مجید سے تاریخ وفات ہے:۔

اَلْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ = ۱۹۳۳ء (سورہ قمر، آخری آیت، پارہ ۲۷)

تصانیف اور طرزِ تحریر میر ناصر نذیر فراقؔ کی تصانیف یہ ہیں:۔

۱۔ میخانۂ درد۔ حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات۔

۲۔ دلّی کا آخری دیدار۔ دہلی و بادشاہِ دہلی، اہلِ شہر و اہلِ قلعہ کی معاشرت، رسم و رواج، اشغال، میلے، تہوار، سب کچھ بیان کیے ہیں۔

۳۔ لال قلعہ کی ایک جھلک۔ دہلی کے آخری تاجدار ابوظفر بہادر شاہ کے زمانے کا لال قلعہ پورا اس کتاب میں منعکس ہے۔

۴۔ دلّی کا اجڑا ہوا لال قلعہ۔ مختصر کتاب ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے فرزند شاہ رخ میرزا کے شکار کجلی بن کے حالات ہیں۔

"میں نے اپنے والدین ماجدین کی صحبت چوالیس سال اٹھائی، اور ان دونوں حضرات نے مجھے ان کمالاتِ ظاہری و باطنی سے، جو وراثۃً خواجہ میر دردؔ صاحب سے پہنچے تھے، مالا مال کر دیا۔"

اس فیضان کے علاوہ میر فراقؔ نے فارسی و عربی کی با قاعدہ تعلیم حاصل کی اور درسِ نظامیہ ختم کر کے سند لی۔ پھر فنِ طب کی طرف توجہ کی۔ پہلے حکیم بدرالدین خاں دہلوی سے اس فن کو حاصل کیا۔ پھر حکیم محمود خاں دہلوی اور ان کے فرزند اکبر حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں سے طب کی تکمیل کی اور سند حاصل کی۔

غدر کے بعد میر فراقؔ کے والد اور دادا کو رئیس دھرم پور (ضلع بلند شہر) نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ پھر فراقؔ صاحب کو رئیس نے اپنا طبیب خاص اور اپنے صاحب زادوں کا اتالیق مقرر کیا۔ ایک عرصے تک ان سے وابستگی رہی۔ اور علاج معالجہ میں خوب شہرت پائی۔ رئیس کے انتقال کے بعد فراقؔ صاحب علی گڈھ کالج کی طرف سے سفیر بن کر بمبئی، بڑودہ، احمد آباد تشریف لے گئے۔ اس تعلق کے ختم ہونے کے بعد اپنے وطن دہلی میں مستقل قیام اختیار کیا۔ اور کوچہ چیلان بارہ دری خواجہ میر دردؔ میں باقی عمر گزار دی۔

میرِ فراقؔ صاحب شاعری میں مولوی محمد حسین آزادؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ علامہ آزاد لاہور سے دہلی آئے اور خان بہادر مولوی ذکاءاللہ کے مکان پر قیام فرمایا۔ میر فراقؔ کی جوانی کا آغاز تھا اور شاعری کا شوق تھا۔ انھوں نے اپنے والد سے درخواست کی اور وہ ان کو ساتھ لے کر علامہ آزادؔ کی خدمت میں گئے۔ یہ غزل لے گئے تھے۔ آزادؔ کے ارشاد پر غزل سنائی۔ انھوں نے سن کر فرمایا، "ماشاءاللہ

این سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بھئی کیوں نہ ہو، آپ حضرت دردؔ کے خاندان سے ہیں، اور کلام میں پورا پورا رنگ حضرت دردؔ کا ہے۔ بھلا میں کیا اصلاح دے سکتا ہوں۔"

جب فراقؔ صاحب کے والد نے اصرار کیا تو علامہ آزادؔ نے فرمایا، "اچھا میر صاحب، میں بھی دلی میں ایک دوسرا آزادؔ بنائے دیتا ہوں، جاؤ میاں مٹھائی لے آؤ۔" چنانچہ فوراً مٹھائی آئی اور آزادؔ نے ان کی غزل میں اصلاح دی۔ پھر یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔

میر ناصر نذیر فراقؔ کے خاندان میں قدیم سے سلسلۂ نقشبندیہ جاری تھا۔ خواجہ میر درد اسی سلسلے کے درویش کامل تھے۔ لیکن میر فراقؔ نے چشتیہ طریقہ میں حضرت شاہ سلیمان تونسوی قدس سرہٗ کے پوتے حضرت شاہ اللہ بخش تونسوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و اجازت حاصل کی۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ میرا سلوک پورا ہو گیا اور میں اپنے مقصد کو پہونچ گیا۔ مرض الموت میں بھی اپنے صاحب زادے سے فرمایا کہ "تم کو معلوم نہیں ہے میرا پاس انفاس ہر وقت جاری رہتا ہے۔" بعض رباعیوں میں اپنا مسلک بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

کچھ بھی نہیں یہ نمود اِلَّا اللّٰہ | سب ہیچ ہے تار و پود اِلَّا اللّٰہ
کہتے ہیں فراقؔ جن کے دل روشن ہیں | لَا فَاعِلَ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللّٰہ

وفات سے ایک مہینہ قبل جنوری ۱۹۳۳ء میں فرمادیا تھا کہ "ہمارا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا ہے، اور وہ فقیر کیا جو اپنی مرگ سے آگاہی نہ رکھتا ہو۔" انہی دنوں میں ان کے ایک دوست مزاج پُرسی کے لئے آئے تو ان سے فرمایا: "بھائی اب رواداری ہے۔ میں نے یہ شعر اپنے حسب حال کہا ہے:

کرے گا اس عالم کی تو سیر کب تک | منائے گی بکرے کی ماں خیر کب تک

چنانچہ دوشنبہ شب میں ۱۸ر فروری ۱۹۳۳ء ﴿شوال ۱۳۵۱ھ﴾ کو رحلت فرمائی۔
قرآن مجید سے تاریخ وفات ہے:۔

اَلْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَھَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ = ۱۹۳۳ء (سورۂ قمر، آخری آیت، پارہ ۲۷)

تصانیف اور طرزِ تحریر میر ناصر نذیر فراقؔ کی تصانیف یہ ہیں:۔

۱۔ میخانۂ درد۔ حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات۔

۲۔ دلّی کا آخری دیدار۔ دہلی و بادشاہِ دہلی، اہلِ شہر و اہلِ قلعہ کی معاشرت، رسم و رواج، اشغال، میلے، تہوار، سب کچھ بیان کیے ہیں۔

۳۔ لال قلعہ کی ایک جھلک۔ دہلی کے آخری تاجدار ابوظفر بہادر شاہ کے زمانے کا لال قلعہ پورا اس کتاب میں منعکس ہے۔

۴۔ دلّی کا اجڑا ہوا لال قلعہ۔ مختصر کتاب ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے فرزند شاہ رخ میرزا کے شکار کجلی بن کے حالات ہیں۔

۵۔بیگموں کی چھیڑ چھاڑ۔ایک شادی کی محفل کا نقشہ ایک بیگم کی زبانی پیش کیا ہے۔
۶۔سات طلاقنوں کی کہانیاں۔سات عورتیں ایک جگہ جمع ہو کر اپنی اپنی کہانی کہتی ہیں کہ ان کو کس وجہ سے طلاق ملی۔
۷۔دکن کی پری۔ایک طویل افسانہ۔
۸۔مضامینِ فراقؔ۔مصنف کے افسانوں کا مجموعہ۔
۹۔چار چاند۔مصنف کے چند مضامین کا مجموعہ۔

میر ناصر نذیر فراقؔ جس دلّی کی خود یادگار تھے، اسی دلّی کی یادگار ان کی زبان اور ان کی کتابیں ہیں۔انھوں نے کوئی علم و فن کی کتاب نہیں لکھی۔ان کا قلمی کارنامہ لطف بیان اور حسن بیان کے ساتھ دہلی کی تہذیب و تمدن کا آخری نمونہ پیش کرتا ہے۔ان کے طرزِ تحریر کی داد ان کے ایک ہم پایہ اور ان سے بزرگ ادیب دیتے ہیں۔فراقؔ صاحب کے صاحب زادے نے اُن کے حالات میں لکھا ہے:۔

"منشی سیّد احمد صاحب مؤلف فرہنگِ آصفیہ آپ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے اور فرمایا، بھائی صاحب، کمال کیا ہے۔اتنے چھوٹے سے افسانہ 'اختر محل' میں اتنے دلّی کے ٹھیٹھ محاورے آپ نے بھر دئے کہ مجھ کو حیرت ہے۔میں تو آپ کو سلطانِ زبانِ اُردو کہتا ہوں۔چنانچہ خطوط میں ان کو 'سلطانِ زبانِ اُردو' لکھا کرتے تھے۔"

دو ایک نمونے درج کیے جاتے ہیں۔

بیگموں کی چھیڑ چھاڑ۔اس مضمون میں سیّد ناصر نذیر فراقؔ نے دلّی میں بیاہ کی ایک محفل جمائی ہے۔

(ا) ایک بیوی کالے محل سے مہمان آئی تھیں، ان کا نام تھا حضرت بیگم۔وہ بڑی اکل کھری اور مزاج کی بڑی کڑوی تھیں۔حسن جہاں کی باتیں سن سن کر بہت گھٹتی تھیں اور بیٹھی کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا کرتی تھیں۔بی دولتی اپنے تیہے میں آپ ہی آپ گھولتی، کھانا پینا، پان چھالیہ، زردہ، الائچی، چٹنی، اچار، مربہ، مٹھائی، ناشتہ سب کچھ حسن جہاں کے تحت میں تھا۔بیچ مچ خالہ جان نے انھیں کُل گلاں کا مالک کر دیا تھا۔اس مارے بعض بیوقوفیں اُن سے اور کھسیانی تھیں۔ایک دن حضرت بیگم اور حسن جہاں کا مچیدہ ہو گیا۔

حضرت بیگم کے دل میں حسن جہاں بیگم کی طرف سے ناحق کا بخار تو بھرا ہی ہوا تھا۔ انھیں دیکھ کر ایک بیوی سے کہنے لگیں، اے بوا رضیہ سلطان سخت بھی ہو قلعہ کی بیگمیں بلی کونگٹی کہا کرتی تھیں۔ یہ چھوٹی ناک بھی کیا بُری معلوم ہوتی ہے۔ کم بخت پیا پھرا ہوا اور بہن مجھے تو زیادہ گوری رنگت سے بھی نفرت ہے جیسے پھیکا شلجم۔"

حسن جہاں کی ناک بھی چھوٹی تھی اور رنگ بھی ان کا پڑکا پڑتا تھا۔ سمجھ گئیں کہ پھبتی مجھ پر ہی ڈالی گئی ہے۔ وہ بھلا کب چوکنے والی تھیں۔ کہنے لگیں۔ پھیکا شلجم تمبا کو کے پنڈے سے تو ہر طرح اچھا ہوتا ہے اور مجھے بڑی ناک دیکھ کر گھن آتی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے سِل کا بٹہ کسی نے چہرے پر دھر دیا ہے۔ اونچی ناک کولاؤ چھرا۔ یہ مثل تو تم نے سنی ہوگی۔" حضرت بیگم کی رنگت بھی کالی بھٹ تھی اور ناک بھی ان کی بیڈول اونچی تھی۔ حسن جہاں کے اس کہنے پر سب بیویاں بیگمیں ہنس پڑیں۔ اور بی حضرت بیگم بگڑ گئیں۔ ہنسی میں کھسی ہوگئی اور بی حسن جہاں کی اوران کی خوب دنگودنگ ہوئی۔

(۲) رات کے بارہ بجے برات آئی۔ سمدھنیں بڑے جلوے سے ساتھ اتریں۔ جھڑاں جال کے جوڑے، کمخواب، زری، بوٹی، پوتھ کی تہ پوشیاں، نیچے نیچے کرتے ہمارے بچپن میں کوئی بیوی کُرتا پہنے آجایا تی تھی تو اس پر تیلن گھوسن کی پھبتیاں اُڑا کرتی تھیں، یا اب ساری بیگموں نے یہی وضع طرح لے لی ہے۔ سچ ہے "کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات۔" سمدھنیں بڑے ٹھسّے کے ساتھ مسند پر گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھیں۔ شربت پلانے کے لئے بھی ہماری بجلی بسنت بی حسن جہاں اور لنکا مبارک نساء کھڑی ہوئیں۔ مبارک نساء کے ہاتھ میں چاندی کی کشتی اور اس میں شربت کا شیشہ بلور کی پیالی اور بی حسن جہاں کے ہاتھ میں ریشم کا رومال منھ پوچھنے کے لئے۔ اللہ کی بندی رومال کا گھسا اس زور سے دیتی تھی کہ شربت پینے والی پھڑک جاتی تھی، منہ اور باچھیں چھل کر لال ہو جاتی تھیں۔ بعض جلاتن کہہ دیتی تھیں "اے پھٹکار یہ منہ پونچھتی ہو یا کبھی کا بیر نکالتی ہو؟"

آغائی بیگم، دولہ کی بہن کا جو منہ پونچھا تو رگڑے کے ساتھ ان کی ناک کی کیل الجھ کر ناک میں سے نکل گئی اور وہ بیچاری منہ پکڑ کر کہنے لگیں "شاباش بوا شاباش دیکھت کی تو تم کامنی سی ہو مگر ہاتھ تو ماشاءاللہ لوہے کی میخیں ہیں دیکھو میری ناک کی کیل تمھارے رومال میں

الجھ کر چلی گئی ہے۔" حسن جہاں "بُوا او کھلی میں سر دیا تو دھمکوں سے کیوں ڈرتی ہو، خدا رکھے بھائی کو بیاہنے آئی ہو نیگ جوگ کے روپے ڈھیر سارے تمھارے تنٔر میں جائیں گے۔ سمدھن بننا ٹھٹھہ ہے، ابھی تو منہ ہی پچھوانے میں بُولا گئیں، جب ڈومنیوں کی موٹی موٹی گالیاں کھاؤ گی اس وقت معلوم ہوگا کہ کئے بیسی کا ساٹھ ہوتا ہے اور بوا ناک کی کیل تو ہم نے دیکھی بھی نہیں۔ سچ کہنا بہن، گھر سے پہن کر بھی آئی تھیں یا مفتِ خدا میں مجھے لئے مرتی ہو؟"

رومال جھاڑا تو اس میں سے کیل نہ نکلی۔

آغائی بیگم۔ "بھئی اللہ جانتا ہے ہماری کیل ڈھونڈو، اس میں تُرملی جڑی ہوئی ہے۔"

حسن جہاں۔ "بہن آغائی بیگم تم کیل کے مارے کیوں ہلکی جاتی ہو۔ مانگے کی تو پہن کر نہیں آئی تھیں۔ تمھاری نہ ملے گی تو میں اپنی ہیرے کی کیل تمھیں دے دوں گی۔ مگر تم ذرا چھری تلے دم تو لو۔"

اتفاق کی بات کیل آغائی بیگم کی گود میں جا پڑی تھی۔ جب مل گئی تو حسن جہاں کی چڑھ بنی، کہنے لگیں "واہ بوا، بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا۔ کیل تو آپ چرائے بیٹھی ہیں اور لوگوں کو اوپر ڈرے پکڑتی ہیں۔"

یہ دو نمونے زبان و محاورات دہلی کے تھے۔ اب ایک نمونہ سیّد ناصر نذیر کی تاریخی خیال آرائی کا دیکھئے۔ ایک مضمون "قوتِ مجاز" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس کا اقتباس یہ ہے:-

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار　　صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

بعض مورخوں نے قیس عامری (مجنوں) اور لیلیٰ کے حالات کو اتنا کریدا کہ حسن و عشق کی داستان کو بے نمک کر دیا۔ کیونکہ وہ خشک دماغ ہیں اور تصوف سے بے نصیب۔ خدا نے نہ انھیں ایسی آنکھیں دی ہیں جو کسی محبوب کے بناؤ سنگار کو دیکھ کر مائل ہو جائیں، نہ ان کے سینہ میں ایسا گرم دل ہے جو کسی کی باریک مانگ اور چنے ہوئے دوپٹے کی بہار دیکھ کر لوٹ ہو جائے اس لئے وہ ایک باؤلے مرد اور ایک سانولے رنگ کی عورت کی کیا وقعت کرتے، مگر ہم مورخوں کے مسلک کو اختیار کرنا نہیں جانتے، بلکہ اپنے مشائخ کی لکیر کے فقیر بنتے ہیں۔ اور اہلِ دل کو حضرت قیس اور بی لیلیٰ کی شیریں داستان سناتے ہیں۔ یعنی جب قیس لیلیٰ کے عشق میں سڑی ہو گئے، تو ان کے باوا جان انھیں جدہ

سے لے کر مکہ معظمہ پہنچے۔ ہاتھ پکڑ کر حرم محترم میں لائے اور کعبہ کو دکھا کر کہا "بیٹا یہ اللہ کا گھر ہے، یہاں دعا قبول ہوتی ہے، اور جو مانگو وہ ملتا ہے۔ تم اس کے گرد سات دفعہ پھرو، اور غلاف پکڑ کر عرض کرو الٰہی تو میرے دل سے وحشت دور کر دے، میرے دل کو ٹھہرا دے میرے سر میں جو لیلیٰ کا سودا سا گیا ہے اُسے دور کر دے۔" قیس نے باپ کے آگے سر جھکا دیا۔ اور طواف میں مشغول ہو گیا۔ باپ نے سات بار گرد پھرنے کو کہا تھا، قیس نے جو کعبہ کا چکر کاٹنا شروع کیا تو گھنٹوں گذار دیئے۔ پھرکی کی طرح پھرے جاتا تھا۔ باپ نے کہا 'بیٹا بس کرو، سر چکرا جائے گا۔'

قیس: باوا جان مدت کے بعد تو یہ دن نصیب ہوا ہے کہ لیلیٰ کا گھر ملا ہے۔ اب تو جب تک میرا جی نہ بھرے گا میں صدقہ واری ہوئے ہی جاؤں گا۔

باپ: میری جان، کیا باؤلی باتیں کرتا ہے۔ یہ لیلیٰ کا گھر نہیں ہے۔ خدا کا گھر ہے۔۔

قیس: باوا جان لیلیٰ اور خدا ایک ہے۔ کوئی اسے خدا کہتا ہے کوئی لیلیٰ کہتا ہے۔

باپ: میں نے تم سے کہا تھا، تم اپنے لئے دعا کرو مگر تم بھول گئے۔

قیس: نہیں حضرت میں بھولا نہیں ہوں۔ اچھا میں دعا کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر قیس نے کعبہ کا غلاف پکڑ لیا اور بہت ادب کے ساتھ عرض شروع کی "اے لیلیٰ، تجھے اپنے اس سیاہ دامن کی قسم مجھے تو بھولنا نہیں۔ میرے سینے میں تیری یاد آگ بن کر بھڑکتی رہے۔" قیس کی یہ باتیں سن کر مہربان باپ چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ اور اس کے رونے پر کعبۃ اللہ کے سب حاضرین کے دل بھر آئے اور وہ بھی رونے لگے۔ کسی نے کہا اسے حضرت رسول اللہ کی خدمت میں لے جاؤ۔ آپ کی نظر توجہ اس پر پڑ جائے گی تو یہ اچھا ہو جائے گا۔ لگی بُری ہوتی ہے۔ باپ قیس کو لے کر حضور میں حاضر ہوا۔ اور آپ کی طرف اشارہ کر کے کہا: "بیٹا یہ پیغمبر آخر الزماں ہیں۔ سارا عرب آپ پر ایمان لایا ہے، تو بھی آداب بجالا۔" قیس نے حضورؐ کے چہرۂ نورانی کو غور سے دیکھا اور ایک آہ بھر کر کہا۔ "ان کی شانِ نبوت کی پہچان تو عاقل کر سکتے ہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ ان کی آنکھیں بالکل لیلیٰ جیسی ہیں۔"

"سنا ہے یہ بادۂ محبت کے متوالے امیر معاویہ کے دورِ حکومت تک زندہ رہے۔ اس وقت خلافت کا مسئلہ ہر ایک کی زبان پر رہتا تھا۔ ان چرچوں کو سن کر قیس بولے، بھائی خلافت کے مستحق نہ ابوبکرؓ نہ عمرؓ نہ عثمانؓ نہ علیؓ نہ معاویہ نہ یزید۔ حق لیلیٰ کا تھا۔

ایک بار انھیں خبر لگی کہ آج کل لیلیٰ کو ریچھ کا ناچ دیکھنے کا بڑا شوق ہے اور روز ایک ریچھ والا جاتا ہے، اور ریچھ کا ناچ دکھا کر انعام لے آتا ہے۔ انھیں تاب کہاں تھی۔ ریچھ والے کے پاس پہنچے، اسے روپے دیے اور کہا مجھے ریچھ کی کھال اوڑھا کر اور ریچھ بنا کر لیلیٰ کے پاس لے چل میں اس بہانے سے اپنے یار کا جمال دیکھ لوں گا۔ قلندر لالچ میں آ گیا۔ اور قیس کو ریچھ بنا کر لے گیا۔ لیلیٰ ڈگڈگی کی آواز سن کر اپنے جھروکہ میں آ بیٹھی اور جھمورا ناچنے لگا۔ حضرت قیس نے اپنے محبوب کو خوش کرنے کے لئے وہ وہ نرت کیے، وہ وہ اچھلے کودے کہ لیلیٰ پھڑک پھڑک گئی اور سمجھ گئی کہ میرا سچا طالب ریچھ کے بھیس میں آیا ہے۔ دل کا مالک تو اللہ ہی تھا مگر قوم قبیلہ کے دکھانے کے لئے ریچھ والے سے کہا کیوں رے نامراد خدا تجھے سمجھے، یہ آج بے نکیل کا ریچھ کیوں لایا ہے۔ تجھے خوف نہیں تو ہمیں تو خوف ہے۔ یہ بھر پڑا تو دو چار کی جان لے لے گا۔ کل اسے لائے تو اس کی ناک میں ڈوری ڈال کر لانا۔ قیس نے بہت آہستگی کے ساتھ کہا بھائی تو خدا کے واسطے میری ناک ابھی چھید دے تاکہ سرکار خوش ہو جائیں۔

ریچھ والا: (لیلیٰ کی طرف مخاطب ہو کر) حضور میں ابھی اس کی ناک چھیدے ڈالتا ہوں۔

لیلیٰ: نہیں نہیں ہم سے یہ ظلم نہیں دیکھا جائے گا۔ اپنے گھر لے جا کر چھیدنا۔ یہ کہہ کر لیلیٰ نے ریچھ والے کو رخصت کر دیا، بس اب ہمارے دروازے پر نہ آنا ہمارا دل ریچھ کے ناچ سے آج بھر گیا ہے۔

اس دَور کی نثر پر تبصرہ

ا۔ یہاں تک جن مصنفوں کا ذکر کیا گیا یہ سب وہ ہیں جن کی کم سے کم نصف عمر انیسویں صدی میں گذری اور جو ختم صدی سے پہلے مستقل مصنف اور انشا پرداز کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ ان میں چند ایسے ہی ممتاز مصنفوں کی کمی بیک نظر معلوم ہوتی ہے مثلاً

(۱) پنڈت رتن ناتھ سرشار
(۲) مولوی عبدالحلیم شرر
(۳) مرزا محمد ہادی رسوا
(۴) منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ

لیکن ان کو بالقصد اس تاریخ میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ ان کی سب سے پہلی اور بڑی حیثیت ناول نگار کی ہے۔ اگرچہ ناول نویسی کی بنیاد ان سے پہلے پڑ گئی تھی، اور ان کے بھی اکثر ناول انیسویں صدی ہی کے ہیں، لیکن اس فن کا ارتقا بیسویں صدی میں ہوا ہے، اسی طرح ظرافت نگاری عصر حاضر میں کمال کو پہنچی ہے۔ شرر و رسوا، اور سرشار و سجاد حسین ناول اور ظرافت کے پیش رو ہیں۔ اس حیثیت سے جدید ناول نویسوں اور مزاحیہ نگاروں سے پہلے ان بزرگوں کا تذکرہ ہونا چاہئے، اور اس کے لیے علیحدہ تالیف کی ضرورت ہے۔

۲۔ جس زمانے تک اس تالیف کو ختم کیا گیا ہے، اس میں تصانیف کی اتنی کثرت ہو گئی تھی کہ مصنفوں کے صرف ناموں کا شمار و احاطہ بھی محال ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جن مصنفوں کا ہم نے تذکرہ لکھا ہے ان سے بہتر اور مشہور تر کوئی مصنف نہ تھا (بجز مذکورہ بالا ناول نگاروں کے)۔

۳۔ انیسویں صدی کے آخری تیس سال کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ یہ "دورِ مشرقیت" اور "زمانۂ تصنیف و تالیف" ہے۔ اور بیسویں صدی کا آغاز "عصر مغربیت" اور "عہدِ ترجمہ"۔ سرسیّد سے پہلے تو اس تفریق کا محل ہی نہ تھا، سرسیّد سے شبلی تک اکثر مصنفوں نے یا کتابیں تصنیف کی ہیں یا عربی و فارسی سے تالیف۔ انگریزی سے ترجمے بہت کم ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے قانونی ترجموں کو چھوڑ کر، سب سے مشہور مولوی سیّد احمد بلگرامی کے ترجمے ہیں۔ ان کے علاوہ جو ترجمے ہوئے ان کو شہرت اور قبول عام حاصل نہ ہوا۔

۴۔ انیسویں صدی کی تصانیف میں مغربی علوم و فنون کا اثر کم، اور انگریزی کے طرزِ ادا اور جدت اسلوب کا اثر بہت کم ہے۔ سرسیّد اور ان کے رفقاء نے شبلی تک یورپ کے خیالات سے فائدہ حاصل کیا لیکن بالواسطہ۔ اسی لیے ان کے ہاں یہ رنگ ہلکا ہے۔ ان

کے دوسرے معاصرین مولوی چراغ علی، مولوی سیّد علی بلگرامی، جسٹس کرامت حسین، مرزا ہادی رسوا، مولوی عبدالحلیم شرر وغیرہ نے براہِ راست یورپ کی زبانوں سے فیض پایا، اس لیے ان کی تصانیف کے موضوع، اسلوب، ترتیب سب میں یہ اثر زیادہ نمایاں ہے۔ (مرزا ہادی رسوا کی خدمات دارالترجمہ میں اس وقت زیرِ بحث نہیں ہیں، وہ خاص بیسویں صدی کی چیزیں ہیں، ان کا تذکرہ الگ ہوگا)۔

۵۔ پُرانی تعلیم کے زیرِ سایہ اور ''نئی روشنی'' کی صبح صادق میں جتنے بہتر سے بہتر اسالیب بیان پیدا ہو سکتے تھے، وہ سرسیّد سے شبلی اور شرر تک پیدا ہو گئے۔ اس امر میں سرسیّد کی جامعیت حیرت انگیز ہے۔ اکیلے سرسیّد کی تحریر میں عالمانہ، فلسفیانہ، متین و مزاحی، نرم و گرم ہر طرح کا اسلوب موجود ہے۔ شبلی اپنے اسلوب کے توازن و تناسب، صحت و پختگی میں سب معاصرین سے بڑھے ہوئے ہیں، لیکن سرسیّد کے جوش کی ان میں کمی ہے۔ حالی ان دونوں کے درمیان میں ہیں، اگرچہ جوش ان میں بھی نہیں ہے۔ حالی نے سرسیّد کی صحت و صفائی کو آگے بڑھایا، لیکن حسن و موزونیت میں شبلی سے پیچھے رہے۔ نذیر احمد اور آزاد اپنے اپنے رنگ کے موجد و خاتم ہوئے۔ سرشار و سجاد حسین ''پنچ'' طرزِ ظرافت کے خداوند تھے۔

بیسویں صدی میں اقسام کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ اسالیب بیان ایجاد ہوئے اور تقریباً سب انگریزی زبان و علوم سے متاثر ہیں۔ عصر حاضر میں مغربی تعلیم سے اُردو کو جو سب سے بڑا فیض پہنچا، اور زبان و ادب کی اصلی خدمت ہوئی، وہ یہ ہے کہ فلسفہ و سائنس تاریخ و سیرت، ادب و انشا، تبصرہ و تنقید، ناول و افسانہ وغیرہ مختلف موضوعات کے لیے الگ الگ مناسب و موزوں اسالیب مخصوص ہو گئے۔ اب سے پہلے یہ بات نہ تھی یا خال خال تھی۔ جیسا کہ ہم تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن ان دو زمانوں (انیسویں صدی کا آخری اور بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ) کے مصنفوں میں عجیب و دلچسپ فرق یہ ہے کہ سرسیّد اور ان کے رفقاء و معاصرین کو جو اسلوب پسند تھا وہ انھوں نے ابتدائے تحریر سے اختیار کر لیا، اور آخر تک اس پر قائم رہے۔ آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی کا انداز و طرز ان کی پہلی تصانیف سے موجود ہے۔ اس کی تکمیل و پختگی میں البتہ کچھ دیر لگی، لیکن اتنی ہی جتنی کسی

اسلوب کے ہموار ہونے اور منجھنے میں لگتی ہے۔ برخلاف عصرِ حاضر کے، کہ اس زمانے کے سب نہیں تو بہت سے مشہور اہلِ قلم اسلوبوں اور اندازوں کے پیچھے دوڑتے پھرے، پھر کہیں مدت کے بعد کوئی روش اختیار کر سکے۔ ابوالکلام آزاد کی ''عالمانہ و شاندار نثر'' 'الہلال' سے شروع ہو کر 'تفسیر قرآن' تک رہی، پھر ہلکی پڑ گئی۔ نیاز فتحپوری کی ''نثر میں شاعری'' اور ''ٹیگوریت'' کچھ عرصہ جاری رہ کر ختم ہو گئی، اور ''نثر میں نثر'' لکھنے لگے۔ خواجہ حسن نظامی نے زبان میں چٹکلوں کا مزہ پیدا کیا، اور چٹکیاں لیں، گدگدیاں کیں، لیکن ان کی بھی حد ہو لی۔ ملا رموزی نے اُردو کو گلابی رنگ دیا، یعنی ''گلابی اُردو'' کے نام سے مُلایانہ لفظی ترجمہ کا طرز لکھا، لیکن یہ رنگ پختہ نہ تھا، ڈھل گیا۔ پھر مزاحیہ شوخ رنگ اختیار کیا۔ اب وہ بھی ''بادامی'' رہ گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے طنزیات میں انفرادی طرز نکالا اور شوخی میں ادبیت پیدا کی۔ لفظوں کے معنی اور معنوں کے لفظ ایجاد کیے، لیکن یہ اسلوب تھکا دینے والا تھا، چنانچہ تھک کر بیٹھ رہے۔ اس طرح کے تغیرات اور الٹ پھیر اور اسالیب واہل قلم میں بھی ہوئے۔ یہ چند نام مثال کے طور پر لکھے گئے ہیں۔

ان میں یک رنگی قائم نہ رہنے کا سبب یہ تھا کہ یہ سب روشیں اصل میں تحریر کی ''جولانیاں'' تھیں، لکھنے والوں کے شباب تک رہیں۔

۶۔ علوم وفنون اور مضمون و موضوع کے اعتبار سے بھی انیسویں صدی کا آخری دور کامیاب ہے۔ تعداد میں سب سے زیادہ مذہبی کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے بعد داستانیں اور ناول، پھر تاریخ و سیرت کا نمبر ہے، تذکرہ زبان و ادب دو چار سے زیادہ نہیں۔ تنقید کا صرف آغاز ہوا۔ فلسفہ، سائنس، معاشیات وغیرہ بہت کم ہیں۔ سیاسی تصانیف برائے نام۔ لغات کی کتابیں متعدد لکھی گئیں ''فرہنگِ آصفیہ'' سب سے پہلی جامع تالیف ہے۔

یہ سرمایہ بعد کی تصانیف سے زیادہ وسیع و متنوع نہیں ہے۔ لیکن اس زمانے میں بڑی بات یہ تھی کہ مصنف عالم ہوتے تھے۔ فضل و کمال حاصل کرنے سے پہلے مصنف بننا اور شہرت حاصل کرنا نہ چاہتے تھے۔ اس لیے جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے کمال و تبحر کے ساتھ لکھتے تھے اور تصنیف کا حق ادا کر دیتے تھے۔ نام و نمود پیشِ نظر نہ تھا۔ علم و ہنر مقصود تھا۔ اس معیار و مسلک کی اہمیت عام طور پر دلنشین تھی۔ اس لیے کم استعداد مصنفوں اور فرو مایہ تصانیف کو قبول عام حاصل نہ ہوتا تھا۔

بیسویں صدی میں یہ بات بدل گئی، لیکن بتدریج بدلی۔ اس زمانے کے دو دور ہیں۔ یعنی موجودہ صدی کے پہلے بیس سال، اور بعد کے ۳۵ سال۔ پہلے دور کے مصنف وہ ہیں جن کا شباب انیسویں صدی میں شروع ہوا، اسی صدی میں یا بیسویں صدی کے آغاز میں تعلیم ختم کی، اور پھر میدانِ تصنیف و تالیف میں قدم رکھا۔ ان اہلِ قلم میں قدیم وضع، اخلاق، تعلیم، مذاق کا بہت کچھ اثر تھا۔ اس لیے ان کی تصانیف کا معیار بھی صحیح ہے۔ دوسرے دور کے مصنف وہ ہیں جو بیسویں صدی میں پیدا ہوئے یا انیسویں صدی میں صرف پیدا ہوئے تھے۔ باقی ہر نشو و نما بیسویں صدی میں پایا۔ یہ زمانہ انقلاب در انقلاب اور پوری کایا پلٹ کا دور ہے۔ معاشرت، اخلاق، تعلیم، مذاق سب بدل گئے، اور بدل رہے ہیں۔ آج کل دنیا چل نہیں رہی بلکہ دوڑ رہی ہے۔ ہر کام میں عجلت بہت ہے، ذمہ داری کا احساس کم ہے، اور پروا بالکل نہیں۔ "کسبِ کمال" سے پہلے "عزیزِ جہاں" بننے کی دھن ہے۔ پھر شہرت کے ذرائع آسان اور بے شمار ہیں۔ انہی اسباب کا نتیجہ آج کل کا اکثر لٹریچر ہے۔

عصرِ حاضر کے مصنفوں میں جو لوگ فطری صلاحیت اور ذوقِ سلیم کے ساتھ اعلیٰ تعلیم، ذہنی تربیت اور با اصول علمی تحقیق سے فیض یاب ہیں وہی ٹھوس اور اصلی کام کر رہے ہیں۔ باقی جہاں علم و ادب کے "حشرات الارض" ہیں اور ہر زمانے سے زیادہ ہمارے زمانے میں ہیں۔

یہ غنیمت ہے کہ (بقول اکبر آلہ آبادی) "جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے" ان بزرگ عالموں اور ادیبوں کی تصانیف عصرِ حاضر کی غیر فانی دولت ہے، اور ان کی رہنمائی میں قابلِ فخر مصنف اور انشا پرداز پیدا ہو رہے ہیں۔

۷۔ انیسویں صدی کا یہ زمانہ زیرِ تبصرہ اخبارات و رسائل کے لحاظ سے بھی گراں مایہ ہے۔ 'اودھ اخبار' لکھنؤ، 'اخبارِ عام' لاہور، 'پیسہ اخبار' لاہور، 'اودھ پنچ' لکھنؤ، 'آگرہ اخبار' 'ریاض الاخبار' گورکھپور، 'دبدبۂ سکندری' رامپور، 'وکیل' امرتسر، 'وطن' لاہور، 'البشیر' اٹاوہ، 'نیر اعظم' مراد آباد، 'ہندوستانی' لکھنؤ، 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' علی گڑھ، 'رہبر دکن' وغیرہ اپنے اور اپنے زمانے کے رنگ میں نہایت پختہ تھے۔ ان سب نے زبان کی خدمت اور ملک کی قیادت زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے بہتر سے بہتر کی۔ اگلے زمانے میں "سیاسی رائے"

آزاد و بیباک نہ تھی، پھر بھی ان اخباروں کا لہجہ حسب موقع نرم و گرم رہا۔ اخبارات مذکورہ میں سے بجز 'وکیل' اور 'وطن' اور 'ہندوستانی' کے سب اب تک جاری ہیں۔ 'اودھ اخبار' کی عمر ۸۳ سال کی ہے۔ بعض کی ۷۰ سے زیادہ۔ ۴۰ سال سے کم کسی کی نہیں۔ ماہوار رسائل بھی اس دور میں اعلیٰ پایہ کے تھے۔ 'تہذیب الاخلاق' (بادارت سرسیّد) سب کا پیش رو اور سب سے بہتر تھا۔ 'دلگداز' لکھنؤ (بادارت شرر لکھنوی) ادب و تاریخ میں اپنے رنگ کا موجد تھا۔ ان دو رسالوں نے فنِ مقالہ نگاری کے ارتقا میں سب سے زیادہ مدد دی ادب و انشا اور فکر و تخئیل کو تھوڑے دنوں میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ 'پیامِ یار' لکھنؤ (بادارت منشی نثار حسین) نے شعر و غزل کا جو صحیح معیار اور اعلیٰ نمونہ پیش کیا، وہ اپنی نوع میں منفرد تھا۔ 'مرقع عالم' ہردوئی (بادارت حکیم محمد علی) 'حسن' حیدر آباد، 'معارف' علی گڈھ (بادارت مولوی وحید الدین سلیم) اپنی علمی و ادبی خدمات میں نہایت وقیع و ممتاز تھے۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز میں 'مخزن' لاہور (بادارت شیخ عبدالقادر بیرسٹر) 'زمانہ' کانپور (بادارت منشی دیا نرائن نگم) 'اردوئے معلیٰ' (بادارت حسرت موہانی) اور ان کے کچھ بعد 'دکن ریویو' (بادارت ظفر علی خاں) 'الناظر' لکھنؤ (بادارت ظفر الملک علوی) اور 'نقاد' آگرہ (بادارت شاہ دلگیر) نے اگلوں کی جگہ لے لی، ان کے نقشِ قدم پر چلے، اور ان کی ''موجِ خرامِ ناز عجب گُل کتر گئی''، جن کی خوشبو سے آج تک مشام ادب معطر ہے۔ ان میں سے صرف ایک 'زمانہ' کانپور سب کے بعد تک زندہ رہا اور ۴۰ برس زبان و ادب اور ملک کی خدمت نہایت سلامت روی اور وضع داری کے ساتھ کر کے ۱۹۴۴ء میں بند ہوا۔ 'الہلال' کلکتہ (بادارت ابوالکلام آزاد) اخبار و رسالہ کی درمیانی جنس یعنی ہفتہ وار مجلّہ تھا، جس کی وضع، معیار، ادبیت، صحافت، سب کی تعریف میں ایک لفظ 'شاندار' کافی ہے۔ یہ چند نام لیے گئے ہیں، ان کے علاوہ اور بھی قابلِ قدر رسالے جاری اور بند ہوتے رہے۔

بیسویں صدی کا موجودہ دور اخبار و رسائل میں دورِ سابق سے کم رتبہ نہیں ہے۔ لیکن اس اعتبار سے بھی ان دونوں زمانوں میں وہی فرق ہے جو تصانیف کے سلسلے میں بیان کیا گیا۔ اگلے زمانے کے رسالوں کا معیار اور مذاق صحیح، پختہ اور ہموار تھا۔ جن رسائل کا نام لیا گیا ان میں جو مضمون شائع ہوتا تھا اعلیٰ یا اوسط درجے کا ہوتا تھا۔ ادنیٰ

درجے کا کوئی نہ تھا۔ اب یہ امتیاز اٹھ گیا ہے۔ اکثر رسائل کی اکثر اشاعتوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ مضامین پہلو بہ پہلو ہوتے ہیں۔ آج کل (بقول ایک ایڈیٹر کے) ''سب کو خوش رکھنا پڑتا ہے'' سب میں بازاری اور عوام بھی ہیں، نوجوان طالب علم بھی، آزاد خیال وانقلاب پسند بھی، پرانے استاد بھی، بوڑھے فلسفی بھی، عالم وادیب بھی۔ گویا ''از شمار افزوں خداوندانِ او''، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ''شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا۔'' صرف گنتی کے چند رسائل صحیح اصول اور اعلیٰ معیار رکھتے ہیں، اور انھیں سے ''مجلّہ نگاری'' کی لاج قائم ہے۔

آج کل کے اخبارات کا بھی یہی حال ہے۔ اس صدی کے پہلے پندرہ بیس سال میں بعض روزانہ اخبار ایسے جاری ہوئے جن کو زبان وادب کا معیار بھی ملحوظ تھا۔ ان میں اول و افضل ''زمیندار'' تھا، مولوی ظفر علی خاں نے زمیندار میں ادارت وصحافت کی جو خوبیاں اور جدتیں پیدا کیں، وہ انھیں کی ''اولیات'' تھیں۔ بعد کے سب روزنامچے ان کے ناقل وتبیع ہوئے۔ ادبیت اور صحیح ادارت میں سیّد جالب دہلوی (ایڈیٹر روزانہ ہمدم لکھنؤ)، قاضی عبدالغفار مرادآبادی (ایڈیٹر روزانہ جمہور و صباح کلکتہ) مولانا محمد علی (ایڈیٹر روزانہ ہمدرد دہلی) کی خدمات بھی ممتاز ہیں۔ سیّد جالب ان سب سے کہن سال و کہنہ مشق اڈیٹر تھے۔ ادارت سے دست کش ہیں۔

ان کے بعد حال کے پچیس تیس برس میں جو اخبار جاری ہوئے ان کی نظر میں سیاسی جدوجہد تمام لوازم صحافت پر مقدم ہے۔ پھر بھی اچھے اخبارات سے زمانہ خالی نہیں ہے۔

۸۔ مطابع کے حق میں پوری انیسویں صدی گویا ''اجارہ دار'' تھی۔ دہلی، لکھنؤ، کانپور، آگرہ، لاہور میں جس کثرت سے اور جیسے بڑے اور اچھے چھاپے خانے قائم ہوئے ان کا نظیر بیسویں صدی اب تک پیدا نہیں کر سکی۔ بلکہ انھیں میں سے بہت سے مطابع بیسویں صدی کی طباعت میں بھی معقول حصہ دار ہیں۔ ان میں مطبع نول کشور سب سے ممتاز ہے۔ منشی نول کشور سی، آئی، ای کے حسنِ نیت، خلوصِ ارادت، ذوقِ علم، شوقِ خدمت نے جو احسان کیا ہے اس سے ملک و زبان اور علم وفن کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اس کے ساتھ مطابع مجتبائی، مصطفائی، مجیدی، انتظامی، نامی، مفید عام، آگرہ اخبار وغیرہ کی خدمات واحسانات بھی کچھ کم گراں قدر نہیں ہیں۔

بیسویں صدی نے طباعت میں جو حسن و خوبی پیدا کی ہے وہ بلاشبہ نہایت دلکش و شاندار ہے۔ اس زمانے کے نئے مطابع شمار و حصار سے زیادہ ہیں لیکن یہاں بھی وہ امتیاز کارفرما ہے کہ اگلے زمانے والے نفع سے زیادہ خدمت علم و فن مدِ نظر رکھتے تھے، اور اب تجارت پہلے ہے، باقی سب کچھ پیچھے۔

۹۔ انیسویں صدی کی علمی انجمنوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ صدی کے آخر میں ان کے علاوہ ایک اور ممتاز انجمن یا ادارۂ تصنیف و تالیف قائم ہوا، یعنی حیدرآباد میں مولوی سیّد علی بلگرامی کی نگرانی میں جس کی مطبوعات سلسلۂ آصفیہ کے نام سے شائع ہوئیں۔ ان میں علامہ شبلی کی بھی بعض تصانیف شامل ہیں۔ ان کے حالات میں چند بار اس سلسلے کا ذکر آچکا ہے۔ اس کے بعد بیسویں صدی کے آغاز میں انجمن ترقی اُردو قائم ہوئی، پہلے اورنگ آباد (دکن) میں دفتر تھا، پھر دہلی آگیا۔ تقسیمِ ملک کے بعد سے کراچی میں دفتر ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی نگرانی میں اُردو علم و ادب کی خدمت کر رہی ہے۔ تالیف و تراجم کے علاوہ دو بلند پایہ سہ ماہی رسالے 'اُردو' اور 'سائنس' اور ایک پندرہ روزہ پرچہ 'قومی زبان' اس کے اہتمام میں جاری ہیں۔ یہ انجمن اپنے معتمد و سکرٹری کی طرح حرف مشدد کا خواص رکھتی ہے کہ ہماری تقسیم ادوار کے لحاظ سے اس کا آغاز ہمارے اس دائرۂ تبصرہ کے اندر ہے، اور اس کی ترقیاں زمانۂ بعد سے متعلق ہیں۔ اس لئے اس کا باقی تبصرہ ''داستان تاریخِ اُردو'' کے دوسرے حصے کے لیے رکھا جاتا ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد جب مولوی عبدالحق صاحب کراچی چلے گئے اور وہاں انجمن ترقی اُردو کا دفتر قائم کر لیا تو ہندوستان میں الگ انجمن قائم رہی۔ اس کا دفتر دہلی سے علی گڈھ منتقل ہو گیا۔ اور قاضی عبدالغفار صاحب مرادآبادی اس کے سکرٹری مقرر ہوئے۔ انجمن کے پندرہ روزہ پرچے کا نام (ہماری زبان) ہندوستان میں رہا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے پرچے کا نام 'قومی زبان' رکھ لیا۔ لیکن سہ ماہی رسالہ کا نام 'اُردو' پاکستان میں رہا۔ قاضی صاحب نے سہ ماہی رسالہ کا نام 'اُردو ادب' رکھا۔ علی گڈھ کی انجمن کو حکومتِ ہند کی امداد حاصل ہے اور ترقی اُردو کا کام جاری ہے۔

قاضی عبدالغفار صاحب کے انتقال (۱۹۵۵ء) کے بعد اُردو کے مشہور ادیب و

نقاد آل احمد سرور انجمن ترقی اُردو کے علمی و عملی کام کی قیادت کر رہے ہیں۔ سہ ماہی رسالہ (اُردو ادب) پہلے ہی سے سرور صاحب کی ادارت میں تھا۔ سرور صاحب کی محبت و محنت سے انجمن اور اُردو کی ترقی کی بہت کچھ امیدیں ہیں۔ سرور صاحب کی نگرانی میں ہماری زبان ہفتہ وار ہو گیا ہے۔ اور مضامین کے اعتبار سے بھی اب پہلے سے زیادہ وقیع ہے۔

بیسویں صدی کی ایک بڑی خصوصیت جس میں ''حیاتِ اُردو'' کا کوئی زمانہ مقابلہ نہیں کرسکتا، اس کے عظیم الشان ادارے، مکتبے اور انجمنیں ہیں۔ (۱) دار الاشاعت پنجاب (۲) انجمن ترقی اُردو (۳) دار المصنفین اعظم گڈھ (۴) مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی (۵) دار الترجمہ دولتِ آصفیہ دکن (۶) ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد، تقسیمِ ہند سے پہلے سب سے ممتاز اور وسیع تھے۔ ان کے علاوہ دہلی، لکھنؤ، الٰہ آباد، لاہور، حیدر آباد وغیرہ مقامات پر چھوٹے ادارے بھی بڑے کام کر رہے تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں خصوصاً کراچی اور لاہور میں اعلیٰ ادارے قائم ہو گئے ہیں، جو نہایت وسعت اور جامعیت کے ساتھ اُردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

یہ ''تصنیفی'' حیثیت کا ذکر تھا، اسی کا لاحقہ ان سب اداروں کی ''تجارتی'' حیثیت و خدمت ہے۔ اس خصوصیت میں ان کے علاوہ اور بہت سی بک ایجنسیاں، بک ڈپو، مکتبے، کتاب گھر اور کتابستان شامل ہیں۔ یہ بجائے خود اس قدر اہم اور ضروری ہیں کہ ان کے بغیر اشاعت دشوار تھی اور تصنیف و تالیف بیکار۔

انیسویں صدی میں یہ شعبے بہت کم تھے، اور ایسے وسیع و جامع نہ تھے۔ اُس زمانے کے مطابع اپنی اپنی مطبوعات فروخت کرتے تھے۔ غالباً سب سے پہلے علی گڈھ کالج میں بک ڈپو قائم ہوا جس نے مطبوعات غیر کی فروخت کا بھی انتظام کیا۔

۱۰۔ اس تبصرے میں داستانِ تاریخِ اُردو کے آخری دور کا تذکرہ مقصود اصلی تھا۔ صرف موازنہ کی غرض سے زمانۂ حال کا مختصر حوالہ آ گیا ہے کہ ''اول بآخر نسبتے دارد۔''

-------تمام شد-------